THE 'ADEEB' DELHI

ماہنامہ ادیب

(دہلی)



جلد ۲ نمبر ۱ | اڈیٹرز:- فصیح الدین احمد ایم اے، سید محمد مرتضیٰ واحدی | سالانہ چندہ

(۱) زندگی کے نئے زاویے

از جناب زین احمد صاحب جعفری مصنف سیرۃ مولانا محمد علی
شائع کردہ ادارۂ اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن
سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۳۶۴ - مجلد مع گردپوش
قیمت تین روپے

جعفری صاحب کی پہلی کتاب "سیرۃ محمد علی" ملک میں بہت مقبول ہو چکی ہے ایسے مصنف سے بڑی چیزوں کی توقع تھی - سیرۃ نے جعفری صاحب کا ایک معیار اور وقار قائم کر دیا تھا - جو ان افسانوں سے متزلزل ہو گیا - سرورق پر ایک برہنہ مرد اور عورت کی کثرنگ تصویریں بنی ہوئی ہیں - عورت کے آغوش میں ایک شیر خوار شیر خواری کر رہا ہے - مرد کا ایک ہاتھ ایک لوہے کی کل کے پہیوں پر رکھا ہوا ہے - دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا ہے - اور چہرہ بچے کی طرف مڑا ہوا ہے - اِن تصویروں کے نیچے کتاب کا نام لکھا ہوا ہے - کتاب کے نام اور تصویروں کے درمیان رابطہ کیا ہے ؟ میری سمجھ میں نہیں آیا - رابطے کے امکانات حسب ذیل ہو سکتے تھے -

(۱) برہنگی سے لوہے اور دھات کے زمانے کی طرف خیال جاتا ہے -
(۲) لوہے کی کل ترقی پسندی اور سوشلزم کی ترجمانی کرتی ہے -
(۳) بچے کا برہنہ ماں کی چھاتیوں سے شیر خواری کرنا بے لبی اور بے بضاعتی کا اعلان ہے -

مگر یہ تینوں صورتیں کتاب کے افسانوں میں نہیں پائی جاتیں -

فہرس میں چھ عنوان ہیں - یعنی کتاب میں چھ افسانے ہیں (۱) مہاراجہ گنگاپور (۲) کعبہ کے برہمن (۳) گرلز ٹریننگ سکول (۴) ننگِ خاندان - (۵) پہلو بہ پہلو (۶) عشق و ہوس -

ان تمام افسانوں کو میں نے اس تلاش میں پڑھا کہ شاید زندگی کا کوئی نیا زاویہ نظر آئے - گر الف سے لیکر ی تک تمام افسانے پڑھ ڈالے لیکن سوائے ایک "زاویہ" کے جو بہت فرسودہ زاویہ نگاہ ہے - مجھے نہ مل سکا - اس زاویہ کا نام میں کتاب کے عنوانات میں سے ایک نام کو مستعار لے کر ادا کرتا ہوں - یعنی "عشق و ہوس" - مرد کی ہوس کاری اور عورت کی نفس پرستی - یا مرد کی ہوسناکی اور عورت کی بیچارگی کوئی نئے مضامین نہیں - جسے آجکل محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے - وہ ہوس رانی ہے - شکاری ایک شکار کے بعد دوسرے شکار کی تلاش کرتا ہے - نئے نظریے خواہ مخلوط تعلیم خواہ بے پردگی - خواہ تعلیم نسواں - خواہ افلاس اور بیچارگی کو عصمت اور عفت کی قربان گاہ بنائیں - مگر حقیقت صرف ایک ہی ہے - ہماری مذہبی تعلیم اور تربیت اگر بچپن سے استوار ہو تو قدم میں لرزش کبھی پیدا نہ ہو سکے گی - بہر حال یہاں مجھے مذہب اور اخلاق کا فلسفہ سمجھانا منظور نہیں - مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ "سیرۃ محمد علی" کے مصنف سے ہمیں سیرۃ علیؓ - سیرۃ عثمانؓ - سیرۃ عمرؓ - سیرۃ صدیقؓ اور سیرہ محمدی کی توقع ہے - دیکھیں جعفری صاحب یہ توقعات کب تک پوری کرتے ہیں -

(۲) سیاست جاپان

از امام علی بلگرامی ایم اے
شائع کردہ اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن - قیمت ۱۰ /

اس وقت جبکہ جاپان ہمارے ملک کی مشرقی سرحد تک آن پہنچا ہے - ہر طرف پڑھے لکھوں میں اور جاہلوں میں جاپان اور اُسکے فوجی اقتدار کے چرچے ہیں - بدنصیبی سے ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو غلطی سے جاپان کو اپنا دوست اور نجات دہندہ سمجھتے ہیں - جاپان قطعی طور پر ایک فاشسٹ ملک ہے - اِس فاشسٹ نظام کی بنیاد ہی جبر و تشدد پر قائم ہے - اِن حالات میں جبکہ یہ خطرہ ہم سے بہت قریب آگیا ہے ضروری ہے کہ لوگ اسکے اندرونی حالات اور اُس کی خارجی پالیسی سے واقفیت حاصل کریں -

خوشی کی بات ہے کہ ادارہ اشاعت اردو نے جو ایک ادبی ادارہ ہے ، سیاسی ادب بھی پیش کرنا شروع کر دیا ہے - جس کی موجودہ حالات میں بڑی ضرورت ہے - "سیاست جاپان" ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے - ان صفحات میں علی امام صاحب بلگرامی نے اختصار کے ساتھ جاپان کا تاریخی ارتقا پیش کیا ہے - مصنف نے بتایا ہے کہ تاریکی کے دور سے لیکر فاشیت کے دور تک جاپان کن کن مراحل سے گذرا ہے - اور اس عرصہ میں اس میں کیا کیا اندرونی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں - نیز اس کی موجودہ پوزیشن کیا ہے - آخر میں جاپان کی فسطائی انجمنوں پر روشنی ڈالی ہے -

کتاب کا مطالعہ موجودہ حالات میں مفید بھی ہے اور ضروری بھی -

خُدا

(رشحاتِ قلم عالیجناب ڈاکٹر سر شانتی سروپ صاحب بھٹناگر)

وہ ذات واحد وہ حُسنِ یکتا کہ شمع پروانۂ یقیں ہے ۔ جو ذرّے ذرّے سے جلوہ افشاں تو ریشے ریشے میں جاگزیں ہے
نقابِ شامِ خزاں اُلٹ دے تو داغِ لالہ سرشکِ شبنم ۔ حجابِ صبحِ بہار اُٹھا دے تو بوئے گُل رُوحِ انگبیں ہے
کہیں دلِ افروزِ لالہ و گل ، کہیں جگر سوزِ دیدہ و دل ۔ کہیں نسیمِ بہار ہستی ، کہیں دمِ مرگ آفریں ہے
غرض میسّر جو چشمِ دل ہو تو اُس کا جادہ کہاں نہیں ہے

مگر کل اِک شخص کہہ رہا تھا سُنو کہ دل میرا راز داں ہے ۔ خدا حقیقت میں حُسنِ ظن ہے ، خیال ہے ، وہم ہے ، گُماں ہے
غمِ حیات و ممات کیسا ، یہ بحثِ ذات و صفات کیسی ۔ ہماری ہی زندگی ہے دائم ، ہماری ہی ذات جاوداں ہے
ہمیں تو ہیں سازِ صبحِ اوّل ، ہمیں تو ہیں سوزِ شامِ آخر ۔ ہمیں سے رنگِ ازل میں شوخی ، ہمیں سے حُسنِ ابد جواں ہے
قصور عقل و خرد ہے ورنہ خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے

عجیب نافہم و کج خرد ہیں وہ لوگ قائل ہیں جو خدا کے ۔ تلافیِ ہر گناہ جو کر چکے ہیں دستِ دُعا اُٹھا کے
اگر وہی رُوحِ خار و گُل ہے ، اگر وہی اصلِ جام و مُل ہے ۔ اگر وہی وجہ جُز و کُل ہے تو اُس کو دِکھلائے کوئی پا کے
خدائے نادیدہ مثلِ عنقا کوئی خیالی پرند ہو گا ۔ خیالِ شاعر نے جس کو بے پر اُڑا دیا اپنے پر لگا کے
یہ قولِ صادق ہے معتبر بھی خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے

یہ صبحِ روشن ، یہ شامِ رنگیں ، یہ روئے گُل ، یہ جبینِ اختر ۔ مطیعِ آئینِ نیچری ہیں ، ہے سب کی پروردگار نیچر
ذرا سی گنجائشِ تغیّر ، نہ خطرۂ انقلاب اصلا ۔ جو اُس کا قانون ہے مُدلّل ، جو اُس کا دستور ہے مقرر
وہی فسوں گاہ لالہ و گُل ، وہی چمن زارِ دیدہ و دل ۔ وہی جمالِ بہار آرا ، وہی بہارِ جمال پرور
سُنو میسّر جو گوشِ دل ہو خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے

ہوا مرے دِل کا آئینہ بھی غُبارِ شک سے ذرا مکدّر ۔ گیا میں نیچر کی کارگہ میں برائے تحقیقِ دینِ نیچر
صبا کی وہ عطر بیز شوخی ، گُلوں کا وہ برق زا تبسّم ۔ دلِ طرب آشنا کی قیمت ، نگاہِ بے نوش کا مقدّر
فضا کی رنگینیوں میں کھو کر ، کلی نے اپنی زبان کھولی ۔ چمن کی خاموش چاندنی میں کہا یہ غنچے نے مُسکرا کر
مجھے بغور تمام دیکھو خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے

نظر پڑا اِک پھول ، میں نے کہا ، غضب کا تو نازنیں ہے ۔ شرابِ تنویر جس میں ڈھالی گئی وہ ساغر وہ ساتگیں ہے
اگر تجھے کچھ خبر ہو مجھ کو بتا وجودِ خدا کی بابت ۔ تجھے بھی کیا ہستیِ خدا میں ہنوز شک ہے یقیں نہیں ہے

نے اس مقصد کے لئے وعظ و نصیحت یا کسی قسم کی براہ راست اپیل نہیں کی۔ بلکہ طنز کو ہی مقصد کا ذریعہ بنایا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ اکبر کے نزدیک قومی زندگی کا آئیڈیل کیا تھا۔ چنانچہ یہی سے غور و فکر سنجیدگی کے ساتھ اقبال کی شاعری میں نمایاں ہوئی۔

غزل کا دائرہ بھی حالی کے زمانے سے وسیع تر ہو گیا۔ انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کی اصلاح اور اس کی وسعت پر زور دیا۔ اگرچہ غالب نے غزل میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لئے گنجائش پیدا کر دی تھی لیکن اس چیز کو ایک مستقل نظریے کی شکل میں جس نے پیش کیا وہ حالی ہی تھے۔ چنانچہ اس کے بعد سے اردو غزل میں زندگی کے مختلف پہلو شامل ہونے لگے۔ اردو شاعری کی یہ صنف بھی زندگی سے قریب آ گئی۔ موجودہ دور میں اقبال کی غزلوں میں ہم زندگی کے مختلف مسائل کی ترجمانی پاتے ہیں۔ جگر کی غزل حسن و عشق کے نفسیاتی نکات کی پوری آئینہ دار ہے۔ جوش کی غزلیں پوری طور پر زندگی کی تند و صبات کی حامل ہیں۔

موجودہ دور میں نظم غزل پر غالب آ گئی۔ اس کی وجہ دراصل اس کی لامتناہی وسعت ہے۔ نظم میں زندگی کے مسائل کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ اور زندگی کے واقعات اور اُن کے نتائج کو تمثیل کی روشنی میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ مناظر اور جذبات کی مکمل تصویریں بھی اُتاری جا سکتی ہیں۔ اور حسن و عشق کی کیفیات اور واردات کا حرف بحرف نقشہ بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس میں ناول بھی آ سکتی ہے اور ڈرامہ بھی۔ کردار نگاری بھی اور مکالمہ بھی۔ خطابت بھی اور خطوط بھی۔ غزل کو باوجود جدید وسعت کے یہ بات حاصل نہیں۔ غزل میں جو بات کہی جاتی ہے اُسے "فی الجملہ" "المختصر" یا "عرض کیا ہے" سے زیادہ نہیں بڑھا سکتے۔

یہ ہے ہمارے جدید ادب کا پس منظر۔ جدید ادب کے دو پہلو ہیں ایک رومانی اور دوسرا انقلابی۔ جدید رومانی ادب کا علمبردار صحیح معنوں میں جوش ہے۔ جہاں تک انقلابی ادب کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ پہلی آواز اقبال ہی کی سنائی دیتی ہے۔ انقلاب، سرمایہ دار، مزدور، کسان، محنت، ملوکیت اور آزادی یہ تمام الفاظ اور اصطلاحات اقبال ہی کے قلم سے پہلے پہل اردو ادب میں داخل ہوئے۔ جوش جب انقلاب کی طرف آئے تو انہوں نے یہ الفاظ اقبال ہی سے لئے۔ لیکن اقبال اور جوش کی انقلابی شاعری میں سیاست کی مختلف رو پائی جاتی ہے۔ اقبال نے اولاً قومیت اور وطنیت کا راگ چھیڑا لیکن بعد میں ممالک اسلامیہ کی سیاحت "پان اسلامزم" اور تحریک خلافت سے متاثر ہو کر اسلامیات کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اقبال کی اس زمانے کی انقلابی شاعری کا مقصد اسلامی طرز حکومت یا خلافت پر زور دینا تھا وہ شاہنشاہیت کے خلاف ہیں۔ برطانوی جمہوریت کا طرز اُن کے نزدیک "دیو استبداد" سے کسی طرح کم نہیں۔ رہا خالص جمہوری نظام۔ تو اس کے بارے میں اُن کی یہ رائے ہے۔

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

جوش نے بھی قومیت اور وطنیت کے رنگ سے اپنی انقلابی شاعری کی ابتدا کی۔ اور آج بھی اُن کی شاعری اسی لے سے لبریز ہے۔ آگے چل کر وہ اشتراکیت کمیونزم سے متاثر ہوئے۔ اور آج اُن کے نغموں میں مزدور اور ستم رسیدوں کی آہ و فغاں سنائی دیتی ہے۔

نظم اور نثر دونوں پر اقبال اور جوش کا اثر پڑا۔ جوش کا اثر اول تو جدید رومانی شاعری پر ہے۔ فطرت نگاری شاعری میں بھی ہمارے نوجوان شعرا براہ راست جوش ہی سے متاثر ہیں۔ نوجوان شعرا کے سیاسی خیالات کا دھارا بھی اسی سمت بہہ رہا ہے جس سمت جوش کا۔ ان نوجوان شعرا نے [illegible] ہیں اقبال اور جوش کے بنائے ہوئے سلوگن [illegible] کے [illegible] اور کہیں تھوڑے رد و بدل کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔

جدید نظم گو شعرا میں مجاز، احسان دانش، جاں نثار اختر، [illegible] الطاف مشہدی، سردار جعفری، جمیل مظہری، جذبی، ساغر، [illegible] وغیرہ نمایاں ہیں۔ ان نئے شعرا کے ہاتھوں [illegible] اس کو وسیع کرنے کیلئے میں نے رومانی شاعری میں صرف جاں نثار اختر [illegible] کو لیا ہے اور [illegible] شاعری میں احسان دانش اور جاں نثار اختر کو لیا ہے۔ اور جدید ادب میں انقلابی پہلو کو نمایاں کرنے کے سلسلہ میں احسان دانش، مجاز، سردار جعفری کی شاعری مدنظر رکھی ہے۔ ان کی شاعری میں تمام جدید رجحانات پورے طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔

اوّل رومانی شاعری کو لیجئے۔ مجاز کی شاعری [illegible] کافی ہیں۔ بلکہ ان کا ابتدائی دور پورا رومانی شاعری کا دور ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری کا بڑا حصہ رومانی ہے۔ جدید رومانی شاعری کی بعض خصوصیات مصوری اور جذبات نگاری ہے۔ یہ خصوصیت ان شعرا میں جوش سے منتقل ہوئی۔ جوش کی "جنگل کی شہزادی" "گنگا کے گھاٹ" [illegible] "یہ کون اٹھا ہے شرماتا" "فتنۂ خانقاہ" "سونے والے" [illegible] مصوری کے اچھے نمونے ہیں۔ [illegible]

جذبات نگاری کے لحاظ سے اُردو ادب میں بے نظیر ترین ہیں۔ مصوری میں جذبات نگاری اور جذبات کی باریک سی جوشش کا حصہ ہے۔ مجاز کے یہاں "اصنام نمائش"، "نرس کی چارہ گری" اور "جشن سالگرہ" مصوری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مجاز کی "رات اور ریل" کو اگرچہ ہم رومانی شاعری میں جگہ نہیں دے سکتا لیکن مصوری کے اعتبار سے ان کی بہترین نظم ہے۔ چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی　　نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرود دلنشیں　　آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت　　ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی　　پٹریوں پر دور تک سیماب جھلکاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار　　ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے　　رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ　　خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی، بکھری ہوئی　　شورشِ پیہم سے دل گیتی کا دہلاتی ہوئی

مذکورہ بالا مثالوں میں متفرق اشعار یا بند اِدھر اُدھر سے چن لیے گئے ہیں۔ ان میں کوئی تسلسل نہیں اور مکمل تصویر کا اندازہ کرنے کے لیے پوری نظم کا سامنے رہنا ضروری ہے۔ تاہم ان اجزا سے مجاز کے کمالِ تصویر کشی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

جذبات نگاری کی مجاز کے یہاں فراوانی تو نہیں ہے لیکن بعض عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ اس کی "آج کی رات" مجسم رومان میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نظم میں شاعر انتہائی رومانی کیف میں سرشار نظر آتا ہے۔

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
اور کیا چاہیے اب اے دلِ مجروح تجھے
اُس نے دیکھا تو بہ اندازِ دگر آج کی رات
عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات
نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات
اُف وہ وارفتگیٔ شوق میں اک وہمِ لطیف
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نظر آج کی رات
میری ہر سانس پہ وہ اُنکی توجہ کیا خوب
میری ہر بات پہ وہ جنبشِ سر آج کی رات

مجاز کا یہ آخری شعر جنسی نفسیات کا ایسا گہرا نکتہ ہے جس کی سچی داد ماہر نفسیات ہی دے سکتا ہے۔

جاں نثار اختر کے یہاں "بنارس کا سفر"، "گرلس کالج کی لاری" اور "نذر انجم" مصوری کے حسین نمونے ہیں۔ نوجوان شعراء میں اتنی جذبات نگاری اور کہیں نہیں پائی جاتی۔

جذبات نگاری کے سلسلہ میں جاں نثار اختر کی دو نظمیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک "بھولا ہوا افسانہ" اور دوسری "ایک یاد"۔ بھولا فسانہ میں اس نے ان بے باقی لمحوں کو بتایا ہے جب ایک لڑکی کو اپنی گذشتہ محبت کی یاد ستاتی ہے۔ ان ہم لمحات کو تو یہاں نقل کرنا دشوار ہے۔ چند ٹکڑے درج ہیں:—

بہاروں کی حسین نکھری ہوئی سرشار راتوں میں
محبت پہ کبھی جب بحث آ جائے گی باتوں میں
تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا
اگر تم ملک کر کسی ناول کا کونہ موڑتی ہو گی
اگر شغلاً کسی کے خط کے پرزے جوڑتی ہو گی
تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا
اگر بے کیف لمحے انکھڑیوں کی نیند لوٹیں گے
نفس میں دفعتاً جب دو ستارے ساتھ ٹوٹیں گے
تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

"ایک یاد" میں خاص بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس نظم میں جس لڑکی کا ذکر ہے شاعر اُس سے محبت نہیں کرتا، بلکہ خود لڑکی اُس کی محبت میں گرفتار ہے۔ شاعر اُس سے بے نیاز ہے۔ لیکن اُس کے جذبات کا مطالعہ غور سے کرتا ہے۔ اُنہیں جذبات کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔

مرتا اُلجھی ہوئی نظریں مرا کھوئے ہوئے رہنا
میں اُس کے سامنے جاتا تو کیا مسکراتی تھی
اگر میں چاندنی راتوں میں سازِ دل اُٹھا لیتا
تو آتی اور مرے قدموں میں آ کر بیٹھ جاتی تھی
اگر میں بیٹھے بیٹھے وحشتوں کے درد سے روتا

تو اپنے آپ بھی روتی مگر آنسو چھپاتی تھی
اسے میری محبت تھی سُنا ہے میں نے غیبت میں
مری ہر چیز کو وہ اپنی آنکھوں سے لگاتی تھی

موجودہ شاعری کی ایک خصوصیت جرأت ہے۔ شاعر سماجی بندش جنسی پابندی اور ہر اُس مروجہ اصول یا تنظیم کے خلاف جسے وہ غلط سمجھتا ہے علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ چیز موجودہ شعر و ادب میں نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی کے اقدام سے آئی۔ جوش کی رومانی شاعری میں جا بجا اس جرأت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جوش پہلا شخص ہے جس نے "جامن والیاں" "مالن" "مہترانی" کو شاعری میں جگہ دی۔ اور ان نظموں میں اکثر جگہ ہندستان کے نچلے نوجوانوں کے گرے ہوئے اخلاق کو واضح کیا۔ جرأت کا یہ رجحان نوجوان شعرا میں اپنا قدم آگے بڑھا رہا ہے۔ اس کا مقصد ایک طرف موجودہ اخلاق کی پردہ دری ہے۔ اور دوسری طرف جنسی آزادی کو حاصل کرنا، جن کی عدم موجودگی ان نوجوان شعرا کے نزدیک چھپ چھپ کر گناہ کرنے کی دعوت ہے۔

مجاز سماج کی مقید عورتوں کو فطری نیکی کا حامل ماننے کیلئے تیار نہیں۔ وہ ان کے اخلاق کو سچا اخلاق نہیں سمجھتا۔ ان کی عصمت اُنکے نزدیک صحیح عصمت کہلانے کی مستحق نہیں۔ وہ اس عصمت کا قائل ہے جو جنسی آزادی کے ساتھ ہو۔ "پردہ اور عصمت" والی نظم میں وہ کہتا ہے۔

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا — مذاقِ لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنا — کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے
سرِ رہ گذر چھپ چھپا کر گذرنا — خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا — کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے
قسم شوخیٔ عشقِ سنجوگتا کی — قسم جوہن کے عزمِ صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی قسم خالدہ کی — کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

جنسی آزادی کا عنصر بھی مجاز کی شاعری میں نمایاں ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے واضح ہے۔

جب اُس کے ہونٹ آ جاتے تھے از خود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

مذہبِ عشق میں جائز ہے یقیناً جائز
چوم لوں میں لبِ لعلیں بھی اگر آج کی رات

مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اُسکی

جاں نثار اختر کی شاعری میں بھی جرأت کے یہ دونوں پہلو ملتے ہیں۔ اُس نے بھی جوش کی طرح "طوائف" اور "خانہ بدوش لڑکی" کے گرے ہوئے اخلاقی کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس کا الزام سماج کے سر رکھتا ہے۔ وہ ان کی فطرت کو معصوم سمجھتا ہے۔ لیکن ان کی موجودہ شخصیت کو موجودہ نظام کے جبر سے تعبیر کرتا ہے۔ "طوائف" کے متعلق لکھتا ہے۔

پیٹ کی خاطر اگر تو بیچتی ہے جسم آج
کون ہے نفرت سے تجھ کو دیکھنے والا سماج
مدتوں تک بھوک کی ماری رہی جو آستا
کر دیا دولت نے اُس کی آبرو کا خاتمہ

اسی طرح خانہ بدوش لڑکی کی پست اخلاقی اور اُس کے سبب کا یوں ذکر کیا ہے۔

عشق ان کا بے تکلف حُسن ان کا بے نقاب
مُفلسی کی گود میں آزاد ہے ان کا شباب

ان نوجوانوں کی اخلاقی حالت کا جو سماج کے سامنے مصنوعی چہرہ لگائے رہتے ہیں۔ اور پس پشت اس چہرہ کو اتار کر اپنے اصلی اور فطری رنگ روپ میں نظر آتے ہیں۔ جاں نثار اختر اپنی نظم "طوائف" میں ایک جگہ اس طرح ذکر کرتا ہے۔

سنتے ہیں دن کو لے سکتے نہیں تیرا سلام — رات کو جو تیرے ہاتھوں سے چڑھا جاتے ہیں جام
محفلوں میں تجھ سے کر سکتے نہیں جو گفتگو — تیرے آنچل میں بندھی ہے انکی جھوٹی آبرو

جنسی آزادی کا اظہار بھی اس کے یہاں موجود ہے۔ اس کی نظم "اپنی سنجوگتا سے" اسکی کھلی ہوئی مثال ہے۔ جس میں ایک لڑکی اپنے شریکِ زندگی کے انتخاب کیلئے سماج سے بغاوت کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:—

وفا کا راز کھولا اس نے دنیا کی نگاہوں پر — وہ بجلی بن کے ٹوٹی رسم کی قربان گاہوں پر
کلی بارش کی طغیانی میں جیسے مسکراتی ہو — ہوا کے تند جھونکوں میں کوئی لو جگمگاتی ہو
شگفتہ ہو کنول کا پھول جیسے تیز دھارے پر — بھرے طوفاں میں کشتی آ گئی جیسے کنارے پر
بدل ڈالا فضا اس نے بدل ڈالا جہاں اس نے — نئے سر سے کہی سنجوگتا کی داستاں اس نے

اس ترقی یافتہ شاعری کی ایک اور خصوصیت انانیت ہے جو دراصل غالب کی خصوصیت ہے۔ جوش کے یہاں بھی یہ خصوصیت موجود ہے لیکن پرانی شاعری کے اثر کے تحت جس کے اجزا جوش کی شاعری میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں

وہ کبھی کبھی حُسن کے قدموں پر اپنا سر بھی رکھ دیتا ہے۔ لیکن اس نئی پود میں یہ عنصر مستقل طور پر ایک حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ موجودہ شعرا میں یہ عنصر مجاز۔ جذبی۔ مخدوم۔ جاں نثار اختر اور سردار جعفری کے یہاں مکمل ہو چکا ہے۔ خودداری اور خود اعتمادی انانیت کے اہم اجزا ہیں۔ اور یہ ان کی تمام نظموں میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ مجاز کی نظم "نذر دل" موجودہ ادب میں نمایاں ہے۔ مجاز نے اس میں ایک جگہ حسن کے لئے دل اور نگاہیں بچھائی ہیں۔ لیکن تیور وہی خوددارانہ ہیں۔ خودداری کے عام رجحان کے ثبوت کے لئے مجاز اور جاں نثار اختر کے چند شعر نمونتاً درج ہیں۔

ادائیں لے کے آئی ہے وہ نظر کے خزانے سے
نگاہ سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانے سے
وہ ملک بے خراج اُٹھ لئے ہیں جو تاتوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں ناصرانیاں سی کی

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں

جاں نثار اختر اپنی نظم "دوست کے حضور" میں کہتا ہے ؎

تکلف برطرف دے مجھ کو فرمان غزل خوانی
تری محفل پہ چھا جانے کا دعویٰ لیکے آیا ہوں
اُٹھا لے اپنے پیمانے کو اس دم تیری محفل میں
میں اپنی مے، میں اپنے جام و مینا لیکے آیا ہوں

ایک دوسری جگہ کہتا ہے ؎

اور کا غم اُٹھا رہا ہوں میں　　تو مرے غم کو اختیار نہ کر
جو تجھے پیار کر نہ سکتا ہو　　تو بھی اس بے وفا کو پیار نہ کر

آج کل کی شاعری میں ایک اور چیز نمایاں ہے۔ وہ عورت کے تصور کا ارتقا ہے۔ اُردو شاعری میں ابتدا سے عورت پر تذکیر کا نقاب پڑا ہوا تھا۔ قدیم شاعری میں خسرو اور سعدی (دکنی) کی غزلوں میں عورت بے نقاب موجود ہے۔ لیکن اس کی حیثیت عاشق کی ہے۔ اور یہ ہندی شاعری کا اثر تھا۔ اُردو شاعری نے چونکہ اپنا سنگ بنیاد فارسی ادب پر رکھا تھا اس لئے اس میں اس محبوب کا صیغہ مذکر ہی رہا۔ صرف ولی دکنی کی شاعری میں ایک آدھ جگہ عورت محبوب کی حیثیت سے بے نقاب پائی جاتی ہے ؎

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے گھنگھرو کی آواز سناتی جا

لیکن رفتہ رفتہ زمانے کے ساتھ فارسی شاعری کا تذکیر کا صیغہ اُردو میں مروج ہو گیا نسوانی مخصوصات البتہ قائم رہے۔ ولی کی شاعری میں داخلی رنگ ہونے کی وجہ سے نسوانی مخصوصات کی نمائش کم ہوئی۔ البتہ لکھنؤ کی شاعری میں جس کا نمایاں پہلو خارجی تھا ان سے مالا مال نظر آتی ہے۔ حالی نے اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں پہلے پہل عورت کے چہرے سے نقاب اُٹھا دینے کا فتویٰ دیا۔ لیکن ابتداءً شعرا ایسی جرأت نہ کر سکے۔ جوش پہلا شخص ہے جس نے عورت کو رومانی شاعری کی مستقل محبوبہ بنا دیا۔ یوں تو جوش اپنی جوانی اور شاعری کی ابتدا میں ہر عورت پر للچائی نظر ڈالتا ہے لیکن اسکی اصل محبوبہ سامنتی تمدن کی عورت ہے۔ وہ شریف خاندان سے ہے۔ درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اسکی زندگی کا مقصد عشق کی لذتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ساغر کی محبوبہ ہندو عورت نظر آتی ہے۔ اور وہ بھی سامنتی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اختر شیرانی نے ایک مُسلمان لڑکی سلمیٰ کو محبوبہ بنایا۔ اور اتنی جرأت برتی کہ اس کا نام بھی منظر عام پر لے آیا۔ لیکن جوش اور اختر شیرانی کی شاعری میں یہ احساس کہیں نہیں ہوتا کہ وہ عورت پردہ اُٹھا چکی ہے۔ جوش "انگیٹھی کے کنارے" راز و نیاز میں محو نظر آتا ہے۔ اور اختر شیرانی کی سلمیٰ رات کو چوری چھپے وادی میں آکر اُس سے مل جایا کرتی ہے۔ مجاز کی محبوبہ کسی کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے وہ اُسکی زندگی کا نصب العین عشق و عاشقی ہی تک محدود نہیں رکھنا چاہتا۔ بلکہ وہ اُسے سوسائٹی کے پُشتے سے ٹکرانے اور سماجی انقلاب میں حصہ لینے کی دعوت دیتا ہے ؎

آ ملکر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

جاں نثار اختر کی محبوبہ متوسط طبقہ کی ایک مسلمان لڑکی ہے سماج کی

کتاب السلف

علامہ سیماب صاحب چونکہ اکتوبر میں آگرہ سے غیر حاضر رہے۔ اس لئے نومبر میں ان کے مضمون کی قسط شائع نہ ہو سکی۔

(فصیح الدین احمد)

بندشیں عموماً متوسط طبقے پر زیادہ شدید ہوا کرتی ہیں۔ اس لڑکی میں اِن سماجی زنجیروں کو توڑنے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔ وہ آزادی کی جویا ہے۔ اور یہ چیز صرف احساس ہی کی حد تک نہیں رہی۔ وہ سماج کی آہنی دیواروں سے ٹکرا بھی جاتی ہے۔

جبیں سے اُس کی شعاعِ آزادی جھلکتی ہے
بغاوت حُسن بن کر اس کی نظروں سے ٹپکتی ہے
ادائے ناز میں تیرتے ہوئے سیلاب کی اک رو
ملائم بازوؤں میں [illegible] کا پرتو
جلا ڈالے رواج و رسم کے جھوٹے نقاب اُس نے
نظر سے توڑ ڈالے [illegible] آفتاب اُس نے
(از "اپنی سنجوگتا سے")

موجودہ شاعری میں جوش کے یہاں عورت کا جو آئیڈیل پایا جاتا ہے وہ قطعاً سامنتی ہے۔ اُس کی نظم "خاتونِ مشرق" اس کا ثبوت ہے۔ احسان دانش کے یہاں عورت کا تخیل جوش سے بھی زیادہ فیوڈل ہے جس کی مثال "عورت کا ایثار" اور "نامۂ بے نام" میں پائی جاتی ہے۔ اختر شیرانی کے یہاں عورت کا تخیل قلوپطرہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ ساغر کے یہاں البتہ عورت ایثار کی دیوی بن گئی ہے۔ اسکے دل میں قوم اور وطن کا درد ہے۔ لیکن اسکی آئیڈیل عورت بھی ہندو ہے۔ مجاز نے آئیڈیل عورت کا تخیل "نوجوان خاتون سے" اور "پردہ اور عصمت" میں پیش کیا ہے۔ وہ بدلتے ہوئے نظام کی عورت ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ بے پردہ ہے۔ مخلوط سوسائٹی کی رکن ہے۔ اور انقلابی رجحان رکھتی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل مثال سے ثابت ہوتا ہے ؎

ترے زیرِ نگیں گھر ہو، محل ہو، قصر ہو، کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تو نے سر اُٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو سازِ بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز کا یہ ذہنی آئیڈیل جاں نثار اختر کی شاعری میں مجسم اور متشکل نظر آتا ہے۔ اس کا ثبوت اس کی نظم "تم کون ہو" میں ملتا ہے ؎

بال افشاں جنبشِ مژگاں میں روحِ انقلاب
انکھڑیوں میں جاگتے پرکیف مستقبل کے خواب
شعلۂ آزاد شمشیرِ حسیں [illegible] سرو شباب
اس طرح پرچم سی لہراتی ہوئی تم کون ہو

ہماری نئی شاعری کا ایک نمایاں پہلو رجائیت ہے۔ [illegible] اور نئے شعرا میں ہر ایک کے یہاں حزن و غم کا عنصر [illegible] اُسے قنوطیت نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جذبی کے یہاں قنوطیت نمایاں [illegible] شعرا کا غم صحت مند آدمی کا غم ہے۔ بیمار کا غم نہیں۔ مجاز کی نظم [illegible] جاں نثار اختر کی نظم "بیزاری" میں زندگی سے [illegible] ہیں۔ زندگی اپنے اسلوب میں اتنی متنوع اور کثیر [illegible] انسان پر گذرنا کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ان [illegible] پسند دماغوں کیلئے وقتی ہوا کرتے ہیں۔ مجاز اور جاں نثار [illegible] کسی اور جگہ اس قسم کی کیفیات نظر نہیں آتیں۔ جس سے صاف [illegible] وقتی تاثر تھا۔ پھر ایک بات اِن دونوں نظموں میں قابلِ [illegible] اہم مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت اُس وقت بھی ان شاعروں [illegible] "آوارہ" کے دو ایک بند ملاحظہ ہوں ؎

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اسکا گلشن پھونک دوں اسکا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اسی طرح جاں نثار اختر کی نظم "بیزاری" میں مسائل سے عدم توجہی نہیں پائی جاتی ؎

آہ یہ دنیا ہے دولت کی غلام
زندگی ہے یاں غریبوں پر حرام
لے نہ میرے سامنے دنیا کا نام
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے
ہر طرف بغض و عداوت قتل و جنگ

کھا چکی انصاف کی میزان زنگ
لٹ چکا انسانیت کا نام و ننگ
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

منظر نگاری کی ابتدا یوں تو قدیم مثنویوں اور قصائد کی تشبیب میں ہو چکی تھی اور مرثیوں میں تو میر انیس نے اس عنصر کا کمال ہی دکھا دیا۔ لیکن اسکو علیحدہ حیثیت آزاد، اسمٰعیل، حالی وغیرہ کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ جوش کی شاعری میں منظر نگاری مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں جو اس کی نظمیں اور قطعات ہیں۔ وہ مشاہدے، تشبیہ اور تمثیل کے لحاظ سے کسی غیر ملک کے اس قسم کے لٹریچر سے کم نہیں۔ "گرمی کی دوپہر"، "برسات کا اتار"، "بدلی کا چاند"، "ساون کی پہلی گھٹا"، "[illegible]" وغیرہ اس کی نمایاں نظمیں ہیں۔ جوش کے یہاں منظر نگاری بطور مقصد کے بھی ہے اور بطور ذریعے کے بھی استعمال ہوا ہے۔ اپنی انقلابی نظموں میں جوش نے منظر نگاری کو بطور ذریعہ ہی کے استعمال کیا ہے۔ "[illegible]"، "ضعیفہ"۔ "مزدور کی لڑکی" اس کی مثالیں ہیں۔ جوش کی منظر نگاری میں حسین اور بھیانک دونوں پہلو موجود ہیں۔ اس معاملہ میں جیسی جزئیات نگاری جوش کے یہاں پائی جاتی ہے اور کہیں نہیں ملتی۔ جدید شعرا میں سردار جعفری، مجاز اور جذبی کے یہاں منظر نگاری کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی وہ نیچر کے گوناگوں نظاروں سے متاثر نہیں ہوتے۔ باقی تمام نوجوان شعرا میں منظر نگاری پائی جاتی ہے۔ احسان دانش کی شاعری میں منظر نگاری کی افراط ہے۔ وہ بغیر منظر کے نظم شروع کرنا ہی نہیں جانتا۔ کہیں کہیں اُس کے یہاں خالص منظر نگاری بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً "صبح مسرت"۔ "گرمی کی دوپہر"۔ "افسونِ بہار"۔ "روشنائی" "سادھو کی چتا"۔ لیکن زیادہ تر منظر نگاری کو وہ اپنی مقصدی نظموں کی تمہید بناتا ہے۔ اور اس منظر کو اپنے مقصد کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ "مزدور کی موت" "ناخواندہ خاتون"۔ اور "طوفانی نغمہ" اسکی اس قسم کی منظر نگاری کے کامیاب نمونے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

نیم شب زلفِ سیہ کھولے ہوئے ہے دوش پر
ہیں ستاروں کی نگاہیں ظلمتِ خاموش پر
ہر طرف دنیا میں ہے بے نور خاموشی کا راج
آسماں پر ہے اندھیرے کی جوانی کا مزاج
ہیں شوالے بند ناقوسوں کے نالے سو گئے
تیلیوں میں جا کے سکوں کے اجالے سو گئے
کوئی ٹہنی خوف سے گردن اٹھا سکتی نہیں
طائروں کی سانس پتوں کو ہلا سکتی نہیں
اب سحر سے پیشتر یہ رنگ کٹ سکتا نہیں
یک بیک یہ سرمئی آنچل الٹ سکتا نہیں
(از "مزدور کی موت")

یا پھر ؎

زمانہ ہو گیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی
[illegible] جس کے دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی
عجب بپھرا ہوا موجوں کا نقشہ تھا روانی میں
کہ جیسے بہتی ہوں جل [illegible] پانی میں
ادھر پانی کا رخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا
کسانوں کی [illegible] سرسبزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا
[illegible] دھارے نے کی تھی رہگذر پیدا
جو ٹکراتی تھیں دو موجیں تو ہوتے تھے شرر پیدا
یقیں ہوتا تھا اکثر جوشِ طوفاں کے قرینے سے
کہ اب مل جائیگا جھک کر فلک گنگا کے سینے سے
فلک سے ہانپ کر [illegible] گرنے والا تھا
زمیں کی نعش پر کالا کفن فطرت نے ڈالا تھا
(از "طوفانی نغمہ")

جاں نثار اختر کی بعض نظموں کی ابتدا منظر نگاری سے ہوتی ہے۔ مثلاً "خانہ بدوش"، "ہلولہ" وغیرہ لیکن منظر نگاری ان نظموں کا موضوع نہیں ہے۔ "برکھا رُت" البتہ خالص منظر نگاری ہے۔ منظر نگاری میں جذبات کی آمیزش ایک عام چیز ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جزئیات اور تشبیہات کے اعتبار سے نوجوان شعرا نے منظر نگاری میں کیا اضافہ کیا۔ جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے بتایا جا چکا ہے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جوش سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ نئے مناظر اور انکی نئی جزئیات کا اضافہ ضرور ہوا ہے۔ جوش کی تشبیہات کی ندرت و نزاکت میں کوئی شبہ نہیں۔ موجودہ نوجوان شعرا نے تشبیہات کی رنگینی اور لطافت جوش ہی سے سیکھی ہے۔ لیکن اب تشبیہات کے آرٹ میں ایک نئے پہلو کا اضافہ ہوا ہے۔ جوش۔ ساغر، مجاز اور احسان دانش وغیرہ یا تو کسی مادی شے کو کسی دوسری مادی شے سے یا کسی غیر مرئی چیز کی تشبیہ مادی چیز سے دیتے ہیں۔ کہیں کہیں جوش کے یہاں ایسی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں جہاں غیر مرئی چیز کو غیر مرئی چیز سے مشابہ

[illegible] غیر مرئی اشیا سے تشبیہ دینا ایک اعلیٰ فن ہے۔ ایسی تشبیہیں
[illegible] کے خیالات میں [illegible] نظر آتی ہیں۔
[illegible] کی نظموں میں یہ تشبیہیں بالخصوص پائی جاتی ہیں۔
اس قسم کی تشبیہات انگریزی ادب میں [illegible] کی خصوصیت ہے۔ اور
جہاں تک اختر کا تعلق ہے یہ خصوصیت غالباً شیلے ہی کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مجھ کو ان کی تشبیہ دیکھئے

چاک پر جیسے بنائے جا رہے ہوں لڑے — یا جنوں طے کر رہا ہو گردشوں کے مرحلے
مل رہا ہو جس طرح جوش بغاوت کو فراغ — جنگ چھڑ جانے پہ جیسے ایک لیڈر کا دماغ
یوں بگولے میں ہیں تپتے سرخ ذرے بیقرار — جس طرح افلاس کے دل میں بغاوت کے شرار

جدید شاعری کا دوسرا اہم رخ انقلابی ہے جوش اور تمام نوجوان شعرا ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ وطنیت، موجودہ سماجی نظام سے بیزاری، حکومت سے تنفر، سرمایہ داری اور جاگیرداری کی بربادی کی خواہش، مزدور اور ان سے ہمدردی، مساوی تقسیم، ذات پات کے امتیازات سے اختلاف اور تمام اشتراکی رجحانات انقلابی شاعری کی بنیاد ہیں۔ جوش کے یہاں انقلاب کی گھن گرج بہت شدومد کے ساتھ موجود ہے۔ وہ مزدور، کسان اور سماج کے کچلے ہوئے اشخاص کی تصویریں بھی پورے طور پر پیش کرتا ہے۔ اسکی نظمیں "ہمارا ہندستان"۔ "بغاوت"۔ "ضعیفہ"۔ "شکست زنداں کا خواب"۔ "کسان" "انقلاب" وغیرہ اسکی مثالیں ہیں۔ لیکن جوش کی شاعری میں چند اسقام بھی نظر آتے ہیں۔ اسکی ابتدائی انقلابی نظموں میں کہیں کہیں رومانیت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ "مزدور کی لڑکی" کی مشقت زدہ زندگی کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوئے اسکی چوڑیوں میں رنگین نغمے بھی سننے لگتا ہے۔ بعد کی شاعری میں وہ اپنی اس کمزوری پر غالب نظر آتا ہے۔ جوش انقلابی وعظ دینے کا بھی بہت عادی ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا سقم ہے۔ وعظ و خطابت شاعر کو موزوں نہیں۔ یہ چیز کوئی اچھا اثر مرتب نہیں کرتی سوچنے والے دل و دماغ کے لئے اس میں کوئی اپیل نہیں وہ اسے حکم یا جبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جوش کی انقلابی شاعری میں خطابت ابتدا سے لیکر آج تک پائی جاتی ہے۔ وہ اس خامی کو دور نہ کر سکا۔ اور جوش ہی پر کیا منحصر ہے۔ یہ چیز کم و بیش ہر انقلابی شاعر میں پائی جاتی ہے۔ ایک اور سقم جو جوش کی شاعری میں پایا جاتا ہے وہ تخریب پر زور ہے۔ آگ، آندھی، خون، لاشے۔ زلزلہ۔ کڑک اور موت ان سے اسکی شاعری گونجی ہوئی ہے۔ وہ دور حاضر کے ہر نظام کو ڈھا دینا چاہتا ہے لیکن اس تخریب کے بعد کیا ہو گا۔ یہ کچھ نہیں بتاتا مستقبل کی روشن جھلک اس کے یہاں آخر زمانے میں بھی اس قدر شاذ و نادر ہے کہ تقریباً نفی کے مترادف ہے۔

نئے دور کی انقلابی شاعری میں احسان دانش کی شاعری اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ مزدوروں، کاشتکاروں اور سماج کے ستم خوردہ افراد کے مصائب کی بہت واضح ترجمان ہے [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] سے انقلاب کی طرف آیا۔ اس نے [illegible]
ہے۔ یا درچی گیری بھی کی ہے اور چوکیداری بھی [illegible]
رات کو سڑکوں پر بھی سویا ہے۔ ان تکالیف و مصائب کو جیسا [illegible]
میں وہ بیان کر سکتا ہے دوسرا نہیں کر سکتا۔ "جشن بیچارگی"۔ "مزدور کی ماں [illegible]" "مزدور کا مہمان" وغیرہ اس کی مشہور نظمیں ہیں۔

نوشاہ کا جو سر پہ تھا باندھے ہوئے سہرا — عبر بیہ چولی میں تھا اترا ہوا چہرہ
اندوہ ٹپکتا تھا بشاشت کہ نظر سے — مرجھائے سے رخسار تھے فاقوں کے اثر سے
کرتا بھی پرانا سا تھا پگڑی بھی پرانی — مجبور تھی قسمت کے شکنجوں میں جوانی
ہمراہ نفیری تھی نہ باجا تھا نہ تاشا — آنکھوں میں تھا بے مہری عالم کا تماشا
لڑکی کا یہ عالم تھا کہ آپے کو سمیٹے — گڑیا سی بنی بیٹھی تھی چادر کو لپیٹے
انصاف زمانہ تھا کہ تقدیر کا چکر — ماں باپ کو آیا نہ تھا جوڑا بھی میسر
یوں کہنے کو دلہن تھی یہ مزدور کی دختر — اماں کا دوپٹہ تھا تو ابا کی تھی چادر
آخر نہ رہا باپ کو جذبات پہ قابو — تھرانے لگے ہونٹ [illegible] لگے آنسو

(از "جشن بیچارگی")

اسی سردی میں اک بیچارہ مزدور — مشقت کا دھنی قسمت سے مجبور
بہت گذری نہ تھی شادی کو مدت — مگر اللہ رے [illegible] کی قلت
پرانے ٹاٹ کے ٹکڑے پہ بیوی — سمٹ سمٹا کے چپ بیٹھی ہوئی تھی
جوانی کا فسوں کم ہو رہا تھا — تبسم بھیک کر غم ہو رہا تھا
گڑی جاتی تھی غیرت سے جوانی — شرافت ہو رہی تھی پانی پانی
یہ حالت اور پھر مہماں کا آنا — بدل کر رہ گیا کروٹ [illegible]
یہ ڈر اب انکشاف حال ہوگا — [illegible] مزدور مفلسی پامال [illegible]

(از "مزدور کا مہمان")

احسان دانش مصائب کو اچھی طرح جانتا ہے لیکن [illegible]
پورے طور پر نہیں سمجھتا۔ اور اسی وجہ سے وہ غریب طبقہ کا دکھ درد بیان کر [illegible]
کے بعد یا تو خدا کو الزام دینے لگتا ہے یا علم کو اس کی دوا تجویز کرتا ہے

مورچے پر وقت کے تو فتح پا سکتا نہیں — پر جہاں کا سر بلند [illegible]
جینا چاہے تو حصول علم کی تدبیر کر — [illegible]

یا
علم کے بل پر اگر کچھ چل سکتا ہے [illegible]

یا پھر

اے مالکِ کونین یہ تو نے بھی سنا ہے — دنیا کو گماں ہے کہ غریبوں کا خدا ہے
[illegible] آن کا جو گردش میں ستارہ — کیا تیرے کرم کو یہ ستم بھی ہے گوارا

(از "جشن بیچارگی")

احسان دانش کی شاعری میں بھی وہی تخریب کا پہلو پایا جاتا ہے۔ تعمیری شان کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ تخریب کا جذبہ ان جدید شعرا میں عام ہے۔ لیکن سردار جعفری۔ جمیل مظہری، جاں نثار اختر، روش اور مجاز کی شاعری میں تخریب کے پہلو بہ پہلو تعمیر بھی نظر آتی ہے۔ مجاز کے یہاں یہ چیز کھلے الفاظ میں موجود ہے

تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
آ! منتظر ہے عشرتِ فردا ادھر بھی آ (مجاز)
صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر
ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خار زارِ جہاں میں گلاب پیدا کر
بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
تو اس زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر

مجاز کی انقلابی شاعری میں اگرچہ تمام سیاسی مسائل نہیں ملتے۔ لیکن اسکی شاعری اپنے آہنگ اور اپنی نغمگی کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اسکی نظمیں "اندھیری رات کا مسافر"۔ "سرمایہ داری" اور "انقلاب" انقلابی ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں ؎

اُفق پر زندگی کے لشکرِ ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

چراغِ دیر، فانوسِ حرم، قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
نہ ناقوسِ برہمن ہے، نہ آہنگِ حدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(از "اندھیری رات کا مسافر")

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے
محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے
یہ آشوبِ ہلاکت فتنۂ اسکندر و دارا
زمیں کے دیوتاؤں کی کنیزِ انجمن آرا
ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے
زمانہ چیخ اٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہے
گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہے
مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے

(از "سرمایہ دار")

گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں
خون بن جائیگی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں
کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
اس قدر لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسمان پر خاک ہوگی، فرش پر رنگِ شفق
اور اس رنگِ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

(از "انقلاب")

قطعہ

(از جناب ڈپٹی ضیاء الاسلام صاحب۔ پی سی ایس)

کبھی اے جانِ شیریں پھر نظر آ!
بسی ہے آج تک دل میں تری یاد
یہ مانا تو ہے مِلکیت کسی کی
مری دنیا ہے پھر بھی تجھ سے آباد

چین کی تعمیرِ نو

از
جناب عبدالرؤف صاحب
(جامعہ ملیہ)

برطانیہ عظمیٰ میں اخلاقی، جسمانی، معاشی اور مذہبی اصلاحات کی مختلف تجویزوں پر بحث ہو رہی ہے۔ اسپین میں فرانکو کی حکومت پلوں اور ذرائع آمد و رفت اور خبر رسانی کو ٹھیک کر کے خانہ جنگی کے نقصانات کی آہستہ آہستہ اور بڑی دشواری کے ساتھ تلافی کر رہی ہے۔ فرانس میں "وِشی" کی حکومت نے ۱۹۴۱ء میں لڑائی کے نقصانات کو پورا کرنے کیلئے قانون بنائے۔ لیکن مارشل پیٹن کے ساتھیوں میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ حکومت نے جو کام کیئے وہ نقصانات کو پورا کرنے کیلئے کافی ہیں یا نہیں۔ وہاں پر ایک طرف تو اس بات کا مطالبہ ہے کہ نجی طور پر عمارتیں بنانے کا موقع زیادہ دیا جائے۔ اور دوسری طرف قوم کی طرف سے مکانات کی تعمیر کیلئے ایک ادارہ قائم کرنے اور علاقہ وار منصوبے کے مطابق مکانات تعمیر کرانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہالینڈ، بلجیم، ناروے اور وسطی یورپ میں بھی جنگ کی تباہیوں کو دور کرنے اور مستقبل کی تیاریوں کیلئے کچھ جد و جہد کی جا رہی ہے۔ لیکن چین کے باشندے (جو کہ باتوں سے کام کو زیادہ پسند کرتے ہیں) یورپ سے پانچ سال پیشتر ہی سے نہایت ہمت و استقلال کے ساتھ اپنے شہروں کو قدیم کھنڈرات پر تعمیر کر رہے ہیں۔

جون ۱۹۴۱ء میں شکاگو ٹائمز (Chicago Times) کے نمائندے مسٹر ایم، سی اولائے نے چنگ کنگ (Chung King) سے ایک بہت ہی بصیرت افروز تقریر نشر کی تھی جس میں انہوں نے بتایا کہ ہوائی حملے کے ختم ہونے کی اطلاع ملتے ہی چین میں مکانات وغیرہ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جاتا ہے۔ آج چین میں ہر جگہ جوان اور بوڑھے اپنے ان مکانوں کی تعمیر کر رہے ہیں جو کہ یا تو بارود سے اڑا کر کباڑ کے ڈھیر بنا دیئے گئے ہیں۔ یا آگ نے انہیں خاکستر کا ڈھیر بنا کر ناقابلِ شناخت بنا دیا ہے۔ چنگ کنگ کا شہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا کہ اس پر قدرت کی طرف سے کوئی مصیبت نازل ہوئی اور اس نے تمام شہر کو [illegible]

یورپ میں [illegible] جنگ سے پہلے [illegible] ہولے سالس کا [illegible] ہے۔ کوئی شخص [illegible] (Adriatic) [illegible] (Aberdeen) [illegible] (Cherbourg) [illegible] دو بارہ بنانے پہنچیگے۔ لیکن مغربی اقوام کیلئے خاموشی اور ہمت کے ساتھ کام کرنے اور مناسب تجویزیں سوچنے کی ایک بہت اچھی مثال چین میں موجود ہے۔ باوجود اس کے کہ چین کے ایک بہت بڑے حصہ پر جاپان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ جنوبی چین بلکہ تمام آزاد چین میں ہر جگہ لوگ از سرِ نو تنظیم و تجدید کرنے میں بڑی تندہی کے ساتھ مشغول ہیں۔

مشرقی دنیا میں ریاست حیدرآباد گذشتہ بیس سال سے منصوبے کے مطابق شہر بسانے، تنگ و تاریک محلوں کو صاف اور کشادہ حصوں میں تبدیل کرنے اور دوسری معاشرتی خدمات کی وجہ سے ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ ان کاموں کو انجام دینے کا سہرا اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن اور انکے بیدار مغز مدبر سر اکبر حیدری کے سر ہے۔ لیکن ہندوستان میں امن کے زمانہ میں اور چین میں جنگ کی حالت میں جو ترقی ہوئی ہے اسکے باہمی مقابلے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ چین میں صرف حکومت ہی نہیں بلکہ قوم بذاتِ خود بھی تعمیرِ نو کے کاموں میں چیونٹیوں کی طرح مصروف نظر آتی ہیں۔ جونہی جاپانی بمباروں نے شہروں کو تباہ کیا، ہزاروں چینی "چین کی امداد باہمی کی انجمنوں" میں شریک ہونے کیلئے ٹوٹ پڑے۔ آج کل آزاد چین کے تمام حصوں میں تقریباً دو ہزار انجمنیں موجود ہیں۔ اور ہر مہینے پچاس لاکھ پونڈ کی مالیت کی مصنوعہ چیزیں تیار کر رہی ہیں۔ چین کے ان تعمیری کاموں میں بالخصوص ادنیٰ طبقے کے لوگ بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ کسی تباہ شدہ ملک کی مادی تنظیم اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں رکھتی جب تک کہ ملک میں پیداوار کے مستقل ذرائع موجود نہ ہوں۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ چینیوں نے بہت ہی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں یہ کام شروع کیا تھا۔ ۴۰-۱۹۳۹ء کی سردیوں میں جبکہ مغربی محاذ کی جنگ صرف "پروپیگنڈے کی جنگ" کے نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ چینی سپاہی سردی سے مر رہے تھے اور ایسی حالت میں جبکہ نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے آزاد چین میں ہندوستان سے بھی سوتی کمبل نہیں بھیجے جا سکتے تھے۔ وہاں پر ایک فیکٹری بھی ایسی موجود نہیں تھی جس میں کمبل تیار کئے جا سکیں۔ آخر کار امدادی انجمنوں نے ۱۹۴۰ء کی سرگرمیوں کے شروع میں چار لاکھ کمبل تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ پہلے انہوں نے

تے کی مشینیں بنائیں تاکہ سوت اور اون بنائی کے ساتھ زیادہ تعداد میں [illegible] کام لے شروع ہوا۔ پھر شروع کیا گیا تھا کہ مغربی زبانوں میں Speak [illegible]) میں اس سے پہلے کبھی اسکی نظیر نہیں ملتی۔ کیمیاوی رنگ دستیاب نہ [illegible] ہونے سے وہ لوگ مغربی چین کی "مشنری یونیورسٹی" کے "کیمیکل ڈیپارٹمنٹ" کے مشورہ پر قدرتی رنگوں کا استعمال کرتے تھے۔ اس کام میں مدد دینے کے لئے ہزاروں عورتوں نے بھی کاتنا سیکھ لیا۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں تقریباً ایک ہزار کمبل یومیہ تیار ہونے لگے۔ یہ چینیوں کی انتظامی قابلیت اور احساس ذمہ داری کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ اس سلسلہ میں تمام ضروری چیزوں کو مزدور خود ہی مہیا کرتے اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تمام کاروبار چلاتے ہیں۔ اسکے بعد ان امدادی انجمنوں سے صنعت کا دائرہ وسیع کرنے کیلئے رفتہ رفتہ اور بہت سی دوسری چیزیں بھی بنانی شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ دیا سلائیوں سے لیکر دخانی کشتیاں تک تیار کی جانے لگیں۔ کام میں سہولت کی غرض سے کچے مال کی خریداری اسکو کارخانوں تک پہنچانے اور بازار میں فروخت کرانے کا کام انجمن کے مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سوت اون وغیرہ کی کتائی اور بنائی کا کام جاری ہے۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ وہ لوگ کیمیاوی صنعتوں کی تیاریوں میں بھی مشغول ہیں۔ کوئلے اور سونے کی کانوں میں بھی کھودائی جاری ہے۔ نیز کھانے پینے کا سامان اور مشین کے پرزے تیار کرنے کے علاوہ وہ چھپائی اور نقل و حمل کا انتظام بھی بڑی خوش اسلوبی سے کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک قابل لحاظ چیز ہے کہ جنگ کی دشواریوں کے باوجود جنوبی چین میں صنعتی تنظیم کی یہ عظیم الشان مہم اس قدر کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

محکمہ حفظانِ صحت

یہ عظیم الشان کامیابی ناممکن ہوتی۔ اگر کام کرنیوالوں کی صحت کا پوری طرح خیال نہ رکھا جاتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی بہت کچھ کیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں نانکنگ (Nan king) میں ایک بہت بڑا ہسپتال کھولا گیا۔ جس نے صحت عامہ اور دواسازی کے سلسلے میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ ایک میڈیکل کالج بھی قائم کیا گیا۔ اور "نیشنل فیر نطائن سروس" کو جو کہ اب بین الاقوامی شہرت کی مالک ہے۔ رفتہ رفتہ ترقی دی گئی۔ چین کی تنظیمی جدوجہد کے سلسلہ میں ملک کے تمام حصوں میں صحت گاہوں کا قیام بھی شامل ہے۔ چنانچہ اب آزاد چین میں سب ملا کر تقریباً سات سو صحت گاہیں موجود ہیں۔ بہت سے عوامی شفاخانے دشمن بھی قائم کئے گئے ہیں۔ وہ بے شمار خانماں برباد جو جاپان کی شدید بمباری کی وجہ سے دوسرے شہروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے صحت عامہ کے لئے زبردست خطرہ کا سبب بن گئے تھے۔ اور اگر دور اندیشی کے ساتھ فوراً ہی اس خطرہ کا مقابلہ نہ کیا جاتا تو ملک میں ٹائیفائڈ کی ایک عالمگیر وبا پھیل جاتی اور اس طرح لاکھوں آدمیوں کی جانیں ضائع ہو جاتیں۔ ساڑھے چار سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ ہزاروں ڈاکٹر اور نرسیں ہسپتالوں اور نقل پذیر تجربہ گاہوں میں اور صحت عامہ کی محافظ جماعتوں کی شکل میں ان خانماں بربادوں کی خدمت اور دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ انھوں نے پچیس لاکھ آدمیوں کے چیچک کے اور دس لاکھ آدمیوں کے ہیضہ، خناق، گردن توڑ بخار اور طاعون کے ٹیکے لگائے۔ ٹائفس (Typhus) کی انسدادی کارروائیوں کے سلسلے میں تقریباً ہزاروں چینیوں کے کپڑوں میں سے جوئیں دور کی گئیں۔ خاص طور سے برما روڈ پر جہاں پہلے سڑک بنانے والے مزدور اور موٹر ڈرائیور آئے دن ملیریا کے شدید حملوں کا شکار ہوا کرتے تھے۔ "اینٹی ملیریا کمیشن" (Anti Malaria Commission) نے نہایت شاندار کام کیا۔ اس کمیشن کی تحقیقات کیلئے مختلف مقامات پر اسٹیشن اور کلینکس بھی بنائے گئے ہیں۔ چین میں ملیریا کی روک تھام کیلئے جو کچھ کیا گیا ہے اسکی کامیابی ایک بڑی حد تک ان مفید مشوروں کی مرہون منت ہے جو امریکہ کے حفظان صحت کے محکمہ نے وقتاً فوقتاً یہاں کے ہیلتھ آفیسروں کو دیئے۔

لندن پر بمباری کے بعد ہم ان دشواریوں کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں جو چینیوں کو دوران جنگ میں حفظان صحت کے انتظامات میں پیش آتی ہونگی۔ چین پر تقریباً ساڑھے چار سال سے بمباری کی جا رہی ہے۔ اور ملک کا ایک بہت بڑا حصہ بھی جینیوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ لیکن اسکے باوجود بھی وہ نہایت مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور استواری سے حفظان صحت کے محکموں کو حیرت انگیز تیزی سے بڑھا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جب جاپانی بمباری کی وجہ سے نانکنگ ناقابل سکونت ہو گیا تو "سنٹرل ہسپتال" کو وہاں سے چنگ کنگ (Chungking) میں منتقل کر دیا گیا۔ ابھی حال ہی میں تین اور شہروں میں بھی ہسپتال کھولے گئے ہیں ہسپتالوں کے سٹاف میں بہت سے ایسے محب وطن شامل ہیں جو نہایت انہماک سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ طبی مدارس کے طلباء جونہی اپنی تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں امداد کیلئے بلا لئے جاتے ہیں۔ "پبلک ہیلتھ پرسنل ٹرینڈ انسٹی ٹیوٹ" (Public Health Personnel Trained Institute) میں طبی محققین، صحت عامہ کے محافظین، ڈاکٹروں، نرسوں، دائیوں اور دواسازوں کو صحت عامہ کے بارے میں جدید تجربوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ ابھی اس درسگاہ میں سرجری آلات، ادویات اور دوسری ضروری چیزوں کی بہت کمی ہے۔

تھے جہاں ملک کی تاریخ قحط اور وباؤں کے واقعات سے بھری [illegible] ہے۔ قریب قریب ہر سال چین کے لاکھوں باشندے انہی قحطوں کی بدولت موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ یہ قحط یا تو خشک سالی کے سبب سے ہوا کرتے تھے یا دریاؤں میں سیلاب آ جانے سے۔ ریشمہ، تاشعش اور ملیریا کی وبائیں بھی آبادی کے ایک بڑے حصہ کو ختم کر دیتی تھیں۔ ان طبی درسگاہوں کے فارغ التحصیل طبیب اور ڈاکٹر ابھی زیادہ تجربہ کار نہ تھے کہ ان پر یکایک لاکھوں خانماں بربادوں کی دیکھ بھال اور علاج معالجہ کا بار پڑا۔ انہیں ہزارہا زخمی سپاہیوں اور بے شمار شہریوں کی جو جاپان کی اندھا دھند بمباری سے زخمی ہو گئے تھے مرہم پٹی کرنی پڑتی تھی۔

میڈیسین کالج چنگٹو کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کلبرن (Dr. Kilborn) کا بیان ہے کہ چین میں مغربی طریقہ علاج ۱۸۳۵ء سے رائج ہوا۔ اسکی ابتدا ایک امریکن ڈاکٹر "پیٹر پارکر" (Peter Parker) نے کی تھی لیکن کرسچین مشن نے اسے تمام ملک میں پھیلا کر بام ترقی پر پہنچایا۔

۱۹۳۷ء میں جب جاپان نے چین پر حملہ کیا اس وقت چین میں ۲۶۸ مشن ہسپتال تھے۔ جن میں ۸۶۰ ڈاکٹر اور ۵۱۴۵ نرسیں کام کرتی تھیں۔ ان ہسپتالوں میں ۲۴۳۰۰۰ داخلی مریض اور ۴۳۰۰۰۰۰ خارجی مریض زیر علاج تھے۔ لیکن بعد میں جنگ کی وجہ سے ان میں سے بہت سے ہسپتال اور کالج بند کر دینے پڑے۔ اور بہت سے جاپانی بمباری سے تباہ ہو گئے۔ طبی کالج اور مدرسے یونن (Yunnan) کویچو (Kweichow) یا زیچوان کے صوبوں میں منتقل کر دیئے گئے۔ اس نقل مکانی سے اگرچہ کام کرنے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا پھر بھی یہ جد و جہد مناسب طریقہ پر جاری رہی۔ اور صحت عامہ کے کاموں کو ان تمام مقامات پر ترقی دی گئی جہاں پر پہلے سے اس سلسلے میں کچھ تھوڑا سا کام کیا گیا تھا۔ نیز ملک میں مجروحین کا علاج اور امداد کرنے والی انجمنوں کی بھی مکمل طور پر نئی تنظیم کی گئی۔ لیکن علاج و معالجہ کے سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ادویات کی کمی ہے۔ چین سے کچھ دوائیں مثلاً ایفیڈرا (Ephedra) اور ریوند چینی وغیرہ تمام حالت میں باہر بھیجی جاتی ہیں لیکن جنگ سے قبل بھی باہر سے دوائیں منگائے بغیر ملک کی ضروریات پوری نہ ہوتی تھیں۔ آج کل بھی وہ بالخصوص کونین، اینٹی سپٹک (مصفی) اور دوسری جدید کیمیاوی طریقہ پر بنی ہوئی دوائیں کے لئے دوسرے ملکوں کا دست نگر ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک صرف برما روڈ کے راستے سے چین میں یہ دوائیں پہنچائی جا سکتی تھیں۔ لیکن اس سڑک پر جاپانیوں کا قبضہ ہو جانے سے یہ راستہ بھی بند ہو گیا۔ نیز ملک میں تعلق ہوائی جہازوں

[illegible] اور ہسپتال بھی [illegible] تجربہ سے ماہرین [illegible] کس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

چینی طلباء کی زندگی

جنگ کی ان تباہ کاریوں کے باوجود چینی حکومت نے ملک کی اعلیٰ تعلیم بھی استقلال کے ساتھ جاری رکھی ہے۔ اس سے اسکی بیدار مغزی اور دور اندیشی کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے یہ اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کے بعد ملک کی تعمیر و تنظیم کا اہم کام چین کے ہوشیار اور تجربہ کار اشخاص کے ہاتھ میں ہوگا۔ چینی حکومت کی یہ بڑی دور اندیشی ہے کہ اس نے اس نئی پود کو جنگ میں شریک ہونے سے روک دیا ہے۔ اور یونیورسٹی کی تعلیم کے جاری رکھنے میں ہر ممکن کوشش و امداد کی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ چینی یونیورسٹیوں کو بے پناہ بمباری کی وجہ سے بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا انہوں نے اپنے طلباء کی تعلیم کو اسی بے سر و سامانی کی حالت میں جاری رکھا۔ حتیٰ کہ گذشتہ چند مہینوں میں بہت سے کالجوں نے کوہستانی علاقہ کے غاروں میں پناہ لے کر اپنے طلبا کو تعلیم دی۔ ڈاکٹر رائے (Dr. Ray) نے جو کہ چنگٹو یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر ہیں ابھی حال ہی میں ایک تقریر نشر کی ہے جس میں انہوں نے معائنہ کے بعد ایسے بہت سے سکولوں کے حالات بیان کئے ہیں جن میں ہزاروں طلباء کو ۳۰، ۴۰ فٹ گہرے غاروں کی [illegible] ڈاٹ کی چھت لگا کر رکھا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ لندن یونیورسٹی میں "بیکرلو" (Bakerloo) لائن کے بند سٹیشنوں پر پروفیسروں کے لیکچر ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر رائے نے بتایا کہ کس طرح ایک ایسے مدرسے میں پڑھائی کے کمرے جن میں طلباء کے لئے تکیہ دار بنچیں اور استادوں کے لئے کرسیاں اور میزیں بھی موجود تھیں۔ سب کچھ چکنی مٹی سے بنائے گئے تھے۔ چنگٹو یونیورسٹی میں دوسرے مقامات کی آٹھ یونیورسٹیوں کے طلبا کی تعلیم وغیرہ کا انتظام کیا گیا ہے۔ طلباء کی کثرت اور جگہ کی قلت کی وجہ سے ایک کمرے میں آٹھ آٹھ لڑکے رکھے گئے۔ ان کے سونے کیلئے [illegible] تختے لگا دیئے گئے۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں [illegible] سب سے زیادہ [illegible]

بجائے کے دوسرے طلبا کو ایک ایسے بیٹھے کے کمرے جو ایک سوئے گھر سے میں شریک کر دیا گیا تھا۔ ایمرجنسی صوبہ کی یونیورسٹی میں انہیں رہائشی مکانوں میں ٹھہرا دیا گیا تھا۔

چینی طلبا عام طور پر فوجی وردیاں پہنتے ہیں۔ وہ اپنے گھر والوں سے بہت دور رہتے ہیں۔ اور آج کل بہت تنگدستی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں کئی بار ان کے بہت سے کپڑے اور کتابیں بھی ضائع ہو گئی ہیں۔ لیکن بلحاظ ذہنی قابلیت کے وہ بہت ہوشیار ہیں۔ وہ اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہیں۔ ان کے وقت کا بیشتر حصہ ملک کی اصلاح و تعمیر کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ ملک میں چاول کی قیمت بڑھ جانے سے غذا کی بہت قلت ہو گئی ہے۔ لیکن وہ اس تکلیف کو بھی غیر معمولی ہمت کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں محکمہ تعلیمات بھی طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اور ان کی تعلیمی ترقی کیلئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر رائٹ“ کا یہ نقطۂ نظر (جس پر چینی حکومت عمل کر رہی ہے) غلط نہیں ہے کہ ”طلبا فوج میں داخل ہونے کے بجائے اگر یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں تعلیم مکمل کریں تو وہ قوم کیلئے زیادہ مفید اور قابل قدر ثابت ہوتے ہیں“ چین کو نہ صرف جنگی جد و جہد ہی کیلئے بلکہ ملکی تنظیم کیلئے بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو جدید طریقوں اور اصولوں سے واقف ہوں۔ اور ان میں فنی قابلیت بھی ہو۔ چھٹیوں کے زمانے میں جو طلبا فوجی تربیت کیلئے موزوں نہیں سمجھے جاتے وہ دوسرے تعمیری کاموں کیلئے اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے جنوبی شنسی (Shensi) کو زخمیوں، سڑک بنانے والے مزدوروں اور جنگ کے آفت زدہ خاندانوں کی امداد کرنے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ کچھ طلبا ایک طرف تو لوگوں میں حفظان صحت کے اصولوں اور عام معلومات کی اشاعت کی غرض سے اور دوسری طرف مختلف قبائل کے لوگوں کے مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج کا مطالعہ کرنے کیلئے چین کے دور دراز صوبوں کا سفر کرتے ہیں۔ ملک میں ریلوں اور بسوں وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اکثر موقعوں پر انہیں منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے سینکڑوں میل کا سفر پیدل ہی طے کرنا پڑتا ہے۔ جو طلبا ”اسٹوڈنٹ کرسچین موومنٹ“ (Student Christian Movement) سے تعلق رکھتے ہیں وہ عیسائیت کے اصولوں کی تبلیغ کی کوشش کرتے ہیں۔ غرضیکہ طلبا کی یہ خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ”ڈاکٹر رائٹ“ ایک طالبہ کا جو چٹائی کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اسکے پیروں کے تلوے چھالوں سے بھرے پڑے تھے اور اس کو چلنے میں ہر ہر قدم پر تکلیف ہو رہی تھی تاہم اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پیدل چلنے کا فیصلہ کر کے کت میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس لڑکی کو چین کی نئی پود کے نمونہ پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ابتک ہم نے چین کی مادی ترقی کی کچھ مثالیں دی ہیں۔ لیکن مثالوں کے علاوہ مختصر طور پر ان اسباب کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنکی بنا پر یہ شاندار کامیابیاں ممکن ہوئیں۔ اس سلسلہ میں ہماری نظر سب سے پہلے ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی پر پڑتی ہے جسکی بدولت بمباری سے تباہ شدہ شہروں اور گاؤں کو بہت جلد اور نہایت عمدگی کے ساتھ دوبارہ بسا لیا جاتا ہے۔ ”کمانڈنٹ اسکارا“ (Commandant Escarra) نے جو کہ آج کل آزاد فرانسیسی فوجوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں اپنی مشہور چینی کتاب (China Then and Now) میں ۲۸۵۲ ق م سے موجودہ زمانہ تک یعنی چین کی تقریباً ۵ ہزار سالہ تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گذشتہ پانچ چھ سال میں صنعتی تنظیم ملک کے قریب قریب ہر حصہ میں پھیل گئی ہے۔ اور اس میں نہایت ہی غیر معمولی رفتار کے ساتھ ترقی ہو رہی ہے۔ صنعتی تنظیم کی یہ کوششیں ایک طرف تو قومی حکومت کا فرض سمجھی گئی ہیں اور دوسری طرف صوبائی حکومتوں پر انکی ذمہ داری آتی ہے۔ تقریباً دس سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ مجلس اقوام کے توسط سے غیر ملکی مشیروں کو چین میں مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے مشورے سے ایک معاشی ادارہ قائم کیا گیا جس نے موجودہ حکومت کی نگرانی میں ماہرین فن کی ہدایتوں کے مطابق کام شروع کیا۔ اسکے بعد قوانین اور محکمہ عدالت پر نظر ثانی کی گئی۔ اور جدید ضروریات کے مطابق ان میں مناسب تبدیلیاں کرنے کے بعد نئے معاشرتی اور تعزیری قوانین پر باضابطہ عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔

تعلیم

زمانہ جنگ کے ناساعد حالات کے باوجود چین میں طریق تعلیم کو جدید نظریوں کے مطابق دوبارہ مرتب کیا گیا ہے۔ جاپانی حملہ کے وقت چین میں ۲ لاکھ ۶۰ ہزار پرائمری سکول تھے جن میں طلبا کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تھی۔ اور تین ہزار ہائی سکول تھے جن میں پانچ لاکھ اسی ہزار طلبا تعلیم پاتے تھے۔ بیاسی یونیورسٹیاں اور آزاد کالج تھے۔ ان کے علاوہ ۲۹ سکول صنعت و حرفت اور ۴۰ ہزار سکول بالغوں کی تعلیم کیلئے مخصوص تھے۔ ”کمانڈنٹ سکارا“ نے خاص طور سے ان جدید یونیورسٹیوں کی تباہی پر بے حد قلبی اذیت کا اظہار کیا ہے جنہیں جاپانیوں نے دیدہ و دانستہ نہایت بیدردی سے تباہ و برباد کر دیا ہے۔ انہیں چینیوں نے بڑی محنت اور مسلسل کوششوں کے بعد تعمیر کیا تھا۔ ان تمام یونیورسٹیوں میں ٹینٹسن (Tientsin) میں نانکائی یونیورسٹی سب سے بڑی

[illegible] ہے بجا طور پر [illegible] کی [illegible]
[illegible] اس حیثیت سے ان کو کوئی خاص خرچ [illegible]
[illegible] نہیں ہو سکتی۔

نقشہ کے مطابق شہروں کی تعمیر

چین میں عالمگیر تباہی کی وجہ سے مستقبل کیلئے شہروں کی تعمیر پر بھی غور کرنا ضروری تھا۔ پیکنگ، نانکنگ، سین تو، کینٹن، ہانگچو اور چینی شنگھائی وغیرہ شہروں کو نقشے کے مطابق بسانے کی تجویزیں پہلے سے سوچی جا رہی تھیں۔ اور کہیں کہیں ان پر عمل بھی شروع کر دیا گیا تھا لیکن جاپانی حملہ (جولائی ۱۹۳۷ء) کے بعد سے یہ کام بہت تیزی کے ساتھ شروع کر دیا گیا۔ ایک ماہر مبصر کا بیان ہے کہ چین میں اس وقت اس قدر شہر زیر تعمیر تھے جن کی مثال دنیا کے کسی ملک کی تاریخ میں کبھی نہیں ملتی۔ اگر صرف جنگ درمیان میں حائل نہ ہوتی تو چین کی اس ترقی کا ریاست حیدرآباد میں نقشہ کے مطابق شہر بسانے کی اسکیم، گندی اور تاریک گلیوں کی صفائی۔ گنجان آباد علاقوں کی کشادگی مزدور طبقہ کے معیاری مکانوں کی تعمیر۔ گندے پانی کی نکاسی اور صاف پانی مہیا کرنے کے اہتمام سے مقابلہ کرنا بہت دلچسپ مطالعہ ہوتا۔ ریاست حیدرآباد میں یہ تمام اور ان کے علاوہ اور بہت سی مفید اصلاحیں جو کہ ملک میں امن اور ذہین و روشن خیال نظام کے حسن انتظام کی بدولت عمل میں آئیں۔ اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ایک مشرقی ملک موجودہ جنگ کے خطرے سے محفوظ ہونیکی صورت میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔

چین بھی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۷ء تک جدید سڑکوں کی تیاری میں ریاست حیدرآباد کی طرح شاہراہ ترقی پر بڑی تیزی کے ساتھ گامزن تھا۔ اسی زمانہ میں تار ٹیلیفون اور وائرلیس کو بھی ملک میں بڑے وسیع پیمانہ پر پھیلا دیا گیا۔ ملک میں ۶۰ ہزار میل سے زیادہ لمبی سڑک نکالی گئیں۔ بہت سی ریلوے لائنوں کو بھی مکمل کیا گیا جو کہ صرف چینی انجینیروں ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ غرضکہ اس وقت چین نہایت ہی اہم اور بنیادی تبدیلیوں کے دور سے گذر رہا تھا۔ وہ تمام شہر اور قصبے جو طول مسافت کی وجہ سے ہزاروں سال سے ایک دوسرے سے جدا تھے اور جس کے طے کرنے میں کئی کئی ہفتے اور مہینے صرف ہو جاتے تھے۔ موٹر بسوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے ملا دیئے گئے اور یہ تمام دور و دراز فاصلے ان نئی سڑکوں پر موٹروں کے ذریعہ صرف چند گھنٹوں میں طے کئے جانے لگے۔ کمانڈنٹ اسکارا کا بیان ہے کہ چین کے محکمہ فضائی (China National Aviation Carporation) کے ہوائی جہازوں میں ۱۹۲۹ء میں ۴۳۸ مسافروں نے اور ۱۹۳۶ء میں

زراعتی تعلیم

[illegible]

آخر میں چین کی زراعتی تعلیم [illegible] غالباً بے محل نہ ہوگا۔ زراعت کی تنظیم اور [illegible] کی انجمنیں بنائی گئی ہیں۔ چینی کاشتکاروں کو یہ سکھایا [illegible] طرح اپنی کپاس اور چائے کی فصلوں کو اگانا اور بڑھانا ہے۔ شکر، [illegible] اور پارچہ بافی وغیرہ کی صنعتوں میں جن کی بنیاد زراعت پر ہے خاص طور سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ غرضکہ چین اصلاحات کے اس دور سے گذر رہا تھا جبکہ اس پر یکایک ایک ناگہانی مصیبت جاپانی حملہ کی شکل میں نازل ہوئی۔

جو لوگ اس سلسلہ میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں پروفیسر اسکارا کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ چین کی تاریخ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح اس میں واقعات کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اور عہد تاریخ سے اس وقت تک اسکی مربوط تاریخ ملتی ہے۔

چین میں شاہی خاندان وجود میں آئے اور مٹ گئے۔ لیکن یہاں کے باشندے اپنی فطری صلاحیتوں اور غیر معمولی جفاکشی کے لحاظ سے ابھی تک اسی سطح پر قائم ہیں جس پر اپنے اولالعزم آباد اجداد کے زمانے میں تھے پروفیسر اسکارا کے الفاظ میں "چینی تہذیب" ہمیشہ اپنی امتیازی خصوصیات کی حامل رہی ہے۔ اور اس میں اب تک کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ قدیم اخلاقی اصول بھی ہمیشہ سے اسی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ ملک میں اندرونی خلفشار اور سیاسی تبدیلیوں کے باوجود ان بلند اخلاقی اصولوں اور قدیم روایات پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑا۔ چینیوں نے اپنی ان روایات کے تحفظ کے لئے بڑے سے بڑے خطرہ کا مقابلہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ چین اس جنگ کے خاتمہ پر اپنی قدیم اور جدید تہذیب کے امتزاج سے پھر اپنی شاندار ماضی کی تجدید کریگا۔

(ترجمہ از ایشیاٹک ریویو)

آج اور کل

از جناب جاں نثار اختر

کل کریں گے منعقد بزمِ چمن　　ڈھونڈھ کر لائیں گے صدرِ انجمن
کل سُنیں گے نغمہ ہائے جوئبار　　آپ بھی ساحل پہ چھیڑیں گے سِتار
کل پئیں گے لالہ و گل میں شراب　　سُرخ رو انکھوں میں لہکیں گے گلاب
کل چھیڑیں گے بربط و طاؤس و نَے　　عرش کے تاروں کو چھو جائے گی لَے
کل کریں گے شوق کا ساماں بہم　　خود کو بھر دیں گے جوانی کی قسم
پھر سے ہوگا ماہ پاروں کا ہجوم　　ٹوٹ آئیں گے مہ و مہر و نجوم

ہر طرف چھا جائیں گی رعنائیاں
زندگی لے گی حسیں انگڑائیاں

کل کریں گے ہر طرح کے تجربے　　طے کریں گے خیر و شر کے مسئلے
کل کریں گے کوششیں پرواز کی　　چھو سکیں گے لہر تک آواز کی
کل مہ و خورشید پر پھینکیں گے دام　　قبضۂ انساں میں ہونگے صبح و شام
دسترس ہوگا مہ و مریخ پر　　نو بنو تاروں کو چُومے گی نظر
کل اُڑائیں گے سِتاروں کا غبار　　کہکشاں بن جائے گی اک رہگذار
برق پاروں کا تراشیں گے جگر　　تجربے پیہم کریں گے رُوح پر

جان لیں گے موت کا رازِ نہاں
زندگانی کو کریں گے جاوداں

آج تو لیکن ہے حشرِ کارزار　　چیختی ہے زندگی دیوانہ وار
آج خطرے میں ہے ناموسِ جہاں　　جُھک رہا ہے آدمیت کا نشاں
آج کیسی غفلتیں، کیسا ہراس　　آج تو مرنے میں ہے جینے کی آس
آج تو شمشیر کرنا ہے علم　　موت کے سینے پہ رکھنا ہے قدم
موڑنا ہے زیست کی پتوار آج　　آگ کا دریا کریں گے پار آج
چاک کرنا ہے گھٹاؤں کا نقاب　　ظلمتوں سے چھیننا ہے آفتاب

رقص ہاں تیغوں کی جھنکاروں پہ رقص
رقص پیہم خون کے دھاروں پہ رقص

کتبہ

(از جناب غلام عباس صاحب)

نوٹ:۔ غلام عباس صاحب نے یہ افسانہ دہلی لٹریری سوسائٹی کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا جو ہارڈنگ لائبریری دہلی میں منعقد ہوا تھا

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل دور پُر فضا باغوں اور پھلواڑیوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں۔ جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی سرگرمی اور تہما کہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور کشادہ سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے۔ ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو۔ اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت۔ سڑکوں پر درختوں کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ عالم تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی سڑک پر سے گزری تھی۔ جہاں جہاں پانی پڑا تھا۔ ابخرات اُٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک گریڈ نمبر ۲، معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ تانگے میں سوار ہو کر گھر جانے کی لذت [illegible] چار پانچ ہی روز نصیب ہوتی تھی۔ اور آج کا دن بھی انہیں [illegible] دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلاف معمول تنخواہ کے آٹھ دس روز بعد بھی اس کی جیب میں [illegible] کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ [illegible] اس کی بیوی بچوں سمیت میکے چلی گئی تھی شریف حسین [illegible] کر رہا تھا۔ کیونکہ گھر میں وہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ دن

[illegible] حالت [illegible] کہ جب جاتے گھر جا [illegible]

تھوڑی دیر میں [illegible]

اور دوسرے کلرکوں کی ٹولیاں گروں سے [illegible] نیم آستینوں کی قمیص، خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے [illegible] رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے۔ رنگدار چشمے لگائے [illegible] بابو چھاتا کھولے منہ میں بیڑی، بغل میں فائلوں کے گٹھے۔ [illegible] فائلوں کو وہ اپنے افسروں کی خوشنودی کے لئے قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر میں نہیں سلجھا سکے۔ ممکن ہے گھر میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے۔ مگر گھر میں انہیں [illegible] نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے [illegible] سوٹ پہنے اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کا التزام کئے ہوئے، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ گو ان سب کی مادری زبان ایک تھی۔ مگر وہ [illegible] غیر زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس زبان میں باتیں کرنے پر آ سکتی ہے۔ بلکہ یہ کہ انہیں دن بھر اپنے افسروں سے اسی زبان میں باتیں کرنی پڑتی تھیں اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اسکی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر [illegible] بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں۔ اور ایسے [illegible] گھاگھ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک استعمال کرنے کے [illegible] پڑ گیا تھا۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں کرسی سے ذرا [illegible] مسندوں سے متواتر چپکے رہنے کے باعث ان کے [illegible] بالوں کی جڑیں پھوٹ نکلی تھیں۔ جنہوں نے [illegible] اختیار کر لی تھی۔ ہر شخص افسروں کی [illegible] نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں [illegible] اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ شہر کے قریب پہنچ [illegible] اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جانب [illegible]

[illegible] کے گرد گرد ہر وقت ہجوم کو کہنہ فرش اور سستا مال بیچنے والوں [کی دکانیں] سجا کرتی تھیں۔ اور میلہ سا لگا رہتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر قسم کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُرلطف [بات] تھا۔

شریف حسین لکچر بازیگروں، سپیروں، تعویذ گنڈے بیچنے والوں، پرانے کپڑے، تصویریں اتار دینے والے فوٹوگرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک دو منٹ رُکتا۔ سیر دیکھتا اُس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں جہاں آئے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آتیں۔ ان میں بعض ایسی [تھیں جو] اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی۔ مگر ان کباڑیوں [کے ہاتھ] پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی [نہ جا]تی تھی۔ اور یا اُن کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار [ہو گئی] تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان۔ ٹیبل لیمپ۔ گھڑیاں۔ بیکار بیٹریاں اور بلب۔ گراموفون کے کل پرزے۔ جراحی کے آلات۔ بستر۔ بھس بھرے ہرن۔ پیتل کے لم ڈھینگ۔ مہاتما بدھ کا نیم قد مجسمہ ......

ایک دکان پر اسکی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی۔ جو معلوم ہوتا تھا کہ عہد مغلیہ کے کسی مقبرہ یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اُس کا طول کوئی سوا فٹ تھا۔ اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اُس نے محض یہ دیکھنے کیلئے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی

تین روپے! کباڑی نے اُس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اُسے اسکی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چل دیئے؟ آپ بتایئے کیا دیں گے؟"

شریف حسین رُک گیا۔ اُسے یہ ظاہر کرتے شرم سی محسوس ہوئی کہ اُسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اور اُس نے محض اپنے شوق تحقیق کو پورا کرنے کے لئے قیمت پوچھی تھی۔ اُس نے سوچا دام اس قدر کم بتاؤ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ [illegible]

"[illegible] روپیہ دیں گے" یہ کہکر شریف حسین [illegible] کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ مگر اس نے اسکی [illegible] بھی نہ دی۔

"ابھی سنئے تو۔ کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں... اچھا لے جایئے!"

شریف حسین اپنے پر پیچ و تاب کھانے لگا۔ کہ بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اُس نے مرمریں ٹکڑے کو اُٹھا کر دوبارہ جانچ پڑتال کی کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اُسکے ذہن میں آیا۔ کیا عجب خدا اُس کے دن پھیر دے اور وہ کلرک گریڈ نمبر ۲ سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے۔ اور اسکی تنخواہ چالیس سے بڑھکر چار سَو ہو جائے۔ یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرکی ہی سہی۔ پھر اُسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی بڑا مکان لے لے۔ اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے پھاٹک کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اُس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا اور یا اب اُسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصہ سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا۔ اور اگر وہ اسے نہ خریدتا تو سخت غلطی کرتا۔

ملازمت کے شروع میں اُس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعیِ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مزاج میں سکون آ چلا تھا۔ کہ یکبارگی اس مرمریں ٹکڑے نے پھر سے اُسکے خیالوں میں ہلچل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آیند خیالات کئی دن تک اسکے دماغ میں چکر لگاتے رہے۔ اُٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھکر۔ یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہونے پر اُسے تنخواہ ملی۔ تو اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس مرمریں ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگتراش کے پاس لے گیا۔ جس نے بہت [illegible] سے اُس کا نام اس پر کندہ کر دیا۔ اور کونوں میں [illegible] بیل بوٹے بنا دیئے۔

اس سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھکر اسے ایک عجیب [illegible] لذت کا احساس ہوا۔ [illegible] پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا۔ گھر آتے ہوئے بازار میں کئی مرتبہ اس [illegible] کو کتبہ پر سے اُس اخبار کے [illegible] ہٹا کر [illegible] جس میں سنگتراش نے اُسے لپیٹ دیا تھا۔

[illegible] سے ایک عطر اور ڈال سے۔ مگر ہر بار ایک حجاب ایک نامعلوم ڈر جیسے اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اُس نے اخبار اُتار پھینکا۔ اور نظریں کتبہ کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل پر اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے مکان کے دروازے کے باہر اتنی جگہ بھی نہیں کہ اُس پر کوئی بورڈ لگایا جاسکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو ایسے کتبے یہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لئے تو بڑا سا مکان چاہیئے۔ جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا۔ اور سوچنے لگا کہ فی الحال اِس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصّہ مکان میں دو کوٹھریاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک کوٹھری میں تھی مگر اُس کے کواڑ نہیں تھے آخر اُس نے کتبے کو اُسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ تھکا ہارا دفتر سے واپس آتا تو سب سے پہلے اسکی نظر اُس کتبہ پر پڑتی۔ اُمیدیں اُسے سبز باغ دکھاتیں۔ اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اُس کا کوئی ساتھی کسی معاملہ میں اُسکی رہنمائی کا جویاں ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا۔ تمنائیں اس کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتیں۔ افسر کی ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اُسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اُس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں میں ہی مست تھا۔ نہ دوستوں سے ملتا نہ کھیل تماشوں میں حصّہ لیتا۔ رات کو جلدی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آجاتا۔ اور سونے سے پہلے کئی کئی گھنٹے عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں بسر کرتا۔ مگر اُن کے آنے کی دیر تھی کہ اور اور فکروں نے اُسے گھیر لیا۔ اور مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑنے لگیں۔

کتبہ سال بھر تک اُسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اُس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر اُسکی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اُس کے بڑے بیٹے کی عمر چار برس کی ہوگئی تھی اور اُس کا ہاتھ اُس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ [illegible] کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

سالہا سال [illegible] سردیوں کا موسم آیا تو اسکی بیوی کو گرم کپڑے [illegible] کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ بیوی نے کتبہ کو نکال کر کاٹھ کے اُس [illegible] میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے کار [illegible] ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور ردّی چیزیں پڑا رہا کرتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھکر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسکی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا۔ جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا۔ اور اُسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اُسے ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اُس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبہ کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اُس کے افسروں نے اسکی دیانتداری اور پرانی کارگذاری کا خیال کر کے اُسے تین مہینے کے لئے گریڈ نمبر ا کے ایک کلرک کی جگہ دیدی۔ جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اُسے یہ عہدہ ملا۔ اسکی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا۔ بلکہ پیدل ہی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اُسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

دوسرے مہینے اُس نے نیلام گھر سے ایک چھوٹی سی خوبصورت میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اُسے پھر کتبہ کی یاد آئی۔ اور اُس کے ساتھ ہی اسکی سوئی ہوئی اُمنگیں جاگ اُٹھیں۔ اُس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کاٹھ کے صندوق میں سے کتبہ کو نکالا، صاف کیا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اُس کے لئے نہایت کٹھن تھا۔ کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگذاری دکھانے کے لئے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا دن کو دن سمجھتا نہ رات کو رات۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اُسے اُس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اُس کا دل بجھ جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے ...... ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے ...... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے۔

گر تین مہینے کے بعد نہ تو اُس کلرک نے چھٹی کی میعاد بڑھوائی اور نہ وہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پہ آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گذرے وہ اُسکے لئے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ اُس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا۔ نہ ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ تھوڑی سی خوشحالی کی ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اُسے اپنی حالت پہلے سے ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اُسے راہ راست پر لے آئے۔

اب اُس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا۔ چھوٹا دوسری میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی اور سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اُس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھکر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ کے گر جانے کا خدشہ تھا۔ اور پھر اُس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی۔ اس لئے لڑکے نے اُسے اُٹھا کر پھر اُسی بے کواڑ کی الماری میں رکھدیا۔

سال پر سال گذرتے گئے۔ اِس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر، کبھی صندوق کے تھاک پر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے صندوق میں۔ ایک دفعہ کسی نے اُٹھا کر باورچی خانے کے اُس بڑے طاق میں رکھدیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دُھوئیں سے اُس کا سفید رنگ کچھ کچھ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُٹھایا، دھلوایا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھد یا۔ مگر چند ہی روز میں اُسے پھر غائب کر دیا گیا۔ اُسکی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھدیئے گئے۔ جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اُسے تحفے میں دیئے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب ان کاغذی پھولوں کے سُرخ سُرخ رنگوں سے الماری میں جان پڑ گئی تھی۔ اور ساری کوٹھری دہک اُٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے بیس برس گذر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ اور پیٹھ میں گُدّی سے ذرا نیچے خم آگیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اُس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے۔ مگر اب اُن کی صورت پہلے کی سی نہ تھی۔ کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر ایک آہ پل بھر میں ان تصورات کو اُڑا لے جاتی۔

پچپن برس کی عمر میں اُسے پنشن مل گئی۔ اب اس کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑا لڑکا کسی دفتر میں چالیس روپے کا ٹائپسٹ تھا۔ اور چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ جب اُسے پنشن وصول کرتے تین سال گذر گئے۔ تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح سینے میں لگی۔ اور نمونیہ ہو گیا۔ لڑکوں نے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ مگر کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔

اسکی موت کے دو مہینے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اُسے وہ کتبہ مل گیا بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبہ پر اپنے باپ کا نام دیکھکر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی دلاویز خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔

یکبارگی اُس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اور اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ اور اُس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرانے کے بعد اُسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

آخری حسرت

صرف ایک جام مے ہوش ربا اور سہی
غرق کر دوں گا اسی میں یہ غم و فکر و الم

ایک پروانہ گرا شمع فسردہ کے قریب
ایک تارے نے کہا ٹوٹ کے لو میں بھی چلا
لہر سی دوڑ گئی سرد تمناؤں میں
میری گھائل رگِ احساس میں اک درد اٹھا
میرے مفلوج تخیل نے سنبھالا لے کر
عمرِ رفتہ کے فسانوں میں نیا رنگ بھرا
اپنے جذبات کی لو دیتی ہوئی شمع کے ساتھ
ہاں اِدھر دیکھ ذرا برہمی بزم بھی دیکھ

سرنگوں ہو گئے افسردہ و بے جاں شیشے
گر پڑے نیند کے مارے ہوئے ساغر تھک کر
جیسے ساقی کی نگاہوں میں وہ افسوں نہ رہا
بختِ شبرنگ میں اُلجھی ہے ستاروں کی نظر
اور بھی ہو گئیں اُمید کی پلکیں بوجھل
رات کی زلفِ سیہ بھیگ گئی تا بہ کمر
کیا یہ بکھرا ہوا شیرازہ بکھر جانے دوں
کیوں نہ اک جام مئے ہوش رُبا اور سہی

چند لمحوں میں وہی تلخیِ دوراں ہوگی
زندگی جس کے تصور سے سہم جاتی ہے
دل میں بھڑکے ہوئے شعلے تو بجھا لینے دو
خیر آنے دو اگر صبح چلی آتی ہے
روک سکتا ہوں سحر کو میں اُفق کے اُس پار
ہاں بس اِک جام مئے ہوش رُبا اور سہی

از
جناب مکین احسن کلیم

افسانہ

لالٹین

از جناب محمد امین شرقپوری

کوٹھری میں لالٹین کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں دو جھریاں پڑے ہوئے چہرے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کی نظریں ایک ساتھ لالٹین پر اٹھ جاتیں۔ جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور کاغذ کے میلے کچیلے پرزے سے آٹا لگا کر چپکا رکھا تھا۔ عورت کی نظر لالٹین سے ہٹ کر گھر کے مختصر سامان کا جائزہ لے رہی تھی۔ سکوت کو توڑ کر بولی "جاڑے آگئے کچھ ہے فکر تمہیں؟"

مرد بھنّا کر بولا "تمہیں فکر کے سوا کچھ اور بھی سوجھتا ہے۔"

"تمہارے کیا برے کی کہہ رہی ہوں۔ جاڑا آگیا۔ لحاف کے چیتھڑے نکل رہے ہیں۔ اوڑھوگے کیا؟"

"تمہارے پاس تو ہے نا" وہ آہستہ سے بولا

"میرے پاس ہونے سے تمہارا تن ڈھک جائیگا؟"

وہ آنکھیں میچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "ہوں"۔

"دیوالی کے بعد لڑکی بھی تو آئیگی۔ اوڑھنے کے لئے اسے بھی چاہیے گا"

وہ جمائی لیکر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ لیٹتے ہوئے بولا "بتی کب تک جلتی رہے گی۔ تیل نہیں ملے گا کل بھی"

وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی "جہاں خرچ کی بات آئی۔ تمہیں نیند آگئی"

اس نے بازو سر کے نیچے رکھ لیا۔

"گونے پر کیا دیا تھا اسے جو ایک روز گنوا رہے تھے"۔ ایک لمحہ بعد "بولتے نہیں ہو"

وہ انگڑائی لیکر بولا "ہوں ——— خوانچے پر کپڑا ڈال دینا کبھی کوئی چوہا مال کا ناس نہ کردے۔"

وہ تنک کر بولی "پرائے گھر بھیج کر تم نے یہ سمجھ لیا کہ مرگئی"۔ سانس تیزی سے لیتے ہوئے بولی "جھوٹ سچ اسے ایک خط ہی گیر دیتے۔"

"کچھ بات بھی، اب کے خالی ہاتھ نہیں جانے دونگی اسے۔ کنیا دان کے پیسے بھی جیب میں رکھ لئے تم نے۔ وہ تو لڑکی اچھی ہے۔ کوئی اور ہوتی تو کھڑے کھڑے دھروا لیتی۔ دان کے پیسوں میں کس کا ساجھا۔ لئے تھے تو کوئی چیز ہی بنوا دیتے اسے۔ نہ ناک میں کیل، نہ کانوں میں بالیاں۔ سسرال والے نہ لاتے تو دکھا لیتے منہ جگ کو، دو تین ہوتیں تو پھر کیا کرتے۔ خدا گہنے کو ناخن نہ دے اور ایسوں کو بیٹی نہ دے۔ چار ٹھیکریاں دیکر دھکا دیدیا نہ جہیز نہ گہنے پاتے، وہ تو برتن ایک ایک کرکے میں نے گلی میں سے خرید لئے تھے۔ تمہارے بھروسے چھوڑتی تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ بیاہ کے دن تم تو باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اندر شرم سے کٹی جاتی تھی۔ کیسر کی بہو بار بار کہتی۔ چاچی جہیز کہاں ہے۔ زیور تو دکھاؤ۔ نارائینی کون سے کپڑے پہنے گی"۔

"اور یہ مالن رانڈ پوپلے منہ سے بولی۔ کمر ٹوٹ گئی ہے راجہ کی ساری عمر خوانچے لیکر گلی گلی بھرتے۔ پیسے کے دو سیو گڑ کے بیچتا ہے۔ تیل کے پاپڑ اور پھیری والے پیسے کے دو بیچیں، راجہ بیچے ایک۔ بڑا نانواں کمایا ہے لونڈیا کے بیاہ کے لئے"

"اور یہ کل کی چھوکری دھنو کی بیٹی چلا کر بولی "تائی! بیاہ پہ تو بھکاری بھی دل بڑا کرلیتا ہے۔ ساری عمر پھٹے پرانے پہنتی رہی ہو۔ نارائینی کے لئے کچھ تو جوڑ جمع کی ہوگی"۔

"ہائے میں ہی پاگل ہوں کیا، مردوں میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں کوئی بات چیت نہ کی ہوگی تم سے؟ کیا سب بے غیرت تھے۔ سب کے گھروں میں کنیا ہے۔ بیاہ شادی بھی کرتے ہیں۔ جہیز بھی دیتے ہیں۔ ان کے گھر تو دھن نہیں برس رہا۔ یہی محنت مجوری کرتے ہیں۔ اس سے تو کلو والی بات ہی اچھی تھی۔ کنگلے تھے تو سو پچاس لڑکے والے سے لے لیتے۔ بھیک مانگ لیتے۔ میں یوں تو نہ جھکتی۔ میرا کلیجہ تو نہ جلتا۔ ہاں تم ابن گئے اس وقت۔ ان بیچاروں نے کہلا کر بھی بھیجا کہ ہاتھ تنگ ہو تو کچھ لے لو۔ راجہ نے گردن ہلا دی۔ لگے رام رام کرنے۔ کنیا دان کی چیز ہے۔ ایک پائی نہیں لوں گا۔ ایک تم ہی کیا، جگ جانتا ہے۔ ہندو مسلمان سکھ، عیسائی سب یہی کہتے ہیں۔ تمہارے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایسے برہمن تھے تو کہیں جا کر پاٹھ دیتے۔ خوانچہ نہ اٹھاتے۔ برہمنوں نے کبھی یہ کام کیا ہے۔ برہمن تھے میرے ابا، کیا مجال جو دھرم شالہ سے پاؤں باہر نکالا ہو۔ کھانے کو وہ وہ مال آتا ہے کہ کبھی خواب میں بھی نصیب نہ ہوا ہوگا تمہیں دور سے لوگ پرنام کرتے ہیں۔ لڑکی کا بیاہ کیا تھا انہوں نے، دنیا جانتی ہے آج تک، کسی بچے ہی سے پوچھ لینا۔ جھٹ کہہ دیگا۔ درگا کے بیاہ پہ لڈو بٹے تھے گاؤں بھر

اُس نے "ہوں" کی اور کروٹ بدل لی۔ وہ کہتا جاری رکھتے ہوئے بولی: "تمہاری طرح نہیں کہ دمڑی کے بتاشے بھی نہ بانٹے۔ کمانے والے کیا بھی کماتے ہیں۔"

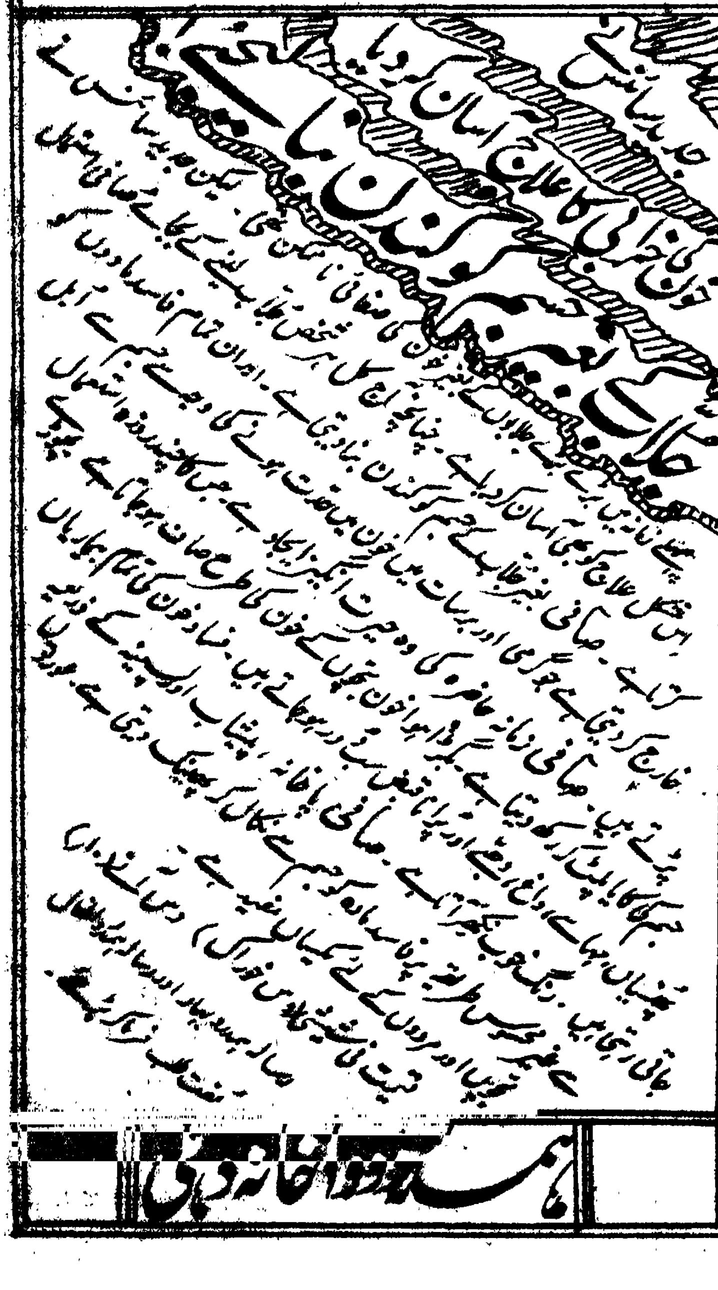
وہ خراٹے لینے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی: "میرے ددّا کے چاچا بھی کام کرتے تھے، گھر کے سارے دھندے چلاتے تھے۔ بیٹوں کے بیاہ بھی کئے انہوں نے۔ ایک ایک بہو کو کئی کئی چیزیں پہنائیں۔ چاہے بیاہ میں بیچ ہی ڈالیں۔ مگر وقت پر ذلیل نہیں ہوتی۔ مجھے بری بتاتے ہو، بھائیوں سے مقدمہ لڑنے کو نہ کہتی تو کبھی کے مرے گئے ہوتے۔ ہلا سے زمین بک گئی جان تو بچ گئی تمہاری، یہ تو وقت ہے کبھی اچھا کبھی برا۔ انسان پر سدا ایک سے دن نہیں رہتے۔ یہاں ہمارا دل تو کچھ نہ سا دن رہے۔ ایسا ٹوٹا بھی مقدر کیا لیکر آئے۔ مجھے جنم بھر کو دکھیاری کر دیا۔ دا اپنے میں کمائی نہیں ہوتی تو کرنی اور دھندا کر لو۔ کام والے کے سو راستے۔ در کام چور کو سو بہانے۔ میں کب کہتی ہوں کہ اکیلے کھاتے ہو۔ مہنگائی ایسی بھی کیا ہے۔ دنیا بھوکی تو نہیں سوتی۔ مہنگے سستے گزر کر ہی رہی ہے۔ نہ گھر چھوڑ بیٹھی ہے رشتہ داریاں۔ لوگ مہنگا بیچتے ہیں تم بھی مہنگا بیچو۔ کھینچ کر تولو۔ جھکتا تول ب پر تا نہیں کھاتا۔ تمہاری ترازو ٹھیک ہے نہ باٹ، جانے کب سے پاسنگ تھا وہ تو میں نے دیکھ لیا ایک دن۔ چھٹانک کا سوا چھٹانک تولتے رہے۔ روکا تو لگے آنکھیں نکالنے۔ اس میں دھرم کی کیا بات ہے۔ جو ٹھیک تول کر دیتے ہو۔ دھرم گھر لٹانا تو نہیں سکھاتا۔ دھرم کا نام تک جانتے نہیں بن گئے دھرماتما! بچوں کو مفت بانٹ دیا کرو سارا خوانچہ۔"

وہ مچھر کے کاٹنے سے پنڈلیاں کھجانے لگا۔ عورت کی آواز تیزی پکڑ گئی۔

"بازار سے سودا سلف لاتے ہو وہ لوگ تمہیں کتنا نرم دیتے ہیں۔ سیر کا تین پاؤ اترتا ہے۔ گھر آ کر، آنکھیں نہیں ہیں کیا تمہاری۔ تمبا کو پی پی کر سٹھیا تو نہیں گئے ہو۔" پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے بتی کو دیکھا۔ روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ پھر اسے جیسے یاد آ گیا تھا تیل کل بھی نہیں ملے گا۔ سوچ کر بولی۔ "سنا ہے کپڑا کچھ سستا ہو گیا ہے پہلے سے۔ تمہاری قمیص پھٹی ہوئی ہے۔ گلی گلی گھومتے ہو۔ نہ جانے لوگ تمہارے ہاتھ سے کیسے سودا خرید لیتے ہیں۔ میل میں اٹی ہوئی ٹوپی۔ دھوتی کو سو پیوند لگا چکی ہوں۔ جوتا الگ پھٹا ہوا ہے۔ جاڑوں میں کیا کرو گے۔ کون سے دن رہ گئے ہیں۔ میرے پاس بھی کوئی لتا نہیں۔ میں اسی سے گذر کر لوں گی نارائینی آئے گی۔"

پھر پھر کر وہی باتیں اسکی زبان سے نکلنے لگیں۔ "دھوتی جوڑا لا دو اُن کے لئے، قمیص کے کپڑے لے دو، نہیں کہتا ہوں، چاہئے تو یہ بھی، اب ایسے چھوڑا تو نہیں جاتا۔ جیسے بھی کیسے منہ موڑ لوں۔ جب تک جیتی رہے ہی گی وہ تو ——— جو لینے آئیگا ایک آدھ لتا اسے بھی دینا ہوگا۔ تیوہار کا موقع ہے۔ پڑوس میں دیکھو۔ بسنتی کے بیاہ کو مہینہ نہیں ہوا۔ دسیوں جوڑے تیار کر کے رکھ دیئے ہیں اسکی ماں نے ——— جانے اُن کے پاس پیسے کہاں سے آجاتے ہیں۔"

ہوا کا سرد جھونکا آیا۔ ٹمٹاتی ہوئی لالٹین بھڑکی۔ چمنی میں دھواں بھر گیا۔ ٹوٹی ہوئی چمنی پھر بھک بھک . . . . دو تین بار بھڑک کر گل ہو گئی ——— تاریکی میں عورت کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور مرد کے خراٹوں کی آواز بلند ہو گئی تھی۔



"کس سے محبت ہے!"

از جناب اسرار الحق صاحب مجازؔ۔ بی ، اے (علیگ)

مجازؔ صاحب نے یہ نظم ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی۔ یہ کسی کے استفسار کا جواب معلوم ہوتا ہے۔ نظم کیا ہے۔ شاہد نظر نواز کی لفظی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ نظم کو ایک بار سُننے یا پڑھنے سے جی نہیں بھرتا۔ بلکہ بار بار سُننے کو جی چاہتا ہے۔ مثنوی "زہر عشق" میں ٹریجڈی نے چار چاند لگا دیئے تھے مگر یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُمید کا آنچل ہاتھ میں ہے۔ نئی تشبیہوں، نئے استعاروں، نئی ترکیبوں نے نظم میں ایک عجیب رعنائی اور دلفریبی پیدا کر دی ہے۔ مجازؔ صاحب اگر سال بھر میں ایک ایسی نظم کہہ لیا کریں اور باقی سال میں کچھ بھی نہ کہیں تو شاید انکے سُننے والوں کو کسی نئی چیز کی فرمائش کا حق باقی نہ رہے گا۔ اور اردو لٹریچر میں گرانقدر اضافہ ہو جائیگا۔ (فصیح الدین احمد)

بتاؤں کیا تجھے اے ہمنشیں کس سے محبت ہے
میں جس دُنیا میں رہتا ہوں وہ اس دُنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بُو ہے پیکرِ حُسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُس کی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہِ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنّت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گُلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُس کی

جبیں پر سایہ گستر پرتوِ قندیلِ رہبانی
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہی عظمتِ تاجِ سلیمانی

ازل سے منعقد ہے محفل [illegible] اس کی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے، مجھ کو اپنی آنکھوں پہ بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے
سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اس کی

ادائیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملک ہے خراج اس نے لئے ہیں بوستانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اس کی

وہ میری جراتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر نازکی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بے باکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درسِ تمکیں دے گئیں نادانیاں اس کی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اس کی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا، تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

گدڑی کا لعل سید سجاد علی انصاری مرحوم

(از جناب الیاس احمد صاحب مجیبی)

سجاد ناشاد، دنیا سے سدھارے۔ ایسے میں کہ زندگی کی بہار بھی اچھی طرح نہ دیکھنے پائے تھے۔ خدا اُن کی تربت کو ٹھنڈا رکھے۔ وہ جوان مرے! شاید نوجوانوں میں ظہور پانے اور زندہ رہنے کے لئے! وہ نوجوان تھے مگر مثل پیرانِ پختہ کار۔

وہ ادیب تھے۔ نہ صرف ادیب بلکہ بے پناہ نقاد اور مفکر بھی تخیل کی بلندی، نظر کی گہرائی، فکر کی بے باکی میں سجاد کا ہمسر اُردو ادیبوں میں نہ ملے گا۔ بیان میں جہاں لطافت، نفاست اور البیلا پن رکھتے تھے اور اُس میں وہ منفرد تھے۔ وہاں قدرت نے انہیں صورت شکل، رنگ روپ، بانکپن اور سجیلا پن بھی وہ دیا تھا کہ میں تو اپنی نانجھی میں بھی انہیں بس گھورا ہی کرتا تھا بڑی پیاری اور موہنی صورت پائی تھی! آواز میں کھنک تھی۔ رس تھا اور صورت میں بے حد جاذبیت۔ مزاج میں لطافت کے ساتھ تیکھا پن بھی تھا۔ مگر چڑچڑے نہ تھے۔ شگفتگی تو اس درجہ کہ اپنے حلقۂ احباب میں باغ و بہار، وہ خود بھی ہنستے اور خوب ہنستے، دوسرے تو ان کے سنجیدہ اور مطالب میں ڈوبے ہوئے لطافت پر لوٹ پوٹ جاتے۔ غرض عجب چیز تھے۔ مگر افسوس! بے رحم اور ناترس موت نے اس بلبل شیریں زبان و ہزار داستان کو بہت جلد خاموش کردیا۔

عام طور پر بہت کم حضرات اُن سے واقف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت کم جیئے۔ اور اُنہوں نے جو ادبی سرمایہ چھوڑا وہ بھی بہت کم ہے چند مضامین، چند نظمیں اور غزلیں اور ایک ڈراما "روزِ جزا" وہ بھی نامکمل مگر باوجود نامکمل ہونے کے باعتبار مطالب کے مکمل ہے۔ اسکی حیثیت علمی ہے۔ محض تفریحی نہیں۔ وہ تفریح سے خالی بھی نہیں۔ مگر اس تفریح کی حیثیت بھی علمی ہے۔ بہر حال وہ کھیلا نہیں جاسکتا۔ نہ فنی لحاظ سے، نہ اصولی اعتبار سے، پھر اُسے کھیلنے کی ہمت بھی کون کرے گا۔ بھلا کس کی مجال ہے کہ خدا بنے اور کس کا گردہ ہے کہ شیطان کا روپ بھرے۔ ہاں زاہد خشک اور صوفی کے بہروپ میں تو بہتیرے پڑے پھرتے ہیں۔ خوبصورت مرد، خوبصورت عورت اور بدصورت مرد اور بدصورت عورتوں کی بھی کمی نہیں۔ مگر آدم و حوا، عزرائیل و میکائیل اور اسرافیل و جبرائیل کون بنے۔ روزِ جزا کے کردار یہی سب ہیں۔ اُردو میں اپنی نوع کا بالکل نیا اور پہلا ڈراما ہے۔ مرحوم زندہ رہتے تو نہیں معلوم اسکی تکمیل کہاں اور کس طرح کرتے۔

سجاد بدمذاقی کے دشمن تھے۔ ایسا لگتا ہے وہ جب کوئی بے تکی بات دیکھتے، بے قابو ہوجاتے، بپھر جاتے! مگر اس بگڑنے اور بپھرنے میں اُن کا گل رخ چہرہ اور بھی جاذبِ نظر ہو جاتا، منہ سے پھول جھڑتے۔ اور قلم سے گوہر آبدار ٹپکتے! یہ تو بس خدا کی دین ہے۔ جس کو مل جائے۔ محنت اور مشق سے بھی یہ امتیاز حاصل نہیں ہو پاتا۔ وہ لکھنے کی خاطر نہیں لکھتے تھے نہ وہ "حیوانِ کاتب" تھے۔ نہ لکھنا اُن کا پیشہ تھا۔ اُن کے بول بول میں جان ہے، پیام ہے، سجاد کا پیام لطافت اور رنگینی میں شرابور ہے۔ انکی تہ رشترو تلخ باتوں میں بھی مزا ہے۔ اور بعض لغزشوں اور بے اعتدالیوں میں حقائق مضمر ہیں۔

سجاد کی وفات پر ان کے بوڑھے باپ، کنبے والوں اور ان کے دوستوں پر بجلی سی گری۔ اب بھی ان کے چاہنے والوں کو ان کی یاد تڑپا دیتی ہے۔ ان کے اپنی سوگواروں نے سر جوڑ کے ان کے افکار و نگارشات کو "سحرِ خیال" کے نام سے یکجا کیا۔ عام اشاعت کی نیت سے نہیں۔ نہ تجارتی مقصد کے پیش نظر، بلکہ اُس محدود حلقے کے "یارانِ میکدہ" چاہتے تھے مرحوم کے بکھرے ہوئے موتی ایک لڑی میں بندھ جائیں۔ اور کبھی کبھی انکی مرغوب و محبوب شخصیت چلتی، پھرتی، ہنستی بولتی، چہکتی اور جگمگاتی نظر آجایا کرے پھر بھی وہ "شعر مدرسہ تک بھی پہنچا"! اور اُس پر ہلڑ بھی خاصا مچا۔ کوئی پندرہ برس بعد میں نے ان جواہر پاروں کو اپنے بس بھر مناسب و موزوں انداز میں پھر پیش کیا۔ میں سہما سا رہ گیا۔ کوئی اوچھی سی بدمذاقی بھی ہوگئی تو مرحوم کی رُوح بیکل ہوگی۔ غرض اب کہیں جاکر لوگ اُن سے آشنا ہوئے ہیں اور ہاتھ ملتے ہیں کہ ہائے یہ "شعلہ مستعجل" کون تھا اور کیا ہوگیا۔

بعض سنجیدہ دوستوں اور ادیبوں کا خیال ہے۔ سجاد مغرب اور مغربی ادیبوں سے متاثر تھے۔ ایک اعتبار سے یہ غلط بھی نہیں۔ مگر ان بدنصیب و محروم آنکھوں کا مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ مرحوم نہ صرف مشرقی تھے۔ نہ محض اُن گھڑ مغربی۔ ان کی شخصیت میں مشرقیت اور مغربیت کا نہایت متوازن طریقہ پر امتزاج پایا جاتا تھا۔ اُن کا ڈھیلا ڈھیلا پاجامہ

[illegible] بھرنے بھرنے دلکش چھلے یاد آتے ہیں ۔ تو دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور جی بھر آتا ہے ۔ بے شک مغرب میں دنیا بھر کے علوم جمع ہیں اور اہل علم و اہل فن میں سبھی نے مغرب سے خوشہ چینی کی ہے ۔ اس لئے سجاد مغربی ادیبوں سے متاثر رہے ہوں ۔ تو حرف گیری کا موقع نہیں ۔ کہ حکمت کی بات مومن کی گمشدہ پونجی ہے ۔ جہاں سے پاؤ لے لو ۔" مگر سجاد نے مشرقیت کو نہ کبھی حقیر جانا نہ مغربیت میں گم ہو کر ہمزبان سرائی کی ۔ انہوں نے اپنی شخصیت اور انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ دیکھئے اُن کے تیکھے تیور ، مغربیت کے مقابلے میں سجاد فرماتے ہیں :-

" مغربی اُصول تنقید یہ ہیں کہ مسئلہ زیر بحث میں مدح و ذم کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو ۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ مدح وستائش بھی کرے اور عیوب شماری بھی ۔ عام اس سے کہ محاسن کو عیوب قرار دے یا عیوب کو محاسن ۔ اس حیثیت سے ڈاکٹر اقبال پر فارسٹر صاحب کا ریویو مغربی تنقید کی گمراہیوں کی ایک بین مثال ہے ۔"

نئے پڑھے لکھوں کی کٹ حجتی اور اُس پر طفلانہ و احمقانہ فخر اور اوچھے پن پہ کیسے پُرسوز انداز میں ماتم کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :-

" قرآن اُن کے نزدیک معمۂ لاینحل تھا اور حدیث ایک کلام ناقابل عمل ۔ اُنہیں اپنے مذہب پر شرم آتی تھی ۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا کی ابتدا مغرب سے ہوئی ۔ اور اسکی انتہا بھی مغرب ہی پر ختم ہوگی ۔ مغرب ہی کو وہ علوم و فنون کا مخزن اور حقائق و معارف کا مرکز تصور کرتے تھے ۔ ان کا مطمح نظر خالد نہیں ۔ ولنگٹن ۔ غزالی نہیں ، مِل اور کیسلے ، ابن خلدون نہیں اسمتھ اور مارسڈن تھے ۔ کاش وہ مغرب ہی کے حقیقی علوم سے باخبر ہوتے اُن کی نظر محدود تھی انگلستان اور اُس کے سطحی اور تنگ مایہ مصنفین تک ۔"

یہ ہے مغرب زدگی پر سجاد کی بے لاگ تنقید ۔

سجاد کو بعض نے دیوانہ ، مجذوب اور مجذوب فرزانہ بتایا ہے ۔ تعریفاً نہیں ، نیک نیتی سے ۔ لیکن مرحوم کی دیوانگی اور مجذوبیت میں صحیح اور حقیقی فرزانگی جا چھپی ہو ، اُن کا فلسفہ اور آرٹ پر کھنا ہو تو انہیں کچھ پوشیدہ گوشوں سے بھی دیکھنا ہوگا ۔ میں نے مرحوم کو کچھ قریب سے بھی دیکھا ہے ۔ میرا ذاتی خیال ہے ، وہ لوگوں کی بے راہ روی اور لغویتوں کو دیکھ دیکھ دل ہی دل میں کڑھا کرتے تھے ۔ اور جب کہنے پر آتے تو گویا پھٹ پڑتے تھے ۔ ظاہر ہے جب کوئی صاحب علم اور گویا آدمی بولنے پر آتا ہے تو کیا کچھ نہیں ملتا ۔

پر جو کہیں حسن بیان اور لطافت زبان کی دولت بھی اور ہی حاصل ہو تو یہی زبان گویا سے آگ ہی بھڑکا دیتی ہے ۔ تو یوں اور کہیں کی قسمیں ہی پھٹ دی ہیں ۔

نہ صرف حیرت بلکہ افسوس تو یہ ہے ، بعض بزرگوں کے خیال میں مرحوم کے افکار و خیالات میں بے دینی اور الحاد تھا ۔ ایسی پر [illegible] کو جی چاہتا ہے ۔ یوں تو ہزار حیف ! اب وہ ہم میں ہی نہیں ، اُن کا معاملہ اب اُس سے ہے جو اپنا معاملہ ، ہمارے آپکے اور سجاد کے معاملے سے بالکل علیحدہ ہی رکھتا ہے ۔ اس لئے اس پر ہنگامہ آرائی بے وقت کی راگنی سے زیادہ وقیع نہیں ۔ رہا موجودہ سیلاب اُسے روکنے کیلئے پیغمبروں کا عزم و حوصلہ ، صدیقوں کا استقلال اور لوچ درکار ہے ۔ چڑانے اور گالی دینے سے بنی بات بگڑ جاتی ہے ۔ سجاد کا الحاد عین ایمان اور صحیح دین ہے ۔ سجاد کو ملحد کہہ دینا سہل نہیں ، جسارت بے جا ہے ایسے قصہ ہے سجاد الفاظ پرست مسلمان ہرگز نہ تھے اور نہ خدا کرے کوئی ہو ، مگر اُن کی تمام تر زندگی سے اور عام سماجی رہن سہن سے آشنا حضرات جانتے ہیں وہ دین کی حقیقتوں کو کتنا صحیح سمجھتے تھے اور دین کی روح پر کس پختگی سے عامل تھے ۔ مرحوم نے شاید دین کے اپنی اجارہ داروں کیلئے فرمایا تھا ۔

مرے ہر ہر گنہ میں ہیں ہزاروں جنتیں مضمر
کسی کو اور دکھلا یہ فریب اتقا اپنا

اب سجاد کے مرکزی خیالات ملاحظہ ہوں ، اس قسم کے اُن کے البیلے بیانات کی آڑ لے کر بعض بزرگ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنا چاہتے ہیں ۔ مرحوم فرماتے ہیں :-

" فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے ۔" اس جگہ تھوڑا سا دخل در معقولات گراں بار خاطر نہ ہو ۔ میں یہ حقیقت بھی یاد دلاؤں کہ اکثر انسان کو شیطان ہوتے تو ہم آپ بھی دیکھا کرتے ہیں ۔ ذہنی اعتبار سے بھی ، اخلاقی حیثیت سے بھی ۔ بجائے سجاد نے جو یہ کہا تو گویا زہر ملا دیا ۔ خیر اور سنئے " ایک حقیقت جب پلٹتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے ۔ خدا نے ابتدا میں صرف فرشتوں کو پیدا کیا تھا ۔ اس وقت تخلیق شیطنیت کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ وہ جانتا تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصر شیطنت مضمر ہیں ۔ سلسلۂ ارتقا سے شیطان خود [illegible] معلم الملکوت کی فطرت میں ملکوتیت کے وہ تمام عناصر [illegible]

تعمیرِ شخصیت کے لئے لازمی تھے ۔

اصل یہ ہے ، بات کرنے کو سبھی کر لیتے ہیں۔ اور حقیقتیں شاید کہ سبھی سمجھتے ہیں۔ مگر بات کو حسن اور سلیقے سے کہنا اور اس طرح کہنا کہ خود اس میں ایک بات پائی جائے ہر کسی کے بس کی بات نہیں ——— مرحوم کے ایسے البیلے انداز ہیں وہ مزا ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی فرماتے ہیں :—

" نمرود و فرعون لطافتِ شر سے نا آشنا تھے ۔ وہ اُسی کائنات کے لئے بھیجے گئے تھے جسکی فضا لطافت سے محروم تھی ۔ لیکن جس وقت خیرِ لطیف حضرت یوسفؑ کی صورت میں نمودار ہوا شیطان نے اُس کے مقابلے کیلئے شرِ لطیف کو زلیخا کے لباس میں مبعوث کیا ۔ جسکی رنگینیوں کو صرف نسوانیت کی رنگینیاں شکست دے سکتی ہیں ۔ شیطان کی خوش مذاقیوں کی انتہا ہے کہ ایک خوبصورت پیغمبر کے لئے جس حریف کو منتخب کیا نسوانیت کا وہ مجسمہ لطیف تھا جس کے ایک ایک انداز میں کائنات کے ہزار ہا طلسم پوشیدہ تھے ۔" ——— قریب تھا کائنات خیر کا شیرازہ بکھر جائے ۔ لیکن قدرت نے عین وقت پر حضرت یوسفؑ کی دستگیری کی ۔ اور طلسمِ شر ٹوٹ گیا ——— حضرت یوسفؑ کا یہ معجزہ ناقابلِ تردید ہے کہ چاک دامانی صرف چاک دامانی رہی ۔ لیکن اس میں بھی قدرت کی امداد شامل تھی اس لئے اسے معجزہ ہی کہہ سکتے ہیں ۔ یہ کوئی انسانی صفت نہیں ۔"

سجاد مرحوم اقبال علیہ الرحمتہ سے بہت متاثر ہیں ۔ لیکن وہ ان مسخروں سے بیزار ہیں جو اقبال کی بھونڈی تقلید میں نہ جانے کیا کہتے ہیں کیا نہیں ۔ مرحوم ، مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ اور ڈاکٹر اقبال مرحوم و مغفور کے گویا پرستار تھے ۔ فرماتے ہیں :—

" اقبال کو جب پڑھتا ہوں ، خدا یاد آ جاتا ہے ۔ میرا عقیدہ ہے اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا یا مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم ۔"

مولانا آزاد مدظلہ کے ذکر میں فرماتے ہیں :—

" الہلال نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کر دیا جس طرح نفخِ صور سے لاکھوں برس کے سوتے ہوئے انسان زندہ ہو جائینگے ۔"

اب فرمائیے ۔ یہ لکھنے والا بھی قیامت کا منکر ٹھیرے گا اور ملحد !

استغفر اللہ ! اور فرماتے ہیں :—

" روشن خیال طبقہ کو یہ پہلی بار معلوم ہوا قرآن پاک میں فضل و طہارت کے علاوہ کائنات کے حقائق بھی پوشیدہ ہیں " ——— مولانا آزاد قرآن لے کر اٹھے ، مسلمان مبہوت ہو گئے کہ تیرہ سو برس کے صحیفے میں حال ہی کے لئے نہیں ہمیشہ کیلئے نکات و حقائق پوشیدہ ہیں ۔"

صد حیف ! اس پر بھی بچارے سجاد کو قبر سے اُکھیڑ پھینکنے کے توڑ جوڑ لگائے جائیں ! سجاد ایسے مخلص اور درد مند مسلمان کو یارانِ طریقت ملحد کہیں اور بے دین سمجھیں ، اُن سے کوئی کیا کہے ۔ خدا ہم سب کی ہدایت فرمائے !

سجاد انصاری کا صرف ایک البیلا فقرہ اور سُنئے ۔ اس قسم کے جواہر پارے اُن کے یہاں بکثرت ملتے ہیں ۔ ان جواہر مُہروں کی تاثیر مُردوں میں جان ڈالتی ہے ۔ ندرت کے ساتھ زندگی اور سادگی سبھی کچھ ہے ۔ ذرا غور سے سُنئے گا ۔ کتنی بلند بات ہے ۔ آج بہتوں کے لئے تازیانۂ عبرت و عمل ہے ، فرماتے ہیں :—

" سعیِ ناکام دُعائے مقبول سے برگزیدہ تر ہے ۔ کوششوں میں عظمتِ انسانی مضمر ہے ۔ لیکن دُعا انسانیت کا اعلانِ شکست ہے ! "

(منشور از نشر گاہ دہلی)

غزل

از جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی۔ ہوم منسٹر کشمیر

روداد محبت نہیں اب اس کے سوا یاد
سو بار بھلایا اُسے، سو بار کیا یاد

امالی حسرت کا گلہ کیجے کیونکر
اک وعدہ پشیماں کا ہے انداز حیا یاد

ل مائل فریاد ہے، خاموش زباں ہے
کرتا ہوں ستم یاد تو آتی ہے وفا یاد

ل سچ ہے کہ بے مہر ہے، کیا کیجے لیکن
جب اس کو بھلاتا ہوں تو آتا ہے سوا یاد

تہا ہے اگر یاد دلاؤ کوئی وعدہ
"کیا یاد ہے، کیا یاد ہے، کیا یاد ہے، کیا یاد"

یمن وفا مجھ سے بھلائے نہیں جاتے
ورنہ ہے ترے شکوۂ بے جا کا مزا یاد

سدم اسی امید میں اک عمر گذاری
پھر مجھ کو نہ اس نے کبھی بھولے سے کیا یاد

صویر تھی جو حسن کے بے ساختہ پن کی
اب تک ہے ستمگر کی وہ مستانہ ادا یاد

عشق کے اسرار کا محرم نہیں زاہد
اس راہ میں ہر گام پہ آتا ہے خدا یاد

اعر کی طرح خون کھنکتا تھا رگوں میں
آتا ہے وہی دور مئے ہوش ربا یاد

ہ نہ کبھی نشۂ صہبائے محبت
مستوں کو نہیں اس کے سوا اور دعا یاد

کیا کیا نہ اثر خوار ہوئے عشق کے ہاتھوں
سنتے ہیں کہ اب کی ہے فقیروں کی صدا یاد

ایک سانحہ

(از فصیح الدین احمد)

جون ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ میں بی۔ اے کا امتحان دیکر فارغ ہو چکا تھا۔ مگر امتحان کا نتیجہ ہنوز برآمد نہیں ہوا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ لوئیں خوب چل رہی تھیں۔ سہ پہر کو کالج کے کھیلنے کے میدان میں روز جاتا تھا۔ شام تک کرکٹ ہوتا۔ پھر وہیں سے باغ سے نکل جمنا کے کنارے جا پہنچتا تھا۔ اور دس پندرہ منٹ جمنا میں نہا کر واپس گھر لوٹ آتا تھا۔

انہی دنوں کالج کا ایک مسلمان طالب علم جو حافظ قرآن بھی تھا۔ اور بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ عیسائی ہو گیا۔ ہم میں سے کوئی اور اگر عیسائی ہو جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔ جتنا اس شخص کی حرکت سے ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ نہ صرف حافظ قرآن تھا، بلکہ صوم وصلوٰۃ کا بھی پکا تھا۔ اور حتی الامکان ہر نماز باجماعت پڑھتا تھا۔

جب اس سانحہ کی خبر ملی تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں، اشتیاق حسین قریشی، جو اب ڈاکٹر قریشی ہیں اور ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہیں اور عبدالجبار غازی جو اب کسی مقامی سکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں، تینوں نے باہم مشورہ کیا اور یہ رائے قرار پائی کہ دوسرے دن صبح سات بجے کی ٹرین سے پانی پت جا کر اس طالب علم کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم لوگ پانی پت دوپہر کے قریب پہنچے۔ مولانا حالی کے خاندان کے ایک بزرگ جو اُن دنوں ہندوستانی دواخانہ دہلی میں منیجر تھے۔ اتفاق سے وہ بھی ہم سفر تھے۔ راستہ میں جب ہم لوگوں کے پانی پت جانے کی وجہ ان کو معلوم ہوئی تو سٹیشن سے مجھے ہمراہ ان کے ساتھ ... لے گئے۔ جہاں پہلی بار میں نے خواجہ غلام السیدین کو دیکھا۔ جو اُن دنوں چھٹیوں میں علی گڈھ سے گھر آئے ہوئے تھے۔ کھانا کھا کر ہم منزل مقصود پر پہنچے بارہ بجے سے لے کر شام کے سات بجے تک سر مارا۔ مگر صدائے برنخاست۔

آخر ہم ہار جھک مار کر واپس دہلی لوٹے۔

دن بھر کی تکان تھی۔ تینوں نے سوچا کہ جمنا چل کر نہانا چاہئے۔ چنانچہ سٹیشن سے ہم تینوں کالج کے میدان سے ہوتے ہوئے جو کشمیری دروازہ کے باہر ہے جمنا پہنچے۔ کالج کے میدان سے ایک اور طالب علم جس کا نام آنیل تھا ہمارے ساتھ ہو گیا۔ جب ہم جمنا کے کنارے جا کر کھڑے ہوئے اور کپڑے اتارنے شروع کئے تو میرے تینوں ساتھیوں نے کہا۔ "آج دریا میں پانی زیادہ معلوم ہوتا ہے اور روانی بھی تیز ہے۔" اتفاق سے میں اُن سب میں بہتر تیرنا جانتا تھا۔ اس لئے میں نے ان سب کو روکا اور پہلے خود دریا میں کود پڑا۔ کودنے کے بعد کم پندرہ گز کے فاصلے پر جا کر میں نے پاؤں ٹکالنے چاہے۔ کیونکہ ایک دن پہلے اس جگہ صرف کمر تک پانی تھا۔ مگر اب جو پاؤں ٹکانے کی کوشش کرتا ہوں تو پانی ہونٹوں تک آ پہنچا۔ میں نے پھر تیرنا شروع کیا اور درمیان دریا میں جا پہنچا۔ اس مقام پر صرف ٹخنے ٹخنے پانی ہوتا۔ مگر اس وقت یہاں بھی قد آدم پانی تھا۔ اور روانی بہت تیز تھی۔ اب میں پریشان ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً جو میرے ساتھی سامنے دریا کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کو Help ، Help کہکر پکارنا شروع کیا۔ ستم ظریفی دیکھئے، وہ لوگ یہ سمجھے کہ میں انہیں دریا میں اترنے کو بلا رہا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر پانی میں اترنے سے انکار کر دیا۔ اب میری طاقت جواب دے چکی تھی۔ واپس ساحل پر پہنچنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس لئے میرے سامنے موت کا نقشہ پھر گیا۔ اس دوران میں میں نے دو تین غوطے بھی کھائے۔ یہ حال دیکھکر ہمارا عیسائی ساتھی انیل دوڑا اور گھاٹ پر دو جو چند آدمی نہا رہے تھے۔ اُن سے مجھے بچانے کی درخواست کی۔ وہ لوگ بنگالی تھے۔ نہا دھو کر اپنے کپڑے نچوڑ رہے تھے۔ انسانی ہمدردی کی خاطر ان میں سے دو آدمیوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مجھے نکالنے کی کوشش کی۔ اور فوراً تیرتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ ایک نے دھوتی میرے طرف پھینک دی۔ میں نے دھوتی کا سرا خوب مضبوط دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ لیکن چونکہ پیٹ میں کافی پانی بھر چکا تھا۔ اس لئے اپنے وزن کو پانی پر سنبھال نہ سکا اور پھر غوطے کھانے لگا۔ ان میں سے ایک آدمی میرے قریب آیا۔ اور اُس نے مجھے پھر کمر پکڑ کر ...

دنگی ہوا آپ میں نے دوبارہ دھند پکڑلی۔ پیچھے ایک آدمی مجھے
دھکیلتا ہوا تھا۔ اور آگے سے دوسرا شخص مجھے کھینچ رہا تھا۔
زندگی تھی جو میں دریا میں سے صحیح سالم باہر نکل آیا۔ اور کنارے
مل آدھے گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے
اشتیاق سے کہا کہ وہ میرے نامعلوم محسنوں کا نام اور پتہ

دریافت کریں۔ [illegible]
وہ دن اللہ [illegible] سے [illegible]
دس کے بعد جب لوگوں سے میری جان بچانے والوں کا [illegible]
مگر آج تک کامیاب نہ ہو سکا۔

غزل

(از جناب فراق گورکھپوری)

سکوتِ فضا میں کھو جائیں
آسمانوں کے راز ہو جائیں
عجب تیرے چند تر دامن
سب کے داغِ گناہ دھو جائیں
سب کا جدا جدا ہی سہی
کس پہ ہنس جائیں کس پہ رو جائیں
میں آنے والی نسلوں کے
خیر کانٹے تو ہم نہ بو جائیں
تو رسوائیوں کا نام لے چھلے
عشق میں آبرو ڈبو جائیں
اس تنگنائے دنیا کی
وسعتِ بیکراں میں کھو جائیں
لگ گیا ہے؟ آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں
آئی فراق! دوست نہیں
کس سے کہئے کہ "آؤ سو جائیں"

افسانۂ ماضی

(لارڈ بائیرن کے احساسات واٹرلو کو دیکھ کر)

از محترمہ اختر قریشی بی، اے، بی، ٹی

آئیے چند لمحات کے واسطے واٹرلو کے میدانِ کارزار پر ٹھہر جائیں۔

مگر یہی تو وہ مقام ہے۔ جہاں نپولین کی عظیم الشان فرانسیسی سلطنت کا اختتام ہوا تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ یہاں اُس مشہور لڑائی کی کوئی بھی یادگار نہیں۔ جس پر آنے والی نسلیں فخر کر سکیں۔ یہاں تو خالی میدان پڑا ہے۔ اجاڑ اور ویران ...... المناک اور اُداس فضا..... خاموش سر بلند درخت..... کیا پوچھیں اور کس سے پوچھیں؟

اے مادرِ گیتی تو ہی کچھ بتا! تیرے ہزاروں بہادر بچوں نے اس جگہ وطن اور قوم کی محبت میں اپنی جانیں قربان کر دیں لیکن تو نے ایک دن بھی اُن کا ماتم نہ کیا۔ تیرے جگر گوشوں نے اپنے خون کا چھڑکاؤ تیرے سینے پر کیا۔ اور تیرے منہ سے آہ بھی نہ نکلی۔ تجھ جیسی سنگدل ماں تو اس عالم میں کوئی دوسری نہ ہوگی۔ غضب ہے کہ تیرے جگر کے ٹکڑوں کا خون تیرے لئے بہے اور تو اُف بھی نہ کرے.... ایک آنسو تیری آنکھ سے نہ نکلا۔ کیا ان کی جانوں کی قربانی کا یہی صلہ ہے کہ اُن کا نام اس جہان سے مٹ جائے اور تو انہیں بھول کر بھی یاد نہ کرے۔

...... وہ نونہال تیری ہی گود میں تو پل کر جوان ہوئے تھے! تیری ہی چھاتی پر کھیل کود کر پروان چڑھے تھے!!! اور پھر اے ماں! تیری ہی لاج، آن بان عزت اور نام کی خاطر اپنے سر خوشی اور فخر سے قربان کر دیئے۔ اُن کے دل میں جوش تھا اور سینے میں مادرِ وطن کی محبت!! اُن کے فولادی بازوؤں میں بل تھا! جوان خون رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ غیرت اور حمیت کا سمندر جوش میں آگیا۔ اور تیرے تقدس کی خاطر اِن جوشیلے نوجوانوں نے تلواریں نیام میں سے نکال لیں۔ اور دشمن پر پوری قوت سے ٹوٹ پڑے۔ لوہے سے لوہا بجا.. میدانِ جنگ میں خون کی کیچڑ ہو گئی..... لیکن تیرے سپوت مقابلے میں جمع دشمن کے خون سے ہولی کھیلتے رہے...... ان کے زرہ بکتر خون سے رنگین تھے۔ اور تلواروں سے خون کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ لیکن جب تک ان بہادروں کے سانس چلتے رہے اُس وقت تک اُن کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی.... گولیوں کی بوچھاڑیں دشمن کی صفیں کی صفیں کاٹ کر رکھدیں اور ساتھ ہی تڑکے..... جنگ کے میدان میں وہ کارنامے دکھائے جن کی داستانیں دنیا کی تاریخ میں سونے کے حروف سے لکھی جائیں گی۔ اور جب وہ دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن کر خاک پر ڈھیر ہو جاتے تھے۔ تو اُن کی نیم وا آنکھیں اپنے ساتھیوں کو یہی پیغام دیتی تھیں.....

"دیکھو مادرِ وطن پر آنچ نہ آنے پائے"...... اور ایسا ہی ہوا.....

اے ماں! تیرے سورماؤں نے تجھ پر آنچ نہ آنے دی...... وہ تیری بھینٹ چڑھ گئے.... لیکن حیرت تو یہ ہے کہ تیری آنکھ سے آنسو نہ نکلا..... ماتم تو کرنا کجا.... تو ایک دن اُداس بھی نظر نہ آئی.... بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے خون سے زرخیزی میں ایسا اضافہ ہوا کہ تیری سرسبزی اور شادابی میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی گئی۔ اپنے بچوں کے خون سے تجھے ہی پھولتے پھلتے دیکھا۔

عبرت کا مقام ہے کہ اتنی بڑی لڑائی کہ جس نے ایک وسیع سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا اُس کا کچھ بھی نشان اس سرزمین پر باقی نہیں..... اگر انسان کا یہی انجام ہے تو ان لڑائی جھگڑوں سے کیا فائدہ.......

آیئے ذرا اس لڑائی کی سوگوار یاد تازہ کر لیں۔

۱۸۱۵ء ۱۶ جون کی ایک حسین و دلفریب شام تھی۔ بلجیم کے دار الخلافہ برسیلز میں ایک شاندار محفلِ رقص منعقد ہونے والی تھی، مرد عورتیں لڑکے، لڑکیاں سبھی محفل میں جانے کیلئے آراستہ ہو رہے تھے۔ ہر شخص بے انتہا مسرور تھا۔ لڑکیاں اُس رنگین شب کی بے تابی سے منتظر تھیں۔ جبکہ حسین و رعنا نوجوانوں کی نگاہیں ان کے دلربا چہروں پر جمی کی جمی رہ جائیں گی۔ ناز و انداز کے مظاہرے کے لیے اس سے زیادہ سنہری موقعہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔ آخر کار انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ وقت معینہ پر رقص گاہ کے دروازے پر شاندار گاڑیوں کا تانتا لگ گیا۔ برسیلز کی حسین ترین جوانیاں کھنچ کھنچ کر رقص گاہ کی جانب آنے لگیں۔ یکایک دلفریب نغموں سے رقص گاہ کی فضا میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ تیز روشنی سے رقص گاہ جگمگا رہی تھی۔ فضا نکہت بیز تھی بیش بہا قیمتی جھلملاتے ہوئے ملبوسات کی چمک دمک نے ایک عجب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ نوجوانوں کی مشتاق نظریں پھول سے رخساروں پر شرم و حیا کا غازہ مل رہی تھیں۔ اپنے حسن و جمال کی تعریف سنکر ماہ جبینوں کا تیز تیز تنفس، زیرلب مسکراہٹ اُن کے چہروں کو اور بھی دلفریب بنا رہی تھی۔ بالآخر رقص شروع ہوا۔ بلند و بالا خوبرو منچلے نوجوان، مرمریں بازوؤں والی سیمیں تن عشوہ طراز نازنینوں کی زریں کمر کو حلقے میں لے کر رقص کرنے لگے۔ فضا میں مستی سی چھانے لگی۔ زندگی اور مسرت ذرہ ذرہ میں بھر گئی۔ نقرئی قہقہوں اور تالیوں تحسین و آفرین کے

...کی سرسراہٹ اور نغمات کی مترنم تانوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ کیا۔ کی ... سے سرخ آنسو

عالم ... کے بینگری کی دُنیا میں پہنچا دیا تھا مستی سے بھرپور قدم خوش آہنگ ... کی گت کے ساتھ ساتھ اُٹھنے لگے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اپنی رنگ رلیوں میں شب بسر کی جائے۔

اس مسرت کے فلک شگاف قہقہوں سے اس ایوان نشاط کے بام و در گونج رہے تھے اور یہ رنگ رلیاں بہار پر تھیں کہ زور سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔۔۔۔ سب چونک پڑے۔۔۔۔ باجے کی گت پر تھرکنے والے قدم اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہوگئے۔ مسرت کے فلک شگاف نعرے ایک دم دھیمے پڑ گئے۔ مے نشاط کے مخمور متوالے خوف و ہراس سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔۔۔۔ نشیلی آنکھوں والی حسین دوشیزاؤں کی چاندی سی پیشانیوں پر فکر کی گھٹائیں چھا گئیں۔۔۔۔ معنی خیز نگاہوں سے وہ باہر کی جانب دیکھنے لگیں۔ کسی نے کہا کہ گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ یہ سنکر ان کے ہراساں چہروں پر پھر شادابی کی لہر دوڑ گئی۔ اور بدستور سابق رنگ رلیوں میں مصروف ہوگئے۔ لیکن دوبارہ پھر وہی دھماکہ ہوا۔ اور اب کی مرتبہ بہت صاف تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا، آواز صاف اور زور سے آنے لگی۔۔۔۔ اور اب حقیقت اچھی طرح ان پر واضح ہوگئی کہ بلاشبہ یہ طوفانی گرج اور دھماکے غنیم کی توپوں کے چھوٹنے کی آواز ہے!!! ایوان نشاط میں کھلبلی سی مچ گئی۔ آنے والے خطرے کے تصور سے خون اُن کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ حسینان برسیلز کے چہرے جن پر ابھی خوشی سے خون دوڑ رہا تھا۔ خوف سے سفید پڑ گئے۔ نشیلی آنکھوں کی چمک دمک معدوم ہوگئی۔ اور اسکی جگہ خوف و ہراس نے لے لی۔ یاقوتی لب گلاب کی پتی کی طرح تھرتھرانے لگے۔ محفل نشاط ایک دم درہم برہم ہوگئی۔ رقص کرنے والے حسین جوڑے حسرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ کیونکہ اب جدائی کا وقت آپہنچا تھا۔ نوجوانوں کو اپنے عزیزوں، ماں باپوں اور دوستوں کو الوداع کہنا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ان کی عزیز صورتیں پھر کبھی دیکھ سکیں گے۔ جبکہ ایسی خوبصورت رات کے بعد ایک ایسا ہیبت ناک دن نکلا، جو خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

آخر کار وطن کی محبت عزیزوں کی محبت پر غالب آئی۔ جذبۂ غیرت جوش میں آیا۔ اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنے گھر بار اور سب عزیزوں کو الوداع کہا۔ ماؤں نے اپنے جگر گوشوں کو، بہنوں نے اپنے عزیز بھائیوں کو کانپتے ہوئے ہونٹوں، نمناک آنکھوں اور غمگین دلوں کی آہوں کے ساتھ رخصت

تھرتھراتے ہوئے لب شب کی رنگ رلیوں ... پر ... اشکبار، خوف و ہراس سے کپکپاتے ہوئے قدم۔ قوت گویائی قدرت نے سلب کرلی ہو ساہو گیا ہو۔ حسرت بھری آنکھیں نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا کیا پیغام دے رہی تھیں۔ رنج و غم سے نوجوانوں کا بھی کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ بار بار مڑ مڑ کر اپنے گھروں کو دیکھتے اور لوٹ لوٹ کر بیوی بچوں سے ملتے۔ اور اُن کی آنکھیں بند ہو جاتے۔ گو اپنے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ غرض اس طرح جیسے جسم انسانی سے گوشت جدا ہو۔ وہ اپنے عزیزوں سے جدا ہوئے۔

فوج کو ہتھیار بندی کا حکم دیا جا رہا تھا۔ سپاہیوں نے اپنی اپنی بندوقیں، تلواریں اور ڈھالیں سنبھالیں۔ کیا سوار اور کیا افسر سب زرہ بکتر پہن گھوڑوں پر سوار پو پھٹنے سے پہلے ایک جگہ جمع ہوگئے۔ فوج کی صف بندی دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ شروع ہوگئی۔ اب توپوں کی آوازیں بالکل قریب آگئی تھیں۔ مشہور فاتح نپولین کی فوج آگے بڑھتی چلی آرہی تھی۔

توپوں کی آوازوں نے سوتے ہوئے شہریوں کو بھی جگا دیا۔ وہ سب گھر سے نکل کر باہر کھڑے ہوگئے۔ خوف سے اُن کے چہرے زرد اور ہونٹ سفید پڑ رہے تھے۔ اور منہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ آہستہ آہستہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے کہ "دشمن آگیا۔ دشمن آگیا"!

صبح کا سہانا وقت تھا۔ لیلائے شب اپنی زلفیں سمیٹ کر رخصت ہوچکی تھی۔ اور خورشید خاور اپنی سنہری کرنوں سے عالم کو منور کر رہا تھا۔ فوجیں تیار ہو کر دشمن سے مقابلہ کیلئے جا رہی تھیں۔ ہر طرف ایک سناٹا اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کی ڈالیاں آہستہ آہستہ جھوم رہی تھیں اور اُن پر شبنم کے قطرے ایسے معلوم ہو رہے تھے گویا کہ قدرت نے ان نوجوانوں کی آنے والی موت پر آنسو بہائے ہیں جو اس وقت ہمت اور فتح کی اُمید یں دل میں لئے، غرور سے سر اُٹھائے، سبزہ کو پاؤں سے روندتے ہوئے لڑائی کے میدان کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ لیکن آہ! یہی گھاس ان پر اُگے گی۔ جبکہ وہ گھاس ہی کی مانند کٹ کٹ کر اُس سرد و سخت زمین پر گریں گے۔

کیا خبر تھی کہ دم کے دم میں واقعات یوں پلٹا کھائیں گے۔ جنگ سے پہلے شام کو یہی نوجوان سوز و ساز زندگی اور مسرت سے بھرے ہوئے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اُن کے دل فکروں سے آزاد تھے۔ ان کے مسرت کے فلک شگاف نعروں اور حسینوں کے نقرئی قہقہوں نے ایوان نشاط کو جنت کا نمونہ بنا رکھا تھا۔ آدھی رات کو توپوں کی آواز نے ایک دم اُن کو کانپنے والے

...سے آگاہ کیا۔ اور اپنے عزیزوں اور ہر اُس شے سے جو اُنہیں پیاری تھی جدا ہو کر دن نکلنے سے پیشتر ہی مسلح ہو کر لڑائی کے میدان "واٹرلو" پر آ گئے
. . . . اُن کے بازو فولادی تھے۔ اور عزم آہنی . . . .
اور دل میں جوش کا دریا موج زن . . . . . . فتح و نصرت کی اُمیدیں لئے ہوئے وہ غنیم سے مقابلے پر جم گئے . . . . . . پھر توپوں نے گرجنا شروع کیا
. . . . . . اور گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی . . . .
سر کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ تلواروں کی جھنکار، توپوں کی گرج۔ گھوڑوں کا ہنہنانا۔ سب کچھ مل کر قیامت کا نمونہ پیش کر رہا تھا . . . . . .

میدان کارزار پر گرد و غبار کی تاریک چادر چھائی ہوئی تھی۔
اور جب لڑائی ختم ہوئی تو میدان میں لاشوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ زخمیوں کے سسکتے ہوئے جسم۔ عالم نزع میں زخمی سپاہیوں کی دلدوز چیخیں۔ کٹے ہوئے اعضاء۔ موت کی تباہی کے شاہد تھے۔ خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ گھوڑے اور سوار . . . . دشمن اور دوست . . . . بوڑھے اور جوان سب خون میں لت پت کٹے پڑے تھے
. . . . یہ ہے اِس میدان جنگ کی داستانِ الم ناک جس کا اب بھی کوئی نشان باقی نہیں۔

میرے لئے!!

(از محترمہ بیگم)

چھا رہی ہیں چار سُو بے کیفیاں میرے لئے
یاس سے معمور ہے سارا جہاں میرے لئے

نوحہ گر بادِ صبا ہے اور شبنم اشک بار
غم زدہ سی ہے بہارِ گلستاں میرے لئے

پھول افسردہ ہیں مُرجھائی ہوئی ہے ہر کلی
کر رہی ہیں بلبلیں آہ و فغاں میرے لئے

جس طرف دیکھو نظر آتی ہے ہر شے سوگوار
جلوہ گر ہیں ہر طرف مایوسیاں میرے لئے

منحصر ہے بر نہ آنے پر حیاتِ آرزو
کامیابی ہیں مری ناکامیاں میرے لئے

اِس مسلسل کشمکش ہی میں ہے لطفِ زندگی
پھر مزا کیا، ہوں اگر آسانیاں میرے لئے

...گاہ نہ تپ درون را

(از محترمہ صالحہ عابد حسین)

قسط دوم

ماجد کسی وجہ سے شادی میں نہیں آسکا شادی ہوگئی
...حسن کو اپنی دُلہن حد سے زیادہ پسند آئی۔ شادی کے دو مہینے
...بعد خط اُس نے ماجد کو لکھا وہ بھی اس میں موجود ہے۔ لو سُنو!

"میرے پیارے دوست! تمہاری شکایت سر آنکھوں پر کہ میں نے ...دن سے خط نہیں لکھا مگر مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے خوشی سے معاف کر دو گے ...بس اپنی بھابی کے متعلق پوچھتے ہو کہ کیسی ہیں؟ پسند آئی یا نہیں؟ کوئی اور ...تا تو میرا خاموشی کے کوئی جواب نہ ملتا۔ مگر تم میرے دوست اور راز دار ہو۔ تم ...کیسی شرم۔

ناصرہ کو جب میں نے پہلے پہل دیکھا تو چند لمحے کے لئے سکتے میں آگیا۔ ...! میں نے کبھی کسی عورت کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ اسے نہ میری طبیعت ...کرتی تھی اور نہ میرا دل ہی چاہتا تھا۔ لیکن ناصرہ میری اپنی تھی۔ خدا رسول ...بچوں کی اجازت سے مجھے ملی تھی۔ شاید اس لئے کہ عمر میں پہلی عورت وہی ہے ...سے مجھے دلچسپی ہوئی وہ مجھے بیحد حسین معلوم ہوتی ہے۔ اسکی بڑی بڑی ...ب آلود آنکھیں، سُرخی مائل گندمی رنگ، چھوٹا سا خوبصورت دہن اور صراحی دار ...گردن، بھرا بھرا ڈیل اور لمبے لمبے بال۔ اس سے زیادہ حسین بیوی کسی کو ...ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ پھر ایسی سیدھی، شریف، نیک دل اور بے زبان ...کہ کیا بتاؤں۔ آپ کے ہر حکم پر سر جھکانا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ میں اس کی ...برداری کرنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ میرے چشم و ابرو کے اشارے پر چلنے کو تیار اور ...خدمت کو حاضر ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں بھی انسان ہوں۔ میرے اندر خون اور حرارت ہے۔ میری دُنیا بھی رنگین اور دلکش ہے۔ امجد! میں آج ...اپنے کو دُنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھتا ہوں۔ جسے یہ دولت بے بہا ...مگر میری کم نصیب دُلہن! اُسے مجھ سے بیاہ کر کے کیا حاصل ہوا۔ وہ اس قابل ...کہ بہترین سے بہترین ملبوسات، اعلیٰ سے اعلیٰ زیورات میں سجی بنی رہتی۔

[illegible] جھوٹی۔ ایک [illegible] کی جگہ۔ اور جھوٹے موٹے کام [illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ خود بہت قانع اور صابر [illegible]۔ مجھ سے کبھی کوئی فرمائش یا شکایت نہیں کرتی۔ مگر میں اپنے دل [illegible] کروں؟

تم کہو گے کہ اس نے بیوی کی تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ نہیں بھائی یہ جھوٹی تعریف نہیں۔ اور پھر میرے نقطہ نظر سے دیکھو جسے عمر میں پہلی مرتبہ کسی سے دلچسپی یا محبت ہوئی۔ پہلی مرتبہ۔ تمہارا محسن"

محسن کی گرویدگی کو ہر شخص حیرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ بہن خوش تھیں کہ ان کا انتخاب اس قدر کامیاب رہا۔ محسن کا مرجھایا ہوا چہرہ اب شگفتہ اور ہنستا نظر آتا۔ ان چار ماہ میں اس کو معمولی نزلہ تک نہیں ہوا۔ لیکن ایک تازہ آفت نے محسن کو اس حسین خواب سے جگا دیا۔ اور وہ تھا قرض کا تقاضہ۔ محسن سخت پریشان ہوا۔ بہن نے سُنا وہ بھی متفکر ہو گئیں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہار کر کہا دُلہن کا زیور لیکر قرض ادا کر دو۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن محسن نے یہ کسی طرح گوارا نہ کیا۔ جس کی یہ آرزو ہو کہ بیوی کو نت نئے زیور لا دوں وہ بھلا یہ کیسے کر سکتا تھا۔ بہن نے کہا اللہ کریگا ہاتھ فراغ ہو جائے گا تو دُگنا بنوا دینا۔ پر محسن نہیں مانا۔ اُداس ہو کر بولا۔ مجھ سے ان کا رنجیدہ چہرہ اور ننگے ہاتھ کان نہیں دیکھے جائیں گے۔ گئی ہوئی چیز غریبوں کو بھلا کہاں نصیب ہوتی ہے۔ غرض اُس نے قرض خواہ کو قسط وار روپے دینے پر راضی کر لیا۔ اور دُگنی محنت اور جوش سے کام کرنا شروع کیا۔ دکان پر کام کرتا، ٹیوشن کرتا، اِدھر اُدھر سے کام لے آتا اور قرض کی قسط ادا کر دیتا۔ اور بیوی کو بھی چھوٹے موٹے تحائف دیتا رہتا۔

جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ عنقریب بچے کا باپ بننے والا ہے تو خوشی کے ساتھ اُسے ایک نئی فکر بھی پیدا ہو گئی اور بچارے نے طاقت سے زیادہ کام شروع کر دیا۔ چوبیس گھنٹے کی فکر اور کام نے اسکی صحت پر بُرا اثر ڈالنا شروع کیا۔ رنگ سیاہ پڑ گیا، چہرہ ستّ گیا۔ اور بشاش چہرہ پھر فکر مند نظر آنے لگا۔ سب سے پہلے بہن نے تنبیہہ کی کہ اس قدر محنت نہ کرو صحت خراب ہو جائیگی۔ بھائی نے بھی کہا۔ لیکن محض زبان سے۔ یہ نہ ہوا کہ خود بھی کچھ کر کے اس کا بار کم کرتا۔ بیوی کم عمر اور ناتجربہ کار تھی لیکن آخر اُس نے بھی میاں کی کمزوری اور اضمحلال کو محسوس کر ہی لیا۔ اور اُسے سمجھایا کہ اتنی محنت نہ کرو۔ تمہاری سلامتی میں مجھے چٹنی روٹی ہزار نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ پر محسن نے ہنس کر ٹال دیا

چند مہینے یوں ہی گذر گئے اور محسن کی صحت خراب ہونے لگی۔ نزلہ زکام حرارت وغیرہ اکثر ہو جاتی۔ انہی دنوں کا محسن کا ایک خط ماجد کے نام کا سنو:

"میرے پیارے ماجد بھائی! میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ بدنصیب کو کبھی خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ ناصرہ سی نعمت پا کر بھی مجھے خوشی حاصل نہ ہو سکی۔ اور ہو کہاں سے۔ دن رات خرچ کی فکر، قرض کے ادا کرنے کا خیال اور ناصرہ کی تکلیف کا احساس مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ دن رات کی محنت نے صحت بھی خراب کر دی ہے۔ پہلے معمولی نزلہ کھانسی ہوا۔ جوشاندہ کا استعمال ہوتا رہا مگر فائدہ نہ ہوا۔ روز شام کو طبیعت بھاری ہو جاتی اور حرارت محسوس ہونے لگتی۔ آخر ایک دن زور کا بخار چڑھ آیا۔ سخت انفلوئنزا ہو گیا۔ حکیم نے دیکھا نسخہ لکھا۔ پورے مہینے بھر تک علاج ہوا تب جا کر دفتر جانے کے قابل ہوا۔ اگرچہ حکیم کا اصرار تھا کہ ایک مہینے بیس دن اور آرام لو۔ مگر آرام لیتا تو کھاتا کیا؟ گھر والے فاقے کرتے اور میں بیٹھا دیکھتا؟ اب کام پر جاتا ہوں مگر طبیعت گری گری اور اداس رہتی ہے۔ ایک اور حکیم کو دکھایا ہے وہ کہتا ہے کہ نزلہ بگڑ گیا ہے اسی لئے کھانسی اور حرارت ہے۔ پر مجھے کچھ اور ہی خوف ہے۔ میری زندگی تو کچھ ایسی خوشگوار نہیں کہ زیادہ جینے کی آرزو کروں۔ پر آپا اور کم عمر ناصرہ کا خیال کرتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں نہ ہوا تو یہ دونوں کیا کریں گی؟ ناصرہ بچے کی ماں بننے والی ہے۔ بجائے اس کے کہ اس زمانے میں اسے خوشی اور اطمینان ہوتا۔ اسے دن رات میری فکر رہتی ہے۔ مجھے کل ہی معلوم ہوا کہ اس نے اپنا ایک زیور بیچ کر حکیم کی دوا اور فیس کے دام دئیے ہیں۔

آہ ــــ بدنصیب لڑکی ــــ 34658

چار دن بعد ــــ بھیا چار دن سے تیز بخار ہے۔ دفتر جانا چھوٹا ہوا ہے۔ خدا جانے کیا ہوگا۔ تمہارا مریض محسن۔"

ماجد کو محسن کا یہ خط ملا تو وہ بدحواس دوڑا ہوا وطن گیا وہ یہاں دو سو کا نوکر ہے۔ محسن کو دیکھ کر وہ سکتے میں آگیا۔ محسن ان کا ساتھ کا کھیلا بچپن کا دوست اور نہایت عزیز بھائی تھا۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ اس نے کہا دق شروع ہو چکی ہے۔ اور اگر نہایت احتیاط سے علاج کیا جائے تو اچھا ہونے کی پوری امید ہے۔ دق کا نام سن کر دونوں بھائیوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ محسن کو لمبی چھٹی دلائی اور باقاعدہ ڈاکٹری علاج کا انتظام کر کے ماجد واپس چلے گئے۔ اور محسن کے چھوٹے بھائی نے دوڑ دھوپ کر کے بیس روپے کی نوکری کر لی۔ ناصرہ نے چپکے چپکے اپنی سب چیزیں اور استعمال کی چیزیں بیچ ڈالیں تاکہ محسن کو اچھی غذا ملتی رہے۔ دوا وغیرہ کا خرچ تو ماجد نے اٹھا لیا تھا۔ چند دن طبیعت بحال رہی تھی کہ جاہل عورتوں نے کہنا شروع کیا "بوا توبہ۔ اللہ نہ کرے محسن کے دشمنوں کو دق ہو گئی ہے۔ کچھ نہیں نزلہ بگڑ گیا ہے۔ فلاں حکیم کو دکھاؤ۔ ان کا علاج ایک پر ایک ہے۔" "ان موئے ڈاکٹروں کی زبان کو دق ہوتی ہے۔ جسے چاہا دق کہہ دیا۔ دلہن! تم میاں صاحب سے گنڈا منگا کر گلے میں ڈالو۔ اللہ نے چاہا اسکی برکت سے ایک پندرھواڑے میں جی بالکل اچھا ہو جائیگا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹری علاج چھوڑ کر پھر حکیم کا علاج شروع کیا گیا اور گنڈے تعویذ بھی ہونے لگے۔ مہینہ بھر کے اندر محسن کی حالت اور خراب ہو گئی۔ ماجد کو خبر ہوئی تو وہ آکر محسن کو مع اسکی بیوی بہن اور بھاوج کے یہاں لے آیا اور باقاعدہ علاج شروع کرا دیا۔

محسن کی دلہن کی حالت عجیب تھی۔ بچاری لڑکی میاں کی حالت دیکھ دیکھ کر سہمی جاتی تھی۔ خاموش اور شرمیلی ہونے کے سبب منہ سے ایک حرف بھی نہ نکالتی۔ بس چپ چاپ سب کا منہ حسرت سے تکتی رہتی تھی۔ بہن نے بھائی کی خدمت میں دن اور رات ایک کر دیا۔ نہ دن میں ایک منٹ کو چین لیتی نہ رات کو آرام کرتی تاکہ سوچنے اور فکر کرنے کا وقت بھی نہ ملے۔

محسن ہر وقت بیوی کے کمرے میں لیٹا اسکی اداس صورت کو تکا کرتا۔ اسے اپنی زندگی سے مایوسی ہو چکی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زندگی کی جو چند گھڑیاں باقی ہیں وہ اپنی پیاری محبوب بیوی کے پاس گذارے۔ لیکن ناصرہ اتنی الھڑ تھی کہ اسے آنے والی مصیبت کا پورا احساس ہی نہ تھا۔ ماجد کے پاس آنے کے دو مہینے بعد ناصرہ کے بچہ ہوا۔ بہت پیاری صورت مگر ماں کی پریشانی اور فکر کا اثر بچہ پر بھی تھا۔ بے حد کمزور اور دبلا۔ محسن کی حالت بدستور خراب دیکھ کر ڈاکٹر اور ماجد دونوں کی رائے ہوئی کہ اسے ٹی بی ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ محسن ہسپتال جانے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی کی آخری گھڑیاں اپنی بیوی اور بچے اپنی بہن اور بھائی سے الگ بسر کرے۔ لیکن عزیزوں کو اتنی مایوسی نہیں تھی۔ جب تک سانس ہے تب تک آس باقی رہتی ہے۔ خصوصاً اسکی کم عمر اور ناتجربہ کار دلہن کو تو میاں کی صحت کا یقین تھا۔ وہ شاید یہ سمجھتی تھی کہ اس کم عمری میں جب کہ اس نے دنیا میں ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا۔ خدا اسے اتنا بڑا صدمہ نہیں دیگا۔ بہشت کی محض جھلک دکھا کر اسے تپتے ہوئے بیابان صحرا میں نہیں چھوڑا جائیگا۔ اسکی زندگی اس قدر جلد برباد نہیں ہوگی۔ اسکا جیتا دولہا زندہ رہے گا ــــ ضرور رہے گا ــــ

غزل

(از محترمہ آمنہ [illegible])

ہائے کیا تابشِ خورشید و رمِ شبنم ہے
میرے احساس کی دنیا بھی بڑا عالم ہے

دل سے مٹ جائے محبت کہ بنے نقشِ دوام
آج جو کچھ بھی نہ ہو جائے جنوں سے کم ہے

کیسی طوفانِ مسرت کی خبر ہے شاید
نغمۂ شوق کی لے آج جو کچھ مدھم ہے

نغمہ و ساز بھی، ساقی بھی، مے و مینا بھی
دل مگر پھر بھی پریشاں ہے یہ کیا عالم ہے

کیوں چھلک اٹھتی ہے رہ رہ کے یہ احساس کی مے
کیا مری یاد میں وہ چشمِ حسیں پُرنم ہے

عشق ہی کیفِ جوانی ہے، اگر افسردہ
حسن ہی نقشِ حقیقت ہے مگر مبہم ہے

میرا افسانہ ہو دلچسپ گراے [illegible]
نہ ہمہ نغمۂ عشرت، نہ ہمہ ماتم ہے

[illegible] ہسپتال جانے پر راضی کر لیا۔ [illegible] ہسپتال [illegible] تیسرے چوتھے دن بہن اور بیوی اور ہم بھی دونوں بھاوجیں [illegible] آجاتی ہیں۔ ہر روز آتے ہیں۔ مریض کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ آج سنا ہے کہ حالت زیادہ خراب ہے۔ زبان بھی بند ہوگئی۔ ہائے افسوس! کیسی حسرتناک حالت ہے۔"

ساوتری کی آواز فرطِ گریہ سے رک گئی۔ اور میں بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

صبح اخبار میں خبر پڑھی کہ محسن کا انتقال ہوگیا۔ اور اسکے عزیز صبح ہی لاش کو لے گئے۔ ہم دونوں سکتے کی سی حالت میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

اگلے دن میں اور ساوتری دونوں محسن مرحوم کی بیوی اور بہن کے پاس پرسے کے لئے گئے۔ ایک محلے سے مکان پر جا کر تانگہ رکا۔ پردیس کا واسطہ تھا۔ باہر مردوں کے پاس تو چند احباب اور جان پہچان والے جمع تھے مگر اندر صرف گھر کی چار عورتیں تھیں۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں میلی سی دری کے فرش پر محسن کی بیوی، بہن اور دونوں بھاوجیں بیٹھی تھیں۔ دونوں بھاوجیں زار و قطار رو رہی تھیں۔ بہن کی تو ایسی بُری حالت تھی کہ دیکھ کر کلیجہ پھٹتا تھا انتہائی ضبط کے سبب اگرچہ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ مگر چیخیں پھر بھی نکل جاتی تھیں۔ اور — آہ! — محسن کی ڈیڑھ سال کی بیاہی نئی دلہن لٹھے کی میلی سی سفید چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ نہ ہاتھوں میں رنگین چوڑیاں تھیں نہ کانوں میں بالیاں اور ناک میں کیل۔ ہاں اجڑے سہاگ کی نشانی ہاتھوں میں مہندی اب بھی موجود تھی۔ وہ گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اور اسکی بڑی بڑی سیاہ کھلی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے گول گول قطرے ڈھلک ڈھلک کر اسکے سینے پر گر رہے تھے۔ جیسے کسی صناع کی بنائی ہوئی پتھر کی مورتی کی آنکھوں سے سچ مچ کے آنسو گرنے لگے ہوں۔ اور — اور اس کی گود میں ایک چھوٹا سا پیارا پیارا بچہ اپنی یتیمی کی ہولناک مصیبت سے بے خبر لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اور اپنی گول گول معصوم آنکھوں سے ماں کو دیکھ کر گویا اُسے ڈھارس بندھا رہا تھا کہ "ماں نہ رو۔ تیری جوگی کا سہارا۔ اور پیارے سے ناشاد زندگی کا کٹوانے والا — میں موجود ہوں"

اس بچہ کو دیکھ کر میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اور ہوک سی اٹھی۔ کیا دیر سویر یہ کمزور بچہ بھی اُسی موذی مرض کا شکار نہ ہو جائیگا۔ جس کی بھینٹ اس کا نوجوان ناشاد باپ ہوا!

معصوم محبت

(از محترمہ ہاجرہ مسرور لکھنوی)

صبح سے گھرا ابر چھایا ہوا تھا۔ اور بادلوں کی گرج سے معلوم ہوتا تھا کہ اولے پڑیں گے۔ سردی اس غضب کی پڑ رہی تھی کہ لحاف کے اندر سے ہاتھ نکالنا دشوار تھا۔ لیکن ننھی منیر حسب معمول صلاح الدین کے انتظار میں بھیا کے دروازے پر کھڑی اُسکی راہ تک رہی تھی۔ ماں نے اُسے اوڑھ کر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ تنویر نے ڈانٹا کہ "چلو آگ کے پاس بیٹھو۔ آجائیں گے تمہارے بھیا۔ عجیب آنا ہوگا" لیکن دھن کی پکی منیر نے کسی کی نہ سنی۔ آخر اس نے دیکھا کہ صلاح الدین اوور کوٹ کا کالر چڑھائے جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے جلدی جلدی چلا آرہا ہے۔ منیر خوشی سے اُچھلتی کودتی سڑک تک دوڑ کر اپنے صلو بھیا سے لپٹ گئی۔ صلو نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ معصوم بچی مجھے کتنا چاہتی ہے۔ اور اسکی بہن تنویر؟ وہ تو مجھ سے سیدھے مُنہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرسکتی۔ میں اسے کس قدر چاہتا ہوں لیکن وہ مجھ سے کتنی بے نیاز سی رہتی ہے۔

منیر اُس کی گود میں کچھ بے چینی سے بیٹھی تھی اس لئے بار بار کسمسا رہی تھی۔ صلو اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لیکن اس نے اُس کا ہاتھ غصے سے جھٹک دیا۔

"کیا تم بھی مجھ سے خفا ہو گئیں؟"

وہ مُنہ پھلائے پڑی رہی۔

"اچھا اگر میں تمہیں چاکلیٹ دوں تو مَن جاؤ گی؟"

"نہیں! اب میں آپ سے کبھی نہ منوں گی" اُس کے پیارے سے چہرے پر غصے کے باعث عجیب کیفیت پیدا ہو گئی۔

"کیوں ناراض ہو گئیں تم؟" صلو نے پوچھا

"آپ ہنستے جو نہیں۔ بس چُپ رہتے ہیں" اسے جیسے سچ مچ صلو کی خاموشی سے تکلیف ہو رہی تھی۔

"ارے بس! اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں۔ لو میں ہنستا ہوں" اور وہ ہنسنے لگا۔

"اب آپ کتنا ہی ہنسئے میں ہرگز نہ منوں گی آپ سے۔" وہ صلو کی گود سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اچھا اب میں تمہارے گھر سے چلا جاؤں گا۔"

وہ اس طرح گردن ہلا کر کہنے لگی جیسے اُسے صلو پر بڑا اختیار تھا۔

"میں آپ کو نہیں جانے دوں گی"

"تو پھر مَن جاؤ"

صلو نے اُسے دوبارہ اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔ اور منیر نے بھی اپنی ننھی ننھی باہیں اُس کے گلے میں ڈال دیں۔

"لڑائی ختم ہو گئی۔ اب یہ چاکلیٹ لو" صلو نے بہت سے چاکلیٹ اُسے دیئے۔

"بڑے اچھے ہیں آپ! لیکن دیکھئے جانے نہ پائیے گا مت"

اُس نے ایک دم کئی چاکلیٹ مُنہ میں بھر لئے۔ صلو پھر کسی سوچ میں غرق تھا۔

صلاح الدین اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد کسی اچھی ملازمت کی تلاش میں لکھنؤ میں اپنی خالہ کے ہاں مقیم تھا۔ امید ہی امید میں اُسے وہاں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ خالہ اپنے بھانجے پر جان چھڑکتیں اور منیر کو تو جیسے صلو بھیا کے بغیر ایک پل چین نہ پڑتا تھا۔ جب تک وہ گھر میں رہتا اسکا مُنہ صلو بھیا، صلو بھیا کہتے خشک ہوتا۔ اس کے باوجود صلو کچھ رنجیدہ سا رہتا۔ اسے اپنی زندگی میں ایک خلا سا معلوم ہوتا جسے پُر کرنے کیلئے اُسے خوبصورت تنویر کے حسین التفات کی ضرورت تھی۔ لیکن تنویر اُس سے اس قدر بے نیاز سی رہتی جیسے اسے یہ احساس ہی نہ تھا کہ کوئی اُس کے میٹھے بول سننے کے لئے بے چین ہے۔ کسی کی اُداس نظریں اس کا پیچھا بھی کیا کرتی ہیں۔ یا پھر اس کے دل کے کسی گوشے میں بھی محبت کی کوئی چنگاری سلگ رہی تھی۔ اور جسے وہ دُوری کے چھینٹوں سے بجھانا چاہتی تھی۔ بہرحال صلو اس کے طرزِ عمل سے اکثر رنجیدہ رہا کرتا۔ اسی طرح ننھی منیر بھی اس کے لئے پہروں چُپ چاپ پھرا کرتی۔

موسم انتہائی دلکش تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے دور سے دوڑ دوڑ کر آئے اور آپس میں مدتوں کے بچھڑے ہوؤں کی طرح مل جاتے۔ صلو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا تنویر کو دیکھ رہا تھا جو سائبان میں آرام کرسی پر دراز کسی کتاب

[illegible] ... اور تنویر چپ چاپ اسکی طرف [illegible]
اور صلّو کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ شاید [illegible] کہیں اسی طرح [illegible]
[illegible] جاتے۔ اور وہ جلدی سے پلٹ کر اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ رہا۔

"صلّو بھیا! باہر دیکھئے! کتنا اچھا موسم ہے" منیر دوڑتی ہوئی [illegible]
[illegible] کا لحاف کھینچنے لگی۔

"تم جاؤ منیر! مجھے لیٹا رہنے دو۔"

"آپ کیوں نہ جائیں گے باہر؟"

"ڈر لگتا ہے۔"

"بادلوں سے" منیر نے حیرت سے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔

"نہیں! تمہاری آپا سے۔" صلّو نے دل کی بات کہہ دی۔

"کیوں؟" اسکے بھولے بھالے چہرے پر سنجیدگی جھلکنے لگی۔

"وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں نا۔"

"اسی لئے آپ چھپ چھپ سے رہتے ہیں؟" اس نے اپنا گلابی رخسار [illegible] چہرے پر رکھ دیا۔

"ہاں!" اسے اعتراف کرتے بن پڑی۔

وہ اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اور جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے کچھ سوچنے لگی۔

صلّو اسکی معصومیت سے لبریز حرکتیں دیکھتا رہا۔

اس نے ایک بار سائبان کی طرف دیکھا۔ جہاں تنویر آرام کرسی پر [ک]تاب دیکھ رہی تھی۔ اور پھر وہ پھرتی سے صحن پار کر کے اسکے پاس پہنچ گئی۔

"آپا!"

"ہوں" تنویر نے کتاب بند کر کے منیر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"آپ صلّو بھیا سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟ مجھے بتایئے۔" منیر نے [illegible] لہجے میں پوچھا۔

"خوب! تم تو اس وقت منی سی رانی معلوم ہو رہی ہو" تنویر نے [بات] کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"تو پھر رانی کی بات کا جواب دینا ضروری ہے۔"

تنویر زور سے ہنس پڑی

"کس بات کا جواب دوں؟"

"آپ صلّو بھیا سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟"

"تجھ سے کس نے کہا؟"

[illegible] ... [illegible] سے نفرت کرتی [illegible]
اس نے وہ ہجوم [illegible]
تنویر [illegible]

"تمہارے بھیا جھوٹ بکتے ہیں۔ ... [illegible] سے نفرت کرتی ہیں،
دیکھو سب سے بولتے ہیں لیکن کبھی مجھ سے ہی بات [illegible]"

اس نے منیر کے بالوں میں انگلیاں الجھا دیں۔ اور کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"آپا! آپ بڑی اچھی ہیں۔ میں صلّو بھیا سے کہہ دوں گی کہ آپا آپ کو بہت چاہتی ہیں۔ لیکن آپ ہی اُن سے نہیں بولتے۔"

"اپنے بھیا سے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ میں تم کو [illegible] گی۔"

منیر اسکی گود سے اتر گئی۔

"میں تو ضرور کہوں گی۔ مار لیجئے آپ ـــــ" اور وہ [illegible] جانے لگی۔

"سنو تو منیر" وہ اُسے پکڑنے دوڑی۔ لیکن منیر صلّو کی گود میں [بیٹھی] ہوئی اپنی آپا کی صفائی پیش کر رہی تھی۔ تنویر کچھ کھسیانی سی ہو کر لوٹ آئی۔ اور صلّو زور سے ہنس دیا۔

منیر اس دن بہت خوش تھی۔ کیونکہ اس کے صلّو بھیا بات بات پر ہنس رہے تھے۔ اور اسے اپنے بھیا کا ہنستا ہوا چہرہ بہت ہی اچھا لگتا تھا۔

اب منیر اکثر تنویر کو صلّو کے کمرے میں پکڑ لاتی اور تنویر بھی ہلکی سی مزاحمت کے بعد اسکے ساتھ ہو لیتی۔ وہ کمرے کے وسط میں نئے آئے ہوئے مہمان کی طرح جھجکی کھڑی رہتی۔ اور صلّو؟ وہ بھی اپنی جگہ پر کھڑا اُسے دیکھا کرتا۔ منیر اپنی بہن کا آنچل کھینچتے ہوئے کہتی۔

"باتیں کیجئے صلّو بھیا سے۔"

"کیا باتیں کروں؟" وہ کھڑکی سے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے کہتی اور صلّو کو ایسا محسوس ہوتا کہ ننھی منیر نے اپنے چھوٹے سے جانی کا [illegible] پھینک دیا ہے۔

اس کے بعد صلّو کوئی بات شروع کر دیتا۔ وہ [illegible] ہوں ہاں میں جواب دے دیتی۔ اور پھر کسی بہانے سے وہاں سے بھاگ جاتی۔

صلّو کو اپنا کمرہ ویران معلوم ہونے لگتا۔

ایک روز منیر نے صلّو کو گم صم کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا سچ مچ یہ ہیں صلو بھیا؟" اس کی ماں شفاف آنکھوں سے گھر جاتی معلوم ہوتی۔

"بھیا؟ صبح دا اتنا کہ اس وقت میرے پاس کوئی ہوتا۔"

اس نے جواب دیا اور سائبان میں کھڑی ہوئی تنویر کو دیکھنے لگا۔

وہ آہستہ سے دوسری طرف مڑ گئی۔

"میں تو ہوں صلو بھیا!" منیر نے حیرانی سے کہا۔

"رہشت پگلی! تم سے کوئی کیا بات کرے۔"

منیر کے دل پر گھونسہ سا [illegible] اور وہ رو پڑی۔ اس نے بھیا کے منہ سے ایسی بات کبھی نہ سنی تھی۔ اُسے پوری پوری اُمید تھی کہ صلو اُسے گود میں اٹھا کر اپنی بات کی تردید کر دیگا۔ لیکن وہ نہ بولا۔ وہ صحن میں ٹہلتی ہوئی تنویر کو دیکھنے میں محو تھا۔ منیر اپنے دل میں شکایتوں کا طوفان لئے اس کمرے سے چلی گئی۔

آخر تنویر و صلاح الدین کی شادی ہو ہی گئی۔ تنویر ابھی تک اپنی سسرال میں رخصت نہ کی گئی تھی۔ بلکہ صلو ہی تنویر کے ہاں مقیم تھا۔

منیر کا لاڈ پیار ختم ہو گیا تھا۔ نہ تو اب ہر وقت وہ صلو کی گود میں رہتی اور نہ اُسے چاکلیٹ ملتے۔ وہ پہروں دیوار سے لگی کھڑی رہتی کہ شاید صلو اُسے یوں کھڑا ہوا دیکھکر گود میں اٹھا لے۔ اور کہے "میری منیر من جاؤ اب" صلو اس کے قریب سے گذرتا تو اس کا ننھا سا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ جلدی جلدی سوچنے لگتی۔

"میں گھنٹوں ستاؤں گی بھیا کو۔ چاہے وہ مجھے بسکٹ دیں تب بھی نہ منوں گی۔ پھر وہ مجھ سے کہیں گے۔ منیر! اگر تم نہ بولوگی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تو پھر وہ ان کے گلے میں لپٹ جائے گی۔ بس میل ہو جائیگا"

لیکن وہ یہ سب سوچتی ہی رہ جاتی اور صلو اسے دیکھے بغیر قریب سے گزر جاتا وہ اپنی ناکامی پر زور زور سے رونے لگتی۔ ماں پوچھتی تو زمین پر مچل کر چیخنے لگتی۔ اس اُمید پر کہ اب صلو بھیا دوڑے آئیں گے اور کہیں گے۔ "ارے میری منیر کو کس نے مارا" لیکن کمرے سے سوائے قہقہوں کی آواز کے کوئی نہ نکلتا۔

اس کا ننھا سا دل صلو کی بے اعتنائی سے ٹوٹ گیا۔ وہ تنہا سائبان میں گھنٹوں کھڑی رہتی۔ کیونکہ سامنے صلو کا کمرہ تھا۔ اور صلو اور تنویر کو ہنستے بولتے دیکھکر سوچتی۔

مگر میں آپا اور بھیا کا میل نہ کراتی تو اچھا ہوتا۔ جیسے میں نے میل کرایا ہے وہ مجھ سے بولتے بھی نہیں۔ اور نہ ہی گود میں لیتے ہیں بس آپا ہی سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ اب میں بھی کبھی ان سے بات نہ کرونگی اور نہ ہی آپا سے بولوں گی۔

چند ماہ بعد صلاح الدین کو ملازمت مل گئی۔ اور اُسے لکھنؤ سے رخصت ہونا پڑا۔ ماں نے بیٹی کو گلے سے لگا کر آنسو بہائے۔ اور صلو کو شاد و آباد رہنے کی دعائیں دیں۔ صلو نے منیر کی طرف دیکھا جو سب سے الگ تھلگ منہ پھلائے کھڑی تھی۔ صلو نے اُسے زبردستی گود میں اٹھا لیا۔ لیکن وہ مچل کر اتر گئی۔

صلو نے بہت چاہا کہ چلتے چلاتے تو وہ اُسے منا ہی لے۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ منیر نے نفرت سے اپنا منہ دونوں کی طرف سے پھیر لیا۔ اور گھر میں سب اسکی معصوم خفگی پر ہنس دیئے۔ جب صلو اور تنویر تانگے میں بیٹھ گئے تو وہ نہ جانے کیوں دوڑ کر دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ صلو نے اُسے چھیڑنے کی غرض سے ہاتھ کا اشارہ کیا تو منیر کا دل چاہا کہ دوڑ کر چلی جائے۔ لیکن دوسرے لمحے تانگہ سڑک پر تیزی سے جا رہا تھا۔

ایک شام

(از محترمہ لالہ رخ)

اُف وہ بھی ——— اللہ۔ ممی اچھی ہیں ہم بالکل۔ ذرا یونہی سا سر میں درد ہو جانے کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ اب ہمیں دودھ اوولٹین پینا پڑے گا۔

اور ممی گھبرائی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔ شاید ڈاکٹر کو فون کرنے۔ میں نے لیمپ کا رُخ مسہری کی طرف کر کے آسکر وائلڈ کی ایک کتاب اُٹھائی۔ ڈرائنگ روم میں سے ریڈیو کی آواز آ رہی تھی۔ وہی اختری فیض آبادی کی ہمہ خراشی تانیں ——— اور پھر مجھے یاد آیا کہ ابھی کالج کا بہت سا کام کرنا باقی ہے اور اگلے ہفتے سے ششماہی امتحانات شروع ہونے والے ہیں۔ دودھ اوولٹین اور سوڈا بائی کارب ... میں نے جھنجھلا کر کتاب نیچے قالین پر پھینک دی اور لیمپ کے نیلے شیڈ پر بنے ہوئے چینی نقش و نگار کو غور سے دیکھنے لگی۔

اور پھر خیالات کہاں کہاں بھٹک گئے۔ لیمپ کے سرخ شیڈ اور آدھے جلے ہوئے سگریٹ ——— بوہیمیا ——— لیلیٰ کو ارلو ——— تصویروں کے آڑے ترچھے بے تکے سے نقوش ——— ترچھی اور بڑی بڑی آنکھیں اور سبجھ پتلی اور لمبی انگلیاں ——— پس منظر میں دھندلا دھندلا نہ معلوم کیا۔ اور دھواں سا بل کھاتا اور اوپر کو اٹھتا ہوا ——— لمبے لمبے فرانسیسی دریچے اور ان میں عجائب کے افسانے۔ نپولین اور لارڈ نیلسن۔ بچارے کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں بھی تو درد ہو رہا ہے ——— اور ایک لیڈی ہملٹن تھی ——— اور پھر یہ اتنے سارے "ازم" ——— "سوشلزم"۔ "کمیونزم"۔ "فاشزم" "ناتھی ازم" ——— وزم وبزم ——— اُف وہ بھی ——— توبہ۔

اور میری نظر رسالہ "ادب لطیف" کے تازہ پرچہ پر پڑ گئی جو پاس کی میز پر رکھا ہوا تھا ——— واقعی یہ نیا ادب بھی کیا کمال کی چیز بنا ہے ——— ترقی پسند ادب ——— جیسی پگڈنڈیاں ——— خوبصورت ہوائیں ——— جنتا۔ سماج۔ مزدور ——— بیڑی۔ بھوک بھوک بھوک

[illegible]

کہاں بھی نہ کہا [illegible]

اور [illegible] کسی کی شام

کہیں اور [illegible] بادل [illegible]

کی رخصتی کی پارٹی دے رہے ہیں۔

خالہ جان بتا رہے تھے جو ہماری سرکاری [illegible] میں لفٹیننٹ کرنل ہیں تبدیل ہو کر پونہ جا رہے تھے۔ اور اُن کی رخصتی دعوتوں کا سلسلہ کئی ہفتے پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ یہ پونہ والے صاحب تھے یہ ترقی پسند شاعری کرتے تھے اور شکر سپاہی میں ملازم ہونے سے قبل سبھاش بوس کے چیلے بھی رہ چکے تھے۔

اور دوسرے دن سہ پہر کے بعد کافی ہاؤس میں فوجی افسروں کے علاوہ پونہ والے صاحب کے کامریڈز یعنی ترقی پسند مصنفین جمع ہونے شروع ہوئے ——— ڈھیلی ڈھیلی پتلونیں۔ لمبے لمبے بال۔ سیاہ فریم کی عینکیں۔ انگلیوں میں پائپ یا سگریٹ اور کھدر کے پاجامے۔

اور جب چائے ختم ہوئی تو جہلم پار کے ایک لوگ [illegible] لمبے "جی کچھ گانا بتانا نہیں ہو رہا ہے؟" "یہاں بیہ ایک ترقی پسند ادیب نے میری خالہ زاد بہن فرخندہ سے فرمایا۔ "جی آپ [illegible] آئے ہیں۔ ایک آدھ ڈھولک کا گیت سنا دیں۔ یہ ڈھولک کے گیت کس قدر حسین اور [illegible] ہوتے ہیں!" اور میرا جی چاہا کہ اُس کی اس سرخ اور لمبی ناک پر ساری چائے والی انڈیل دوں۔

لگتے ہیں ان کے دوسرے سرے میں نئے ادب کا [illegible] نہایت شد و مد سے بحث شروع ہو گئی۔ پیام مرغی شہری فرما رہے تھے "جناب ہم ترقی پسند نوجوانوں نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور [illegible] خوبصورت نظموں اور افسانوں نے اُردو کے دقیانوسی اور سرمایہ داروں کے ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ہمارا ایک نوجوان شاعر [illegible] بلند پایہ نظم میں کہتا ہے:۔

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

[illegible] چلا [illegible] رہتا ہوں کی راہ میں

[illegible] صاحب نے ارشاد کیا ——— ان کے [illegible] نے کہا ہے کہ :۔

مسرت کے جواں قافلے گشتی لے کے نکلے ہیں
[illegible] کے [illegible] لگاتا ہے

[illegible] مجھے سگار پلا رہے تھے۔ پیام مرغی شہری نے پھر کہنا شروع کیا — "تو گویا کہ کامریڈز — "ادب برائے حیات" نے دُنیا پر ثابت کر دیا کہ اب ہندستان کو اس ادب کی ضرورت نہیں جو سرمایہ داروں کے سجے ہوئے ایوانوں میں جنم لیتا ہے۔ بلکہ اب ہمیں ایسا ادب چاہیئے جو جنتا کی دل کی دھڑکنوں کا آئینہ دار اور مزدوروں کے اندھیرے جھونپڑوں کا باسی ہو۔ اور جو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے چھپی ہوئی مضطرب چیخوں کی نمائندگی کر سکے—"

اتنے میں ڈبلیو، اے، سی کی ایک اینگلو انڈین لڑکی نے پیام صاحب کو آئس کریم پیش کی۔ اور وہ اُسکی طرف متوجہ ہو گئے۔ "کافی ہاؤس" کا آرکیسٹرا تیزی کے ساتھ بج رہا تھا۔

ہال کے ستون کی دوسری طرف ایک نہایت ترقی پسند افسانہ نگار عظمت چنگیزی خالو جان سے باتیں کر رہے تھے۔ اور وہ بچارے بھی ان سے "نئے ادب" پر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پام کے گملوں کے پیچھے ہال کے ایک گوشے میں فرخندہ اور پدما میرے ساتھ بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں دو ترقی پسند ادیب ہمارے قریب کی میز پر آکر بیٹھ گئے — ان کے نام مجھے یاد نہیں آ رہے — اور ان میں سے ایک نے فرخندہ سے پوچھا — "آپ نے میرے تازہ ترین افسانے "پیٹی کوٹ" اور "توہین" ملاحظہ فرمائے ہونگے؟" فرخندہ نے فوراً جھوٹ بول دیا۔ "جی ہاں بہت محظوظ ہوئی تھی۔" حالانکہ خالو جان کے ساتھ بچپن سے انگلستان میں رہنے کی وجہ سے اسکو اچھی طرح اُردو پڑھنا بھی نہیں آتا ہے — دوسرے ادیب نے مجھ پر عنایت کی — "جی آپ نے بھی تو میرا [illegible] پڑھا ہوگا؟" گویا میری زندگی کا واحد مقصد جیسے [illegible] تھا۔ لیکن مجھے بھی فرخندہ کی تقلید کرنی پڑی — "آپ کے افسانے تو مجھے بہت پسند ہیں" — اور اب انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "[illegible] محترمہ کہ ادب اور زندگی کے متعلق میرا تخیل طوفانی [illegible]

[illegible]

کے پاس جم لیگ کہانیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں —"

میں ان کی اس تقریر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ پرویز رومانی ہماری طرف آتے نظر آئے۔ اور قریب آ کر کہنے لگے۔ "ادھر! اس آتشیں کتاب "شرارے" کے مصنفین ابھی تک نہیں آئے۔ ٹھیریئے میں فون کرتا ہوں —" اور پام کے گملوں کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک ترقی پسند شاعر نے گنگنانا شروع کیا۔

یہ کس نے خون پر دی سالِ نو کی تہنیت مجھ کو
تمنا رقص کرتی ہے تخیل گنگناتا ہے

اور ان کے ایک "کامریڈ" نے پرویز صاحب سے کہا۔ ہمارے ان شعلہ بیان مصنفوں میں سے آج شاید کوئی بھی نہ آسکے گا۔ کیونکہ ان میں سے ایک کو تو گورنمنٹ آف انڈیا میں ایک اعلیٰ عہدہ مل گیا ہے اور باقی ہندستان کو آزاد کرانے میں مصروف ہیں۔"

ہم سے کچھ دور کیپٹن دبگیم قریشی بیٹھی تھیں۔ ہم اٹھکر ان کے پاس چلے گئے۔ بدقسمتی سے چار پانچ کمیونسٹ اور اشتراکی قسم کے ادیب وہاں بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کیپٹن قریشی سے کہہ رہے تھے — "یہی وجہ ہے کیپٹن صاحب کہ اب ہم زندگی کو ہر ترقی پسند زاویۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہماری جنتا کو اس وقت "پیٹی کوٹ" اور "رضائی" وغیرہ قسم کے حسین فسانوں کی بے حد ضرورت ہے —" اور جب وہ اپنا پائپ جلانے کے لئے رُکے تو دوسرے ادیب نے کہنا شروع کیا۔ "قصہ مختصر یہ کہ ہم ایک ایسے سنسار کے باسی ہیں جہاں بھوک ہے۔ محنت ہے۔ افلاس ہے۔ ظلم وستم ہے۔ حکومت کا استبداد ہے۔ آنسو ہیں اور آہیں ہیں۔ ہمارے نوجوان شعرا بھی اسی دُنیا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پیام مرغی شہری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی معرکتہ الآرا نظم —

سنج دسیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے

سُنا کر ہمیں محظوظ کریں —" لیکن پیام صاحب میزبان سے اجازت لے بغیر شاید مس مارگریٹ ولینڈ کے ساتھ سینما دیکھنے جا چکے تھے۔ اس لئے ان ادیب صاحب نے خود ہی اپنی ایک شاہکار نظم پڑھنی شروع کی۔

دوپہر کی گرم لو میں خشتیاں ویران سڑکوں پر یوں

اور کہا یوں جیسے

بکھرے بکھرے ہوئے خواب

کسی مل کے مزدور کی آہیں ہو

پانی کے نل کے پاس بیٹھا باسی چنے کھا رہا ہے۔

میرے سر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہونے لگا تھا ——— "واہ واہ" کے شور سے ہال گونج اٹھا۔ پھر ایک اور شاعر نے جو اب تک آرکیسٹرا میں پیانو بجانے والی لڑکی کے ساتھ بیٹھے کافی پی رہے تھے، اپنی نظم سنائی ؎

خوابوں کے دھندلے جزیروں کے اس پار

دور شفق کے رنگین کناروں میں کھوئے ہوئے جیالوں کی طرح

جب کلاس روم میں خاموش بیٹھا ہوتا ہوں میں

تو باہر گھاس کھودنے والی مزدور لڑکی کی چوڑیوں کی جھنکار

سن کر مجھے

غلام آباد ہندستان کا خیال آتا ہے اے دوست

اور میں سوچتا ہوں کہ کیا کروں

ایک [illegible]

ایسے [illegible] ہیں جیسے

پھلوں سے لدا [illegible]

زرگری بھی نہیں ہے جو کر دیں ہے

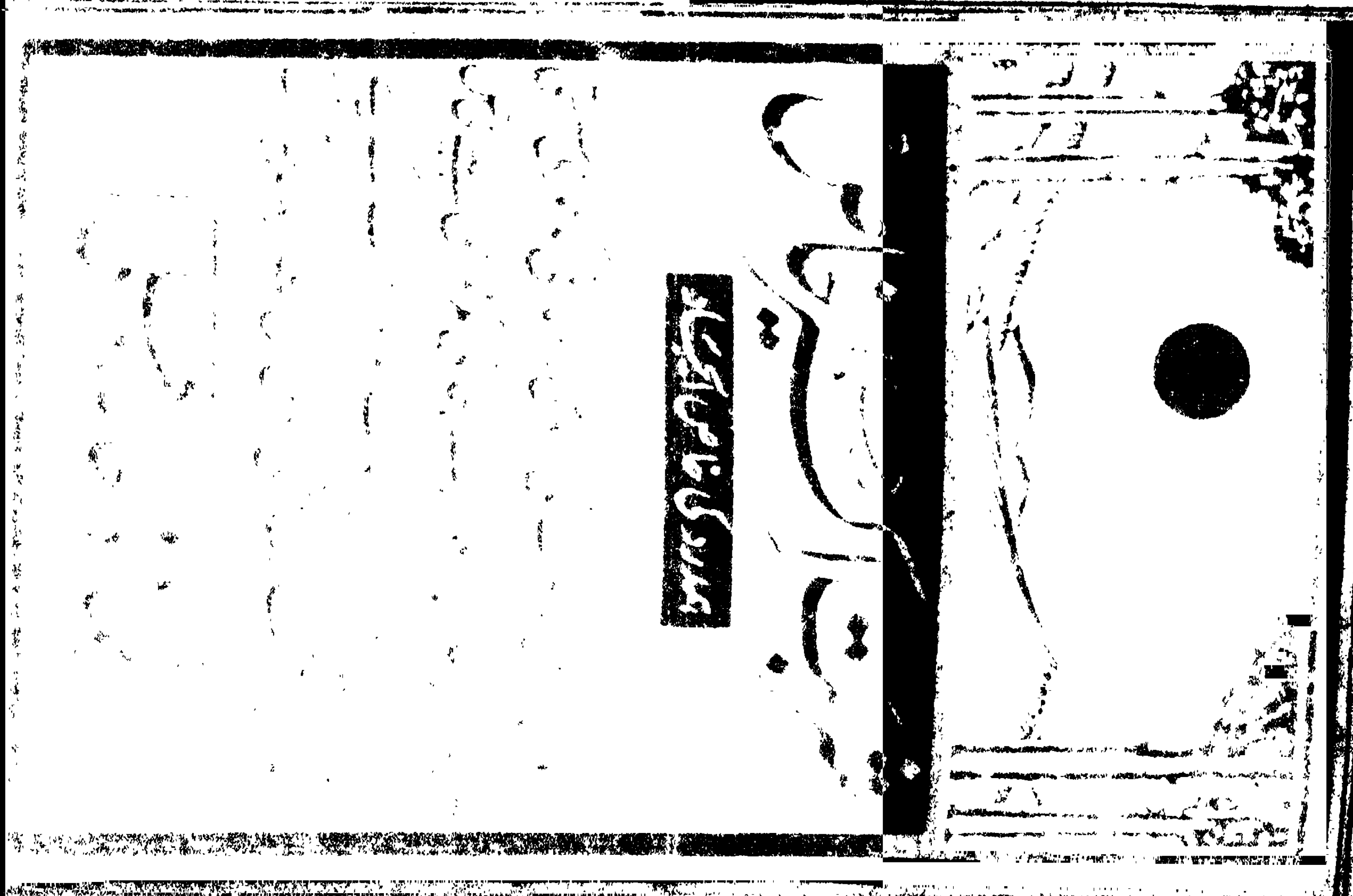
نئے ادب کی شاعری کا [illegible] ہوا

ہے لاحق

کاش میں ہو سکتا داخل امیرجنسی کمیشن میں

گر نہ ہوتا مجھے خیال اے دوست تیرا

——— میرے سر میں درد بہت زور سے شروع ہو گیا۔ میں پریشان ہو کر ممی کو دیکھا اور میزبان سے معذرت چاہ کے باہر کار میں آ کر لیٹ گئی۔ اور اس رات خواب میں مجھے یہ معلوم ہوا جیسے بہت سے۔ ۳۵ سو ترقی پسند ادیب اپنے حسین الف نون اور خوبصورت نظموں سمیت میرے کمرے پر دھاوا کر رہے ہیں۔ تاکہ [illegible] کی حالت سدھرے۔ اور غلام آباد ہندستان کو آزادی نصیب ہو جائے۔



اور بھرتی ہوئی تھی

قسط دوم

(از محترمہ شیریں)

جب نیلوفر کی ظفر سے شادی ہوئی تھی۔ تو وہ اسکے لئے بالکل اجنبی نہ تھا۔ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اور اس وقت ظفر کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اور اسی وقت سے جبکہ ظفر ۲۰ برس کا اور نیلوفر ۶ برس کی ایک بے سمجھ مخلوق تھی۔ نیلوفر کے نام کے ساتھ ظفر کا نام لیا جانے لگا تھا ——— خیر اس وقت تو وہ بالکل ناسمجھ تھی۔ لیکن جوں جوں بڑی ہوتی گئی ہندستانی لڑکیوں کی ذہنیت کے مطابق اسے ظفر کی ذات سے کافی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور جانے کیوں اس نے لاشعوری طور پر یقین کر لیا کہ ظفر کوئی بہت ہی ارفع اور منزہ ہستی ہے۔ غیر ملکیوں کے ہاتھوں ہندستانی تہذیب کو زوال پذیر ہوئے ایک عرصہ بیت گیا۔ تعلیم و تہذیب کی روشنی نے کب سے اپنی شعاعیں بکھیرنی شروع کر دیں۔ زمانہ ترقی کی کتنی منزلیں طے کر آیا۔ لیکن ہندستانی عورت کا دل اور اسکی فطرت بدل دینا کسی سے ممکن نہ ہو سکا۔ اور اگر کوئی تبدیلی ہوئی بھی تو ظاہری اور سطحی ——— اور نیلوفر کا یہ جذبہ بھی وہی ہندستانی عورت کا خاوند کو دیوتا ماننے کے پرانے مگر مضبوط اصول کے زیر اثر تھا۔ نیلوفر نے چھوٹی ہی عمر میں ہی تعلیم و تربیت میں ایسی ترقی کر لی تھی کہ لوگ اسکی ذہانت دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ اس نے صرف نصابی کتب ہی نہیں پڑھی تھیں بلکہ دنیا کے بہترین معیاری لٹریچر کا معتد بہ حصہ دیکھ ڈالا تھا۔ فلسفہ اور ادب اس کے محبوب مضامین تھے۔ مشاہیر عالم شعراء کے دواوین اسکی نظروں سے گذر چکے تھے۔ اور اس وسیع مطالعہ نے قدرتی طور پر اسکے اخلاق کو بلند کر دیا تھا۔ اسکے خیالات کو وسیع کر دیا تھا۔ اور اُسے شائستگی نفاست اور مروت کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ وہ ازل ہی سے اثر پذیر اور متلون دل اور شاعرانہ طبیعت لیکر آئی تھی۔ قدرت نے اسے جنم بھی ایسے گھر میں دیا جہاں اس کی یہ خصوصیات اور بھی چمک اٹھیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت ہی ارفع نظر، باذاق اور بلند معیار سکالر ثابت ہوئی۔ وہ انسان کیلئے علم ہی کو ذریعہ نجات سمجھتی تھی۔ اسکے خیال میں علم ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتا تھا۔ وہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کو عام لوگوں سے بہت بلند اور الگ سمجھتی تھی۔ اسکے نزدیک ایک اچھی تعلیم اخلاق

ہوا من کیلئے اکسیر کا کام رکھتی ہے۔ بلکہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے دیتی۔ اور اس لئے وہ ہر تعلیم یافتہ فرد کو تمام عمومی اور پست خیالات سے مبرا اور ہر قسم کے عیوب سے پاک سمجھ لیتی تھی۔ لیکن اُسے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ اسکا یہ تجربہ کتابی تھا عملی نہیں۔ سکول یا کالج کی چہار دیواری میں بیٹھ کر محض ڈگری حاصل کرنے کے لئے نصابی کتب رٹ لینا اخلاقی معیار کو بلند نہیں کر سکتا۔ مگر اس وقت نیلوفر میں ایسی عملی سمجھ اور پرکھ کہاں تھی۔ اور اسی لئے جب ظفر انگلینڈ سے کئی بڑی بڑی ڈگریاں لے کر آیا تو نیلوفر کے دل میں جو عقیدت اور وقعت پہلے تھی کئی گنا بڑھ گئی۔ ظفر اس سے بہیں برس بڑا تھا۔ لوگ دبی زبان میں اسکے متعلق کچھ افواہیں بھی اڑاتے تھے۔ لیکن نیلوفر نے کبھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ کبھی ان پر یقین نہیں کیا اور اس لئے جب ظفر کی شادی کا پیغام قبول کر لیا گیا تو نیلوفر ناخوش نہیں ہوئی بے شک اس بارے میں اسکی آواز کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اگر وہ مخالفت بھی کرتی تو کون سنتا تھا اور نہ وہ خاندان کی رسم کے خلاف مخالفت کر ہی سکتی تھی۔ لیکن اسے تو اسکی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کا جیون ساتھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور مہذب ممالک میں کئی برس رہکر تعلیم و تہذیب میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ اسکے علاوہ اور کو وہ قابل توجہ نہیں سمجھتی تھی۔ اور وہ تصور ہی تصور میں ایک نئی دنیا کا نقشہ بنانے میں مصروف ہو جاتی۔ لیکن کبھی کبھی گھر سے جدائی کا خیال اسے بیقرار بھی کر دیتا تھا۔ مگر بہت جلد پھر سے وہ رنگین سپنوں میں کھو جاتی۔

اور پھر شادی کا دن بھی آ پہنچا۔ نیلوفر اپنے عزیزوں سے، اپنی بچپن کی سکھیوں سے اپنے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کا شاعرانہ دل گھر کی ایک ایک چیز سے لپٹ کر آنسو بہانا چاہتا تھا۔ اندر ہی اندر جیسے دل میں کوئی چھریاں چلا رہا تھا۔ اور آخر کار وہ رخصت ہو کر اسی شام کو ایک اجنبی گھر میں پہنچ گئی۔ ظفر کے یہاں اپنے خاندان کی کوئی عورت تھی ہی نہیں۔ مہمان اُس نے بلائے نہیں تھے۔ وقتی طور پر چند عورتیں شہر کی آگئی تھیں۔ اور نیلوفر کو رونمائی کا ایکٹنگ کرنا پڑا۔ جو ہر ہندستانی لڑکی صدیوں سے کرتی آ رہی ہے۔ خواہ جاہل ہو یا پڑھی لکھی، امیر ہو یا غریب۔ نیلوفر کو یہ کھیل بہت رومانٹک اور دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے غسل کروا کر کپڑے بدلوائے گئے۔ پھر سے اُس کا سنگار کیا گیا۔ اور اُسے عورتوں نے باہر چھت پر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور پھر سب ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ نیلوفر کے پاس صرف اسکی اپنی دو نوکرانیاں رہ گئیں۔ کھانا آیا تو اس نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا۔ اسے بالکل بھوک نہیں تھی۔ تھکان سے جسم چور چور ہو رہا تھا۔ اور وہ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئی۔ اور جانے کب گہری نیند سو گئی۔

[illegible] [illegible] تو آ جاتی، جیسے آنکھ لگی ہی کہیں بج رہے تھے۔ پرندوں کی [illegible] آ رہی تھیں۔ صبح کی سرد ہوا سرسرا رہی تھی۔ اور وہ عادت کے مطابق شب خوابی کا لباس تبدیل کئے بغیر سوئی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اپنے گرد نگاہ ڈالی۔ اسے آج وہ مانوس مانوس سے [illegible] وہ نظر نہیں آ رہے تھے جو اس کی پہچانی ہوئی تھیں۔ کوئی اجنبی جگہ تھی۔ کوئی اجنبی پلنگ۔ اور ایک ہی سیکنڈ میں اسے یاد آ گیا آج وہ کہاں تھی۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ مگر وہ تو یہاں تنہا تھی۔ وہ رات بھر اس نئی جگہ اکیلی سوتی رہی۔ یہ خیال اس کے جسم میں خوف کی جھرجھری پیدا کر رہا تھا۔ یہ اسکی سہاگ رات کی صبح تھی۔ اور اس کے کانوں میں کل رات کے وقت بجنے والی شہنائیوں کی مدھری تانوں کی صدائے بازگشت گونجتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مگر اس وقت اس آواز میں کتنا درد تھا۔ کتنا سوز تھا۔ جیسے کسی کی شکست قلب کی آواز نغمہ میں تبدیل ہو گئی ہو۔ نیلوفر کے دل میں کوئی ناگوار سا احساس انگڑائی لینے لگا۔ دن چڑھے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھی۔ ظفر بھی وہیں آ گیا۔

"رات نیند کیسی آئی؟" اس نے آتے ہی نیلوفر سے پوچھا۔ "میں تو تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔"

نیلوفر نے بچپن میں کئی بار ظفر کو دیکھا تھا۔ وہ کئی کئی روز اسکے یہاں جا کر ٹھیرا تھا۔ اور وہ دوسرے رشتہ داروں کی طرح ظفر کے پاس بھی کھیلا کرتی تھی اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اور پھر انگلستان سے واپسی پر بھی ایک دفعہ ظفر ان سے ملنے گیا تھا۔ مگر اس وقت میں اور آج میں بڑا فرق تھا۔ ان دنوں وہ اسے اپنا بزرگ سمجھ کر پیش آتی تھی۔ مگر آج ——— آج تو وہ ——— اس کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ جھکی جا رہی تھی۔ جیسے منوں بوجھ کے نیچے دبی ہو۔ اسکے سارے چہرہ پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے چمکنے لگے۔

"چائے پی لی؟" ظفر نے پوچھا۔ نیلوفر اب بھی کچھ نہیں بولی۔

"ناراض ہو گیا؟" ظفر نے کہا۔ "بولتی کیوں نہیں ہو؟"

نیلوفر نے جیسے سارا زور لگا کر جواب دیا۔ "جی پی لی" اور خدا جانے کس جذبہ کے تحت اسکی نگاہیں ظفر کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک نظر ——— چند سیکنڈ کی ایک نظر ——— اور نیلوفر کا معصوم اور دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف دل جیسے ڈوبنے لگا۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسکی زندگی کی بازی کس قدر غلط لگ چکی تھی۔ ظفر اس وقت شلوار قمیص پہنے تھا۔ اس کا قد پہلے سے بہت چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔ دوہرے جسم میں پیٹ خاص طور پر نمایاں تھا سر کے بال اڑے ہوئے تھے چہرہ پر کتنی ہی باریک باریک لکیریں تھیں اور آنکھوں

[illegible] عجیب سی [illegible] جھک تھی۔ جیسے [illegible] نیلوفر کے سامنے تھی۔ نیلوفر [illegible] کر آ رہی تھی۔

"بیٹھ جائیے" [illegible] ظفر نے کہا۔ اور پھر کافی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے لہجہ میں جھجک نہیں رہی تھی۔ نہ [illegible] میں حجاب تھا۔ نہ آنکھوں میں کسی شرمیلے جذبہ کی جھلک تھی۔ کم عمر ہی سہی لیکن نیلوفر کے دماغ نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ اس جنس کا یہاں کوئی خریدار نہیں۔ اور اس کے بعد ہر گزرنے والا دن نیلوفر کے دل پر سینکڑوں چرکے لگا کر جاتا اور ہر بیت جانے والی شب اسکے رخساروں پر لاتعداد آنسوؤں کے نشان چھوڑ جاتی۔ اس کی امیدوں کے خوشنما محل منہدم ہو چکے تھے۔ اسکے ارمانوں کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ اس کے تصور کا سنہری جال ٹوٹ چکا تھا۔ قدرت کا کیا ستم ظریفانہ کھیل تھا۔ اس کی قسمت میں ایسے شخص کا ساتھ پڑا تھا۔ جو معنوی لحاظ سے اس سے کوسوں دور تھا۔ جسکی عادات و اطوار اس سے بالکل متضاد تھیں۔ نیلوفر علم و ادب کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی عادی اور ظفر کو سوائے اخبار کے جھینگوں کوئی الماری کا دیکھنا کوئی علمی گفتگو کرنا قسم ——— نیلوفر کلاسیکل موسیقی کی دلدادہ اور پرستار اور ظفر سرے سے موسیقی کو تضیع اوقات اور خواہ مخواہ کی سمع خراشی سمجھنے پر مجبور نیلوفر اساتذہ کے کلام کی گہرائیوں میں پہنچ کر از خود رفتہ سی ہو جانے والی۔ اور ظفر کے نزدیک شاعری محض بیکاروں کا مشغلہ۔ نیلوفر کو اپنے بڑے سے بڑے دکھ اور تکلیف کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپانے کی عادت اور ظفر ذرا سی بات پر غم و غصہ سے آپے سے باہر ہو جانے کا عادی۔ غرضیکہ ایک طرف لطافت تھی اور دوسری طرف کثافت۔ ایک طرف پھلواری تھی تو دوسری طرف کرخت بنجر زمین۔ ایک طرف زندگی تھی تو دوسری طرف موت کا سناٹا۔ گویا دوسرے لفظوں میں ان دونوں کی طبائع میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور بقول کسے ایک کا راستہ پورب کو جاتا تھا تو دوسرے کا پچھم کو ——— اگر ظفر کے دل میں نیلوفر کے جذبات کے احترام کی اہمیت موجود ہوتی۔ اگر اسکی طبیعت نیلوفر کی طبیعت کے موافق ہوتی تو شاید نیلوفر کے لئے عمر کا تفاوت اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا۔ اگر ان کی طبیعتیں مختلف تھیں تو خیر۔ ظفر کے دل میں ولولہ اور زندگی ہوتی تو بھی نبھ جاتی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹا تھا چوبیس گھنٹوں میں ایک بات بھی نیلوفر کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتی تھی۔ ایک بات بھی اسے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ ہر وقت کا کڑھنا ہر وقت کا جلنا۔ شادی کے بارے میں اس کے جو حسین تصورات تھے یہاں ان کا سایہ تک نہیں تھا۔

یوں تو بہتیری باتیں کرتا تھا۔ وہ بہت باتونی تھا مگر نیلوفر کو اسکی باتیں کبھی اچھی نہیں لگی تھیں۔ وہ زیادہ تر انگلستان کے قصے کہنے کا عادی تھا۔ [illegible]

کا کیفیت۔ وہاں کے بال روم کا نقشہ۔ وہاں کے ادنیٰ درجہ کے گھروں کی لڑکیوں کے قصے اور وہاں کی چیپ بند سیاستوں اور خود اپنی اخلاقی پستیوں کی داستانیں۔ اور خدا جانے کیوں نیلوفر کو ان تذکروں سے دلی نفرت تھی۔ وہ چاہتی تھی ظفر وہاں کی کسی تاریخی چیز کا ذکر کرے۔ وہاں کی بڑی بڑی شاندار عمارتوں کا نقشہ کھینچے۔ کسی بڑے مصنف یا سیاست دان کے متعلق کچھ بتلائے۔ اسے قید کی "لڑکیوں" کے کیرکٹر اور کیفیوں کے قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ ایسی باتیں اسکے دل کو داغ سا کر دیتی تھیں۔ غرضیکہ ظفر کے ساتھ نیلوفر کی زندگی سکوت اور جمود کا ایک انتہائی سلسلہ بنکر رہ گئی تھی جس میں نہ کوئی تبدیلی تھی نہ جوش۔ اور یہ جمود نیلوفر کی بیتاب مگر بیقرار طبیعت کے لئے گویا موت کا پیغام تھا۔ یوں تو ہر ازدواجی زندگی کچھ مدت کے بعد ایسی ہی افسردگی اور روحانی تھکن سے لبریز ہو کر رہتی ہے لیکن نیلوفر کی تو اس نئی زندگی کا آغاز ہی جاودانی جمود سے ہوا تھا جس میں کسی خوشگوار تبدیلی کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔ اس نے سنا ہوا تھا دولہنوں کے ان کے خاوند بڑے اچھے اچھے شیریں خط لکھا کرتے ہیں۔ اور جب شادی کے کچھ روز بعد ظفر کسی سرکاری کام سے باہر گیا تو نیلوفر اسکے جاتے ہی اسکے خط کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا ظفر جو باتیں زبان سے نہیں کہہ سکا تھا۔ وہ خط میں ضرور لکھے گا۔ وہ لکھے گا "تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ تمہیں دیکھنے کیلئے بیقرار ہو رہا ہوں" "جلدی واپسی کی کوشش کرونگا"۔ مگر جب کئی روز بعد ظفر کا خط آیا تو اس میں وہاں کے ہوٹل کے کھانے کی شکایت اور سفر کی تکلیف کا حال لکھا ہوا تھا۔ نیلوفر جھنجھلا اٹھی۔ اور اس نے خط کے پرزے پرزے کرکے ہوا میں بکھیر دیئے۔

پھیکے اور افسردہ دن یونہی گذرتے جا رہے تھے۔ گرمیوں کی پر فسوں معطر چاندنی اور قدرے خنک راتیں بیت گئیں۔ برسات کے دیوانہ گر رومانوی دن آئے اور گذر گئے۔ اور پھر جاڑوں کی طویل سرد راتیں بھی بسر ہو گئیں۔ لیکن نیلوفر کے دل کی کلی جو کھلنے سے پہلے مرجھا چکی تھی۔ ہری نہ ہوئی۔ نیلوفر اپنے نئے ماحول سے مانوس ہونے سے پہلے ہی بیزار ہو گئی تھی اور یہ احساس بیزاری کچھ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہونے لگا۔ وہ لاکھ پڑھی لکھی اور بردبار تھی۔ مگر اپنی توقعات کے عظیم الشان محل یوں منہدم ہوتے دیکھکر بچوں کی طرح ٹھنک گئی۔ اور بات بات پر ظفر سے اختلاف ہونے لگا۔ وہ تہذیب زبان کو انسانیت کا لازمی جزو سمجھتی تھی۔ ادھر ظفر کو جب کسی ملازم پر غصہ آتا تو ایسی مخرب اخلاق باتیں کہہ جاتا کہ نیلوفر غصہ سے کانپ کر رہ جاتی۔ اور کئی مرتبہ اس نے نیلوفر سے بھی بدکلامی کرنے

سے بدمزہ کر دیا۔ چونکہ [illegible] ظفر کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن [illegible] نیلوفر کیلئے زہر میں بجھے ہوئے تیر سے کم نہ ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ [illegible] میں یہ کشمکش بڑھتی گئی۔ جہاں اسکی خواہش اور خوشی سب پر مقدم تھی۔ اسکی کوئی بات کبھی نہ ٹالی جاتی تھی۔ کسی کام میں کبھی اس سے اختلاف نہیں کیا گیا تھا اور اگرچہ نیلوفر فطرتی علم، وضعداری کے جذبہ کے زیر اثر اور اچھی تعلیم و تربیت کے طفیل اپنے ناز و نعم میں بھی خود سر اور ہٹ دھرم نہیں بنی تھی۔ مگر احساس خود داری اس میں نہایت درجہ بڑھا ہوا تھا اور اسی لئے ظفر کی اس قسم کی غیر مہذب باتیں اسکی روح کو تڑپا دیتی تھیں۔ جن کا مرجانے کو جی چاہتا تھا۔ ظفر کیلئے اسکے دل میں نفرت کا جذبہ ابھر آتا تھا اور وہ کئی کئی روز ظفر سے روٹھی رہتی۔ کھانا نہ کھاتی۔ کوئی کام دل سے نہ کرتی بہت ہوا تو ظفر اسکو معافی مانگ کر منا لیتا۔ مگر اگلے ہی دن پھر کوئی ذکر کوئی قصہ شروع ہوجاتا۔ نیلوفر کسی نوکر کو ناپسند کرتی ظفر اسی کا مداح ہوجاتا۔ چلئے لڑائی شروع ہوجاتی۔ ظفر کبھی اطلاع کئے بغیر کسی دوست کے یہاں چلا گیا اور زیادہ دیر ہوگئی۔ نیلوفر کا بولنا بند! نادان لڑکی اپنی ناکامی اور ناپسندیدگی کے جذبہ کا اظہار اسی عدم تعاون سے کر رہی تھی۔ لیکن کچھ مدت بعد اُسے یہ روٹھنے منانے کا کھیل نہایت ہی مضحکہ خیز اور ذلیل معلوم ہونے لگا۔ وہ اپنے تئیں نفریں کرنے لگی کہ کیوں بے بسی کا اظہار وہ روٹھنے کی صورت میں کرے۔ یہ بات اسے اپنی خودداری کے منافی معلوم ہونے لگی۔ اور اس قسم کے لڑائی جھگڑے چھوڑ کر وہ گویا اپنی قسمت پہ شاکر ہو کر بیٹھ گئی۔ جیسے چڑھی ہوئی ندی راستہ نہ پا کر اپنے بہاؤ کا رخ بدل دے۔

اپنے کسی مقصد میں ناکام رہنے کے بعد انسان کسی طرح [illegible] کے مشاغل میں تسکین قلب ڈھونڈھتا ہے۔ نیلوفر نے اپنی حیات کی تلخیوں کو صحافتی زندگی کی حلاوتوں میں مدغم کردینے کا تہیہ کرلیا۔ اسکی غیر معمولی ذہانت اور ادبی ذوق مضمون نگاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ہر گوشے میں اس کے زور قلم کی دھاک جم گئی۔ علم و ادب کے مختلف اصناف پر اسکے ناقدانہ تبصرے اور فاضلانہ مضامین دیکھکر بڑے بڑے جید فاضل بھی دنگ رہ جاتے مگر اس کی غیر فانی شہرت کا سبب اسکے افسانے تھے۔ جو دلآویز اسلوب بیان اور دلنشیں طرز تحریر کے ساتھ ساتھ کسی درد پنہاں کی ہلکی سی لذت آمیز چاشنی اور گھلے ہوئے جذبات کے دھندلے سے عکس کا مرقع ہوتے تھے اور جو پڑھنے والے کو کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے، اسکے مصداق بنا دیتے تھے۔

کچھ عرصہ سے نیلوفر ایک اردو ماہنامہ میں کسی غیر معروف شاعر کا کلام دیکھ رہی تھی۔ وہ ضیا کے نام سے [illegible] کرتا لکھے ہوئے تھا کہ وہ علاقہ ہی میں [illegible] آگیا ہے۔ نیلوفر رسالوں میں ادیبا و شعرا کے متعلق [illegible] تھی۔ اس کا ادبی مذاق اس قدر نکھرا ہوا اور پاکیزہ تھا کہ [illegible] سے داد حاصل کرنا آسان بات نہیں تھی۔ اکثر ادیب اسکی پسند [illegible] کا سند سمجھتے تھے لیکن ضیا کے کلام میں اسے اول ہی سے عجیب [illegible] دکھائی دے رہی تھی۔ باریک تر فلسفیانہ نکات۔ بلند تخیل، [illegible] دلی درد کی ہلکی سی جھلک گویا ضیا کا کلام ایک شفاف آئینہ تھا جس میں لکھنے والے کے بلند معیار اور ذوق سلیم کی جھلک صاف نظر آرہی تھی اور نیلوفر کے دل پر بالکل غیر ارادی طور پہ یہ تمام خوبیاں نقش ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ضیا کی ہر نظم کا ہر شعر خود نیلوفر کے جذبات و محسوسات کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر شے کا بالکل نیلوفر ہی کی طرح مطالعہ کرتا تھا۔ زندگی کے ہر زاویہ کو اسی کی مانند دیکھتا۔ حیات انسانی کے ہر پہلو کو اسی کی طرح اجاگر کرتا۔ اور اس کا تخیل نیلوفر ہی کی طرح ارفع سے ارفع تر [illegible] تھا۔ ایسا ہوا کہ نیلوفر کوئی مضمون لکھنا شروع کرتی یا کسی افسانے کے پلاٹ کو ذہن میں ترتیب دیتی اور اپنے خیالات کو سپرد قلم کرنے سے پہلے ہی اسے ضیا کے کلام میں بالکل انہیں خیالات کا عکس دکھائی دیتا۔ خیالات کی اس حیرت انگیز مناسبت اور ہم مذاقی کے سبب نیلوفر قدرتی طور پہ بالکل لاشعوری طریقہ سے ضیا کے قریب ہوتی گئی۔ لیکن اس ذہنی قربت سے اکثر اسے بہت خفت ہونے لگی تھی۔ ایک عجیب سی دلی کشمکش کی تکلیف۔ کیا یہ مذہب کی رو سے جرم نہیں تھا۔ اخلاقی گناہ نہیں تھا۔ اور اس خیال سے وہ بےکل سی ہوجایا کرتی۔ لیکن پھر خود ہی اس پرانے نظریے بےبسی کیلئے ناپسندیدگی کا جذبہ دل میں پیدا ہوجاتا [illegible] کے مطابق دل کو تسلی دے لیا کرتی۔ اور پھر ایک دن نیلوفر کو ایک رسالے کی معرفت ضیا کا خط ملا۔ جس میں اسکے تازہ ترین افسانے کی تعریف لکھی تھی اور اسکی ادبی [illegible] پہ اسے مبارکباد پیش کی تھی۔ اس قسم کے تعریفی خط اسے اکثر موصول ہوتے [illegible] تھے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے کبھی ایسے خطوط کا جواب [illegible] نہیں دیا۔ لیکن ضیا کا خط اسے ان خطوں سے بالکل جدا [illegible] سے نیلوفر [illegible] جذبات [illegible] تھے۔ [illegible] اور اسکے بعد ان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ [illegible]

مناسب امر تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ اُن نظموں کے کوئی فلسفہ کا مسئلہ زیر بحث ہوتا کبھی قدیم و جدید ادب کا موازنہ کیا جاتا۔ اور کبھی کوئی اور علمی و ادبی بحث چھڑ جاتی۔ لیکن ان تذکروں کے درمیان قدرتی طور پر ان کے قلم سے ایک دوسرے کی ذات کے متعلق بھی چند الفاظ نکل ہی جاتے۔ ضیا لکھتا "آپ کا تازہ ترین افسانہ پڑھا۔ ہندوستانی معاشرت اور رسم و رواج کے متعلق جس قدر عمیق نظری سے کام لیا گیا ہے۔ یقیناً آپ ہی کا حصہ ہے۔ اور پھر کہانی یا بے رنگی تو نام کو نہیں۔ فلسفہ اور شعر کو سمو کر ایک ایسا خاکہ کھینچ دینا ضرورت اتنی کہ دل پر نقش ہو جائے جو دل کو سوز و گداز کے بیش بہا خزانے بخش دے آپ کے لئے معمولی بات ہے۔" نیلوفر بھی اپنا تاثر چھپا نہ سکتی۔۔ بھی مجھے سے الفاظ میں لکھ دیتی: "آپ کی ماہ حال کی نظم دیکھی۔ بخدا آپ لکھتے نہیں جادو کرتے ہیں۔"

اگرچہ اس قسم کے خیالات بالکل غیر ارادی طور پر ظاہر کئے جاتے تھے۔ لیکن قدرتی طور پر اس سے وہ احساس پسندیدگی اور بھی مستحکم ہوتا گیا جو دونوں کے تحت الشعور میں دبا ہوا تھا۔

نیلوفر ہر بار سوچتی مراسلت کا یہ سلسلہ جو بالکل اچانک شروع ہو گیا تھا بند کر دے۔ لیکن ہر بار وہ اپنے اس ارادے میں ناکام رہتی۔ ضیا کے خطوط سے نیلوفر کی روح میں جو ایک پُرکیف اہتزاز سا پیدا ہو جاتا تھا وہ اس کے لالچ کو چھوڑ نہ سکی۔

ظفر، نیلوفر کی ڈاک میں اور خطوط کے ساتھ اکثر ضیا کے خط بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ پھر وہ نیلوفر سے دو تین مرتبہ ضیا کے کلام کی تعریف بھی سن چکا تھا۔ جن خوبیوں سے ہم خود محروم ہوں وہی محاسن کسی دوسرے شخص میں دیکھ کر ہم خواہ مخواہ اس سے جلنے لگتے ہیں۔ اور اسی لئے ظفر کو ضیا سے ایک نہ معلوم سی پرخاش ہو گئی تھی ——— !

گرمیوں کا موسم تھا۔ نیلوفر اور ظفر اور ان کا ننھا پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ نیلوفر کی روح کو پہاڑوں کے قدرتی مناظر آسودگی سی بخشتے تھے۔ اور وہ یہاں بہت خوش تھی۔

ایک دن نیلوفر کی ایک ملنے والی نے چند سہیلیوں کے ساتھ اسے ایک ریسٹوران میں چائے پر مدعو کیا تھا۔ وہ سب ایک طرف کو بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ چائے ختم کر رہی تھیں اور پُرلطف باتوں کا سلسلہ چھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دبے ہوئے قہقہے بھی بلند ہو جاتے تھے۔ نیلوفر حسب عادت ساری مجلس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ سب اسکی پُرلطف ظرافت آمیز باتوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ اچانک قریب کی میز پر نیلوفر نے ایک شخص کو بیٹھے دیکھا جو چائے کی پیالی آگے رکھے کچھ کھویا کھویا سا لگاتار نیلوفر کو دیکھے جا رہا تھا۔ اکثر ہندوستانی جاہل عورتوں کو یوں ہی گھورا کرتے ہیں۔ نیلوفر نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ لیکن کچھ دیر بعد اس نے بالکل غیر ارادی طور پر پھر اس طرف دیکھا تو اسے اب بھی برابر اپنی طرف دیکھتے پایا۔ چائے کی پیالی جوں کی توں اس کے سامنے رکھی تھی۔ نیلوفر محجوب سی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد نیلوفر نے ظفر کے ایک دوست کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ وہی شخص تھا۔

"ہماری بھابی صاحبہ ملک کی مایۂ ناز افسانہ نگار خاتون نیلوفر اور یہ جادو نگار شاعر خالد ضیا۔"

ظفر کے دوست نے تعارف کرواتے ہوئے ظرافت سے شاعرانہ انداز میں عجیب سے والہانہ پن سے قدرے جھک کر سلام کیا۔ نیلوفر بھی ذرا سی کھڑی ہوئی اور پھر سب سے باری باری تعارف کروایا گیا۔ اور سب ایک ہی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ضیا کچھ از خود رفتہ سا نظر آ رہا تھا۔ جیسے کسی اچانک مسرت سے دوچار ہو کر مغلوب ہو رہا تھا۔ اسکی بیقرار آنکھیں بار بار نیلوفر ہی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کیسی کشش انگیز چمک تھی۔ کیسی شاعرانہ اداسی تھی۔ جیسے ایک دنیا کو جذب کر لینے کی قوت رکھتی ہوں۔ اور نیلوفر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان آنکھوں کی گہرائی اور یہ نشیلی اداسی اُسے کوئی بہت ہی پُرکیف اور لطیف سندیسہ دے رہی ہو۔ وہ کانپ گئی اور جان بوجھ کر اور طرف متوجہ ہو گئی۔ ضیا تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی رسمی گفتگو کرتا رہا۔ نیلوفر کی سہیلیاں اسکی باتوں میں خاص دلچسپی لے رہی تھیں۔ مگر نیلوفر کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح کچھ ڈری ہوئی سی شرمائی ہوئی سی اور جیسے پر جبیں نظر آ رہی تھی ـــ

"بھابی! ضیا کل ہی یہاں آئے ہیں" ظفر کا دوست بولا۔ "میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ سے ان کا تعارف ضرور کراؤں گا۔ دو فنکاروں کا اتنے نزدیک رہ کر بھی ایک دوسرے سے بیگانہ رہنا بے انصافی ہوتی۔"

"ایک دوسرے سے بیگانہ" یہ الفاظ نیلوفر کے دل میں ایک دلدوز کھٹک پیدا کر گئے۔ نیلوفر بہت جلد وہاں سے چلی آئی۔ رخصت ہوتے وقت ضیا سوچ رہا تھا وہ اُسے دوبارہ ملنے کیلئے کہے گی یا اپنے گھر آنے کی دعوت دیگی۔ مگر نیلوفر نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس نے جاتے جاتے پلٹ کر ایک بار ضیا کو دیکھا۔ اور آناً فاناً میں نظروں سے اوجھل ہو گئی ـــ

(باقی آئندہ)

قومی رہنما

از محترمہ آصفہ مجیب

کچھ دن سے مجھے قومی کام کرنے کا بہت شوق ہوگیا تھا۔ اپنی قومی تباہی اور بربادی کا یہ سوہان رُوح ہوگیا۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی۔ یا اللہ کیا انجام ہوگا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور کرونگی۔ اس سلسلے میں مجھے بہت سے منتے لوگوں سے واقفیت ہوگئی۔ میں اپنی جوشیلی تقریروں اور اپنے پُرزور خیالات سے سوتوں کو جگانے پر تُل گئی۔ دامے درمے سخنے جو کچھ بضاعت تھی وہ سب اس میں لگادی۔ بہت لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ سنبھالا، مجھے بہت اونچا اُٹھایا۔ اور میرا شمار بھی قومی کارکنوں میں ہونے لگا۔ مجھے اپنے قومی رہنماؤں سے خاص ارادت اور عقیدت ہوگئی تھی۔ میں سوچنے لگی ان سے بڑھکر کس کے دل میں قومی درد ہوگا۔ خیر میں نے جو درد و دوش کی اس کا ذکر کیا، چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ میری حقیقت ہی کیا۔ لیکن ہاں میں جب اپنے کسی قومی رہنما کو دیکھتی تو جوش عقیدت سے سرخم کردیتی۔ جی چاہتا انہیں دل میں بٹھالوں یا ان کے لئے پلکیں بچھاؤں، کیا کروں۔ اپنے حلقے میں جب کوئی جلسہ کرتی تو وہ بعد سے چن چن کر انہیں صدارت کیلئے منتخب کرتی۔ ہاں یہ کیسی قابل قدر روشن ہستیاں ہیں۔ دوسروں کیلئے اپنا عیش و آرام تج دینے والی۔ بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھلانے والی۔ قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے والی۔

اتفاق سے ایک مرتبہ مجھے ایک عظیم الشان جلسے میں جانے کا موقع مل گیا۔ میں اسکو اپنی خوش نصیبی سمجھی۔ کیونکہ ایسے موقعے ذرا کم میسر آتے تھے۔ میرا قیام دیہات میں ہونے کی وجہ سے باہر جانا آنا بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ میری ایک بہن بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہم نے شہر میں اپنے ایک عزیز کے یہاں قیام کیا۔ اور ٹھیک جلسے کے وقت پہنچ گئے۔

ایک وسیع مقام پر بڑا سا پنڈال بنا تھا۔ جو کھچا کھچ بھرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کا ایک سیلاب اُمنڈا چلا آرہا ہے۔ طرح طرح کے چہرے کالے، گورے، جوان، بوڑھے، مختلف لباس، مختلف آن بان۔ شاندار اور برق رفتار موٹریں چلی آرہی تھیں۔ اور ان پر سے بڑے بڑے رئیس

[illegible] بیش قیمت کپڑے پہنے [illegible] ساڑیاں پہنے تیتریوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ ان کی ساڑیاں [illegible] گرانبہا جاذب نظر تھیں۔ کچھ نئی معاشرت کے [illegible] کی نظریں دوڑا رہے تھے۔ اس ہجوم میں ہم بھی [illegible] جذبہ سے سرشار لیکن میں آزاد نہ تھی۔ ایک سیاہ برقعے میں تھی۔ [illegible] رنگ کا۔ پردے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ [illegible] اور جگہ تلاش کررہی تھی۔ میری بہن نے کہا۔

"ارے باجی کہاں بیٹھو گی؟ یہاں تو بڑا مجمع ہے۔ برقعے کے اندر دم گھٹ جائیگا۔ کہیں پردہ کی جگہ نہیں۔"

"چلو کہیں بھی بیٹھ جائیں گے۔ نہ سہی پردہ کا انتظام۔ جہاں بھی جگہ ملے گی گھس جائیں گے۔ تھوڑی دیر تکلیف ہی سہی۔ ایسے موقع پر آرام کی فکر نہیں کیا کرتے۔" میری بہن مسکرا کر ہنس پڑی۔

"آفریں ہے آپ کی ہمت اور شوق پر۔"

خیر ہمارا ذوق شوق دیکھکر اور ہمارے آرام کے خیال سے ایک والنٹیر نے ایک کنارے پر چند چقیں لاکر ڈال دیں اور دو کرسیاں رکھدیں۔ ہم اطمینان سے وہیں بیٹھ گئے۔ اور نہایت دلچسپی سے باہر کا منظر دیکھنے لگے۔ جھنڈا بلند ہوا۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ تجویزیں پیش ہوئیں۔ ووٹ لئے جانے لگے۔ ہم نہایت غور و انہماک سے سب کارروائی دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی کچھ رائے زنی بھی کرنے لگتے۔

ابھی جلسہ ہو ہی رہا تھا کہ ایک نہایت معمر بزرگ بیوی کمر خمیدہ سفید پوشاک پہنے ایک جوان سی بیوی کا ہاتھ پکڑے جو نہایت فیشن ایبل کپڑے پہنے تھیں ہماری طرف آئیں۔

ہم دونوں بہنیں انہیں دیکھکر فوراً کھڑے ہوگئے۔ اور اپنی کرسیاں پیش کیں۔ ان بزرگ بیوی کو جگہ دینا ہمارا اخلاقی فرض تھا۔ ان دونوں کو میں اچھی طرح جانتی بھی تھی۔ کتنی مرتبہ جلسوں میں ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ ان کا شمار قومی کارکنوں میں تھا۔ وہ بھی قومی رہنماؤں کی ایک رکن کی حیثیت رکھتی تھیں۔

"لیجئے امّاں جان آپ تو آرام سے یہیں بیٹھ جائیے" جوان بیوی نے کہا۔ جو اُن کی بہو تھیں۔

"بس بس خوب دکھائی دے رہا ہے۔"

یہ کہکر میری طرف اس طرح دیکھکر مسکرائیں گویا بہ زبان خاموش ہمارے ایثار کا شکریہ ادا کررہی ہیں۔ اور اتنا ہی کافی ہے۔ آن کی بہو [illegible]

پھر وہ کسے دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور جلسہ کی کارروائی دیکھنے لگیں۔

اتنے میں ایک صاحب آدھر سے گزرے جو میرے بھائی کے دوست تھے جن کے ساتھ میں آئی تھی۔ اُنہوں نے ہمیں کھڑا دیکھا تو دوڑے ہوئے گئے اور دو کرسیاں اور لے آئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور دونوں بہنیں بیٹھ گئے۔

میں نے شمسہ سے کہا کہ" ان کو پہچانا ؟"

" ہاں ہاں پہچانتی کیوں نہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے لو وہی تو ہیں جنہوں نے آپ کے جلسہ میں سودیشی پر تقریر کی تھی ۔"

ہم منتظر تھے کہ وہ ہم سے کچھ مخاطب ہونگی۔ مگر اُنہوں نے ہماری طرف رُخ بھی نہیں کیا۔

ایک دم وہ جوان بیوی میری طرف دیکھکر کہنے لگیں۔

"آپ کے پاس پان تو نہ ہونگے ؟"

"جی نہیں۔ میں پان لانا بھول گئی۔ یہاں آنے کی ایسی عجلت تھی کہ ایک پان کھا کے بھی نہ چلی ۔"

یہ سُنکر اُنہوں نے اپنی ساس کا جھولا اُٹھایا۔ اس میں سے پان نکال کر کھایا، ایک ساس کو دیا۔ اور جھولا بند کرکے ان کو واپس کر دیا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجمع کو چیرتی پھاڑتی دو خواتین زرق برق لباس پہنے تشریف لائیں۔ ایک تو یہاں کے ووٗمین لیگ کی صدر تھیں اور دوسری سکریٹری اور بہت بڑی لیڈر۔ ان دونوں سے مجھ سے چند بار ملاقات ہو چکی تھی۔ اور ہمارے یہاں ایک جلسے میں اُنہوں نے صدارت بھی کی تھی۔ ہم تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ اُن کو سلام کیا۔ اور پھر اپنی کرسیاں اُن کے لئے خالی کر دیں۔

"تشریف رکھئے ۔"

اُنہوں نے نہ ہمارے سلام کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ نہ کچھ بولنے کی زحمت گوارا کی۔ بے دھڑک بیٹھ گئیں۔ اور وہ دونوں جو پہلے سے موجود تھیں اُن سے نہایت تندروں میں ہم کلام ہوئیں۔

یہ عجیب مہمل سی حرکت تھی کہ اتنی دیر تو وہ مردانے جلسے میں بے تکلفی سے بیٹھی رہیں۔ خود پردہ تو کرتی نہیں تھیں۔ پھر اُنہیں آکر بیٹھنے اور مفت میں پردہ داروں کو تکلیف پہنچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور کہاں کی انسانیت تھی۔ محض وہ دو بیویاں جو بیٹھی تھیں ان سے باتیں کرنے کے لئے

ہم مسلسل کھڑے رہے۔ کھڑے کھڑے ہمارے پیر شل ہو گئے۔ جلسہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ صدر صاحبہ نے میری طرف رُخ کیا اور بولیں۔

"اے بیوی کہیں سے پانی منگواؤ۔ مارے پیاس کے حلق سوکھا جا رہا ہے ۔"

میں نے ذرا تامل سے جواب دیا۔ "مجھے بھی پیاس لگی ہے مگر منگواؤں کس سے ؟ "

دوسری بولیں ۔ "اِدھر جا کر کسی سے کہو۔"

میں اُن کی بات رد نہ کر سکی۔ اور جوشِ خدمت سے مغلوب ہو کر پانی کی فکر میں گئی ۔ مجھے بڑی مشکلوں سے دو گلاس پانی کے ملے۔

دونوں نے میرے ہاتھ سے ایک ایک گلاس لے لیا۔ اور بے تکلف چڑھا گئیں۔ یہ بھی نہ کہا کہ تم بھی پیاسی ہو۔ تھوڑا تم بھی پی لو۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ آفریں ہے۔ اگر ہم جنس ہوتے تب بھی جب ہم نے ان کو جگہ دی۔ اُن کی خاطر خود کھڑے رہے۔ انہیں پانی پلایا تو کم از کم انہیں دو حرف شکریہ ہی کے ادا کر دینا چاہیئے تھا۔

جلسہ ختم ہوا تو سکریٹری صاحب نے مجھ سے کہا۔

"یہ کام آپ ہی کر سکتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا ہمارا موٹر بُلوا دیجئے اِدھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے اِس طرف کوئی ہوگا۔ اس سے کہہ دیجئے ہمارا موٹر لے آئے۔

میں نے حیران نگاہوں سے اُن کو دیکھا۔ اور تعمیلِ حکم کے لئے بڑھی۔ میری بہن نے میرا دامن کھینچا۔

" ارے باجی آپ کہاں جا رہی ہیں ؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیرو میں ابھی آتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی ۔"

میں نے کسی نہ کسی طرح اُن کا موٹر لگوا دیا۔ وہ بغیر سلام کلام کے روانہ ہو گئیں۔

میری بہن نے حیرت زدہ ہو کے مجھے دیکھا

" ارے باجی وہ تو ہمارا پنکھا بھی لے گئیں۔ میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ پھر واپس ہی نہیں کیا۔

میں تھوڑی دیر دم بخود کھڑی رہی۔ پھر اپنا برقع سنبھالتے ہوئے بولی۔

" شاباش ہے شاباش ! خوب لوگ ملے آج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا نادر اخلاق تھا ۔"

"...... کا پردہ کلب"

(از نجمہ تصدق)

بجلیوں کی اور شراروں کی زمیں ❖ چاند، تاروں، سیم پاروں کی زمیں

قہقہے آرام پاتے ہیں یہاں ❖ پھول سے لب مسکراتے ہیں یہاں

اُف یہ ملبوسات! ہوتا ہے گماں ❖ جیسے کوئی ساڑیوں کی ہو دکاں

عشق کے ارمان پلتے ہیں یہاں ❖ شعر اور رومان پلتے ہیں یہاں

ریشموں میں جھلملاتی لڑکیاں ❖ گاہ آتی گاہ جاتی لڑکیاں

نکہتیں بکھری ہوئی ہیں چارسو ❖ مستیاں نکھری ہوئی ہیں چارسو

سحر کاری، جلوہ تابی ہر طرف ❖ دیدۂ دل کی خرابی ہر طرف

مضطرب ہیں حسن کے جلوے یہاں ❖ اس نمائش گاہ میں پردہ کہاں؟

واہ وا کیا آبروئے عشق ہے

حُسن کو خود جستجوئے عشق ہے

بونوں کے ملک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

(چھٹی قسط)

بستی میں غل مچ گیا۔ لوگ آنے شروع ہوئے۔ سرائے کے بڑے سے کمرے میں گلیور کو ایک میز پر کھڑا کیا گیا۔ لڑکی بھی اس کے برابر ایک سٹول پر آ کر کھڑی ہوئی۔ تاکہ اس کی حفاظت کرے۔ ایسے بڑے بھلے کا خیال رکھے اور ایسے تماشائی بھی جانے کہ اب وہ کیا کرے۔ اب اسکو کیا کرنا ہے۔ اور اب کیا کرنا چاہیئے۔

آدمیوں کی بھیڑ ہوگئی تھی۔ قریب قریب آدھا قصبہ [illegible] آیا تھا۔ زمیندار نے کمرے کے دروازے بند کر دیئے۔ سب کو ایک دم اندر جانے میں [illegible] تیس تیس کی ٹولیاں اندر جانی شروع ہوئیں۔ ہر شخص سے ایک روپیہ ٹکٹ کا لیا۔

گلیور میز پر چل کر، دوڑ کر، اچھل کر دکھاتا۔ لڑکی اس سے سوال کرتی۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اونچی سے اونچی آواز میں جواب دیتا۔ [illegible] تماشائیوں کی طرف منہ کر کے انہیں سلام کرتا۔ ان کا مزاج پوچھتا۔ لڑکی نے ایک انگشتانے میں شراب بھر کر اسکے سامنے رکھی جسے وہ جام صحت پینے کے انداز میں پی گیا۔ اسکے بعد اس نے اپنی تلوار میان سے نکالی۔ اسکو ہوا میں لہرایا اور اس طرح ہاتھ چلائے جیسے کوئی لڑ رہا ہے۔ کبھی پینترہ بدلتا۔ کبھی اچھلتا۔ کبھی آگے بڑھتا۔ کبھی پیچھے ہٹتا۔ کبھی تھمتا۔ کبھی [illegible] باتوں سے دیکھنے والے بہت خوش ہوتے۔

اس دن تیس تیس آدمیوں کی بارہ سے زیادہ ٹکڑیوں نے یہی کھیل تماشے دیکھے اور بارہ دفعہ گلیور کو اپنی کل کل توڑنی پڑی تھی۔ اس [illegible] ختم ہوتے ہوتے وہ تھکاوٹ کے مارے قریب قریب ادھ موا ہوگیا تھا۔ بدنصیبی اور کیا ہوگی۔ سچ مچ بندروں کے سے برتاؤ کئے جا رہے تھے۔ فقط ڈگڈگی کی کسر تھی۔ غریب کا دل بھرا چلا آتا تھا کہ خوب چیخیں مار مار کر روئے۔

نمائش ختم ہونے کے بعد [illegible] بستی میں یہ اعلان کرایا کہ اگلے [illegible] کو جب بازار لگے گا تو دوبارہ عجیب غریب تماشہ دکھایا جائیگا [illegible] ہیں۔ اور اپنے گھر روانہ ہوا۔ گھر پہنچ کر اس نے پہلے کہیں سے بہت زیادہ آرام دہ بکس تیار کرایا جس میں گلیور [illegible]

بھری ہوئی تھیں۔ جس کی بدولت ایک دن میں اتنی کمائی کی تھی اس کا خیال کیوں کرتا۔

لیکن [illegible] کے مصائب کی کسی کو خبر نہ تھی۔ سفر کی ناقابل برداشت کھکھیڑ اور متواتر اپنے کرتب دکھانے سے اسکی بوٹی بوٹی دکھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں تھک کر چور ہو گئے تھے۔ کھڑے ہونے اور بات کرنے کا دم نہ تھا۔ آخر ہی پڑ گیا اور تین دن کے بعد ذرا جان میں جان آئی۔ یہ تین دن بھی اسکو چھٹی سے نہیں گزرے۔ [illegible] کوس سے لوگ اسکو دیکھنے کیلئے برابر چلے آ رہے تھے۔ ہر وقت زمیندار کے گھر پر تماشائیوں کا ٹھٹ لگا رہتا۔

مخلوق کا یہ شوق دیکھ کر زمیندار نے سوچا کہ اگر گلیور کو ملک کے بڑے شہروں میں لے جایا جائے اور وہاں اسکی نمائش ہو تو بڑی کمائی ہوسکتی ہے چنانچہ اس نے لمبے سفر کی تیاری کرلی۔ اور اپنی کھیتی باڑی کا کام بیوی کے سپرد کر کے روانہ ہوگیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بادشاہ کی دارالحکومت کا رخ کیا۔ جو وہاں کا بڑا شہر اور تین ہزار میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

زمیندار کی لڑکی ساتھ تھی۔ باپ کی پیٹھ کے پیچھے گھوڑے پر۔ اور اسکی گود میں گلیور کا بکس تھا جسے ننھے آدمی کا بنگلہ کہنا چاہیئے۔ یہ بکس خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔ اندر کے رخ چاروں طرف نرم نرم کپڑوں کی پوشش تھی۔ گڑیا کا پلنگ بچھا ہوا۔ پہننے کے کپڑے اور تمام ضروری سامان قرینے سے رکھا تھا۔ کیونکہ زمیندار کی خواہش تھی کہ راستے میں جو گاؤں، قصبہ یا بستی ملے وہاں ٹھہر ٹھہر کر گلیور کا تماشہ دکھاتے چلیں۔

یہ سفر دس ہفتے میں ختم ہوا۔ ان دس ہفتوں میں گاؤں، چھوٹی چھوٹی بستیوں اور بعض امیر گھرانوں کے علاوہ اٹھارہ بڑے بڑے شہروں میں گلیور کی نمائش کی گئی اور زمیندار نے خوب دولت سمیٹی۔

آخرکار دارالسلطنت میں پہنچ گئے۔ زمیندار نے شہر کے بیچ میں ایک نہایت اچھا سربازار مکان کرایہ پر لیا۔ اشتہار تقسیم کرائے۔ باجے کے ساتھ تمام آبادی کو اطلاع دی کہ جو چیز عمر بھر نہیں دیکھی آؤ آج دیکھ لو۔ زمیندار نے ایک بڑی میز کا بھی انتظام کیا اور اسکے چاروں طرف کٹہرا لگوایا تاکہ گلیور نیچے بھی نہ گر پڑے۔ یہاں روزانہ دس بار کھیل ہوتا اور جو دیکھتا تعجب کرتا اور کئی کئی دفعہ دیکھنے آتا۔

گلیور اب اس ملک کی زبان خاصی اچھی طرح سمجھ سکتا تھا اور بول بھی سکتا تھا۔ جو بھی لوگوں سے باتیں کرتا۔ [illegible] کہتا اور انکی سمجھتا۔ زمیندار کی نیک لڑکی کو جب ذرا بھی فرصت ملتی سفر اور حضر دونوں میں اسے [illegible] پڑھنا سکھاتی رہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی کتاب وہ ہر وقت رکھتی اور اس کتاب کی مدد سے اپنی زبان کی الف بے پڑھاتی اور مختلف چیزوں کے نام اسکو بتایا کرتی۔

(باقی آئندہ)

نیشنل وار فرنٹ

یعنی

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اسکے اغراض و مقاصد تمام عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں:—

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کے لئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بد امنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاش اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور ان کا انسداد کرنے کے لئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا اور ان کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمنوں کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور ان کی نگرانی کرنا۔ تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے کی اور ضرورت زندگی کی چیزوں کو انکی مقررہ قیمت پر فروخت کرانیکا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملے سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنیکی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا اور اسکے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض و مقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے اور تعاون کرکے عوام الناس کی فلاح و بہبودی میں حصہ لینا چاہیئے ؞

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ راجپور روڈ۔ دہلی

فلمی خبریں

از فصیح الدین احمد

رنجیت مووی ٹون کے تیار کیے ہوئے فلم "تان سین" کو جگت ٹاکیز دہلی میں سولہ ہفتے ہو چکے ہیں۔ یہاں کے علاوہ نشاط ٹاکیز لاہور اور امپیریل ٹاکیز کراچی میں بھی بڑی دھوم سے چل رہا ہے۔ فلم میں دربار اکبری کا پرشکوہ ماحول اور "تان سین" کی موسیقی کا اعجاز بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

سہگل نے "تان سین" کے روپ میں اعلیٰ معیار کی موسیقی پیش کی ہے۔ خورشید کی نغمہ سرائی بھی کچھ کم دلکشی نہیں رکھتی۔ اس فلم کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ابھی یہ فلم ایک ایک ہال میں کئی کئی ہفتے اور دکھایا جائیگا۔

رنجیت مووی ٹون "تان سین" کے بعد بہت جلد دوسرا فلم دیش کنیا پیش کرنے والی ہے۔ اسکے ڈائرکٹر کیدار شرما ہیں۔ دیش کنیا میں راجپوتوں کی شان و شوکت، ان کی صداقت و شجاعت اور راجپوت عورتوں کے بلند کیرکٹر کا نہایت کامیاب مظاہرہ ہے۔

اس زمانہ کا ماحول پیش کرنے اور لباس وغیرہ کی تیاری کے سلسلے میں بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔

رامنک پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم **ریکھا** جمعہ ۲۲ اکتوبر سے دہلی کے کمار ٹاکیز میں دکھایا جا رہا ہے۔ ڈائرکٹر مہندر ٹھاکر نے یہ فلم بڑی کاوش و اہتمام سے تیار کیا ہے۔ اس فلم میں مشہور و مقبول "لیلا چٹنس" اور "مایا بنرجی" نے کام کیا ہے۔

ڈی-آر-ڈی پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم **اشارہ** ڈ رز سنیما دہلی میں ۳ ستمبر سے دکھایا جا رہا ہے۔ کہانی دیوان شرر کے مشہور ناول Gong of Shiva سے ماخوذ ہے۔

اس فلم میں پرتھوی راج کی اداکاری نے جان ڈال دی ہے۔ کہا جاتا ہے اس فلم میں پرتھوی راج نے اپنے تمام کارناموں پر سبقت ثابت کر دی ہے۔ دوسرے اداکاروں میں جگدیش، ثریا، [illegible] سنگھ اور پرو تما دیوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

کہانی نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ ایک شاندار [illegible] ہے۔

[illegible] پروڈکشنز [illegible] ابھی قائم کرنے سے پہلے بھگت [illegible] سنت تلسی داس، تان سین اور شادی جیسے معرکۃ الآرا فلم پیش کر چکے ہیں۔ اب اپنی الگ فلم کمپنی قائم کرنے کے بعد انہوں نے ایک فلم بھگت راج تیار کیا ہے۔ جو روپ ٹاکیز دہلی میں دکھایا جا رہا ہے۔ "بھگت راج" میں اجودھیا کے بھگت مہاراجہ امبریش کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ یہ ہندوستان کی قدیم تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔

بشنو پنت پگنیس، واسنتی، کوشلیا، مبارک اور رنجیت اس فلم کی روح رواں ہیں۔

محبوب آرٹ پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم **نجمہ** دہلی میں میجسٹک سنیما میں اٹھارہ ہفتے پورے کر چکا ہے۔ ہال اب بھی کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے کہ ابھی مہینوں اور دکھایا جائیگا۔

کہانی میں اسلامی معاشرت و تمدن پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے اپنی اس نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلا فلم ہے۔ کہانی دلچسپ ہونے کے علاوہ سبق آموز بھی ہے۔ موسیقی کا معیار اچھا ہے۔

شوانی آرٹ پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم **سہارا** جس کے متعلق اطلاع تھی کہ نہایت کامیابی کے ساتھ امرتسر، کراچی، بریلی اور نینی تال میں دکھایا جا رہا ہے اب ریز سنیما دہلی میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس فلم میں "نیلسنا" اور "بھابی" کی مشہور و مقبول اداکارہ رینوکا دیوی نے کام کیا ہے۔

دوسرے اداکاروں میں نارنگ اور پران کے نام قابل ذکر ہیں۔ نارنگ "خزانچی" میں، اور پران "خاندان" میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

فضلی برادران لمیٹڈ کا تیار کیا ہوا ترقی پسند فلم **فیشن** ۵ نومبر سے [illegible] سنیما [illegible] شروع ہے۔ یہ فلم مشہور و معروف ڈائرکٹر حسنین کی نگرانی [illegible] تیار ہوا ہے۔ جو غریب و مفلس طبقہ کی [illegible] حالات اور ان کے طور طریق پہ بہت گہری نظر رکھتے ہیں۔ [illegible]

دلچسپ کمپنی فلم میں اس طبقہ کے کردار پیش کرتے ہیں تو ماحول اور اس کے تقاضوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

اس فلم کی کہانی دلچسپ، پُر اثر اور سبق آموز ہے۔

انڈین آرٹ پکچرز کے زیر اہتمام مسٹر جے رہی پرکاش **رام جے لکشمی** اور **انگوری** تیار کر رہے ہیں۔ یہ اب تیاری کی آخری منزلوں میں ہیں۔ رام جے لکشمی میں سب سے زیادہ دلکش عناصر اس کے ناچ اور گانے ہیں۔

امر پکچرس کا تیار کیا ہوا فلم **پیغام** مختلف جگہوں پر کافی مقبول ہو رہا ہے۔ اس کمپنی کا دوسرا آنے والا فلم **آداب عرض** ہے۔ جس کے ڈائرکٹر مسٹر چودھری ہیں۔ اس فلم میں نیپنی جیونت کی اداکاری خاص طور پر جاذب توجہ ہے۔

مسٹر چودھری کی نگرانی میں اس کمپنی کا ایک اور فلم **گلی** تیار ہونے والا ہے۔

پنچولی آرٹ پکچرز بڑے عظیم الشان انتظامات کے ساتھ ایک فلم **شیریں فرہاد** تیار کر رہی ہے۔ کہانی کی ترتیب کے سلسلہ میں بہت کافی تاریخی کلو پچر کی چھان بین کی گئی ہے تا کہ فلم اس یادگار ٹریجڈی کو صحیح ماحول کے ساتھ پیش کر سکے۔ اس زمانے کے لباس اور ساز و سامان کی تیاری پر بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ عظیم الشان محلات اور اُن کی اندرونی شان و شوکت پیش کرنے کا حیرت انگیز اہتمام کیا گیا ہے۔ پس منظر اور اسکی جزئیات کے سلسلہ میں پرمانا دت کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ جو "مالی وڈ" میں بھی کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ امید کی جاتی ہے ڈائرکٹر این۔ ایم۔ خواجہ کے مشوروں سے اس میں اور چاند لگ جائیں گے۔ خیال کیا جاتا ہے یہ اپنی نوعیت کا بے نظیر فلم ہوگا۔

پچھلے دنوں بمبئی میں پنچولی آرٹ پکچرس کی تیار کردہ فلم "پونجی" کی نمائش ہو چکی ہے۔ "پونجی" نہایت اعلیٰ درجہ کا فلم ہے۔ اور یقیناً پنچولی آرٹ پکچرز کے شایان شان ہے۔ فلم کی بنیاد ایک معاشرتی کہانی پر ہے جس میں جا بجا بڑے دلچسپ مقامات آتے ہیں۔ کہانی کے علاوہ اس فلم کا دوسرا دلکش پہلو اس کے گانے ہیں۔ ان گانوں سے فلم میں اور چار چاند لگ گئے ہیں۔ اداکاروں میں ہے بی اختر۔ راگنی۔ اسمٰعیل۔ جنت اور اجمل کے نام خاص طور پر قابل ذکر

ہیں مس پانڈے کی اداکاری بھی پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ امید کی جاتی ہے یہ فلم بہت مقبولیت حاصل کریگا۔

بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ کا تیار کیا ہوا فلم "ہماری بات" بمبئی میں بہت مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس فلم میں دیوکا رانی ایک عرصہ دراز کے بعد نمودار ہوئی ہیں۔ اگر فلم کے اور پہلو بہت زیادہ کمزور بھی ہوتے تو دیوکا رانی کی شخصیت اور ان کی اداکاری اس کو مقبول عام بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ اس سے قبل بمبئی ٹاکیز کے تیار کردہ فلم "قسمت" اور "بسنت" ہندوستان کے مختلف شہروں میں نہایت کامیابی کے ساتھ چل چکے ہیں۔

پرکاش پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **رام راج** مختلف شہروں میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ کہانی میں فن کارانہ عظمت اور دلکشی ہے۔

ان دنوں پرکاش پکچرز ایک فلم **کویتا** تیار کر رہی ہے۔ اس کے زیادہ تر سین مکمل ہو چکے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ دسمبر تک یہ فلم مکمل ہو جائیگا۔ ان کے علاوہ یہ کمپنی ایک فلم "مہاتما بدھ" کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

شالامار پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **پریم سنگیت** حال ہی میں چل چکا ہے ان دنوں اس کمپنی کے زیر اہتمام ایک فلم **من کی جیت** تیار ہو رہا ہے۔ اس فلم کے مکالموں اور گیتوں کیلئے ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے فلم کا ادبی معیار بہت بلند ہوگا۔

پردیپ پکچرز کے زیر اہتمام مسز کملا بائی منگلوریکر ایک فلم **پنابائی** تیار کر رہی ہیں۔ مسز منگلوریکر ان چند خواتین میں ہیں جو فلم کی تکنیک میں مہارت رکھتی ہیں۔ "پنابائی" کی کہانی اور مکالمے لکھنے کیلئے دیوان شرر کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

سن رائز پکچرز دشنو کمار ویاس نے پروڈیوسر کی حیثیت سے فلمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ حال ہی میں انہوں نے ایک فلم "ستی انسوئیا" مکمل کیا ہے۔ اس فلم میں درگا کھوٹے اور شوبھنا سمرتھ نے کام کیا ہے۔ اداکاروں کے نام دیکھکر اندازہ کیا جاتا ہے یہ فلم کافی مقبولیت حاصل کریگا۔

دین پکچرز کے زیر اہتمام مسٹر فتح دین نے ایک فلم **کوشش** تیار کر لیا ہے جس کی بہت جلد دلی میں نمائش ہونے والی ہے۔ اس فلم میں ہندو مسلم اتحاد کا شاندار عقیدہ پیش نظر ہے۔ اس کے بعد یہ کمپنی ایک دوسرا فلم "جھلک" تیار کرے گی۔



محبوب
مسحور کن نغمے!
اچھوتی کہانی!!
دلکشی اور دلپسندی کا بہترین مرقع
ڈائرکٹر: محبوب
نجمہ
اشوک کمار
وینا
ستارہ
کمار
یعقوب
بیش بہا مسلم سوشل فلم
۹ ویں کامیاب ہفتہ
میجسٹک سنیما
تقسیم کنندگان
دہلی لاہور کراچی

آج
تان سین
اپنی موسیقی کی
بدولت زندہ ہے

ایک دن اکبر زندہ نہ ہوگا
مغل حکومت باقی نہ رہے گی
مگر تان سین ہمیشہ زندہ رہے گا
دنیا اس کی تانوں کو سُنے گی۔ اور فخر کے ساتھ کہے گی کہ
تان سین بھی اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا۔"
شہنشاہ اکبر

شاہانہ انداز
کا
بہترین فلم

رنجیت کا انوکھا شاہکار
تان سین

اداکاران خصوصی :۔
خورشید * سہگل * مُبارک * کملا چیٹرجی

ہر جگہ بہت کامیاب ہو رہا ہے

جگت دہلی
نشاط لاہور
رنجیت کراچی
میں ۱۶ واں پُر ہجوم ہفتہ

ان کے علاوہ ملک کے
گوشہ گوشہ میں نہایت
مقبول ہو رہا ہے

جاری کردہ — دہلی ٹاکیز بیورو۔ دہلی۔ لاہور۔ کراچی

پنچولی آرٹ پکچرز کا تیار کیا ہوا بے نظیر فلم

پونجی

اداکاران: ممی ۔ اختر
راگنی ۔ بی بی ۔
مس ۔ نجیب
منورما ۔ جینت ۔
اسمٰعیل ۔ جی ۔ این ۔ بٹ
درگا مہوٹا اور

ڈائرکٹرز: دلسکھ پنچولی اور راوندر دیو

جس میں

حسن کی سحر طرازیاں ـــــــ پُر لطف مذاق ـــــــ وجد آفریں گانے

اور شاندار مناظر

کہانی: دلسکھ پنچولی
مکالمے: سید امتیاز علی تاج

میوزک ڈائرکٹر: غلام حیدر

عنقریب آرہا ہے

(تیار ہو رہا ہے)

پنچولی کا شاندار فلم

شیریں فرہاد

بیش قیمت ساز و سامان کے ساتھ

اداکاران: راگنی ۔ جینت ۔ غلام محمد وغیرہ

ڈائرکٹر: پرہلاد دت

جاری کردہ ـــــ ایمپائر ٹاکی ڈسٹری بیوٹرز ۔ دہلی، لاہور، کراچی

زندگی

حسن و موسیقی کی ...

شیخ مختار ۔ امین خاتون ۔ یعقوب ۔ روپ

ہندوستانی زبان کے انمول کارنامے

مسز کملا بائی منگلورکر تیار کردہ بے نظیر فلم

وکیل صاحب

ڈائرکٹر : ـــــ موہن سنہا

۱۹۴۳ء کی بہترین پُر مذاق سنسنی خیز کامیڈی

اداکاران : مس مادھوری ۔ ترلوک کپور ۔ شہزادی ۔ راجکماری شکلا ۔ غلام رسول ۔ وغیرہ

اس سال کا یادگار شاہکار

اشارہ

طوفان خیز ...

اداکاران

نشانی

غیر معمولی طور پر دلچسپ اور پُر لطف ڈرامہ

جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک طوفان برپا کر رکھا ہے

اداکاران مجنوں ۔ راگنی ۔ روپ لیکھا ۔ غلام قادر

میوزک : ـــــ پیش کردہ امرناتھ

اس فلم نے ہر شہر میں دھوم مچا رکھی ہے!

دوسرا تیار ہونے والا فلم

کوئل (پنجابی)

اداکاران : ـــ

مجنوں ۔ نیلم ۔ رضا ۔ ساگر ۔ غلام قادر

ڈسٹری بیوٹرز ۔ آر ۔ ایس ۔ چمن لال اینڈ کمپنی لاہور ۔ دہلی

سید محمد ارتضیٰ دہلوی ... نے جید پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر "ادیب" ... سے شائع کیا



فلم ''وکیل صاحب'' کے چند اداکار



لیلا دیسائی فلم ''پرایادھن'' میں



[illegible]



[illegible]

only Title cover Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi.
Edited by Fasih-ud-din Ahmad M. A. and M. L. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

چندہ [illegible] روپے معہ محصول ڈاک — قیمت فی پرچہ [illegible] معہ محصول ڈاک

ادیب

مدیران —
[illegible] — فصیح الدین احمد ایم۔ اے — نجمہ تصدق ایم۔ اے، بی۔ ٹی

جلد ۶ — جنوری سنہ ۱۹۴۴ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد ایم۔ اے نے جید برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ادیب چاندنی محل دہلی سے شائع کیا)

[illegible]

کتابوں میں بتائی ہیں ... [illegible] ... جاتی ہیں۔

ان کتابوں کی زبان نہایت سیدھی سادی اور دلکش ہے۔ ان کا مطالعہ بچوں کے باعث دلچسپی بھی ہے اور مفید بھی۔ جس گھر میں بچے ہیں وہاں ان کتابوں کو ضرور ہونا چاہیے۔

(۷) انتقام اور دوسرے خوفناک افسانے

از ایم۔ اسلم صاحب

شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت عہ

اس سے قبل ہم ایم اسلم صاحب کی مختلف تصانیف پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ مگر زیر نظر کتاب کی نوعیت ان سب سے الگ ہے۔ یہ کتاب موصوف کے سات خوفناک اور سخت خوفناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ انہیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شگفتہ نگار ادیب جب زندگی کے تاریک اور بھیانک پہلوؤں کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کا تخیل کیسے کیسے روح فرسا مظاہر پیش کر سکتا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا جذبہ انتقام کیا کیا بھیانک صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں "گلہائے عقیدت" کے عنوان سے شاہد احمد مدیر "ساقی" کی ایک تقریظ شامل ہے۔ اس کے علاوہ "سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے مصنف نے خود بھی ایک تمہید لکھی ہے جس میں افسانہ نگاری سے بحث کی ہے۔

(۸) گردش

از حضرت مجنوں گورکھپوری

شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت عہ

حضرت مجنوں گورکھپوری اردو کے ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ مگر ایک عرصے سے انہوں نے افسانہ نگاری کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ زیر نظر کتاب "گردش" ان کا ایک طویل افسانہ ہے جو پہلی دفعہ آج سے گیارہ سال قبل شائع ہوا تھا۔ مجنوں صاحب انگریزی کے مشہور افسانہ نگار اور ناولسٹ ہارڈی سے بہت متاثر ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ہارڈی کی روح دوڑ رہی ہے۔ اس افسانہ میں بھی یہی رنگ غالب ہے۔ کتاب کے آغاز میں مجنوں صاحب کی ایک مختصر مگر پر مغز تمہید بھی شامل ہے جس

[illegible]

[illegible] کی تازہ ... [illegible]

بھی ملتی ہے کہ آئندہ ... [illegible]

ان سے مایوس نہیں ہوسکتے ... [illegible]

(۹) جھلکیاں

از یوسف بخاری صاحب

شائع کردہ مکتبہ جہاں نما دہلی۔ قیمت [illegible]

زیر نظر کتاب یوسف بخاری صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل موصوف ایک کتاب "موتی" پیش کر چکے ہیں۔ جو مشرق و مغرب کے فلسفی اور شاعروں کے نادر اقوال پر مشتمل تھی۔ "جھلکیاں" میں بعض طبع زاد افسانے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو انگریزی زبان سے ترجمہ کئے ہیں۔ طبع زاد افسانے تکنیک اور مادہ کے اعتبار سے کوئی بلند حیثیت نہیں رکھتے۔ اور مصنف کو خود اعتراف ہے کہ یہ افسانے ان کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ترجمہ میں مقامی رنگ شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے ان سے اجنبیت نہیں ٹپکتی۔ بحیثیت مجموعی افسانے دلچسپ ہیں اور ان میں سے بیشتر ایسے ہیں۔ جن میں معاشرتی اصلاح کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

(۱۰) باغی لڑکی اور دوسرے رومانی افسانے

از محترمہ شفیق بانو صاحبہ شفق

شائع کردہ نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی

زیر نظر کتاب محترمہ شفیق بانو کے ۲۳ افسانوں کا مجموعہ ہے شفیق بانو صاحبہ ادبی و صحافتی دنیا میں خاصی شہرت کی مالک ہیں اکثر افسانوں میں سوسائٹی پر تنقید کے علاوہ اصلاحی رنگ بھی شامل ہے۔ بیشتر افسانوں میں رومانیت غالب ہے۔ افسانوں کی نمایاں خصوصیت کردار نگاری نہیں۔ بلکہ زبان اور اسلوب ہے۔ موصوفہ کی اس خصوصیت پر مسٹر آصف علی نے اپنی تمہید میں اشارہ بھی کیا ہے۔ جو "حق شناسی" کے عنوان سے کتاب کی زیب و زینت ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب خواتین کے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

[illegible]

(۱۱) ہندی کے مسلمان شعرا

از عبداللہ بٹ صاحب

شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور۔ قیمت ۸/

مکتبہ اردو لاہور نے مختصر اور کم قیمت کتابوں کا نہایت کارآمد سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیر نظر کتاب "ہندی کے مسلمان شعرا" لاہور کے ایک نوجوان ادیب عبداللہ بٹ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ایسے موقعہ پر جب ہندی اردو کا سوال ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ اور یہ فتنہ روز بروز الجھتا ہی چلا جارہا ہے، ایسی کتابوں کا شائع ہونا ایک نیک فال ہے۔ ہندی شاعری میں بعض مسلمان شعرا نے گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ اسے کوئی مورخ ادبی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ خوشی کی بات ہے کہ عبداللہ بٹ صاحب نے اس طرف توجہ کی۔ کتاب میں ان شعرا کی زندگی کی ایک جھلک اور ان کے کلام کے پاکیزہ نمونے ملتے ہیں۔ شروع میں خود عبداللہ بٹ صاحب کا پیش لفظ ہے جس میں قومی زبان کے مسئلہ سے بحث کی ہے۔ اور سیدھی سادی زبان لکھنے پر زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتی زبان کے مشہور شاعر سید مطلبی فرید آبادی کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ جس میں عوام کی زبان اختیار کرنے اور اسکو ادبی حیثیت دینے کی پُر زور تائید کی ہے۔

(۱۲) معیشت زر

از ابن الحسن صاحب

شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور۔

اقتصادیات اور معاشیات پر اردو میں بہت کم لٹریچر ہے۔ اب بعض ذمہ دار اداروں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ مکتبہ اردو لاہور نے اس موضوع پر چند مختصر کتابیں شائع کی ہیں۔ زیر نظر کتاب معیشت زر کو اس سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ یہ کتاب ابن الحسن صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے اختصار کے ساتھ زر کی اہمیت، اس کے تبادلہ کے طریق، زر کی قدر، "سکہ سازی" اور اس کے معیار پر بحث کی ہے۔ آخر میں بینک کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف نے مسئلہ کی اہمیت اور اس کے فوائد و نقصانات پر پُر از معلومات مواد بہم پہنچایا ہے۔ یقیناً یہ کتاب ہمارے معاشی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

(۱۳) عربوں کی قومی تحریک

از مسعود علی ندوی صاحب

شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور۔ قیمت ۸/

مسعود علی ندوی صاحب اسلامی موضوعات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں وہ اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں موصوف نے عربوں کی جذبہ وطنیت کا تاریخی ارتقا پیش کیا ہے۔ عرب کے قدیم باشندے نسبی تفاخر پہ جان دیتے تھے۔ اور یہ چیز ان کی روایات میں شامل ہوچکی تھی۔ مگر آخرکار آہستہ آہستہ وہ اِس منزل سے آگے بڑھے۔ اور ان میں وطنیت کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ جذبہ کن اندرونی تضاد اور بیرونی اثرات کا نتیجہ تھا۔ اِسے فاضل مصنف نے بڑی جامعیت کے ساتھ اس مختصر کتاب میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے کتاب بڑی کاوش سے مرتب کی ہے۔ آخر میں حوالے کی کتابوں کی فہرست شامل ہے۔ اُمید ہے علمی حلقوں میں یہ کتاب دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

(۱۴) ادب اور انقلاب

از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

شائع کردہ ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲/

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ترقی پسند ادیبوں میں ایک پائینر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر ان کے افسانوں پر ہے جن میں انہوں نے انسانیت کے زخم سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اور جن میں رجعت پرستی پر شوخ اور تیز نشتر لگائے ہیں۔ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ موصوف ایک بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔ ان کا ایک طویل مضمون مدت ہوئی رسالہ "اردو" میں "ادب اور زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو نئے رجحانات پر پہلا تبصرہ کہنا چاہیئے۔ زیر نظر کتاب میں موصوف نے اسی مضمون کو زیادہ وسعت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ادب برائے ادب کے فلسفہ کی پُرزور مخالفت کی ہے۔ زندگی کا ادب سے اور ادب کا زندگی سے ناتہ جوڑنے کی تائید کی ہے۔ ادب برائے زندگی کے موضوع پر نہایت پُرمغز اور بلیغ بحث کی ہے۔ بلاشبہ اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ نئے اور نوخیز ادیبوں اور شاعروں کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

(۱۵) لہریں

از شفیق الرحمن صاحب
شائع کردہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن
قیمت تین روپیہ بارہ آنے

شفیق الرحمن صاحب موجودہ افسانہ نگاروں میں ممتاز درجہ
ھتے ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے متعدد رسالوں میں شائع ہو کر ادبی
تقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے تازہ
سانوں کا مجموعہ ہے۔ شفیق صاحب کے اسلوب نگارش میں ایک خاص
س اور شگفتگی ہے۔ ان افسانوں میں کہیں کہیں مزاح کی بھی ایک ہلکی
ر ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کھردرا پن نہیں ملتا۔ بحیثیت مجموعی
سانے دلچسپ ہیں۔ اور ادبی حلقوں میں یقیناً دلچسپی کے ساتھ
ھے جائیں گے :۔

(۱۶) مقالاتِ محمد علی (حصہ اول)

مرتبہ رئیس احمد جعفری صاحب
شائع کردہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

اس سے قبل رئیس احمد جعفری صاحب کی تصنیف سیرۃ محمد علی
ل میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ موصوف نے مولانا محمد علی مرحوم
بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور ان کی سیاسی اور ادبی زندگی
ے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب مقالات محمد علی میں رئیس احمد
عفری صاحب نے مولانا مرحوم کے وہ مضامین یکجا کئے ہیں جو عالم اسلام
ے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اس دور کی اسلامی سیاست
ا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک
ی سیاسی رہنما ہونے کے علاوہ ایک نہایت شگفتہ نگار ادیب بھی
ے، ان مضامین کی نوعیت صرف سیاسی نہیں ادبی بھی ہے ہم اس کی اشاعت کے
ے ادارہ اشاعت اردو کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ اس کے دوسرے
صے بھی بہت جلد نظر نواز ہوں گے۔

توریت وانجیل کی تحقیق

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب)

یہ مضمون ۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کی شام کو حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے ہارڈنگ لائبریری دہلی کی ادبی سوسائٹی میں پڑھا تھا۔

---

(۱)

انسان زمین پر رہتا ہے مگر اُس کا دماغ آسمان سے باتیں کرتا ہے اور ساری دُنیا کے بسنے والے انسانوں کی بڑی تعداد یقین کرتی ہے کہ خدا آسمان پر ہے۔ اور وہ کبھی کبھی انسانوں کی اصلاح و ترقی کے لئے کسی ایک آدمی سے باتیں کرتا ہے۔ اور اُن باتوں کو وہ انسان ایک کتاب میں جمع کرکے کہتا ہے کہ یہ آسمانی کتاب ہے۔

(۲)

موجودہ زمانے میں چھ کتابیں آسمانی مانی جاتی ہیں۔ ایک وید۔ دوسری ژندا وستا۔ تیسری توریت۔ چوتھی انجیل۔ پانچویں زبور۔ چھٹی قرآن۔ ساتویں کتاب گوتم بدھ کی بھی ہے۔ مگر وہ اتنی مشہور نہیں ہے۔

مسلمانوں کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام ماننے کے ساتھ ہی یہ بھی مانیں کہ توریت۔ انجیل اور دوسری وہ سب کتابیں حق ہیں۔ اور خدا کا کلام ہیں جو مختلف پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں۔

(۳)

قرآن پر ایمان رکھنے کے سبب میں ان کتابوں کو بھی مانتا ہوں جن کا نام قرآن نے بتایا ہے۔ اور ان کتابوں کو بھی مانتا ہوں جن کے نام نہیں بتائے مگر یہ حکم دیدیا گیا ہے کہ تم کو ان سب کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو خدا نے مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں پر نازل کی تھیں۔

میں قرآن کے مذکورہ حکم کو مان لینے کے بعد ان لوگوں سے اختلاف رکھتا ہوں جو اُن کتابوں کو آسمانی نہیں مانتے جن کا نام قرآن میں نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کردیا ہے کہ جن پیغمبروں کا نام قرآن میں نہیں آیا ہے اُن پر بھی ایمان لاؤ اور ان کتابوں کو خدا کا کلام مانو جو اُن

(۴)

توریت اور انجیل چونکہ یہودیوں اور عیسائیوں کی ایسی مشہور کتابیں ہیں جن کا نام اور ذکر قرآن میں بہت زیادہ آیا ہے۔ اس لئے میں پورے ادب اور پورے یقین اور پورے ایمان کے ساتھ توریت اور انجیل کو پڑھا کرتا ہوں۔ اور آج ہارڈنگ لائبریری کی ادبی سوسائٹی میں یہ مضمون اس لئے پڑھتا ہوں کہ یہ سوسائٹی ہندوؤں، مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ سب قوموں کی مشترکہ انجمن ہے۔ اور اس کی وقعت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کے بانی علامہ ایوننز سابق ڈپٹی کمشنر دہلی و حال سکریٹری چیف کمشنر صاحب دہلی ہیں۔ اور اس کے جلسوں میں ہر قوم کے بڑے بڑے نامور اہل علم مضامین پڑھتے ہیں۔ اور ہر قوم کے اہل علم سکون سے سُنتے ہیں۔ اور نظر تحقیق و انصاف سے دیکھتے ہیں۔ یہاں میں نے بعض اوقات ایسے مضامین بھی پڑھے ہیں کہ اگر کوئی سیاسی آدمی سیاسی نیت سے پڑھتا تو جیل خانے میں بھیج دیا جاتا۔ اور ان مضامین کو بڑے ذمہ دار انگریز افسروں کی موجودگی میں پڑھا گیا تھا اور کسی انگریز افسر نے ان مضامین سے بُرا نہ مانا تھا۔

لہٰذا آج بھی یہ تحقیقی مضمون کسی قوم کی آسمانی کتاب کی مخالفت یا ہجو کے لئے نہیں بلکہ محض علمی تلاش و تحقیق کی نیت سے پڑھتا ہوں۔

(۵)

جب میں نے حضرت عیسیٰ کی لائف لکھنے کا ارادہ کیا (کیونکہ قرآن میں حضرت عیسیٰ اور اُن پر نازل شدہ کتاب انجیل کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر آیا ہے) تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ میں یہ جانتا تھا کہ دُنیا کی موجودہ قوموں میں جتنی زیادہ خدمت اشاعت کے لحاظ سے انجیل کی ہوئی ہے۔ ویسی کسی دوسری کتاب کی نہیں ہوئی جس کو آسمانی کتاب مانا جاتا ہو۔ دُنیا کی ہر زبان میں انجیل کے ترجمے شائع ہوئے ہیں اور کروڑوں کی تعداد میں ان کی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ اِس لئے میرا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ کی لائف لکھنے میں مجھے بہت آسانی ہوگی اور سری کرشن جی اور آں حضرت کی لائف لکھنے میں جو تلاش مجھے کرنی پڑی تھی وہ حضرت عیسیٰ کی لائف لکھنے میں نہیں کرنی پڑیگی۔ مگر میں حیران رہ گیا کہ مجھے کسی زبان میں حضرت عیسیٰ کی ایسی لائف نہیں ملی۔ جو سیرت اور سوانح عمری کی شان رکھتی ہوتی۔ اِس لئے میں نے مجبوراً لوقا۔ یوحنا۔ متی۔ پطرس کی انجیلوں کو پڑھکر تاریخ مسیح تیار کی۔ اور جب وہ چھپ کر تیار ہوئی تو اس سے زیادہ حیرت ہوئی جو کتاب کی تیاری کے وقت سیرت

[illegible] اور یہاں تک کہ عیسائیوں [illegible]

اس میں کوئی بات عیسائی عقائد کے خلاف نہ تھی۔

(۶)

میں نے بغیر کسی مشکل کے سمجھ لیا کہ مسلمان تو تیرہ سو برس کی سیاسی لڑائیوں کے سبب سے عیسائیوں سے اُن کی ہوتی رہی تھیں۔ اس کتاب کی طرف مخاطب نہیں ہوئی۔ اور ہندوؤں کو حضرت عیسیٰ سے رغبت کی کوئی وجہ نہ تھی اور عیسائیوں نے اس لئے اس کو نہ لیا کہ وہ ایک مسلمان کی لکھی ہوئی تھی۔

(۷)

اب میں حضرت موسیٰ کی لائف لکھنے کی تیاری کرنے لگا تو توریت کو پڑھا اور حضرت موسیٰ کے حالات تاریخوں میں تلاش کرنے شروع کئے۔ تو معلوم ہوا کہ تاریخیں عموماً توریت سے ماخوذ ہیں اور مؤرخوں نے حضرت موسیٰ کی شخصیت کی نسبت بہت کم لکھا ہے۔

فرعون کی تاریخ لکھ چکا تو اندازہ ہوا کہ مصری آثار قدیم سے بھی حضرت موسیٰ کے تاریخی حالات اتنے نہیں ملتے جتنے توریت سے ملتے ہیں۔

(۸)

مگر میرا یہ مضمون حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کی ذاتی سرگذشت سے تعلق نہیں رکھتا۔ میری تحقیق محض توریت و انجیل کتابوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ توریت اور انجیل میں کلام الٰہی ہونے کی شان کتنی ہے؟ اور انسانی تحریر ہونے کی شان کتنی ہے؟

میں نے یہ تحقیق قرآن کو سامنے رکھکر کی ہے۔ کیونکہ قرآن ہی نے ان دونوں کتابوں پر ایمان لانے اور ان کو آسمانی کتاب اور کلام الٰہی سمجھنے اور ماننے کا حکم دیا ہے۔

پس جب میں قرآن کے انداز تحریر کو دیکھتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی ذات بول رہی ہے جو انسان نہیں ہے۔ کہیں خدا نے کہا ہے میں ایسا ہوں میں نے ایسا کہا تھا۔ میں نے یہ حکم دیا تھا۔ اور کہیں پایا جاتا ہے کہ خدا جمع کا صیغہ بولتا ہے اور کہتا ہے ہم نے ایسا کیا۔ ہم نے ایسا کہا۔ ہم نے ایسا حکم دیا۔

بہرحال کلام صیغہ واحد سے ہو یا صیغہ جمع سے ہو۔ دونوں حالتوں میں وہ خدا کا کلام معلوم ہوتا ہے۔

مگر توریت اور انجیل میں یہ بات نہیں ہے خاصکر انجیل میں بالکل نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کی عبارتیں ایسی ہیں کہ کوئی انسان خدا کی یا خدا کی مخلوق کی باتیں سنا رہا ہے

[illegible]

عالم میں [illegible] توریت [illegible] تاریخ [illegible] اور قرآن [illegible] انداز بیان میں الوہیت کی شان بہت کم ہے۔ ان [illegible] الوہیت کا انداز پایا جاتا ہے۔

(۹)

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ طور پہاڑ پر چلہ کرنے گئے تو پتھر پر لکھی ہوئی چند تختیاں اپنی قوم کے پاس لائے اور کہا کہ یہ توریت ہے مگر جب اپنی قوم کو بچھڑے کے بت کی پوجا کرتے دیکھا تو خفا ہو کر وہ پتھر کی تختیاں زمین پر دے ماریں۔ اور یہ بھی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد جب ان کی یہودی قوم نے تابوت سکینہ بنایا (جو ایک صندوق تھا اور لڑائیوں کے وقت فوجوں کی ہمت بڑھانے کے لئے فوجوں کے آگے رکھا جاتا تھا) تو اس تابوت میں پتھر کی لوحیں بھی رکھیں جن کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ بعض جگہ دو لوحیں لکھی ہیں بعض مقامات پر دس سے زیادہ تختیوں کا ذکر آیا ہے۔ بہرحال ان کی تعداد دو چار سے زیادہ نہ تھی۔ اور ان ہی تختیوں یا سنگین لوحوں کو توریت کہا جاتا تھا۔

(۱۰)

میرا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کے مشہور دس احکام ان لوحوں میں درج تھے اور ان ہی دس احکام کو کلام الٰہی کہا جا سکتا ہے۔ اور بقیہ عبارتیں جو بعد میں ان الواح کے علاوہ توریت میں قلم بند ہوئی ہیں۔ ممکن ہے توریت کا وہ مختصر حصہ جو پیدائش وغیرہ بابوں میں ہے کلام الٰہی ہو اور پتھر کی الواح میں درج ہو اور توریت کتاب میں اُن کو نقل کر دیا گیا ہو۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ توریت کا زیادہ حصہ حضرت موسیٰ کے بعد لکھا گیا ہوگا جس کو کلام الٰہی نہیں کہہ سکتے۔

میں اپنے مضمون کے آخر میں دوبارہ شروع کی عبارت کو دوہرانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ مضمون قرآن کو توریت اور انجیل پر فوقیت دینے کی نیت سے نہیں لکھا ہے بلکہ اس کا منشا محض یہ ہے کہ ہندو بھی اور مسلمان بھی اور یہودی بھی اور عیسائی بھی اور مجوسی بھی علمی اور تحقیقی نظر سے قرآن اور توریت اور انجیل کو سامنے رکھکر غور کریں کہ خدا کے کلام کی شان ان تینوں میں سے کس کتاب کو زیادہ ہے۔

اگر اس تحقیقات کی طرف اہل علم توجہ کریں گے تو میں بھی اس مضمون کا دوسرا حصہ تیار کرنے کی کوشش کرونگا۔

ذکرِ سائل

(جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی)

نوٹ :۔ جناب سائل نے خدا اُن کو سلامت رکھے "یہ خمسہ داغ ڈے" کو بوقت شب خود پڑھ کر مجلس مشاعرہ منعقدہ ٹاؤن ہال میں سنایا تھا (فصیح الدین احمد)

رونے دھونے سے فائدہ کیا ہے — شیون نالہ و بکا کیا ہے
چارہ فرما کا مشورہ کیا ہے — دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

ہم کلامی کی شان رکھتا ہوں — آبرو کا دھیان رکھتا ہوں
آنکھ رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں — میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے

عشق ہے وہ بلائے پراسرار — کھیلتا ہے خرد وروں کا شکار
حیرت افزا ہیں اس کے سب اطوار — ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کی جو وحدت نے کثرتوں کی نمود — حق نگر آنکھ ہوگئی نابود ؛
کوئی منکر نہ سمجھا یہ مردود — جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ناسمجھ نوجوان ایسے ہیں — مطمئن دِل بس ایک شے سے ہیں
کیوں سمجھتے کہ پاس پیسے ہیں — یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شیخ عصیاں سے تو بری کیوں ہے — کہہ کے یہ سُن فسوں گری کیوں ہے
اچھی صورت کو برتری کیوں ہے — شکنِ زلفِ عنبری کیوں ہے
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

فلسفی لاکھ سر کھپائے ہیں — شاخ سا نے بہت لگائے ہیں
کھوج پائیں نہ ان کے ہائے ہیں — سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

سامنا جس حسیں سے میرا ہوا — دے کر اس کو دُعا یہ میں نے کہا
چھوڑنا او غرور حرص و ہوا — ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

عاشقانہ شعار کرتا ہوں — زیست کو اپنی خوار کرتا ہوں
کشتیٔ عمر پار کرتا ہوں — جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

زیست میں دل لگی سمجھ کے مفید — منتخب کر دیئے بُتِ بے دید
بات ثابت ہوئی خرد سے بعید — ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

نام سائل سوال ہے غائب — دادا نیّر تھا باپ تھا ثاقب
سیم و زر کا نہیں ہوں گو طالب — ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

عربوں کے اخلاق

اسلام لانے کے بعد

(از واحدی)

بچے پیسے پر پنّی منڈھا کرتے ہیں یا پیسے پر کاغذ رکھکر پنسل پھیرتے ہیں۔ پنّی پر بھی پیسے کے نقوش آجاتے ہیں اور کاغذ پر بھی۔ پیسے کو موم پر جمایا جائے تو موم بھی نقوش قبول کرلیگا۔ لیکن پیسے کو پتھر پر انتہائی قوت کے ساتھ دبا کر دیکھئے پتھر پیسے کے نقوش نہیں قبول کریگا۔ کسی بات کے قبول کرنے کے لئے قبول کرنے والے میں بھی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ صرف بات کے اچھے ہونے سے کام نہیں چلتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام سچا دین ہے اور اسکی پیروی میں انسانوں کی فلاح ہی فلاح ہے۔ اور اللہ کا یہ سب سے بڑا کرم تھا کہ اُس نے ہم کو دنیا میں رہنے کے ایسے آسان، معتدل اور متوازن طریقے سکھائے۔ مگر یہ بھی ایک کرم تھا کہ اسلام کی ابتداء عرب سے کی۔ عرب کی حالت بعض اعتبار سے دنیا بھر سے بدتر تھی اور دنیا بھر سے زیادہ عرب اصلاح کا محتاج تھا۔ لیکن عرب ہی وہ ملک ہے جہاں کے لوگ اچھی بات قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسلام عرب سے شروع نہ ہوتا تو یہ جو قرآن پاک کی ایک آیت ہے کہ اللہ کے رسُول کی زندگی انسانوں کے لئے نمونہ ہے نعوذ باللہ بے معنی رہ جاتی۔ عربوں کو یہ صلاحیت اللہ ہی نے بخشی تھی۔ وہ چاہتا تو یقیناً بالکل یہی صلاحیت کسی دوسری قوم میں پیدا کردیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس شرفِ امتیاز کے لئے عربوں کا انتخاب فرمایا۔ اسلام کو جتنا عربوں نے مانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدم بقدم جیسے عرب چلے اس کی مثال دوسرے ملکوں کے مسلمانوں میں نہیں ملتی۔ آج کل کا ذکر نہیں ہے میں مسلمانوں کے اچھے وقت کا ذکر کررہا ہوں۔ دورِ زوال کا نہیں، دورِ عروج کا ذکر کررہا ہوں۔ یہ اللہ کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے دین کا آغاز ایسی جگہ سے کیا کہ بے شمار نمونے دین کی صحیح اتباع کے مل جاتے ہیں۔

اسلام سے پہلے عربوں کے اعمال خراب تھے۔ لیکن عربوں کی طینت خراب نہیں تھی۔ عربوں کا کیرکٹر خراب نہیں تھا۔ پھر عربوں میں اگر ابوجہل یا ابولہب جیسے شقی موجود تھے تو عربوں میں ابوبکرؓ اور خدیجہؓ جیسی سعید رُوحیں بھی نمودار ہوسکتی تھیں اور پھر عرب کے شقیوں کا انکار بھی ایک شان رکھتا تھا اور عرب کے سعیدوں کا اقرار بھی دنیا بھر کے اقراروں سے پختہ اور استوار تھا۔ عرب عار پر نار کو ترجیح دیتے تھے اور عربوں کے دماغ سے عار کا کانٹا نکل جاتا تو وہ جنت لے کر چھوڑتے تھے۔ عربوں نے اخلاقِ اسلام کو اس طرح جذب کرلیا جس طرح بلاٹنگ پیپر روشنائی جذب کرلیتا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی ایک ایک ہدایت پر انہوں نے عمل کیا اور قرآن مجید جیسا مسلمان پیش کرنا چاہتا تھا ویسے مسلمان وہ بن گئے۔ قرآن مجید نے مسلمان کی جو تعریف کی ہے۔ عرب اُس تعریف کے مصداق تھے۔ اسلام لانے کے بعد عربوں کے اخلاق وہ تھے جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اور قرآن مجید اور کتب احادیث جس تعلیم کا مجموعہ ہیں۔ سارا قرآن اور ساری حدیثیں یہاں نقل نہیں کی جاسکتیں۔ صرف معاشرت کے (سب نہیں) کچھ طریقے لکھتا ہوں جو اسلام ساری دنیا کو سکھانے چاہتا ہے اور جنھیں عربوں نے پوری طرح قبول کرلیا تھا۔

حکم ہے "مَردوں کو مَردوں پر نہیں ہنسنا چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) اُن سے بہتر ہوں۔ اور عورتوں کو عورتوں پر نہیں ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستی ہوں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں۔ (اور) آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہیں دینے چاہئیں اور ایک دوسرے کو نام نہیں دھرنا چاہیئے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد بدتہذیبی کا شائبہ بھی بُرا ہے۔ اور جو (ان حرکتوں سے) باز نہ آئیں گے تو وہ ظالم قرار پائیں گے۔ اے مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) شک و شبہ کرنے سے بھی بچتے ہو کیونکہ بعض شک (داخل) گناہ ہیں۔ اور ایک دوسرے کی بُرائیاں نہ تلاش کیا کرو۔ اور کوئی ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی (اسے) گوارا کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ (قطعی) گوارا نہیں کریگا تو غیبت کیوں گوارا ہو۔ غیبت بھی ایک طرح کا مُردار کھانا ہے۔

(قرآن مجید کی چند آیات کا مطلب)

"اللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ اور والدین اور کنبہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور کنبہ کے پڑوسیوں اور غیر کنبہ کے پڑوسیوں اور پاس کے بیٹھنے والوں اور مسافروں اور جو (لونڈی غلام) تمہارے قبضہ میں ہیں۔ ان سب کے ساتھ سلوک کرتے رہو۔"

(قرآن مجید کی چند آیات کا مطلب)

"جو لوگ دین کے سلسلہ میں تم سے نہیں لڑے اور جنہوں نے تمہیں خانہ بدر نہیں کیا اُن کے ساتھ سلوک کرنے اور صحیح برتاؤ کرنے سے اللہ نے کب منع کیا ہے۔ اللہ تو منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

(قرآن مجید)

"مسلمان خوشی اور تنگ دستی (دونوں صورتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو ضبط کرتے ہیں اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگذر کرتے ہیں۔"　(قرآن مجید)

"تفسحوا: جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کرو۔ خدا (جنت میں) تمہیں کشادہ جگہ دیگا۔ اور جب کہا جائے کہ (اپنی جگہ سے) اٹھ کھڑے ہو تو کھڑے ہو جایا کرو۔"

(قرآن مجید)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے سوال کیا کہ میں اپنے خادم کی خطاؤں کو کتنی دفعہ معاف کروں۔ ارشاد ہوا ستر دفعہ۔

(حدیث)

ایک صحابیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں اپنی سوکن کو اگر ایسی چیزیں دکھاؤں جو حقیقتاً میرے شوہر نے نہیں دی ہیں۔ لیکن میں اس پر یہ ظاہر کروں کہ شوہر کی دی ہوئی ہیں تاکہ وہ جلے تو مجھے گناہ تو نہیں ہوگا۔ آپ نے ایسی حرکت کو پسند نہیں فرمایا۔

(حدیث)

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ بہترین مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ بہترین مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو ناحق تکلیف نہ پہنچے۔ اور جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور شناسا و غیر شناسا کو سلام کرے

(حدیث)

ایک دفعہ مرد و عورت رَلے مِلے چل رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو روک کر بتایا کہ تمہیں کنارے کنارے چلنا چاہیئے۔ راستہ کے بیچ میں نہ چلا کرو۔

(حدیث)

ایک بار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے کسی غلام کو ملعون کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا۔ اور فرمایا لعنت اور صدیقیت کا ایک جگہ جمع رہنا ممکن نہیں۔ اس فقرے کو بار بار دہرایا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس غلام کو آزاد کر دیا۔

(حدیث)

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں بچہ سا تھا۔ کھانا کھاتا تو پیالہ میں ہر طرف ہاتھ دوڑاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ بسم اللہ کر کے کھانا کھایا کرو۔ داہنے ہاتھ سے کھانا کھایا کرو اور کھانے کو آگے سے کھایا کرو۔ دور تک ہاتھ مت دوڑایا کرو۔

(حدیث)

ایک بار ایک صحابی نے عرض کیا مجھ کوئی مفید ہدایت کیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راستے سے تکلیف دہ چیزیں ہٹا دیا کرو۔

(حدیث)

ایک بار ایک صحابی نے کہا مجھے ایسا کام بتایئے جس کے کرنے سے میں جنت حاصل کر لوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو اور اعزا و اقارب کے ساتھ درجہ بدرجہ سلوک کرو۔

(حدیث)

ایک صحابی نے پوچھا میرے سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ماں"۔ صحابی نے سوال کیا "پھر"۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "ماں"۔ صحابی نے تیسری دفعہ سوال کیا "پھر"۔ رسول اللہ نے فرمایا "ماں"۔ صحابی نے چوتھی دفعہ سوال کیا۔ تب رسول اللہ نے فرمایا "پھر باپ"۔

(حدیث)

ایک دفعہ آپ نے فرمایا۔ اللہ کو سب سے زیادہ یہ کام پسند ہیں۔ وقت کی پابندی سے نماز پڑھنا۔ پھر ماں باپ کے ساتھ سلوک اور پھر جہاد۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ پھر گناہوں میں دوسرا درجہ ماں باپ کی نافرمانی کا ہے اور تیسرا درجہ جھوٹی شہادت کا۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ انسان اپنے ماں باپ پر لعنت کرے۔ صحابہ نے پوچھا ماں باپ پر کوئی کیسے لعنت کر سکتا ہے۔ فرمایا دوسروں کے ماں باپ پر لعنت کر کے۔ تم کسی کے ماں باپ کو برا کہو گے۔ تو وہ تمہارے ماں باپ کو برا کہے گا۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا اعزہ و اقارب سے تعلقات خوشگوار رکھنا عمر کو بڑھاتا ہے۔ تعلقات رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عزیز تم سے تعلقات رکھیں تو تم ان سے تعلقات رکھو۔ بلکہ تعلقات رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ عزیز تعلقات نہ رکھیں تو بھی تم ان سے تعلقات رکھو۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا باپ کا کوئی کچھ حق ادا کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ باپ کسی کا غلام ہو اور بیٹا اسے آزاد کر دے۔ (حدیث)

رسول اللہ نے ایک دفعہ فرمایا۔ لوگوں کو چاہیئے اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کریں۔

(حدیث)

ایک صحابیہ کی ماں جو مسلمان نہیں ہوئی تھیں۔ صحابیہ کے پاس مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ آئیں۔ صحابیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ کیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرسکتی ہوں؟ فرمایا: "ہاں" اسی سوال کے بعد قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی: "جو لوگ دین کے معاملہ میں تم سے لڑتے نہیں اللہ ان کے ساتھ سلوک کرنے سے تمہیں نہیں روکتا"

(حدیث)

رسول اللہ نے ایک دفعہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو ٹکڑے کئے۔ ننانوے ان میں سے اپنے پاس رکھے اور ایک بندوں کو دیدیا۔ اسی ایک ٹکڑے کا اثر ہے کہ انسان اور چرند پرند ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے اور گھوڑا اپنی ٹاپ سے اپنے بچے کو بچاتا ہے۔

(حدیث)

ایک عورت کا دودھ پیتا بچہ کھو گیا۔ اس کا دودھ چھاتی میں بھر جاتا تو وہ دوسروں کے بچے دودھ پینے کے لئے تلاش کرتی پھرتی۔ بڑی مشکل سے اس کا بچہ ملا۔ اس نے اسے چھاتی سے چمٹالیا۔ رسول اللہ نے یہ منظر دیکھا تو صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا "تم تصور کرسکتے ہو کہ یہ عورت کبھی اپنے بچے کو آگ میں ڈال دیگی"۔ صحابہ نے کہا "نہیں" رسول اللہ نے فرمایا "اسے جتنی اپنے بچے سے محبت ہے اس سے کہیں زیادہ اللہ کو اپنے بندوں سے محبت ہے"

(حدیث)

مقصد اس گفتگو سے محبت اور رحم کا پرچار تھا۔ اسلام انسانوں کو محبت اور رحم کی دعوت دیتا ہے۔ درجہ بدرجہ بلقدر تعلق۔ غرض انسانیت کا لازمہ ہے اپنے ہم جنس اور غیر جنس سب کے ساتھ محبت اور رحم کا برتاؤ۔

رسول اللہ تو سراپا محبت و رحم تھے۔ نماز پڑھتے ہیں معصوم بچے آپ کی پیٹھ پر اور کندھے پر چڑھ جاتے اور حضور اسی حالت میں نماز ادا کرتے اور بچے کو نہ روکتے بلکہ رکوع و سجدہ کے وقت بچہ کو کندھے سے اتار دیتے۔ اور قیام کے وقت پھر بٹھالیتے۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسہ حضرت امام حسن کو پیار کیا۔ آپ کے پاس اقرع بن حابس تمیمی بیٹھے تھے انہیں یہ بات شاید شان رسالت کے خلاف معلوم ہوئی۔ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ رحم نہیں کریگا۔ ایک بدو کا بھی اسی قسم کا واقعہ ہے۔ اس نے کہا ہم لوگ بچوں کو پیار و یار نہیں کیا کرتے۔ رسول اللہ نے فرمایا اللہ نے تمہارے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں اس میں رحم کیونکر ڈال سکتا ہوں۔

(حدیث)

رسول اللہ کا ارشاد ہے "کسی شخص پر بیٹیوں کا بوجھ پڑ جائے اور وہ اسے صبر کے ساتھ برداشت کرے تو وہ بیٹیاں اس کے اور دوزخ کی آگ کے درمیان پردہ بنکر حائل ہو جائینگی۔"

(حدیث)

رسول اللہ کا ارشاد ہے۔ غلاموں سے اچھا برتاؤ کرنا برکت کا موجب ہے۔ اور برا برتاؤ نحوست کا موجب۔ جو شخص غلاموں کے ساتھ برا برتاؤ کریگا۔ وہ جنت میں نہ گھس سکے گا

(حدیث)

رسول اللہ نے وفات پانے کے وقت فرمایا "نماز کی پابندی کرو۔ اور غلاموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو"

(حدیث)

ایک بار رسول اللہ نے فرمایا "تمہارے بھائیوں کو اللہ نے تمہارے قبضہ میں دیدیا ہے۔ تم جو خود کھاتے ہو وہی انہیں کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ۔ اور ان سے ان کی طاقت کے مطابق کام لو۔ اور کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔

(حدیث)

ایک بار رسول اللہ نے فرمایا "جہاں رہو۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ برائی کے بدلے بھی بھلائی کرو۔ تمہاری بھلائی برائی کرنے والے کی برائی کو مٹا دیگی۔

(حدیث)

رسول اللہ کا ارشاد ہے "قیامت کے روز خوش خلقی سے بڑھکر کوئی شے وزنی نہیں ثابت ہوگی۔ اللہ بدکلام انسان کو قہر کی نگاہ سے دیکھتا ہے"

(حدیث)

ایک بار ارشاد ہوا "دو عیب مسلمان کے شایان شان نہیں ہیں۔ ایک بخل اور ایک بدخلقی"

(حدیث)

ایک بار ارشاد فرمایا "اللہ کو جاہل سخی عبادت گزار بخیل سے زیادہ پسند ہے"

(حدیث)

ایک بار ارشاد ہوا "یہ مت کہا کرو کہ دوسرے ہمارے ساتھ برائی کرینگے تو ہم بھی ان کے ساتھ برائی کرینگے بلکہ دل میں ٹھان لو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ بھی برائی نہ کروگے"

(حدیث)

ایک بار ارشاد ہوا "واللہ ایمان نہیں لایا وہ شخص جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہیں رہتا"

(حدیث)

حُسینی برہمن

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب)

یہ مضمون خواجہ صاحب نے ہارڈنگ لائبریری کی ادبی سوسائٹی میں ۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو سنایا

محرم قریب ہے اور ہندستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا بڑا حصہ اور تیس کروڑ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد حضرت امام حسینؑ کی ماتم داری میں شرکت کی تیاریاں کر رہی ہے ایسے زمانے میں دہلی کی یہ نامور ادبی اور علمی سوسائٹی بھی اگر حضرت امام حسینؑ کا ذکر کرے تو اس کے لئے زیبا ہے۔

مجھے اپنا مضمون پڑھنے سے پہلے ایران کے ایک شیعہ سیاح سید محمد صاحب حجازی کا اہلِ دہلی سے تعارف کرانا ہے جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں کہ وہ ایران کے نامور مورخ اور مقبول خاص و عام انشاپرداز اور ادیب اور مصنف ہیں۔ دہلی انکی تشریف آوری سے مسرور ہے اور ان کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں سلطنت ایران کے کونسل جنرل ہز ایکسیلنسی معتمدی صاحب کا تعارف بھی ضروری سمجھتا ہوں جو ازراہ علم دوستی یہاں تشریف لائے ہیں۔

میرے مضمون کا عنوان "حسینی برہمن" ہے جس میں ہندستانی برہمنوں کی ایک مشہور شاخ کا ذکر ہے۔ یہ برہمن ہندستان کے کئی صوبوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ وہ سب پکے ہندو ہوتے ہیں۔ اور ان کے رسم و رواج اور عقائد بھی ہندوؤں جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ حضرت امام حسینؑ سے بہت عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ کربلا کی لڑائی کے وقت حضرت امام حسینؑ کے ساتھ تھے اور برہمن مذکور نے حضرت امام حسینؑ سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کے ساتھ ہندستان تشریف لے چلیں۔ اور حضرت امام حسینؑ نے اسکو قبول بھی کر لیا تھا چنانچہ جب حضرت امام حسینؑ نے کوفے کے حاکم عبید اللہ ابن زیاد کے پاس صلح کی شرطیں بھیجیں تو ان شرطوں میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھے ہندستان [illegible]

بعض حسینی برہمنوں کا بیان ہے کہ ان کے بزرگ صورت ہندستان میں واپس آگئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہو گئے تھے۔

حسینی برہمنوں کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ سری کرشن جی نے واقعہ کربلا کی پہلے سے خبر دی تھی جو سری بھاگوت میں موجود ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اٹھارہ پرانوں میں آخری پران کلکی پران ہے جس میں کلجگ کا ذکر ہے اور کلجگ کے [illegible] کا حال بھی ہے۔ اور کلجگ اوتار کے ایک نواسے کا ذکر ہے جن کو ظلم و ستم سے قتل کیا جائے گا۔

کلکی پران کے اُردو ترجمے مطبوعہ میرٹھ کو میں نے دیکھا تو ایک حد تک حسینی برہمنوں کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ کلکی پُران میں لکھا ہے کہ کلجگ کا اوتار شمبل دیپ میں جنم لے گا شمبل دیپ کی نسبت ہندوؤں کا خیال ہے کہ وہ سنبھل مراد آباد ہے۔ مگر انگریز پروفیسر میکس مولر نے وید کا انگریزی ترجمہ کرتے وقت لکھا ہے کہ شمبل دیپ سے مراد ملک عرب ہے۔ کیونکہ شمبل نرم اور ریتیلی زمین کو کہتے ہیں۔ سنبھل مراد آباد کی زمین عرب کی طرح نرم اور ریتیلی نہیں ہے۔

کلکی پُران میں اسی کے بعد یہ بیان بھی ہے کہ کلجگ کا اوتار برہمن خاندان میں جنم لیگا اور چونکہ محمد رسول اللہ صلعم کی پیدائش قبیلہ قریش میں ہوئی تھی اور قبیلۂ قریش کی عرب کے دوسرے قبائل میں وہی عزت تھی جو ہندستان کے برہمنوں کی دوسری ذاتوں میں ہے۔ اس واسطے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ کرشن جی نے کلجگ کا اوتار محمد رسول اللہ صلعم ہی کو کہا ہوگا۔ تیسری بات کلکی پُران میں کلکی اوتار کے سلسلے میں یہ پائی جاتی ہے کہ کلجگ کے اوتار کے باپ کا نام وشنو داس ہوگا۔ وشنو سنسکرت میں خدا کو کہتے ہیں اور داس غلام اور بندے کو کہتے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پیشین گوئی سے مراد محمد رسول اللہ صلعم تھے۔ کیونکہ ان کے والد کا نام عبد اللہ تھا۔ کلکی پران میں یہ بھی لکھا ہے کہ کلجگ کے اوتار کی ماں کا نام اوم ستی ہوگا یعنی سچ بولنے والی اور اللہ کی مرضی پہ صبر کرنے والی۔ اور رسول اللہ کی والدہ کا نام آمنہ تھا جس کے لفظی معنی امانت دار اور راست باز عورت کے ہیں۔

کلکی پران میں یہ بھی لکھا ہے کہ کلجگ کا اوتار پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھا کریگا اور وہاں پرشرام آئینگے اور اوتار کو سبق پڑھائینگے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نبوت سے پہلے غار حرا میں عبادت کرنے جایا کرتے تھے اور اسی غار کے اندر سب سے پہلے جبرئیل وحی لیکر آئے تھے اور قرآن شریف کی پہلی آیت ایسے الفاظ کی تھی جن سے سبق پڑھانے کے الفاظ کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ خدا نے فرمایا تھا "اقرا باسم ربک الذی خلق" اپنے اس رب کا نام لیکر پڑھ جس نے دُنیا کو پیدا کیا۔

کلکی پران میں اس کے بعد یہ عبارت ہے کہ کلجگ کے اوتار چار بھائی ہونگے جو ساری دنیا پر قبضہ کر لینگے اور اس کے بعد ہی یہ عبارت ہے کہ کلجگ کے اوتار کی بیوی بہت سرخ و سفید رنگ کی ہوگی۔ جس سے غالباً حضرت عائشہ مراد ہیں جن کا رنگ بہت سرخ و سفید تھا۔ اس کے بعد کلکی پران میں لکھا ہے کہ کلجگ کے اوتار کو اپنی بیٹی اور اپنے داماد سے اور اُن کے بچوں سے بہت زیادہ محبت ہوگی۔ اور کلکی اوتار کے ایک نواسے کو بہتے پانی کے کنارے گرم ریت پر ذبح کیا جائیگا۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ کلکی اوتار کے نواسے کے خون سے ایک جوت پرگٹ ہوگی جس سے سارا سنسار ... حسینی برہمنوں کے مذکورہ بیان کی تحقیقات میں نے اچھی طرح کی اور کلکی پران کو بھی دیکھا۔ اور ایک حد تک سب باتیں کتاب مذکور میں پائی گئیں۔

حسینی برہمن آخری زمانہ کے وید "اتھروید" کی نسبت بھی کہتے ہیں کہ اس میں بھی ایک شروتی کلکی اوتار اور ان کے نواسے حضرت امام حسین کی نسبت موجود ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں " اتو پنت پرا بہیا اسملا نگ لیتے متر و مہا سور ندرا اتو بھول مہا ندیو "

کلجگ کا اوتار اُتو کا اپدیش دیگا اور رب رب کہے گا۔ اسمل اسمل پڑھے گا۔ وہ بڑا خوبصورت ہوگا۔ اور اس کا نام مہامد ہوگا وغیرہ۔

حسینی برہمن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ بیان کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ امام حسینؓ کے والد حضرت علی ادم مورتی تھے۔ یعنی اُن کے وجود میں ادم بلی نے ظہور کیا تھا۔

ہز ہائینس سر آغا خاں کے لاکھوں ہندو مرید بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوفی خط میں لفظ "علی" لکھا جائے اور سنسکرت خط میں ادم لکھا جائے تو دونوں کی شکل ایک ہوگی۔ چنانچہ ہز ہائینس سر آغا خاں کے لاکھوں ہندو مرید اپنے سینوں پر ایک لاکٹ لٹکاتے ہیں جس میں علیؓ کا نام ادم کی شکل میں لکھا ہوتا ہے۔

ہز ہائینس سر آغا خاں کے داعی ان ہندو مریدوں کے سامنے عجیب و غریب تقریریں کرتے ہیں۔ میں بھی ایک بڑے جلسے میں شریک ہوا تھا جسکے شروع میں بدخشاں کے رہنے والے ایک داعی نے کہا کہ حضرت مولانا روم نے اپنی مثنوی کو بشنو کے نام سے شروع کی ہے۔ دوسرے مسلمان مصنفوں کی طرح اللہ کے نام سے شروع نہیں کی۔ چنانچہ مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
در جدائی ہا شکایت می کند

اس کے بعد داعی نے کہا حضرت علیؓ کی صورت میں ادم بلی نے ظہور کیا تھا۔ اور قرآن شریف میں بھی خدا نے فرمایا ہے کہ ادم حضرت علیؓ ہیں۔ اس کے بعد داعی نے قرآن مجید کے پچیسویں پارے کے سورہ زخرف کی یہ آیت پڑھی :—

وانّہٗ فی امّ الکتاب لدینا لعلیٌّ حکیم۔

داعی نے ام الکتاب کا تلفظ ادم الکتاب کیا تھا۔ اور اس کا ترجمہ ہندوؤں کو یہ سنایا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یقیناً ہمارے نزدیک ادم ایک نوشتہ ہے اور وہ نوشتہ علیؓ ہے حکمت والا۔

مسلمان لوگ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ اور یقیناً یہ قرآن اللہ کے نزدیک لوح محفوظ میں ہے جو بلند اور حکمت والا ہے۔

مجھے یہاں مسلمانوں اور آغا خانیوں اور حسینی برہمنوں کے عقائد کی نسبت بحث نہیں کرنی ہے۔ میں تو صرف یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ حسینی برہمن ہی ایسے نہیں ہیں جو حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے محبت رکھتے ہیں بلکہ اور بھی لاکھوں کروڑوں ہندو مختلف صورتوں سے حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کو مانتے ہیں۔

ہز ہائینس سر آغا خاں کے لاکھوں ہندو مریدوں کے علاوہ ایک اور ہندو فرقہ "ستپنتھی" صوبہ بمبئی میں پایا جاتا ہے جس کی تعداد بیس لاکھ ہے۔ اس فرقے کا مرکز احمد آباد گجرات کے قریب ایک مقام ہے جس کو پیرانہ کہتے ہیں جہاں اس فرقے کے بانی پیر سید امام الدین صاحب کا مزار بھی ہے۔ اس مزار پر تین سو برس سے رات دن چراغ روشن رہتا ہے۔ اور اس چراغ کو "علی کی جاگتی جوت" کہتے ہیں۔ پیر صاحب کے مزار کے قریب جنیو کی درگاہ بھی ہے۔ جو ہندو پیر کی درگاہ میں مومن بنکر آتے ہیں وہ اپنا جنیو اس درگاہ میں چڑھا دیتے ہیں۔ اس فرقے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فرقہ گپتی یعنی خفیہ کہلاتا ہے۔ ان کی صورت شکل اور نام اور کام سب ہندوانہ ہیں اور وہ خفیہ طور سے علیؓ علیؓ جپا کرتے ہیں۔ اور پیر امام الدین کی درگاہ میں جاگتی جوت کے درشن کے لئے جاتے ہیں اور اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اس درگاہ میں دیتے ہیں ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔ دوسری جماعت کو پرگھٹی کہتے ہیں جس کے لفظی معنی ظاہر کے ہیں۔ یعنی وہ ظاہری طور سے شیعہ ہوگئے ہیں اور ان کو مومن کا لقب مل گیا ہے۔ یہ بھی اپنی آمدنی کا دسواں حصہ پیرانہ درگاہ میں دیتے ہیں۔ اور نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں۔ اسلامی نام رکھتے ہیں۔ ان کے نام غلام حسین۔ غلام علی۔ غلام حیدر وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور عورتوں کے نام کلثوم بائی۔ فاطمہ بائی۔ رقیہ بائی۔ زینب بائی رکھے جاتے ہیں۔

نام کے ایک بزرگ تھے اس جماعت کے آدھے پیرو شیعہ ہیں اور آدھے سنی ہیں اور یہ جماعت بھی حضرت امام حسین کی محبت کی کشش سے اسلام میں داخل ہوئی ہے۔

سندھ اور صوبہ بمبئی میں ایک اور بڑی جماعت معراج پنتھی ہے اور یہ اپنے آپ کو پیری نام پنت والا بھی کہتے ہیں۔ پیرانہ پنت میں بھی ایک کتاب ست پنتھی کے نام سے مانی جاتی ہے۔ اور معراج پنتھی بھی ایک کتاب کو مانتے ہیں جس کا نام قلزم شریف ہے۔ میں نے اس کتاب کی زیارت کاٹھیاواڑ میں کی تھی۔ یہ گجراتی حروف میں تھی۔ اور اس میں مثنوی شریف اور دیوان حافظ اور قرآن مجید اور احادیث رسول کے اقتباسات ہیں۔ یہ فرقہ آنحضرت کی معراج کو مانتا ہے اور آنیوالے امام مہدی کا بہت معتقد ہے۔ اس کا بیان ہے کہ سید صاحب اور سچا مذہب اسی فرقے کا ہے۔ ان لوگوں کے مندر جن کو یہ دھام کہتے ہیں۔ نگر ٹھٹہ سندھ میں ہیں اور ریاست جام نگر کاٹھیاواڑ میں بہت بڑا دھام ہے۔ مگر میں نے راجکوٹ کاٹھیاواڑ کا دھام دیکھا تھا جہاں قلزم شریف کی زیارت کی تھی۔

آخر میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ گوالیار اور بڑودہ اور اور وغیرہ بہت سی ہندو ریاستوں میں ہندو رئیسوں کی طرف سے لاکھوں روپیہ محرم کے زمانے میں خرچ کیا جاتا ہے۔ تعزیے بنوائے جاتے ہیں۔ نیازیں ہوتی ہیں۔ لاکھوں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

حسینی نور اسی سلسلے میں یہ بیان بھی ضروری ہے کہ سنٹرل انڈیا کی مشہور اسلامی ریاست جاورے میں "حسین ٹیکری" نام کی ایک پہاڑی پر روزانہ حسینی نور نظر آتا ہے بے شمار ہندو، پارسی مسلمان، عیسائی یہ نور دیکھنے وہاں جاتے ہیں۔ جاورے کے سنی رئیس کی طرف سے زائرین کے لئے بہت سے مکان بنوا دیئے گئے ہیں۔ ہز ہائینس نواب صاحب رام پور اور ان کی بیگم صاحبہ بھی اس نور کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے بھی اس پہاڑی پر اپنی طرف سے ایک بڑا مکان بنانے کا حکم دیا ہے۔ خود میں نے بھی کئی بار جاورے میں جا کر اس نور کی زیارت کی ہے۔ اور اپنے دوست نواب صاحب جاورہ سے ایک مکان بنانے کے لئے زمین مانگی ہے۔

نئے زمانے کے سائنس داں انگریز اور ہندوستانی جوق در جوق وہاں جاتے ہیں اور اس روشنی کی تحقیقات کرتے ہیں۔ مگر آج تک اس کی حقیقت اور وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے اس روشنی کو دیکھا تو پہلے ایک چراغ نظر آیا اور وہ چراغ زمین سے آسمان کی طرف اونچا ہوا۔ اور یکایک اس چراغ کے آس پاس بے شمار چراغ حرکت کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اہل سائنس کا خیال ہے کہ اس

کچھ بھی ہو۔ مگر یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ حسینی برہمنوں کا فرقہ بے عقل کے سبب یا کسی دھوکے اور فریب سے متاثر ہو کر حسینی نہیں بنا ہے۔ بلکہ حضرت امام حسین کی کرامتوں کو دیکھکر اس نے یہ عقائد قبول کئے ہیں۔

یارِ اغیار

(از مولانا حسرت موہانی)

آشنا جب سے وہ بدخو وہ ستمگار ہوا ——— فتنہ بیدار ہوا

جان دل سے ہوئی دل جان سے بیزار ہوا ——— صبر دشوار ہوا

اب نہ دُنیا کی تمنا ہے نہ عقبیٰ کی ہوس ——— اک ترا شوق ہے بس

دل جو اے جانِ جہاں تیرا طلبگار ہوا ——— سب سے بیزار ہوا

دل کو حاصل ہوئی انکارِ دو عالم سے نجات ——— بن گئی خوب یہ بات

چھوٹ کر سب سے تری قید کا اِقرار ہوا ——— اور یہ اصرار ہوا

بے وفائی کا جو خطرہ تھا وہ پیش آ کے رہا ——— تجھ سوا اے محوِ جفا

لُطف کا شکوۂ غم پھر بھی نہ اظہار ہوا ——— صاف اِنکار ہوا

ہم نے حسرت کی سفارش تو بہت کی تھی مگر ——— نہ ہوا کچھ بھی اثر

پہلے بیگانہ جو تھا اب وہ دِل آزار ہوا ——— یارِ اغیار ہوا

ٹیگور کی شاعری

(از جناب بلونت سنگھ صاحب گجراتی بی۔ اے)

ٹیگور پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اُس کی تصانیف کا درجہ نہایت بلند ہے۔ وہ بنگالی زبان کا شاعر ہے۔ میں اس زبان سے نا واقف ہوں۔ ٹیگور کے متعلق میری تمام تر معلومات اس کی تصانیف کے انگریزی ترجموں کی مرہونِ منت ہیں۔ مجھے ان تراجم کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ بنگالی زبان کس قدر شیریں، دل آویز، وسیع اور بیکراں ہے جو ایسے عظیم الشان خیالات و جذبات کی متحمل ہو سکتی ہے۔

ٹیگور کا دورِ حیات ۱۸۶۱ء میں شروع ہوا اور ۱۹۴۱ء میں ختم ہوگیا۔ مگر اس کا نام دنیا کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔ وہ مہرشی دیوندر ناتھ ٹیگور کے سات بیٹوں میں سے سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کا خاندان ایک برہمن خاندان ہے جو عُرفِ عام میں ٹیگور مشہور ہے۔ ٹیگور دراصل لفظ "ٹھاکر" کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بنگال میں رابندر ناتھ ٹیگور کو "رابندر ناتھ ٹھاکر" ہی لکھتے ہیں۔ رابندر ناتھ کے معنی "ربِ خورشید" کے ہیں۔

ٹیگور کو بچپن میں سکول کے علاوہ گھر پر بھی اُستاد رکھکر تعلیم دیجاتی رہی۔ لیکن پڑھنے لکھنے میں اس کا جی زیادہ نہیں لگتا تھا۔ جب بھی موقع ملتا وہ پڑھنا لکھنا چھوڑ کر چپکے سے باہر نکل جاتا اور قدرتی مناظر کی سیر میں محو ہو جاتا۔ اُسے شہری ہنگاموں سے زیادہ جنگلوں کی خاموشی پسند تھی۔ شانتی نکیتن کی پُرسکون فضا جس کو اُس کے باپ نے یادِ خدا کے لئے کُنجِ تنہائی بنایا تھا۔ اس کے لئے عجیب کشش رکھتی تھی۔ وہ اپنے باپ کے ہمراہ کئی بار ہمالیہ کی سیر کو بھی گیا۔ جہاں اُس نے حُسنِ قدرت اپنی تمام رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جلوہ گر دیکھا۔ ان خوبصورت مناظر کی کیفیات کا اُس پر گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ یہ اثر اس کی تمام شاعری میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

دورِ حیات کے پچیسویں سال میں ٹیگور ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا قد لمبا اور اُس کے چہرے کے نقش و نگار اور بھی دلکش نظر آتے تھے۔ اسکی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، اور بال لمبے اور گھنگریالے تھے۔ وہ ہمیشہ نفیس اور جاذبِ نظر لباس پہنتا اور کلکتہ کی ہر لٹریری مجلس میں امتیازی شان کا مالک تصور

بالیدگی آئی۔ عورت ——— ایسی عورت جس کے چہرے میں آسمانی انوار کی جلوہ آرائیاں ہوں، جس کے دل میں شفقِ صبح کی رعنائیاں ہوں ——— اس کے تصور کو آئینہ خانہ بنانے لگی۔ اُس کا تخیل ایک متلاطم سمندر تھا جسکی ہر موج ایک شعرِ تر تھی۔ دُنیا اس کی نگاہوں میں ایک عشرت کدہ تھی۔ زندگی کا مقصد محض سعیٔ عیش و مسرت تھا۔ اس زمانے کی ایک نظم بعنوان "زندگی" اس راز کے چہرے سے نقاب کشائی کرتی ہے۔ جس میں ٹیگور کہتا ہے:۔

"میں اس حسین دُنیا میں مرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ انسانوں کے درمیان زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سُورج کی روشنی میں، پھولوں سے بھرے ہوئے باغ میں اور زندگی سے معمور دلوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنے دو۔ نوعِ انسان کے خوشیوں اور غموں کے نغمات سے مجھے ایک غیر فانی گھر بنانے دو۔ اپنے توڑنے کے لئے صبح و شام مجھے نئے نغموں کے پھول اُگانے دو۔ تو میرے پھولوں کو ہنستے ہوئے چہرے سے قبول کر۔ اگر وہ مُرجھا جائیں تو انہیں پھینک دے۔"

۱۸۹۰ء کے بعد ٹیگور کی شاعری میں حُسنِ نسوانی کیلئے وہ بے خودانہ پرستاری نہ رہی جو اس سے پیشتر تھی۔ اب اس میں کچھ تلخی سی آگئی۔ وہ دُنیا کو ایک تاریک زندان خانہ تصور کرنے لگا۔ جس میں ہر گھڑی اُسے روشنی اور رہائی کی جستجو رہتی تھی۔ زندگی اُس کے نزدیک ایک گرانبار زنجیر تھی جس کو اُتار پھینکنے کے لئے وہ ہر لمحہ بیتاب تھا۔ چنانچہ ایک نظم بعنوان "سرکشِ اُمید" کے خاتمے میں وہ لکھتا ہے:۔

"کاش میں کہیں بھاگ سکتا، پھر میں کس قدر خوش رہتا۔
اس پابند زندگی میں تو مجھے کوئی آرام نہیں۔"

ایک اور نظم "زندگی کی دوپہر" میں یوں رقم طراز ہے:۔

"جوانی میں زندگی میرے لئے سہل تھی، میں ہر نئی صبح زندگی کی دوڑ کو ایک کھیل سمجھ کر شروع کرتا، اُس وقت میرے آنسوؤں میں گرمی اور میرے ہنسنے میں تمسخر نہ تھا، میری پیشانی مصیبت کے شکنوں سے بالکل خالی تھی اور سکون اور خوشی سے چمکتی تھی، اس کے بعد راستہ ٹیڑھا ہونا شروع ہوا۔ زندگی میں اختلال پیدا ہوا۔ اور اس کا بوجھ زیادہ ہوگیا، آج میں فطرت کی خموشی سے نکلتی ہوئی تسکین کی ابدی ندی سے اپنی پیاس بجھاتا ہوں۔"

لیکن عورت کا حُسن ٹیگور کے دل کو اب بھی کبھی کبھی روشن کرتا ہے دُنیا اپنی مصیبتوں، کلفتوں اور تاریکیوں کے باوجود اب بھی بعض اوقات جاذبِ توجہ بن جاتی ہے۔ یہ صرف اسی لئے ہے کہ اس میں عورت کا حُسن موجود ہے۔ عورت کے حُسن نے دُنیا کی ہر چیز کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ وہ خدا ہی کی نہیں بلکہ انسانی دل کی بھی صنعت گری ہے۔ ٹیگور اپنی ایک نظم میں کہتا ہے :۔

"اے عورت تو صرف خدا ہی کی نہیں بلکہ انسانوں کی بھی صنعت گری ہے، جو اپنے دلوں سے تیرے حُسن کی آرائش کرتے رہتے ہیں۔ شاعر تیرے لئے سُنہری تخیل کے تاروں سے جال بُنتے ہیں۔ مُصوّر تیری صورت کو ہمیشہ نئی ابدیت دیتے ہیں سمندر اپنے موتی، کانیں اپنا سونا اور بہار چمنستان اپنے پُھول تیری زینت و آرائش کیلئے پیش کرتے ہیں۔ انسانی دل کا جمالِ آرزو تیرے شباب کے لئے ہدیۂ نیاز بنتا ہے۔ تو آدھی عورت ہے اور آدھا خواب۔"

سنہ ۱۹۰۹ء تک ٹیگور کی شاعری معراجِ کمال تک جا پہنچی۔ اُس کے سازِ سے اور بھی جاں پرور نغمے نکلنے لگے۔ اُس کی توجہ دُنیا کی ظاہری آب و تاب سے ہٹتی گئی۔ وہ عالمِ باطن کی سیر میں مشغول ہوا۔ اُس نے دل کی پُر اسرار دُنیا کو دیکھا، اُس پر خدا، کائنات اور انسان کے باہمی تعلق کی نسبت گوناگوں حقائق منکشف ہونے لگے۔ اس سے پیشتر وہ جو کبھی کبھی اس کے ابتدائی کلام میں خدا کے خلاف بغاوت کا عنصر آجاتا تھا، اب اس کی جگہ محکم یقین پیدا ہوگیا۔ خدا سے والہانہ محبت اُس کی طبیعت پر ایک غیر فانی سرور بنکر طاری ہونے لگی۔ اس عالمِ کیف و مستی میں شاعر نے جو نغمات گائے، اُن کا مجموعہ "گیتا نجلی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نغمات اگرچہ مقامی رنگ سے خالی نہیں، تاہم اپنی اثر آفرینی اور وجد انگیزی میں ہمہ گیر ہیں۔ شاعرانہ آرٹ کے پیشِ نظر بھی "گیتا نجلی" کے نغمے مکمل ترین شاہکار ہیں۔ زبان کی دل آویزی اور شیرینی انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ شاعر نے اپنے پیغام کا اظہار ایک غیر معمولی طور پر دل پذیر پیرائے میں کیا ہے۔ اس کا شعر سحر اور انداز اعجاز ہے۔ عالمِ جذب و مستی میں اُس پر یہ حقیقت کھلتی ہے۔ کہ انسان کا غم بھی ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے، جس کا مالک انسان خود ہے۔ لیکن شہرت اور ثروت خدائی عطیہ ہیں۔ شاعر انتہائی عقیدت کا ثبوت دیتے ہوئے خدا کے حضور میں آنسوؤں کا ہار بطور تحفہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے :۔

"جب صبح کی نسیم چلے، اور تیری آواز سُنہری بانسری میں گونجے، تو اے شاہِ اعظم! مجھے بھی اپنی نوا ریزی میں شریک ہونے دے۔"

ٹیگور کا خدا ہر جگہ موجود ہے، وہ معبدوں کی خاموش فضا ہی میں نہیں بلکہ عام مشقت گاہوں کی ہنگامہ آرائی میں بھی ہے۔ وہ ایک ایسے انسان سے جو خدا کو کسی مندر کے تنہا گوشے یا کسی ویرانے کی خاموشی میں ڈھونڈتا ہے یوں مخاطب ہوتا ہے:۔

"یہ بھجن گانا اور مالا جپنا چھوڑ دے، تو مندر کے تنہا اور تیرہ و تار گوشے میں تمام دروازے بند کرکے کسے تلاش کر رہا ہے، اپنی آنکھیں کھول اور دیکھ، کیا تیرا خدا تیرے سامنے نہیں؟ خدا وہاں ہے، جہاں ہل چلانے والا کسان سخت زمین پر ہل چلا رہا ہے، جہاں سڑک بنانے والا پتھر کوٹ رہا ہے، وہ دھوپ اور بارش میں اُن کے ساتھ ہے، اور اس کا لباس گرد آلود ہے۔ تو اپنا یہ مقدس چغہ اتار دے۔ اور اس کی طرح گرد آلود زمین پر آ۔

آزادی؟ ــــ یہ آزادی کہاں مل سکتی ہے۔ ہمارے مالک نے خود اپنی ذات پر آفرینش کی قید عاید کر رکھی ہے، وہ ہمیشہ کے لئے ہم سب سے بندھا ہوا ہے۔ تو اپنی محویتوں سے باہر نکل، اور خوشبو اور پھولوں کو چھوڑ دے۔ اگر تیرے کپڑے بوسیدہ اور داغدار ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔ تو اپنی پیشانی پر پسینہ لئے ہوئے اُس سے مل، اور اُس کے ساتھ کھڑا ہو"

ٹیگور پر مشہور و معروف مجذوب صوفی بھگت کبیر کا نمایاں اثر پڑا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا نظم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کبیر کے یہ اشعار پڑھئے :۔

"میرے بندے تو مجھے کہاں ڈھونڈ رہا ہے۔ دیکھ میں تیرے پاس ہی کھڑا ہوں، میں نہ مندر میں ہوں، نہ مسجد میں، نہ کعبے میں ہوں نہ کلیسا میں، نہ شاندار جشنوں میں اور نہ زاہدانہ ایثار میں، اگر تو حقیقی طور پر میرا طالب ہے، تو تُو مجھے جلد ہی پالے گا۔ ایک وقت آئیگا جب ہم ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ کبیر کہتا ہے اے یاترا کو جانے والے! خدا ہر سانس میں موجود ہے۔"

ٹیگور کی نظروں میں موت بھیانک نہیں۔ وہ اُسے "تکمیلِ حیات" اور "عروجِ حیات" جیسے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کو خدا کا قاصد سمجھتے ہوئے اسکا استقبال نہایت خندہ جبینی سے کرتا ہے اور ایک دوست کی طرح اُس سے بے تکلفانہ انداز

میں ہمکلام ہوتا ہے اور ... اس کے حضور میں اپنی قیمتی زندگی کو بطور تحفہ پیش کرتا ہے :-

"جس دن موت تیرے دروازے پر دستک دیگی ۔ تو تو اُسے
کیا چیز پیش کریگا ۔ میں اپنے مہمان کے سامنے زندگی کا لبریز
ظرف رکھدونگا ۔ میں اُسے خالی ہاتھ بالکل نہیں جانے دونگا
جب موت میرے دروازے پر دستک دیگی تو میں اپنی زندگی
کے خاتمے پر ... ایام خزاں اور جلوہ ہائے بہار کی شادابی
اور اپنی مصروف زندگی کا تمام حاصل اسکے سامنے رکھدوں گا ۔"

"اگر دن ختم ہو گیا ہے ۔ اگر پرندوں نے چہکنا بند کر دیا ہے ۔
اگر ہوا تھک کر سو گئی ہے ، تو مجھ پر گہری تاریکی کا پردہ ڈال
دے ، بالکل اسی طرح جس طرح تو نے زمین کو نیند کے غلاف
میں لپیٹ رکھا ہے ۔ اور شام کے وقت کنول کی پتیوں کو
آہستہ سے بند کر دیتا ہے ۔ جس مسافر کا زادِ راہ کا تھیلا سفر ختم
ہونے سے پیشتر ہی خالی ہو گیا ہو ۔ جس کا لباس پھٹا ہوا اور
غبار آلودہ ہو ، جس کی طاقت ختم ہو چکی ہو تو اُس مسافر سے
شرم اور ناداری ... دور کر ، اور اپنی مہربان رات کے پردے
میں اُسکی زندگی ... کی طرح تر و تازہ کر دے ۔"

جہاں تک موت کو خوش آمدید کہنے ، اُسے باعثِ آرام ٹھیرانے اور حیاتِ نو کا قاصد گرداننے کا تعلق ہے ، ٹیگور بعض مغربی شاعروں سے بہت قریب ہے ۔ شاعرِ فطرت ورڈز ورتھ ... ت کو "پُر سکون زندگی کا خاموش انجام" بتاتا ہے ۔ شیلے جو ٹیگور کو آغازِ شباب میں بہت پسند تھا ، موت کے خوف سے لرزاں نہیں ہوتا ۔ وہ موت کو "خوفناکی اور تاریکی کا دروازہ" کہکر بھی اُسے ایک ایسے غیر فانی تغیر سے تعبیر کرتا ہے جو دنیا کو ... زندگی بخشنے کا کفیل ہے ۔ چیکوسلو ویکیہ کے شاعر برزنا کے نزدیک موت "... ت سحر کا سرور ، لبوں کا ایک شیریں بوسہ ، اور ستاروں کی سنہری بارش میں غسل ... کرنے کا نام ہے ۔ ایک اور شاعر ڈاکٹر ڈائک لکھتا ہے :-

"میں تجھ سے کہتا ہوں ... موت کوئی چیز نہیں ۔ بلکہ اس کے پردے میں
ایک نہ رکنے والی بالیدگی ہے ۔ وہ بالیدگی جو رنج و غم پر غالب
آتی ہے ۔ دنیا کے ایک ... نے سے لیکر دوسرے کونے تک بیشمار
سرگوشیاں سانس لے رہی ہیں ۔ تو اپنی زندگی کے لئے اور
آنے والی مہمات کے ... ان چڑھ ۔ تو ایک کڑی ہے اس

... ہے لیکن کسی اور ... ہے احساس
نئی صبح کے لئے تیری رات بھی دلکش ہے :-

۱۹۱۴ء میں ٹیگور نے "گیتا مالیہ" (نغموں کی مالا) کے نام سے ایک کتاب شائع کی ۔ اس مجموعہ کی نظمیں اپنی سادگی ، شگفتگی اور سحر انگیزی کے لحاظ سے "گیتانجلی" کی نظموں سے بہت مشابہ ہیں ۔ اب ٹیگور کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت اس دنیا میں بہت بڑھ گئی ہے اُس کی تمنا ہے کہ وہ اس دنیا میں اتنا اہم بن جائے جس قدر تماشا گاہِ عالم میں صبح کو طلوع ہونے والا آفتاب یا رات کو تابناک بنانے والے انجم و ماہتاب ہیں ۔ اب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو رہا ہے کہ اس کا دل ایک لازوال حسن کا آئینہ خانہ ہے ۔ وہ محبت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا صبح کی فضا کو نغموں سے معمور کیوں کرتا ۔؟ ستاروں سے بھرا ہوا آسمان اور پھولوں سے رنگین ساحل وجود پذیر کیوں ہو گئے ؟ اور جنوب سے آنے والی ہوا کان میں چپکے چپکے شیریں پیغام کیوں کہتی ؟

"تو میرے نغمات کے ساحل پر کھڑا ہے ۔ میری راگنی تیرے
قدموں تک پہنچتی ہے ۔ لیکن میں وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ۔
خوشگوار ہوا چل رہی ہے اب تو زیادہ دیر کے لئے کشتی کو
باندھے نہ رکھ ۔ آ ۔ میرے دل میں آ ۔ یہ نغموں کے
ذریعہ میرا تیرے ساتھ کھیل محض دور کا کھیل ہے ۔ میری
بانسری سے ہمیشہ ماتمی صدا بلند ہوتی رہتی ہے ۔ آ ۔
میری یہ بانسری لے لے ۔ اور اس خاموش اور سرور انگیز
رات میں اسے خود بجا ۔"

ایک نظم میں ٹیگور فخریہ انداز میں خدا سے یوں مخاطب ہوتا ہے :-

"تو نے پرندوں کو گانا بخشا ہے ۔ اس لئے وہ گاتے ہیں لیکن
وہ تجھے کچھ نہیں دے سکتے ۔ تو نے مجھے گویائی بخشی لیکن میں
تیرے گیت بھی گا سکتا ہوں ۔"

ٹیگور کے غیر فانی شاہکاروں میں ایک نظم "حیات" کے عنوان سے ہے اس میں وہ آسمان سے زیادہ خاکدان سے پیار کرتا ہے ۔ کیونکہ اس کی زندگی یہیں بسر ہوئی ۔ وہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے جس کی خاطر خدا کی طاقت پُر اسرار طور سے ہر لمحہ سرگرم عمل ہے ۔ اُسے کسی آسمان کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ آسمان خود اس کی ذات میں تکمیل پذیر ہو رہا ہے :-

کیا تجھے معلوم ہے کہ آسمان کہاں ہے؟ اس کی کوئی حد نہیں، اس کی نہ کوئی ابتدا ہے، نہ انتہا، نہ اس کی صبح ہے اور نہ شام۔

میں آج آسمان کی فضا میں ایک غریب یاتری کی طرح پھر تا ہا صدیاں بعد میں خاکی جسم لیکر اور اس دُنیا کا بیٹا بنکر پیدا ہوا، آج میرے جسم، میری محبت، میرے دل کے اضطراب، میرے خوف، میری سعی و کوشش اور میرے عیش و غم میں آسمان موجود ہے۔ آسمان میری زندگی اور موت کی لہروں پر ہر لمحہ بدلتے ہوئے رنگوں کی صورت میں چمک رہا ہے۔ آج وہ میرے نغموں کا مطرب ہے اور میری زندگی میں تکمیل پذیر ہو رہا ہے۔"

ٹیگور کے والد مہرشی دیوندر ناتھ نے شہر کلکتہ کی شورشوں سے دور، جو پرسکون اور خاموش جگہ گیان دھیان کے لئے انتخاب کی تھی، وہاں ٹیگور نے مشہور و معروف "شانتی نکیتن" نامی درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ جو بعد میں ترقی کرکے یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ۱۹۲۱ء میں ٹیگور نے مغرب کے مختلف ممالک کی سیر کی اور کئی شہروں میں لیکچر دیئے۔ بہت سے مشہور و معروف پروفیسروں اور وقت کے بڑے بڑے سیاست دانوں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس سے اس کی نظر میں اور بھی وسعت پیدا ہوگئی۔ مشرق و مغرب کا امتیاز اس کی نگاہوں میں مٹ گیا۔ اسے تمام دُنیا ایک ہی رشتے میں منسلک دکھائی دی۔ ہندوستان میں واپس آکر اُس نے بین الاقوامی نوعیت کی ایک یونیورسٹی قائم کی۔ جس کا نام "وشوا بھارتی" رکھا۔ اس یونیورسٹی کا مقصد مشرق و مغرب کا امتیاز مٹانا۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا اور امن و امان قائم کرنے کے لئے باہمی محبت و اخوت پیدا کرنا تھا۔ "شانتی نکیتن" اور "وشوا بھارتی" کے قیام سے ٹیگور کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دُنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ہوگئی۔ اِن درسگاہوں سے اسے خود بھی فائدہ پہنچا۔ نوعمر طالب علموں کے اُستاد کی حیثیت سے اُس نے نفسیاتِ طفلی کا گہرا مطالعہ کیا۔ چنانچہ اُس کے کلام میں بچوں کے لئے جو نظمیں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کی نفسیات سمجھنے میں وہ کس قدر ماہر ہے۔ اور اُس کی طبیعت کس قدر ہمہ گیر ہے۔ ایک نظم میں وہ کہتا ہے:۔

"میں اپنی ماں کو یاد نہیں کرسکتا، لیکن موسم خزاں میں صبح سویرے جب سیولی پھولوں کی نکہت ہوا میں تیرتی ہے تو مندر سے صبح کی عبادت کی خوشبو مجھے یوں آتی ہے جیسے وہ میری ماں کے پاس سے آئی ہو، میں اپنی ماں کو یاد نہیں کرسکتا

لیکن اپنی خواب گاہ کی کھڑکی سے جب میں دور آسمان کے نیلے رنگ کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے چہرے پر میری ماں کی گڑی ہوئی نگاہوں کی خاموشی تمام آسمان پر پھیل گئی ہے"

ٹیگور انسانی شخصیت کے ارتقاء کو مانتا ہے اور مافوق الفطرت انسان کا قائل ہے۔ زمین پر خدا کے وجود اور اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتا ہے۔ اُس کا خدا آسمانوں کی بلندی پر ہی نہیں رہتا بلکہ زمین پر بھی ہے ہم میں موجود ہے۔ اور دُنیا کی ہر چیز میں چھپا ہوا ہے۔ اس نکتۂ خیال کے پیش نظر ٹیگور اپنے باپ اور رام موہن رائے سے اختلاف رکھتا ہے۔ جو ایک ذاتی خدا کے قائل ہیں۔ وہ خدا کے لئے مختلف نام استعمال کرتا ہے، مثلاً ابدی رُوح، رُوحِ انسان، اعلیٰ ترین انسان، عالمگیر خودی، عالمگیر ذہن وغیرہ۔

۱۹۳۱ء میں ٹیگور کی عمر ستر سال کی ہوگئی۔ اس کی جوانی کبھی کی جا چکی تھی، اب اُس کی شاعری میں بہاریں ہنگاموں سے زیادہ خزاں کی خموشی اور سنجیدگی پیدا ہونے لگی۔ اُس کی سترویں سالگرہ کے موقع پر ہر ملک کے شاعروں، ادیبوں، فن کاروں، مصوروں اور سیاست دانوں نے اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ اور اُس کے متعلق نہایت بلند آہنگ تعریفی مضامین لکھے۔ جو "گولڈن بک ٹیگور" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔

ٹیگور نے اپنی نظموں، ڈراموں اور افسانوں سے دنیا کے لٹریچر میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ اس کے کلام نے بنگالی زبان کا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ اس کا ذہنی ارتقاء اُسے مناظرِ قدرت کے مشاہدہ کے بعد رفتہ رفتہ انسانی فطرت کے عمیق مطالعہ کی طرف لے آیا۔ اُسے معلوم ہوگیا کہ انسان ایک نیک مقصد لیکر دُنیا میں آیا ہے۔ جس کی تکمیل آسمان پر نہیں بلکہ زمین پر ہوگی۔ اس نے ارضی زندگی میں اس نیک مقصد کی تکمیل کی اور اس کے بعد دُنیا کی نگاہوں سے رُوپوش ہوگیا۔

کیفِ تغزّل

(از جناب حامد شاہجہانپوری)

نہ گذر خیال کا ہے، نہ رسائی ہے گماں کی
کہ زمیں فلک سے اونچی ہے تمہارے آستاں کی

نہ تلاش فصلِ گل ہے نہ ہی فکر کچھ خزاں کی
مجھے خاک دیںگی دھوکا یہ دو رنگیاں جہاں کی

نہ غرض ہے لامکاں سے نہ ہے جستجو مکاں کی
ترا نقش پا ملا تو ملی سلطنت جہاں کی

مری بے خودی میں پنہاں ہیں رموز معرفت کے
مجھے ہوش میں نہ لائیں ابھی گردشیں جہاں کی

ترے ذوقِ خود نمائی نے کیا ہے تجھ کو رسوا
نہ قصور میرے دِل کا نہ خطا مری زباں کی

ہے کوئی جو بڑھ کے روکے مرا بے قرار نالہ
نہ فضاؤں کو یہ قدرت نہ مجال آسماں کی

ترے قصّۂ ازل کی وہی انتہا ہے شاید
کہ جہاں سے ابتدا ہے مرے غم کی داستاں کی

یہ کمالِ جستجو ہے کہ میں کھو گیا ہوں ورنہ
مرے دل کے ذرہ ذرہ میں ہیں وسعتیں جہاں کی

تری اک نظر نے جانے مجھے کیا بنا دیا ہے
کہ نگاہیں اُٹھ رہی ہیں مری سمت دو جہاں کی

وہ جو دل میں رہ کے حامدؔ ہیں مری نظر سے پنہاں
کوئی اُن سے یہ تو پوچھے کہ یہ رسم ہے کہاں کی

افسانہ

پرمٹ

PERMIT

(از جناب محمد امین شرقپوری)

گھوش بابو ہر پانچ منٹ کے بعد دریافت کر لیتے کہ کھانا تیار ہو گیا۔

"ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر اور رک جائیے۔" رسوئی سے آواز آئی۔

"تھوڑی دیر سنتے سنتے ایک گھنٹہ ہو گیا۔" وہ کسی قدر جھنجھلا کر بولے: "دفتر کا وقت ہو گیا ہے۔ کبھی آنچ نہیں جلی۔ اور کبھی سنتا ہوں کہ چاول چڑھا دیئے ہیں۔ بس چند منٹ اور۔ کوئی حد بھی ہے انتظار کی۔"

بیوی اطمینان سے بولی "شیش کو پرمٹ لینے میں دیر ہو گئی۔ ورنہ کبھی کے پکا کر رکھ دیتی۔"

"پرمٹ۔ پرمٹ!" وہ بولے۔ "یہ بھی ایک مصیبت ہو گئی۔ پہلے پرمٹ لو، اور پھر کھانے کا سامان۔" کواڑ زور سے بند کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ بیوی نے آواز دی کہ جہاں اتنی دیر رکے رہے۔ وہاں تھوڑی دیر اور سہی۔ وہ کچھ جواب دیئے بغیر چلے گئے۔ صبح انہوں نے چائے کی ایک پیالی پی تھی۔ آج شاید تمام دن اسی پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہیں دفتر لیٹ پہنچنے کا ڈر بھی تھا۔ اور بھوکے رہنے کا احساس بھی۔ دن بھر کاغذات سے دھینگا مشتی کے لئے جسم میں مدافعت کی تھوڑی قوت بھی چاہیئے۔ پھر ایک روز کے تجربے نے انہیں یہ سبق سکھا دیا تھا کہ گھر پر چاہے بھوکے رہ لو مگر دفتر پیٹ بھر کر جانا چاہیئے۔ خالی پیٹ نہ کام ہوتا ہے نہ گردن ڈال کر بیٹھا جاتا ہے۔ اس روز انہیں پریشانی الگ ہوئی اور پرکاش چند سے لڑائی علیحدہ مول لینی پڑی۔ جو برت رکھتے ہیں وہ نہ جانے کیسے کام کرتے ہوں گے۔ آپ ہی آپ بولے۔ "اجی کیسا برت، وہ دودھ پھل وغیرہ خوب ٹھونس لیتے ہیں۔ بھوک لگے بھی کیونکر۔" بولے "اب تو یہ چیزیں بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ شاید اسی وجہ سے پرکاش چند کے چہرے پر کل دس ہی بجے بارہ بج رہے تھے۔ منگل کے برت رکھنے کا مزہ آ گیا ہو گا بابو جی کو۔"

اس کی ہنسی اڑاتے ہوئے آج اپنے آپ پر رونا آ رہا تھا۔ انہوں نے کئی مرتبہ سوچا کہ لوٹ جاؤں اب تو چاول تیار ہو گئے ہوں گے، کبھی کہتے "اب تو آ ہی گیا ہوں، شام کو کھاؤں گا۔ صبح سات بجے بیچارے رکی شیش کو بھیجا تھا کم بخت ساڑھے نو بجے چاول لیکر آیا۔" بولے "اس کا کیا قصور۔ سامان لینے سے پہلے پرمٹ لینا ضروری ہے اس کے بغیر بنیا نہیں دیتا۔"

سنتے آئے تھے کہ روپے بغیر دھندے نہیں چلتے۔ وہ ایشور کے بعد روپے کی طاقت کے قائل تھے۔ اس کی پوجا بھی کرتے تھے۔ مگر آج ان کا اعتقاد اٹھ گیا تھا۔ آج ان کی نظر میں اگر کوئی قابلِ پرستش چیز تھی تو وہ پرمٹ تھی۔ بولے "آج سے پرمٹ کو ہی دیوتا ماننا پڑے گا۔" بھوک کے احساس سے طرح طرح کے خوشگن اور یاس انگیز خیالات میں چکر کھاتے ہوئے جا رہے تھے۔ کنٹرول کے بارے میں ان کی رائے مختلف تھی۔ ان کے خیال میں روزمرہ استعمال کی چیزوں کے بجائے لوگوں کی نیت پر کنٹرول کی ضرورت تھی۔ کیونکہ امیر اور دولتمند اس خیال سے اناج جمع کر رہے تھے کہ شاید یہ کبھی بالکل مفقود نہ ہو جائے۔ اور دکاندار یہ سمجھتے تھے کہ کنٹرول پر بیچنے سے نفع کم ہوتا ہے۔ چوری چھپے چار گنا اور پانچ گنا داموں پر اٹھ رہا ہے۔ پھر مفت کی ہمدردی کے لئے وہ کیوں بٹہ کھائیں۔ دھرم ان باتوں کا پرچار کرتا ہے۔ کرے، حکومت ان کے فعل کو جرم سمجھتی ہے، سمجھا کرے، یہ سب کمزوریاں ہیں جہاں تک عمل کرو۔ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ انسان کو بہا دیتی ہیں۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھنے والا مجنوں کہلاتا ہے۔ یہ وہ ناپاک خیالات ہیں جو انسان کے ذہنی اور روحانی نشو و نما پر برا اثر ڈال رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ پیدا کرنے والے کے منشا اور رضا کو دلیری سے ٹھکرایا جا رہا ہے۔

ان کے ذہن میں کئی آدمیوں کے نام آئے جو چند دن پہلے مفلس تھے اور آج دولتمند ہیں۔ بے ایمانی جادو کا کام کر رہی تھی۔

کل جب رائے بابو نے انہیں بتایا کہ ایک گاؤں میں ماں باپ نے بھوک سے تنگ آ کر اپنے بچے کو ایک آنہ کے عوض بیچ ڈالا۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ کام چھوڑ کر بہت دیر سوچتے رہے کہ یہ تباہی کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔ کیسے کیسے عجیب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ شاید ماضی کی تاریخ ایسی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے گی۔ مستقبل کے لوگ ان واقعات پر یقین نہیں کریں گے۔ ان کے خیال میں یہ من گھڑت قصے ہوں گے: بچے کا مول ایک آنہ! صرف چار پیسے! وہ کانپ اٹھے۔ ذات پات کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ نیچ ان کی نظر میں ذات کا نیچ نہیں۔ بلکہ دل کا نیچ تھا وہ کہتے تھے کہ برہمن اگر اچھے کاموں سے عاقبت سنوار لیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بھنگی اس درجہ کو نہ پہنچ سکے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ ان کا مقولہ تھا۔ کیا برہمن کیا بھنگی آج انہیں سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سب کے سر پر لالچ کا بھوت سوار تھا۔ دیا اور کرم کی جگہ دغا اور ظلم نے لے لی تھی۔ وہ اسے بھی کرموں کا پھل کہتے تھے۔ جب بھائی بھائی کا گلا کاٹے گا۔ تو اس کی کشتِ آرزو کیا ہری ہو گی۔ اولاد بیچنے والے کی مجبوری تو درکنار رہی انہیں خریدنے والے پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ انسان کی قیمت

میں ۱۲ بجے کی چار ٹکریاں دم تھیرتے۔ اس کا حل کیا تھا پھر کا تھا۔ مرامر اجالا (ملا) ہوا ہے
بانہ آتے کھولی کے دم ملے جاتا ہے۔ انسانی جان کی یہ ارزانی اس کے تھے پن اور شرم
کا افسانہ تو محو اب ہے جس سے انسان کو اپنی ناداری اور حقیر ہونے کا فوراً اعتراف
کر لینا چاہیے۔

بردہ فروشی کے ایام میں بکنے والوں کی قیمت کم از کم ایک درم یا اشرفی ہوتی
تھی اور آج ایک آنہ! شاید قدرت انسان سے انتقام لینے پر اتر آئی ہے۔ اسکے غرور اور
نخوت کو خاک میں ملا دینا چاہتی ہے۔ ایک آنہ جس سے ایک آدمی ایک وقت پیٹ بھی نہیں
بھرتا۔ شاید بیچنے والے یہ سمجھیں ہوں کہ ان کا بچہ دوسری جگہ زندہ رہ سکے گا، وہاں سے
جو روٹی کے کچھ ٹکڑے کھانے کو مل جائیں۔ اس طرح وہ موت کے ہاتھوں بچ جائیگا۔
مگر وہ دائمی لعنت جو ان کے گلے میں پڑ جائیگی وہ زندہ رہنے کی مہر کیا تو ہین ہے۔ نہ خریدیکی ضرب المثل جو
مدت ہوئی مہذب دنیا کی لوح سے مٹ چکی ہے آج اپنی وہی دن پھر ابھرے ہوئے نظر آ رہے
ہے۔ کبھی محبت اور جنگ میں جو جائز سمجھا جاتا ہے وہ آج بھوک میں سب جائز بن گیا ہے۔ ان
خیالات میں الجھ کر گھوش بابو کو اپنی بھوک مٹتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ ان کا پیٹ ان تخیلوں ہی سے
بھر گیا۔ چلتے چلتے موٹر کے ہارن کی آواز سے چونک پڑے۔ موٹر قریب سے نکل گئی۔ ایمبولنس
موٹر جس کے اندر بھوک سے جاں بلب بھرے ہوئے تھے انہیں اسپتال لیجا رہے تھے۔ بھوک کے علاج
کیلئے ان میں سے بہتیرے راستے ہی میں دم توڑ دینگے۔ زندگی زندہ رہنے کیلئے ہے یا مرنے کے لئے
یکایک... اور نئی الجھن دماغ میں پیدا ہو گئی۔ کچھ کھائے بغیر انسان کیونکر زندہ رہ سکتا
ہے۔ اور موت! بے وقت موت کتنی بھیانک تعبیر ہے زندگی کے خواب کی کتنی عورتوں
کا سہاگ اس کے ہاتھوں اجڑ جاتا ہے۔ کتنے بچے لاوارث ہو جاتے ہیں۔ ملک میں
دھوا اور انانفقا اشرم جیسے ہی کیا کم ہیں۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے سارا ملک
آشرموں کا استھان بن گیا ہے۔ وہ اس تصور ہی سے کانپ گئے۔ دفتر آ گیا۔
ان کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ رجسٹر، کاغذات، فائلوں کے پلندے، وہ تھوڑی
دیر کے لئے سب بھول گئے۔ کام میں لگ گئے۔ برابر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چندر
بابو کا بچہ کئی روز سے بیمار پڑا تھا۔ صبح آتے ہی دریافت کرتے تھے کہ اب بچے کا
کیا حال ہے۔ وید کے علاج سے کچھ افاقہ ہوا یا ابھی ڈاکٹر ہی کا علاج ہو رہا ہے۔ آج
انہیں خاموش پاکر چندر بابو خود ہی قلم چھوڑ کر بولے "گھوش بابو میرا بچہ کل رات"
وہ چونک کر بولے "اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کیسی طبیعت ہے اب؟"

"وہ رات مر گیا ہے" چندر بابو روندے ہوئے گلے سے بولے۔

"افسوس!!" ان کی زبان سے نکلا کتنا پیارا بچہ تھا۔ موت کے بیرحم
ہاتھوں نے چھین لیا۔ اس افسوسناک خبر نے گویا گھوش بابو کے دماغ میں دبی ہوئی چنگاری
کو پھر سلگا دیا تھا۔ موت اور بچے! کبھی بھوک اور موت سامنے آ جاتی۔ ایمبولنس کار
دماغ میں چکر کاٹنے لگی۔ ... بڑے بڑے پیٹ جیسے ان کی جان لئے
ہوئے جا رہے تھے۔ انہیں انکھیاں دکھتی ہوئی معلوم دے رہی تھیں۔ ...
وہ بے صبری سے گھنٹے کو دیکھ رہے تھے کہ قسمت چلتی ہوئی ... پر کیوں جلدی
نہیں پہنچ جاتیں۔ کیا یہ ممکن ہے ... بھوک ... ممکن ہے
لوگ کئی کئی دن بھوکے رہتے ہیں اور ... آج انہیں یہ فلسفہ بھی باطل
نظر آ رہا تھا۔

چار بجے چھتری ہاتھ میں لے کر دفتر سے نکل گئے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے
جا رہے تھے۔ سڑک پر، جبڑا کھولے ہوئے لمبی سڑک، جو سیدھی اسپتال کو چلی گئی
تھی، جس پر ایمبولنس گاڑیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دن اور رات!

جب گھر پہنچے تو پسینے میں شرابور تھے۔ بیوی بولی "پتہ ہے بچے نے
تھوڑے چاول دئے تھے۔ وہ پھر کوشش کو دوبارہ بھیجا تو بولا کل صبح دوں گا۔
اب ہو چکے ہیں۔ پرمٹ واپس لے آیا ہے۔"

وہ چونک کر بولے "بچوں کو کھانے کو دیا کچھ؟"

"صبح کے تمہارے چاول رکھے تھے۔ کھائے ہیں انہوں نے۔ تھوڑی مچھلی
پکائی ہے، لاؤں، آپ نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"خالی مچھلی پکی ہے" وہ دہرا کر بولے۔ بھیگی ہوئی قمیص اتار رہے
تھے۔ "پرمٹ کہاں رکھا ہے؟" غصہ سے نکلکر آئے۔

بیوی طاق سے اٹھا کر بولی "صبح بھیجوں گی لے پھر"

وہ ہاتھ سے چھین کر رسوئی کی طرف بڑھے۔

"کیا کر رہے ہو؟" بیوی بولی

وہ دہکتی ہوئی آگ میں ڈال کر بولے "پرمٹ پرمٹ!"

جیسے بھوک سے آنتیں پیٹ میں کلبلا رہی تھیں۔ بڑبڑاتے ہوئے پلنگ
پر آ کر لیٹ رہے۔ دماغ میں خیالات پھر رینگنے لگے۔ جنہوں نے تمام دن
انہیں بے چین رکھا تھا اور وہ کروٹیں لے کر بھلانے کی ناکام کوشش
کر رہے تھے۔ اور شاید بھوک کو بھی!!

دو شعر

جنوں میں بھی ہے اتنا احساس باقی   کہیں یہ جنوں تجھکو رسوا نہ کر دے
سمجھ بوجھکر پرسشِ حال کیجئے   کہیں کوئی عرضِ تمنا نہ کر دے

مجاز

"سیّاروں کی تقدیر"

(از جناب پروفیسر فراق صاحب ایم اے گورکھپوری)

سیّاروں کی تقدیر یہیں جاگ رہی ہے
سوتے ہیں نہ افلاک زمیں جاگ رہی ہے

تارے بھی ہیں بیدار زمیں جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

کروٹ سے شبِ ماہ میں بہتی ہے یہ گنگا
یا حُسن کی بل کھائی جبیں جاگ رہی ہے

ہیں خواب میں عشّاق مگر یاد کسی کی
یا دل ہی میں یا دل کے قریں جاگ رہی ہے

اِک عالمِ نیرنگ ہے دُنیائے محبّت
سوتی ہے کہیں اور کہیں جاگ رہی ہے

یہ رات اندھیری ہے مگر اے غمِ فردا
سپنوں میں ابھی شمعِ یقیں جاگ رہی ہے

سوتی ہے جہاں عشق کی تقدیر ازل سے
وہ نرگسِ بیمار وہیں جاگ رہی ہے

اِقرار کی ٹھنڈک میں ہے اِنکار کی گرمی
سنّاٹے میں تری "ہاں" کے "نہیں" جاگ رہی ہے

آہوں سے کہو سینۂ شب چیرتی جائیں
تاثیر سرِ عرشِ بریں جاگ رہی ہے

شب خوں نہ مہِ نو سے ہو عشّاق میں اے چرخ
یہ رات لئے خنجرِ کیں جاگ رہی ہے

چھیڑیں تو مری سادگیِ عشق کو سو بار
لیکن نگہِ شوخ تریں جاگ رہی ہے

یہ نکھری ہوئی رات فراق آنکھ تو کھولو
سوتا ہُوا سنسار زمیں جاگ رہی ہے

عزم

(از جناب اخلاق حسین عارف)

آناً فاناً پھر جنگل کے سکوت میں مشین گنوں اور رائفلوں کی گھن گرج سے ایک حشر سا برپا ہوگیا۔ سرسبز و شاداب درختوں کی ہری ہری پتیاں اور پتلی پتلی شاخیں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر فضا میں گرنے لگیں جیسے طوفانی جھکڑ چل رہا ہو۔ تناور درختوں کی شاخوں اور ڈالیوں کے درمیان گزرتی ہوئی گولیوں سے شعلوں اور دھوئیں کی لپک اور سنسناہٹ پیدا ہوکر فنا ہونے پاتی تھی کہ اس کی جگہ دوسری شرر فشاں شے موجود ہو جاتی تھی۔ ان شعلہ افشانیوں میں گھرے ہوئے سُرخ فوج کے دو جانباز اپنے زخمی افسر کو ربر کی ایک چادر پر لٹائے ہوئے کافی دیر تک اوندھے پڑے رہے تاکہ گولیوں کی بوچھاڑ سے اپنا تحفظ کرسکیں ـــــ اور جب آگ کی بارش میں قدرے کمی ہوئی تو وہ زخمی افسر سمیت گھنی جھاڑیوں کی جانب رینگنے لگے۔ زخمی افسر کا تحفظ ان پر اسی طرح لازم تھا جیسے ان کی اپنی جانوں کا۔

اسی کشمکش میں وہ جنگل کی گھنی جھاڑیوں میں اتنی دور نکل آئے کہ اب انہیں دُور سے گولیوں کی سنسناہٹ اس طرح محسوس ہوتی جیسے تناور درختوں کی ہری ہری شاخوں پر پرندوں کے اُترنے اور پرواز کر جانے کے ساتھ ہی ایک خفیف سی آواز پیدا ہوتی ہے۔

زخمی افسر راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ کم سے کم یہ سپاہی تو ہیڈ کوارٹر تک پہنچ جائیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ اُسے یہیں کہیں گھنی جھاڑیوں میں چھوڑ دیں ـــــ اور وہ اس کے لئے تیار نہیں معلوم ہوتے۔ سپاہیوں کے رینگنے اور کبھی جھجک کر آہستہ آہستہ چلنے کے ساتھ ہی جب زخمی افسر بھی ربر کی چادر پر گھسٹتا تو اس کے تمام اعضا کی سکت اور تناؤ میں اس چیز کی سعی ہوتی کہ اس کا ٹوٹا ہوا زخمی پیر درد، جلن اور چبھن سے محفوظ رہے مگر ایسا نہ ہوسکتا تھا۔

اسے سخت جسمانی اضطراب تھا اور جسمانی اضطراب سے کہیں زیادہ ذہنی اضطراب ـــــ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ جتنی دیر ان تینوں کو صدر دفتر سے ، اور وطن کے نقصان کا احتمال ہے۔

اس کے علاوہ اس کے ذہن میں چند اور چیزیں بھی طرح رقص کر رہی تھیں ـــــ مگر وہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو دشمنوں کی نقل و حرکت کے متعلق صدر دفتر کو مطلع کردے تاکہ اس کے سر سے فرض کا یہ بارِ عظیم ہلکا ہو جائے۔

اور وہ مرنا بھی نہیں چاہتا تھا ـــــ اتنی کم عمری اور اتنی قلیل فوجی خدمت کے بعد ـــــ ایسی حالت میں جبکہ اس کا ملک نرغۂ اعداء میں گھرا ہوا تھا اور دشمن اس کے نظامِ تمدن و معاشرت اور اس کی صنعت و حرفت کو تباہ و برباد کرکے صدیوں پیچھے ڈھکیلنے پر تُلے ہوئے تھے ـــــ اور ایسی حالت میں جبکہ رخصت ہوتے وقت اس نے اپنی ماں، بیوی اور بہنوں سے فتحیاب و کامراں ہوکر واپس آنے کا عہد کیا تھا۔

"زندگی کے وہ چند لمحات ایک طویل معطل عمر سے زیادہ گراں بہا ہیں جو ایک مقصدِ عظیم کے لئے وقف ہوں۔"

اُس نے سوچا!

اور اسی عزم کے ساتھ وہ ابھی کچھ دیر زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اتنی دیر کہ وہ دشمن کی نقل و حرکت اور پیش قدمی کی اطلاع اپنے دفتر پہنچا دے۔ مگر یہ اس طرح ناممکن تھا اور بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ سپاہیوں کو ضروری ہدایت دیدے اور اسے یہیں چھوڑ کر انہیں آگے بڑھنے کے لئے کہے۔ اور وہ گویا ہوا:-

"دیکھو ساتھیو! تم مجھے اب چھوڑ دو۔ تمہیں بہت جلد صدر دفتر پہنچ کر میری ہدایات کے مطابق عمل پیرا ہونا ہے۔ تاکہ ـــــ"

مگر سُرخ جانبازوں نے اس کی ہدایت پر توجہ نہ کی اور برابر چلتے رہے وہ اسے اس طرح موت اور زیست کی کشمکش میں چھوڑ کر کیسے جاسکتے تھے؟

اور اسی طرح جب تقریباً نصف کیلومیٹر یہ لوگ اور آگے بڑھ گئے تو افسر نے گرج کر کہا:-

"سالومن اور پیٹر! میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم مجھے یہاں چھوڑ کر صدر دفتر کی جانب میری ہدایت کے مطابق جاؤ۔ ورنہ نافرمانی کے صلہ میں ـــــ ورنہ نافرمانی کے صلہ میں ـــــ"

مگر وہ دونوں جیسے اس خیال ہی سے ڈرے ہوئے تھے کہ انہیں افسر کو چھوڑ جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اپنی جانیں۔ وہ بلا جھجک اور توقف اپنا راستہ

سے کرتے رہے۔

افسر جب اس طرح حکم صادر کر کے ان کو آمادہ نہ کر سکا تو اب اُس نے انہیں منت و سماجت کے لہجہ میں سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھو کامریڈ سالومن! کامریڈ پیٹر! اس وقت جو اہم ترین فرض ہمارے ذمہ ہے۔ وہ ہے جرمنوں کی پیش قدمی اور فوجی نقل و حرکت کی اطلاع صدر دفتر پہنچانا، اِس کا مطلب یہ ہے کہ میں بذاتِ خود معذور ہوں، اب اگر تم میری حفاظت کروگے تو یہ فرض رہ جائیگا۔ تم لوگ سمجھ گئے کہ ہماری جانوں سے پیارا اور ضروری ہمارا فرض ہے۔ اور بڑی جد و جہد کے بعد اس نے انہیں آمادہ کرلیا اور ضروری ہدایات کے بعد رخصت کر دیا۔

دن بھر کا تھکا ہوا آفتاب اب آہستہ آہستہ مغرب کی طرف سرک رہا تھا۔ سرد دن کو سیاہی محیط کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ آسمان کے خلا میں گہرا رقص کرتا ہوا جنگلی درختوں اور پہاڑی ٹیلوں پر گرنے کا عزم کئے ہوئے فضا پہ منڈلا منڈلا کر غنودگی سی طاری کر رہا تھا۔ جنگل کی گھنی جھاڑیاں، چھوٹے اور بڑے درخت کہیں صف بستہ کہیں تتر بتر عالمِ سکوت میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہر چیز پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ وہی جگہ جو کچھ گھڑی پیشتر فاشسٹ بھیڑیوں کی آتش بار توپوں اور مشین گنوں سے میدان کارزار بنی ہوئی تھی اب دن بھر کے قتل عام کی سرگرمیوں کے بعد ایک اضمحلالی کیفیت کا مرقع بن گئی تھی۔ دن میں گذرے لمحات اب کسی سُست رفتار کیڑے کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔

اِدھر زخمی افسر اپنے دونوں ہاتھ، سر کے نیچے رکھے چت لیٹا ہوا گہرا دھندلکے کے اُس پار، نیلے آسمان پہ ستاروں کی بزم آرائی کے نظارے سے اپنے متفکر دل کو بہلا رہا تھا۔ اُدھر ستارے بساطِ آسمانی پہ یکے بعد دیگرے اپنا پڑا جما رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں درخشاں ماہتاب کہکشاں اور ستاروں کے درمیان شامل ہونے کے لئے درختوں کی شاخوں اور پتیوں کی اوٹ سے عالمِ انسانیت پہ اپنی ضیا پاشیاں کرتا ہوا دھیرے دھیرے اُوپر چڑھ رہا تھا۔

افسر کے لئے جنگل کی کھلی کھلی فضا میں ہزار ہا سوگواریاں پنہاں تھیں اس کی تھکی ہوئی خواب ناک آنکھوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود اس کا احساس دھیرے دھیرے سرد ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کرلیں اور اس کی بند آنکھوں کے سامنے جیسے تاریکی سی پھیل گئی۔ ساری فضا، بلکہ ساری کائنات ——— اور خود اس کا اپنا مستقبل سب تاریک ہی تاریک نظر آنے لگے۔ وہ ربڑ کی چادر پر اس طرح لیٹا ہوا تھا جیسے اپنے جسم، اپنی ہستی بلکہ موجوداتِ عالم سے بیزار رہے۔ اس کے تمام اعضا اس طرح ڈھیلے اور بے سکت پڑے ہوئے تھے جیسے ان سے تمام عملی قوتیں سلب کرلی گئی ہوں۔

رات کے بڑھنے کے ساتھ ہی سردی بھی اب قدرے بڑھ چکی تھی۔ اس نے اپنے تھیلے سے گوشت کا ایک بھنا ہوا پارچہ نکال کر کھایا۔ اس کے دماغ میں اس وقت بھی کچھ اُلجھے اُلجھے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ مگر اب وہ انہیں سلجھانے کی کوشش بالکل نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بالکل زور دینا نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ان پریشان کن خیالات کو واضح طور سے سمجھنا ہی چاہتا تھا۔ تکان، زخم، مسافت اور شکست خوردہ فرار کے بعد اب اس میں اتنی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ آخر کار اُسے نیند آگئی اور وہ سو گیا۔

دو گھڑی رات رہے فضا میں غیر معمولی خنکی کے باعث افسر کی آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف غضب کی تاریکی محیط تھی۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کامریڈ سالومن اور کامریڈ پیٹر اب تک صدر دفتر تک نہیں پہنچے ——— اس کا مطلب ہے کہ مجھے لینے کے لئے اب تک کوئی ایمبولنس نہیں آئی!! ——— اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ راستہ میں دشمنوں کا نشانہ بن گئے!! ——— اس کا مطلب ہے کہ دشمنوں کی نقل و حرکت کے متعلق ہمارے دفتر کو کوئی اطلاع نہیں ملی ——— اور اسکا مطلب ہے کہ ہم حریف کی مزید پیش دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکیں گے ———؟"

وہ ہر جملہ کے پہلے اپنا تکیہ کلام "اس کا مطلب ہے کہ" ضرور لاتا اور ہر بار اپنے مخصوص انداز میں موجودہ حالات کا مطالعہ کرتا۔

پچھلی شام کی طرح اس پر یاس و ناامیدی پھر طاری ہوگئی اور اُلجھے اُلجھے خیالات اُس کے ذہن میں آآ کر اسے حد درجہ پریشان کرنے لگے۔

جہاں وہ اس وقت تھا۔ وہاں سے صدر دفتر تین کیلومیٹر پر واقع تھا اُسے تین کیلومیٹر رینگ کر اور گھسٹ کر جانا تھا۔ اور آخر کار اُس نے وہاں پہنچنے کا عزم کرلیا۔

اب وہ آہستہ آہستہ کچھوے کی رفتار کی مانند اپنے دونوں ہاتھوں اور پیر کی قوت پر رینگ رہا تھا۔

وہی راستہ جو پچھلے ہفتہ اُس نے چند منٹوں میں طے کیا تھا اب کئی دن کا محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کی رفتار ایسی تھی کہ وہ بمشکل ایک کیلومیٹر بارہ گھنٹوں میں طے کرسکتا تھا۔

ایک گھڑی رات سے وہ صدر دفتر کی جانب روانہ ہوگیا تھا اور اب شام ہوتے ہوتے وہ صرف پون کیلو میٹر طے کرسکا تھا۔ اور ابھی اسے کافی مسافت طے کرنی تھی۔ شام ہونے کے ساتھ ہی اس نے بہت تھوڑا وقت آرام کرنے پر صرف کیا۔ اور تھوڑا سستانے کے بعد وہ پھر چل پڑا۔ دوسرے دن علی الصباح وہ تقریباً دو کیلو میٹر چل چکا تھا۔

آفتاب کی پہلی کرن نکلنے کے ساتھ ہی وہ بے دم ہوکر زمین پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضا میں سے جو چلنے میں اس کے معاون تھے، پھٹ کر خون بہہ چلا تھا۔

اسی عالم میں وہ کئی گھنٹہ پڑا رہا اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے سوچا کہ یہ صورت اور تشویش ناک ہے کیونکہ تعطل اور تساہلی کے باعث فرض سے سبکدوش ہونا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا ہونا سب سے بڑا قومی اور ملی نقصان ہے۔

ساتھ ہی وہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا ——— کاش اس موقع پر وہ میدان کارزار میں دشمنوں سے نبرد آزما ہوکر اپنی جان دیتا!......

"مگر یہ بھی تو سچی قربانی ہے۔" اس نے سوچا "ہم اپنے فرض کی انجام دہی میں دشمنوں سے مقابلہ ہی تو کر رہے ہیں ——— ؟" کاش میں ابھی کچھ گھڑی اور زندہ رہتا! کہ اپنے دوستوں کو جرمنوں کی پیش قدمی سے مطلع کردوں۔"

اور اسی خیال کے ساتھ اس میں تھوڑی قوت عود کر آئی۔ اور وہ پہلے کی طرح پھر زمین پر آہستہ آہستہ گھسٹنے لگا۔

ایک تاریک رات کو تقریباً گیارہ بجے روسی صدر دفتر سے کچھ دور ایک گشتی دستہ کے کسی سپاہی کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچ گیا۔ اس نے زمین کی طرف جھک کر اسے ٹٹولا۔ وہ کوئی انسانی جسم تھا۔ اسی اثنا میں اس کے ساتھی بھی اس کی جانب متوجہ ہوئے تو انہوں نے معلوم کیا یہ کوئی روسی افسر تھا جو بری طرح زخمی تھا۔ تاہم نفس کی آمد و شد سے اس کی زندگی کا ثبوت ملتا تھا اس کے دونوں ہاتھ زمین پر آگے کی جانب پھیلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ آگے بڑھنے کی کوشش میں لیٹے لیٹے چل رہا تھا۔ اس کا ایک پیر ٹوٹا ہوا تھا۔ جس کا بیشتر حصہ کٹ کٹ کر نہ معلوم کہاں گر چکا تھا۔ اور دوسرا پیر اور ہاتھ بری طرح گھائل تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں برفیلی زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ اور روشنی میں دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے وہاں کچھ لکھ دیا تھا۔

[illegible]

جرمن مقبوضہ علاقہ پر [illegible] کر لیا۔ اور انہیں بری طرح مار کر بھگا دیا۔

کوڑھ

(از جناب سلام مچھلی شہری)

"دھیمی دھیمی ہوائیں گاتی ہیں
پھوٹ کر سب نسیں اُبھر آئیں
موت کی پڑ رہی ہے پرچھائیں
اور فضائیں خود اپنے گیتوں کی
آخری لَے میں مرتی جاتی ہیں

حُسن کے سائے رقص کرتے ہیں
گُل و مہتاب و عارضِ جاناں
نقشِ دیوار مسجد و ایواں
سب ہی کچھ تو ہیں میرے جسم کے داغ
یہی جو آگ بن کے اُبھرے ہیں

اِن فضاؤں میں اِن ہواؤں میں
آتشیں راگ تھر تھراتے ہیں
اور مرے داغ مسکراتے ہیں
دیکھوں آتے ہیں کیسے نظّارے
برق و آتش کی گرم چھاؤں میں ——؟!!"

ایک ادبی ڈائری

ایک کتاب

(از جناب اختر انصاری)

Sir Valentine Chird کے نام سے ہندوستانی سیاسیات کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے جدید ہندوستان کے سیاسی مسائل پر کئی اہم کتابیں تصنیف کیں اور تقریباً دس سال بیشتر غالباً ہندوستان میں انتقال کیا۔

India اُن کی اہم ترین تصنیف ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور میں نے ۱۹۲۸ء میں تاریخ و سیاسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کو پڑھا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہمارے اُستاد Dr. T. G. P. Spear نے ایک دن کلاس میں اس کتاب کی تعریف کی تھی۔ اور اس کے سٹائل کو خاص طور پر سراہا تھا۔ مجھے صاحب طرز مصنفوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے میں نے اس کو خریدا، پڑھا اور بہت پسند کیا۔

کچھ تو کتاب کی نگین، پُرزور عبارت کا لطف اُٹھانے کیلئے اور کچھ اپنی معلومات کو تازہ کرنے کی غرض سے اب میں نے اس کتاب کو ایک مرتبہ پھر پڑھا۔ اور چونکہ اب میرا سیاسی شعور ایک نوجوان طالب علم کے سیاسی شعور سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس لئے اُس سامراجی ذہنیت کی بنا پر جس کی ترجمانی مصنف نے کی ہے۔ یہ کتاب قطعی طور پر گھناؤنی معلوم ہوئی۔

کتاب کے پہلے پانچ ابواب میں ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا ایک سرسری مگر فاضلانہ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان اوراق نے ہندستانیوں کے قومی ضمیر، اُن کی اجتماعی ذہانت، اُن کے کردار، اُن کی اہلیتوں اور اُن کی گذشتہ و موجودہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ باقی کے چودہ ابواب بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سالوں سے متعلق ہیں۔ اور ان صفحات میں اس دور کی اکثر اہم سیاسی تحریکوں، سیاسی واقعات اور حکومت ہند کی کارروائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جدید ہندستان اور اس کے مسائل کو سمجھنے کے لئے جن عناصر سے واقف ہونا ضروری ہے وہ اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ کتاب کی ہر سطر مصنف کے وسیع مطالعے اور ذاتی تجربے پر دال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے ہندستانیوں کے ذہن و کردار اور اُن کے تہذیب و تمدن کا ہمدردانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ مگر جب ہم ان صفحات میں جگہ جگہ مصنف کی سامراجی ذہنیت کے اظہار سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم اس کی نیت پر شبہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

برطانوی حکومت نے ہندستان پر جن فوائد و برکات کی بارش کی ہے اُن کا [illegible] ذہن [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] کی [illegible] شمل

تمل [illegible] ایک [illegible] حیثیت سے امر کی [illegible]

[illegible]۔ ساری کتاب اس عقیدے کی ترجمان ہے۔ کہ ہندستان [illegible] دوسرے [illegible] برطانیہ کے قبضہ میں بطور ایک مقدس امانت (Trust) کے ہے۔ اور جب تک ہندستان اپنے طور کے [illegible] سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتے، برطانوی قوم اپنے اقتدار کی زنجیروں کو ڈھیلا کرکے بددیانتی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔

دُنیا کی تاریخ میں یورپی اقوام کا یہ عقیدہ سیاسی مکاری اور منافقت کی ایک شاندار مثال کے طور پر ہمیشہ یادگار رہے گا۔ Chirol جیسے تاریخی و تمدنی نقادوں کی جانب سے اس عقیدے کا اظہار عموماً حسب ذیل چار فقروں کی شکل میں ہوتا ہے:-

(1) *The Civilizing mission of Europe.*

(2) *The white man's burden.*

(3) *The Spiritual genius of India.*

(4) *East is East and west is west, and never the twain shall meet.*

یہ چار فقرے بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر مطلب ان چاروں سے ایک ہی نکلتا ہے۔

پہلے فقرے کے معنی بظاہر تو یہ ہیں کہ دُنیا کی غیر مہذب اقوام کو مہذب اور متمدن بنانے کی خدمت قدرت نے یورپ کی سفید اقوام کے سپرد کر دی ہے۔ مگر اصل میں اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید اقوام کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ ایشیا اور افریقہ کی مختلف قوموں کو اپنا محکوم بنائیں۔ اور انہیں سیاسی و اقتصادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر اُن کا خون تک پی جائیں۔

دوسرے فقرے کے معنی بھی بظاہر تو یہ ہیں کہ دُنیا کی پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ اقوام کو اپنے ملکی معاملات کی دیکھ بھال کے قابل بنانے کی ذمہ داری ایک عظیم الشان بار ہے جو کارکنان قضا و قدر نے سفید اقوام کے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔ مگر اس کا اصلی مطلب وہی ہے جو اُوپر بیان ہوا۔

تیسرے فقرے کے استعمال سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ہندستان روحانیت کا مخزن ہے۔ اور ہندستان والے روحانیت کے امام ہیں۔ اس ملک میں ہمیشہ سے [illegible] جوگی، رشی، مہاتما اور سنیاسی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور یہاں کی انجذاب آفریں معرفت بار اور تقدس ریز فضاؤں میں ہمیشہ پُراسرار روحانی تحریکیں جنم لیتی رہی ہیں اور پھلتی پھولتی رہی ہیں۔ روحانیت والی ہندستان کا خاص میدان ہے جس میں نفس کشی اور ریاضت

ہے اور رہبانیت کے خیالی گورکھ دھندے میں پھنس کے کچھ اور نہیں حاصل کیا کرتے ہیں۔ انہیں روحانی صفات کی بنا پر ہندستان کو مادیت زدہ یورپ پر فوقیت حاصل ہے اور اسی لحاظ سے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغربی دنیا کو ابھی ہندستان اور ہندستان کی قدیم روحانی تہذیب سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

یہ اس فقرے کا ظاہری مطلب ہے۔ لیکن اس کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ہندستان والے جو روحانیت اور روحانی مشاغل کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں زندگی کے مادی پہلوؤں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کر سکتے۔ اور اپنی دنیوی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ وہ دنیوی امور کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ان کو چاہیئے کہ اپنے سارے دنیوی معاملات جو ان کے لئے نہایت پست اور رکیک چیزیں ہیں، اہل مغرب کے سپرد کر دیں اور خود فراغت ہو کر بھگوان کے نام کی مالا جپیں۔ اور اس سے جو مطلب نکلتا ہے وہ ظاہر ہے۔ یعنی یہی کہ ہندستانی کو سیاسی و اقتصادی خود مختاری سے منفر ہیں۔

White man's کا نظریہ Spiritual genius
burden کے نظریے سے بالکل مترادف ہے۔

گویا ہندستان والوں کی تہذیبی پسماندگی کو ایک خوبی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر اُسے نہایت بلیغ فلسفیانہ انداز میں سراہا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں ہندستان والوں پر روحانی تفکر کا غلبہ رہا ہے۔ لیکن وہ کون سی مہذب سوسائٹی ہے جو اس دور سے نہیں گذری؟ ہر انسانی جماعت اپنے ذہنی اور سماجی ارتقا کے ایک مخصوص دور میں روحانی طرز فکر سے کام لیتی ہے۔ یورپ کی بعض اقوام جو آج ایک مادی تہذیب کی امین ہیں، اس تاریخی دور سے گذر چکی ہیں اور اس تاریخی ضرورت کو پورا کر چکی ہیں۔ تقریباً تین سو برس پیشتر تک یورپ بھی ہندستان کی طرح روحانیت میں غرق تھا۔ جدید سائنس اور علمی انکشافات نے اس دور کو ختم کر دیا اور ایک نئے دور کی ابتدا کی جس میں عقلیت پسندی (Rationalism) اور سائنسی علم (Scientific knowledge) کو ہی ترقی کی بنیاد قرار پایا۔ ہندستان ابھی اس دور سے نہیں نکلا ہے۔ یہ اس کی پسماندگی کی علامت ہے کوئی قابل ستائش خصوصیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے استعمار پسندوں نے روحانیت کو ہندستان والوں کا خاص وصف قرار دینا ایک سیاسی فریب ہے اور بس۔ مقصد یہ ہے کہ ہندستان والے روحانیت ہی میں پھنسے رہیں اور اپنے سیاسی حقوق کا احساس نہ کریں۔

چوتھا فقرہ مشہور شاعر کپلنگ کے دماغ کی پیداوار ہے۔ جو صاحب مغربی طرح کا ایک سیاسی تقاضا ہے۔ اس کے ظاہری اور لفظی معنی بالکل صاف ہیں۔ مشرق مشرق ہے۔ اور مغرب مغرب۔ اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتے۔ یعنی مشرق کی خصوصیات مغرب کے اوصاف سے مختلف ہیں۔ اور یہ اختلاف بنیادی، قطعی اور ابدی ہے۔ اسی مطلب اس فقرے کا ہے جو White man's burden

اور Spiritual genius کا ہے۔ یعنی یہ کہ اہل مشرق روحانیت کے ماہر ہیں۔ ان کا ذہن روحانی مسائل پر غور و فکر کرنے کی غیر معمولی استعداد رکھتا ہے۔ وہ اپنے فلسفیانہ استغراق کے باعث دنیوی امور کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس اہل مغرب دنیوی کارگزاریوں اور مادی فتوحات کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ بھاپ اور بجلی کے خالق اور مشینی طاقت کے مالک ہیں۔ انہوں نے کائنات کو مسخر اور فطرت کی اندھی طاقتوں کو مغلوب کر لیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دنیا کی صنعتی ترقی اور سیاسی و اقتصادی تنظیم کے ضامن صحیح معنوں میں وہی ہو سکتے ہیں اور تمام ایشیائی و افریقی ممالک کو چاہیئے کہ ان کی کارکردگی اور کار آرائی سے مستفید ہونے کے لئے اپنے ملکی انتظامات کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں دے دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب اور مشرق میں جو فرق آج پایا جاتا ہے وہ بنیادی اور دائمی نہیں۔ بلکہ سطحی اور وقتی ہے۔ یہ کہنا کہ اس فرق کا سبب مختلف نسلی و ذہنی خصوصیات ہیں سراسر مہمل ہے۔ اہل مغرب ایک زمانے میں اتنے ہی "روحانی" تھے جتنے کہ اہل مشرق آج ہیں۔ اور آج اہل مشرق اتنے ہی مادی ہو سکتے ہیں جتنے کہ اہل مغرب اب تک ہو چکے ہیں۔

یہ چاروں فقرے مختلف الفاظ ہیں۔ ایک ہی ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں اور چاروں سے ایک ہی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ India کا مصنف ایسی ذہنیت کا علمبردار ہے اور اسی مقصد کا خادم۔ یہ چیز اس کے گہرے اور وسیع مطالعے کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔

جہلم

(از جناب نواب جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی)

جہلم کے وہ ہم صبح وہ دلچسپ نظارے — بلور بہا جاتا ہے کرنوں کے سہارے
اوپل کی طرح سطح پر رنگوں کا جھلکنا — یا آڑتے آنچل کی حسینوں کے اشارے
کھیتی کا وہ جھک جھک کے ہر اک موج سے کہنا — چھاتی سے لگا لوں اگر آجاؤ کنارے
احسان کا ہر چند صلہ ہو نہیں سکتا — جو پاس ہے میرے وہ ہیں صدقے میں تمہارے
لہراتے سفینوں کا ادھر عکس لب آب — اور نازسے ہلکورے ادھر لیتے شکارے
وہ پیچ و خم ساحل و امواج کا عالم — آئینے میں گیسو کوئی معشوق سنوارے
موجوں کو شرابور کئے دیتے ہیں جو جیسے — قطرے ہیں کہ چھوٹی ہوئی افشاں کے ستارے
جذبات پرستش میں وہی جوش تلاطم — دیوی کوئی جب اپنے پجاری کو پکارے
وہ لمحۂ پرکیف حیات ابدی ہے — انساں جو آغوش میں فطرت کی گزارے
نالہ ہو کہ نغمہ ہو مزا دے کے رہے گا — جب سینے میں دم رکنے لگے شوق کے مارے
ہم ہارنے کو ہار گئے عشق کی بازی — المنتہ للہ کہ ہمت نہیں ہارے

کشمیر ترے نام پہ کچھ نغمے سنا کر
چلتے ہیں اثر اپنے وطن آج سدھارے

دباؤ

(از جناب کشن رام پوری)

مغرب میں ڈوبتا ہوا سورج یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زخمی سپاہی خون میں لت پت آخری سانسیں لے رہا ہو۔ چمپا اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر کھڑی رہی تھی۔ گل عارض پہ لرزاں آنسو وہی منظر پیش کر رہا تھا جو مغرب میں ہو رہا۔ اس کے سامنے ڈوبتا ہوا سورج اور لالی کا یہ حملہ " تم اس مصیبت سے نجات پا سکتی ہو" کہہ رہا تھا۔ گاؤں میں تین روز سے ناٹک پارٹی آئی ہوئی تھی۔ اور لالی اسکا روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ اسکا منہ بنا بنا کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرنا سب کو پسند تھا۔ جیسے بھی لالی چالاک تھا۔ چمپا نازو نعم میں پل کر جوان ہوئی تھی اور اسی لئے طبیعت میں ضد اور شوخی تھی۔ بات بات پر چھینا اسکا شیوہ تھا۔ وہ چاند ایسی سندر تھی۔ چودھویں کے چاند ایسی۔ کیونکہ وہ بھی تو اپنی عمر کی چودھویں منزل میں قدم رکھ رہی تھی پھر پورنماشی کے چاند ایسی نہ ہوتی تو کیا ہوتی اور ؟ اسکا باپ گاؤں بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یوں تو اسکی سہیلیاں بہت تھیں۔ لیکن رمو سے اسکا گہرا بہناپا تھا۔ جب رمو سسرال سے آئی تھی تو اس کا منہ سفید اور ہونٹ سرخ دکھائی دیتے تھے۔ چمپا حیران ہوگئی تھی اور پوچھ بیٹھی تھی " یہ کیا ملا ہے منہ اور ہونٹوں پر؟ " رمو نے ہنس کر جواب دیا تھا۔ " اری پگلی یہ پوڈر اور سرخی ہے اس سے منہ سفید اور ہونٹ سرخ ہو جاتے ہیں۔ " چمپا کے دل میں بھی پوڈر اور سرخی لگانے کی آرزو پیدا ہوئی۔ رمو کے قرب نے یہ تمنا پوری کر دی۔ جب وہ سسرال کے لئے چلی تو پوڈر اور سرخی چمپا کو دے گئی تھی۔ صبح و شام منہ ہاتھ دھو کر پوڈر اور سرخی ملنا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ لیکن اسکی ماں کو یہ اتنا ہی برا لگتا جتنا اسے اچھا۔ اسکی ماں نے چمپا کی عادت چھڑانے کیلئے سختی شروع کر دی۔ اسے مارتی پیٹتی اور پوڈر سرخی کی ... دیتی۔ مگر اسے کچھ پتہ نہ چلتا۔ ناز و نعمت میں پلی الہڑ بچی کو ... سے متنفر کر دیا۔ وہ ماں کی سختی کو جلن اور بغض ... باپ کا یہ رویہ ایک آنکھ نہ بھاتا۔ نفرت و حقارت کی آگ اس کے سینے میں جلنے لگی۔ وہ سوچتی۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ جو وہ مجھے روز روز مارتی ہے۔ پوڈر! اس سے اسے کیا واسطہ۔ اس کے تو پیسے خرچ نہیں ہوئے۔ اور باپ بھی مجھے ہی مارتا ہے ظالم باپ۔ یہ باپ ہے

بچپن میں تو اتنی محبت تھی اب میری ایک نہیں سنتا۔ باپ اور ظالم میں فرق ہی کیا ہے۔ یہی لئے بچوں کی خواہشات کو اپنے ناجائز دباؤ سے کچلنا چاہتا ہے اور وہ بھی۔ ماں! کتنی سخت ہے یہ ماں اپنے سوکھے ہاتھوں سے میرا منہ نوچ ڈالتی ہے۔ اس کے ہاتھ ایسے ہیں جیسے خزاں رسیدہ درخت کی شاخیں۔

اس کی ماں صحن میں بیٹھی برتن مانجھنے میں ہمہ تن مصروف تھی۔ کبھی کبھی چمپا کو جو منہ ہاتھ دھو رہی تھی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی۔ چمپا منہ ہاتھ دھو کر اندر چلی گئی۔ اس نے پلنگ پر چڑھ کر ایک کپڑا اٹھایا اور اسے کھولنا شروع کیا۔ پوڈر کی پڑیا اور سرخی کی ڈبیا نکال کر منہ پر خوب خوب پوڈر ملا اور ہونٹوں کو سرخی سے " لب لعلیں " بنا ڈالا۔ اس کام سے فراغت پا کر اس نے اپنا عکس آئینہ میں دیکھا اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جلدی جلدی پوڈر کی ڈبیا اور سرخی کی ڈبیا کو کپڑے میں لپیٹنے لگی۔ اس کی ماں آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اس کے چہرے سے عجب وحشت برس رہی تھی۔

" تو نے بہت تنگ کیا ہے بے شرم! " اسکی ماں نے آتے ہی کہا۔

" میں نے ؟ کیا تنگ کیا ہے تجھے ؟ " چمپا نے جواب دیا۔

" بے شرم! تجھے لجیا نہیں آتی۔ گاؤں کے لڑکے کیا کہتے ہونگے۔ کس سے آنکھیں لگائی ہیں "

غصہ اور اضطراب کی حالت میں وہ کہتی رہی۔ " کس کو سنگار دکھاتی ہے "

اس نے بڑھ کر چمپا کے ہاتھ سے کپڑا چھین لیا۔ پوڈر زمین پر بکھیر کر پاؤں سے مسل دیا۔ اور سرخی کی ڈبیا باہر پھینک دی۔

" میرا پوڈر! میری سرخی!! بھگوان کرے تو مر جائے " چمپا نے روتے ہوئے کہا۔

" یہ زبان! ڈوب مر کہیں کنواری کنیا اور سنگار کرے۔ کلنکنی "

یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ پھیلا ہوا ہاتھ تڑاخ سے چمپا کے منہ پر پڑا۔ وہ تلملا اٹھی ——

ہائے کیا ہوا؟ ماں تو روز ہی مارتی تھی۔ لیکن اس کا پوڈر اور سرخی پھینکی جا چکی تھی۔ کنواری کنیا کو وہ کیا سمجھی۔ اس کے ماں باپ نے تو اسے کنواری کنیا کا مطلب سمجھنے کا موقعہ ہی نہ دیا تھا۔ وہ تو دیہاتی اکھڑ پن سے کام لیتے۔ اور سختی سے اسے دباتے۔ لیکن سختی سے کوئی جذبہ دبا ہے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ " بھگوان کرے تیرا ناش ہو "

ٹوٹ رہا ہو۔

بھولی ماں نے دونوں ہاتھ اٹھا دئے ... چھپا کے
باہر ... اسکی ... گیا۔

وہ روتی ہوئی باہر چلی گئی ———

تاریکی کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ میں کائنات کا ہر ذرّہ سسکتا جا رہا تھا۔ چھپا نے اندر کی طرف دیکھا اور ——— اور بھاگ گئی ———

صبح کو سمدو بنئے کی دکان پر بیٹھے ہوئے دو تین آدمی باتیں کر رہے تھے

ٹھکر کی لڑکی چھپا بھاگ گئی ... ایک نے کہا

”ناک کاٹ دی بیچاری کی ...“ دوسرے نے کہا

سمدو بنئے نے پوچھا۔ ”کس ...؟“

ایک آدمی حقہ کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ”کال سنے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اسکی نظر ... گھر گھر چھپا پہ ...“

”لیکن یار“ سمدو بنیا بولا۔ ”کہیں اس نے تو نہیں بھگا دی؟“

”ایں! پاگل تو نہیں ہے تو“ کسی نے جواب دیا ———

اور ایک قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔



کشمکش

از جناب عرشی خیرآبادی

پھر کھول دوں میخانۂ فطرت کے دریچے
پھر سے گُل و لالہ کے حسیں جام اُٹھا لوں
پھر جوڑ دوں اُمید کے ٹوٹے ہوئے رشتے
پھر بزمِ تمنا میں کوئی ساز اُٹھا لوں
پھر چھیڑ دوں بھولے ہوئے رنگین ترانے
پھر سازِ محبت کا ہر اک تار ہلا لوں
پھر چارۂ ویرانیٔ دل ڈھونڈ کے لاؤں
پھر اُن کی نگاہوں کو نگاہوں میں بسا لوں
یا ختم کروں سوزشِ پنہاں کا تسلسل
اِک درد کے آغاز کو انجام بنا لوں
وہ نقش جو خاطر کے لئے بارِ گراں ہیں
اک بار انہیں لوحِ تخیل سے مٹا لوں
یا وقت کے ماتھے پہ دمکتا ہے جو شعلہ
اُس شعلۂ جاں سوز کو سینے میں چھپا لوں
افکار کو دوں دعوتِ آزادیٔ انساں
احساس کو صدیوں کی غلامی سے چھڑا لوں
تا پھر نہ نظر آئیں کہیں ایوانِ امارت
مزدور کے جذبے کی قسم آج سے کھا لوں
احساس کی دنیا میں کوئی فتنہ گری کر
اے کشمکشِ زیست مری راہبری کر

غزلیات

(جناب پرواز زبیر جعفری)

(۱)

مضرابِ محبت ہے کس درجہ نشاط آمیز
ادراک کی منزل ہے پُرسوز و جنوں انگیز

ہے فقر میں پوشیدہ اسرارِ ملوکانہ
کیا دبدبۂ کسریٰ کیا طنطنۂ چنگیز

اب سازِ تمنا میں وہ درد کہاں باقی
جو ساز کو بھی پھونکے وہ سوزِ جنوں آمیز

کر فقر و محبت سے معراجِ بقا حاصل
غارت گرِ ہستی تھا ہر حوصلۂ چنگیز

یہ حُسن کی رنگینی لالہ ہے نہ شعلہ ہے
یہ عشق کی اک ضو ہے بجلی سے زیادہ تیز

(۲)

وہی قیدِ غم آلامِ جہاں ہے کہ جو تھی
زندگی بارِ گراں۔ بارِ گراں ہے کہ جو تھی

نغمۂ سازِ محبت سے ہے کیا کام مجھے
زندگی اب بھی وہی شورشِ جاں ہے کہ جو تھی

کبھی قسمت میں بلندی ہے کبھی ہے پستی
زندگی آج بھی اک موجِ رواں ہے کہ جو تھی

ہے تجسس کی نظر میں یہ فریبِ جلوہ
لیکن اپنی وہی چشمِ نگراں ہے کہ جو تھی

اب بجز یاس کے کچھ بھی نہ رہا حاصلِ عشق
اب مرے دل میں وہ اُمید کہاں ہے کہ جو تھی

دامِ ہستی میں تعین کی حقیقت معلوم
زندگی ڈھونڈ رہا ہوں وہ کہاں ہے کہ جو تھی

میرے اس خواب کی تعبیر وہی ہے پرواز
زندگی اب بھی وہی خوابِ گراں ہے کہ جو تھی

ٹیگور کی شاعری

(از محترمہ مس وحیدہ عزیز بی، اے)

مغرب کے نقادانِ سخن کہتے ہیں کہ زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور ہر شاعر اپنے زمانہ کے حالات کا ایک مجسمہ ہوتا ہے۔ شاعری کی تاریخ اس دعویٰ کا ایک بین ثبوت پیش کرتی ہے اور اقوامِ عالم کے مختلف زبانوں کی حالت اس کی صداقت کی ایک مکمل دلیل ہے۔

جب کسی قوم میں شجاعت اور جوانمردی کا جوہر کمال پر ہوتا ہے اس کے افراد میدانِ کارزار کو عیش و نشاط کا ایوان خیال کرتے ہیں۔ شمشیر کی عریانی ہلالِ عید کی تابانی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ تو شاعر نعرہ جنگ بلند کرتا ہے۔ وہ قتل و غارت کا طبل بجاتا ہوا اٹھتا ہے۔ وہ گوہر افشاں نہیں شعر ریز ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے پھول نہیں جھڑتے بلکہ چنگاریاں برستی ہیں۔

اُس کی شعلہ بیانی میں ایک داستانِ شجاعت پنہاں ہوتی ہے۔ جو ملکوں اور قوموں کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔ اس نوع کے شاعر ازمنہ تاریک میں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوئے۔ سپارٹا کی فتوحات کا باعث ایک نحیف البدن شاعر تھا۔ جسے یونانیوں نے فوجی خدمت کے ناقابل سمجھ رکھا تھا۔ عرب کا نابینا شاعر قبیلوں کی قسمت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا ایک شعر ہنگامہ قتال کی آتش افروزی کے لئے کافی تھا۔

لیکن قوم کی حالت میں ایک اور دور بھی آتا ہے جب غیر ٹھوکریں مارتے ہیں، ظلم کرتے ہیں۔ ان کا حق دبا بیٹھتے ہیں۔ مگر افراد قوم کچھ ایسے تعیش میں گم رہتے ہیں کہ چپکے چپکے شرم کی باتیں سہے جاتے ہیں، اور اپنے انحطاط کو انتہائی تہذیب اور اپنی بے غیرتی کو قناعت اور صبر کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس وقت نظامِ طبعی کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے دہر پہلو بدلتی ہے اور اسی زمین شور سے ایسے سخنورانِ سخن اٹھاتی ہے۔ جو اپنی اعجاز بیانیوں سے نیم مردہ قوم کے یخ بستہ جذبات کو سخن کی آگ سے گرما دیتے ہیں۔

چنانچہ حالی اس سلسلہ کا پہلا پیامبر تھا۔ جس نے اپنے دلگداز نعروں سے خوابیدہ قوم کو جگایا۔ اکبر کے تیر و نشتر اور طعنہ زن نعروں نے اس کے بعد چھیڑ کا۔

اقبال نے اپنی شعلہ نوائی سے یہ آگ مغرب کے کونہ کونہ میں پہنچا دی۔ اور ٹیگور نے محسوس کیا کہ یورپ کی مادی تہذیب دنیا کو تام ترقی کی طرف نہیں بلکہ غار تنزل کی طرف لے جا رہی ہے۔ دولت کی قدر پرستش کے درجہ کو پہنچ چکی ہے۔ اور افراد میں جذبۂ روحانیت بالکل مفقود ہو چکا ہے۔

افسانہ نویسی

ٹیگور آنجہانی نہ صرف ایک افسانہ نویس تھے بلکہ ان کی غیر معمولی طباع ذہنیت ہر شعبۂ ادب میں نمایاں تھی۔ وہ نہ صرف شاعر کی حیثیت سے ایک نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ بلکہ نغمہ ساز کی حیثیت سے بھی اوجِ کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ ان کا نغمہ سازی کائنات سے ہم آہنگ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آناً فاناً سارے بنگال میں مقبول خاص و عام ہو گئے اور پھر ان کی شہرت دیارِ مغرب میں بھی اپنا خراج وصول کرنے کے لئے نکل گئی۔ شاید بہت کم نغمہ سازوں کو ایسی خوش بختی نصیب ہوئی ہو گی۔

ناول نویس کی حیثیت سے اگرچہ بہت سے لوگ انہیں بنکم چندر چٹرجی اور سرت چندر چٹرجی سے کم پایہ سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مختصر افسانہ (Short story) کی سرزمین پر کوئی اور تاجدار ان کے مقابلہ کیلئے نظر نہیں آتا۔ ان ہی افسانوں کے ذریعہ ٹیگور نے لوگوں کے دلوں میں وہ تار چھیڑ دیا تھا جو مدت سے ایک فوقانی حزب انداز کے زخمہ کا منتظر تھا۔ انکے ڈرامے فلسفیانہ مضامین، لیکچر اور خطوط جو ان کی زندگی کے آخری حصہ میں اس قدر زبردست سیلاب کے ساتھ پے درپے امنڈ آمنڈ کر صفحۂ قرطاس پر پھیلتے چلے گئے۔ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک حقیقی انسانیت کے داعی اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ ایک شدید احساس ہمدردی آدم کا ہمیشہ ان کے دل میں موجزن رہتا تھا۔

ٹیگور کے کلام میں سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں روحانی رنگ غالب ہے۔ "گیتانجلی" اس کلام کا انگریزی مجموعہ ہے جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اور جب اس پر آپ کو نوبل پرائز ملا تو ساری دنیا کی نگاہیں آپ کی طرف جھک پڑیں۔ دنیائے ادب مسٹر ڈبلیو۔ بی ییٹس (W. B. Yeats) کی ہمیشہ ممنون [illegible] رہے گی کہ انہی کی کوشش سے "گیتانجلی" نے شاعر کی لاابالی طبیعت کی دست برد سے نجات پائی اور دنیا اس بیش بہا خزانے سے مالا مال ہوئی۔

فلسفۂ تصوف

قدیم ایشیائی شاعری کے قدردان ٹیگور کے کلام میں تصوف کے متلاشی

ہیں۔ بعض [illegible] نظریات کی تہجیریت کے معترف ہیں اور بعض لوگوں کو ان کے کلام میں سیاست کی بہ نسبت تغزل زیادہ ہے۔ لیکن اگر اسے غور سے پڑھا جائے تو اس میں جذباتی جذبات ہیں۔ تصوف اب اردو زبان میں پرانی چیز ہو گئی ہے۔ لیکن بقول پروفیسر براؤن دنیا کا کوئی مذہب اس سے خالی نہیں ہے اور یہی تصوف کی خصوصیت ہے۔ بھگتی یا خدا کی تلاش تمام دنیا کا مقصود اعظم ہے۔ "گیتانجلی" کا اقتباس ذیل ملاحظہ ہو۔ ٹیگور "تصوف" سے جو مراد لیتے ہیں۔

"میرے سفر کی مدت دراز اور منزل کی راہ دور ہے۔ میں سورج کی پہلی کرن کے رتھ پر آیا تھا اور دنیا بھر کے بیابانوں میں بادیہ پیمائی کر چکا ہوں۔ ستاروں اور سیاروں پر اپنے نقش قدم چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن منزل قریب ہنوز دور ہے۔ اور وہ راستہ جو منزل مقصود تک جاتا ہے۔ بہت تاریک ہے۔ مسافر کو منزل مقصود تک پہنچنے پر ایک دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹانی ہوگی۔ کیونکہ کوئی رہرو دنیا بھر کی خاک چھانے بغیر اس کعبۂ دل اور معبدگاہ روح تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔"

کیا اس تصوف اور منصور کے تصوف میں کوئی فرق ہے؟

اب "گیتانجلی" سے ذرا ان کی تہجیریت ملاحظہ ہو۔

"دن ختم ہو گیا۔ تاریکی کا سایہ تمام دنیا پر پھیل گیا۔ اس وقت میں ندی کے کنارے صراحی بھرنے جاتا ہوں۔ شام کی ہوا پانی کے اداس نغمے سے ہم آہنگ ہے۔ مجھے اندھیرے میں بلاتی ہے۔ مگر سنسان گلی میں کوئی رہرو موجود نہیں ہے۔

ہوا نہایت تیزی سے چل رہی ہے۔ اور دریا کی لہریں بھی سطح آب پر تیزی سے دوڑ رہی ہیں۔

کیا معلوم میں گھر لوٹ سکوں یا نہیں۔ خبر نہیں کس سے ملنے کا اتفاق ہو۔ ندی اترنے کے مقام پر ایک چھوٹی سی کشتی میں کوئی شخص بانسری بجا رہا ہے۔"

بادی النظر میں یہ ایک [illegible] نیچرل سینری کا چربہ ہے۔ کیونکہ دور کی بانسری کی آواز تو اردو زبان کے شعرا کو بھی [illegible] آج تک معشوق کے زلف میں گرفتار ہیں سہانی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن "گیتانجلی" کے آخری [illegible] کبھی مایوسی کا خیال ہی پیدا نہیں ہونے دیتے واقعی جب زندگی کی دھوپ ختم ہونے [illegible] عدم کی تاریکی چھا جائیگی تو شہر خموشاں کے سناٹے میں اس نامعلوم شخص کی بانسری کا محبت بھرا نغمہ عدم وہستی کی فضاؤں میں تحلیل ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔ اس وقت یہ معلوم ہوگا کہ یہ نام نہاد تہجیریت کچھ اور ہی چیز تھی۔

نظریہ سیاست

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادب کے معاشرتی پہلو کا اہم سیاست ہے

اور مفہوم کی [illegible]
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] جو سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ٹیگور دراصل مشرقی روحانیت کو مغربی جمہوریت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہی کیف روحانی کی ایک صورت ہے۔ جو زندگی سے ہم آہنگ ہو کر اس طرح نمودار ہوتی ہے۔ ٹیگور نے اس کیف روحانی کو دو طریقوں پر زندگی کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔

ان میں سے ایک کی بنیاد کیفیت پر ہے اور دوسری حسن و خوبصورتی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اور یہ ٹیگور کے ایک کامیاب نقاش اور حقیقی مصور ہونے کی بدولت ہے۔ ان کے کلام میں جو روحانی کیف پیدا ہوتا ہے اس کی بنیاد نغمۂ روح اور وجدان شخصیت پر ہے۔ ٹیگور ہماری صدی کے ایک کامیاب مغنی بھی ہوئے ہیں۔ اور اس اعتبار سے انہیں خسرو وقت کہنا بے جا نہ ہوگا۔

غرض یہ جذبہ جو دراصل منتہائے مقصود حیات ہے۔ اور عملی طور پر سیاسی جذبہ سمجھا جاتا ہے۔ تمدن جدید کی جان اور مسیحی عقیدے کا معراج کمال ہے۔ اس کی تمثیل "گیتانجلی" کا وہ نغمہ ہے جس پر ٹیگور کو نوبل پرائز ملا۔ یہ وہ دعا ہے جس سے مراد "حقیقی آزادی" ہے۔ اور سچ تو یہ [illegible] یہی وہ مناجات ہے جو ہندوستان کے ہر باشندے کی (بلا امتیاز مذہب و ملت) دعا اور جزو عبادت ہو سکتی ہے۔

مغرب کے نقاد جہاں اقبال اور ٹیگور کی ہمہ گیر شخصیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی تعلیم دنیا کو جنگ و جدال کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ وہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کہ مردانگی، شجاعت، اخلاقی و مذہبی تنظیم ہر ملک اور قوم کے لئے ضروری ہے۔ اقبال اور ٹیگور میں یہ دونوں صفتیں [illegible] موجود ہیں۔ ان دونوں کے کلام کا ہر مصرعہ اک جذبۂ آتشیں سے معمور ہے۔ جس کی تاثیر ملک اور قوم کو بیدار کر رہی ہے۔ یہ شاعر بھی ہیں۔ عالم بھی اور فلسفی بھی۔ مگر یورپ کی کم نظری ہے کہ وہ ان کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

بہار

از محترمہ عزیز جہاں بیگم صاحبہ ادا بدایونی

منہ غنچے کا ابر دھو رہا ہے
سامان بہار ہو رہا ہے

گھر آئیں گھٹائیں اودی اودی
پھولوں کی مہک ہے بھینی بھینی

خوشبو میں بسی ہوئی ہے پُروا
دلہن سی بنی ہوئی ہے پُروا

شرما کے جھکی ہوئی ہیں شاخیں
پھولوں سے لدی ہوئی ہیں شاخیں

آتے ہیں امنڈ کے کالے بادل
پھیلا ہوا انکھڑیوں میں کاجل

آوارہ ہیں یوں ہوا کے جھونکے
جس طرح امنگ دل میں اٹھے

سبزہ یہ بگڑ کے بن رہا ہے
یا روٹھ کے کوئی من رہا ہے

جنگل میں چمک رہی ہے بجلی
دل بن کے دھڑک رہی ہے بجلی

یوں ہجر کی تلخیوں میں جیسے
گزرا ہوا عیش یاد آئے

مصری سی دلوں میں گھولتے ہیں
امبوا پہ پپیہے بولتے ہیں

میں اب بھی مگر نراس سی ہوں
چپ چپ سی ہوں کچھ اداس سی ہوں

حیران تم اتنی کیوں ہو سکھی!
بے وجہ نہیں مری خموشی

متوالی سکھی بہک گئی ہو
تم اس کو بہار کہہ رہی ہو

تم بوندیاں کہہ کے خوش ہوئی ہو
یہ تو ہیں فلک کے چند آنسو

ساون کی جھڑی لگی ہوئی ہے
بادل کی گھٹا برس رہی ہے

تم جس کو سمجھ رہی ہو خوشبو
آہیں ہیں بہار کی یہ ہر سو

کلیاں یہ کھلائی ہیں ہوا نے
یا دل کے کئے ہیں لاکھ ٹکڑے

پھولوں پہ یہ تتلیاں کہاں ہیں
یادیں کچھ ہیں کہ پرفشاں ہیں

جینے کی امیدیں ٹوٹتی ہیں
جب کوئلیں بن میں کوکتی ہیں

البیلی کلی جو چونکتی ہے
بجلی سی نظر میں کوندتی ہے

عذر لائے سحر سے کوئی کہہ دے
آ آ کے نہ یوں مجھے ستائے

چھپاتا ہے جو نور بام و در پر
لگتی ہے کٹار سی جگر پر

مدت سے رہین غم نظر ہے
اس رات کی بھی کوئی سحر ہے

یہ ارض و سما تھے زیر فرماں
اک دور تھا جب خوشی تھی ارزاں

جب حسن پہ عشق کا گماں تھا
جب عشق فسردہ کامراں تھا

جب فرق گدائے بے نوا پر
تھا تاج شہانہ جلوہ گستر

وہ ناز و نیاز دیدنی تھا
مجھ پر بھی وہ مہرباں کبھی تھا

اگلی سی وہ بات اب کہاں ہے
وہ موسم گل تھا یہ خزاں ہے

ترقی پسند شاعری اور مجاز

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

ہماری اُردو شاعری اپنے اجداد کے بنائے ہوئے راستے پر چلی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ غزل خوانی اور مرثیہ خوانی ہمیشہ ہی ہوتی رہے گی۔ پرانی عظمت کی داستانیں ہمیشہ ہی دُہرائی جائیں گی۔ اور اہلِ محفل کو ماضی کی فرسودہ روایات سے خوب خوب لایا جائیگا۔ لیکن اُردو ادب نے ایک زبردست کروٹ لی۔ اور وہ ادب جو اب تک سماجی زندگی سے بے نیاز تھا۔ اب اسی سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ ۵۷ء میں ایک زبردست سیاسی جدوجہد ہوئی جو عرصہ تک ہماری سماجی زندگی پر اثر ڈالتی رہی۔ یہ کشمکش کچھ معمولی نہ تھی۔ اس کا اثر جاگیرداروں سے لیکر عوام تک یکساں ہوا۔ مگر جب ہمارا شاعر شعر کہتا تھا تو گویا اسکے اردگرد کے ماحول میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اتنے ہنگامی دور میں دو چار شعر سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مقابلہ میں عشقیہ شاعری کا ایک زبردست ذخیرہ موجود ہے جو اس تحریک سے کہیں بھی متاثر نہیں۔ لیکن یہ زمانہ کب تک رہتا۔ ایسے سخنور بھی پیدا ہوئے جن کے دلوں میں درد تھا جنھوں نے قوم کی زبوں حالی کو دیکھ ۔انہوں نے اس قوم پر مرثیہ لکھا۔ مگر ناامید نہیں کیا۔ اور زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے کو کہا۔ حالی نے مسدس میں ایک نیا پیغام دیا ادب اُردو نے سمندر میں پہلی بار مدوجزر آیا جس سے معلوم ہوا کہ جو سطح بظاہر غیر متحرک معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بھی طوفان آسکتا ہے۔

حالی نے جس عمارت کی بنیاد رکھی اب آہستہ آہستہ اس پر اینٹیں چنی جانے لگیں۔ اب تک جو آوازیں نکل رہی تھیں اُن میں کچھ گھٹن تھی مگر یہ یہ جوش پاک آخر کب تک دبایا جاسکتا۔ کیونکہ "یہ آگ وہ ہے جو پانی دبا نہیں سکتا"

حالی کے بعد چکبست نے اس حب الوطنی کے جذبہ کو محسوس کیا اور اس نے بربانگ دہل اعلان کر دیا ؎

حکم حاکم کا ہی فریاد زبانی رک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کہہ تماشا نہیں اب قوم نے کروٹ لی ہے

لیکن اس دلی پستی کے احساس نے ایک نیا راستہ کردیا جس پر سے گذر کر ہمارے ادب نے اپنی سماجی زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اور جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی روس میں ایک انقلاب ہو گیا۔ نہ صرف زار کی حکومت ختم ہوگئی بلکہ ایک جمہوری نظام قائم ہو گیا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ملکی حکومت بھی ہماری انفرادی آزادی کی راہ میں ایک روڑا ہے۔ توہیت ختم ہوگئی تھی اور اب جہاں غیر ملکی حاکم کو قوم کی کروٹ سے ڈرایا جاتا تھا وہاں اب یہ بتا دیا گیا ؎

گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا

اقبال نے بھی اس کو سوچا۔ اُس نے بھی فرسودہ نظام کی دھجیاں اُڑائیں۔ یہ ہیں ہماری بوسیدہ روایات۔ ان کے سہارے چلکر ہم انفرادی و جمہوری آزادی حاصل نہیں کرسکتے۔ انسانیت کا قافلہ جارہا ہے۔ وہ اب کسی کے روکے نہیں رکے گا۔ اقبال نے بھی اعلان کردیا ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور وہ وقت آگیا کہ وہ کنجشک جس کو شاہین بہ آسانی ختم کر دیتا تھا کہ اس کی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ آج شاہین سے لڑنے کے لئے تیار ہے۔

یہ کتنی بڑی تبدیلی تھی۔ وہ ادب جو سماجی و سیاسی حالات سے بھاگتا تھا اب دھیرے دھیرے اُن کے لئے شمع راہ ہو گیا —— آخر یہ کیوں ہوا؟— جہاں ہندوستان کی سیاسی بیداری اس کی ذمہ دار تھی وہیں ایک اور بھی طاقت تھی جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ پروفیسر اعجاز حسین نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہماری اُردو شاعری کے سیاسی رجحان میں اس وقت انقلاب برپا ہو گیا جبکہ اشتراکیت کا زور ہندوستان کی سیاست میں بھر گیا۔ مزدور، کسان، افلاس بے کاری، بغاوت، سرمایہ داری، حکومت، ملوکیت، موافق و مخالف خصوصیات خاص موضوع قرار دئے حیات عامہ نے قصرِ ادب پر دستک دی کہ ہم کو بھی اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ دروازہ کھلتے ہی اُس نے اپنے حقوق و مطالبات کی فہرست پیش کی۔ شعر کی دیوی نے گلے سے لگالیا۔ ادا شناس شعرا کی طرف اشارہ کیا انہوں نے جوش و تپاک کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

مجاز بھی انہیں ادا شناس شعرا میں سے ہے جس نے اس کے تمام مطالبات کو اپنے کارناموں کا عنوان بنایا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کی شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ وہی شاعر جو رومان کی راہ میں گامزن تھا اپنی منزل دوسری طرف تلاش کرتا ہے۔

حکومت کے مظاہر جنگ کے پُر ہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ایک تاریک فضا ہے۔ دُھوئیں کی بدلیاں ہیں۔ گولیوں کی سنسناہٹ ہر طرف سُنائی دے رہی ہے۔ ہر طرف اجل قہقہے لگا رہی ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا مگر ہمارا شاعر مستقل مزاج ہے۔ وہ اپنی منزلِ مقصود کا خیال لیکر آگے بڑھتا ہے۔ وہ کہیں بھی نااُمید نہیں ہوتا اور نااُمید کیوں ہو ؎

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے

صبح نو کی اُمید جلوہ گر ہے۔ صرف اُمید ہی نہیں ایک اعتماد ہے۔ یہ تاریکی سرمایہ داری کے ساتھ ختم ہو جائیگی۔ اس کے رنج و غم میں زمانے کا اندوہ پوشیدہ ہے۔ ایک فراواں مخلوق اس کے ساتھ ہے۔ ایک دن ایسا آئیگا کہ اس مخلوق کا نشیمن آندھی کی رو سے بچ نکلے گا۔ اور وہ اس کو اچھی طرح سجا بھی لیگا۔ لیکن ابھی تو بجلی کوندرہی ہے۔ دہقان کا خرمن اس کی زد میں ہے۔ یہ ہی ہے وہ سرمایہ داری کی آندھی اور بجلی ــــــ

سرمایہ داری میں مجازؔ نے اُس کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ ہرچند اس میں خیالات کی گہرائی اوروں کے مقابلہ میں کم ہے اور فنی اعتبار سے کچا پن بھی پایا جاتا ہے مگر جذبات کی شدّت ان سب پر حاوی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

کلیجہ پھُنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے

مگر آگے چل کر جذبات نے اور بیان پر قدرت حاصل کرلی ہے۔ سرمایہ داری پر اُردو ادب میں مشکل ہی سے ایسی مثال ملیگی۔ مجازؔ نے اُس کے ظلم و ستم اس کی نطرت کے بیان کرنے کے بعد اس کی انحطاطی حالت کا نقشہ کتنا اچھا کھینچا ہے ؎

ع مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے

وہ جانتا ہے کہ اِسی موقع سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے ؎

مُبارک دوستو لبریز ہے اب اُس کا پیمانہ
اُٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیادِ کاشانہ

مجازؔ کے یہاں ایک خاص قسم کا تضاد پایا جاتا ہے۔ کبھی تو وہ انقلاب کا سُرخ پرچم لئے ہوئے بڑھتا ہے۔ اور کبھی وہ گُلابی آنچل کی آڑ میں پناہ لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے جو بار بار حملہ کرتا ہے۔ کبھی تو وہ اچھا ہو جاتا ہے اور کبھی پھر بیمار۔ جذبات کی رو میں بہنے والا شاعر کبھی نوجوانوں کو انقلاب کی آمد کا انتظار کرنے کے بجائے خود انقلاب پیدا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی وہ خود انقلاب سے بے پروا ہو جاتا ہے۔

مجازؔ پر رومان بری طرح حاوی ہے۔ اور سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ہے وہ اکثر خود بھی سوچتا ہے کہ کاش اس کا پیچھا چھُوٹ جاتا اور بعض اوقات تو وہ سمجھتا ہے کہ رومان سے دُور انقلاب کی بستی میں آگیا۔ مگر وہ تو غیر شعوری طور سے اس کے ساتھ ہے۔ بالآخر وہ اس سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے ؎

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے

اس سے تھک کر پھر عاجزی سے درخواست بھی کرتا ہے ؎

مجھکو تیرے سحرِ موسیقی سے کب انکار ہے — مجھکو تیرے لحنِ داؤدی سے کب انکار ہے
بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ — ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے — ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اُٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

لیکن رومان گو وقتی طور سے بے حس ہو جاتا ہے لیکن تھوڑی دیر میں پھر اٹکھیلیاں شروع کر دیتا ہے۔ اُس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ مجازؔ اپنے محبوب سے فیض کی طرح براہ راست یہ کہتا ہوا جھجکتا ہے کہ ع

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اور یہی وجہ ہے کہ بہت جلد انقلاب کا شاعر خاموشی سے میکدہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اب اس کے سامنے ماورائے ساقی کچھ نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی
مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

لیکن یہ آثار چڑھاؤ مجازؔ کی شاعرانہ نطرت ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ایک نشہ ہے کہ جو یونہی اُترتا چڑھتا ہے۔ اِس قسم کی شاعرانہ لغزشیں مجازؔ سے عموماً سرزد ہوتی ہیں۔ بغاوت کا عزم رکھنے والا "مزدور" مجازؔ پھر رقص و سرود کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ اگلی صبح اگر اس کو اپنے سفر پر جانا ہے تو بقیہ لمحات میں وہ دو گھڑی خود کو شادماں کرنا چاہتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک مہمان جسے کسی خاص مہم پر جانا ہے۔ ایسے تعیشانہ جذبات رکھتا ہے۔ ایسے موقع پر جب کہ ایک طرف ــــــ

زندگی منتظر ہے مُنہ پھاڑے

زندگی خاک و خون میں تھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تند لئے

—— کھڑی ہے تو یہ اسے خود کو سرشادماں کرنا چاہتا ہے جب سینۂ گیتی میں زلزلہ ہورہا ہے، دنیا ایک زبردست انقلابی دور سے گذر رہی ہے۔ انسانیت موت اور زیست کے درمیان ایک عجیب کشمکش میں ہے۔ ان کے پاس میں سُرخی آگئی تو ایسے وقت میں شاعر کا ایسا کون سا ذوقِ نہاں ہے، جس کو وہ کامران کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اس جد و جہد میں حصہ لینے کے بے چارا جانتا تو ولیس آنے کے کوئی امکانات نہیں۔ جو شخص اس تدبذب میں ہوکر خار رہا ہو بھلا وہ اپنی منزلِ مقصود پہ کیس طرح پہنچے گا۔

پھر کہاں یہ حسین شبانی رات
یہ فراغت یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوق نہاں
کچھ تو تسکین شورش جذبات
آج کی رات جاوداں کرلیں
آج کی رات اور آج کی رات

اسی عیش و عشرت کے لمحات کو وہ جاوداں سمجھتا ہے۔ گویا اس کی زندگی کا یہ ہی ماحصل ہے۔ یہی وہ انفرادیت پسند طبیعت ہے۔ جو دو گھڑی خود کو "شادماں" کرنا چاہتی ہے۔ لیکن چونکہ مجاز کی فطرت کو کہیں بھی قیام نہیں لہٰذا یہ تضاد "عشرتِ تنہائی" میں ایک حیرت انگیز شکل اختیار کرلیتی ہے۔ انفرادیت قلب و ذہن کو مطمئن نہیں کرسکتی۔ باوجودیکہ وہ خوش ہے۔ لیکن یہی عیش چونکہ اس کی واحد ذات سے متعلق ہے۔ انسانیت کا کثیر التعداد طبقہ اس سے محروم ہے۔ اس واسطے یہ خار ہوکر ایک دل میں چبھتا ہے۔ اور "آج کی رات جاوداں کریں" کا شاعر پکار پکار کر کہتا ہے ؎

لاکھ مجبور ہوں میں ذوقِ خود آرائی سے
دل ہے بیزار اب اس عشرتِ تنہائی سے

اور وہ اسی پریشانی میں کہتا ہے ؎

کیوں نہ چاہوں کہ ہر اک ہات میں پیمانہ ہو
یاس و محرومی و مجبوری اک افسانہ ہو
عام اب فیضِ مئے ساقی و میخانہ ہو

اور اب مجاز پھر تندرست ہوکر ہمارے سامنے آتا ہے کہ ہم اس کو پہچان بھی نہیں سکتے۔ وہ ایک انقلاب کا متمنی ہوتا ہے جس میں یہ "عشرتِ تنہائی" "عشرتِ عمومی" کی شکل اختیار کرے ؎

ہے یہ ارمان بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور

لیکن ابھی تک تو وہ سماجی زندگی کا نقاد تھا جب دنیا کے سیاسی حالات بدلے، قومی جنگ کا دور شروع ہوگیا۔ دنیا میں دو کیمپ ہوگئے۔ ایک طرف جرمنی، اٹلی اور جاپان کے فاشسٹ ہوگئے جو دنیا کو محکوم بنا کر رکھنا، ان کے وطن کو غصب کرنا، ان کے جمہوری حقوق اور جمہوری اداروں کو تخریب و غارتگری کے حوالہ کرنا اور ہر جگہ ہٹلری نظام کی بقا چاہتے ہیں۔ حریت و آزادی کو ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ فاشزم دنیا کی بدترین قسم کی رجعت پسند طاقت ہے جو تمام حقوقِ انسانی کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے —— دوسرے کیمپ میں دنیا کی محکوم قومیں اور آزادی پسند عوام، سوویٹ یونین اور چین شامل ہوگئے۔ ان کی قیادت سوویٹ یونین کررہا ہے جس نے اپنے خون کی قیمت پر دنیا کو فاشزم کے خون سے نجات دلائی۔ اور اب وہ دنیا کی آزادی پسند قوتوں کے ساتھ دنیا کے بدترین سامراج یعنی فاشزم کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے الغرض ایک طرف عوام کی متحدہ قوت ہے۔ اور دوسری طرف فاشزم کے رجعت پسند جابر ——

ان سیاسی حالات کے بدلنے کے ساتھ عوام کے فرائض بھی بدل چکے تھے۔ کیونکہ اب وہ جنگ ان کی اپنی جنگ ہوگئی تھی۔ روس کا محاذ ساری دنیا کا محاذ ہوگیا۔ چنانچہ عوام کے ساتھ ہمارے فرائض میں بھی تبدیلی ہوگئی —— اور ہمارے شاعر مجاز نے بھی اپنے فرائض کو محسوس کیا۔ وہ شاعر جو سرمایہ داری کے خلاف، سماجی بے انصافیوں کے خلاف نظمیں لکھتا تھا اس کے فرائض میں اضافہ ہوگیا۔ اب وہ جوانانِ وطن کو ایک "پیامِ نو" دیتا ہے۔ فاشسٹ دشمنوں کے اقدام کو دیکھکر اس کی رگِ حمیت بھڑک اٹھتی ہے۔ اور اسی لئے وہ جام و سبو کی سرمستیوں اور زلف و عارض کی چھاؤں سے ہٹ کر عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے اور اس کو فرار سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ ایک ناقابلِ تلافی جرم ہے۔ اس کو اپنے افتاں و خیزاں ماضی کا احساس ہے۔ مجاز کا یہ ایک زبردست ترقی پسند قدم ہے۔ جس سے ہماری امیدیں پھر اٹھ گئی ہیں۔ بقول سجاد ظہیر ترقی پسندی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کسی منجمد تصور کا نام نہیں۔ اس کا تصور متحرک و سیال ہونا چاہیئے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حقائق و حالات کے ساتھ اسے بھی بدلنا چاہیئے۔ وہ ترقی پسند ادیب جو کسی زمانہ میں سماج کی بے انصافیوں کے خلاف پُرزور احتجاج بلند کرتے تھے جو انقلاب کا نعرہ بلند کرکے معاشی انقلاب

خود سچائی کی تلقین کرتے تھے ـــــــ اگر آج وہی پرانے راگ الاپیں تو کیا وہ ترقی پسند کہے جانے کے مستحق ہونگے۔

ـــــــ تو پھر جب وہ فیصلہ کن جنگ ہو رہی ہے جس پر تمام بنی نوع انسان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ جب خود ہماری سرحد تک دشمن کی فوجیں پہنچ گئی ہیں تو ایسے وقت میں اگر ہم وہی نغمے گائیں، ویسی ہی نظمیں لکھیں تو کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہم ترقی پسند نہیں رہے۔

لہذا وقت نے ہمارے شعرا کے فرائض بہت کچھ بدل دئے ہیں۔ اس وقت ان کا فرض فاشزم کے خلاف ایک ادبی محاذ قائم کر کے لوگوں کو ناشسٹ حملہ آوروں کے خلاف ابھارنا ہے۔ کہ وہ اس خطرے کو محسوس کریں۔ شاعر "دیدۂ بینائے قوم" ہے۔ اسکو اپنی قوم کی رہنمائی کرنا ہے۔ ہمارا شاعر اس رزم کا خاموش تماشائی نہیں ہے۔ وہ اپنی جنت کو جہنم کے حوالہ کسی قیمت پر نہیں کر سکتا۔ یہ وقت آگیا ہے کہ اس کو نوجوانوں سے بلا امتیاز قوم کہنا ہے ؏

ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی

مجاز کی نظم "پیام نو" ایک خالص ترقی پسند نظم ہے۔ وہ ہمارے لئے بیداری کا پیغام ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ہر طرف شبخون کی تیاری ہو رہی ہے۔ ہماری سرحدوں پر جاپان اپنی فوجیں لئے موقع کا انتظار کر رہا ہے مگر مشرقی محاذ پر بھوک اور موت کا تسلط ہے تو شاعر کہتا ہے ؎

محفل زیست پہ فرمان قضا جاری ہے
شہر تو شہر ہے گاؤں پہ بھی بمباری ہے

اور وہ ان کے متعلق کہتا ہے ؎

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشان و شرر بار چلے آتے ہیں
خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم بھی اٹھ جاؤ تو بیکار چلے آتے ہیں

خوں جو بہہ نکلا ہے اس خوں میں بہا دو انکو
ان کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو انکو

بالآخر جب اس کی نظر اس کی تمدن سوز تہذیب پر پڑتی ہے تو وہ بے اختیار چیخ اٹھتا ہے اور اپنے نوجوانوں کو بدیں الفاظ مخاطب کرتا ہے :- ؎

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار جلا دو ان کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو
پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شان شایان وطن ہو یہ دکھا دو ان کو

یہ نظم مجاز کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ شاعر اپنے ماحول سے بے خبر نہیں۔ وہ سو نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کو معلوم ہے کہ اس کی مشرقی سرحدوں پر دشمن کی فوجیں کھڑی ہیں ـ اب مجاز کی شاعری امید افزا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ وہ فرار نہیں کرے گا۔ ماحول کو وہ اچھی طرح محسوس کر رہا ہے۔ اور اسی میں اس کی شاعرانہ عظمت کا راز پنہاں ہے۔

"اعلائے حق"

(از محترمہ زیب عثمانیہ لودھیانوی)

زمانے کی یزیدیت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر
کہ باطل بر سرِ شوکت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

نہیں ابن علیؑ سے بے بس و محکوم ہی، ورنہ
حکومت مظہرِ قوت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

کبھی اعلائے حق کی کربلا کو گر ضرورت تھی
تو اب دُنیا کی یہ حالت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

مصائب کا بیاں کیا، تعزیہ کیا، سینہ کوبی کیا
مُسلمانوں میں ہر بدعت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

گلال و رنگ کے چھینٹوں کو خوں کہنا شہیدوں کا
بشر کی پستیٔ فطرت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

رہِ حق میں مصائب جھیلنے والوں کو مژدہ ہو
کہ جُرمِ اظہارِ اصلیت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

ضرورت خون کی اے زیب چند اشکوں سے ٹل جائے
تن آسانی کی یہ حسرت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

(گذشتہ سے پیوستہ) دوسری قسط

بدنام

(از محترمہ مہر آرا وصفی مراد آبادی)

"چٹھی لے جاؤ" دروازے پر ڈاکیہ کی آواز آئی۔ اور لیلا کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ایک لمحہ تو وہ یوں ہی بے حس و حرکت پتھر کی مورت کی طرح کھڑی رہی۔ اور آخر جب ڈاکیہ نے دوبارہ پکارا تو وہ قدم بڑھاتی ہوئی دروازے پر آگئی اور کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس نے خاموشی سے اپنا ننھا سا خوبصورت ہاتھ باہر بڑھا دیا۔

"لاؤ بھیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں پڑھ کر سنا دوں" ڈاکیہ نے اس کے خوبصورت ہاتھ پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں ——" لیلا نے مختصر سا جواب دیا ——!!

"تم سے کاہے کو پڑھوانے لگیں تھیں بھلا ——" شنکر نے طنزاً یہ فقرہ کسا۔

لیلا نے غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے سنا۔ اسکا بس چلتا تو ابھی جا کر دو جوتے شنکر کے مار دیتی۔ اس قسم کی جلی کٹی باتیں اسکو بہت تکلیف دیتی تھیں۔ نہ جانے کیوں پہلے پہلے شنکر نے لیلا پر بہت زیادہ اظہار ہمدردی کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سودا سلف لیلا اس ہی سے منگوایا کرے۔ اور اس بہانے وہ صبح و شام روز ہی اس کے گھر جائے۔ اور اس سے اظہار ہمدردی کرے۔ لیکن لیلا کو یہ پسند نہ تھا۔ وہ شنکر اور اسکی باتوں سے لرز جاتی تھی۔ اور اسی لئے جب کبھی وہ آیا اس نے یہ کہکر دروازے پر ہی سے واپس لوٹا دیا "کچھ نہیں چاہئیے بھیا۔ گھر میں سب کچھ ہے ——" جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اب گاؤں بھر میں اس کو بدنام کرنے پر تلا ہوا تھا۔ لیلا سب کچھ جانتی اور کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ لیلا نے سوچا اس وقت بھی وہ ڈاکیہ کو اس طرف آتا دیکھکر اسی لئے آیا ہوگا کہ دیکھئے پرمود نے لیلا کو کیا بھیجا ہے؟ اور جب اس نے طنزاً یہ فقرہ کہا تھا تو لیلا نے سنا۔ محلہ کے دو چار نوجوان لڑکے —— اور خود "پوسٹ مین" بھی ہنس رہے تھے۔ ان کی یہ ہنسی لیلا کیلئے کس قدر اذیت بخش تھی۔ یہ تو اس کا ننھا سا مجروح دل ہی جان سکتا تھا ——!! لیلا نے اندر آکر —— لفافہ چاک کیا —— ہندی میں تحریر تھا۔ "بھابی جی۔ نمستے

تمہاری طرف سے ہر دم فکر رہتی ہے۔ تمہاری تنہائی کا خیال کر کے میں کبھی کبھی بہت گھبرانے لگتا ہوں۔ اور اس ہی لئے میں نے تمہاری حالت کا صحیح نقشہ ماتا جی کو سنا دیا تھا۔ پہلے وہ راضی نہ تھیں مگر اب ان کا بھی یہی خیال ہے تم ہمارے یہاں آ رہو۔ میں نے تمہارے والد صاحب کو بھی اس بارے میں ایک خط لکھا تھا مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید نئی بیوی کے ڈر کی وجہ سے وہ تم کو اپنے پاس بلانا نہیں چاہتے بہر حال تم تیار رہنا میں اگلے ہفتہ تم کو آکر لے جاؤں گا۔ ننھے کو پیار

تمہارا بھائی پرمود"

ان محبت بھری سطروں میں لیلا کیلئے سب کچھ تھا۔ اس نے کئی بار اس خط کو پڑھا۔ باپ کی بے وفائی —— کا خیال کر کے وہ رونے لگی —— آہ! سوتیلی ماں کے مظالم کیا —— وہ بھی کچھ کم تھے جو شادی سے قبل اس بدنصیب نے سہے تھے۔ اب بھی اس کے احساس سے وہ کانپ اٹھی —— پھر بھی اس تنہائی —— خوفناک تنہائی سے جو اس کی نو عمری کے سبب اسکے لئے جان لیوا تھی بچ کر وہ ان تکالیف کو خندہ پیشانی سے منظور کر لینے کو تیار تھی اگر باپ بلا لیتا۔ مگر بابا کیا معنی —— اس نے تو داماد کے انتقال کی خبر سنکر دو سطر کا خط بھی نہ لکھا۔ اس صدمہ نے اس کا دل باپ کی طرف سے پارہ پارہ کر دیا تھا ——!! رمیش کے مرنے سے ایک ماہ بعد اس کے میکے سے ایک پڑوسی آیا تھا اور وہ ازراہ ہمدردی اس کے پاس بھی آیا جس کی زبانی لیلا کو معلوم ہوا کہ باپ نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ بڑی بدنصیب ہے۔ پیدا ہوئی تو ماں مر گئی۔ وہاں گئی تو ساس کو جاتے ہی کھا گئی —— اور اب آدمی بھی اسکی بدنصیبی کی بدولت مر گیا۔"

"کچھ اور بھی کہا چاچا —— ؟" لیلا نے امید کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کو بجھنے نہ دیا۔ اس کے سوال میں آس تھی۔ جسکو جلد ہی اس جواب نے یاس میں تبدیل کر دیا اور وہ ہلکی سی شعاع امید بھی جو ابھی حوادث دنیا کے تھپیڑوں سے لرز رہی تھی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ !!

"وہ کہتے تھے۔ اس بدنصیب کے سسرال میں بھی کوئی نہیں —— ایک رشتے کا چچا رمیش تھا —— ہمیں بہت افسوس ہے کہ لیلا نے اپنی بدمزاجی کے باعث اس کی بھی رمیش سے لڑائی کرا دی۔ اب اگر میل ہوتا تو لیلا اس کے پاس ہی چلی جاتی۔"

"مجھ سے لڑائی کر دی تھی ـــــ ؟" لیلا بے ساختہ چیخ اٹھی۔ "بیوہ تھا، شادی بھی نہ ہوئی تھی جو ان دونوں میں ان بن ہو چکی تھی۔ چاچا ـــــ یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے! برجیش کے باپ کہا کرتے تھے ان کے چاچا ـــــ ان کی ماں سے بیاہ کرنا چاہتے تھے۔ اور ـــــ وہ بچاری اپنے بچے کی خاطر اس بیاہ پر راضی نہ ہوئیں۔ اس لئے وہ چچا دیور اور بھتیجے کے دشمن بن گئے تھے۔ اور پھر بھی ہماری ساس نے سارا رنڈاپا ـــــ اس ہی گاؤں میں گذار دیا۔ سسرال کبھی نہ گئیں۔ میں نے تو ان کے چاچا کی شکل تک نہ دیکھی۔ اور وہ کہتے ہیں میں نے آکر لڑائی کرا دی"

لیلا نے زخمی ہرنی کی طرح تلملاتے ہوئے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔ اور ـــــ اس دن کے بعد سے ـــــ اس کے دل میں باپ کی طرف سے نفرت سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی سوتیلی ماں نے ۔۔۔۔ اس کے باپ کے دل میں اس کے لئے کوئی محبت باقی نہ چھوڑی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی اسکی ساس بھی تو اس ہی کی طرح جوان بیوہ ہوئی تھی۔ جیسے بھگوان نے ان کی عمر گذاری ایسے ہی وہ بھی منے کے سہارے زندگی کے بقیہ دن گذار دیگی!!

"لیلا جی جی ـــــ!"

"آؤ بہن ـــــ" لیلا نے جلدی سے خط چھپاتے ہوئے آنے والی کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔

"کس کی چٹھی آگئی ؟" شانتا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا ؟" لیلا نے شرما کر سوال کیا۔

"شنکر بھیا نے ـــــ" شانتا نے سادگی سے جواب دیا اور پھر وہ خط دیکھنے کا تقاضہ کرنے لگی۔ لیلا نے لفافہ اس کے آگے ڈال دیا۔

شانتا نے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھا اور بڑی محبت سے بولی

"بھی جی ـــــ یہ حرکتیں اچھی نہیں ـــــ"

"کیا ـــــ ؟" لیلا نے بے اوسان ہو کر سوال کیا۔

"شنکر بھیا ـــــ کہہ رہے تھے تم سارے گاؤں میں بدنام ـــــ ہو رہی ہو۔ یہ شنکر بہت دکھ ہوا۔"

لیلا کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ـــــ وہ کوئی جواب نہ دے سکی البتہ اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اس کے جذبات کا پتہ چل سکتا تھا۔ جس کا احساس شانتا کو بھی ہوا۔

"برا مان گئیں ـــــ!" اس نے محبت بھری نظروں سے اس کی بیچارگی کا احساس کرتے ہوئے اسکو سرتاپا دیکھکر سوال کیا۔

"۔۔۔ ہیں ۔۔۔ تو بے ۔۔۔ جواب دیا۔ شنکر بھیا کہتے تھے شہر کے لڑکے بہت چالاک ہوتے ہیں اور بھولی بھالی لڑکیاں اور جوان عورتوں کو وہ بھائی بنکر خوب فریب میں پھنسا لیتے ہیں ـــــ"

شانتا نے آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "غیر بندہ نہ جان نہ پہچان۔ کہتا ہے میرے ساتھ چلو۔ بھلا تم کو کون ہے جو یہاں سے ایسے ایک غیر گھرانے میں جانے دیگا۔ لاکھ گاؤں والے سب اس کو اور اس کے ماتا پتا کو جانیں پر اپنی بہو بیٹی کون ایسے رئیس گھرانے میں اس طرح بھیج دیگا۔ تم ہی سوچو جی جی ـــــ دنیا ـــــ کیا کہے گی ؟ پہلے ہی بدنام ہو۔ جی جی ایسا کام نہ کرو جو بدنام ہو"

"تو میں جا ہی کب رہی ہوں!" لیلا نے مردہ سی آواز میں پھر کہا۔

کہنے کو تو لیلا کہہ گئی۔ مگر یہ آخری امید بھی جب ٹوٹ گئی۔ تو اسے تنہائی اور ـــــ محلہ والوں کی دشمنی کا احساس اس کے لئے سوہان روح بن گیا۔ خصوصیت سے شنکر کی طرف سے اسکو بہت زیادہ خطرہ تھا۔ وہ بہت دیر تک خیالات کی رو میں بہتی رہی۔ لیکن ـــــ ساحل ـــــ لاپتہ تھا ـــــ!!

اب وہ ـــــ کیا کرے ـــــ ؟ یہ ایک ایسا معمہ تھا جس کا حل ناممکن سا ہو چلا تھا ـــــ!! گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اس پر زور ڈال رہی تھیں کہ شنکر سے بیاہ کرے ـــــ شاید اپنی حالت کا احساس کرتے ہوئے وہ اس قربانی پر بھی تیار ہو جاتی ـــــ مگر مشکل تو یہ تھی کہ شنکر نے خود اس کے دل میں اپنی حرکتوں سے نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ اور اس کے علاوہ ایک اور بھی سبب تھا۔ اور وہ تھا اس کا برجیش جس کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اب بھی اس کے تمام غم غلط کر سکتی تھی۔ جب وہ سوچتی۔ جس طرح اسکی سوتیلی ماں نے اس پر ظلم کئے ـــــ اور باپ نے مرد ہونے کے باوجود انکو برداشت کیا۔ کیا برجیش پر اس کا سوتیلا باپ ایسے ہی ظلم نہ کریگا جو کرے گا۔ اور پھر چونکہ وہ عورت ذات ہے اس لئے جب ایک مرد بھی عورت سے ہار مان گیا اور کچھ نہ کر سکا تو پھر میں مرد کے مقابلہ میں کب جیت سکوں گی ـــــ ؟ جس وقت وہ یہ سب سوچتی۔ اس کی روح لرز جاتی اور وہ پختہ عزم کر لیتی کہ کچھ بھی ہو وہ دوسری شادی نہ کریگی۔ برجیش اس کو اس قدر عزیز ہے کہ اسکی راحت کی خاطر وہ سب کچھ قربان کر سکتی ہے۔ اور اس ہی لئے اس کا یہ ارادہ اب بہت پختہ ہو گیا تھا۔ اور شانتا ۔۔۔ اس کو اس دیکھ

سب برا بھلا کہتے تھے کہ وہ ان کے خلاف چلتی ہے ان کے احکامات نہیں مانتی ان کی اسی بغاوت کا واحد سبب ان کی نظروں سے دیکھے اب پرمود تھا۔ جس نے بقول ان کے انکی امداد کر کے اسکو خود دماغ بنا دیا تھا۔

اگر پرمود اس طرح اس کے کھانے پینے کی خبر گیری نہ کرتا تو وہ خرچ سے پریشان ہوتی اور اس طرح ضرور وہ ان کا فرمان پورا کر دیتی اور بقول ان کے کنبہ برادری کی ناک رہ جاتی۔

ایک ہفتہ سوچتے ہی سوچتے بیت گیا ——— اور وہ کوئی صحیح رائے قائم نہ کر سکی۔ اور آخر پرمود آ ہی گیا ——— !! اس مرتبہ وہ ننھے کیلئے کئی کھلونے اور کچھ گرم کپڑے بھی لایا تھا۔ لیلا کیلئے ایک جوڑا چپل اور ایک سادہ سلک کی ساڑی بھی تھی ———

"بھابی تیار ہو ——— !" اُس نے حسب عادت آتے ہی مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ لیلا کیا جواب دیتی ——— وہ تو اسی سامان کو دیکھکر ڈر رہی تھی۔ محلہ والوں کی طرف سے ——— اس مرتبہ اسکو شاید زندہ ہی نہ چھوڑینگے۔

"جواب دو ——— آخر کب چل رہی ہو ——— بھابی ——— !!" پرمود نے حیرت سے اسکی سراسیمگی کو دیکھکر سوال کیا۔

"بھیا ———" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بولو ——— بولو ——— کیا کہنا چاہتی ہو ——— ؟" پرمود نے مزید حیرت سے سوال کیا۔

"میں نہیں جا سکتی ———" لیلا نے بمشکل کہا۔ کہتے وقت وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔

"آخر کس لئے ؟" پرمود نے سوال کیا۔

"گاؤں والے ——— سب منع کرتے ہیں ———" لیلا نے چھت پر آنکھیں گاڑے جواب دیا۔

"ان کی ایسی تیسی ——— گنوار ——— کم بخت کہیں کے ———" پرمود نے غصے سے لرز کر جواباً کہا۔

"تمہیں اس مکان میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا ورنہ تم دق کا شکار ہوگی۔ تین ——— تم ہو چکیں۔ تمہارے سسر مرے۔ ساس دق میں گئیں ——— اور ——— رمیش ——— بھی آخر ختم ہو گیا۔ میں نے اسکو بھی سمجھایا تھا لیکن وہ نہ مانا ——— تمہیں چلنا ہی ہوگا۔ میں نے وہاں انتظام کر دیا ہے۔ وہاں ایک ——— ہے اس میں تمہیں داخل کرا دونگا۔ وہاں جا کر تمہارا دل بہل جائیگا

تم اپنی تعلیم مکمل کر سکوگی۔ اور آئندہ زندگی آرام سے بسر کرنے کے قابل ہو جاؤگی۔"

پرمود نے یہ سب ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔ لیلا اس وقت تاریک بھیانک خوابوں کی بجائے خوش آئند سپنوں میں کھو سی گئی تھی۔ آریہ کنیا پاٹ شالہ ——— تعلیم اور ——— اور ——— اس کا ننھا اب پرمود کی زیر نگرانی تھا۔ وہ پڑھ رہا تھا اور اب وہ پڑھکر چودہ پندرہ سال کا ایک حسین اور چنچل لڑکا تھا ——— اور لیلا ——— بھی ——— ایک ادھیڑ عمر کی اُستانی ——— وہ پاٹ شالہ میں لڑکیاں پڑھانے پر لازم ہو گئی تھی ——— ننھا سکول سے آگیا تھا ——— اور اس وقت اُس کی ماں ——— اس کو کھانا کھلوا رہی تھی ——— ان کا ایک چھوٹا سا گھر تھا ——— دُور ——— دنیا کی نظروں سے دُور ——— جہاں اغیار کے طعنے نہ تھے۔ یہ دونوں ماں بیٹے آزاد اور مسرور زندگی گذار رہے تھے ———

"سو رہی ہو بھابی !" پرمود نے اس کی محویت کو دیکھکر سوال کیا۔ اور وہ اُچھل پڑی ——— جیسے خواب سے اچانک بیدار ہوئی تھی۔

ننھا کھلونوں سے کھیل رہا تھا ——— اور پرمود نے اسکو اُونی نیکر اور سوئیٹر بھی پہنا دیا تھا۔ اب موزے پہنا رہا تھا ——— لیلا نے دیکھا ——— اس کا دل کھل گیا۔ "آج ننھا ——— شہزادہ لگ رہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا ——— کیا کھلتا ہے اس پر یہ انگریزی لباس"

"بھابی دیر سے دیر ——— ہمیں کل روانہ ہو جانا ہے ———" پرمود نے کہا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے ؟" لیلا نے رسماً جواب دیا۔

"اوہ ——— تمہیں یہ تو بتانا بھول ہی گیا تھا ——— اگلے ہفتہ میری شادی ہے۔ اور اس ہی لئے میں تمہارے لئے ایک سلک کی ساڑی اور ننھے کے لئے یہ کچھ کپڑے خرید لایا تھا ——— پرسوں لگن ہے۔ اور اس لئے کل یہاں سے روانہ ہو جانا ضروری ہے"

لیلا کا غم آشنا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ چہرہ کندن کی طرح چمک اُٹھا۔ دل کو بھی ڈھارس ہوئی۔ کہ اس بہانے وہ اس کنج تنہائی سے نکل جائے گی۔

"بڑی اچھی خبر سنائی بھیا" لیلا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ آج ایک مدت کے بعد وہ اس طرح کھل کر ہنسی تھی۔

…ں رنگین عہد و پیمان سب جھوٹے اور ناقص ثابت ہوئے۔
شاید یہ صفحہ میری زندگی کے حالات کا آخری صفحہ ہو۔ اور یہ سال میری …آخری سال!

…ہوش و حواس پر اضطراب سا چھایا ہوا ہے۔ دل کو سنبھالتی ہوں …ڈوبتا جاتا ہے۔ ؎

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے

…م فرما۔ مجھے سکون دے۔ ایک بیزار زیست کو موت دے۔ کہ کون قلب …میری تمناؤں اُمیدوں کا قصر ایک ہیبت ناک جھٹکے کے ساتھ گر پڑا۔ …منڈر پر کب تک آنسو بہاؤں۔ تا کجا ماتم کروں۔ یہ کرب و ابتلا کی زندگی …زی نہیں جاتی معبودا! میرا دل مر چکا۔ میری اُمنگیں ہمیشہ کیلئے سو گئیں۔ …اب وبال ہے۔ پیارے دوست رحم کر تنہائی ما کن۔ اے لاوارثوں …! اس دنیا کے مکر و فریب سے دل عاجز آ گیا۔ سب کچھ کھو کر میں نے تجھکو … مجھے تو اپنے در سے مایوس نہ لوٹا۔ میں تجھ سے زندگی نہیں چاہتی، …یں مانگتی۔ موت صرف موت مانگتی ہوں۔ زندگی کا زہر ہلاہل اب مجھ …یں جاتا۔ موت کے شیریں جام کی منتظر ہوں۔ اے خدا!

…ارچ ۱۹۴۰ء

…گذرے ہوئے تمام دن میں نے بستر علالت پر گذارے۔ شدت غم نے …حرقہ میں مبتلا کر دیا۔ شب و روز عالم بے ہوشی میں گذرتے تھے۔ دونوں …یانی کیفیت طاری رہی۔ لیکن موت نے مجھ پر رحم نہ کیا۔ یہ کڑی بیماری …خر کار گذشتہ ہفتے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن غم دل نے میرا کام …یا۔ میری صحت اب شاید کبھی نہ سنبھل سکے گی۔ رُخساروں کا شہابی …کبھی واپس نہ آ سکے گا۔ اور میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دائمی ہو گئے …پنی اصلی ہستی کا مٹا ہوا دھندلا سا عکس ہوں۔ بقول ظفر ؎

جو اُڑتی پھرے سر رہ گذر اب میں وہ مشتِ غبار ہوں

…رواج کی قربان گاہ پر ایک اور معصوم رُوح کو قربان کر دیا گیا۔ اب …ٹھنڈا ہوا۔ او قربان گاہ سماج! او ڈائن!!

…پریل ۱۹۴۰ء

آج صبح دیر سے اُٹھی۔ پچھلی شب سو نہ سکی۔ یہ سوچ خدا جانے کب …ڑیگا۔ دماغ تھکان سے چور چور ہے اور دل شکستہ!
…نے کہا ہے ؎

موت تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

لیکن موت بھی تمہاری طرح مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ نہ تم کو اب میں پا سکتی ہوں نہ موت ہی مجھکو آتی ہے۔ اُف میری بے کسی!

۲۰ مارچ ۱۹۴۰ء

یہ دو روز بھی یوں ہی گذر گئے۔ کیا لکھوں جب زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے گو بظاہر اب میں تندرست ہوں۔ لیکن دل کا غم بستر سے اُٹھنے نہیں دیتا۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ میں پہاڑ پر گرمی شروع ہونے سے قبل چلی جاؤں۔ لیکن کیا میرے پژمردہ دل کو پہاڑ کی فرحت بخش آب و ہوا تازگی بخش سکے گی۔

۱۰ مئی ۱۹۴۰ء

۳۰ اپریل کو شملہ پہنچی۔ روز ارادہ کرتے رہنے کے باوجود روزنامچہ نہ لکھ سکی۔ یہاں کے دلفریب مناظر دلکش سبزہ زار اور سیرگاہیں۔ اور بھی فخری کی یاد دلاتی ہیں۔ ہماری طفلی کے کھیلوں کا مسکن و مامن شملہ! کوہسار پہ چھایا ہوا ابر جھومتا ہوا سبزہ، سنکی ہوئی ہوائیں، بہتے ہوئے آبشار رہی ہیں۔ لیکن میرا دل وہ نہیں۔ دن ملنے ملانے اور درستی تخیل میں بسر ہوتے ہیں۔

۱۴ مئی ۱۹۴۰ء

آج غضب کی بارش ہو رہی ہے۔ خوب ٹھنڈ ہے۔ میں آتش دان کے قریب بیٹھی تمام دن اپنی ایک طویل نظم "بیتے دنوں کی یاد" مکمل کرتی رہی۔

۲۴ مئی ۱۹۴۰ء

کل تمام رات سخت بارش ہوتی رہی۔ اس کے سبب میری نیند اُچاٹ رہی۔ آج بھی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی۔ سبزے پہ نکھار ہے۔ اور ہر جانب موہنی سی برس رہی ہے۔ سہ پہر کو دھوپ نکل آتی تھی۔ اس لئے میں دُور تک ٹہلتی ہوئی چلی گئی۔ گرتے ہوئے آبشاروں کی خوبصورتی لفظوں میں نہیں سما سکتی۔

آہ یہ حسین منظر، یہ رومان خیز فضا، کون سا دل ہے جو بیقرار نہ ہو جائے۔

۲۵ مئی ۱۹۴۰ء

کل شام کو واپسی پر بارش نے آ لیا تھا۔ مجھے بھیگ جانے کے باعث سخت زکام ہو گیا۔ اور خفیف سی حرارت بھی ہو گئی۔ اس لئے آج تمام دن بستر پر پڑی رہی۔ اب قدرے سکون ہے۔

۲ اگست ۱۹۴۰ء

میں نے اپنے روزنامچہ کا آخری ورق ۲۵ مئی کو لکھا تھا اسکے

...بے سہارا چھوڑ کے اور ناقص ثابت ہوئے۔
مجھے میری زندگی کے معاملات کا آخری فیصلہ ہو۔ اور یہ سال میری
...!

ہوش و حواس پر اضطراب سا چھایا ہوا ہے۔ دل کو سنبھالتی ہوں لیکن وہ ڈوبتا جاتا ہے۔ ع

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

خداوند رحم فرما۔ مجھے سکون ملے۔ ایک بیزار زیست کو موت ملے۔ کہ کوئی قلب نہیں رہا۔ میری تمناؤں اُمیدوں کا قصر ایک ہیبت ناک جھٹکے کے ساتھ گر پڑا۔ میں اس کھنڈر پر کب تک آنسو بہاؤں تا کہاں ماتم کروں۔ یہ کرب و ابتلائی زندگی مجھ سے گذاری نہیں جاتی معبودا! میرا دل مر چکا۔ میری اُمنگیں ہمیشہ کیلئے سو گئیں۔ مجھے جینا اب وبال ہے۔ پیارے دوست رحم کر تنہائی مارکن۔ اے لاوارثوں کے وارث! اس دنیا کے مکر و فریب سے دل عاجز آگیا۔ سب کچھ کھو کر میں نے تجھکو پا لیا۔ اب مجھے تو اپنے در سے مایوس نہ لوٹا۔ میں تجھ سے زندگی نہیں چاہتی، دولت نہیں مانگتی۔ موت صرف موت مانگتی ہوں۔ زندگی کا زہر ہلاہل اب مجھ سے پیا نہیں جاتا۔ موت کے شیریں جام کی منتظر ہوں۔ اے خدا!

۱۵ر مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

گذرے ہوئے تمام دن میں نے بستر علالت پر گذارے۔ شدت غم نے مجھے تپ محرقہ میں مبتلا کر دیا۔ شب و روز عالم بے ہوشی میں گذرتے تھے۔ دنوں مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری رہی۔ لیکن موت نے مجھ پر رحم نہ کیا۔ یہ کڑی بیماری جھیل کر آخر کار گذشتہ ہفتے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن غم دل نے میرا کام تمام کر دیا۔ میری صحت اب شاید کبھی یہ سنبھل سکے گی۔ رُخساروں کا شہابی رنگ اب کبھی واپس نہ آسکے گا۔ اور میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دائمی ہو گئے اب میں اپنی اصلی ہستی کا مٹا ہوا دھندلا سا عکس ہوں۔ بقول ظفر ؎

جو اُڑتی پھرے سر رہ گذر اب میں وہ مشتِ غبار ہوں

سماج و رواج کی قربان گاہ پر ایک اور معصوم رُوح کو قربان کر دیا گیا۔ اب تو تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ او قربان گاہ سماج! او ڈائن!!

۱۸ر مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

آج بھی دیر سے اُٹھی۔ پچھلی شب سو نہ سکی۔ یہ سوچ خدا جانے کب پیچھا چھوڑیگا۔ دماغ تکان سے چور چور ہے اور دل شکستہ!

غالب نے کہا ہے ؎

مت تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

لیکن موت بھی تمہاری طرح مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ تم کو اب میں پا سکتی ہوں نہ موت ہی مجھ کو آتی ہے۔ اُف میری بے کسی!

۲۰ر مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

یہ دو روز بھی یوں ہی گذر گئے۔ کیا لکھوں جب زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے گو بظاہر اب میں تندرست ہوں۔ لیکن دل کا غم بستر سے اُٹھنے نہیں دیتا۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ میں پہاڑ پر گرمی شروع ہونے سے قبل چلی جاؤں۔ لیکن کیا میرے پژمردہ دل کو پہاڑ کی فرحت بخش آب و ہوا تازگی بخش سکے گی۔

۱۰ر مئی سنہ ۱۹۴۰ء

۳۰ر اپریل کو شملہ پہنچی۔ روز ارادہ کرتے رہنے کے باوجود روزنامچہ نہ لکھ سکی۔ یہاں کے دلفریب مناظر دلکش سبزہ زار اور سیرگاہیں۔ اور بھی فخری کی یاد دلاتی ہیں۔ ہماری طفلی کے کھیلوں کا مسکن دامن شملہ! کوہسار پر چھایا ہوا ابر جھومتا ہوا سبزہ، سنکی ہوئی ہوائیں، بہتے ہوئے آبشار رہی ہیں۔ لیکن میرا دل وہ نہیں۔ دن ملنے ملانے اور درستی تخیل میں بسر ہوتے ہیں۔

۱۴ر مئی سنہ ۱۹۴۰ء

آج غضب کی بارش ہو رہی ہے۔ خوب ٹھنڈ ہے۔ میں آتش دان کے قریب بیٹھی تمام دن اپنی ایک طویل نظم "بیتے دنوں کی یاد" مکمل کرتی رہی۔

۲۴ر مئی سنہ ۱۹۴۰ء

کل تمام رات سخت بارش ہوتی رہی۔ اس کے سبب میری نیند اُچاٹ رہی۔ آج بھی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی۔ سبزے پر نکھار ہے۔ اور ہر جانب موہنی سی برس رہی ہے۔ سہ پہر کو دھوپ نکل آتی تھی۔ اس لئے میں دُور تک ٹہلتی ہوئی چلی گئی۔ گرتے ہوئے آبشاروں کی خوبصورتی لفظوں میں نہیں سما سکتی۔

آہ یہ حسین منظر، یہ رومان خیز فضا، کون سا دل ہے جو بیقرار نہ ہو جائے۔

۲۵ر مئی سنہ ۱۹۴۰ء

کل شام کو واپسی پر بارش نے آلیا تھا۔ مجھے بھیگ جانے کے باعث سخت زکام ہو گیا۔ اور خفیف سی حرارت بھی ہو گئی۔ اس لئے آج تمام دن بستر پر پڑی رہی۔ اب قدرے سکون ہے۔

۲ر اگست سنہ ۱۹۴۰ء

میں نے اپنے روزنامچہ کا آخری ورق ۲۵ر مئی کو لکھا تھا اسکے

...بیمار ہوگئی۔ ضعف و نقاہت نے بستر سے اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ کل ... نے غسلِ صحت کیا ہے۔ یہاں کی بارشوں سے دل تنگ آگیا۔ موسم بہت ... خراب ہو رہا ہے مسلسل تین دن سے بارش ہو رہی ہے۔ میں واپس چلنے پر ضد کر رہی ہوں۔ لیکن والدہ میری کمزور صحت کے باعث ابھی کچھ دن یہاں رہنا چاہتی ہیں۔

۔ار اگست سنہ ۱۹۴۰ء

آج میری سالگرہ کا دن تھا۔ حسبِ معمول میری سہیلیوں اور جو ... یہاں تھے ان کو پارٹی پر والدہ نے بلایا تھا۔ تحفے بھی ملے اور چہل پہل بھی رہی۔ بظاہر میں بھی مسرور تھی۔ اور ضرورت سے زیادہ بلند قہقہے لگا رہی تھی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ان قہقہوں میں دل کا ... تھا۔ وہ ... وہ شوخ آنکھیں آج مجھ سے ... میں ... جو ایک سال تک بیتابی سے میری سالگرہ کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ ... کی افسردگی سارے دن میں ... میرا جسم ایک لکڑی کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے زرد بے کیف رنگ اور مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بے اختیار میرے لبوں پر آہ آ گئی۔ کاش یہ میری آخری سالگرہ ہو ؎

مزا آ جائے ایسے میں جو مرگِ ناگہانی ہو
جدھر آنکھیں اٹھاؤں میں جوانی ہی جوانی ہو

~~~~~~~~

تلاشِ سکون

از

محترمہ نجمہ انوار الحق
بی۔اے

یہ آس دل میں لئے سو بسو میں پھرتی ہوں
حسین چاندنی راتوں میں ہم نشیں اکثر
جفائے چرخ کی خونخواریوں سے گھبرا کر
کہ غرق اپنے الم بحرِ نور میں کر دوں

سکونِ دل کی بہت کی ہے جستجو میں نے
فرازِ کوہ کی مہکی ہوئی فضاؤں میں
چمکتے تاروں کی خاموش ٹھنڈی چھاؤں میں
پیا ہے برسوں تمناؤں کا لہو میں نے

کسی طرح سے دلِ مضطرب کو بہلا کر
سرود و رقص کی وجد آفریں صداؤں میں
رباب و چنگ سے نکلی ہوئی نواؤں میں
یہ چاہتی ہوں کہ غم اپنے بھول جاؤں مگر
دلِ شکستہ یوں ہی سوگوار رہتا ہے
سلگتا سینہ سدا شعلہ بار رہتا ہے
~~~~~~~~

موجودہ جنگ کی روک تھام صرف عورتیں ہی کر سکتی ہیں

(از محترمہ ناجیہ خانم شروانیہ)

فروری سنہ ۴۲ء میں مسلم گرلز کالج علی گڑھ کی لٹریری سوسائٹی کے زیرِ اہتمام بیگم عبداللہ ڈیلیگیشن کے سلسلہ میں ایک مجلس مباحثہ منعقد ہوئی تھی۔ سوسائٹی کی طرف سے مختلف عنوانات مقرر تھے۔ محترمہ ناجیہ خانم شروانیہ نے مندرجہ بالا عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ دخترانِ وطن کا یہ ادبی مساعی جمیلہ یقیناً قابل ستائش ہیں۔ (عصمت)

اس موضوع پر کوئی فیصلہ کن بحث کرنے سے پہلے ہمیں چند ضروری باتوں پر غور کرنا ہے۔ سب سے پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی نفسی خصوصیات میں وہ کون سا نمایاں فرق ہے جس کا اثر موجودہ جنگ کی روک تھام پر پڑ سکتا ہے؟ دوسرے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ دراصل جنگ کی وجہ کیا ہے اور اس وجہ کو دور کرنے کی صلاحیت مردوں میں زیادہ ہے یا عورتوں میں؟ سب سے اہم اور قابل غور مسئلہ یہ دیکھنا ہے کہ آیا عورتوں کے اثرات مردوں پر اس قدر گہرے پڑ سکتے ہیں کہ وہ موجودہ سوسائٹی کے مروجہ نظام کے خلاف اگر کوئی قدم اٹھائیں تو کامیاب ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ مندرجہ بالا باتوں پر پہلے غور کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس موضوع کی بنیادی باتیں ہیں۔ اور ان کے بغیر ہم اس مبحث پر کسی قسم کی کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔

دنیا کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہمیں دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ دراصل جنگ انسانوں کے جنونِ حکمرانی کا نتیجہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ جنونِ حکمرانی جس کا مظاہرہ جنگ ہے عورتوں کی طرف سے بہت کم ظاہر ہوا ہے اور مردوں کی طرف سے بہت زیادہ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مرد نے اپنی جسمانی طاقت کی برتری سے غلط فائدہ اٹھا کر ترقی کے راستہ میں ہمیشہ عورتوں کو اپنا پیرو بنا کر رکھا۔ رہبری کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں مشکل یہ آ پڑی ہے کہ مردوں میں فطرتاً جوش زیادہ ہوتا ہے۔ ہوش کم۔ مگر برخلاف اس کے عورتوں میں ہوش زیادہ ہوتا ہے اور جوش کم۔ جنگ جوش کا مظاہرہ ہے ہوش کا نہیں چونکہ سوسائٹی کا نظام ہمیشہ سے مردوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے جنگ و جدال کا بازار گرم ہوتا چلا آتا ہے۔ مرد اپنی برتری اور تفوق کے شوق میں دیوانہ اور وحشی ہو جاتا ہے۔ عورتوں میں یہ بات کم پائی جاتی ہے۔ بلکہ اگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو صلح، امن، دوستی اور محبت کے لطیف جذبات عورت میں فطرتاً زیادہ پائے جاتے ہیں۔

موجودہ جنگ کی روک تھام صرف اسی وجہ سے اب تک نہ ہو سکی کہ ہماری سوسائٹی کا نظام کسی نہ کسی غلط فہمی کی بنا پر مردوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اور مردوں نے اپنی جنگجو فطرت کا مظاہرہ مسلسل اور مستقل طور پر کیا ہے۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ اگر مردوں کی ذات پر ہی موجودہ لڑائیوں کی روک تھام کو منحصر کیا جائیگا تو یہ لڑائیاں تا قیامت ختم نہ ہو سکیں گی۔ اگر آج یہ فتنہ دب بھی گیا تو کل ذرا سی چنگاری اس شعلہ کو بھڑکانے کیلئے کافی ہوگی۔ ہزاروں سال قبل کی تاریخ اس قسم کی لڑائیوں سے بھری پڑی ہے۔ اگر مرد لڑائیوں کو روک سکنے کا اہل ہوتا تو یہ لڑائیاں اب تک جاری ہی کیوں رہتیں۔ یہ پہلی دو باتوں کا جواب تھا۔

اب رہی تیسری بات یعنی جہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف عورتیں ہی موجودہ جنگ کی روک تھام کر سکتی ہیں۔ وہاں ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ اگر عورتیں روک تھام کرنا چاہیں گی تو کر بھی سکیں گی؟

اس سلسلہ میں مجھے آپ معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ میرے خیال میں عورتوں کے لئے کوئی ارادہ کرکے اس میں کامیابی کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ عورت کا عزم وہ شے ہے جو ایک پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہے۔ آج اگر دنیا کی تمام عورتیں مستقل طور پر ارادہ کر لیں کہ موجودہ جنگ کی روک تھام صرف ہمارا ہی حصہ ہے تو میں دعویٰ کے ساتھ کہتی ہوں کہ صرف چند ہفتوں کے اندر تمام جنگ کا نقشہ بدل سکتی ہیں۔ خود عورتوں کے ماحول میں اس بات پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ جب بھی انہوں نے کوئی ارادہ کر لیا ہے تو مردوں کو اپنی مرضی کے خلاف ہونے کے باوجود عورت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔ میں یہ مثالیں بھی دے سکتی ہوں کہ ملکوں کے انقلابات میں عورتوں کے ارادوں نے کیا کیا کمالات دکھاتے ہیں۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث میں صرف اپنے ملک کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتی ہوں۔

آپ نے دیکھا کہ ہم نے جو رسم قائم رکھنا چاہی خواہ وہ مردوں کی مرضی

۱؎ اور مرد آج بھی عورت کو ناقص العقل خیال کرتا ہے۔ معلوم ہے آپ کو؟ (عصمت)

۲؎ شاید یہ غلط فہمی اب تک باقی ہو۔ (عصمت)

[illegible]

مرد نہ برتری کے لئے قائم نہ رکھ سکے۔ اور بھی جن معاملات میں عورت اور مرد کی رائے کا تصادم ہو جاتا ہے ان میں فتح کا سہرا ہمیشہ عورت کے سر رہتا ہے۔ شادی، بیاہ، پیدائش اور اموات کے مواقع پر جو مختلف قسم کی رسومات ہوتی ہیں آپ ان پر نگاہ ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ عورتیں اپنی بات مردوں سے کس طرح منوا لیتی ہیں۔ لہذا اگر آج عورتیں ارادہ کرلیں تو دنیا کی اس مہیب جنگ کی روک تھام اُن کے لئے کچھ دشوار امر نہیں۔ عورتوں نے ملکوں میں انقلابات برپا کردیئے ہیں کیا کلوپیٹرا اور جون آف آرک یا اس قسم کی دوسری خواتین کے درخشاں کارنامے تاریخ کے صفحات سے محو کئے جاسکتے ہیں؟ سوچئے تو سہی کہ جو ہستیاں بڑے بڑے ممالک میں انقلاب کرسکتی ہیں۔ سلطنتوں کو بدل سکتی ہیں خود حکومت کرسکتی ہیں تو کیا وہ موجودہ جنگ کی خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرگئی ہو روک تھام نہ کرسکیں گی۔ یہ بالکل معمولی بات ہے صرف عزم مصمم درکار ہے اور کچھ نہیں۔

میں تو یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے جب کہ مرد اپنی خامیوں کی وجہ سے سوسائٹی کے نظام کی ذمہ داری اُٹھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اور کل سوسائٹی کا نظام عورت کی کاوش اور کوشش کا رہین منت ہوگا۔ مرد نے اس وقت تک سوسائٹی کے نظام کو بہتر بنانے میں اتنی بھی کامیابی حاصل نہیں کی کہ وہ سوسائٹی سے حیوانیت اور درندگی کے جراثیم نکال دیتا بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے مردوں کی بدولت سوسائٹی کے نظام میں حیوانیت اور بربریت بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ اس لئے لازمی طور پر ہم کو ہی سوسائٹی کا نظام درست کرنا پڑیگا۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ مرد لڑنے میں تو درندوں کو بھی مات کرسکتا ہے لیکن لڑائیوں کی روک تھام اسکی فطری صلاحیتوں سے بعید ہے۔ یہ کام صرف عورتیں ہی کرسکتی ہیں۔ ہندوستان کے ایک شاعر نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کس قدر صحیح کہا ہے:-

دیکھ وطن و قوم کے غم کو ڈھا سکتی ہے تو
مشرق و مغرب کو اک کنبہ بنا سکتی ہے تو
آمنہ اور دیوکی نے جو پلایا تھا کبھی
پھر وہی ساغر زمانہ کو پلا سکتی ہے تو
مریم و سیتا کی شیریں مسکراہٹ کی قسم
آج بھی سنسار کو جنت بنا سکتی ہے تو

۱۔ رونا بھی تو اسی کا ہے (ترجمہ)
۲۔ یہ ایک خواب ہے جو شاید شرمندۂ تعبیر نہ ہو (ترجمہ)
۳۔ الفاظ سے نہیں عمل کی طاقت پیدا کیجئے (ترجمہ)

غزل

(از محترمہ ک۔ ف۔ بیگم)

ہماری داستاں کیا داستاں ہے
غم و رنج و الم، آہ و فغاں ہے
نہ اترا آج اتنا فصلِ گُل پر
ارے ناداں بلبل! کل خزاں ہے
ہنسی رونے کا ہے اک پیش خیمہ
پس پردہ خوشی کے غم نہاں ہے
فنا ہو جانا ذوقِ آگہی میں
یہی تو زندگیٔ جاوداں ہے
نہیں ہے گیت بلبل کا یہ اے گُل!
یہ میرے دکھ بھرے دل کی فغاں ہے
بھلا کیا پوچھنا حسنِ ازل کا
نظر سے چھپ کے بھی جلوہ کناں ہے
نہیں ہمدم بجز اللہ بیگم
دلِ پُر غم سے بیگانہ جہاں ہے

دیوؤں کے مُلک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

آٹھویں قسط

اور ملکہ نے گلیور سے کہا کہ اپنا قصہ بادشاہ سلامت کو بھی سُناؤ۔ گلیور نے مختصر الفاظ میں بادشاہ کو اپنی داستان سُنائی۔ بادشاہ بھی اسکی حرکتیں دیکھکر اور باتیں سُنکر حیران رہ گیا۔

اس کے بعد ملکہ نے اپنے مستری کو حکم دیا کہ اس ننھے آدمی کے لئے ایک ایسا بکس تیار کرو جس میں یہ آرام کے ساتھ اُٹھے، بیٹھے اور سوئے۔ مستری اپنے فن کا اُستاد تھا۔ اس نے بڑی کاریگری سے جیسا ملکہ چاہتی تھی ویسا بکس تین ہفتے کے اندر اندر بناکر حاضر کیا۔ گلیور اور زمیندار کی لڑکی نے بھی بکس بنانے میں مستری کا ہاتھ بٹایا یعنی وقتاً فوقتاً یہ دونوں اُسے بتاتے رہتے تھے کہ بکس کیسا ہونا چاہیئے اور کس کس چیز کی اس میں ضرورت ہوگی۔

یہ بکس کیا ایک قسم کا چھوٹا سا کمرہ یا بنگلہ کہنا چاہیئے۔ سولہ فٹ سے سولہ فٹ مربع اور بارہ فٹ اُونچا۔ اس میں کئی کھڑکیاں تھیں۔ ایک دروازہ اور دو الماریاں اُوپر کے ڈھکنے کو چھت سمجھو جو دو قبضوں کے ذریعے کھلتی اور بند ہوتی تھی۔ کمرے میں گلیور کا پلنگ اور بستر تھا جس کو لڑکی روزانہ صبح کو باہر نکال کر ہوا میں رکھ دیتی اور رات کو پھر بچھا دیتی۔ سونے کے وقت ڈھکنا یا چھت رکھکر قفل لگا دیا جاتا۔

ایک دوسرے کارگیر نے گلیور کیلئے اور کئی چیزیں بنائیں۔ دو میزیں۔ دو خوبصورت کرسیاں اور ایک صندوق۔ جس میں چھوٹا آدمی اپنا سامان رکھے۔ یہ چیزیں ہاتھی دانت جیسی کسی سفید لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ کمرے کی دیواروں کو سب طرف سے ریشمی کپڑے سے منڈھا گیا تھا۔ فرش اور چھت بھی اسی طرح گدگدی بنائی گئی تھی۔ تاکہ اگر بکس کو اُٹھانے والے بے احتیاطی برتیں یا کبھی گاڑی پر لاد کر کہیں لے جائیں تو گلیور کو جھٹکوں سے کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

جوں جوں دن گذرتے گئے ملکہ کی گلیور سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ اتنا اُنس ہوگیا کہ اس کے بغیر چین نہ آتا۔ ہر کھانے پر وہ اسے اپنے ساتھ لیکر بیٹھتی۔ ملکہ کی بائیں طرف گلیور کی چھوٹی سی میز لگادی جاتی۔ حضرت بڑی شان کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے۔ اور لڑکی سٹول پر برابر کھڑی رہتی۔

شاہی محل یا دربار میں ایک شخص ایسا تھا جو گلیور کو ہمیشہ ستایا کرتا۔ بچارے ننھے آدمی کے دق کرنے سے اس کا کبھی پیٹ نہ بھرتا۔ یہ ذات شریف ملکہ کے ایک بونے تھے دیوزادوں کا یہ بونا بھی گلیور سے سات حصے بڑا سمجھو۔ قاعدہ ہے کہ طاقتور کے اچھے ہیں اور کمزور کی زبان چلتی ہے۔ وہ گلیور کو چھیڑتا اور گلیور بھی اُسے بُرا بھلا کہتا اور گالیاں کوسنے دیتا۔ اس پر وہ اور ستاتا، ڈراتا، دھمکاتا۔ گلیور بیچارہ سہم جاتا۔ اسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ ظالم کوئی آفت ضرور ڈھائے گا۔ لیکن زبان اُس کی قابو میں نہ رہتی۔ جب سامنا ہوتا یہ بھی بونے کو کچھ نہ کچھ سنائے بغیر باز نہ آتا۔

ایک مرتبہ کھانے کے وقت گلیور نے خدا جانے کیا کہہ دیا کہ بونے پر بھوت سوار ہوگیا۔ اُس نے جھلا کر میاں گلیور صاحب کو اُٹھا چاندی کے مکھن سے بھرے ہوئے پیالے میں پھینک دیا اور خود کمرے سے نکل بھاگ گیا۔

دیوؤں کا پیالہ گلیور کے لئے حوض سمجھنا چاہیئے۔ اور پھر گرا بھی سر نیچے اور پاؤں اُوپر۔ زندگی سمجھو جو بچنا رہا۔ لڑکی اتفاق سے کمرے کے دوسرے کونے میں تھی۔ چیخ سُنکر دوڑی کہ آسے مکھن کے پیالے میں سے نکالے۔ لیکن نکالتے نکالتے اس کے پیٹ میں کئی پونڈ مکھن اتر چکا تھا۔ لڑکی کے جھپاکے سے گلیور بچ گیا۔ یہی غنیمت ہوا اور سوائے اس کے اور زیادہ کوئی تکلیف نہیں پہنچی کہ اُس کے کپڑے بالکل خراب ہوگئے بونے کو اس حرکت کی سزا میں خوب کوڑے پڑے اور پیالے کا باقی ماندہ مکھن اُسے زبردستی پلایا۔

اس ملک میں گلیور کے لئے مکھیوں کا عذاب سب سے بڑا عذاب تھا۔ ایک ایک مکھی اتنی بڑی تھی جیسے انگلستان کا چنڈول۔ گرمی کے موسم میں جب وہ کھانے کو بیٹھتا تو مُصیبت آجاتی۔ مکھیاں ناک میں دم کردیتیں۔ ایک منٹ کو چین نہ ملتا۔ اس کے چاروں طرف بھنبھناتی اور اُڑتی رہتیں۔ اور وہ انہیں اُڑاتے اُڑاتے پاگل بن جاتا۔ کھانے پر بیٹھتیں تو اُٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ پریشان ہوکر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ کوئی چیز کھانے کے قابل نہ رہتی۔ بعض دفعہ وہ اس کی ناک پر یا ماتھے پر آجمتیں۔ ڈنک مارتیں اور کاٹتیں چھڑانا مشکل تھا۔

(باقی آئندہ)

فلمی خبریں

(از فصیح الدین احمد ایم ، اے)

(۱) نیو ہنس پکچرس لمیٹڈ کے زیر اہتمام ایک فلم "دروپدی" تیار ہو رہا ہے۔ اس فلم میں مشہور سوشیلا رانی کی اداکاری ارباب ذوق کیلئے خاص دلچسپی کا باعث ہوگی۔ دروپدی کا پارٹ ادا کرنے کیلئے یقیناً ایک شاندار شخصیت کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں دروپدی کے مکالمہ نگار مسٹر جے ، سی کیشپ کا یہ بیان کافی اطمینان بخش ہے کہ اس فلم میں سوشیلا رانی کی ہر ادا سے ایک رانی کا جاہ و حشم ٹپکتا ہے۔ دوسرے اداکاروں میں جیندر موہن ، مظہر خاں ، بابھاؤ ، پندھارکار ، کے ، این سنگھ ، ڈکنسٹ اور پدماد یوی کے نام کچھ کم قابل توجہ نہیں ہیں۔

(۲) جینت دیسائی پروڈکشن کا تیار کیا ہوا فلم جگت راج ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک شائقین سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ اس فلم کا ہر شہر میں خاطر خواہ خیر مقدم ہو چکا ہے۔ ہمیں امید تھی کہ اس فلم کے بعد جینت دیسائی پروڈکشن کوئی اور فلم جلدی پیش کرسکے گا۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ سے لائسنس نہ ملنے کی وجہ سے پروگرام کی تکمیل میں کچھ دیر لگ جائیگی۔

(۳) ہندوستان چترا کے زیر اہتمام کشور ساہو ایک فلم شرارت تیار کر رہے تھے۔ اطلاع ملی ہے کہ یہ فلم نصف سے زیادہ تیار ہو چکا ہے۔ فلم کی بنیاد ایک کامیڈی پر ہے۔ اداکاروں میں خود کشور ساہو اور پرو تما داس گپتا کے نام دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فلم عوام میں بہت مقبولیت حاصل کرے گا۔

(۴) راج لکشمی پروڈکشن بڑے اہتمام کے ساتھ ایک فلم کالی داس تیار کر رہی ہے۔ اس فلم میں مشہور و معروف پہاڑی سانیال اور سینہہ پر بھا پردھان اداکاری کر رہے ہیں۔ کہانی اور اس کے ساتھ اداکاروں کے نام دیکھکر اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ فلم نہایت کامیاب ثابت ہوگا۔

(۵) پردیپ پکچرس ان دنوں ایک نیا فلم "پنا دائی" کی تیاری پر غور کر رہی ہے۔ مسز کملا بائی منگلور کر اس فلم کے سین وغیرہ کے بارے میں دیوان شرر سے مشورہ کر رہی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے وہ آئندہ ماہ سے اس فلم کی تیاری میں منہمک ہو جائیں گی۔

(۶) رنجیت مووی ٹون کا تیار کیا ہوا فلم تان سین کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ "تان سین" کے بعد اس کمپنی کا تیار کیا ہوا دوسرا فلم شنکر پاربتی آرہا ہے۔ اس کے علاوہ ویش کنیا بھی تیار ہے جس میں سادھنا بوس ، پرتھوی راج نے کام کیا ہے۔ کمپنی کے آئندہ پروگرام میں شہنشاہ بابر ، گنیش جنم ، ممتاز اور سیتا ہرن شامل ہیں۔

(۷) نیچولی آرٹ پروڈکشن کچھ عرصہ سے ایک فلم شیریں فرہاد بڑے شاندار انتظامات کے ساتھ تیار کر رہی ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ اب یہ فلم تیاری کی آخری منزل میں ہے۔ اس فلم کی تیاری پر بے دریغ دولت اور محنت صرف کی گئی ہے۔ اس تاریخی ٹریجڈی کو صحیح ماحول اور اس زمانے کے ساز و سامان کے ساتھ پیش کرنا یقیناً کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس بات میں کمپنی نے بڑی کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں اس فلم سے شاندار توقعات وابستہ ہیں۔

(۸) رامنک پروڈکشن اپنے اندھیری کے سٹوڈیو میں ایک فلم کرن تیار کر رہی ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ یہ فلم بہت جلد تیار ہو جائیگا۔ فلم کی بنیاد ایک معاشرتی کہانی پر ہے۔ اداکاروں میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس کے نام دیکھکر اس کی مقبولیت میں کوئی

سے شبہ نہیں ہوجاتا۔ اس کے ساتھ یہ کمپنی عام دلچسپی کا ایک فلم بندوق والی بھی تیار کررہی ہے۔

(۹) نیو کیتھرا پکچرز لمیٹڈ نے ایک تازہ فلم نیا ترانہ کی تکمیل کرلی ہے جو بہت جلد دکھایا جانے والا ہے۔ اس فلم کی روح رواں جیرآج اور سینہ پر بھا ہیں۔ کہانی میں جدید حالات اور واقعات کے تقاضوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جسے اداکاروں نے اور اہمیت دیدی ہے۔

(۱۰) جوبلی فلم ان دنوں ایک پروپیگنڈا پکچر ہٹلر یا بٹلر تیار کرنے میں مصروف ہے۔ اس فلم میں حکومت کی اعانت حاصل کرنے کے لئے کمپنی کے ارباب وحل وعقد کچھ عرصہ ہوا دلی آئے ہوئے تھے۔ ہمیں امید ہے یہ فلم ملک میں فاشسٹ دشمنی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد دیگا۔ اور دلچسپی بھی برقرار رکھے گا۔

(۱۱) اسن رائز پکچرس ان دنوں ایک معاشرتی کہانی ماں باپ کی تیاری میں مصروف ہے۔ جو اپنی آخری منزل میں ہے۔ کہانی گھریلو مسائل سے متعلق ہے۔ اور اس کی تیاری میں پروڈیوسر دی، ایم، دیاس خاص توجہ کا ثبوت دے رہے ہیں۔

(۱۲) انٹرنیشنل تھئیٹرس ایک دلچسپ معاشرتی فلم جدائی تقریباً تیار کرچکی ہے۔ خیال ہے کہ اسی ماہ کی آخری تاریخوں میں ریلیز ہوجائیگا۔

(۱۳) کمل رائے پکچرس کا تیار کیا ہوا شاندار فلم اکبر بمبئی میں بڑی مقبولیت حاصل کررہا ہے۔ اس فلم میں اس زمانہ کی درباری شان وشوکت اور علمی وفنی ماحول پیش کرنے کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔

پروڈیوسر رائے کا آئندہ پروگرام لائسنس نہ ملنے کی وجہ سے ذرا مذبذب ہے۔ ہمیں امید ہے اس عرصہ میں انہوں نے اپنی مشکلات حل کرکے کسی اور فلم کی تیاری کا پروگرام بنالیا ہوگا۔

(۱۴) چندر آرٹ پروڈکشن کی درخواست پر ہندوستان کے مشہور ڈائرکٹر مسٹر جینت دیسائی نے ایک فلم منور ما کا ڈائرکشن منظور کرلیا ہے۔ کہا جاتا ہے اب تک کسی ہندوستانی ڈائرکٹر کو اتنا معاوضہ نہیں ملا ہے جتنا اس فلم کے سلسلہ میں مسٹر جینت دیسائی کو دیا گیا ہے۔ فلم کے اداکاروں میں لیلا چٹنس، ایشور لال، چارلی، مبارک اور ماسٹر جی کے نام قابل ذکر ہیں۔

دلچسپ خبریں

یہ موسم شادی کا موسم رہا ہے۔ اس عرصہ میں بے شمار ہستیوں نے رشتہ ازدواج قبول کیا ہے۔ شادی کی اس خوشگوار نسیم نے فلمی دنیا کو بھی اپنی نشاط سامانیوں سے محروم نہیں رکھا۔ چنانچہ معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ مسز درگا کھوٹے نے جو ایک عرصہ سے بیوگی کی زندگی بسر کررہی تھیں ایک صاحب مسٹر رشید کو اپنا رفیق حیات منتخب کرلیا ہے۔ مسٹر رشید غالباً ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں اور ان دنوں فلائٹ لفٹننٹ کے عہدے پر مامور ہیں۔ مسز درگا کھوٹے اداکار کی حیثیت سے فلمی دنیا میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ اس وقت ان کی عمر اکتالیس سال کی ہے۔ اب دفعتاً وہ مسز درگا کھوٹے سے بیگم رشید بن گئی ہیں۔ اس اتحاد کا ہم انتہائی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔

مس نرمو جو اداکاری اور خاص طور پر گانے کی بنا پر فلمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کرچکی ہیں، اس طرف کچھ عرصہ سے گوشہ نشین تھیں۔ اب شادی کرکے انہوں نے یہ جمود توڑ دیا ہے۔ نئے ازدواجی رشتے کی بنا پر وہ بیگم بھٹو ہوگئی ہیں۔ اطلاع ملی ہے وہ اب اپنی تازہ مسرتوں کے ساتھ دوبارہ بمبئی تشریف لے گئی ہیں۔ امید ہے یہ رشتہ مستحکم اور مضبوط ثابت ہوگا۔

ہر مسئلہ کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ازدواجی زندگی کا کبھی کبھی یہی انجام ہوتا ہے کہ علیحدگی اختیار کرلی جائے۔ ہالی وڈ میں شادی اور طلاق دونوں بہت عام چیزیں ہیں۔ وہاں سے آئے دن اس قسم کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ ہندوستان کی فلمی دنیا بھی غالباً اس راستہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ چنانچہ ہمیں اس حلقہ سے جہاں چند شادیوں کی خبر ملی ہے۔ وہاں ایک طلاق کی بھی اطلاع ملی ہے۔ مسز لیلا گولانی نے جو لیلا چٹنس کے نام سے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ اپنے دوسرے شوہر مسٹر گولانی سے علیحدگی اختیار کرلی ہے اور اپنے خاندانی نام کی طرف رجوع کرلیا ہے۔

نیشنل وار فرنٹ

یعنی

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد تمام عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں:—

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کے لئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بدامنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا۔ اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاش اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور اُن کا انسداد کرنے کیلئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا۔ اور اُن کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمن کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور اُن کی نگرانی کرنا تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چیزوں کو انکی مقررہ قیمت پر فروخت کرنیکا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملہ سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنیکی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا۔ اور اسکے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض و مقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور تعاون کرکے عوام الناس کی فلاح و بہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ راجپور روڈ۔ دھلی

دوائی تحیلہ رجسٹرڈ

کیا ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کی آرزو ہے؟

وہ کون سی خاتون ہے جو نہیں چاہتی کہ اس کی گود ہری بھری رہے۔ دنیا میں اولاد سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ اولاد کے لئے ہزارہا روپیہ صرف کردیا جاتا ہے۔ مرادیں اور منتیں مانی جاتی ہیں۔ گنڈے تعویذ کئے جاتے ہیں۔ لیکن اب بہت کم عورتوں کو اس کا علم ہے کہ **سیلان الرحم** کی وجہ سے اولاد نہیں ہوتی۔ یہ ایک مرض ہے جو خفیہ جسم سے پانی کی شکل میں بہتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شباب آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگتا ہے۔ طبیعت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے۔ بھوک اڑ جاتی ہے۔ قبض رہتا ہے۔ اور جب تک یہ مرض رہتا ہے۔ استقرار حمل ناممکن ہے۔ لہذا **دوائی تحیلہ** مستورات کو استعمال کرائیے۔ جو ندکورہ مرض کو ہمیشہ کے لئے دور کرکے اولاد ہونے کی بشارت دیتی ہے اور ماہواری ایام بھی اس دوا کے استعمال سے درست ہوجاتے ہیں۔ **قیمت بیس خوراک ۸عہ**

ترکیب استعمال دوا کے پیکٹ پر تحریر ہے

مشہور دواخانہ فراشخانہ۔ دہلی

سرتاج مقویات
معجون شتاقل



جریان، رقت، سرعت، کثرت احتلام اور قوت مردی کیلئے حیرت انگیز ہے بے انتہا امساک، طاقت اور سختی پیدا کرتی ہے۔ جوش اور قوت برقرار رکھتی ہے۔ اس کا نسخہ بھی خاندان شریفی کا ایک خاص نسخہ ہے جسکو عالیجناب مسیح الزماں حکیم حاجی محمد فاضل خاں صاحب رئیس اعظم دہلی نے خاص طور پر شمسی دواخانہ کو عنایت فرمایا ہے۔ ترکیب استعمال ۹ ماشہ صبح۔ ۹ ماشہ شام کھا کر دودھ پی لیں قیمت فی ڈبیہ تیس خوراک ۱۲عہ

طبی مشورہ: — اگر کوئی صاحب اپنے مرض کے متعلق خاص طور پر ہم سے یا ہمارے ذریعہ کسی حاذق طبیب سے مشورہ لینا چاہیں تو وہ مفصل حالات خوشخط اور صاف الفاظ میں لکھکر بھیج دیں۔ جواب کے لئے چھ پیسے کے ٹکٹ ڈاک کے ارسال کریں۔ ہم نہایت راز کے ساتھ مشورہ اور تجویز سے اطلاع دینگے پھر اگر مجوزہ نسخہ تیار کرانا منظور ہو تو کارخانہ واجبی قیمت پر اور احتیاط سے اس خدمت کو انجام دیگا لیکن اس صورت میں نسخہ کی پوری قیمت پیشگی آنی چاہیئے۔

شمسی دواخانہ۔ بلی ماران۔ دہلی

خوردنیات

صاف اور ستھری ملتی ہیں

گوئلز رائس ہاؤس. کھاری باؤلی۔ دہلی

سودیشی کپڑا

گوئلز ہاؤس کی دکان سے خریدیں

بردکان نیو فرینڈ اینڈ کمپنی. چاندنی چوک دہلی

گھڑیاں گھنٹے

نیو فرینڈ اینڈ کمپنی چاندنی چوک دہلی کی دکان سے خریدیں

بروا پروڈکشن کی یادگار پیش کش

رانی

جس میں

خود **بروا** اور مشہور و معروف **جمنا**

نے معیاری اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے

اداکاروں میں

کلوتی اور دوسرے نمایاں اداکار بھی

نظر آتے ہیں

میوزک :- کمل داس گپتا (جو جواب میں بھی دھنیں پیش کر چکے ہیں)

ڈائریکٹر :-

پی - سی ، بروا

بروا پروڈکشن کی ایک اور پیش کش

اپنا پرایا

آرٹ اور دلکشی کا مرقع!

اداکاری کا شاہکار!!

جس کی روحِ رواں

بروا - جمنا

اور دوسرے مشہور اداکار ہیں

یہ فلم

موسیقی - فن کاری اور مکالموں کے

لحاظ سے ایک بے نظیر فلم ہے

ہماری کتھا - منوہر پکچرز - رز - دہلی - لاہور اور کراچی

نشانی

جس نے
ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک طوفان برپا کر رکھا ہے
اداکاران۔ راگنی، روپ لیکھا۔ غلام قادر۔
میوزک پیش کردہ:۔ امرناتھ

روپ کے بشوری کی عظیم الشان پیشکش

کوئل

اداکاران۔ غلام قادر

یہ فلم پنجابی زبان میں ہے
اپنی غیر معمولی دلچسپی و دلکشی کے لحاظ سے ہندستان
کے ہر صوبے میں مقبول ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے
یہ فلم
منگتی سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے
عام دلچسپی کو خاص طور پر مد نظر رکھا گیا ہے

من کی جیت

جس میں سحر طراز نینا نے اداکاری کی ہے
ان کے علاوہ
شیام اور دوسرے اداکاروں نے اپنے کمالات پیش کئے ہیں
یہ فلم بہت جلد نظر نواز ہونے والا ہے
اس کے مکالمے اور گیت ملک کے بہترین ادیب
اور شاعروں کی کاوش کا نتیجہ ہیں

تیار ہو رہا ہے! تیار ہو رہا ہے!!

کرشن بھگوان

جس میں
بالکل نئے اور تازہ دم اداکاروں نے
اپنے جوہر دکھائے ہیں

اسٹوڈیو شنکر
دفتر کنسٹنٹ اسکوئر۔ دادر۔ بمبئی

لاہور کراچی۔ بمبئی۔ دہلی

بکنگ کردہ:۔ سلیکٹ اینڈ کمپنی ـــــ دہلی و لاہور

لکشمی پروڈکشنز کی پیشکش

شرافت

جس میں

فلمی دنیا کی مشہور و مقبول ہستی۔ موسیقی و تاثیر کی ملکہ

لیلا دیسائی

نے اپنے کمالات پیش کئے ہیں

اس کے علاوہ

اس فلم میں پہاڑی سانیال کی نغمہ طرازی اور جگدیش سیٹھی

کی اداکاری کا جادو بھی ملاحظہ فرمائیے

ٹرنر سینما دہلی میں چھٹے شاندار ہفتہ میں

بہت مقبول ہو رہا ہے

دوسرے شہروں میں بھی اس فلم نے دھوم مچا رکھی ہے

ہماری بات

جس میں

دنیائے فلم کی مقبول و ہر دل عزیز ہیروئن

دیویکا رانی

ایک عرصہ دراز کے بعد نمودار ہوئی ہیں!

فلم

رقص و نغمہ کا سحر آفریں مرقع ہے

دوسرے اداکار

شاہ نواز۔ ممتاز علی۔ ڈیوڈ۔ بہن بھائی۔ ثریا

راجکماری شکلا۔ اور اودے کمار

پروڈیوسر

ڈائرکٹر — ایم۔ آئی۔ دھرم سی

گیت مصنف

جئینت ڈیسائی کا پاک عبرتناک اور نرالا شاہکار

بھگت پراج

ڈائرکٹر :— جئینت ڈیسائی

(اداکاران) :—

(مرحوم) وشنو پنت پگنیس - واسنتی - ڈیکشت

مبارک وغیرہ

بھگتی سے لبریز گانے —— دلکش رقص

اور

بھگتی کے چمتکار دیکھ کر آپ

محوِ حیرت رہ جائینگے

[illegible] دہلی لکھنؤ اور کانپور	پندرہواں ہفتہ
[illegible] آباد	بارہواں ہفتہ
[illegible] آباد	پانچواں ہفتہ
[illegible]	چوتھا ہفتہ

[illegible] وارڈیا پیرامونٹ پکچرز - دہلی

[illegible] کا معراج صرف [illegible] ہی میں مل سکتا ہے۔
جہاں استاد حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کو [illegible] کی ٹکسالی زبان لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔
صاحب طرز مصنف نے اس کتاب میں [illegible] گل کاریاں کی ہیں جن پر ادب ناز کرے گا۔
اُردو کے طلباء کے لئے عصر حاضر کی یہ بہترین کتاب ہے۔
جس پر سر عبد القادر اور علامہ نیاز فتحپوری نے تقریظیں لکھی ہیں۔
بہترین لکھائی چھپائی، مصور گرد پوش اور مجلد ہونے کے باوجود قیمت صرف دو روپے چار آنے

نگارستان ایجنسی - اُردو بازار - جامع مسجد دہلی

تاجدار رقاصہ

از

فصیح الدین احمد ایم اے

ایلکزینڈر [illegible] ناول کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس ناول کے واقعات کچھ سال قبل مسیح شروع ہوتے ہیں۔ یہ ناول اس زمانے کے حالات کا مرقع ہے جب شرم و حیا کے نام سے لوگوں کو نفرت ہو گئی تھی۔ حسن نسوانی کی پرستش نصب العین رہ گیا تھا۔ لباس سے نفرت اور [illegible] عریانی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ حکومت کے [illegible] عہدے حاصل کرنے اور دونوں ہاتھوں سے پبلک کو [illegible] کے نام سے لوٹ کھسوٹ کر اپنا گھر بھر لیا کرتے۔ نفس پرستی کے انسداد کی ناکام کوشش نے عورتوں کو [illegible] بنا دیا تھا جب زنان بازاری کو پکڑ کر زبردستی [illegible] [illegible] ہونیکی کوشش میں اونچی اونچی دیواروں سے کود کر اپنی جان دے دیتی۔ [illegible] کی سوسائٹی میں ان عورتوں کی جگہ شریف عورتوں نے لے لی۔ اور جو عیب ابتک چھپا کر ہوتا تھا کھلم کھلا ہونے لگا۔ بداخلاقی، سیاسی سازشوں اور [illegible] ایک عورت جس نے اپنی زندگی ایک [illegible] کی حیثیت سے شروع کی تھی بادشاہ سے شادی کر کے ملکہ بن جاتی ہے۔ اور مفسدوں کو کیسی عبرتناک سزائیں دلاتی ہے۔ یہ سب [illegible] پوری جاذبیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ [illegible]

ملنے کا پتہ :— دفتر "ادیب" دہلی

THE 'ADEEB' DELHI

ماہنامہ

ادیب

(دہلی)

فروری ۱۹۳۲ء

جناب نخشب جارچوی



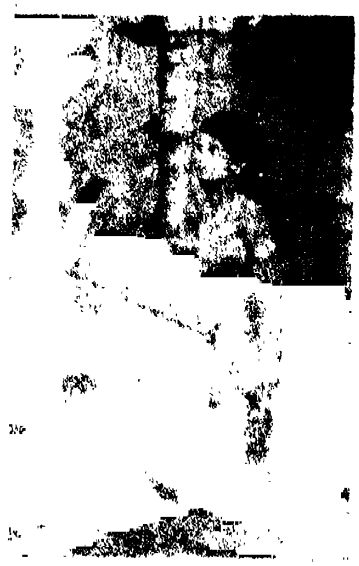
جلد ۶
۲

اڈیٹرز:- فصیح الدین احمد ایم اے، محمد سید ارتضیٰ واحدی

سالانہ چندہ
فی



راہی فلم کی ایک اداکار



مہانما ودر







درگا موٹا
فلم '' پونجی ''
میں

★

قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

سالانہ:- دس روپے علاوہ محصولڈاک

ادیب دھلی

ایڈیٹرز:-
سید محمد ارتضیٰ واحدی
فصیح الدین احمد ایم، اے
(آنسہ) نجمہ تصدق ایم، اے۔ بی ٹی

جلد ۶ فروری سنہ ۱۹۴۴ء نمبر ۴

فہرست مضامین

فصیح الدین احمد ایم اے نے جید برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر "ادیب" چاندنی محل دہلی سے شائع کیا

اشارات

نصیح الدین احمد ایم۔ اے

جنوری میں مسٹر شانتارام ہیڈ ڈیوسر ڈائرکٹر راج کمل کلا مندر دہلی آئے ہوئے تھے۔ وہ دہلی کے ادیبوں سے ملنا چاہتے تھے۔ اس لئے چند صاحبان کو لائبریری میں چاء پر مدعو کیا گیا۔ جس میں چند شعرا اور ادیب موجود تھے۔

مسٹر شانتارام اپنے نئے فلم کے لئے کسی ایسے شاعر کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے جو عام فہم گیت ہندوستانی زبان میں لکھ سکے۔

ان کی نظر انتخاب مسٹر نخشب جارچوی پر پڑی اور اُن سے معاہدہ کر لیا گیا۔ نخشب صاحب فی الحال چھ ماہ کے لئے مسٹر شانتارام کے سٹوڈیو میں چار سو روپے ماہوار پر کام کریں گے۔ اور ممکن ہے اُن کے تقرر میں مزید توسیع بھی ہو جائے۔ نخشب کی موہنی صورت، ہر دلعزیزی اور شگفتہ اور سلیس کلام نے ان کو پہلے ہی سے ادبی حلقوں میں ممتاز بنا دیا تھا۔ ریڈیو سے بھی اکثر ان کا کلام براڈکاسٹ ہوتا تھا۔ ہمیں اُمید ہے کہ فلمی دنیا میں داخل ہو کر یہ فلمی دنیا کے معیار موسیقی کو بھی بلند کرنے میں کامیاب ثابت ہونگے۔

حضرت جگر مراد آبادی بھی جنوری میں دہلی آئے تھے۔ لائبریری کے ایک ادبی جلسے میں ان کو چاء کی دعوت دی گئی۔ چاء کے بعد شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ اور آخر میں جگر صاحب نے بھی تین غزلیں اپنے مخصوص انداز میں پڑھکر سنائیں۔ ان میں سے ایک غزل ناظرین "ادیب" کیلئے اسی شمارہ میں شائع کی گئی ہے۔

جگر صاحب کی زبانی یہ معلوم ہو کر بڑی حیرت ہوئی کہ آل انڈیا ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے گانے کے پروگرام کے لئے بعض شعرائے کرام کی غزلیں اور گیت اِن شرائط پر حاصل کی ہیں کہ ایک دفعہ براڈکاسٹ کی ہوئی غزل یا گیت کا معاوضہ مصنفوں کو حسب مراتب آٹھ آنے یا چار آنے دیا جائے گا۔ بعض شعرائے ان شرائط کو اس خیال سے منظور کر لیا ہے کہ ان کی ایک ایک "چیز" مختلف اسٹیشنوں سے کئی کئی بار گائی جا سکتی ہے۔ اور اس طرح ایک معینہ میعاد میں ایک اچھی خاصی رقم معاوضہ میں مل جائیگی۔ اِن امکانات کے باوجود ایک براڈکاسٹ کی ہوئی غزل کا معاوضہ ایک ممتاز شاعر کو چار آنے یا آٹھ آنے پیش کرنا نہ صرف شعر و ادب کی توہین ہے۔ بلکہ یہ سخت مضحکہ خیز پیشکش ہے۔

پچھلی اشاعتوں کی طرح ادیب کی موجودہ اشاعت میں بھی ناظرین کو مضمون نگار حضرات و خواتین کی ادبی کاوشوں کا خوشگوار امتزاج ملے گا۔ مضامین میں خواجہ محمد شفیع صاحب کا مضمون ہماری رسومات کا فلسفہ خاصے کی چیز ہے۔ علامہ سیماب کی کتاب "التسلف" کا سلسلہ اس اشاعت میں بھی جاری ہے۔ ہماری اس اشاعت میں شاید حصہ نظم ناظرین کیلئے خاص طور پر جاذب توجہ ہو۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا منظوم ترجمہ ان کی قادر الکلامی کا آئینہ ہے۔ حضرت جگر مراد آبادی اور اختر شیرانی کی غزلیں اپنے انداز مخصوص سرمستی رکھتی ہیں جو تغزل کی جان ہے۔ انکے علاوہ ترقی پسند شعرا میں علی جواد زیدی نے اپنی "نظم لٹا جاتا ہوں میں" "جیسا پہلی دفعہ یاد کیا ہے۔ خواتین کے مضامین نظم و نثر اپنا مخصوص معیار رکھتے ہیں۔

از فصیح الدین احمد ایم، اے

نئی کتابیں

(۱) اعمال نامہ

از سر سید رضا علی۔ کے۔ ٹی سی، بی۔ اے۔ ایم۔ ایل، ایے

شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دلی - قیمت مجلد آٹھ روپے۔

بہت سے لوگ سر سید رضا علی کو صرف "سر" کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ بعض لوگ موصوف سے ایک با اثر اور با رسوخ انسان کی حیثیت سے واقف ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی سیاسی دلچسپیوں کی وجہ سے ان سے واقف ہیں۔ اہلِ ذوق کا ایک طبقہ انہیں مشاعروں کے ایک نہایت کامیاب اور مقبول صدر کی حیثیت سے جانتا ہے۔ در اصل ان کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے اور ان کے مشاغل میں اتنا تنوع ہے کہ ان کے جاننے والوں کی تعداد بھی بہت ہے اور جاننے کی نوعیتیں بھی مختلف ہیں۔ مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وہ نہایت پاکیزہ ذوق رکھنے والے اہلِ قلم اور ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ اور اس حقیقت کا انکشاف خود موصوف نے اپنی کتاب "اعمالنامہ" میں کیا ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ جن لوگوں نے سر سید رضا علی کو بہت قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں مشرقی مغربی کلچر کا نہایت خوشگوار اور دلآویز امتزاج ہے۔ ایک طرف اگر وہ انگریزی علوم و ادبیات میں شغف رکھتے ہیں تو دوسری طرف فارسی ان کے دل و دماغ میں رچی ہوئی ہے۔ ان خصوصیتوں کا ان کی کتاب "اعمال نامہ" میں جا بجا اظہار ہو رہا ہے

کتاب بظاہر مصنف کی سوانح حیات ہے۔ مگر یہ در حقیقت زندگی کے واقعات و حوادث کا ایک خشک مرقع یا ریکارڈ نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے اور جو کچھ ہے وہ سب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کتاب ۵۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور چودہ ابواب میں منقسم ہے۔ یہ تقسیم زندگی کے مختلف دور اور اس کی نوعیت کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ گرد و پیش کے حالات اور شخصیتوں پر نہایت جامع تبصرہ بھی کیا ہے۔ جس میں تذکرہ و تنقید کے ساتھ ساتھ ایک افسانوی کیفیت بھی ملتی ہے۔ کیونکہ ہم اس دور کے حالات اور ان شخصیتوں سے بہت دور کی واقفیت رکھتے ہیں۔ کتاب میں پچھلی نصف صدی کے سیاسی علمی و ادبی معرکے، اس دور کی مختلف تحریکیں، سر بر آوردہ علماء، لیڈر، حکام، ادیب و شعرا کے متعلق معلومات، ادبی چٹکلے غرض کیا کچھ نہیں ملتا۔ اسلوب دلکش و دلآویز ہے۔ اس کی تہ میں مزاح کی لطیف چاشنی بھی ہے۔ اور یہ خصوصیت تو خود کتاب کے نام میں جھلک رہی ہے۔ بلاشبہ یہ اپنی نوعیت کی اردو میں پہلی سوانح حیات ہے جو یقیناً ہر حلقہ میں دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھی جائیگی۔

---

(۲) پوشیدہ محل

مترجمہ چندر بھوشن سنگھ

انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد (قیمت درج نہیں)

انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد کو بعض اچھی ادبی و سیاسی کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے علاوہ اس پریس سے عام دلچسپی کی کتابیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "پوشیدہ محل" آخر الذکر سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک جاسوسی ناول کا ترجمہ ہے۔ جس میں نام، جگہیں اور ماحول تبدیل کرکے مقامی رنگ دیا گیا ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو ایک جاسوسی ناول میں پائی جاتی ہیں۔ پیچیدہ گتھیاں اور عقدے پھر ان کا حل، تلاش و تجسس، حیرت میں ڈال دینے والے واقعات و حوادث، سربستہ رازوں کا انکشاف،

ناکامی اور ناکامی کے بعد پھر کامرانی، یہ سب باتیں اس ناول میں مخصوص ترتیب کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ناول پلاٹ کے اعتبار سے دلچسپ ہے اور اُمید ہے جاسوسی ناولوں کے شائقین اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔

---

(۳) لالہ و گل از سید مجاہد حسین کاظمی

شائع کردہ انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد۔ قیمت ۱۲ ار

"لالہ و گل" کاظمی صاحب کے نو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے افسانے زندگی کے اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب ساری کائنات "لالہ و گل" میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جوانی، حُسن اور عشق ہمیشہ کے ساتھی ہیں۔ زندگی یہ تینوں رومان خیز حقیقتیں کتنے افسانے بنا چکی ہیں۔ کاظمی صاحب کا موضوعِ سخن بھی یہی حقیقتیں ہیں۔ اور اسی لئے یہ افسانے تمام تر رومانی ہیں۔ لیکن انہوں نے اُن کشمکشوں اور رُکاوٹوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو سماج جوانوں کی راہ میں پیدا کر دیا کرتا ہے۔ اس لئے اِن کہانیوں میں مُصنّف کا جذبہ خلوص نمایاں ہو جاتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ جنت تخیل کی نظر فریبیوں سے بچنا آسان نہیں پھر بھی کاظمی صاحب نے سنبھل سنبھل کے قدم اُٹھایا ہے۔ ان میں صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور سماجی مسائل کا مطالعہ جتنا گہرا ہوتا جائیگا ان کی تحریروں میں پختگی آتی جائے گی۔ یہ مجموعہ غالباً مُصنّف کی پہلی کوشش ہے اور کئی حیثیتوں سے بہت کامیاب ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ مجموعہ عام طور سے پسند کیا جائیگا۔

---

(۴) پتھر سے ہیرا از ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

شائع کردہ احمد مجتبیٰ برادرز بفرمائش نیا کتاب گھر دلی

قیمت دو روپے

زیرِ نظر کتاب ایک سچا تبلیغی افسانہ ہے جسے ڈاکٹر سعید احمد بریلوی نے اپنے مخصوص انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اس افسانے میں ایک یتیم بچے کی کشمکشِ حیات دکھائی گئی ہے۔ افسانے میں زندگی کی ایک سچی تصویر ملتی ہے۔ کس طرح ایک لاوارث و بے مددگار لڑکا بُری صحبت میں پڑ کر خراب ہو جاتا ہے۔ اور پھر کون سے حالات پیش آتے ہیں۔ اور کس قسم کی تربیت اُسے حاصل ہو جاتی ہے۔ جن کی بنا پر اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور پھر وہ دیانت، ایمانداری اور جفاکشی کے ساتھ زندگی کے حوادث کا مقابلہ کرتا ہے اور آہستہ آہستہ بامِ عروج پر پہنچتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی نوعیت کا نہایت سبق آموز افسانہ ہے۔ زبان نہایت صاف ستھری اور دلکش ہے طرزِ تحریر کی سادگی اور دلکشی نے اسلوب

اور زیادہ خوشنما بنا دیا ہے جو پڑھنے والے کے دل پر یقیناً ایک گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں علامہ راشد الخیری صاحب کی ایک مختصر تقریظ بطور تعارف کے شامل ہے جس میں اجمالاً کتاب کی خوبیوں اور اسکی اخلاقی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

---

(۵) چاند سورج کی چوری از محمد رحیم چمن دہلوی

شائع کردہ نیا کتاب گھر دہلی

قیمت دو روپے

اُردو میں اب تک جتنے جاسوسی ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر یا تو انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں یا پھر ان سے ماخوذ ہیں۔ اس نوع کے طبعزاد ناول بہت کم ہیں گے اور اسکی وجہ صاف ہے۔ جہاں جرائم کی نوعیت پیچیدہ یا سائنٹفک ہوتی ہے وہاں تفتیش و تحقیق کے طریقے بھی ترقی یافتہ اور سائنٹفک ہوتے ہیں۔ یہاں جرائم سادہ اور واضح قسم کے عمل میں آتے ہیں اور اسی اعتبار سے تحقیقات کے طریقے بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا ناول جاسوسی لکھنے کیلئے جس میں حیرت انگیز گتھیاں ہوں لکھنے والے کو تجربہ اور مشاہدہ سے زیادہ تخیل سے کام لینا پڑیگا۔ اور زیرِ نظر کتاب کے مصنف چمن صاحب نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہرچند اس ناول میں انگریزی جاسوسی ناولوں کے مطالعہ کی جھلک ملتی ہے۔ مگر بایں ہمہ اسکے طبعزاد ہونے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ ناول پلاٹ کے اعتبار سے یقیناً دلچسپ۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔

(۶) سوسائٹی کے گناہ از حکیم یوسف حسن

شائع کردہ ہندوستانی لٹریری کمپنی لاہور۔ قیمت ۸ر

ادبی حلقوں میں حکیم یوسف حسن صاحب ادیب سے زیادہ ایک اڈیٹر کی حیثیت سے روشناس ہیں۔ وہ نیرنگِ خیال کے ایڈیٹر ہیں جو بہت شاندار ماضی رکھتا ہے اور ایک زمانہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ حکیم صاحب نے ایسے شاندار سالنامے شائع کئے ہیں جنکے نقوش آج تک دلوں سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ انہوں نے خود کم لکھا مگر اچھے اچھے اہلِ قلم سے سب کو روشناس کرایا ہے اور بہتوں میں لکھنے کا شوق پیدا کیا ہے۔ یہ انکی کیا کم ادبی خدمت ہے۔ کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ انہوں نے شذرات کے علاوہ افسانے بھی لکھے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "سوسائٹی کے گناہ" ان کے ۱۵ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے ان مظالم اور ان اخلاقی جرائم کی داستانیں ہیں جو موجودہ سماجی نظام میں آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ افسانے فنی اعتبار سے تو کوئی بلند ادبی معیار نہیں رکھتے۔ مگر بہت سے لوگ شاید انہیں دلچسپی سے خالی نہ پائیں۔ کچھ لوگ لطف و تفریح کے لئے ان کا مطالعہ کرینگے۔ کچھ لوگ شاید ان سے سبق اور عبرت بھی حاصل کریں۔

---

(۷) سیّدہ کی بیٹی از رازق الخیری
شائع کردہ عصمت بکڈپو دہلی ۔ قیمت عہ

اگرچہ اُردو زبان میں مذہبی ادب کی فراوانی ہے ۔ لیکن ابھی تک حضرت زینبؓ کی کوئی ایسی مستند سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی جس میں ان کے حالات زندگی پر تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو ۔ مولانا رازق الخیری نے یہ کتاب لکھکر ادب و تاریخ کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے ۔

ایسی صورت میں کہ عربی یا فارسی میں بھی حضرت زینبؓ کے حالات کہیں یکجا صورت میں نہیں ملتے ۔ مصنف کو مواد فراہم کرنے اور اسکو ترتیب دینے میں جس دقت کا سامنا ہوا ہوگا اس کا اندازہ تاریخی شہادتوں کے ان اختلافات سے ہوسکتا ہے جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے ۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے ان اختلافات کو سلجھانے میں بڑی دقت نظر کا ثبوت دیا ہے ۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی پڑھنے والوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ حالات کا جائزہ سو فی صدی تاریخی اعتبار سے لیا گیا ہے ۔ اور ان پر نفسیات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے ۔

مصنف کی مصنفانہ صلاحیتوں کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ انکی ادبی صلاحیتوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں ۔ خصوصاً کتاب کا اسلوب بیان سادہ اور دل نشین ہے ۔ دلّی کی نکھری ستھری اور پاکیزہ زبان کی چاشنی کی وجہ سے انداز بیان میں ایک عجیب سلجھاؤ اور نکھار پیدا ہوگیا ہے ۔ کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سوانح عمری جیسے خشک موضوع کے باوجود اس میں شروع سے آخر تک ناول کی سی دلچسپی پائی جاتی ہے ۔

---

(۸) ثمرۂ ایثار ترجمہ از ہندی ۔ مترجم چندر بھوشن سنگھ
شائع کردہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد ۔ (قیمت درج نہیں)

زیر نظر کتاب ہندی کے ایک ناول "تیاگ کا مولیہ" کا ترجمہ ہے ۔ یہ ناول مسٹر سری چند اگنہوتری کی تصنیف ہے اور مخصوص ہندوستانی پس منظر رکھتا ہے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ بنگالی زبان کے بے شمار افسانوں کا اُردو میں ترجمہ ہوچکا ہے لیکن ہندی کی طرف لوگوں نے کم توجہ کی ہے ۔ ہرچند یہ زبان اُردو سے بہت زیادہ قریب ہے ۔ اور موجودہ حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ انہے اور زیادہ قریب لانا چاہیئے اس طرح ہندی اور اُردو کے لکھنے والے نہ صرف ایک دوسرے کے خیالات اور مسائل سے واقفیت حاصل کرسکیں گے بلکہ اس سے اس مشترکہ زبان کے ارتقا میں بھی مدد ملیگی جسکے لئے ایک طبقہ سخت جدوجہد کررہا ہے ۔ اور جو واقعی ایک قومی اور ملی ضرورت ہے ہمیں خوشی ہے کہ مسٹر چندر بھوشن سنگھ نے اس طرف توجہ کی ۔

زیر نظر ناول میں ہندو سماج کے ایک خاص طبقہ کی زندگی اور اس کے تضاد ملتے ہیں ۔ جگہ جگہ ذات پات کی تقسیم سے پیدا ہونے والے اُلجھاوے نظر آتے ہیں ۔ ناول مجموعی حیثیت سے مخصوص اخلاقی اور اصلاحی رنگ رکھتا ہے ۔ اس ناول کا ہیرو ذات پات کی تقسیم کی بنا پر جو جذباتی قربانی کرتا ہے اُسے موجودہ نوجوان طبیعتیں کہاں تک قبول کرسکتی ہیں ۔ یہ البتہ مشتبہ ہے ۔

ہماری رسومات کا فلسفہ

(از جناب خواجہ محمد شفیع بی اے)

نوٹ :- خواجہ محمد شفیع صاحب کی زبان انکی مخصوص طرز ادا اردو ادب میں مستند نمبر رکھ چکی ہے۔ انکی منفرد معاملہ سنجی نئی تشبیہوں اور استعارات سے مرصع ہوتی ہے انکی خصوصیت بن چکی ہے سنجیدہ اور خشک مضمون کو دلچسپ اور شگفتہ پیرایہ میں بیان کرنے کا جو ملکہ انکو حاصل ہے اسکا اندازہ ناظرین زیر نظر مقالہ سے خود لگا سکتے ہیں (محی الدین احمد)

ہر ملک ہر خطہ اور ہر علاقہ کی پیداوار اس جگہ کی ضروریات اور حالات کے مطابق ہوتی ہے۔ علی ہذا القیاس ۔ ذہن انسانی کی تخلیق کردہ ہیں ماحول کے مطابق اختراع کی جاتی ہیں۔ جیسے رہن سہن ۔ طور طریقہ ۔ طرز معاشرت ۔ محاورہ ۔ ادب ۔ پوشاک و مکانات ۔ حالات مقامی سے آمیز ہوتے ہیں پھر رسومات کا تو پوچھنا ہی کیا ۔ یہ تو بدرجہ اتم گرد و پیش کی عکاسی اور ماحول کی آئینہ داری کرتی ہیں ۔

اگر کسی قوم کی ذہنیت ۔ معاشرت اور دماغی تربیت کا پتہ لگانا ہو تو اس کی رسومات کو بنظر غور دیکھئے ۔ حالات اظہر من الشمس ہو جائیں گے ۔ اس قوم کی دماغی کیفیت آپ کے لئے کھلی ہوئی کتاب ہوگی ۔ آپ سمجھ جائیں گے کہ ان کی مالی حالت کیسی تھی ۔ دماغی تربیت کس قسم کی ۔ ماحول کیا تھا اور تعلیم کہاں تک ۔ پس ہماری رسومات بھی ہمارے سماج کا نمونہ ہیں ۔

ہم پر ایک دور ایسا آیا کہ ہر ہندوستانی چیز نظروں سے گر گئی ۔ دلوں سے اتر گئی ۔ ہم الناس علی دین ملوکہم کی تفسیر بن گئے ۔ خذ ما صفا و دع ما کدر سے کوسوں دور جا پڑے ۔ بلا امتیاز خوش و ناخوش اپنی ہر بات مردود قرار دے دی ۔ اور حاکم کی ہر ادا محبوب ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیوکن عقل مغربی اثرات نئے نئے ہماری زندگی میں داخل ہوئے تھے ۔ "کل جدید لذیذ" کا اثر تھا ۔ مزید برآں حاکمانہ آب و تاب نے آنکھیں چندھیا دیں ۔ عقلوں پر فانوس ڈھک دیئے ۔ نگاہ امتیاز و تنقید پر حاکم پرستی کی دھندلی عینک چڑھا دی ۔ دماغوں پر احساس کمتری طاری عقدہ ارتذالی (Inferiority complex) مائنڈ ۔

[illegible] ہمارا پان جو وجہ شرع رسی ہے روسیاہ قرار پایا اور چونکہ گم جو چبانے والے کا چہرہ بگاڑ دے پسند خاطر ۔ حقہ جس میں تمباکو کا دھواں مدبر ہو کے چھن کر دل تک آئے جسکا تمباکو گڑ کی آمیزش سے اصلاح پائے زمانہ جاہلیت کی بولتی نشانی تسلیم کیا گیا اور سگریٹ جو ان تمام خوبیوں سے معرا شب و روز چمنی کی طرح منہ سے لگا رہے ۔

کشیدہ چادر جوڑا جسے امریکنز آنکھوں سے لگائیں ۔ انگریز سونے کے مول خریدے جاتے زمانہ ماسبق کی رنگین یادگار ہو گیا ۔ اور کبھی تھا یہی نوٹیڈ دل کو بہانے ۔ غرض اپنی ہر چیز مورد صد لعنت اور دوسروں کی ترہات وجہ ہزار آفریں ۔ از آن جملہ ہماری رسومات بھی شکار صد لعن و طعن ہوئیں ۔ اور مغربی جدت پسند نے مرقع الظلم قرار دیا ۔ اور ایک قلم لباس کی صورت اتار پھینکا ۔

آہستہ آہستہ جب نگاہیں اس مغربی غریب شفقی کی عادی ہو گئیں اور کچھ نظر آنے لگا ۔ دماغ نے جھرجھری لی ۔ نگاہ مبصر نے آنکھ کھولی تو نظر آیا کہ نہ ان کی ہر چیز اچھی تھی نہ ہماری ہر بات بری ۔ اگر ہمارے ہاں کچھ خامیاں تھیں تو ان کے ہاں بھی عیوب موجود ۔ اگر ہمارے پردے اور حجابات فضا میں تیرگی پیدا کر رہے تھے تو ان کے ہاں بے پردگی صنف نازک کو عریانی کی سرحدوں تک لا رہی تھی ۔ گھر کی زینت بازاروں میں آ رہی تھی ۔ عورت کی فطری حیا سر راہ ذبح کی جا رہی تھی ۔ جامہ شرم ہول روز میں اتارا جا رہا تھا ۔ عورت کا مجسمہ حجابات سے صفر نظر آ رہا تھا ۔ اب جو اپنی رسومات پر نظر غیر متعصب و غیر مرعوب ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ محض جہل و اسراف پر مبنی نہ تھیں بلکہ عقل سلیم و ادراک دوررس کو بدرجہ اتم دخل تھا ۔

بندہ نواز جس طرح عبارت سیاق و سباق سے سمجھ میں آتی ہے ۔ بعینہ تہذیب و تمدن سے متعلق ہر چیز اس ہی ماحول کے پس منظر میں سمجھی جا سکتی ہے ۔ حتی کہ اکثر الفاظ و اصطلاحات کا صحیح ادراک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ جس ماحول میں وہ اختراع ہوئے ہوں اس کا صحیح شعور نہ ہو ۔ مثلاً انگریزی میں "پگ" (Peg) [illegible] کے معنی کیوں دیتا ہے ۔ یا فارسی میں زیادہ پینے والے کو سرشار کیوں کہتے ہیں ۔ ان الفاظ کی فہم و تفہیم سے آپ بے بہرہ رہیں گے اگر یہ معلوم نہ ہو کہ انگلستان میں شراب کاٹھ کے پیالوں میں پی جاتی تھی ۔ اور اس میں پیمائش کے لئے کھونٹیاں گڑی ہوتی تھیں ۔ یہ لفظ اس دور کی نشانی ہے ۔ ایران جو مانی و بہزاد کا ملک تھا وہاں جام پر مورت کا مجسمہ بنا ہوتا تھا اور وہی پیمانہ کا کام دیتا تھا ۔ کوئی تا ساق پیتا کوئی تا کمر ، کوئی تا گلو تو کوئی تا سر ۔ آخر الذکر سرشار کہلاتے تھے ۔

اب ہم نے دیکھ لیا کہ الفاظ و اصطلاحات بھی معاملات ماحول کے بغیر صحیح معنی نہیں دیتے ۔ پس کسی قوم کی رسومات سمجھنے کے لئے اس کے گرد و پیش کو سمجھنا از بس ضروری ہے جس میں وہ رسمیں تخلیق پذیر ہوئیں ۔

دیکھنا یہ ہے کہ جس زمانہ میں یہ رسمیں بنیں اور جس دور میں ان پر عمل ہوا رہا اس وقت کے حالات ان کے متقاضی تھے یا نہیں ۔ پہلے شادی کی رسموں کو لیجئے چونکہ ان کا مرکز بیش از بیش دلہن ہوتی ہے اس لئے لازم آتا ہے کہ ہم اس دور کی

ذہن کو سمجھیں اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ اس کے لئے یہ رسومات ضروری تھیں یا نہیں۔

اس لڑکی کا تصور کیجئے جو ہو ذریعے میں پلی ہو۔ مرد تو مرد جس کی صورت کسی غیر عورت نے نہ دیکھی ہو۔ جس کے خاندان کی عورتوں کا جنازہ رات کو گھر سے نکلے کہ نامحرم کی نظر نہ پڑسکے۔ جس کے کپڑے یا گھر میں دھلتے ہوں یا جلا دیئے جاتے ہوں۔ بہر نوع گھر سے باہر نہ جاتے ہوں۔ سات برس کی عمر کے بعد سے جس کے سر سے دوپٹہ نہ سرکا ہو جو چاندنی رات میں انگنائی میں زیر آسمان نہ سوئی ہو۔ جس پردہ نشین کے پردہ گوش غیر مرد کی آواز سے آشنا نہ ہوئے ہوں، جسے آنکھوں میں رکھا گیا ہو۔ جسے چار دیواری میں پالا گیا ہو۔

جو اس گھر میں پروان چڑھی ہو جہاں سے ماما ایک مرتبہ آ کر مر کر باہر نکلے۔ جہاں چھپا ہوا کاغذ پڑیا کی شکل میں بھی گھر میں نہ جا سکے۔ مبادا آزہر عشق۔ بہار عشق یا کسی اور ایسی ویسی کتاب کا ورق نہ ہو اور بال بچوں کی آنکھ اس پر پڑ جائے۔ جہاں احتیاط کا یہ عالم کہ بیاہی ہوئی لڑکیوں میں کواری بچیاں نہ بیٹھ سکیں۔ جہاں مرغا مرغی یک جا نہ پالے جائیں۔ جہاں کبوتروں کے جوڑے رہنے نہ پائیں۔ جہاں پرندہ پر نہ مارے۔ غیر عورت کا گذر نہ ہو۔

اس ماحول۔ اس فضا اور اس گردو پیش میں پلی ہوئی لڑکی ہے۔ اب خدا رکھے جوان ہونے آئی۔ بادشاہ وزیر اپنی لڑکیوں کو نہ بٹھا سکے۔ یہ پرایا دھن ہے۔ پالا پوسا حوالہ کیا۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ جو عصمت مآب ان حالات میں پرورش کی گئی ہو اُسے اچانک غیر مرد کے حوالہ کر دینا کہاں تک قرین مصلحت ہے۔ صحیح کہ اختلاط جنسی فطری شے ہے لیکن ہم آپ کہتے ہیں کہ کسی انسان کے نوزائیدہ بچے کو اندھیرے میں رکھئے۔ سال چھ مہینے گذر جانے پر دھوپ میں نکال لائیے اس کا ہیش از ہیش بینائی کھو دینے کا امکان ہے۔ انہی کاوش کیوں کیجئے سینما دیکھ کر جب آپ باہر نکلتے ہیں اس وقت آنکھوں کی حالت پر غور کیجئے۔ کیوں صاحب آنکھیں فطرتاً اندھیرا اُجالا دونوں دیکھنے کیلئے تخلیق کی گئی ہیں پھر یہ تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اور کاردان مالکان سینما اول و آخر روشنی دینے اور بند کرنے میں احتیاط کیوں برتتے ہیں۔ بندہ نواز! اعصاب انسان ایسے زود تغیرات کے لئے تخلیق نہیں کئے گئے۔

اب خیال کیجئے اس لڑکی کا جو محولہ بالا ماحول میں پلی ہو اور سوچئے کہ اگر اسے اچانک ایک غیر مرد کے حوالہ کر دیا جائے وہاں ان دو کے سوا اپنا بیگانہ کوئی نہ ہو تو کیا اس کے ہول سے مر جانے کا امکانات نہیں ہیں۔ نیز یہ نظر انداز نہ کیجئے کہ اسے اسی وقت ازدواجی منازل بھی طے کرنی ہیں اور یہ نہ بھولئے کہ زیر بحث لڑکی کے عالم تخیل میں بھی یہ سماں نہیں آئی تھی۔ اس لئے کہ جن حالات میں اسکی پرورش ہوئی ہے ان میں دماغ کا ادھر منتقل ہونا ممکن الوقوع نہیں۔

بندہ پرور! کلی کا پھول بننا عین فطرت ہے۔ لیکن پھر بھی قدرت علی الصباح انہیں کھلاتی ہے۔ جبکہ شبنم تمام شب انہیں مائل بہ نمو کر چکی ہوتی ہے اور نسیم صبح گاہی راجع بہ شگفتگی کر رہی ہوتی ہے۔

پس جس طرح مادر قدرت غنچہ کو کلی بنانے سے قبل اہتمام کرتی ہے بعینہ لڑکی کے ماں باپ بھی اپنی نازوں اور احتیاطوں کی پالی کو ازدواجی زندگی میں داخل کرنے کے اہتمام کرتے ہیں۔ انہی انتظامات کو عرف عام میں رسوم سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لڑکی خیر سے چودھویں میں لگی۔ ماں باپ کو فکر پڑی۔ ڈھیلا ڈھیلا مجنوں کا سا کرتہ بھی آثار شباب نہ چھپا سکا۔ بغیر آرائش جوانی اپنی زیبائش دکھانے لگی۔

جس گھر میں بیری ہوتی ہے پتھر آتے ہی ہیں لڑکی کی نسبتیں آنی شروع ہوئیں۔ ماں باپ نے مشورے کئے۔ کھاتا پیتا، بڑی بوٹی سے درست گھرانا دیکھ ہامی بھر لی۔

نسبت پکی کرنے لڑکے والیاں آئیں۔ پھولوں کا گہنا انگوٹھی چھلا ساتھ لائیں۔ لڑکی پہلی مرتبہ اُن کے سامنے کی گئی۔ معلوم رہے کہ لڑکی پہلے سے نہیں دکھائی جاتی تھی۔ پرانے گھرانوں میں دستور تھا کہ جہاں گھر میں کسی غیر بیوی نے قدم رکھا اور کنواری بچیاں کونے میں منہ چھپا کر جا بیٹھیں۔ کیا مجال جو کسی کی نظر پڑ جائے۔ لڑکے والیاں جب منگنی کرنے آتی تھیں اس وقت پہلی مرتبہ لڑکی اُن کے سامنے کی جاتی تھی۔ اس وقت یہ عورتیں انگوٹھی چھلا بھی اپنے ہاتھ سے پہناتی تھیں اور پھولوں کا گہنا بھی۔ یہ عمر میں پہلی مرتبہ ہے کہ غیر عورت نے اس کے اچھوتے بنڈے کو ہاتھ لگایا اور غیر گھر کی چیز اس کے گلے کا ہار ہوئی۔ نیز پہلی مرتبہ بچی نے پھول پہنے عطر ملا۔ کواری بچی نہ پھول پہن سکتی تھی نہ عطر بسا سکتی تھی۔ اب نئی زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔ پسند فطرت جدتوں اور ہدعتوں سے ابتدا کی جا رہی ہے۔ اُسے خوشنما طریقے سے جتایا جا رہا ہے کہ اب ایک نئی دُنیا میں داخل ہونا ہے۔ حیات نو کی ابتدا ہے۔ جو چیزیں اب تک تم پر منع تھیں روا کی جا رہی ہیں۔

غیر عورتوں کا اس طرح پھول پہنانا دل پر گراں گذرا طبیعت نے بوجھ محسوس کیا۔ لیکن اپنا گھر ہے اپنے گھر بیٹھے ہیں۔ ڈھارس بندھ گئی۔ بچی نے پہلی منزل بہ احسن الطریق طے کر لی۔

سال دو سال نسبت رہی۔ حصہ بقرہ آتے جاتے رہے۔ لڑکی کے کان میں سسرال کا لفظ پڑتا رہا۔ ہم عمر ہمجولیوں نے شرما لجا آنکھیں نیچی کرا کے دو مرتبہ دولہا کا نام بھی لے دیا۔ یہ حیا پرندہ زمین میں گڑ گئی۔ لیکن قوت متخیلہ رو بکار

ہے... خوشی ہے کہ اپنے گھر کی ہوئی۔ محنت ہے کہ کیسے رنگ

... ہے کہ خوشی رہے گی۔

غرض دل پر پتھر رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ دیا۔ بیٹا بسم اللہ کرو۔ [illegible] کوشش کیجئے۔ دیکھنا ! میری نازوں کی پالی ہے۔ اب خدا پر بھروسہ ہے یا تم پر۔ داماد نے نیچی نگاہیں کئے ہوئے کہا میں ہمیشہ کے لئے غلام ہوں۔ آپ دل بھاری نہ کریں۔ دولھا کی ماں نے سمدھن کو گلے سے لگایا اور کہا بہن میرے آگے بھی اللہ کی دی ایک چھوڑ دو دو بیٹیاں ہیں تم اطمینان رکھو۔ انشاء اللہ چاہا تو آنکھوں کا تارا بنا کر رکھوں گی۔

دولھا نے دولہن کو گود میں اٹھایا۔ گھر میں کہرام پڑ گیا۔ وہ سے چچا۔ یہ روتے رہ گئے۔ بھئی یہ ہی ہے کہ بیٹی تو اب اس کی ہے ہم روک سکتے تھے روک نہیں سکتے۔

ڈومنیوں نے حضرت امیر خسرو کا سنہ ڈھالا گانا شروع کیا ۔

کاہے کو بیاہی بدیس رے سکھی بابل مورے

کاہے کو بیاہی بدیس

ہم تو ری بابل محلوں کی چڑیاں

بھور بھئے اڑ جائیں رے سکھی بابل مورے

کاہے کو بیاہی بدیس

سسر نے تمام راستہ فینس پر سے روپیہ نچھاور کئے۔ پھولے ہیں خیرات ہو رہی ہے۔ خدا نیک قدم کرے۔ پر وہ پکڑے لکڑی ٹیکے ساتھ ہیں احباب نے کہا بھی تھک جاؤ گے۔ بولے خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔ میرا منہ اس قابل کب تھا۔

فینس دروازہ پر لگی۔ زنانہ کروایا گیا۔ ساس نے دودھ سے پیر دھلائے زبان بے زبانی سے کہہ رہی ہیں۔ بیٹی تو جب اپنی ماں کے گھر اول دن آئی تھی اس نے دودھ پلایا تھا۔ میں تیرے قدموں پر نثار کر رہی ہوں۔ خدا دودھوں نہانا پوتوں پھلنا نصیب کرے۔

دولھا نے گود میں اٹھا کمرے میں لے جا بٹھایا۔ نندیں واری صدقے ہو رہی ہیں۔ مہمان آیا ہے۔ کھانے کا انتظام ہوا۔ دسترخوان چنا گیا۔ اس کی اپنی ماں نے بھی دیگیں ساتھ کی ہیں۔ اسے دولہن کا حصہ کہتے ہیں۔ آج سے یہ غیر ہو گئی اور ماں بیٹی میں حصہ بقدر کے تعلقات قائم۔

دسترخوان بچھا۔ دولھا نے دولہن کو کھیر چٹائی۔ دلہن کے ہاتھ سے دولھا کو چٹوائی گئی۔ دولھا کی بہنیں بھاوج کی طرفداری لے رہی ہیں۔ اپنے بھائی کو ستا رہی ہیں تاکہ نو وارد محسوس کرے کہ یہاں بھی اس کے حمایتی موجود تھے۔

اب تک اس ورانہ میں [illegible] ساکت و جامد تھی۔ [illegible]

اب پہلی مرتبہ ان کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ انہوں نے میاں کو لقمہ [illegible] ڈال کر کھلایا۔ یہ بڑا شرم کی بات تھی۔ ماں باپ کے گھر رو [illegible] روا ہوئی۔

یہ ہے توجیہ ہماری رسومات کی۔

جس ماحول میں ہماری بچیاں پلتی تھیں اس میں رسومات ٹھیک [illegible] تھیں۔ اب وہ ماحول درست تھا یا نہیں، یہ خود ایک [illegible] مسئلہ ہے۔

دوست سے!

از جناب اسرارالحق صاحب مجاز بی۔ اے (علیگ)

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئینِ فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تہذیب عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی
ابھی یہ زندگی دادِ صداقت دے نہیں سکتی
ابھی انسانیت دولت سے ٹکر لے نہیں سکتی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دعوے کا حقیقت ہے حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی زندگی کو زندگی کرکے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریکِ طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیرِ زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انساں سے آنکھیں ملانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشکِ خوں بہانا ہے
ابھی پامالِ جورِ آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہر دشمنِ نظمِ کہن کے گیت گانا ہیں
ابھی ہر لشکرِ ظلمت شکن کے گیت گانا ہیں
ابھی خود سرفروشانِ وطن کے گیت گانا ہیں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

کوئی دم میں حیاتِ نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بہ ایمائے حمیّت جان کی بازی لگاتا ہوں
میں جاؤنگا، میں جاؤنگا، میں جاتا ہوں، میں جاتا ہوں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

اقبال کا فلسفہ موت

(از جناب سید نعیم الدین ایم ۔ اے)

زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے والے ترجمان حقیقت نے موت ۔ میرا سر پُراسرار مظہر موت کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔ اگر موت پر کچھ روشنی نہ ڈالی جائے تو خود زندگی کی تشریح نامکمل اور ادھوری رہ جاتی ہے۔ اقبال اس نکتہ سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لئے سفر حیات پر ہدایات دیتے ہوئے انہوں نے اس ناگزیر سنگ میل کی بھی حقیقت عیاں کر دی ہے۔

ہماری زندگی کے لئے سب سے بڑا خطرہ بیم و خوف ہے ۔ یہی تمام انسانی کمزوریوں کی جڑ ہے ۔ زندگی کے سفر میں سب سے زیادہ اسی کی رہزنی کا خطرہ ہے ۔ نباض ملت علامہ اقبال نے تشخیص مرض ملت کرتے ہوئے اس خطرہ کو سب سے زیادہ محسوس کیا ۔

لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف می یابد فروغ
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست

صرف ایک ذات واحد ہے جس سے خوف کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی شے اس کی مستحق نہیں کہ انسان اس سے مرعوب ہو۔ اس قادر مطلق کا قول واضح قرآن شریف میں موجود ہے ۔" فلا تخشوہم واخشونی " سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم اس سے خائف رہیں اور اس کی بارگاہ میں ایک سجدہ کو گراں نہ سمجھیں تو ہزار سجدوں سے نجات حاصل کر لیں ۔ مزید برآں خوف غیر اللہ سوائے اس کے کہ ہمارے لئے عرصہ حیات تنگ کرے کوئی فائدہ نہیں رکھتا ۔

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است

زندگی کے راستے میں ابتدا سے لیکر یوں تو تمام راہ ہزار ہا قسم کے خوف کمین گاہوں میں چھپے ہوئے ہیں اور ان کے خلاف کافی طور پر ہمیں آگاہ کر دیا گیا ہے

لیکن اختتام راہ کا خوف یعنی موت کا خوف جو ہمیں منزل پر پہنچ کر ہوتا ہے اس کا تو کیا کہنا اس کی وجہ سے تو زندگی کی مسرتیں بھی حرام ہو جاتی ہیں ۔ خضر طریقت نے اسی لئے اس خوف موت پر ضرب کاری لگائی ہے ۔ راحت طلب حیلہ جو طبائع کو اچھا بہانہ مل گیا کہ جب ہماری تمام کاوشوں کا ثمر محض موت کا تلخ گھونٹ پینا اور فراموشی دہر کا شکار بننا ہے تو ہم کیوں ایسی بے ثبات زندگی کے لئے اس قدر اہتمام سے کام لیں ۔

علامہ اقبال نے ذہن نشین کرایا کہ اول تو مدت حیات ان کی منزل آخر نہیں اور اگر ہو بھی تو تم اپنی شاندار زندگی سے یہ ثابت کر دکھاؤ کہ قدرت کا یہ فعل یعنی قطع حیات ایک حسن کارانہ تصویر کو نذر آتش کرنے سے کچھ کم ظالمانہ نہیں خدا خود ایسے حسین مرقع زندگی کو دائمی موت کے حوالے کرنے سے شرمندگی محسوس کرے ۔

چناں بزی کہ اگر مرگ است مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

زندگی کو لائق رشک طور پر برتنے کی ترغیب میں ایسا بلیغ و جامع و مانع شعر کسی زبان میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا ۔

شاعر کا اعتقاد ہے اور راسخ و غیر متزلزل اعتقاد ہے کہ ؎

یہ عالم یہ ہنگامہ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

موت کی دسترس صرف بدن تک ہے اس سے آگے وہ ایک قدم نہیں بڑھ سکتی ۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے

موت یعنی "شام زندگی" دراصل صبح دوام زندگی ہے ۔ "جہاز زندگی آدمی" ابد کے بحر میں کبھی پیدا اور کبھی نہاں ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن ؎

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

زندگی قدرت کو خود محبوب ہے اور ذوق حفظ زندگی ہر چیز میں ودیعت کیا گیا ہے علاوہ ازیں یہ بھی غور طلب ہے کہ اگر نقش حیات موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا تو نقاش ازل نقش حیات کو اس عمومیت کے ساتھ کیوں پیدا کرتا ۔ اب اگر نقش حیات کی عمومیت و ارزانی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اجل کی کوئی حقیقت نہیں اور سونے کی طرح مرنا بھی جینے میں خلل انداز نہیں ؎

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات — عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظام کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں — جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آدم محض مشت خاک نہیں جسم فنا ہو جائے لیکن روح فنا کو ٹھکرا تی ہوئی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔

این بدن با جان ما انباز نیست
مشت خاکے مانع پرواز نیست

ایک اور مقام پر کہتے ہیں ؎

چہ غم داری حیات دل ز دم نیست
کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ
اگر دم رفت دل باقی است غم نیست

لیکن شرط یہ ہے کہ دل دراصل دل ہو اگر وہ تپش سے خالی ہو تو دل نہیں گل ہے دل یعنی جان ہی دراصل حیات ابدی کی ضامن ہے۔

بمیری گر بہ تن جانے نداری | وگر جانے بہ تن داری نمیری

اس رازداں جسم و جان پر اجل گراں نہ تھی ؎

دل من رازدان جسم و جان است | نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم | ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

یہ ان کا نرا دعویٰ نہ تھا بلکہ خود ان کی موت اس پر شاہد ہے کہ جس وجود نے ملک حیات کے چپہ چپہ پر ہمیشہ کے لئے اپنا سکہ بٹھا دیا اسکی زد سے موت بھی باہر نہ رہی۔ اُس نے موت کو بھی غیر مفتوح نہ چھوڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلدادۂ حیات ذوق سفر سے مست و سرشار اس عالم میں چلا جا رہا ہے کہ موت اس کی راہ میں محض ایک سنگ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ انتقال سے قبل یہ شعر ورد زبان تھا ؎

نشان مرد مومن با تو گویم | چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اقبالؔ کی دقیقہ رس نگاہ میں موت محض "کشادِ درِ دل" ہے۔

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو | ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

موت کو کشادِ درِ دل اس لحاظ سے کہا گیا کہ خودی کی توسیع و استحکام کے لئے نیا امکان پیدا ہو گیا۔ خودی کے لئے اب یہ ممکن ہو گیا کہ ذات لم یزل کو اپنے اندر جذب کرکے خود لازوال ہو جائے اور فنا کے داغ کو اپنے دامن سے ہمیشہ کے لئے دھو ڈالے۔

بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست | اگر او را تو در گیری فنا نیست

تسخیر حیات کے لئے طبیب ملت نے خودی کا لاجواب نسخہ تجویز کیا ہے اور فتح موت کے لئے بھی اسی کو زبردست آلہ گردانا ہے۔ سب سے پہلے اس امر کا یقین ضروری ہے کہ خودی پیکر خاکی سے جدا غیر فانی عنصر ہے۔ اگر اس اعتقاد کا فقدان ہو تو غم موت کی رہزنی کا کھٹکا ہمیشہ لگا رہے گا ؎

تری نجات غم مرگ سے نہیں ممکن | کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

دوسرے مقام پر کہتے ہیں ؎

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ | زبیمش زرد مانند زریری
بہ خود باز آ خودی را پختہ تر گیر | اگر گیری پس از مردن نہ میری

اپنے پیکر میں حضرت ابراہیمؑ کی طرح حرم خودی بنانا پہلی شرط ہے۔ خودگر و خودگیر خودی کا موت سے بھی مرنا ممکن نہیں۔

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

دراصل اسی لئے خودی کا سرور دائمی اور ابدی ہے ؎

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے | اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس | مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

علامہ موصوف ایک مقام پر اسپینوزا اور افلاطون کا مقصود بتاتے ہیں۔ اسپینوزا کہتا ہے ؎

نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند | حیات کیا ہے حضور و سرور و نور و وجود

افلاطون کہتا ہے ؎

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند | حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

اب علامہ موصوف سومنات حیات و ممات کے پجاریوں کو کعبہ حقیقت سے آشنا کرتے ہیں ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق | فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

فتح موت کے لئے دیگر اسلحہ جات ہیں ہے آزادی، یقین اور عشق ہیں۔ دراصل یہ سب زرۂ خودی ہی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جس نے ہر قسم کی غلامی کی زنجیریں توڑ دی ہوں جس نے بے بصری سے بندگیٔ آدم نہ کی ہو اور جس شخص نے اپنے گوہر کو نذر قباد و جم نہ کیا ہو۔ وہی شخص موت سے نبرد آزمائی میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ شان آزادی یہ ہے کہ انسان اس دنیائے دوں کے جنجال سے آزاد رہے اور تعلقات دنیوی کا زریں طوق زینت گلو نہ بنائے۔

ہے گراں سیر غم راحلہ و زاد سے تو | کوہ و دریا سے گذر سکتے ہیں مانند نسیم
مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ | ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

مرد آزاد کا شیوہ تسلیم و رضا ہے۔ اس صید پیشہ حر کی فتراک کا موت اک ادنیٰ صید ہے

[illegible] ... [illegible] است — موت ہیں کہ عالم [illegible] است
بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقام اوست مرگ
[illegible] خندہ بر مرگ [illegible] مرد حق ... [illegible]

غلام کی زندگی بھی بیم مرگ کے باعث موت بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے بندۂ آزاد کی زندگی کا تو کیا کہنا مرگ بھی ہم دوش زندگی ہوتی ہے۔

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ — زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر — مرگ او را می دہد جانے دگر

اور یہ بندۂ آزاد کی خود آگاہی اور خود اندیشی کا ثمر ہے کہ جانستان مرگ اس کیلئے جاں بخش ثابت ہوتی ہے اور مرگ آفات حیات کی کڑی کی محض ایک جز ہوتی ہے

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست — مرگ آزاداں ز آنے بیش نیست

مرد آزاد و غیور مجسم ایمان و ایقان ہوتا ہے اس کا یقین نقطۂ پرکار حق ہے وہ موت کے طلسم سے خوب واقف ہے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور — موت کیا شے ہے فقط عالم معنی کا سفر

فطرت جاں بخشی کے بعد جانستانی سے کام نہیں لیتی۔ یقین کا فقدان البتہ ہمیں فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

جانے کہ بخشند دگر نہ گیرند — آدم بمیرد از بے یقینی

بظاہر اس کے اقبال کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ ؎

اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا — نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

لیکن اس نقش میں رنگ ثبات و دوام بھی بھرا جا سکتا ہے۔ اور وہ عشق کی وساطت ہے ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات و دوام — جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

مختصر یہ کہ تپش عشق ہی زندہ کو زندہ تر کرتی اور اس کو بال و پر بخشتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ وادی موت سے شاداں و فرحاں بہ آسانی گزر جاتا ہے۔ اقبال کے پیر و مرشد مولانا روم کے ہاں بھی عشق ہی دوام حیات کا ضامن ہے۔ خواجہ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بہر حال ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح علامہ نے اجتہاد سے کام لیکر موت کی حقیقت اور اس پر ظفریاب ہونے کی تعلیم بتائیں موت کا لفظ ہی عام اذہان کے لئے ایک بھیانک تصور پیش کرتا ہے۔ دل ترسندہ اس کے نام

[illegible] سے لرز جاتا ہے اور [illegible] ... و پریشان نظر آتا ہے۔ شریعت شاعری کے محی علامہ اقبال کی ضرب کلیمی کے ہم مرہون منت ہیں کہ سرشار فرعونیت موت مجبوراً پسپائی ہوئی اسکی ہیبت کا پردہ چاک ہوا۔ اور اس کی عریاں حقیقت پیش نظر ہو گئی۔ یہ صید افگن اب خود صید نظر آنے لگی ؎

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید — مرگ است صیدے تو در کمینی

سچ تو یہ ہے کہ جس کی ہمت مردانہ جبریل کو زبوں صید گردانتی ہو اور یزداں کا شکار مقصود رکھتی ہو۔ اس کے لئے موت ایک ادنیٰ صید نہ ہو تو کیا ہو۔ موت کی سفاکی اور خون آشامی اب اس سے رخصت ہوئی۔ علامہ ہارون الرشید کی زبان سے تمام ابنائے زماں کو نصیحت کرتے ہیں۔

ہارون نے کہا وقت رحیل اپنے پسر سے — جائے گا کبھی تو بھی اسی راہ گزر سے
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت — لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

مرگ کو محبوب و مانوس ہی نہیں بلکہ تلخی مرگ کو اقبال کے معجز نگار قلم نے شہد و شکر سے زیادہ شیریں بنا دیا۔ جس کی لذت سے افسوس کہ اس خاکداں کی اکثریت بے خبر نظر آتی ہے۔ علامہ نے ایک نظم بہ عنوان "جہاد" لکھی ہے جس میں اپنے مخصوص بلیغ انداز میں شیخ کے عدم جواز فتوائے جہاد کا جواب دیتے ہوئے اظہار تاسف کرتے ہیں ہم معمولی ادنیٰ درجہ کی موت (اصطلاحاً کافر کی موت) سے ہراساں نظر آتے ہیں مسلمان کی یعنی آئیڈیل (نصب العینی) موت ہمارے لئے کیوں جاذب نظر ہونے لگی۔ اس لئے جہاد کو غیر ضروری ثابت کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں — مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود و بے اثر
تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں — ہوں بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل — کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر

ارشادات اقبال کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اور قرآن شریف میں موت کو سچے باایمان انسان کا تمغۂ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ یہی منافقوں کی آزمائش گاہ ہے۔ قل ان کانت لکم الدار الآخرۃ عند اللہ خالصۃ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین۔ شہدائے سبیل اللہ کی موت کے بارے میں امکان غلط فہمی کو یوں دور کیا گیا ہے۔ لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون۔ اقبال نے بھی نصب العینی موت کی مثال شہدائے راہ خدا سے لی ہے۔ اور سرخیل شہدا حضرت امام حسین

[illegible] شہادت کو اعلیٰ ترین نمونہ مرگ قرار دیا ہے ۔

[illegible] از مرگ کو سازد بالحد — زانکہ این مرگ است مرگ دام و دد
مرد مومن خواہد از یزدان پاک — آن دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آن دگر مرگ انتہائے راہ شوق — آخرین تکبیر در جنگاہ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگ پور مرتضیٰ چیزے دگر

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ مسلمانوں کے تنزل میں دو عوامل سب سے زیادہ کارفرما ہونگے حب مال و ترس مرگ۔ اقبال ہم میں یہا فتنہ موجود بتاتے ہیں ؎

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ
فتنہ او حب مال و ترس مرگ

موت سے بے خوفی اسلام کی تعریف میں داخل ہے۔ علامہ اقبال اسلام کے اس پہلو کو خاص طور پر اجاگر کرنا چاہتے ہیں صغرا ہمایوں صاحبہ کے اٹوگراف میں لکھتے ہیں :—
"اسلام کی تعریف میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں یعنی ذات باری پر پورا بھروسہ ہو اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا۔"
مختصر یہ کہ اقبال نے موت کا نہایت صحیح اور معقول نظریہ پیش کیا اور زندگی کے ہزارہا مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے موت کو بھی اپنی نظر کی زد سے خارج نہیں کیا اور اس طرح اپنے زندگی بخش پیغام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا کیونکہ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے مجتہدانہ شان سے تدبیر، تقدیر، یقین، عشق وغیرہ کے مروجہ مفہومات کی دنیا کو زیر و زبر کر دیا اور زندگی کی قدروں کو صحیح سانچوں میں پیش کیا۔ لیکن موت کے مروجہ تصور کے باقی رہنے سے اُن کا پیغام نامکمل رہ جاتا۔ اِس حالت میں یہ رائج الوقت تصور ان سب جرأت آزمائیوں پر پانی پھیرنے کے لئے کافی تھا۔ موت کا انقلابی، تعمیری، روحانی اور امید افزا تصور پیش کرکے اقبال نے زندگی کی صلاحیتوں کی شیرازہ بندی کی اور انسانی ترقی کے میدان کو بے پناہ وسعت دے دی۔

اعلان

"ادیب" کی ایک کرم فرما اور معاون نے جو ادبی حلقوں میں محترمہ شیریں کے نام سے معروف ہیں یہ تجویز پیش کی ہے کہ "ادیب" کے مئی ۱۹۴۴ء کے پرچہ میں زیادہ سے زیادہ اچھے اور منتخب افسانے شائع کئے جائیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے "ادیب" کے مردانہ اور زنانہ شعبوں کے بہترین افسانوں کے واسطے چالیس چالیس روپے کی پیشکش مقرر کی ہے۔

اس پرچہ کیلئے تمام افسانے مارچ کے آخری ہفتہ تک دفتر "ادیب" میں پہنچ جانے چاہئیں۔ افسانوں کا غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔

منیجر

لال قلعہ دھلی

(از جناب فیض جھنجھانوی)

نوٹ:- فیض صاحب ایک نوجوان اور صحیح قسم کے ترقی پسند شاعر ہیں۔ عموماً نظمیں کہتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور تاریخی عمارات کو منظوم کلام میں پیش کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ "ادب" کے ناظرین اس صنف شاعری کا خیر مقدم کرینگے۔ (اڈیٹر)

حسرت اندوز ہے حالِ دلِ دیوانۂ غم — عبرت آموز ہے ٹوٹا ہوا پیمانۂ غم
چشمِ عبرت ہے تو جا اُس قلعۂ سُرخ کو دیکھ — صفحۂ دہر پہ ہے سُرخیِ افسانۂ غم

شعلۂ غم ہے شرارِ دلِ سودائی ہے — داغِ حسرت ہے چراغِ شبِ تنہائی ہے
تابشِ حُسن سے دامانِ نظر سُرخ نہیں — خون میں ڈوبا ہوا لالۂ صحرائی ہے

پارہ پارہ جگرِ عالمِ ناسوت نہ ہو — چشمِ خونابہ فشاں معدنِ یاقوت نہ ہو
جس پہ برسی ہے شفق خون کا بادل بن کر — میری ہی عظمتِ رفتہ کا وہ تابوت نہ ہو

خواب بھی جس کا نہ دیکھا تھا وہ تعبیر ہے یہ — جس کی تخریب مقدر تھی وہ تعمیر ہے یہ
آ دکھاؤں تجھے اے قاتلِ شمشیر بکف — تو نے جو کھینچی تھی خوں سے وہی تصویر ہے یہ

گاہ خوننابہ فشاں ہے رخِ برہم کی طرح — گاہ آئینۂ غم ہے دلِ پرغم کی طرح
آہ جو کل تھا حنا بندِ عروسِ ہستی — آج ہے سرخ مرے سینۂ ماتم کی طرح

وہ شہیدِ ستمِ گردشِ ایام نہ ہو — کشتۂ تیغِ نگاہِ سحر و شام نہ ہو
سر پہ ڈالے ہوئے اک پارچۂ خوں آلود — وقفِ ماتم کوئی دوشیزۂ اسلام نہ ہو

شعلۂ غم ہے پئے شمعِ شبستانِ وطن — اشکِ خوننابہ فشاں ہے پئے عنوانِ وطن
ہے ابھی روکشِ لالہ ابھی ہم رنگِ شفق — کس قدر شوخ اٹھا خونِ شہیدانِ وطن

سجدۂ پائے ایاز اور سرِ محمود یہ کیا — اے شہِ انجمنِ عالمِ موجود یہ کیا
تابشِ حسن بہر شکل مسلم ہے مگر — شعلۂ طور یہ آتشِ نمرود یہ کیا

اے کہ تو وجہِ سکونِ دلِ مایوس رہا — مالکِ تاج رہا صاحبِ طاؤس رہا
حسن نے تجھکو وہ بخشی ہے تب و تابِ دوام — شمع بجھنے پہ بھی روشن ترا فانوس رہا

دیکھ! غارت گرِ بت خانۂ آذر ہے تو — اس خموشی پہ بھی ہنگامۂ محشر ہے تو
تجھکو میرے دلِ خوننابہ فشاں ہی کی قسم — مسکرا! خمکدۂ بادۂ احمر ہے تو

مسکرا! اور سراپردۂ افلاک کو پھونک — تفرقۂ جہل، خطر، ہر خس و خاشاک کو پھونک
غیر کا کام بھلا انجمنِ ناز میں کیا — صاعقہ پاش ہو اس خطرۂ ناپاک کو پھونک

سُرخ اوڑھنی

(از جناب محمد امین شرقپوری)

گاؤں کی حسین صبح کرنوں میں نہا رہی تھی۔ سُرخ اوڑھنی میں اُسکا ہنستا
ہرہ کتنا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ آگ کی لپٹوں میں جیسے کُندن دمک رہا ہو۔ وہ اُسے
بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "یہ اوڑھنی تو بہت اچھی ہے" بار بار بِندو
ماں پر آتا اور لوٹ جاتا۔ اُس کی نظر اپنی میلی کچیلی اوڑھنی میں اُلجھ جاتیں جسے
ایک سال سے اوڑھ رہی تھی۔ اور جب کبھی ماں سے کہتی، "ماں مجھے نئی اوڑھنی
دو۔" وہ بگڑ کر کہتی۔ "روز روز کہاں سے لاؤں تیرے لئے۔ پھر یہ ابھی تو بہت اچھی ہے
ھنی جیسے پھٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اس کا دل سمٹ کر رہ جاتا۔ وہ ہاتھ مسوس لیتی۔
ح نئی اوڑھنی کا چاؤ پھر اس کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ پٹواری کی بہو کا چمکتا ہوا
ہرہ آنکھوں کے آگے گھوم جاتا۔ مُسکرا کر بولی "اماں"

"کیا ہے؟" ماں چونک کر بولی

وہ خوشی کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کو روک کر بولی "پتا کے پاس بہت
چھی اوڑھنی ہے"

"ہوگی —" وہ بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولی۔

"میں بھی لوں گی" دبی آواز سے بولی

ماں نے آنکھیں اسکے چہرہ پر گاڑھ دیں۔ جیسے اس کی بچی نہیں جانتی تھی کہ جو چیز
پتا کے گھر میں ہے وہ اُن کے ہاں مفقود ہے۔ ایک سرے سے مفقود۔ پھر پٹواری نے کیا
کم لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔

"گوپال چاچا —!" چوکیدار کی آئے دن کی آوازیں اُس کے کان میں
گونج گئیں۔

"خیر تو ہے؟" وہ بھنّا کر بولی۔

"پٹواری جی نے بھیجا ہے" جیسے وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔
بھنّا کر بولی "سارے گاؤں میں پٹواری کو ہمارا ہی گھر نظر آیا ہے کیا"
چوکیدار مسکرا کر بولا۔ "پتا کے میکے سے دو آدمی آئے ہیں۔ شام کو دودھ چاہیئے

[illegible]

چوکیدار ہنس کر بولا۔ "میں آگیا ہے گوپال چاچا کی اُسکی آگئی"

شام کو بِندو کا چاچا جب دودھ لیکر آیا۔ وہ برتن ہاتھ سے لیکر بولا۔ "پٹواری
نے چوکیدار کو دودھ کیلئے بھیجا تھا۔ میں نے منع کردیا ہے۔"

"منع کردیا" بِندو کا چاچا بولا۔ "لاؤ برتن دے دو مجھے"
انکار کے باوجود وہ اُس کے ہاتھوں سے برتن چھین کر لے گیا۔ دودھ سے
بھرا ہوا برتن! پٹواری سے کس قدر ڈرتا ہے۔ بِندو کا چاچا۔ لوگ اس سے کیوں
ڈرتے ہیں۔ کوئی اُس کے سامنے زبان نہیں کھولتا۔

"ماں ماں!" بِندو ماں کا شانہ ہلا کر بولی "پھیری والے سے مجھے بھی
لال اوڑھنی لے دو۔"

"لال رنگ کی لے گی" وہ چونک کر بولی۔

"ہاں! بہت بھلی معلوم ہوتی ہے"

"اتنے پیسے کہاں ہیں میرے بچے"

"چاچا سے لے لو" وہ بولی

"اُس کے پاس کیا ٹکسال گڑی ہے"

"رات گن تو رہے تھے روپے"۔ بھولے پن سے بولی۔

"خبر ہے" وہ بولی "لگان کے لئے لائے تھے"

بِندو کے چہرے پر پھر جھنجھلاہٹ دوڑ گئی۔ ماں محبت سے بولی "لال اوڑھنی
گھر میں ہے۔ منگنی پر تیری سسرال سے آئی تھی، ہولی پر اوڑھ لیجو"۔ کہتے ہوئے وہ
اندر سے کھدر کی اوڑھنی نکال کر لے آئی۔

"یہ تو بہت موٹی ہے۔ پتا کے پاس ریشم کی ہے"۔ وہ بسور کر بولی۔

"اس کا کیا ہے"۔ ماں بولی۔ اُس کے لئے ہر دن ہولی ہے۔ ہر رات دیوالی
ہے۔ اس کا سسر —" کان سے پھر آوازیں ٹکرانے لگیں۔

"پانچ سیر گھی چاہیئے شکریوں کے لئے۔ پتا کل میکے جائیگی" چوکیدار کہہ رہا تھا۔

"چھٹانک نہ پاؤ اکٹھا پانچ سیر" وہ ناک پر اُنگلی رکھکر بولی۔

"پاؤ سیر سے کیا شکریاں بنیں گی" چوکیدار مسکرا کر بولا۔ پٹواری جی کہہ
رہے تھے کہ نمبردار اب بوڑھا ہوگیا ہے۔ بِندو کے چاچا کو ملے گی نمبرداری۔"

"ہمیں نہیں چاہیئے" وہ تنک کر بولی "روز روز کی بیگار ہمارے بس کی نہیں
پتا کے بیاہ کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پانچ سیر گھی دیا تو تھا"

"پھر کیا کہدوں اُن سے" چوکیدار بے صبری سے بولا۔

"کہاں سے دوں؟" وہ بولی "بھینس ایک وقت دودھ دیتی ہے۔ کسی اور سے لوں تو پھر کیا اور بیٹا آتا ہوا چلا گیا" اور وہ سوچ رہی تھی کہ ٹھاکر نے پرانے الی سے کس دھوم سے بیاہ کیا تھا۔ لڑکے کا۔ سارے گاؤں نے اگائی ہوئی تھی۔ پیسے یہ کیا خرچ کیا اس نے۔ آج اس کی بندو کا بیاہ سر پر آن پہنچا ہے۔ رنگتے پنے ہیں۔ نہ رات کے کھانے کا سامان۔ رونا ہی آرہا ہے۔ کب تک چپ بیٹھیں گے۔ بندو جوان ہو گئی ہے۔ کل عورتیں پنا کے بیاہ کی باتیں کر رہی تھیں۔

رام دئی بولی "چاچی تم بندو کے ہاتھ کب پیلے کرو گی؟ کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ فصل جو آئی لگان میں اٹھ گئی۔ مکان ٹوٹا پڑا تھا۔ سو پچاس اس پر لگ گئے۔ گھر کے دھندے چھوٹے موٹے خرچ بھی پیسہ پیسہ کر کے رقمیں کھا لیتے ہیں۔ غریب کی جان کو سو جوکھوں۔ بندو گاڑھے کی سرخ اوڑھنی کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اُس کے سسرال والے پنا کی سسرال سے کتنے مختلف ہیں۔ یہ اوڑھنی کتنی معمولی ہے۔ نہ اس میں ریشم کی ملائمت ہے نہ چمک دمک۔

"میں اسے نہیں اوڑھونگی۔" گھبرائی ہوئی آواز سے بولی۔

ماں نے دیکھا آنسو بندو کی پلکوں پر کانپ رہے تھے۔

گاؤں کی سنسان گلیوں میں کپڑے والے کی آواز گونج رہی تھی۔ پہلی آواز بندو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جھپکا کر دیکھا۔ مراری پیٹھ پر گٹھری ڈالے گزرتا ہوا نکڑ سے نکلا۔ مسکرا کر بولی "لال اوڑھنی ہے تیرے پاس؟"

"کیا کروگی لے کر؟" مراری ہنس کر بولا۔ "تمہاری ماں کیا لیکر دیگی تمہیں۔ بہت مہنگی ہے۔"

"دیکھوں کیسی ہے؟" چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بولی۔

مراری کو جیسے آج وہ بڑی سندر نظر آرہی تھی۔ گٹھری کھول کر بولا "ایسی ہے کہ سپنے میں بھی نہیں دیکھی ہوگی تم نے۔"

بندو کا چہرہ چمک اٹھا۔ لال لال ریشم کی اوڑھنی مراری کے ہاتھوں میں چمک رہی تھی۔

"کتنے کی ہے؟" شوق بھری آواز سے بولی۔

"اور کے سے چھ کی۔ تمہیں پانچ روپے میں دیدونگا۔"

یکایک بندو کے چہرے پر اداسی دوڑ گئی۔

بولی "اُدھار دیدو پیسے پھر لے لینا۔"

"اُدھار" وہ ہنس کر بولا "مفت کہو تو دیدوں۔"

بندو انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ننھی سی مسکراہٹ کو دیکھ کر بولا "اوڑھ لو۔ تمہارے لئے لایا ہوں۔" خاموش پاکر مراری کے ہاتھ لئے مسکراتے ہوئے اوڑھنی اس کے سر پر ڈال دی۔ وہ اوڑھنی کی تعریف کر رہا تھا۔ "یہ کتنی اچھی ہے جوبن چھا پڑتا ہے۔ دلہن معلوم ہو رہی ہو۔ مراری کی دلہن۔"

وہ چونک پڑی۔ آنکھیں مراری کے چہرے پر گاڑ دیں۔ مراری کی ہنستی ہوئی آنکھوں سے شعلے پھوٹ رہے تھے اور جیسے وہ گھر گئی ہو شعلوں میں۔ اوڑھنی پھینک کر چیخ کر بولی "مجھے نہیں چاہیئے تمہاری اوڑھنی۔" دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اپنی میلی کچیلی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی گھر چلی آئی۔

سسرال کی گاڑھے کی سرخ اوڑھنی الگنی پر پڑی تھی۔ اب جیسے اس میں کشش امنڈ آئی ہو۔ بندو کے چہرے پر حیا آمیز سرخی پھیل گئی۔ اسے سوتے ہوئے اس کا دل آپ ہی آپ بجنے لگا۔ اوڑھ کر ایک لجائی ہوئی نظر آئینہ پر ڈالی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آگ کی لپٹوں میں کندن دمک رہا ہو۔ اور اس کا گول ہنستا ہوا چہرہ؟

پیڑوں کی اوٹ سے ڈوبتے ہوئے سورج کا لال ٹکیا دھرتی کو جھانک رہا تھا۔ چرواہے گیت گاتے ہوئے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گاؤں کی سونی گلیوں میں زندگی کی لہریں دوڑ گئیں۔

غزل

(حضرت جگر مرادآبادی)

تے ہیں پھر وہ عزمِ دل و جاں کئے ہوئے	پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کئے ہوئے
اُٹھ رہی ہے عارضِ پُرنور سے نقاب	نظارہ و نظر کو پریشاں کئے ہوئے
شام و صبحِ زلف و رخِ یار ہیں بہم	ایماں کو کفر، کفر کو ایماں کئے ہوئے
اُٹھ رہی ہے جانبِ دل چشمِ شرمگیں	اِک اِک نظر میں پرسشِ پنہاں کئے ہوئے
حسنِ منفعل متبسم ہے زیرِ لب	یک قطرہ اشک زینتِ مژگاں کئے ہوئے
ہے نگاہِ شوق کو دیدار کی ہوس	مدت ہوئی ہے جرأتِ عصیاں کئے ہوئے

پھر جی یہ چاہتا ہے کہ بیٹھے رہیں جگر
اُن کی نظر سے بھی اُنہیں پنہاں کئے ہوئے

راشننگ

(از واحدی)

صبح کا بھولا شام کو آجائے تو اُسے بھولا نہ جانئے۔ خدا بھلا کرے لارڈ ویول کا وائسرائے بنتے ہی انہوں نے اعلان کیا تھا "میں ہندستان کی کھانے پینے کی تکلیف مٹاؤں گا" وہ ہندستان کی کھانے پینے کی تکلیف مٹانے کے لئے وہی نسخہ استعمال کر رہے ہیں جو انگلستان میں جنگ کی ابتدا سے زیر استعمال ہے یعنی راشننگ۔

راشننگ کا مقصد ہے چیزوں کی حصہ رسد تقسیم۔

کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ راشننگ کی وجہ سے انگلستان میں کھانے پینے کی چیزوں کی قیمت صرف چھبیس فی صدی بڑھی ہے۔ گویا وہاں جنگ سے قبل جو چیز ایک روپیہ میں ملتی تھی وہ اب ایک روپیہ سوا چار آنے کی ہے۔ برخلاف اسکے ہندستان کو چونکہ مدت دراز تک راشننگ سے محروم رکھا گیا۔ ہندستان میں چیزوں کی قیمتیں چار سو فی صدی بڑھیں۔ یہاں جنگ سے پہلے جو چیز ایک روپے کی تھی وہ اب چار روپے میں بھی بمشکل ملتی ہے۔

اوّل اوّل تو ہندوستان کی حکومتوں نے ہندستان کی ان مشکلات کو شاید لائق اعتنا نہیں تصور کیا۔ لیکن جب خود حکومتوں کو ہندستان کے تجار نے دھتا بتائی تو انہیں محسوس ہوا کہ آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے۔ حکومت ہند نے اس کا علاج پرائس کنٹرول تجویز کیا۔ اور جن جن چیزوں کی قیمتیں مقرر کرنی مناسب سمجھیں مقرر کر دیں۔ یہ قیمتیں تقریباً قریب وہی تھیں جو بڑھتے بڑھتے اس وقت رائج ہو چکی تھیں۔ مطلب پرائس کنٹرول سے یہ تھا کہ بس موجودہ قیمتوں پر بس کرو۔ اور اور نہ بڑھاؤ۔ پرائس کنٹرول کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِدھر طے پاتا کہ فلاں چیز کی قیمت کو فلاں تاریخ سے کنٹرول کیا جائیگا۔ اُدھر اس چیز کے بڑے بڑے تاجروں کے پاس خبر پہنچ جاتی اور وہ چیز تاریخ آتے آتے ایسی غائب ہو جاتی جیسے تھی ہی نہیں۔ زمین کھا جاتی تھی یا آسمان کھا جاتا تھا حکومت اور اہل حکومت کو کنٹرول کے بہاؤ مل جاتی ہو تو مل جاتی ہو۔ ورنہ غریب تو کنٹرول کی بدولت ملک چیزوں کو ترس ترس گئے۔ اور امیروں نے بھی خریدا تو کوکین کی طرح چوری چھپے خریدا۔ اور کوکین کی طرح مہنگا خریدا۔

ایک دور ہندستان کے ہر صوبہ میں یقیناً ایسا گذرا ہے کہ کنٹرول پبلک کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت تھا۔ اس کنٹرول کے ہونے سے اس کا نہ ہونا اچھا تھا کنٹرول نام کا تھا۔ عمل سے کنٹرول کو واسطہ نہ تھا۔ حکومت کے کارندوں اور کنٹرولڈ اشیا کے تاجروں کے درمیان آنکھ مچولی ہوتی تھی۔ حکومت کے کارندے ڈال ڈال رہتے اور تاجر پات پات۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی تاجروں کو چیتوں سے اُتر کر حوالات کی سیر بھی کرنی پڑتی۔ مگر مہینوں کی نفع بازی کے آگے ایک رات کی بے عزتی کیا بڑی بات تھی۔ اور حکومت زیادہ سختی برتنے پر تیار نہ تھی[1]

کہتے ہیں تجارت میں مال کا بیچنا ہنر نہیں ہے۔ مال کو بروقت خریدنا اور روک کر بیچنا ہنر ہے۔ بیچنے کو اخبار بیچنے والے بچے بیچتے پھرتے ہیں۔ اور دکانوں پر بچے چیزیں نکالتے اور دکھاتے اور ماں کے بھاؤ تاؤ کرتے ہیں۔ چیز کی قیمت مقرر کر دی جائے یا یہ معلوم ہو کہ اس قدر قیمت کہکر اس قدر قیمت لی جا سکتی ہے تو بیچنا کون سا دشوار کام ہے۔ ہنر اور فن یہ پہچاننا ہے کہ فلاں چیز کا فلاں وقت بھاؤ چڑھ جائیگا۔ اسے آج خرید لیا جائے اور جمع رکھا جائے اور تین مہینے یا چھ مہینے بعد نکالا جائے۔

موجودہ جنگ میں بوالہوس تاجروں نے اس ہنر اور فن کے وہ وہ ناپاک اور آدمیت سوز کمال دکھائے کہ قارون کی یاد تازہ ہو گئی۔ جو چیزیں باہر سے آتی ہیں دلی میں بمبئی، کلکتہ سے یا ہندستان میں کسی اور ملک سے۔ یہ اندازہ لگا کر کہ ریل گاڑیوں کو تجارتی سامان پہنچانے کی زیادہ فرصت نہ ہوگی اور جہازوں کے تو راستے ہی رُک جائیں گے۔ لہٰذا جو چیزیں باہر سے آتی ہیں اور اس شہر میں مختلف دکانوں پر پھیلی پڑی تھیں ہوشیار اور بڑے تاجروں نے چھوٹے اور کم عقل دکانداروں کو معمولی نفع دیکر خرید لیں۔ اور جمع کر لیں۔ اب انہیں بیچتے نہیں۔ خلقت اُن کے نہ ملنے سے بے چین ہے۔ اور ہوشیار اور بڑے دکاندار صاحب ان چیزوں پر سانپ بنے بیٹھے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ اور بھاؤ بڑھ جائے۔ اور بھاؤ بڑھ جائے۔ مثلاً ایک صاحب نے قلعی شہر بھر سے سمیٹ کر اپنے ہاں بھر لی۔ لوگوں کو بے قلعی پتیلیوں کا پکا کھانا کھانا پڑا۔ وہ بلڈ پوائزن میں مبتلا ہوئے۔ انہوں نے تانبے کے برتن چھوڑ کر مٹی کے برتن اختیار کر لئے۔ مگر قلعی جمع کرنے والے اللہ کے نیک بندہ کو اللہ کی مخلوق پر رحم نہ آیا۔ حتیٰ کہ قلعی کا بھاؤ اتنا چڑھ گیا جتنے کی قلعی جمع کرنے والے ہوشیار تاجر کو توقع تھی۔ تب قلعی نکلی اور روپیہ کی قلعی تیس اور چالیس روپے میں بکی۔

غرض تاجر قارون بن رہے تھے۔ اور حکومت حاتمی اور فیاضی سے نہ ہلتی

---

[1] اب یہ حال نہیں ہے۔ کپڑے کا کنٹرول حکومت نے خاصہ اچھا کیا ہے۔ دواؤں کا کنٹرول بھی کامیاب ہوتا نظر آتا ہے۔

تھی۔ حکومت نے تنگ آکر تاجروں کے کرتبوں اور کرتوتوں کو کنٹرول کے منتر سے دبانا چاہا۔ لیکن منتر اتنی کم طاقتی کے ساتھ پڑھا کہ منتر کا اثر جیسا چاہیئے تھا ویسا نہیں ہوا۔ بلکہ بیشتر چیزوں پر مطلق نہیں ہوا۔

کافی جھک جھک اور پٹ پٹ اور تجویزوں کو پانوں کی طرح اُلٹنے پلٹنے کے بعد حکومت نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ حکومت نے انتظام کا بڑا حصہ غیر سرکاری آدمیوں کے سپرد کردیا اور حکم کیا کہ فلاں چیز فلاں بھاؤ ملے گی۔ اور اس چیز کو گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچنے کے لئے لائیسنس لینے پڑینگے۔ اور بیچنے والوں کی نگرانی فلاں فلاں صاحبان پبلک میں سے کریں گے۔ یہ کم حکومت نے چیزوں پر خاصا قابو پاکر دیا تھا۔ اس دور میں بعض چیزیں حکومت گلی گلی اور کوچہ کوچہ اتنی پہنچواتی تھی کہ جنگ سے قبل وہ چیزیں وہاں اتنی نہیں آتی تھیں۔ لیکن آنریری اور اللہ واسطے کے کام جیسے ہوا کرتے ہیں دیسے ہوئے۔ اس دور میں بھی پبلک چیختی ہی رہی۔ فرق فقط یہ تھا کہ پہلے دوروں میں حکومت کے خلاف چیختی تھی۔ اس دور میں اللہ واسطے کام کرنے والوں کے خلاف حکومت سے شکایت کرنے لگی۔ حکومت زد سے بچ گئی۔ اور آنریری "خدمت" کرنے والے بدنام ہوگئے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اشیائے خوردنی کی قیمتوں کا کنٹرول بغیر راشننگ کے بے معنی ہے۔

ہندستان غالباً بہت سے تجربوں کا مستحق تھا۔ یا ہندستان کی حکومتیں خریداروں کو آسائش پہنچانے کے ساتھ بیچنے والوں کو بھی خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہندستان کی حکومت کے سامنے ہندستان کے غربا ہی نہ تھے ہندستان کے امرا بھی تھے۔ غرض سب تجربے جب ختم ہوئے تو آخراب وہی علاج شروع کیا جارہا ہے جو زمانہ جنگ کا واحد علاج ہے۔ سامان کی حقیقتاً کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ خرابیاں فقط تاجروں کی ہوس اور امیروں کے ہوکے نے پیدا کیں۔ تاجروں کا دل نفع بازی سے اور امیروں کا پیٹ سامان اکٹھا کرنے سے نہ بھرتا تھا۔ راشننگ اس ہوس اور اس ہوکے کا مداوا ہے اب یہ نہیں ہوگا کہ بیوی دوا چھان کر بیٹھی ہیں اور میاں کو دوا کے واسطے دو پیسے کا قند نہیں میسر آتا۔ اس علاقہ میں جہاں کی ستائیس ہزار آبادی کے لئے حکومت چھ سو اسی بوری قند ماہوار دلواتی ہے۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ مالداروں کے ہاں گیہوں سال سال بھر کا بھرا رہے اور غریب پیسے لئے ڈھونڈھائیں۔ اور انہیں ایک وقت کا آٹا نصیب ہو۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ لکڑیوں کے ٹھیلے من من بھر یا بیس بیس سیر بکنے کے خیال سے چلیں اور کوئی اچھی قیمت دے سکنے والا ٹھیلہ کا ٹھیلہ راستہ ہی میں خالی کرالے۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ ایک گھر تو بجلی کی روشنی سے جگ مگ جگ مگ کیا کرے اور دوسرے گھر میں مُردہ اندھیرے میں پڑا رہے۔ اب شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے۔ اب گیہوں، قند، لکڑی، کوئلہ، مٹی کا تیل طاقتور کو بھی ملے گا اور کمزور کو بھی۔ مالدار کو بھی ملے گا اور غریب کو بھی۔

وہ لوگ جو راشننگ سے پہلے قسم قسم کے فائدے اٹھا رہے تھے۔ راشننگ کو برا بتائیں گے۔ راشننگ سے تاجر خوش نہیں ہوسکتے۔ راشننگ تاجروں کی نفع بازی پر کاری ضرب ہے۔ راشننگ مالداروں کو ناگوار ہوگا جو سال بھر اور چھ مہینے کا سامان بھرنے کے عادی ہیں۔ انہیں آٹھ دن کا سامان لینا کیسے پسند آسکتا ہے۔ خواہ اس سے ان کا نقصان کچھ بھی نہ ہو۔ لیکن سب باتوں کے باوجود راشننگ غریبوں کے حق میں قطعی نعمت ہے۔ غریب روز کنواں کھودتے ہیں روز پانی پیتے ہیں۔ اسی واسطے انتظام کیا جائیگا کہ جسے روز خریدنے میں آسانی ہو وہ روز خریدے۔ جسے ہفتہ وار خریدنے میں آسانی ہو وہ ہفتہ وار خریدے۔ غریبوں کو راشننگ سے یہ اطمینان تو ہوگا کہ چیز ملے گی۔

راشننگ کے زمانہ کا جنگ سے پہلے کے زمانہ سے مقابلہ مت کیجئے۔ جنگ سے پہلے کی بات تو جنگ کے بعد بلکہ عرصہ بعد آئے گی۔ البتہ راشننگ کا زمانہ راشننگ سے پہلے کے زمانہ سے اللہ نے چاہا بہتر ہوگا۔ آپ یوں سوچیئے کہ مٹھائی کی ایک ٹوکری آپ خرید کر لاتے ہیں۔ آپ اپنے بچوں میں مٹھائی حصہ رسد بانٹیں گے یا کسی کو زیادہ دیدینگے اور کسی کو بالکل محروم کردیں گے۔

بس حکومت اب اسی انصاف پر آمادہ ہوئی ہے۔

عزم

(از جناب نہال سیوہاروی)

فضائے مہر و ماہ پہ چھا لوں تو چین لوں
کون و مکاں میں دھوم مچا لوں تو چین لوں

انسان کی جبیں پہ ہے محکومیت کا داغ
محکومیت کا داغ مٹا لوں تو چین لوں

وہ کام کر دکھاؤں کہ ارض و سما ہوں دنگ
شانوں پہ کائنات اٹھا لوں تو چین لوں

روتی رہی ہے جبرِ زمانہ سے ایک عمر
جی بھر کے زندگی کو ہنسا لوں تو چین لوں

جس کی نوا ہو تا بہ ابد ضامنِ جمال
وہ نغمۂ جمیل سنا لوں تو چین لوں

پھیکا ہے رنگِ دہر ابھی کیا ہوں مطمئن
تاروں سے فرشِ خاک سجا لوں تو چین لوں

جس کے حضور ماند نظر آئیں مہر و ماہ
ایسا بھی اک چراغ جلا لوں تو چین لوں

یہ خاکداں جہنمِ انساں ہے جس کا نام
رشکِ ہزار خلد بنا لوں تو چین لوں

پی لوں بقدرِ تشنگیٔ شدتِ خمار
ساقی سے رسم و راہ بڑھا لوں تو بچین لوں

اڈے روش روش سے سمندِ حیات کا
سوتے ہوئے چمن کو جگا لوں تو چین لوں

ہے جن کی لاگ مانعِ آزادیٔ خرام
کانٹے وہ راستے سے ہٹا لوں تو چین لوں

ہے شاد کام جن کے تصور سے زہدِ خشک
ان جنتوں کا کھوج لگا لوں تو چین لوں

ہو رفعتوں میں اوجِ ثریا پہ جس کو فوق
وہ پرچمِ بلند اڑا لوں تو چین لوں

وہ آبِ زندگی ہے جسے پی کر نہ آئے موت
دنیائے جاں بلب کو پلا لوں تو چین لوں

الفت کی بارگاہ سے انسانیت کے نام
اک آخری پیام سنا لوں تو چین لوں

خواہم ز دردِ صورتِ درماں برآورم
صبحِ وصال از شبِ ہجراں برآورم

گو عقلت ہے یہ بالکل ایسی بات ہمارے گھرانے میں کبھی نہیں ہوئی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ بہتر اصول پر کبھی عمل ہی نہ کیا جائے۔" صغیر نے سلمیٰ کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ مگر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سلمیٰ مدہوش ہو رہی ہے۔ اُس نے اپنا ہاتھ سلمیٰ کی چہرہ کی طرف بڑھایا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر اور ہونٹ متھر تھرا رہے تھے۔ صغیر کو احساس ہوا کہ وہ بولنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر بول نہیں سکتی۔ وہ گھبرا گیا۔

"سلمیٰ" صغیر رخسار تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

سلمیٰ کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ اپنے پر قابو پانے کی کوشش میں صرف اتنا کہہ سکی۔ "صغیر ہمارا نصیب لڑا ہوا نہیں . . . . . . ہم" اور وہ بے چین ہو کر تکیے سے چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

"سلمیٰ رو کر بدشگونی مت کرو۔ اللہ میں سب قدرت ہے۔ اب تم چین سے سو جاؤ۔" صغیر نے سلمیٰ کا بازو سہلاتے ہوئے کہا۔

"چین" سلمیٰ جھنجھلا کر بولی۔ اور صغیر نے گھبرا کر اُسکے مُنہ پہ ہاتھ رکھدیا "تم اتنی کیوں ڈر رہی ہو۔ سلمیٰ۔ انشاء اللہ ہماری زندگی چین ہی سے گذریگی۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ لو سو جاؤ۔ اچھی سلمیٰ"

صغیر نے سلمیٰ کو پیار سے تھپکنا شروع کیا۔ اور "باقی باتیں کل رات کریں گے" کہکر گویا گفتگو بند کرنے کی کوشش کی۔

"آپ بہت بھولے ہیں" سلمیٰ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ایسی گھٹا روز روز نہیں چڑھا کرتی۔ یہ گھٹا ہمارے سر پر آخری دفعہ سایہ کرنے آئی ہے۔ خوش اعتقادی اور خود اعتمادی کی حد ہوا کرتی ہے۔ مجھے تو اپنا مستقبل نظر آ رہا ہے۔ اس لئے بجا طور پر پریشان ہوں۔ آپ اس مہم کو آسان سمجھ رہے ہیں۔ کہنا آسان ہے کرنا مشکل، بہت مشکل . . . ." سلمیٰ نے اپنا چہرہ پھر تکیہ سے ڈھانپ لیا۔

علی الصباح صغیر کی آنکھ کھلی۔ تو دیکھا کہ کھٹولی پر سعید میاں بڑے خراٹے لے رہے ہیں اور اُدھر والی چارپائی پر بستر لپٹا پڑا ہے۔ باورچی خانہ سے برتنوں کی آوازیں کھڑکنے کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار بھی صغیر کو سُنائی دے رہی تھی۔ ناشتہ تیار کرنے کا آج شاید سلمیٰ کا نمبر تھا۔ صغیر کو ابھی چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ دو تین روز اور پلنگ پر لیٹے لیٹے خیالات کے گورکھ دھندے سے اُلجھتا رہا۔ سلمیٰ کا کہنا صحیح ہوا۔ نہ وہ آندھی آئی اور نہ ویسی گھٹا چڑھی۔ انہیں باتیں کرنے کا پھر موقعہ نہ ملا۔ پہلے تو صغیر کو سلمیٰ کی شادی کی تیاریوں کا پتہ ہی نہ تھا۔ اب سلمیٰ سے سُنکر جو اُس نے عورتوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینا شروع کیا تو اُسے واقعی گھر میں غیر معمولی چہل پہل نظر آئی۔ سب کچھ ہمارے خلاف مرضی اس سے جلد سے جلد ختم ہوتی جا رہی ہے۔

سلمیٰ کی شادی ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ باوجود اپنی انقلابی ذہنیت کے صغیر اتنی جرات و ہمت نہ کر سکا کہ اُسے اپنانے کی کوشش کرتا۔ وہ اب لکھنؤ جا چکی تھی۔ اِس عرصہ میں وہ دو بار میکے آئی۔ پہلی مرتبہ صغیر شملہ گیا ہوا تھا۔ اور دوسری دفعہ اُس وقت جب کہ کرسمس میں کالج کی جیوگریفیکل سوسائٹی کے ساتھ وہ کانگڑہ کے آتش فشاں پہاڑوں، چائے کے باغات اور جو گندر نگر کے بجلی گھر کی سیر کر رہا تھا۔

دسہرہ کی تعطیلات میں کالج کی ٹیم کو لکھنؤ یونیورسٹی سے میچ کھیلنے جانا تھا۔ سلمیٰ کا شوہر اکبر لکھنؤ میں تھا اور سلمیٰ بھی وہیں تھی۔ لیکن صغیر نے انہیں کوئی اطلاع نہ دی۔ گھر والوں نے سیدھے سبھاؤ لکھدیا کہ صغیر فلاں دن سوار ہو کر فلاں دن لکھنؤ پہنچ رہا ہے۔ اکبر کو یقین تھا کہ صغیر ضرور اُس کے ہاں قیام کریگا۔ لیکن وہ ایک ذات شریف تھے۔ ٹیم کے ساتھ ہوٹل میں جا اُترے۔ اکبر کو دفتر سے چھٹی نہ مل سکی اور وہ سٹیشن نہ جا سکا۔ آخری ہفتہ تھا۔ تین بجے دوڑا دوڑا گھر آیا۔ اُمید تھی کہ صغیر گھر پہنچ گیا ہوگا۔ وہاں نہ پاکر اکبر صغیر کو ہوٹلوں میں ڈھونڈتا پھرا۔ خدا خدا کر کے پرنس ہوٹل میں ملاقات ہوئی۔ خوب بھینچ بھینچ کر دو دو تین تین بار گلے ملے۔ آخر چچازاد بھائی تھے۔ مدتوں کے بعد ملنا ہوا تھا۔

صغیر اکبر کے ساتھ حضرت گنج جا رہا تھا۔ لیکن اس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ چلتا اور ٹھٹک جاتا۔ ۲۱ رجون کی آندھی اور اس رات کی تمام باتیں اس کے ذہن میں تلاطم برپا کر رہی تھیں۔ سلمیٰ کے سامنے کس مُنہ سے جائے۔ وہ انقلابی دعوے۔ وہ طفل تسلیاں۔ وہ وعدے وعید۔ سلمیٰ تو اُس سے نفرت کرتی ہو گی۔ کیا مُنہ لیکر جائے اُس کے سامنے۔ اور اس اکبر کو دیکھو کس مزے سے اس ڈاکو کو گھر لئے جا رہا ہے۔ جس نے اُس کی دولت لوٹنے کے منصوبے کئے تھے۔

"لو سلمیٰ صغیر آ گئے۔ دُنیا کا خون آج کل کتنا سفید ہو گیا ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر ہوٹل میں جا ٹھہرے حضرت۔ نہ خط پتر سے واسطہ نہ میل ملاقات سے۔ آئے بھی تو چوروں کی طرح۔"

سلمیٰ اُس وقت میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ جیسے اُسے معلوم تھا کہ صغیر آنے ہی والا ہے۔ "لاؤ بھئی کھانا نکالو۔ میرے پیٹ میں تو چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ صغیر تم بیٹھو نا۔ میں ہاتھ دھو کر ابھی آیا۔" اکبر نے غسل خانے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

کھانے سے فراغت پاکر اکبر نے دو چار گراموفون ریکارڈ بجائے۔ اور اُسکے بعد کوئی آدھ گھنٹہ تک گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر دونوں تفریح کے لئے باہر نکل گئے رات کے نو بجے واپس گھر لوٹے۔ اکبر نے صغیر کو کھانے پر مجبور کیا۔ مگر وہ "ابھی پانچ بجے تو ڈٹ کر کھانا کھایا ہے" کی رٹ لگاتا رہا۔ آخر نیصلہ یہ ہوا کہ چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ رکھ لئے جائیں تاکہ رات بھر کیلئے سہارا ہو جائے۔

سلمہ آنے والی سردیوں کے لئے سویٹر بُن رہی تھی۔ سلائیاں بہت تیزی سے چلتیں۔ مگر کبھی کبھی صغیر کا چہرہ دیکھکر اسکی اُنگلیاں یکایک رُک جاتیں اور ایک آدھ منٹ کے بعد پھر چلنے لگتیں۔

"تم کچھ بولو نا" اکبر نے سلمہ سے کہا۔

"کیا بولوں۔ سُن تو رہی ہوں۔ آپ کی باتیں" سلمہ نے مصنوعی طور پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"شادی سے پہلے سُنا کرتا تھا کہ سلمہ نہایت خاموش لڑکی ہے میرا خیال تھا کہ میں خود گویا ہوں۔ اپنی دُلہن کو بھی باتونی بنا دوں گا۔ مگر ڈیڑھ سال کی محنتِ شاقہ کے بعد بھی یہ ویسی ہی رہیں۔ جیسے پہلے تھیں" اکبر نے سلمہ کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں ان کی"۔ صغیر نے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ مگر سلمہ اکبر کی نظریں بچا کر صغیر کی طرف ایسی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ گویا بھسم ہی کر ڈالے گی۔ جب صغیر کی آنکھیں سلمہ سے چار ہوئیں تو وہ پھر سلائیوں میں اُون اُلجھانے لگی۔ مگر صغیر نے ایک آئینہ میں سلمہ کی تیلیوں میں بودا، ڈرپوک، بیوفا وغیرہ الفاظ ناچتے دیکھ لئے تھے۔

ساڑھے دس بج چکے تھے۔ صغیر نے اکبر سے سونے کی اجازت چاہی۔ اکبر نے اپنے برابر والے کمرہ میں صغیر کیلئے پلنگ بچھوا دیا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ۔ رات خاصی خنک ہو جاتی تھی۔ مگر لوگ اب بھی دروازے کھڑکیاں کھول کر سوتے تھے۔

صغیر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ برابر والے کمرہ سے اکبر کے بولنے کی آواز آتی رہی۔ پھر بجلی بجھی اور تاریکی چھا گئی۔

چاند کی آخری راتیں تھیں۔ آسمان پر صرف ستارے ہی اپنی روشنی سے بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہ دکھانے اور تاریک دلوں میں اُجالا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ صغیر کو بھلا نیند کہاں آتی۔ کمرے کی کھڑکیوں میں سے وہ ستاروں کی چہک زنی دیکھ رہا تھا۔ ڈیڑھ سال کے بعد بھی یہ آسمان ویسا ہی ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس رات بادل اور عناصر میں ہیجان تھا اور آج آسمان سرد ہے۔ اس وقت بھی سلمہ قریب لیٹی ہوئی تھی۔ مگر ہاں کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ "خاندان کے قانون تو دیوتا بھی نہیں توڑ سکتے" سلمہ کا کہنا اُسے یاد تھا۔ یہ گھٹا پھر کبھی نہ چڑھے گی۔ واقعی اُس رات کی سی گھٹا پھر کبھی نہ اُٹھی۔ اس وقت اکبر کے ہاتھ سلمہ کے رخساروں پر ہونگے۔ مگر کیا سلمہ کے گال بھی ویسے ہی گرم ہونگے جیسے اُس رات تھے۔ اور اب سلمہ کے قدموں میں۔ گفتگو میں نظروں میں وہ مخصوص احتیاط کہاں رہی ہوگی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ کس قدر محتاط تھی۔

صغیر کو ان خیالات نے بے چین کر دیا۔ وہ کروٹ بدلتا رہا۔ اُسے نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ گھنٹے نے دو بجائے۔ صغیر کو اکبر کے خراٹوں کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

"کس مزے سے سو رہا ہے صغیر" زیرِ لب بڑبڑایا۔ اس کا دماغی انتشار بڑھ رہا تھا۔ اُس کے خیالات نے الفاظ کی صورت اختیار کر لی۔ وہ اپنے ہی سے باتیں کرنے لگا۔ اُس پر ویسی ہی حالت طاری ہو گئی جو ڈیڑھ سال پہلے آندھی والی رات کو اُس پر گذری تھی۔

"اکبر کیا چین کی نیند سو رہا ہے۔ اُس کی دولت جو اُس کے پاس ہے" صغیر کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑایا۔

"نہیں میں آپ کے سرہانے ہوں"

صغیر نے تاریکی میں سر اُٹھایا۔ بالکل ڈیڑھ سال پہلے کی طرح۔ تاریکی میں اُسے کچھ نظر نہ آیا۔

صغیر صاحب! میں آپ کے پاس کھڑی ہوں" سلمہ نے جھک کر صغیر کے کان میں کہا۔

"سلمہ"! صغیر مضطرب ہو کر قدرے بلند آواز میں بولا۔

سلمہ نے فوراً صغیر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہوش میں آئیے" سلمہ نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "آپ کا قرب میرے لئے باعثِ امتحان ثابت ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے واپس ہوٹل چلے جائیے۔ آپ کو میری قسم فوراً یہاں سے چلے جائیے۔"

یہ کہکر سلمہ خاموش دبے پاؤں اپنے کمرہ میں چلی آئی۔

غیر شعوری طور پر صغیر لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا۔ جلد جلد اُلٹے سیدھے کپڑے پہن مکان سے نکلا۔ اور دیوانوں کی طرح ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

لمعات

(از حضرت اختر شیرانی)

غمِ زمانہ نہیں اِک عذاب ہے ساقی — شراب دے مری حالت خراب ہے ساقی
ہیں سحر مے سے بہم میکدہ میں شام و سحر — کہ ماہتاب قدح آفتاب ہے ساقی
کتاب پڑھنے دے زاہد کو جا کے مسجد میں — مرے لئے ترا ساغر کتاب ہے ساقی

کِھلا رہی ہے نئے پھول یاسمینِ فلک
پِلا وہ پھول کہ رشکِ گلاب ہے ساقی

غزل

لطفِ دوزخ بھی لطفِ جنت بھی — ہائے کیا چیز ہے محبت بھی
عشق سے دُور بھاگنے والو — تھی یہی پہلے اپنی حالت بھی
جینے والا بنالے جو چاہے — زندگی خواب بھی حقیقت بھی
حالِ غم کہہ کے بھی کہا نہ گیا — آ گئی اپنے سر پہ تہمت بھی
نہ ہوئی جو بسر ترے غم میں — حیف اُس زندگی کی قسمت بھی
عشق آفت سہی مگر ناصح — کم نہیں کچھ تری نصیحت بھی
ایک وہ بھی زمانہ آتا ہے — خواب بن جاتی ہے حقیقت بھی
نازِ اخفائے غم بجا لیکن — تو نے دیکھی ہے اپنی صورت بھی

اُف وہ دورِ نشاطِ عشق خمار
لطف دیتی تھی جب مصیبت بھی

از
جناب خمار صاحب
بارہ بنکوی

کتاب السّلف (مسلسل)

(از علامہ سیماب اکبرآبادی)

سلسلہ کے لئے "ادیب" ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء ملاحظہ فرمائیے

نوابِ انعام اللہ خان یقینؔ دہلوی

یہ تذکرہ مجھے میرؔ، سوزؔ اور دردؔ سے پہلے لکھنا چاہیے تھا۔ مگر میں غلطی سے یقینؔ کو مشہور شاعر نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے جس طرح اس دور کے بعض دوسرے غیر مشہور شعرا کو دانستہ نظرانداز کردیا اسی طرح یقینؔ دہلوی کا ذکر بھی چھوڑ گیا۔ لیکن اب جو تذکروں پر نظر ڈالتا ہوں تو ہر تذکرے میں یقینؔ کا ذکر نظر آتا ہے۔ نکات الشعرا۔ تذکرہ شعرائے ہند۔ تذکرہ ہندی۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ گلشنِ ہند۔ طبقات الشعرا۔ سخن شعرا۔ گلشن بے خار سے لیکر خمخانۂ جاوید تک اس جواں مرگ شاعر کے حالات تمام تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں۔ اسکے علاوہ جب کلام دیکھا تو دل خوش ہوگیا اس لئے ان کا ذکر چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ تذکرے کی ترتیب کے وقت یہ تذکرہ اپنی مناسب جگہ پر چلا جائے گا۔

نام، ولادت و سکونت انعام اللہ خاں نام، یقینؔ تخلص۔ ۱۱۴۰ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ اظہرالدین خانی۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں "نواب مبارک جنگ بہادر" کا خطاب پایا۔ اور ہزار و پنجصدی منصب پر فائز ہوئے۔

یقینؔ کے دادا، حضرت شیخ عبد الاحد نقشبندی مجددی المعروف بہ "شاہ گل" المتخلص بہ گُل سرہند شریف کے سجادہ نشین تھے۔ اُن کے بیٹے شیخ اظہرالدین سرہند سے دہلی چلے آئے۔ اور نواب حمید الدین خاں کی لڑکی سے شادی کرلی۔ جو بہادر شاہ کے زمانے میں عصائے مرصع، خدمت میر تزک۔ اور داروغگیٔ گرزبرداران سے ذی عزت تھے۔ اور "بہادر عالمگیری" کے خطاب سے سرفراز ہوئے تھے۔ محمد شاہ کے زمانے تک یہ اسی تزک و احتشام کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔

شادی یقینؔ کی شادی خواجہ میر دردؔ دہلوی کے خاندان میں ہوئی۔ تین لڑکے آپ کی یادگار تھے۔ مرید حسین خاں مرید۔ صمصام اللہ خاں اکمل۔ مقبول نبی خاں مقبول۔

تلمذ یقینؔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔

اعترافات "یقینؔ شاعر ریختہ، صاحب دیوان۔ از بسکہ اشتہار دارد محتاج به تعریف و توصیف نیست" (میر تقی میرؔ)

"جو اشعار یقینؔ کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں اُن سے بہتر پائے کے اشعار ہونا دشوار ہے۔" (ناسخ)

"ریختہ گوئی را برطاقِ بلند گزاشتہ و تخم معنی را در زمین سخن کاشتہ انچہ از طبعش سرزدہ از فرطِ شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بہ افواہ والسنہ جاری شدہ۔" (فتح علی گردیزی)

"صدر نشین بزم شعرائے متاخرین" (قیام الدین قائمؔ)

"الحاصل یقینؔ یکتائے عصر و یگانۂ زمانہ است" (شفیق اورنگ آبادی)

"مشق سخن او بہ پایۂ استادی رسیدہ بود۔ . . . . . ہر قدر کہ دیوانش مرتب است ہمہ انتخاب واز درد خالی نیست۔" (قدرت اللہ شوق)

"اشعارش بسیار نمکین و موثر اند سخنِ او خالی از دردمندی نیست" (میر حسن)

"درد وردِ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ راشستہ و رفتہ گفتہ این جوان است۔" (مصحفی)

"اگر یقینؔ جیتے رہتے تو میر ہوں یا میرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔" (گل رعنا)

تلامذہ شیر سنگھ ظہور، سیتا رام عمدہ اور عبد الولی عزلت کو بعض تذکرہ نو...

ؔ حسب وعدہ میرا ارادہ تھا کہ میر تقی میرؔ اکبرآبادی کے چھ دیوانوں میں سے ہر دیوان کا انتخاب پیش کروں۔ مگر غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ کلیات کا انتخاب ایک علیحدہ کتابی صورت میں موزوں ہوسکتا ہے۔ تذکرے میں اسکی گنجائش نہیں۔ انتخاب کی جو صورت پہلے دیوان میرؔ کے تجزیے سے پیدا کردی گئی ہے وہی باقی پانچ دیوانوں کے انتخاب میں کام آسکتی ہے۔ اگر زمانے نے فرصت، عمر نے مہلت اور خدا نے توفیق دی تو کلیات میرؔ کا مکمل انتخاب میں اپنے قلم سے علیحدہ کتابی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرونگا۔

سیماب

...یقینؔ ... ہے۔

وفات: ابھی یقینؔ کی عمر صرف ۲۹ سال کی تھی کہ ۱۱۶۹ھ میں ان کے والد نے کسی نامعلوم قصور پر انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا ... شاعر ... وادی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے اپنے تذکرے چمنستان شعرا میں یہ تاریخ انتقال درج کی ہے:

شاعر نازک سخن و خوش خیال　　کرد سفر جانب ملک عدم
سال وصالش خرد نکتہ سنج　　گفت یقینؔ رفت بسوئے ارم

۱۱۶۹

...ن عبرتناک موت شاید ہی کسی شاعر کی ہوئی ہو۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

انتخاب کلام یقینؔ

...لو وحشت یہ ہوگیا سارا ہی کیا کہئے　　کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا
...دی اس دیوانے دشت خاک بیکساں ناحق　　غبار ان کا اگر رہتا تو پیمانے کے کام آتا
لیا گھیر اس یقیںؔ نے عشق کا آتشکدہ سارا
کوئی شعلہ بھی بچ رہتا تو پروانے کے کام آتا

...میں بخیر افسوس لذت سے اسیری کی　　جو میں یہ جانتا کنج قفس میں آشیاں کرتا

...ں الفت کا کرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ　　یہ اتنا کار آساں اس قدر دشوار کیا...

...ہیں معلوم اپنے سال میخانے پہ کیا گذرا　　ہمارے تو بہ کر لینے سے پیمانے پہ کیا گذرا
...ہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے　　خدا جانے تری صورت سے میخانے پہ کیا گذرا

...ہتے داغ سے تر سینۂ سوزاں میرا　　آب و رنگ آگ سے رکھتا ہے گلستاں میرا

...وہ جس سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں　　یقیںؔ سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا

...تے ہیں کہ تسخیریں آئینے کو آتی ہیں　　دل سے نہ ہوا جو کام آئینے سے کیا ہوگا

...ر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا　　ہمیں ظل ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

جو کچھ کہیں یہ مجھکو یقیںؔ ہے سزا تری　　شیوہ تو تمکوں کا ہوا کیا تمہارا تھا؟

دام قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک　　دیکھا تو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

داغ محل دھوپ سے ... نکالا گیا... پانی ... گردیا　　حال گزشتہ ... کے ہاتھ کیا آیا

کافر ... اس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہوگیا　　جس مسلماں نے اسے دیکھا وہ کافر ہوگیا

سچ کہو اے بلبلو کس باغ سے آتی ہو تم　　ہے ہمارے بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر

جو لوہا جس نے اسکو لگا نا ہاتھ کیا حاصل　　بہت کی تو نے اس پیشے کی حد کوہکن بس کر
بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو　　یقیںؔ کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

یہ زمیں سیلاب سے ہوتی نہیں ہے چاک چاک　　دشت کی چھاتی پھٹے ہے سنکے دیوانے کا شور

بعد مرنے کے بھی ہوں گور میں غمناک ہنوز　　گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز
پی کے مستوں نے زمیں پر جو گرائی تھی شراب　　سبز ہوتا ہے اسی سے شجر تاک ہنوز
سبزہ اگنے کا نہیں مجھ پہ برس مت اے ابر　　گرم ہے آتش سودا سے مری خاک ہنوز

گرمی اہل بزم مت کر کہ میں ہوتا ہوں داغ　　شمع کی خدمت میں ہے اتنی ہی پروانے کی عرض

دن جنوں کے آن پہنچے، ہوشیاراں الوداع　　فصل گل نزدیک آئی اے گریباں الوداع
ہم سے تھا ویرانہ کچھ آباد سو ہم بھی چلے　　اب خدا حافظ تمہارا اے غزالاں الوداع

بے حجابی بسکہ شان حسن کے لائق نہیں　　بزم میں فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع
باد سے برہم نہیں ہوتا ہے یہ شعلہ یقیںؔ　　بلکہ پروانے کی گستاخی سے جھنجھلاتی ہے شمع

ہم تو اب مرتے ہیں اور بجھتا ہے الفت کا چراغ　　دیکھئے کب ہووے روشن پھر محبت کا چراغ
آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب　　رات دن جلتا ہے یکساں داغ حسرت کا چراغ
خاندان درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقیںؔ　　ہر مرا ہر داغ سینے میں مصیبت کا چراغ

کون سمجھے آہِ پیری شورِ بلبل کا جواب — کون ہو جز جیبِ زخمی گلستاں کا حریف
سالہا سوزِ محبت کو چھپایا تھا یقیںؔ — ہاتھ آخر ہو گیا میرے گریباں کا حریف

چمن میں مجھ سے دیوانے کو لیجا نے سے کیا حاصل — دکھا کر گل جنوں کو شور میں لانے سے کیا حاصل
ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہو تو دارو ہے — یہ سب کچھ حسن کے ساقی باتیں پی جانے سے کیا حاصل

سو ہوئی آخر، رہی تدبیر غم کی ناتمام — کس سے دل خالی کریں، اب چکا مینا تمام

فیض ہوتا ہے کہیں پیدا نہ مکاں پر نازل — ہے وہی طور، وہ لے شعلۂ دیدار کہاں
عیش و راحت کے تماشی ہیں یہ سارے بے درد — ایک ہم کو ہے یہی فکر کہ آزار کہاں

ہم تو حاضر ہیں عشقِ یار کہاں — خار و خس جمع ہیں، شرار کہاں
باغباں ورنہ بند کر آخر — ہم کہاں، تو کہاں، بہار کہاں
موج میں آبِ زندگی کی یقیںؔ — مزۂ تیغ آب دار کہاں

عمر آخر ہے، جنوں کر لیں، بہاراں پھر کہاں — ہاتھ مت پکڑو مرا یارو، گریباں پھر کہاں
اس طرح صیاد کب آزاد چھوڑے گا تمہیں — بلبلو دھومیں مچالو، بوستاں پھر کہاں

کعبے بھی میں گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق — اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
ہیں سو سو التفات تغافل میں یار کے — بیگانگی سے اسکی کوئی آشنا نہیں

دردِ دین ہم کو کچھ اس آگ سے مقصود نہیں — عشق پھیکا ہے اگر زخم نمک سود نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا، وفا نہیں — بندوں کو اعتراض خدا پر، بجا نہیں

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں — اس آفتاب کا کس ذرے میں ظہور نہیں

یہ سینہ عشق سے، محروم درد و داغ نہیں — ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں
خدا کرے کہ یہ روشن رہے قیامت تک — چراغِ گور ہے مستوں کا یہ ایاغ نہیں

بجائے عقل سے کچھ چھوٹنے کی راہ نہیں — بغیر میکدہ یارو کہیں پناہ نہیں

نہ کر مضائقہ گر تجھکو ہے ستم کی ہوس — کوئی دیارِ محبت میں دادخواہ نہیں
خجل نہ کر مجھے، مہماں ہو مرا اے عشق — کہ میری آنکھ میں آنسو، جگر میں آہ نہیں

کرتا ہے کوئی یارو اس وقت میں تدبیریں — مرنے کو ہے دیوانہ، اب کھول دو زنجیریں

نہ گذرا ہوگا کوئی مجھ سا نرگس، باؤلے پن میں — گریباں آپ پھاڑے ہے پھٹکے گل کی طرح دامن میں

کہاں تاثیر ہے نالے میں اے مرغِ قفس چپ رہ — عبث صیاد کو ناخوش بھی کیوں کرتا ہے بس چپ رہ
کوئی آوارگی کو چھوڑ، کیونکر راہ پر آئے — عبث تو شور و شر کرتا ہے آ نالے جرس چپ رہ
گیا ہوگا، تو کیا یار کی گلیوں میں راتوں کو — نئی تقصیر میں نے ہی نہیں کی، اے عسس چپ رہ
کسو کا دستِ کوتہ اسکے دامن تک کہاں پہنچے — تمنا کی زباں مت کر دراز اے بوالہوس چپ رہ

یقیںؔ یہ نالہ تیرا کیا بلا لائے گا ڈرتا ہوں
لگا مت گھر کو اپنے آگ اے آتش نفس چپ رہ[1]

منہ اپنا نہ دیکھا کر، ہو جائے گا دیوانہ — آئینے کو کہتے ہیں اے شوخ پری خانہ

ملے جسکو ہمیشہ سا رقیب، اس کا خدا حافظ — زلیخا قید گر کرتی نہ یوسف کو تو کیا کرتی ؟

مسافر ہو کے آئے ہیں جہاں میں اپنے وحشت ہے — قیامت تھی اگر ہم اس خرابے میں وطن کرتے

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے — وصیت ہے، ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے
نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے، اب نالہ کرتا ہوں — مری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہنچے
ہمیں اس غم کے ہاتھوں زندگی اب خوش نہیں آتی — کوئی بیداد گر یارب ہماری داد کو پہنچے

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھکو بہاراں میں — عبث لیتے ہو اسکو، کیا رہا ہے اب گریباں میں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو — کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانے پن میں

بمقدارِ جفائے یار بڑھتی ہے وفا میری — کوئی چاہے تو آ دیکھے محبت اسکو کہتے ہیں

---

[1] اس قافیہ و ردیف کے ساتھ ایسی اچھی غزل یقیںؔ کی قادر الکلامی کا یقین دلاتی ہے۔ (سیماب)

یقیں مارا گیا تیغِ محبت پر تو ہے طالع — شہادت اسکو کہتے ہیں سعادت اسکو کہتے ہیں[1]

اسیرانِ قفس کی نامرادی پر نظر کیجو — بہار آئے تو اے صیاد ستم گر خبر کیجو

خدا کرے کہ کہیں حق بہ حقدار ثابت ہو — مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

ہمیں بے پردگی کی مرگ نسبت تجھکو اے مرگ — تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھکو بیخوابی کے ساتھ — جمع آسائش کہاں ہوتی ہے بیتابی کے ساتھ

جو سر پاؤں پہ رکھا کیجے تو خوش ہو دیں بتاں ہم کو — ولیکن ہائے نومیدی یہ جرات کہاں ہم سے

خبر کیا پوچھنے مرغِ چمن سے آشیانے کی — اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی

گریباں چاک کرنے سے ہمارے کیا ہوا ناصح — ہمارا ہاتھ جانے اور ہمارا پیرہن جانے
خطا ہے تہمت سر کی یار کو دیوانِ نقیبوں کو — ہماری تم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

یہ وہ آنسو ہیں جن سے زہرہ آتش ناک ہو جائے — اگر پی لے کوئی انکو تو جلکر خاک ہو جائے
دُعا ستوں کی سنتے ہیں یقیں تاثیر رکھتی ہے — الٰہی سبزہ جتنا ہے جہاں میں تاک ہو جائے

نہیں کوئی کہ دشنام اسکی ہم تک یا دُعا لائے — گیا ہے دل، اب اسکو دیکھئے کب تک خدا لائے

اگر بخیر ہمیں یاد کر نہیں سکتا — کبھو بُرا ہی ہمیں کہہ ترا بھلا ہوئے

کچھ رنگ نہیں نغمہ و آہنگ میں اس کے — بلبل جو بہاراں میں گرفتار نہ ہووے
دل بیچ ہو گیا خوب ہوا سوختہ بہتر — وہ جنس کہ کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

---

[1] یقیں کا یہ شعر یقیناً الہامی ہے۔ شاعر کے قلم سے اکثر ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جنکا صدق مستقبل میں ہوتا ہے۔ یقیں بجرم محبت ہی پر قتل کئے گئے۔ اس سے انکے شہید ہونے میں شبہ نہیں۔ پھر باپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اس سے بڑھکر سعادت اور ۔۔۔ ۔۔۔ ۲ ۔۔۔ فرمایا ہے۔ سیماب

بہار آئی ہے جب سے تب سے رگ میں غم نہیں تھمتا — [illegible]

ملا گر بیسوں کھیا ہوا، خسرو نہیں ملتا — [illegible]
جفا پر دلبروں کی صبر کرنا ہی مناسب ہے — یقیں دعویٰ وفا کا کرکے [illegible]

اس سبز پوش سے آغوش رنگیں کیجے — جی میں ہے اس معرکۂ مژدہ کو تضمیں کیجے

بیقراری کب ٹھہرنے دے ہے مجھکو زیرِ تیغ — مارنا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا نہ کوئی کسی سے وفا کرے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں، خدا نہ کرے
دوستی بد بلا ہے اس میں خدا — کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے
ہے وہ مقتول کافرِ نعمت — اپنے قاتل کو جو دُعا نہ کرے
ناصحو یہ بھی کچھ نصیحت ہے
کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

نہ تھی پرواز قسمت میں مری، صیاد پر اتنا — صبا سے کہیو میری خاک گلشن میں اُڑا لا

عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا — نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا

اس اشک و آہ سے سودا اگر نہ جا کہیں — یہ دل کچھ آب دیدہ ہے، کچھ جلا ہے
یہ آرزو ہی کہ اس بیوفا سے یہ پوچھوں — کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا ہے

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر — کہتے تو کچھ یہ پر اس نہ آئی وہ

حسن اور عشق میں اک طور کی نسبت ہے ضرور — چشمِ بیمار تجھے دی ہے، دلِ زار
جب سے نظارہ کیا ترک، ہوا حال دل سرد
گرم رکھتا تھا یقیں شعلۂ دیدار تجھے

کب ہوس ہے مجھکو رسوائی کی لیکن کیا کروں — کھینچ کر لاتی ہے اس کوچے میں [illegible]

بیست کو ہم گرفتار کرتے ہیں یقیں — ان ... ساتھ لئے جاتے ہیں

بہ شکل ہم شکر اتنی بھی کرتا ہے جفا کوئی — کرے گا بعد میرے کس توقع پر وفا کوئی
چمن پر یک تبسم کر کے ہے لے جاتے صبا کوئی — ... ایک غنچے کا
گذر جا دل سے۔ گر ہجر میں دیکھے رضا اسکی
محبت میں یقیں لیتا ہے نام مدعا کوئی

دل چھوڑ گیا ہم کو، دلبر سے توقع کیا — اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے[1]
صحرا میں یقیں آہوا کیا خوف سے پھرتے ہیں
خبر دس نہ کہیے تو دیوانے کو کیا کہیے

یہ تھا نواب یقین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا تجزیہ۔ پورا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان بھی وہی تھی جو گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے شعرا میں مستعمل تھی۔ کبھو، کسو، ٹک، تئیں۔ جانے۔ آئے۔ نیں (بجائے نہیں) زور (بمعنی بہت) سجن۔ تجھ (بجائے تیری) نپٹ۔ مت۔ ادھر۔ کیدھر ستی سیتی۔ جاگہ وغیرہ الفاظ ان کے یہاں بھی موجود ہیں۔ جا بجا بہت بری تعقید بھی پائی جاتی ہے۔ بعض الفاظ جو مسلمہ طور پر مذکر ہیں۔ یقیں نے انہیں مونث استعمال کیا ہے۔ مثلاً ؎

رات دن خوباں کو ہے دل ہائے مفتوں کا تلاش

(یا) ؎ ہُوا پہ ویر کے جینے کا مرگ کو کہن باعث

وغیرہ وغیرہ۔

یہ یقین کے کلام پر فنی ولسانی مختصر تبصرہ تھا۔ لیکن اگر یقین کو صرف ذوق و وجدان کی نظر سے دیکھا اور پرکھا جائے تو انصاف مجبور کر دیتا ہے کہ ان کے متعلق صاحب "گل رعنا" کی رائے تسلیم کر لی جائے۔ درد و اثر اور دل نشینی و دل گرفتگی میں وہ اکثر اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں دل کھینچنے والا ایک مقناطیسی اثر ہے جو اُن کے الفاظ یا اُس دور کی زبان سے احساس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔

ان کی تخیل بعض اوقات اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہاں کوئی دوسرا شاعر رسا نظر نہیں آتا۔ مثلاً ان کا یہ شعر ادب اردو میں بے ہمتا، بے مثل اور بے نظیر

---

[1] یہ مصرعہ بھی ضرب المثل ہے۔ سیماب

معلوم ہوتا ہے ؎

ملے جسکو پیمبر سا رقیب، اُسکا خدا حافظ — زلیخا قید گر کرتی نہ یوسف کو تو کیا کرتی

گو یقین کی تمام شاعری صرف گنتی کے موضوعات پر مبنی ہے۔ یعنی قیس و فرہاد۔ ساقی اور شراب۔ چمن آشیان قفس۔ جنون اور حسن و عشق۔ لیکن آخری موضوع میں جہاں "غم عشق" کی نفسیاتی ترجمانی ہے۔ وہاں اُنکے کلام میں ایک ایسی حلاوت، ایسی کشش، ایسا جذبہ اور ایسی ربودگی ہے جو انہیں کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

یقین مرحوم سودا۔ درد۔ اور میر کے بعد پیدا ہوئے۔ صرف سوز سے وہ تین برس بڑے تھے۔ مگر سودا چھبیس برس۔ میر درد تیس برس۔ میر سوز چالیس برس اور میر تقی میر چھپن برس یقین مرحوم کے بعد تک زندہ رہے۔ تاہم اُن کے چھوڑے ہوئے دیوان میں دل و روح کے لئے جو سامان جراحت موجود ہے۔ بلحاظ عمر اُن سب سے زیادہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے مابعد نے ان کے کلام اور طرز کلام سے بحد کافی استفادہ کیا ہے۔ یقین کی عمر ہنگام رحلت صرف ۲۹ سال کی تھی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ان کا ذوق شاعری بارہ برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا تو صرف سترہ برس میں اُن کی ہونہار طبیعت نے ایسے جواہر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے۔ جو میر اور سوز کے یہاں پختہ سالی کے بعد نظر آتے ہیں۔ وہ ہونہار بھی تھے اور جان باز بھی۔ اس لئے قدرت نے اُن سے وہ کام تھوڑے سے وقت میں لے لیا جو دوسرے شعرا نے آن سے نصف صدی بعد انجام دیا۔ اس میں ان کے استاد مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تصرف ضرور تھا۔ اور بعض نقاد تو یقین کی پختہ کلامی اور نغز گوئی سے متاثر ہو کر یہ الزام بھی لگا بیٹھے ہیں کہ یقین کا سارا کلام مرزا مظہر جانجاناںؒ کا کہا ہوا ہے۔ وہ شاید اس حقیقت سے واقف نہیں کہ مرزا مظہرؒ نے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جو کچھ کہتے تھے صرف فارسی میں کہتے تھے۔ اردو شعر کہنا ارادتاً ترک کر دینے کے بعد انہیں ایسی کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنے شاگرد کے نام سے اردو میں شعر کہتے۔ اگر وہ خود کہتے اور خود پڑھتے تو اُن پر کوئی قدغن نہ تھا۔ نہ کوئی حد شرعی عائد ہوتی تھی۔

یہ ایک عام وبا ہے کہ جب کسی مشہور شاعر کا کوئی شاگرد اچھا شعر کہتا ہے تو اُس پر بدگمانی کی جاتی ہے کہ وہ شعر اُس کا نہیں ہے اُس کے اُستاد

---

[1] مثلاً میر تقی میر۔ مصحفی۔ علی ابراہیم خاں۔ مرزا علی لطف۔ دلیم بیلی۔ خواجہ حمید الدین اورنگ آبادی۔

کا ہے بہر استاد کی موجودگی اور زندگی میں اس قسم کا الزام لگانا اور استاد کا تردید کرنا ایک تعجب خیز بات ہے۔

حضرت مرزا مظہر ایک صوفی بزرگ تھے۔ انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ ریاکارانہ طور پر یقین کے پردے میں ظہور فرماتے۔ مرزا صاحب ۱۱۹۵ھ میں یقین کی شہادت سے چھبیس ۲۶ برس بعد شہید ہوئے۔ اس چھبیس ۲۶ برس کی معتدبہ مدت میں مرزا مظہرؒ نے اپنے کسی دوسرے شاگرد کے کلام میں ظہور کیوں نہ فرمایا۔ ایسے سلیس و نفیس اشعار جیسے یقین کے ہیں اگر مرزا صاحبؒ کی قوتِ فکر کا نتیجہ تھے تو انہیں اپنے ہی نام سے پڑھنے یا شائع کرنے میں کیا عذر مانع تھا۔ اور کیا

اندر میں شعر کہنے سے ان کا پرہیز صرف نمائشی تھا۔

بہرحال ہمیں کسی قسم کا سوءِ ظن پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو غزلیں یقین کے نام سے بصورت دیوان شائع ہوئی ہیں یقین کر لینا چاہیئے کہ وہ انہیں کی ہیں۔ البتہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یقین کے کلام میں اُن کے اُستاد کا پرتو اور تصرف ضرور ہے۔ اور الولد سر لابیہ۔ ایسا ہونا ہی چاہیئے ؎

(باقی باقی)

مجاہد کی صدا

قاضی نذر الاسلام کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ

(از نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

گھٹائیں، قبر سی تاریک راتیں، آندھیاں، طوفاں
یہ شاہد ہیں کہ سونپی ٹوٹی کشتی میں نے موجوں کو
مرے نقشِ قدم کو دیکھنے کیا کیا مچلتی ہیں
نکل کر بجلیاں ابرِ سیہ کی خوابگاہوں سے

مرا سایہ جہاں پڑتا ہے ویراں رہگزاروں پر
وہاں سے پھوٹتی ہیں کونپلیں، انگڑائیاں لیتی

مرے نوحوں کو سُن کر زندگی کی سانس لیتا ہے
چراغِ کشتۂ گورِ غریباں جھرجھری لے کر

نئی شمعیں فروزاں کر رہا ہوں ہر شبستاں میں
حیاتِ نو، فراتِ کربلا کا تیز دھارا ہے
مگر ساحل مرے دریا کا قربانی کا پیاسا ہے
اُدھر لشکرِ ستم کے موج در موج اُمڈے آتے ہیں

میں اس دریا کو پیغامِ عطش اپنا سناتا ہوں
جو عباسِ علی نے روزِ عاشورہ سنایا تھا
کوئی فرعون جب اُٹھتا ہے موسیٰ کے مٹانے کو
اُسے میں نیل کا سیلاب بن کر غرق کرتا ہوں

کوئی نمرود جب اُس نعرۂ حق کو دباتا ہے
لبِ معجز بیاں پہ جو خلیل اللہ کے جاری تھا

دوبارہ گلکدہ آتش کدے کو میں بناتا ہوں
گھٹائیں، قبر سی تاریک راتیں، آندھیاں، طوفاں
یہ شاہد ہیں کہ سونپی ٹوٹی کشتی میں نے موجوں کو

وطن، سہمے وطن کو درسِ جرأت آزما دے کر
دلِ پیری میں بھرتا ہوں اُمنگیں نوجوانی کی۔ بہارِ جاودانی کی
اڑاتی ہے جانبازی مری روشن مناروں سے
دہکتی آرتی بھیری ہوئی وحشی ہواؤں کی

ڈگر کانٹوں بھری ہے، روندتا جاتا ہوں کانٹوں کو
لٹاتا مال و زر، دُکھ سُکھ، جوانی عیش سامانی

بندھی ہے آس شاید بعد میرے اس طرف آئیں
حیاتِ نو کے رہرو نابلد ان رہگزاروں سے
اُفق پر جشنِ آزادی کا پرچم جبکہ لہرائے
اور آنکلو ادھر بھی شامِ رنگیں کے دھندلکے میں
تو اک بار آنکھ اُٹھا کر دیکھ لینا چرخ کی جانب
مجھے تم مسکراتا پاؤگے تاروں کی محفل میں

گھٹائیں قبر سی تاریک راتیں، آندھیاں، طوفاں
یہ شاہد ہیں کہ سونپی ٹوٹی کشتی میں نے موجوں کو

بھولتا جاتا ہوں میں ....

(از جناب علی جواد زیدی)

تمہیں جب یاد کرتا ہوں تو اک مٹتی ہوئی دنیا
مری آنکھوں کے آئینے میں پہروں جھلملاتی ہے

کہیں دم گھٹ رہا ہے مسکراتے سرخ پھولوں کا
کہیں کلیوں کے سینے میں ہوا رُک رُک کے آتی ہے

کہیں کجلا گئے ہیں دن کے چمکائے ہوئے ذرّے
کہیں راتوں کی ہنستی روشنی غم میں سماتی ہے

سُلا دیتی تھی جو آلام کو راحت کے سائے میں
وہ میٹھی چاندنی سوئے ہوئے فتنے جگاتی ہے

وہی دُنیا جو کل تک دل کا دامن کھینچ لیتی تھی
اُسی دُنیا کے ہر منظر میں اب بے التفاتی ہے

گھنے کہرے میں جیسے ڈھکتے جاتے ہوں ہرے سبزے
یونہی بیتے دنوں کی شکل دُھندلی پڑتی جاتی ہے

تمنّا اپنی ناکامی پہ کانپ اُٹھتی ہے یوں، جیسے
بگولے میں کوئی سوکھی سی پتّی تھرتھراتی ہے

وہ خواہش جو خوشی کے گیت اب گانے نہیں پاتی
مرے سینے کے سنّاٹے میں پہروں گنگناتی ہے

جوانی کی اندھیری رات آدھی بھی نہیں گذری
محبت کے دیئے کی لَو ابھی سے تھرتھراتی ہے

"برگِ حنا"

زیبؔ عثمانیہ لدھیانوی

(از محترمہ سیدہ انیس ناہید)

میری رفیقہ کار محترمہ سیدہ انیسؔ ناہید ملک کی مشہور لکھنے والیوں میں سے ہیں۔ آپ کے مضامین تمام نسوانی رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اور "ادیب" میں وہ ایک اچھوتی چیز پیش کر رہی ہیں۔ یعنی "برگِ حنا"۔ یہ شاعراتِ اردو کا زیرِ تسوید تذکرہ ہے جس میں ملک بھر کی معروف اور غیر معروف شاعرات کے حالاتِ زندگی۔ کلام پر تنقید اور منتخب کلام پیش کئے جا رہے ہیں۔ "برگِ حنا" کی افادیت اور اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ بالخصوص موجودہ دور میں جب کہ مرد نقاد شاعر خواتین کی طرف سے بے انتہا بے پروائی روا رکھتے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی شاعر خواتین پر کچھ نہیں لکھا۔ اور بالکل آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ اگر کسی نے کچھ لکھ دیا تو لے دے کر دہی مغلیہ دور کی شاعرات پر۔ اور بس۔ بلکہ اکثر خواتین بھی اگر کچھ لکھتی ہیں تو مرد افسانہ نگاروں اور شعرا پر۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اپنی صنف سے بالکل غافل ہیں۔ میں محترمہ سیدہ انیسؔ ناہید کی بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اور "ادیب" کے لئے اس تذکرہ کو شروع کیا۔ بعد میں یہی چیز قدرے تفصیل کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کی جائیگی۔

اس ضمن میں میری اپنی شاعر بہنوں سے بھی گذارش ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے حالاتِ زندگی اور منتخب کلام مجھے ارسال فرمائیں۔ تاکہ یہ تذکرہ جلد از جلد شائع کیا جائے۔ (انجمہ تصدق)

حالاتِ زندگی

زیبؔ عثمانیہ صاحبہ کا ایک مجموعہ کلام "متاعِ حرم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں آپ کا مفصل تعارف نامہ موجود ہے۔ ذیل میں چند ضروری اقتباسات وہیں سے نقل کئے جاتے ہیں۔

تاجور نام۔ زیبؔ تخلص۔ عثمانیہ نسبت خاندانی سے مشہور ہیں۔ آپ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لودھیانہ کے ایک متوسط افغان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ چونکہ آپ کے عم بزرگوار خان غلام احمد صاحب یکتا پنشنر پولیس لاولد تھے اور اب تک ہیں۔ اس لئے انہوں نے آپ کو عالمِ شیر خوارگی ہی میں اپنے آغوشِ عاطفت میں لے لیا۔ اور بطور متبنّٰی پرورش کیا۔ اسلامی گھرانوں کے پرانے رسم و رواج کے مطابق آپ کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام گھر پر ہی کیا گیا۔ چنانچہ آپ نے جلدی ہی اردو اور فارسی علم و ادب پر عبور حاصل کر لیا۔ آپ کی شادی فروری ۱۹۳۳ء میں اپنے پھوپھی زاد ایس بہاؤالدین صاحب کے ساتھ ہوئی جو محکمہ انہار پنجاب میں آج کل ہیڈ ڈرافسمین کی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

آپ کے عم بزرگوار شعرائے قدیم میں پختہ کلام شاعر ہیں۔ موصوفہ کو اکثر اوائل عمری ہی سے آپ کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ چنانچہ یہی چیز موصوفہ کے لئے ترغیب شاعری کا باعث ہوئی۔ طبع موزوں پائی تھی۔ مشغلۂ شعر و سخن دلچسپ کے ساتھ آسان بھی نظر آنے لگا۔ شروع ہی سے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کا شوق دامنگیر رہا۔ آپ ایک پردہ دار، سادہ مزاج، کم گو اور خوش اخلاق مسلم خاتون ہیں۔ غربا اور مساکین کے بارے میں آپ کا رویہ نہایت دردمندانہ ہے۔ سرمایہ و مزدور اور ملک و قوم کے مسائلِ حاضرہ میں آپ سحر و شام الجھی رہتی ہیں۔ کثرتِ افکار کا اثر گو آپ کی صحت پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ تاہم آپ کا اپنے منظوم پیغامات سے خدمتِ ادب اور اصلاحِ خلق کا پاکیزہ عزم قابلِ صد ستائش ہے۔ جسے آپ تادمِ آخر قائم رکھنا چاہتی ہیں۔"

تنقیدِ کلام

یہ حقیقت ہمارے ادب کے مسلّمات میں شامل ہو چکی ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ مرحوم و مغفور کی ذات سے ہمارا ادب، بالخصوص ہماری شاعری بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی میں ہی شعرائے کرام کا ایک ایسا مستقل گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اپنے اظہارِ خیال کے لئے وہی اسلوبِ بیان اختیار کیا جو حضرتِ مرحوم کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اقبالؒ کا تتبع کرنیوالا کوئی شاعر بھی اپنے اندر فکر و نظر، جذب و اثر اور خلوص و درد کی اتنی گہرائی اور جامعیت پیدا کر سکا ہے۔ اور شاید یہ ہے بھی قریباً ناممکن کیونکہ اقبالؒ کے اندازِ نگارش کی نقل کر لینا اور بات ہے۔ لیکن وہ حقائق کے سینے میں ڈوب جانے والی نظر، وہ نبضِ کونین کو پہچان لینے والی حسّاس انگلیاں، اور وہ ضمیرِ کائنات کے ساتھ دھڑکتا ہوا دل، قدرت کے ایسے عطیے ہیں جو خاص خاص افراد کو اور وہ بھی کبھی

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

در اصل اقبالؒ کی ہمہ گیر قبولیت، بلکہ محبوبیت نے کچھ ایسا جادو کر دیا کہ ن دوسرے شعراء بھی اپنا مخصوص رنگ چھوڑ کر اسی ڈگر پر آ گئے۔ اقبالؒ کے رنگ ہنوں نے "وقت کی چیز" سمجھا۔ اور "سستی شہرت" کی توقع میں وہ بھی اسی شاہراہ ں نکلے۔ لیکن حقیقتاً وہ ایک شدید دھوکے میں مبتلا تھے۔ کیونکہ اقبالؒ کا اتباع کوئی آسان کام نہ تھا۔ اقبالؒ صرف چند پرشکوہ تراکیب الفاظ یا چند نادر وا ستعارات کا نام نہیں بلکہ وہ نام ہے ایک مستقل جہانگیر پیغام کا جس میں عصر حاضر کی مجلسی و معاشی بیماریوں کا علاج پیش کیا گیا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ حقیقت شعرائے کرام ہاس گروہ پر عیاں ہوتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اصحاب تو خود بخود اس سے تکش ہو گئے اور جو زیادہ بضد ہوئے انہیں اس کا خمیازہ اپنی "ادبی موت" کی ورت میں بھگتنا پڑا۔

لیکن اس "تمام ہجوم" میں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے مجھے رف دو نام ایسے نظر آتے ہیں جو بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ اس رنگ کو نباہ ے ہیں۔ اور وہ ہیں خان بہادر ابن حزیں سیالکوٹی۔ اور محترمہ زیب عثمانیہ رھیانوی ——— ان دونوں ہستیوں نے اقبالؒ کی تقلید انتہائی خلوص اور پورے ستقلال کے ساتھ شروع کی اور شاید اپنی فطری رفتارِ طبع سے مجبور ہو کر بھی ——— ——— اور جب ہم زیب عثمانیہ (کیونکہ یہاں صرف انہیں سے بحث ہے) کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ اقبالؒ کی ایک کامیاب مقلد ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم زیب کے فلق بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ بلکہ اتنا کہنا شاید ان کی نسبت سب کچھ کہہ دینے کے نرادف ہے۔

جناب آغا مرتضیٰ احمد خاں میکش ایڈیٹر روزنامہ "شہباز" لاہور نے تاع حرم" کے پیش لفظ میں بجا طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ ——— ان نظموں ں حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے انداز بیان اور خیالات کی جھلک ایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ اقبالؒ کے انداز نے عصر حاضرہ کے بہت سے شاعروں کو متاثر کیا اور ہمارے اکثر سخن گو حضرات ہر انداز میں انہیں کا تتبع کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر میں کہوں کہ محترمہ زیب عثمانیہ کو اس امر یعنی اقبالؒ ے انداز کا اتباع کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اس دور کے بہت کم شاعروں ے حصہ میں آئی ہے تو غلط اور بیجا نہ ہوگا۔

لیکن جب ہم کسی شاعر کے متعلق یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ وہ کامیابی ے ساتھ اقبالؒ کا اتباع کر رہا ہے (ظاہر ہے کہ یہاں صرف موجودہ دور کا ذکر ہی کر سکتی ہوں) تو اس سے ہماری مراد [illegible] ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ہاں بھی جذبات کا وہ خلوص، خیالات کی وہ رفعت، مطالب کی وہ گہرائی، حقائق کی وہ بصیرت افروزی اور تفکر کی وہ جلوہ سامانی موجود ہے جو اقبالؒ کی شاعری کا مایۂ امتیاز ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اقبالؒ کے ساتھ ہی پیدا ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔ ہاں، البتہ اب جو شاعر بھی اس انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کریگا۔ وہ الفاظ کے تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ وہی کچھ کہہ سکے گا۔ جو اقبالؒ بر سوں پیشتر کئی مرتبہ اور نسبتاً کہیں خوبصورت تر انداز میں کہہ چکا ہے ——— اور میرے نزدیک زیب بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں یقیناً وہ تمام محاسن موجود ہیں جو اقبالؒ کے ایک کامیاب مقلد میں ہونے چاہئیں۔ اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ زیب کی ذکاوتِ طبع کا ایک غیر معمولی کمال ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی کچھ ایسے معائب ——— معائب تو خیر نہیں کہنا چاہیئے۔ البتہ کمزوریاں اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو اقبالؒ کے کسی کامیاب سے کامیاب مقلد میں لازمی طور پر موجود ہونگی۔ لیکن اس کے لئے ہم اقبالؒ کی فکر مندانہ عظمت کو ایک وجہ قرار دے سکتے ہیں اور یقیناً یہ ایک بہت بڑی وجہ ہے۔

اگر کتاب کے اصل موضوع سے دور جا پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں اس امر پر مفصل بحث کرتی کہ آیا اس قسم کی شاعری کی اب ہمارے ادب میں ضرورت بھی ہے یا نہیں۔؟ لیکن افسوس کہ "تذکرہ" کی ترتیب کے سلسلہ میں جو پابندیاں میں نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں وہ مجھے اجازت نہیں دیتیں کہ اس مسئلہ پر کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کر سکوں۔ لہذا ذیل میں زیب صاحبہ کے کلام کے کچھ نمونے جو میرے پسندیدہ مقامات میں سے صرف چند ٹکڑے ہیں، پیش کئے جاتے ہیں:—

نمونۂ کلام

ایک نظم "رہبرانِ قوم" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان اشعار کا بولتا ہوا، لطیف اور کامیاب طنز قابلِ داد چیز ہے۔

دین کی بات کبھی عالموں سے پوچھتے تھے — اُن کو مدت ہوئی سچائی کی عادت ہی نہیں
چار ازواج تو کرتے ہیں بچاروں کو ضرور — حق کا فرمان ہو اس میں کوئی حجت ہی نہیں
اور بیٹی کو وراثت نہیں ملتی، نہ ملے — اُن کے آئین میں اس بات کی وقعت ہی نہیں
ان کے نزدیک حوادث میں ہے تقدیر کا ہاتھ — جس سے بچنے کی جہاں میں کوئی صورت ہی نہیں
ان کے ہاتھوں سے ہوا دین کا یہ حال کہ آج — اس سے بڑھ کے کوئی شے وجہِ عداوت ہی نہیں

"وطنی بچیوں کے نام" آپ کی ایک نہایت کامیاب نظم ہے۔ ملاحظہ ہو:—

کارگاہِ زندگی کی گرچہ ہے سردار عقل — ہے مگر تفہیم قیدِ زیست سے لاچار عقل
ہے کشادِ چشم و دل کا نام تحصیلِ علوم — تنگ دل ہیں ہم تو ہے ناکام تحصیلِ علوم

یہ صاحب نوعِ انساں کو ہم احساسِ درد   آہ! وہ قومیں نہیں آپس میں جنکو پاس درد
تم سمجھتی ہو تمہارے کھیلنے کا وقت ہے   یہ مصیبت دیکھنے اور دکھ جھیلنے کا وقت ہے
تم نے سوچا ہے کبھی اے باحیا و باحسب   جو محنت کے بھی ہیں کیوں فاقہ کش اپنے غریب

آہ! اے ہندوستاں کی دخترانِ نیک نام
کہتے ہیں اپنا وطن ہے اہلِ مغرب کا غلام

یہ ناممکن تھا کہ زیبؔ، اقبالؒ کی تعلیم حفظِ خودی سے متاثر نہ ہوتیں۔ چنانچہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آرام فرمائے دہلی کی درگاہِ مبارک میں یہ جملہ ناگوار لکھا دیکھ کر ـــ "خواتین کو اندر آنا منع ہے۔" آپ کی نسوانی غیرت کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس کی نسبت آپ نے جو چند اشعار کہے ہیں۔ وہ پڑھنے کے قابل ہیں دیکھیے :-

گرچہ یہ نہیں میری عقیدت کا تقاضا   لیکن میں شکایت نہ کروں، یہ بھی ہے دشوار
ہے تجھ پہ عیاں نازکیٔ فطرتِ انساں   کیا تیری اجازت سے ہے یہ حکم دل آزار
عورت کوئی آئے نہ تری لوح کے نزدیک   یہ نوعِ بشر پائے نہ قدموں میں ترے بار
مانا کہ ہے مظلوم بہت طبقۂ نسواں   لیکن نہیں ہرگز کسی ذلت کا سزاوار
کیوں خون کرے حسرتِ دیدار کا کوئی   گر تو کسی مشتاقِ زیارت سے ہے بیزار
سائل ہوں مگر جذبِ خودی سے نہیں محروم   اس شکل میں کچھ مانگنا تجھسے ہے مجھے عار

کی جائے کسی در پہ مری ذات کی توہین
کرتی نہیں برداشت مری فطرتِ خوددار

بعض جگہ آپ کا اندازِ بیان اقبالؒ کے اس قدر قریب جا پہنچتا ہے کہ پہلی نظر میں اس پر کلام اقبالؒ ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ایک مختصر سی نظم "فلسفۂ جنگاہ" سنیئے :-

قوموں کی تقدیر وہ مردِ جنگاہ   ایمان جس کا الحکم للہ
مامون سمجھی ہے خود کو جو قوم   ہے اُس کی قسمت میں مرگِ ناگاہ
زندہ ہے خود اک جنگِ عناصر   باہم صف آرا ہیں انجم و ماہ
فکر و نظر سے عاری ہے وہ ملک   جس کی سیاست بدلی نہ ہر گاہ
ہے اک جہاں پہ بھاری وہ ملت   شمشیر جس کی الملک للہ
گر مزوکیت ہو واقفِ راز   اک سحر طاقت ہے شوکت شاہ

درسِ سیادت دے کون اے زیبؔ
شیخ و برہمن ہیں مردِ درگاہ

اور کہیں کہیں تو اظہارِ مطالب کے لئے آپ انہیں اوزان اور بحور کو منتخب کرتی ہیں جو "بالِ جبریلؒ" اور "ضربِ کلیم" میں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نظم پیش ہے :-

کسی ملک کی سراسر ہے دل ونظر کی خامی   اگر اس کی اکثریت نہیں عدل کی حامی
بجز اتفاقِ ملت، بجز اتحادِ ملت   کوئی قوم چشمِ عالم میں نہ ہو سکی گرامی
سرِ کاخ تک کسی کے نہ ہوئی رسائی اسکی   تھی مری نوائے مضطر جو نوائے زیر بامی
وہ علاجِ دردِ ملت کوئی اور چیز ہی ہے   نہ مری فلک خیالی، نہ تری فلک خرامی
مگر اس سے جو ہے بدتر وہ ہے نفس کی اطاعت   یہ بجا بہت بُری ہے کسی قوم کی غلامی
تری ضربِ پاسے جبتک رواں ہو کوئی چشمہ   نہیں در خورِ زمانہ ترا ذوقِ تشنہ کامی

کوئی طائرِ اہلِ دانش ہو کہ تجھسا بے خرد ہو
کہیں کام آ ہی جاتی ہے کسی کی کہنہ دامی

زیبؔ عموماً نظم ہی کہتی ہیں۔ تغزل اُن کے ہاں بہت کم ہے۔ اور خالص تغزل تو شاید آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی کم۔ پھر تغزل میں بھی لب لہجہ کی وہی فلسفیانہ سنجیدگی، اور مفکرانہ متانت نظر آتی ہے جو اقبالؒ کے ہاں ہے۔ یہاں شدہ شدہ کچھ اشعار نقل کرتی ہوں۔

جس تمنا پر تو جاں دینے کو آمادہ نہیں   وہ تمنا ہی غلط ہے اس کا ذکر اصلا نہ کر
جذبۂ آزادی و سرمستی و دیوانگی   دل کے یہ اجزا تیامت ہیں انہیں یکجا نہ کر

مکان ولامکاں ادنیٰ نشاں ہیں ان کی منزل کے
رسائی اہلِ دل کی کوئی کیا جانے کہاں تک ہے
وہ منزل جس کی ہر وادی قیامت کا نمونہ ہو
اُسے آساں سمجھ لینا مذاقِ کارواں تک ہے

تو بیٹھ رہا سیرِ سماوات سے تھک کر   قدرت کے بہت قصد تھے تخلیقِ بشر سے

اگر ہے سخت کوشی پر بنائے آشیاں میری   محافظ میرے طوفاں، اور بجلی پاسباں میری
ترا شیوہ تن آسانی، مرا شیوہ تن آسانی   وہی دشواریاں تیری، وہی دشواریاں میری
نزاکت برگِ گل کی سنگ و آہن میں بدلتا ہے   نہیں ہوجاتی تند گلشن میں فغاں میری

تجھے سمجھا دیا کس سوختہ سامانِ حکمت نے   کہ کوئی شعلہ تیری خاک کا حاصل نہیں ہوتا

مرا ہم عصر ہیں تو کہ چرچا ہے تیری غزل
مجھے اہتمام فغاں، بجھے اتصالِ ساحل

یہیں سعی کا داں تک نہیں زیب گر رسائی
مرا ذوق میری مشکل، ترا ذوق تیری مشکل

حد سے گذرتے گل کی نزاکت کو دیکھکر گلشن میں، میں نے تیغ نوائی شعار کی
مجھکو طلب کہ تیغ ہو ہر جرعۂ حیات تجھکو ہوس ہے جام مئے خوشگوار کی
اے زیب جو مشیت حق تھی وہی ہوا
باطل نے لاکھ اپنی بنا استوار کی

اپنی خودی کو پوج اے برہمن کم تر ہیں اس سے تیرے سب اصنام

برس جائے تو مطلع صاف ہو جائے اُفق پہ زیب ابرِ خوں چکاں ہے

شیخ اور برہمن نہیں گر بندۂ اغراض ہے باعث بیگانگی دیر و حرم کیا؟
سائل کوئی طامع بھی اے صاحب الطاف اتنے پہ بدل جاتا ہے اندازِ کرم کیا؟

نہ شمع ہے، نہ کوئی آئینہ، نہ دستۂ گل سب ان کی صورتیں ہیں انجمن میں آنے کی
نہ زعم دوریٔ صیاد میں رہیں طائر کشش چمن میں بھی ہے دام اور دانے کی

کوئی کیوں ہو خضر سے معترض کہ یہ اپنا اپنا مذاق ہے
ہمیں اک نفس بھی وبالِ جاں اُسے شوق عمر دراز کا
کسی اہلِ ذوق نے حشر کا اُسے نام بزم میں دے دیا
کوئی شیوہ عام نہ ہو سکا جو کسی کرشمہ طراز کا

پیکرِ اضطراب ہے دُنیا میرے دل کا جواب ہے دُنیا

شروع میں ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ زیب، اسلوب بیان، بندش تراکیب، یہاں تک کہ نفسِ مطالب تک اقبالؒ کی پیروی کرتی ہیں۔ اس لئے ناانصافی ہوگی اگر ان کی وہ جامع اور دلاویز نظم جو انہوں نے اقبالؒ کے متعلق کہی ہے

[illegible]

نظریات خود زیب کی شاعری کا بنیادی اساس ہیں۔ اور اسی نظم پر اس مضمون کو ختم کرتی ہوں۔

نکاتِ اقبال

ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری وہ صد ہا نام آزادی کے گِنواتا ہوا آیا
جہاں بیں کارنامہ در پئے شکست سومنات دل ہر اک محمود کو یہ راز بتلاتا ہوا آیا
زمانے میں ہے بے لفظی ہی رازِ قوتِ برتر ہر اک درماندۂ ملت کو سمجھاتا ہوا آیا
عمل کو جو نقطۂ اک کام تھا مشرق و مغرب مثالِ مہر سے ہمکو یہ جتلاتا ہوا آیا
بتائے اس نے گر آدم کو آدابِ خداوندی فرشتوں کی تڑپ آدم کو سکھلاتا ہوا آیا
سمجھ لی تھی جہاں بیں رمز تائیدِ خدا اس نے کہ انساں کو عمل کی راہ دکھلاتا ہوا آیا
نہ ہو جس کا نتیجہ اتحادِ عالمِ انساں
ہر ایسی حکمتِ مذہب کو ٹھکراتا ہوا آیا

ادا بدایونی

(از محترمہ سیدہ انیس ناہید صاحبہ)

ہندوستان کی شاعرات کے زیر تدوین تذکرے "برگ حنا" میں سے ایک حصہ

حالاتِ زندگی عزیز جہاں بیگم نام۔ تخلص اداؔ۔ وطن بدایوں —— حالاتِ زندگی خود اداؔ صاحبہ کی زبانی سُنئے :—

حیران ہوں کہ اس ورق سادہ پر —— اور حالات زندگی؟ کون سی کہانی پڑھکر سناؤں۔ ابھی فطرت نے میری نظم زندگی کا "مطلع" ہی کہا ہے کیا خبر مقطع تک پہنچتے پہنچتے اس نظم کی کیا صورت اور کیا حالت ہوگی —— مارچ ۱۹۳۴ء کی ایک خوشگوار صبح کو میں نے یکایک اپنے آپ کو اس دنیا میں محسوس کیا۔ حیران ہونے کی بات نہیں۔ یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ دنیا کو میری آمد کا علم یا احساس کس وقت ہوا۔ اور یہ ہو بھی سکتا ہے کہ اس کو اس وقت تک میرا احساس نہ ہوا ہو۔ خیر۔ تو میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ میری شاعری کی ننھی سی کٹیا کا سنگ بنیاد (جو مستقبل میں زمین پاس بھی ہوسکتی ہے اور فلک رفعت بھی) مارچ ۱۹۳۷ء میں برادر محترم حضرت اختر شیرانی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ اور مئی ۱۹۳۸ء تک میں ان کے برادرانہ مشوروں سے مستفید ہوتی رہی۔ یہ زمانہ رسالہ "رومان" کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا "رومان" کے ختم ہوتے ہی یا یوں کہو کہ اختر کے "رومان" سے علیحدہ ہوتے ہی یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی (اس حساب سے اداؔ کا سن پیدائش تقریباً ۱۹۲۴ء ہوتا ہے مرتب) ۱۹۳۹ء میں میرا تعارف جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی سے ہوا اور ایک محترم بزرگ کی حیثیت سے وہ مجھے مشورہ سخن دیتے رہے ۔ ۱۹۴۱ء میں یہ سلسلہ خود میری خواہش کے مطابق منقطع ہوگیا۔ اس لئے نہیں کہ میں اُن کی اصلاح سے مطمئن نہیں تھی۔ بلکہ اس لئے کہ میں خود اپنے تجربہ کی روشنی میں اپنی راہ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ میں نے یہ محسوس کر لیا کہ استادانہ اصلاح زمین سخن کو آسمان تک تو پہنچا سکتی ہے مگر اس سے خود شاعر کے جذبات کا خون ہو جاتا ہے اور وہ خلوص بیان نہیں رہتا جو شعر کی جان ہے۔

یہاں تک تو تھا میری شاعری کے متعلق اب کچھ میرے اپنے متعلق سُنئے۔

—— ایک متوسط شریف گھرانے میں پلی ہوئی لڑکی، شوخ و شنگ۔ سنجیدہ متین، ضدی، میلی اور بیباک۔ الھڑ اور شائستہ، غرض متضاد کیفیتوں کی حامل مزاج میں گھلے نسیم کی نرمی۔ نگاہ صرصر کی تیزی۔ سمجھنا آسان، سمجھانا مشکل۔ باپ کا سایہ طفولیت ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ عقلمند ماں کے زیر سایہ تربیت پائی۔ ایک چھوٹا بھائی دو بڑی بہنیں۔ نانا مولوی ظہور الحسن بدایوں کے مفتخر انسان تھے۔ ہر قسم کے قیود بند سے آزاد ہوں۔ شبنم کے ساتھ روتی ہوں۔ پھولوں کے ساتھ ہنستی ہوں۔ زندگی کبھی ایک مسلسل، دلفریب نغمہ اور کبھی روتا ہوا آبشار۔

اداؔ صاحبہ کے اپنے قول ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۷ء میں ہوا۔

تنقید کلام گویا اُن کی شاعرانہ عمر چھ سات برس سے زیادہ نہیں صرف چھ سات سال کی مشق سخن کے بعد کسی شاعر کے کلام میں فنی پختگی کی توقع بہت کم کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ دیکھکر حیرت آمیز خوشی ہوتی ہے کہ اداؔ کا کلام "فنی پختگی" کے اعتبار سے وہ تمام خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے جن کا ایک بلند پایہ شاعر کے کلام میں موجود ہونا ضروری ہے۔ اور یہ اداؔ کی غیر معمولی ذہانت کی ایک روشن دلیل ہے۔

ایک نظم "صبح بنارس" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :—

سرگرم ناز مشق ہے مشاطۂ بہار — کیف و نشاط و رنگ کی دُنیا لئے ہوئے
دامن کشاں ہے ساحل گنگا کی آب و تاب — طغیانِ بیخودی کا اشارا لئے ہوئے
خوشبو مچل رہی ہے ہواؤں کے دوش پر — اعجاز گرمیٔ دم عیسیٰ لئے ہوئے
ہر گل ز فیض ناز چمن در کنار ہے — ہر قطرہ حقیر ہے دریا لئے ہوئے
سامانِ کفرِ عشق مہیا ہیں سر بسر — ہر ہر قدم پہ دعوت سجدہ لئے ہوئے

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر کا کلام نہیں ہے؟ "پختگی کلام" کے ایسے اچھے نمونے۔ اور یہ منجھا ہوا معیار، حقیقتاً اداؔ ایسی نومشق شاعرہ کی ذہانت کا ایک معجزانہ کمال ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر شعرا کے ہاں "پختگی" کچھ اس شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ اُن کے کلام میں "پختگی" کے سوا اور کوئی خوبی نظر ہی نہیں آتی۔ فنی موشگافیوں کے زور پر ان کا کلام تھوڑے سنبھل ضرور جاتا ہے۔ تھوڑا بہت زبان کا چٹخارہ بھی میسر ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ "آسمانی مٹھاس" جو حقیقت میں شعر کی جان ہوتی ہے مفقود ہو جاتی ہے۔ لیکن اداؔ کے ہاں آپ ایک لمحے کے لئے بھی ایسا محسوس نہیں کرنے پائیں گے۔ وہ فنی خوبصورتیوں کو کسی نمایاں کوشش کے ساتھ پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ اُس کے دلکش اسلوب بیان کی گھلاوٹ اور جذبات کی گہری شیرینی میں سے یہ چیز خود پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک یہی ایک اصلی شاعر

نامرادی کی اک سمت کشمکش — اور اک طرف ہے دور مداوا لئے ہوئے

اور

گل گریباں چاک، بلبل مست، بہکی سی نسیم — وحشتِ دل کی پُرمشکل پردہ داری ان دنوں

اور

تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن — وہ دن جو کبھی دوست کے پہلو میں گذارے

ادا چونکہ حضرت اختر شیرانی اور نواب آثر لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتی رہی ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر ان دونوں باکمال شعرا کا رنگ ادا کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ لیکن طبعاً وہ اردو شاعری کے "رومانی سکول" سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ حسن و رومان کے ترانے گاتی ہیں، وہاں ان کا اندازِ بیان زیادہ منہ زور اور والہانہ ہو جاتا ہے اور شعر کا حسن زیادہ نکھرا نکھرا نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والا اپنے دلی محسوسات کو نہایت سچے لیکن دل میں اتر جانے والے انداز سے اشعار میں ڈھالتا چلا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:—

تنہا مجھے رہنے دے
دل میں غمِ الفت کو مستور ہی رہنے دے
مجبورِ محبت کو مجبور ہی رہنے دے
امید کی دنیا کو بے نور ہی رہنے دے
مسرورِ محبت کو مسرور ہی رہنے دے
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے

دل پھول کی صورت ہے مُرجھا کے نہ رہ جائے
آغوشِ تمنا میں لہرا کے نہ رہ جائے
ڈر ہے نگہِ حیراں شرما کے نہ رہ جائے
ترسا کے نہ رہ جائے، تڑپا کے نہ رہ جائے
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے

ایک اور لطیف نظم "عیدِ نظارا" کے چند اشعار سنئے:—

مژدہ نگاہِ شوق کہ عیدِ نظارہ ہے — پلکیں کسی کی راہ گزر میں بچھاؤں میں
آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی — اس طرح غمکدے کو بھی اپنے سجاؤں میں
دامانِ ابرِ تیرہ سے گوہر سمیٹ لوں — قوسِ قزح کا رنگِ عروسی رچاؤں میں

اس نظم کا ایک ایک مصرع حسن رومان اور شباب و شعر کا دھڑکتا ہوا افسانہ ہے۔ پھر یہ نہیں کہ محض رسمی واقعات کو رسمی انداز میں موزوں کر دیا گیا ہو بلکہ ان اشعار میں نسوانی نفسیات کو اس فن کارانہ سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر پڑھنے والے کو ان میں اپنے ہی جذبات کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہ تصویریں بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔

چونکہ ادا کا اصلی میدان رومان طرازی ہے اس لئے جہاں وہ اس سے انحراف کرتی ہیں۔ کلام پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ اپنی فطری ذہانت اور نواب آثر لکھنوی کی استادانہ اصلاح سے کوئی گراوٹ صاف محسوس نہیں ہوتی۔ مگر وہ خلوص گرمجوشی اور جذب و اثر باقی نہیں رہتا۔

ادا بنیادی طور پر ایک نظم گو شاعرہ ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ نظم خوب لکھتی ہیں۔ ایک نظم "انتظار" کے دو بند سنئے:—

ابرِ سیہ نے جھوم کر گھیر لیا ہے آسماں
آنسوؤں کی جھڑی ہے یا گرنے لگی ہیں بوندیاں
بہکی ہوئی بہار ہے، مہکا ہوا ہے آسماں
دل میں کسی کی یاد پھر
لینے لگی ہے چٹکیاں

شوخ رسیلی چاندنی فرش پہ محوِ خواب ہے
ذرہ بھی صحنِ باغ کا درکشِ آفتاب ہے
پھول بھی بیمثال ہے، خار بھی لاجواب ہے
حسنِ جواں کے فیض سے
نکھرا ہوا شباب ہے

نظم کے ضروری اجزا میں مسلسل گہرے تاثر کے علاوہ موزوں الفاظ کی پُرشکوہ موسیقی بھی از حد ضروری چیز ہے۔ ادا کے یہاں اس چیز کا نہایت صحتمندانہ تناسب پایا جاتا ہے۔ الفاظ کی نشست، شکوہ اور صوتی ہم آہنگی کا بھی ادا خاص اہتمام کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی نظم میں ایک قسم کی خوبصورتی اور عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

کھویا ہوا سا خوابِ جوانی بہار کا
تجدیدِ اضطراب کا ساماں کئے ہوئے

اور

کشتی ہے یہ پھولوں کی چمن میں کہ مہِ نو
بکھرے ہوئے غنچے ہیں کہ چھٹکے ہوئے تارے

دیکھا آپ نے "کھویا ہوا خوابِ جوانی" اور "بکھرے ہوئے غنچے ہیں کہ چھٹکے ہوئے تارے" کتنے ہنستے اور گاتے ہوئے ٹکڑے ہیں ———

بعض اوقات وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے شعر میں ایسی موسیقی بھر دیتی ہیں کہ طبیعت

جھلک آجاتی ہے۔ مثلاً

سکون دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں
سکون و دل کی راحتوں کو بیکراں کئے ہوئے
بہار حسن و دلبری کا خواب پھر سے دیکھ لوں
خیالِ حسن و دلبری کو جاوداں کئے ہوئے
کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئیں گے
وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے

اداؔ غزل بھی کہتی ہیں۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی میلان طبع نظم ہی کی طرف ہے۔ جوشؔ اور اخترؔ شیرانی کی طرح ان کی غزل میں بھی کہیں کہیں نظم کا رنگ اُبھر آتا ہے۔ تاہم خالص تغزل میں بھی خوب اشعار نکالے ہیں۔ پڑھئے اور سر دھنئے :۔

پھر کسی کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی   پھر وہی میں ہوں وہی اختر شماری ان دنوں
خندہ ہائے گُل سے دل میں ہوک سی اُٹھنے لگی   سازِ عشرت بھی ہے وجہ بیقراری ان دنوں

عشق کی بیخودی کو کیا، بادۂ ناب سے غرض   کیفِ نگاہِ مست سے حال خراب چاہیئے
زیست وہی ہے جو رہے درد سے لذت آشنا   جامِ حیات میں مجھے تلخ شراب چاہیئے
ٹوٹے جو اک نگاہ میں چُور ہو ایک آہ میں   ساغرِ زندگی اداؔ، رشکِ حباب چاہیئے

مُجھ سے ہی بجھی ہے کہیں لگی دل کی   حریمِ ناز سے ہم اور بے قرار آئے
گلوں پہ خندۂ زخمِ جگر کا دھوکا ہو   جو آئے اب تو اس انداز سے بہار آئے

الفاظ پر ساحرانہ قدرت، اور اُن کے انتخاب میں حسن کارانہ ذوق کے ساتھ محاکات واستعارات میں بھی اداؔ ایک خاص انداز کی مالک ہیں۔ لیکن یہ چیز اُن کے ہاں بہت کمیاب ہے۔ تاہم جہاں کہیں کوئی استعارہ لائی ہیں، شعر میں جان آگئی ہے۔ یہاں اُن کی ایک نظم "طلوع ماہ" سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

عروسِ مہ، سکوتِ شام میں یوں جگمگاتی ہے   پجارن جس طرح تنہائی میں دیپک جلاتی ہے
وطن کا صبح کا جیسے تصور شامِ غربت میں   کہ خوابِ ناز میں دوشیزہ کوئی مسکراتی ہے
ضیائے ماہِ تاباں سے جھلک اٹھتا ہے ہر ذرہ   محبت جس طرح دُنیائے دل کو جگمگاتی ہے

کیا ان میں ہر ایک استعارہ ایک مہکتے ہوئے سرد جھونکے کی طرح رُوح کی گہرائیوں سے چھوتا ہوا نہیں گذر جاتا۔

ہماری شاعری کی پرورش اور نشو و نما زیادہ تر مردوں کے ہاتھوں سے ہوئی ہے اس لئے اس کی روایات ——— حسن و عشق کے "مردانہ نقطۂ نگاہ" سے ترتیب پا گئی ہیں۔ ہماری اکثر شاعرات یہاں ٹھوکر کھا جاتی ہیں۔ اور اپنے لئے وہی اندازِ بیان منتخب کرتی ہیں جو صرف مردوں کے لئے موزوں ہو سکتا ہے حالانکہ ایک شاعرہ کا فرض ہے کہ وہ شعر کہتے ہوئے ——— بیان کے اسلوب، الفاظ کے انتخاب اور جذبات کی شیرینی سے ——— ایک ایسی فضا قائم کرے جو صرف ایک عورت ہی کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ اداؔ اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ لیکن غزل میں کہیں کہیں لغزش کھا جاتی ہیں۔ مثلاً ؎

دامنِ گُل ہے عنبریں، اس میں تو شک نہیں اداؔ
نکہتِ رائیگاں کہاں، گیسوئے مُشکبو کہاں ؟

اداؔ ابھی اپنا کوئی مخصوص اندازِ سخن قائم نہ کر سکیں۔ کبھی وہ رومان و محبت کے ترانے گاتی ہیں۔ تو کبھی سنجیدہ تغزل کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقتی جذبات کی رَو انہیں ہنوز اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہے۔ ابھی ایک شاعر سے متاثر ہیں تو ابھی کسی دوسرے سے۔ یہ درست ہے کہ ابھی اُن کی مشق بہت زیادہ نہیں۔ تاہم انہیں اب اپنے طبعی رجحانات کے ماتحت کوئی مخصوص راہ متعین کر لینی چاہیئے۔ تاکہ اُس میں خصوصیت اور کمال پیدا کر سکیں۔ ہمیں اُمید کرنی چاہیئے کہ اداؔ اپنے "تجربہ کی روشنی میں" جلد ہی اپنے لئے کوئی راہ ڈھونڈ لینگی۔ اور ہمیں یقین ہے کہ یہ راہ "رومان طرازی" سے الگ نہیں ہو سکتی۔ کہ اداؔ اپنے اِسی قسم کے فردوسی نغمات کے لئے زندہ و باقی رہیں گی۔ دیکھئے زندگی کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا خوب کہا ہے ؎

عشق کا خواب تو شیریں ہے مگر ڈرتی ہوں   میری قسمت نہ اسے خواب پریشاں کر دے
خلوتِ رُوح کا فانوس نہ بُجھ جائے کہیں   میری اُمیدوں کی دنیا کو نہ ویراں کر دے

نیز

عشق برآب ہے وابستگیِ حسن و شباب   نکہتِ گُل کی طرح عشق ہے پابند ہوا
اس سے بہتر تھا کہ مجھ سے بھی لغزش ہوتی   پھول مرجھاتے ہیں کانٹا نہیں مرجھا سکتا

اور حد یہ کہ :۔

گرم رفتار و سبک سیر ہے راہوارِ حیات   آرزوؤں کے گھروندے کو یہ ڈھا دے نہ کہیں
بادۂ خام ہے ساغر میں نظامِ نو کے   شکریں ہونٹوں کی لذت کو مٹا دے نہ کہیں

(منتخب کلام کے مفصل نمونے کتاب میں شامل ہونگے)

کسی

(از محترمہ اختر قریشی بی اے۔ بی ٹی)

یہ ناممکن جفاؤں سے تری مایوس ہو جاؤں
یہ ناممکن کہ ناکامی سے میں مانوس ہو جاؤں
تری بے اعتنائی مجھ کو برہم کر نہیں سکتی
مری آزاد فطرت اپنا سر خم کر نہیں سکتی
یہ تیری بے رخی بھی باعثِ وحشت نہیں ہوتی
تری یہ فتنہ انگیزی مجھے کلفت نہیں ہوتی
تری وابستگی کی غیر سے پروا نہیں مجھ کو
تری اس بے وفائی کا بھی کچھ شکوا نہیں مجھکو
نہ مجنوں کی طرح صحرا نوردی پر ہوں آمادہ
نہ میں دشت و بیاباں کا نہ تنہائی کا دلدادہ
مرے نزدیک تیشہ مار کر مرنا نہیں بہتر
میں راہِ عشق میں فرہاد کی صورت نہیں ابتر
جنونِ عشق میں فریاد کرنے سے ہی کیا حاصل
خود اپنی زیست کو برباد کرنے سے ہی کیا حاصل

ہوائیں جب بہار و کیف سے لبریز ہوتی ہیں
فضائیں جب مرا صبر و سکون و ہوش کھوتی ہیں
شبِ مہ میں جو عالم نور سے معمور ہوتا ہے
زمیں کا ذرّہ ذرّہ نیند سے مخمور ہوتا ہے
مری ننھی سی کشتی نقرئی لہروں پہ بہتی ہے
شراب و شعر میں جب رُوح میری کھوئی رہتی ہے
ترا دلکش تصوّر ہے مرے پیشِ نظر ہر دم
تری رعنائیوں کی یاد ہے شام و سحر ہر دم
تخیّل میں مرے ہر دم ہو تو، گو دُور ہے مجھ سے
مرے خوابوں کی ملکہ ہو کے کیوں رنجور ہے مجھ سے
مری ہستی کا مقصد تُو، مری رُوحِ رواں ہے تُو
مرے دل پر عیاں ہے اور آنکھوں میں نہاں ہے تو
میں چپکے چپکے تیرا نام لے کر آہ بھرتا ہوں
سکوں آمیز تنہائی میں شب کی یاد کرتا ہوں
چمکتی نقرئی لہریں منوّر چاند اور تارے
تلاطم خیز موجیں، شوخ کلیاں اور سمن پارے
کہیں ایسا نہ ہو یہ جان جائیں رازِ اُلفت کا
یہ اندیشہ ہے مجھکو چھڑ نہ جائے سازِ اُلفت کا

تمنّا ہے یہی اختر کہ خاموشی سے جل جاؤں
مجسّم عشق بن جاؤں مثالِ شمع جل جاؤں

گذشتہ سے پیوستہ — قسط سوم

بدنام

(از محترمہ مہر آرا وصفی مرادآبادی)

"سامان درست کرلو" —— پرمود نے مسکراتے ہوئے اور منّے کو کھلاتے ہوئے کہا —— اور لیلا نے —— جسکی زریں مسرت نے جیسے اس کے تاریک خانۂ دل کو منور کردیا تھا۔ اس کی جگمگاہٹ میں وہ تمام ڈراؤنے اور تاریک خیالات بھلا دیئے —— اس کی نظریں خیرہ ہوچکی تھیں —— اس لئے اسکو کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ گاؤں —— میں آگ کی طرح یہ خبر مشہور ہوگئی —— اور جب وہ ٹانگہ پر سوار ہورہی تھی تو سب ہی لوگ اکٹھے اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی حقارت آمیز مسکراہٹ نشتر بنکر لیلا کے دل میں پار ہورہی تھی —— لیکن پھر بھی —— وہ مسرور تھی —— !!

ابھی دس قدم ہی ان کا ٹانگہ گاؤں کی حد سے باہر نکلا ہوگا جو شنکر اور چند کانسٹبل ٹانگہ کی طرف آتے نظر پڑے۔ لیلا کانپ گئی —— مگر پرمود —— پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا —— !!

"ٹانگہ روک لو ——" ایک سپاہی نے تحکمانہ چلاکر کہا۔

"کیوں روک لیں —— ؟" پرمود نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"یہ آپ کی کون ہیں ؟" سپاہی نے جھینپ کر کہا۔

"کوئی بھی نہیں صاحب۔ نہ ذات کی نہ رشتہ کی ——" شنکر نے جل کر جواب دیا۔

"میری بہن ہیں —— اور میں مختار ہوں۔ چاہے جہاں لے جاؤں" پرمود نے نفرت سے شنکر کو دیکھکر کہا۔

"یہ آپ کے بھائی ہیں —— ؟" سپاہی نے لیلا پر نظریں گاڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں —— !" لیلا نے جل کر جواب دیا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں —— ؟" سپاہی نے سوال کیا۔ مگر پرمود اس قسم کے کسی سوال کا جواب دینے کو اب تیار نہ تھا۔ غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ اور جسم لرز رہا تھا —— "ٹانگہ ہانک دو ——" اس نے اپنے ملازم کو ڈانٹ بتائی۔ اور اگلے لمحے ٹانگہ ہوا سے باتیں کررہا تھا۔

"ٹانگہ کے نمبر لکھ لو —— !" ایک سپاہی نے کہا۔

"اب چپ رہو —— تحصیلدار صاحب کا ٹانگہ ہے —— اور وہ لڑکے ہی تو ہیں۔ تحصیلدار کے جو اس کو لئے جارہے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے بیچ میں کون پڑے یار !" دوسرے نے جواب دیا۔

"ہوگا بڑا ——" شنکر نے غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"بدلہ نہ لیا ہو تو جاٹ نہیں —— مہتر جانیو !!" سپاہی مسکرا دیئے۔

"جب میاں بیوی راضی تو کیا کریگا قاضی" ایک شریر سپاہی نے مسکراتے ہوئے شنکر سے کہا۔

"دیکھ لینا ——" شنکر نے بڑے استقلال سے جواب دیا۔

شہر کے بازار اور کشادہ سڑکوں کو دیکھکر لیلا کو اپنے میکے کی یاد آگئی۔ جہاں اس نے زندگی کی سولہ بہاریں گذاری تھیں۔ سوتیلی ماں کے مظالم میں یہ بھی ایک تھا کہ اس نے بیاہتے وقت لیلا سے کہا تھا —— گاؤں میں اس ہی لئے دے رہی ہوں کہ تو شہر والوں میں رہنے کے قابل نہیں۔ گنواروں سے اچھی گذرے گی۔ اور جب اس کی شادی ہورہی تھی تو گاؤں —— اور گاؤں والوں کا احساس اس کے لئے جس قدر سوہان روح تھا یہ اس کا ننھا سا دل ہی جانتا تھا۔ لیکن یہاں آکر رمیش کی غریبی کے باوجود اس کو ہر طرح کا آرام تھا اور وہ بہت مسرور تھی۔ اس کی ساس اس کو ماں کی طرح چاہتی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار اس نے ساس کی محبت سے یہ اندازہ کیا کہ ماں کی محبت کیا ہوتی ہوگی —— ؟

جب اس کی ساس رمیش سے کہتی "بڑے گھر کی لڑکی ہے —— شہر کی رہنے والی —— اس سے ایسی محنت مشقت نہ ہوگی۔ آٹا پسوائی پر شہر سے پسوالانا"۔ تو اس کا دل وفور مسرت اور احسان سے بھر جاتا۔ کس قدر ہمدرد ہیں یہ —— ! وہ دل میں سوچتی —— اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہو جاتی۔ —— لیکن فلک کج رفتار سے اس کی یہ مسرت دیکھی نہ گئی۔ اور سال کے اندر ہی اندر اس کی مشفق ساس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اس نے بری طرح احساس تنہائی کیا —— لیکن جلدی ننھا دنیا میں آگیا —— اور وہ اسکی محبت میں ایسی کھو گئی کہ اسکو تنہائی کا خیال بھی نہ ہوتا۔ البتہ ساس کی یاد اس کے دل سے نہ مٹ سکی تھی —— رمیش کی محبت —— اس کی دنیائے غربت میں ایک ایسا درخشاں چاند تھا۔ جس کی زریں کرنوں نے مفلسی جیسی بھیانک تاریکی کو اپنے اندر

...تھا ——!! مگر آہ —— اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ بیتی ماں کا ——
...ا ابھی تک زمانہ ابھی باقی ہے — اور یہ سب سے بڑھکر ہوگا —— یہ اس کو
...جب رنجیتؔ بالکل ہی پلنگ پر گر گیا کہ وہ اس کی شادی سے بھی چھ
...ل سے بیمار تھا —— اکثر اسکو بخار ہو جاتا اور کھانسی —— ...کی
کھانسی تو ہمیشہ ہی رہا کرتی تھی —— محلہ والیوں نے کہا —— اس کی ماں کو
...ے علم تھا —— مگر اس نے اس کی پرواہ نہ کی ——!!
یہ کوئی نئی بات نہیں۔ محلہ والوں نے کہا اس گھر میں تو یہ بیماری اب
...نی پڑ گئی ہے۔ اور جتنے بھی اس میں مرے سب جوان ہی مرے۔

" اُترو بھابی ——" پرمود کی آواز سے لیلا ایسے چونک پڑی جیسے کوئی
...ب سے بیدار ہو۔ اب تانگہ ایک وسیع عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ نوکر سامان اُتار
...تھا۔ اور پرمود ننھے کو گود میں لئے کھڑا مسکرا رہا تھا۔
وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اُتری —— آگے آگے ملازم سامان لئے ہوئے۔
...ا کے پیچھے پرمود ننھے کو لئے۔ سب سے پیچھے لیلا —— ایک وسیع مکان سے
...رنے کے بعد زنانہ مکان کی ڈیوڑھی پر پہنچے۔ جس مکان سے وہ گذر کر گئے تھے وہ
...نی سجا ہوا تھا۔ جا بجا گملے رکھے تھے۔ اور صاف ستھرے صحن میں کچھ کرسیاں
...ی تھیں۔
" یہ مردانہ مکان ہے " پرمود نے لیلا کے متجسس نظروں کو دیکھ کر
...ہا۔ " اندر چلئے۔ یہ ہے زنانہ مکان "
دہلیز پر قدم رکھتے ہی اُس کی نظریں دو عورتوں پر پڑیں۔ ایک ادھیڑ
...لی سیاہ رنگت کی عورت جس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ مغرور بہت ہے ——
. دوسری بالکل ہو بہو پرمود کی ہم شکل اور اُس کی ہم عمر لڑکی۔
" یہی ہیں وہ —— بھیا!! " لڑکی نے پرمود سے سوال کیا۔
" ہاں کمود —— ان کو ماتا جی کے پاس لے جاؤ "
لیلا خوف زدہ —— سامنے دالان میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی عورت کے
...س لڑکی کے پیچھے جا پہنچی —— " نمستے " اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا —— وہ
...وس کر رہی تھی۔ اُس کے آنے سے وہ کچھ خوش نہیں۔
" نمستے " اُنہوں نے بے دلی سے جواب دیا ——!! اور وہ سہم گئی۔

اس کو یہاں آئے آج چھ روز گذر گئے تھے۔ کمود سے اُس کی کافی دوستی
...ئی تھی۔ اور کمود بھی بھائی کی طرح اس پر بہت مہربان تھیں —— لیکن ——

ماتا جی —— وہ کچھ خوش نہ تھیں۔ وہ محسوس کرتی جب پرمود اسے ایک نظر
تو اُن کے تیور بدل جاتے ہیں۔
کمود نے کہا۔ بھابی۔ بھیا کی شادی سے پہلے جائیں تو تمہیں سکول
لے چلیں گے۔ بھیا کہتے تھے تمہارا نام بھی لکھوا دیں گے۔ "
" اب پڑھکر کیا ہوگا " ماتا جی نے حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ
ایک نظر لیلا پر ڈالتے ہوئے کہا۔ لیلا اور پرمود دونوں نے اس کو بیک وقت
محسوس کیا۔ اس ہی لئے پرمود گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔
" بھابی یہاں دل بھی لگ گیا ؟ "
" ہاں بھیا " لیلا نے ایک سرد آہ کے ساتھ جواب دیا —— اسکو ایسا
محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی زندگی —— وقف ہو گئی ہے —— ان حقارت آمیز
نظروں کے لئے —— اور —— ان سے بچکر وہ اب کہیں بھی نہیں جا سکتی۔
پرمود اُٹھکر باہر چلا گیا —— برجیش کمود سے بہت ہل گیا تھا اور
اس وقت بھی اس ہی کے ساتھ فرش پر کھیل رہا تھا۔
" بھابی "! کمود نے حسب عادت کہا " تمہارے کوئی بہن ہے ؟ "
" کوئی نہیں " اُس نے سرد آہ کے ساتھ جواب دیا۔
" کمود! کتنی بار کہا ہے بھابی مت کہا کر۔ جی جی کیوں نہیں کہتی۔ جو
ابھی کوئی آ جائے —— سمدھیانے سے تو نہ جانے کیا سمجھے " ماتا جی نے
تیور بدل کر کہا۔
لیلا نے محسوس کیا جیسے زمین اور آسمان گھوم رہا ہو۔ اس نے
ہر چند سنبھلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی —— اُس کو چکر آیا اور فرش پر
گر کر بے ہوش ہو گئی —— ابھی وہ پوری طرح غافل نہ ہو پائی تھی اس لئے
صرف اس قدر سن سکی " نہ جانے کیا مرض ہے —— بدنصیب کو ——
ایسی نامراد کا صبح صبح منہ دیکھنا ہوتا ہے —— اور بھی نہ جانے ماتا جی کیا
کیا کہہ رہی تھیں —— مگر وہ سن نہ سکی —— اور بے ہوش ہو گئی۔

جب اسکو ہوش آیا —— تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا —— اس نے
محسوس کیا جیسے وہ بہت کمزور ہو گئی ہے —— سب سے پہلے جب اُس نے بولنے کی
کوشش کی تو اُس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا۔ " ننھا "! اور کمود نے ننھے
کو فوراً لا کر اس کے پاس بٹھا دیا۔ وہ جس قدر نحیف ہو گئی تھی۔ ننھا خیر سے اُس ہی قدر
فربہ ہو رہا تھا۔ اُس نے دل میں سوچا۔ میری آنکھوں میں خاک۔ یہاں شہر کی آب و
ہوا نے ننھے کو تو بالکل ہی بدل دیا۔

"جی جی! کچھ ٹھہرئے — چار ماہ بیمار رہیں تم — تم نے تو بس ڈرا ہی دیا تھا سب کو۔ پرمود بھیا بہت پریشان تھے۔" کمود نے مسرت بھری آواز میں اسکی حالت کو دیکھکر سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

"مرجاتی تو اچھا تھا بہن —" لیلا نے ننھے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی اب تم لوگوں سے مانوس ہوگیا تھا — پل ہی جاتا"

کمود نے محسوس کیا۔ لیلا — کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں — اسکی بیچارگی کے احساس سے اس نرم دل لڑکی کے دل پر بہت چوٹ لگی۔

"ایسا نہ کہو جی جی۔" کمود نے لیلا کے ماتھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اب ہم کل کو تمہیں گھر لے جاوینگے۔"

"گھر" لیلا نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے آہستہ سے زیر لب دُہرایا۔ "اوہ — اب بھی میں — ہسپتال میں ہوں —"

"ہاں جی جی — تمہاری حالت بہت ہی نازک ہوگئی تھی۔ بھیا کی شادی کے مہمانوں اور شور و غل کے سبب بھیا کو بہت فکر تھی۔ کہ اس گڑبڑ میں تمہاری صحیح تیمارداری نہ ہوسکے گی۔ اس لئے ہسپتال میں داخل کرادیا تھا۔" کمود نے کہا۔

"ننھا کس کے پاس رہا — ؟" اس نے بے چینی کے منہ پر محبت بھری نظریں گاڑھکر ناتوان آواز میں سوال کیا۔

"میرے پاس —" کمود نے پیار سے بچے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "اب یہ پیروں چلنے لگا ہے جی جی — اور خوب بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔"

"ہاں — چاچا جی —" بچے نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور دوڑکر پرمود کے پیروں سے جا لپٹا۔

"کمود — کیا حال ہے —" پرمود نے سوال کیا۔

"بالکل ٹھیک —" کمود نے خوشی سے جواب دیا۔ "ڈاکٹر صحیح کہتا تھا کہ اس مرتبہ جب ہوش آئیگا تو دماغی حالت درست ہوگی — اب وہ سب کو پہچانتی ہیں۔ اور خوب باتیں کرتی ہیں —"

"نمستے بھابی جی — تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔" پرمود نے لیلا پر جھکتے ہوئے کہا۔

"جیتے رہو بھیا —" لیلا نے بزرگوں کی طرح دعا دیتے ہوئے پوچھا۔

"تو کیا میرا دماغ خراب ہوگیا تھا ؟"

"نہیں — نہیں —" پرمود نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "ذرا یوں ہی پریشانیوں کے سبب — بیمار ہوگئی تھیں۔"

"کمود — انہیں آنا ملاؤ —" پرمود نے بہن سے کہا۔

"اوہ — تو کیا آج بھابی جی بھی آئی ہیں —" کمود نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں — آئی تو ہیں مگر — گاڑی ہی میں بیٹھی ہیں۔ اُترتی نہیں —" پرمود نے بہن کی طرف دیکھکر مری ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔

لیلا نے بمشکل کہا — "بھابی جی —" لیلا کے ہونٹ خوشی سے کانپ رہے تھے۔ چہرہ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا — پرمود نے اس کو دیکھا — اس کی آنکھوں سے اشتیاق اور مسرت پھوٹی پڑتی تھی — "انہیں — بلا — لاؤ — بھیا —" لیلا نے انتظار کی تاب نہ لاتے ہوئے پرمود سے کہا — "میں بھی دیکھونگی —!"

"آجائینگی — کمود جو لینے گئی ہے —" پرمود نے بجھے ہوئے دل سے جواب دیا۔

بہت دیر ہوگئی۔ مگر وہ نہ آئیں۔ لیلا کی متجسس نظریں کئی بار دروازہ پر سے ناکام لوٹ آئیں۔ آخر — کمود اور اُس کے پیچھے ایک لمبی تڑنگی سانولی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی — لیلا نے حیرت سے دیکھا — وہ بہت قیمتی کارچوبی ساڑی پہنے اور سر سے پیروں تک جواہراتی زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ طرز انداز سے بہت مغرور معلوم ہورہی تھی۔

"سوشیلا" — پرمود نے اس کو دیکھکر کہا "یہ — کمود سے میرے لئے کم نہیں ہیں"۔ لیلا کے کانوں — نے اس محبت بھرے جملے کو سُنا اور دل فرط مسرت سے بے خود ہوگیا۔

"نمستے بھابی جی ؟" لیلا بمشکل کہہ سکی — !! ایسے وقت درشن ہوئے ہیں — مگر منہ دکھائی کو یہاں کچھ نہیں — کیوں نہیں — لیلا نے خود ہی فقرہ کو لوٹایا اور دماغ میں یہ تصور آتے ہی اسکا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اور ننھے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اس نے کہا — "میری یہی دولت ہے — بھابی — غریب کی — دولت — میرا یہ لال — تم اپنی منہ دکھائی میں قبول کرلو — بہن" لیلا کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ رہے تھے — کمود — اور — پرمود بھی ضبط نہ کرسکے۔ شوہر اور — نند کی آنکھوں میں آنسو دیکھکر — سوشیلا — جل گئی —

(باقی آئندہ)

یک جُرعۂ تلخ

(از محترمہ نواب سیدہ اختر حیدرآبادی)

یہ کیا ہُوا تیری زندگی کو کہ صبح ناپید زین پیدا — نفس نفس شور بن گیا ہے نظر نظر سے ہے شین پیدا
نہ جلوہ ہائے نجف نمایاں نہ عظمتِ کاظمین پیدا — اگر ہے مُسلم تو کر فضائے جہانِ ہستی میں چین پیدا
کہ تیرے سازِ حیات کے ہے ہر ایک نغمے سے بَین پیدا

نہ آرزو ہے، نہ ولولہ ہے، نہ شورشیں ہیں، نہ آگہی ہے — نہ تجھ میں شانِ سلف نمایاں نہ تجھکو اندازۂ خودی ہے
غضب ہوا آہ! تیری دُنیا بہت ہی تاریک بن گئی ہے — ہزار افسوس تیرے اوپر، یہ زندگی کوئی زندگی ہے
نہ حُسن کی روشنی میسّر نہ عشق کا نورِ عین پیدا

تمام دُنیائے زندگانی کا رہنما ہے تو ابتدا سے — کہ اب بھی آہنگِ ساز باقی ہے صرف تیری ہی اک صدا سے
ہوئی یہ جرأت بھی تیرے اندر کہ جانتا اپنی انتہا سے — ہوئی یہ توفیق آہ تجھ کو کہ پوچھتا خاکِ کربلا سے
یزیدؔ پیدا ہوئے ہزاروں، ہوا نہ کوئی حسینؑ پیدا

ستم! کہ خودداریاں زمانے میں تیری اب بھیک ہو گئی ہیں — غضب! کہ بیداریاں تری سب ترے تغافل میں سو گئی ہیں
تجھے خبر ہے کہ تیری فطرت کی عظمتیں تجھ کو رو گئی ہیں — یہ آج کیا ہے! کہ تیری نظریں جمالِ مغرب میں کھو گئی ہیں
کبھی ہوئی تھی تری جبیں سے تجلیٔ "مشرقین" پیدا؟

یہ زخمِ دل نذر ہے خدایا تو اپنی خدمت میں قبول کر لے — مجھے بھی کچھ درد کر عنایت کچھ اپنے دل کو ملول کر لے
یہ دل سے نکلی ہوئی صدا ہے نوائے سازِ بتولؑ کر لے — دعائے اختر قبول کر لے! قبول کر لے!! قبول کر لے!!!
نگاہِ مُسلم میں اے خدا کر "جلالِ بدر و حنین" پیدا

ڈرامہ

یہ دیس ہمارا ہے

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

(سلسلہ کے لئے دسمبر ۱۹۴۳ء کا ادیب ملاحظہ فرمائیے)

دوسرا ایکٹ ——— دوسرا سین

بنئے کی دوکان۔ دو بنئے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں

ایک :۔ یار گیہوں اور چاول تو بہت جمع ہوگیا۔

دوسرا :۔ بہت ہے یار بہت ——— برسوں کھائیں گے اور بیچیں گے۔

ایک :۔ خوب قانون جاری کئے گئے۔ مگر ہمارا کوئی بھی کچھ نہ کر سکا۔

دوسرا :۔ مزے سے ایک سیر کا بیچا۔ نہ پولیس کچھ کر سکی اور نہ وہ لوگ جو توم توم چلاتے پھرتے ہیں۔

ایک آدمی :۔ (بنئے سے) دو آنے کے چاول ہونگے بھیا؟

بنیا :۔ نہیں۔

(چلا جاتا ہے)

دوسرا بنیا :۔ سالا دو آنے کے چاول لینے چلا تھا۔

ایک :۔ ہم تو اب ایک دانہ بھی نہیں نکالنے کے۔ ہاں کوئی بڑی رقم ملے تو دوکان کھول لیں بھی۔

دوسرا :۔ ایسے تو صبح سے شام تک ہزاروں آتے رہتے ہیں۔

ایک آدمی :۔ (بنئے سے) بھیا کچھ چاول ہوگا؟

بنیا :۔ (تیوری پر بل ڈال کر) یہاں اناج وناج نہیں ہے

آدمی :۔ (خوشامد سے) کچھ چاول ہے۔

بنیا :۔ کیوں بک بک کر رہا ہے۔ ایک بار کہدیا کہ یہاں کچھ نہیں ہے۔

(چلا جاتا ہے)

ایک بنیا :۔ ایک بار منع کر دیا لیکن پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔

دوسرا :۔ ایسے لپٹے ہیں جیسے دکھ گئے تھے۔

ایک بچہ :۔ (دوکان کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے) چار آنے کے چاول دیدو۔

(بنئے ایک دوسرے کو دیکھکر ہنستے ہیں)

بنیا :۔ تیری ماں ہے؟

بچہ :۔ (بھول پن سے) ہاں ———

بچہ :۔ (بھوک سے پریشان ہے) چاول دیدو۔

دوسرا بنیا :۔ ہشت! پاگل ہوا ہے۔ جا پہلے اپنی ماں کو بھیج دے۔

(بچہ مایوس چلا جاتا ہے)

بنیا :۔ ان لوگوں نے بھی پریشان کر رکھا ہے۔ بھلا کال پڑا۔

دوسرا :۔ بیوقوف یہ بھی تو نہیں سوچتے کہ دو آنہ چار آنہ کے لئے کون پریشان ہوتا پھرے گا۔

(ایک عورت بچے کو سینے سے لگائے آہستہ آہستہ آتی ہے)

عورت :۔ کچھ چاول مل جائے گا؟

بنیا :۔ مائی یہاں تو دانہ بھی نہیں۔

عورت :۔ دانہ بھی نہیں (کچھ سوچنے لگتی ہے)

بنیا :۔ اگلی دوکان پہ چلی جا۔ شاید وہاں ہو۔

عورت :۔ (کراہتے ہوئے) کیا تم اس بچہ کو خرید لوگے؟ میں چار آنے میں دیدوں گی

بنیا :۔ ہشت! یہ کال کے دن ہم سے اپنے ہی نہیں سنبھلتے جاتے۔

دوسرا :۔ آگے دیکھ ——— آگے ———

اسی طرح متعدد لوگ اسکی دوکان پر آتے ہیں۔ لیکن وہ ہر ایک کو ایک ہی جواب دیتا ہے۔

ایک نوجوان لڑکی آتی دکھائی دیتی ہے جو بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ ہر لڑ کھڑا رہے ہیں۔ دونوں بنئے دیکھکر خوش ہوتے ہیں۔

ایک :۔ بڑی سندر لڑکی ہے۔

دوسرا :۔ چل کیسے رہی ہے ——— جیسے نشہ میں ہو۔

ایک :۔ ہماری دوکان پر آ رہی ہے۔

دوسرا :۔ چاول لینے آ رہی ہوگی۔

ایک :۔ ہاں ——— دیکھتے نہیں۔ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔

دوسرا :۔ اسے چاول دوگے؟

ایک :۔ ہاں ——— ضرور

(دونوں ہنستے ہیں ——— لڑکی قریب آتی ہے)

لڑکی :۔ (آہستہ سے) کچھ چاول ہوگا؟

[illegible]: ۔ تھوڑا سا بھی نہیں ؟

بنیا : ۔ تھوڑا سا ؟ (کچھ سوچنے لگتا ہے) چاول لے گی ؟

لڑکی : ۔ ہاں ——

بنیا : ۔ مگر چاول ایسے نہیں مل سکتے ۔

لڑکی : ۔ تمہاری کرپا ہوگی —— اگر کچھ چاول دیدو ۔

بنیا : ۔ چاول تو میں تجھے دیدونگا (دوکان کے باہر ادھر اُدھر نظر ڈالتا ہے)

لڑکی : ۔ بھگوان تمہارا بھلا کریگا ۔

بنیا : ۔ چل دوکان کے اندر چل ۔ ہم تجھے چاول دینگے ۔

لڑکی : ۔ میں یہیں کھڑی ہوں ۔

بنیا : ۔ جی ہاں —— مفت میں چاول لینا چاہتی ہے ۔

دوسرا : ۔ ایسے چاول لینے ہیں تو گھر کا راستہ لے ۔ اب اناج ایسے نہیں ملتا ۔

لڑکی : ۔ مجھے تھوڑا سا چاہیئے ہے ۔ بھگوان کے لئے رحم کرو ۔ میرے بہن بھائی بھوک سے مر رہے ہیں ۔

بنیا : ۔ ہماری بات مان جا —— ہم تجھے چاول دینگے ۔

(لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ دوکان پر چڑھنے لگتی ہے)

تیسرا ایکٹ —— پہلا سین

شہر کی ایک میٹنگ ۔ قومی اتحاد اور کھانے کے سلسلہ پر گفتگو ہو رہی ہے ۔ ہندو اور مسلمان سب ہی موجود ہیں ۔

مکرجی : ۔ آج ہمارے سامنے جو چیز ہے وہ کھانے کا مسئلہ ہے ۔ شہر کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے ۔ اور اگر لاپرواہی کی گئی تو معلوم نہیں کہ کیا حالت ہوگی ۔

سلطان : ۔ اس نازک حالت میں ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اس بھوک کا علاج سوچیں ۔

روپا : ۔ لیکن یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندو مسلمان متحد نہ ہو جائیں ۔ ہم کو چاہیئے کہ بنگال کو مصیبت سے بچانے کیلئے متحد ہو جائیں آج کی بھوک ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کی دعوت دے رہی ہے ۔

محمود : ۔ روپا کے خیال کو میں بھی پسند کرتا ہوں ۔ واقعی ہم لوگوں کو غذائی

مکرجی : ۔ اگر اس مسئلہ میں ہندو مسلمان متحد ہو جائیں تو بہت [illegible] وطن کے لئے بھی متحد ہو سکتے ہیں ۔

محمود : ۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ہندو مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کریں ان کو بتلائیں کہ سوویت یونین کی زندہ قومیں کس طرح متحد ہو کر فاشسٹوں سے لڑ رہی ہیں ۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں کو متحد ہو جانا چاہیئے ۔

سلطان : ۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ کانگریسی رہنما مسلمانوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کریں ۔

حمید : ۔ اور ساتھ ہی مسلم لیگی برادران وطن کو چاہیئے کہ کانگریسی رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کریں ۔

روپا : ۔ یقینی اس طرح ہمارے ملک میں اتحاد قائم ہو سکتا ہے ۔ لیکن اب وقت زیادہ سوچنے کا نہیں ۔ ہم لوگوں کو جلد سے جلد متحد ہو کر غذائی بحران کو حل کرنا چاہیئے ۔

مکرجی : ۔ سب سے زیادہ اہم اور تشویشناک بات یہ ہے کہ اگر بنگال کی خبر لی گئی تو جاپانی بہت آسانی سے ہمارے ملک پر قبضہ کریں گے ۔ اس لئے بنگال کی مدد کر کے اپنے ملک کی حفاظت کی جا سکتی ہے ۔

(ایک صاحب آگے بڑھتے ہیں)

ایک شخص : ۔ بنگال کے بھوکے مرنے کا سبب یہ ہے کہ اول تو گورنمنٹ کی زیادتی غلہ کی بہت بڑی تعداد فوجوں کو چلی جاتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزوں نے اناج بھر لیا ہے ۔ لیکن اس کا واحد علاج یہ ہے کہ لوگ گورنمنٹ کو زیادہ سے زیادہ پریشان کریں اور ذخیرہ اندوزوں کی دکانوں میں گھس کر تمام غلہ لوٹ لیں ۔

محمود : ۔ جی نہیں —— یہ فعل ہندوستان کے لئے بیحد خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے ۔ اور اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ۔ اگر عوام کو ہم یہ مشورہ دیں کہ تم دکانوں اور بازاروں کو لوٹ لو تو اس سے غذائی بحران حل نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ سب بھوکے ہونگے ۔ جتنا جس کے ہاتھ آئیگا وہ لے جائیگا ۔ کسی کو کم ملے گا اور کسی کو زیادہ ۔ اور کسی کو بالکل ہی نہیں ملے گا ۔ گورنمنٹ کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا ۔ بلکہ ہمارے ملک میں پھوٹ پڑ جائیگی ۔

حمید : ۔ وہ دوسری بات جو آپ نے کہی کہ غلہ فوجوں کے لئے جاتا ہے ۔ لیکن ہمیں بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہندوستان کا غلہ ہمیشہ باہر جاتا رہا ہے ۔ اور [illegible]

باہر جاتا تھا کہ آج وہ فوجوں کے لئے جا رہا ہے۔

[illegible] :۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ فوجوں کی مدد کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم فوجوں کی مدد نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنے ملک کو فاشسٹوں کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس میں گورنمنٹ کی کوئی زیادتی نہیں ہے ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومت میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ وہ مکمل انتظام کرسکے۔ بہر حال اناج کی اس کمی کو ہم پیداوار بڑھا کر پورا کرسکتے ہیں۔

مکرجی :۔ بنگال پر یہ مصیبت بھی تو اسی توڑ پھوڑ کی لائی ہوئی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ذخیرہ اندوزوں نے خوب جی کھولکر اناج بھر لیا اور پھر جس بھاؤ چاہا فروخت کیا لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال ۹ اگست کو پانچویں دستہ نے کیسی توڑ پھوڑ مچائی تھی۔

سلطان :۔ جی ہاں — ان لوگوں نے ریل کی پٹریاں توڑیں ٹیلیفون کے تار کاٹے۔ پوسٹ آفس میں آگ لگائی وغیرہ وغیرہ

محمود :۔ کہنے کو تو ان لوگوں نے گورنمنٹ کا نقصان کیا لیکن سچ پوچھئے تو اس سے ہمارے ہی ملک پر تباہی آئی۔ کتنے ہندو مسلمان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ غلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جاسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بھوکے مرنے لگے۔

حمید :۔ بہر حال اب ہم کو چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں فصل اچھی ہے وہاں سے اناج حاصل کریں۔ اس طرح ہم بنگال کو اس مصیبت سے بچا سکتے ہیں۔

روپا :۔ ہاں اگر شہر میں فوڈ کمیٹیاں بنائی جائیں تو عوام کو آسانی کھانے کو تول سکتا ہے۔

مکرجی :۔ دیکھئے بنگال ہمارا سرحدی قلعہ ہے۔ اگر ہندو مسلمانوں نے متحد ہوکر اپنے ملک کی حفاظت نہ کی تو فاشسٹ جو اس وقت تاک میں ہیں اندر گھس کر ہمارے ملک کو برباد کر دینگے۔ ہم کو چاہیئے کہ اس وقت قومی اتحاد قائم کرکے نوکرشاہی اور فاشزم کی چالوں کو مات دیں۔

محمود :۔ ہمیں یہ ہرگز نہیں سوچنا چاہیئے کہ ملک کا انتظام گورنمنٹ کیوں نہیں کرتی اس لئے کہ یہ ملک ہمارا ہے اور اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ انگریز اس کو چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں چھوڑ سکتے۔

تیسرا ایکٹ ———— دوسرا اسین

نواب صاحب کا مکان۔ کھانے کے کمرے میں بہترین قسم کا کھانا چنا ہوا ہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کھانا کھا رہے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ محمود کی طرف سے مجھے اب کوئی امید نہیں رہی۔

بیگم صاحبہ :۔ شادی ہو جائیگی سب ٹھیک ہو جائیگا۔ بچپن ہے۔

نواب صاحب :۔ میرا خیال ہے کہ اس کی شادی جلد سے جلد کردیجائے۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں پھر اپنا جو چاہیں کریں۔

بیگم صاحبہ :۔ جب بوجھ پڑتا ہے تو سب بھول جاتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ (افسردگی سے) بیگم! اب وہ ٹھیک ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ مجھ جیسا سخت باپ جب اس کو ٹھیک نہ کرسکا تو بچاری بیوی گھر کی بیٹھنے والی کیا کرسکتی ہے۔ میں نے اسکو مار بھی ایسی ایسی دی ہے کہ جسم کی کھال تک ادھیڑ دی۔ لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔

بیگم صاحبہ :۔ تم کیا جانو بیوی کی اور ہی بات ہوتی ہے۔

نواب صاحب :۔ اور وہ شادی کرنے کو بھی کب تیار ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ تو کوئی لڑکے اپنے منہ سے کہنے لگتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ منہ سے نہیں کہتے تو منع بھی تو نہیں کرتے۔

بیگم صاحبہ :۔ تم نے اپنے منہ سے کہدیا ہوگا۔

نواب صاحب :۔ (ہنس کر) میرا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

بیگم صاحبہ :۔ کیوں ———— ؟

نواب صاحب :۔ تم نے اور میں نے تو پہلے ہی طے کرلیا تھا۔

بیگم صاحبہ :۔ بس رہنے دو —— ہاں جب ہونے لگتا ہے تو کوئی بھی منع نہیں کرتا۔ ہمارے بھائی بھی ایسے ہی کہا کرتے تھے۔ اور دیکھو بیوی کے ساتھ کیسے خوش رہتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ تو پھر اس کو راضی کرلو ———— وہ تو کبھی اپنی چچی کے پاس تک نہیں جاتا۔

بیگم صاحبہ :۔ چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو میں تو دلہن سے جاکر کہونگی کہ بس اسی مہینے میں بیاہ رکھدو۔ اللہ رکھے کسی چیز کی کمی تھوڑی ہے۔

نواب صاحب :۔ آج وہ آئے تو ٹھیک ٹھیک بات۔ یا تو وہ شادی کرے یا وہ میرے گھر سے نکل جائے۔

بیگم صاحبہ :۔ تم تو سٹھیا گئے ہو ———— بچپن ہے ٹھیک ہو جائیگا۔

نواب صاحب :۔ لیکن سوال یہ بھی تو ہے کہ لڑکے کی یہ حرکتیں دیکھتے ہوئے بھلا وہ اپنی لڑکی کیوں دینگے۔

بیگم صاحبہ :۔ کیسی اچھی باتیں کرتے ہو۔ اللہ نہ کرے کہ ہمارا لڑکا بری حرکتیں کرتا پھرتا ہے۔

نواب صاحب :۔ اور بری حرکتیں کیسی ہوتی ہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ بس اپنی باتوں سے میرا جی جلاتے ہے۔ جب ہی تو میں تم سے بات نہیں کرتی۔ اللہ ری سیدھی الجھنے لگتے ہو۔

نواب صاحب :۔ بیگم! تم کو برا لگے یا بھلا۔ میں تو سچ بات کہتا ہوں۔ محمود کا ناس تم ہی نے کیا۔

بیگم صاحبہ :۔ (بگڑ کر) میں نے کیا ناس کیا ——— ؟

نواب صاحب :۔ چماروں کے بچوں میں کھلا کھلا کر تم نے بری صحبت کی عادت ڈلوا دی اب بڑے لوگوں کی صحبت ہی اسکو پسند نہیں۔ اس کو تو وہی اچھا لگتا ہے۔ گاؤں میں مارا مارا پھرے اور ان کسانوں کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھاتا ہے جنکو ہم اپنے جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے

بیگم صاحبہ :۔ (افسردگی سے) میں نے تو اپنی سی بہت کی لیکن تقدیر کا کیا کروں۔

نواب صاحب :۔ (کچھ غصہ اور رنج کے لہجہ میں) اب تقدیر کو بیٹھی رو یا کرو۔

بیگم صاحبہ :۔ تو پھر میرے بس کی بھی کیا بات ہے۔ تم تو بلا وجہ سارا الزام میرے سر تھوپ رہے ہو۔

نواب صاحب :۔ تمہاری وجہ سے میں خاموش ہوں۔ ورنہ میں تو صورت بھی نہ دیکھوں۔

بیگم صاحبہ :۔ ماں کی ممتا باولی ہوتی ہے۔ اگر وہ اس سے بھی برا ہوتا تو مجھ سے ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا۔

(کھانے کے کمرہ سے ملا ہوا ہی باورچی خانہ ہے جسکی کھڑکی سڑک کی طرف کو کھلتی ہے۔ کھڑکی پر ایک چق پڑی ہوئی ہے۔ سڑک کے پار ایک درخت چق میں سے دکھائی دے رہا ہے جہاں بہت سے بھوکے بچے درخت کے پتے اور چھال نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ کئی بچے بیہوش پڑے ہیں۔ دو آدمی بھوک کے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے ہیں)

"روٹی ———"

"روٹی ———"

(ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی ہیں)

(نوکر کچھ سوکھے ہوئے ٹکڑے اور سڑی ہوئی دال وغیرہ کھڑکی سے باہر پھینکتا ہے بھوکے بچے جو چھال وغیرہ چبا رہے ہیں سب ادھر دوڑتے ہیں اور ساتھ ہی ایک کتا بھی دوڑتا ہے۔ بچے جلدی جلدی

کتا نے لگے [illegible]

کتے سے روٹی چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کتا کاٹتا ہے۔ بچے زور آواز سے چلاتے ہیں۔)

ایک نوکر دوسرے سے :۔ یہ بچے بھوکے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا :۔ ہائے ہائے۔ کتے نے کاٹ لیا۔ نہ جانے کس کے بچے ہیں گے۔

نوکر :۔ (بچوں سے) تم بھوکے ہو ؟

بچے :۔ ہاں ——— روٹی ہے ؟

(ایک نوکر جلدی سے جاتا ہے اور کچھ روٹیاں لاکر باہر پھینک دیتا ہے بچے ایک دوسرے سے چھین کر کھانے لگتے ہیں۔)

نواب صاحب :۔ ہوائے! ——— ہوائے !!

بیگم صاحبہ :۔ یہ سب کے سب کہاں مر گئے۔

ایک نوکر :۔ جلدی چلو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ اگر دیکھ لیا تو جسم پر کھال بھی باقی نہ رہے گی۔

(دونوں چلے جاتے ہیں۔ بچے روٹی ملنے کی آرزو میں کھڑکی کو تک رہے ہیں)

تیسرا ایکٹ ——— تیسرا سین

(غلہ کی دوکان۔ ہزاروں بچے اور بڑے دوکان کے سامنے کھڑے ہیں۔ روپا اور محمود بھی دوکان کے سامنے ہی کھڑے ہیں)

روپا :۔ اُف ——— بھوک ——— بچے اور بڑے کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں۔

محمود :۔ روٹی ہی سب کچھ ہے۔ تم دیکھ رہی ہو روپا۔ اس میں مزدور بھی ہیں۔ کسان بھی ہیں۔ کاریگر بھی۔ جب ان کے پیٹ میں روٹی تھی تو یہ چوبیس گھنٹے اپنے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ بڑی سے بڑی چیز اُٹھانے میں بھی انہیں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔

روپا :۔ لیکن آج انہیں اپنا جسم بھی کتنا بوجھل معلوم ہو رہا ہے۔

(سب لوگ کچھ چاول لے کر جا رہے ہیں)

محمود :۔ دیکھو روپا! جو لوگ چاول لیکر جا رہے ہیں کتنے خوش دکھائی دے رہے ہیں

روپا :۔ ہاں ———

محمود :۔ روپا! کوئی ایسی ترکیب کرو کہ ان لوگوں کو جلد سے جلد چاول مل جائے۔

روپا :۔ سوچ تو میں بھی یہی رہی ہوں ——— (کچھ سوچنے لگتی ہے)

محمود :- مجھے یہ سوچ سوچ کر اور بھی رحم آ رہا ہے کہ یہ لوگ نہ معلوم کب سے کھڑے انتظار کر رہے تھے۔

روپا :- یہ دیکھو کتنے تو گرنے کے قریب ہیں ——— معلوم نہیں ان کو روٹی کب ملی ہوگی ؟

روپا :- چلئے اُدھر چلیں۔

محمود :- کیوں ——— ؟

روپا :- ہم لوگ بھی جلدی جلدی ان کی تھیلیوں میں اناج بھرنے لگیں۔

محمود :- ہاں اس طرح ان کو جلدی چاول مل جائیں گے۔ اچھا تم بیٹھو۔ میں جا کر بھرتا ہوں۔

روپا :- تم اکیلے ——— کیوں ؟

محمود :- تمہاری طبیعت خراب ہے۔ پھر تم تھک بھی بہت گئی ہو۔

روپا :- خوب ——— میں بیٹھی دیکھتی رہوں۔

محمود :- تم کئی روز کی جاگی ہوئی ہو اور کئی روز سے مسلسل کام کر رہی ہو۔

روپا :- لیکن یہ میرا فرض ہے ——— چلئے اب دیر نہ کیجئے۔ ہمیں اور بھی کام کرنا ہے۔

محمود :- اچھا ———

دونوں دکان کے اُوپر جاتے ہیں اور جلدی جلدی عوام کی تھیلیوں میں اناج بھرنے لگتے ہیں۔ لوگ بیہوش ہو ہو کر گر رہے ہیں۔

روپا :- بچارے نہ جانے کب کے بھوکے ہیں۔ بیہوش ہوتے جا رہے ہیں۔

محمود :- روپا ! ——— جلدی کرو۔

لوگ اناج لیکر واپس جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ بھیڑ کم ہو گئی۔
روپا نے سر اُٹھا کر باہر کی طرف دیکھا۔

روپا :- او ——— کامریڈ محمود ——— دیکھو !

محمود :- کیا ——— ؟

روپا :- کتنے لوگ بے ہوش پڑے ہیں۔

محمود :- (دیکھتا ہے) اب ان لوگوں کو ہسپتال پہنچایا جائے۔

روپا :- یقینی ———

محمود :- (اناج بھرتے ہوئے) کیا ترکیب کی جائے ؟

روپا :- ترکیب ؟ جس طرح روز چارپائی پہ لے جاتے ہیں۔

محمود :- لیکن سوال یہ ہے کہ چارپائی کہاں سے آئے ؟

روپا :- میں لے آؤں گی۔

محمود :- کہاں سے لاؤگی ؟

روپا :- میں کامریڈ مکرجی کے ہاں سے لے آؤنگی ——— آپ کام کر…

محمود :- تو پھر جلدی جاؤ۔

روپا :- اچھا ———

(روپا جانے لگتی ہے۔ پھر پیچھے مُڑ کر)

محمود :- اچھا ——— میں یہیں انتظار کروں گا۔

(روپا چلی جاتی ہے۔ دوکان کے سامنے بھیڑ برائے نام رہ گئی ہے
محمود دُکان سے نکل کر سڑک پر آ جاتا ہے)

محمود :- (خود سے) معلوم نہیں کتنے ان میں سے مر بھی گئے ہونگے۔

(انتظار کرتے کرتے ——— سامنے دیکھنے لگتا ہے)

محمود :- روپا ابھی نہیں آئیں ———

(روپا آتی دکھائی دیتی ہے ——— اور اس کے ساتھ اور کئی آدمی لئے ہوئے آ رہے ہیں)

محمود :- کامریڈ حمید کہاں رہ گئے ؟

روپا :- وہ بھی آ رہے ہیں۔

روپا محمود اور کئی آدمی بے ہوش لوگوں کو اُٹھا کر ہسپتال لئے جا رہے ہیں۔ روپا کا سانس پھول رہا ہے۔ لیکن وہ برابر کام کر رہی ہے۔ ایک چارپائی پکڑوا کر لئے جاتی ہے۔ پھر جلدی سے واپس آ کر اُٹھانے لگتی ہے۔ کچھ لوگ اناج میں بھر بھر کر لا رہے ہیں۔ اور غلہ کی دوکان میں اسی ڈھیر پہ ڈال رہے ہیں۔ اب برائے نام رہ گئی ہے۔

(باقی آئندہ)

اپنے گاؤں کی یاد!

(از محترمہ مظہر رضویہ صاحبہ)

التہابِ غم جگر میں آگ برسانے لگا — گاؤں کی معصوم و سادہ زندگی یاد آگئی
نیم بسمل کر گیا کھیتوں کے سپنوں کا خیال — اور وہ سوئی ہوئی سی چاندنی یاد آگئی
وہ عروسِ قطرۂ شبنم سے ہنگامِ سحر — مہر کی کرنوں کی رنگیں دل لگی یاد آگئی
کروٹیں لینے لگا ہے دل میں خونِ اضطراب — دلربا کھیتوں کی دلکش سادگی یاد آگئی
پھر خیالِ عہدِ گُل سے تلملا اُٹھا ہے دل — یاسمن زاروں کی پھر اک اک کلی یاد آگئی
جنگلوں میں بانسری کا نغمۂ فردوس گوش — اور اثر سے اس کے مجھکو بے خودی یاد آگئی
وحشتیں ذوقِ تبسم سے ہوئیں پھر دفعتاً — اپنے باغیچے کے پھولوں کی ہنسی یاد آگئی

آہ ساون کی جواں راتوں میں وہ ذوقِ سخن
اور فضاؤں کی معطر سی تری یاد آگئی

ہو کے بے خود موسمِ گُل کے شباب و حسن سے — سرو کی شاخوں میں فطرت کی ہنسی یاد آگئی
شعر گوئی کی لطافت کے نہاں تھے جس میں راز — حاصلِ ہوش و خرد وہ بے خودی یاد آگئی
کوہ کے دامن میں سبزے کے لہکتے فرش پر — روبرو پھولوں کے رسم بندگی یاد آگئی
جنبشِ بادِ سحر سے گُل بکف شاخوں کا رقص — اور اس رقصِ حسیں کی دلبری یاد آگئی
پھر چھلک آئے مری آنکھوں میں آنسو یک بیک — صبح دم پھولوں کی پلکوں میں نمی یاد آگئی
بیٹھے بیٹھے آج آنکھیں خون برسانے لگیں — لالہ زاروں کی وطن کے دل کشی یاد آگئی
آگیا پھر یاسمینہ کے تبسم کے خیال!! — ان کی شیریں گفتگو کی دل کشی یاد آگئی

[illegible] اُٹھا

جُرم

(از محترمہ شیریں)

"چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ" اُسے جیسے طویل غشی کے بعد اچانک ہوش آگیا۔

"چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ" اُس نے زیر لب یہ الفاظ دُہرائے۔ اسے اس وقت جج کی آواز کسی خونخوار درندہ کی چنگھاڑ کے مشابہ معلوم ہوئی تھی جو دُور سے شکار کو دیکھکر غرا رہا ہو۔ غرور سے بھری ہوئی بے رحم غراہٹ۔ یہ اتنے ماہ کی قید۔ اور یہ اکٹھے ہی پچاس روپے جرمانہ۔ آخر کس جرم کی پاداش میں! آخر اُس نے کون سا ایسا انوکھا قصور کیا تھا؟ ایک بار نہیں۔ دو بار نہیں۔ بیسیوں مرتبہ وہ بڑے بڑے معزز اور ذی رتبہ لوگوں کو اس جُرم کا مرتکب ہوتے دیکھ چکا تھا۔ بیسیوں بار اس نے بڑی بڑی تقریبوں پر بوتلوں کی بوتلیں خالی ہوتی دیکھی تھیں۔ اور پینے والوں میں بوڑھے۔ جوان، متین کھلنڈرے، ہندو مُسلم سبھی شامل ہوتے تھے۔ سب یکساں جوش و مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے اس روز روز کے جرم پر کسی نے ان کو نہیں ٹوکا۔ اپنے مالک کو اس نے کتنی بار زیادہ پی کر لڑکھڑاتے دیکھا تھا۔ اور کتنی بار اُس نے اسکو سہارا دیکر گاڑی میں بٹھایا تھا پھر اگر وہ ایک دوست کے مشورہ سے اپنے دُکھ کا بار کچھ ہلکا کرنے کیلئے کبھی کبھار شراب پینے لگا تھا تو کون سا اَن ہونی بات ہو گئی تھی۔ کسی کے پیسے سے تو نہیں پیتا تھا۔ کسی کے ڈاکہ ڈال کے تو نہیں پیتا تھا۔ اور پہلے تو کبھی اس چیز کی طرف رغبت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ شرابی کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ اور پھر ایک دن اور یہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ جب مالک نے اس کی پندرہ دن کی تنخواہ کاٹ کر آٹھ روپے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے تو وہ روپے سانپ بچھو بن کر اُس کے سارے جسم میں ڈنک چبھونے لگے۔ آٹھ روپے اور سارا مہینہ سر پر ——— پہاڑ سے تیس دن! آخر وہ کیا کریگا؟ بیوی کو کیا منہ دکھائے گا۔ جو غریب جانے کتنے دنوں سے ایک وقت آدھے پیٹ روٹی اور کبھی شاید فاقوں سے وقت کاٹ رہی ہے۔ جس کی پندرہ دن کی بیماری میں اپنے کانوں کی چاندی کی بالیاں اور بری کا وہ ریشمی جوڑا جو کہیں آتے جاتے پہننے کے لئے اس نے بڑی کوشش سے اب تک بچا کر رکھ چھوڑا تھا، فروخت کرکے دال روٹی کا خرچ چلایا تھا۔ جو اس تنخواہ کے انتظار میں بنئے سے روزانہ اپنے لڑکے کے ہاتھ آٹا تیل منگا کر جوں توں کا پیٹ بھر رہی تھی۔ اور اب اس بنئے کا لمبا چوڑا حساب مالک مکان کا تین مہینے کا کرایہ اور پھر اس کا یہ پیوندوں سے بھرپور کرتہ، جو اب ہاتھ لگاتے ہی مسک مسک جاتا تھا۔ اور یہ آٹھ روپے! اسی سوچ میں وہ کتنی دیر تک یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا رات کی سیاہی میں مدغم ہو گیا۔ پنچھی پکھیرو اپنے اپنے گھونسلوں میں بسیرا لے رہے تھے۔ مگر اسے آج گھر جانے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا تھا۔ جیسے گھر سے کوئی بہت بڑا جرم کرکے بھاگا ہو اُس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ اور پھر اچانک اُسے ایک واقف کار مل گیا۔ "کہاں پھر رہے ہو؟ بھائی نے کیا چھٹی دے دی؟ چلو کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ ساری پارسائی محض دکھاوے کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دوست اس دُنیا میں یہ چیز نہ ہو تو ان بڑے بڑے دُکھوں کا بوجھ کیسے سہا جائے"۔ اور اُس نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو اسکی نگاہیں تاڑی خانہ کے دروازوں پر جم کر رہ گئیں۔ یک لخت وہ تڑپ کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے کوئی بے خیالی میں کسی بے من کے کنوئیں کے دہانہ پر اچانک خطرہ سے آگاہ ہو جائے ——— لیکن خدا جانے کس طرح اس کا دوست اُسے تاڑی خانہ میں لے ہی گیا ——— اور جب وہ رات کے ایک بجے گرتا پڑتا گھر پہنچا تو اس کی جیب میں تین روپے کچھ آنے باقی تھے لیکن تمام رات اُسے پریشان کُن خیالات سے نجات ملی رہی۔ جیسے آج دماغ نے کام کرنے سے چھٹی لے لی تھی ——— وہ رات بھر خوب گہری نیند سویا کیا ——— اور پھر ہر مہینے آدھی سے زیادہ تنخواہ اور گھر کے دو چار بچے کھچے برتن تاڑی خانہ کی نذر کرنا اس کا معمول ہو چکا تھا۔ بیوی سلائی پسائی کا کام کرتے کرتے سُوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ بچوں کے کمزور جسم اور بھی نحیف ہو گئے۔ اس کا اپنا رنگ دِق کے مریض کی طرح زرد ہو گیا۔ کھانسی نے گھر سے دوستانہ گانٹھ لیا۔ مرجھائے ہوئے گال اور بھی پچک گئے۔ مگر اس کے دل کو سکون حاصل تھا۔ سارا دن وہ رات کی ان مدہوش ساعتوں کے تصور میں گذار دیتا۔ جب وہ چند گھونٹ پی کر دنیا اور دنیا کے فکروں سے بے نیاز ہو جائے۔

اور پھر اس کی بدقسمتی ایک دن اسے سرِ شام ہی تاڑی خانہ لے گئی۔ وہ بازار سے کوئی سودا لیکر اپنے گھر پہنچانے جا رہا تھا۔ مالک نے آٹھ بجے گاڑی مانگی تھی کسی افسر کے ہاں بہت شاندار ڈنر تھا۔ اُس نے سوچا رات کو جانے کے بجے چٹکارا ہو سر میں بلا کا درد ہو رہا ہے۔ کیوں نہ تھوڑی سی پی کر تازہ دم ہو لوں ——— اور اس نے تھوڑی سی کی بجائے ایک دم خوب جی بھر کر

یہاں سے نکلنے کے لئے بلند ابھی سے سات بجے تھے۔ جیسے اٹھ کر ہم پہنچ گیا۔ اتنی تھوڑی دیر میں اتنے میں ہی بھکاریوں کا ٹھاٹھ تھا۔ اتنا نہیں کہ ڈیوٹی بھول جاتا۔ وہ بھاگم بھاگ کوٹھی پر پہنچا۔ کار نکالی اور عین وقت پر مالک کو دعوت والے گھر لے گیا۔

اور پھر جانے کتنی دیر بعد کسی نے زور سے ٹھوکر ماری۔ اور ساتھ ہی ایک اور نے پوری قوت سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جلدی میں گاڑی میں بیٹھ کر سٹیرنگ زور سے گھمایا۔ آج تک اسے موٹر چلانے میں ایسا سرور ایسا لطف حاصل نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا موٹر آپ ہی آپ ہوا میں اڑتی جا رہی ہے جیسے آج سٹیرنگ بہت ہی ہلکا ہوگیا ہو۔ اسے چلانے میں ذرا بھی دقت نہیں ہو رہی تھی۔

"چھن نن" اور گاڑی قریب کے درخت سے ٹکراتی ٹکراتی بچ گئی۔ بائیں جانب کی لالٹین کا شیشہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ اس کا مالک آگ بگولا ہوگیا۔ اور اس کے بعد اسے بالکل یاد نہیں تھا کیا ہوا؟ کیسے گاڑی پہنچی؟ کس طرح وہ حوالات کی کوٹھری میں آگیا؟ اور کیسے اُس کے ہاتھوں میں لوہے کی موٹی موٹی ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں؟ اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کے مالک کے کہنے سے پولیس نے اس پر نشے میں مدہوش ہو کر شدید ایکسیڈنٹ کر دینے کے جرم میں مقدمہ چلایا ہے۔ کتنی پیشیاں ہوئیں۔ اور کتنے ہی اُلٹے سیدھے سوال و جواب! اور ان سب کا نتیجہ چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ!

خیر چھ ماہ تو جوں توں کر کے گذر ہی جائیں گے۔ مگر یہ پچاس روپے کا جرمانہ!

اور اُس کی آنکھیں دُور خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔ جہاں ایک فاقہ کی دیوی ہندوستانی شریف عورت جس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ جس کا آنچل بھی آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لپٹی ہوئی چادر میں اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی چار کمزور اور برہنہ بچوں کو ساتھ لئے رات کو سڑک کے کنارے پر پڑی ٹھٹھر رہی تھی۔

حجابِ نفس

از محترمہ آمنہ برجیس

تصورات کے موتی لٹا رہی ہوں میں
تمہاری یاد میں آنسو بہا رہی ہوں میں

تعینات کے پردے اُٹھا رہی ہوں میں
خیال و فکر کی جنت بسا رہی ہوں میں

شبِ فراق میں یوں اُن کی یاد آتی ہے
کہ جیسے اُن کو بھی خود یاد آ رہی ہوں میں

کمالِ جذبِ محبت کا معجزہ ہے یہ
انہیں خود اپنی جگہ آج پا رہی ہوں میں

کسی کی برقِ تبسم کو یاد کرتی ہوں
خود اپنے دل کا نشیمن جلا رہی ہوں میں

یہ انقلابِ محبت میں کیا ہوا برجیس
کہ دل سے نقشِ تمنا مٹا رہی ہوں میں

دیووں کے مُلک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

نویں قسط

ایک دن صبح کو ایک نئی مُصیبت کا سامنا ہوا۔ زمیندار کی لڑکی نے گلیور کا بکس کھڑکی کی دہلیز پر ہَوا دینے کی غرض سے رکھ دیا تھا۔ اکثر وہ ایسا کیا کرتی تھی۔ اِس لئے کہ گلیور پرندوں کے پنجروں کی طرح کھونٹی وغیرہ پر ٹنگنے سے ڈرتا تھا۔ اب اتفاق یہ ہوتا ہے کہ گلیور نے ایک کھڑکی کھول رکھی تھی۔ اور اپنی میز پر بیٹھکر چاہتا تھا کہ میٹھے کیک کھائے جو اُسے ناشتہ کیلئے دیئے گئے تھے۔ اتنے میں کئی بھڑیں یکایک کمرے میں گھس آئیں۔ کیک کی خوشبو انہیں وہاں لائی تھی۔ اُن کی بھنبھناہٹ اللہ کی پناہ! یہ معلوم ہوا کہ بیسیوں مشک کے باجے بج رہے ہیں۔ اُن میں سے دو چار تو میٹھے کیک پر آ قبضہ کیا اور اُس کا چورا چورا لے اُڑیں۔ باقی گلیور کے منہ پر بھنبھنانے لگیں۔ اور ایسا شور مچایا کہ غریب کے کان بہرے کر دیئے۔ ان کے لمبے لمبے ڈنک دیکھکر بیچارہ خوف کے مارے ڈر گیا۔

تھوڑی دیر تو بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔ ڈرا کہ ہلوں تو کہیں ڈنک ماردیں لیکن کب تک؟ آخر ہمت کی۔ مرد بن کر اپنی تلوار سونت لی اور اُڑتی ہوئی بھڑوں پر حملہ کر دیا۔ سنبھلے ہوئے ہاتھ تھے۔ وو وار میں چار کو مار گرایا۔ باقی اُڑ کر چل دیں۔

بھڑیں کمرے سے نکل گئیں تو گلیور اس قابل ہوا کہ کھڑکی بند کر سکے اور اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے مری ہوئی بھڑوں کو دیکھا۔ یہ بھڑیں قدوقامت میں بھٹ تیتر کے برابر تھیں۔ ان کے ڈنک جو نکالے تو بالکل سوئیوں کی طرح تیز تھے۔ اور لمبائی میں ڈیڑھ انچ سے کم نہیں۔ ان ڈنکوں کو اُس نے عجائب سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ واقعی اگر ان میں سے کوئی بھڑ اسے ڈنک ماردیتی تو اغلب گمان تھا کہ وہ زندہ نہ رہتا۔ فوراً مر جاتا۔

کچھ دن بعد ملکہ نے حکم دیا کہ گلیور کے لئے ایک سفری بکس بنایا جائے جو مقامی سے چھوٹا ہو۔ خیال یہ ہوا کہ موجودہ بکس ذرا بڑا ہے۔ کسان کی لڑکی اس کو آسانی سے گود میں لے کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اس کے علاوہ گاڑی میں بھی وہ زیادہ جگہ گھیر لیتا ہے۔ یہ سفری بکس بالکل چوکور تھا۔ تین طرف تین کھڑکیاں۔ چوتھے رُخ پر کھڑکی وغیرہ کچھ نہ تھی۔ لوہے کے دو قلابے لگے ہوئے تھے۔ ان قلابوں میں چمڑے کا ایک تسمہ ڈالا گیا تھا تاکہ جو شخص اسے لیکر گھوڑے پر بیٹھے تسمے کو پیٹی کی طرح اپنی کمر سے باندھ لے۔ چھت پر یا بکس کے اُوپر کی طرف بھی اسی طرح کا ایک قلابہ تھا کہ اگر کوئی ہاتھ لٹکا کر لے جانا چاہے تو آسانی سے لے جا سکے۔

دور دراز کے سفر میں جب گلیور پنجرے کے اندر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتا تو کوئی سوار بکس کے تسمے کمر سے باندھ لیتے آگے گھوڑے پر رکھ لیتا۔ اور اس طرح گلیور کھلی ہوا میں تین طرف کی کھڑکیوں سے بڑے مزے کے ساتھ جنگل کی سیر کرتا رہتا۔

اِس بکس میں گلیور کے لئے ایک چھوٹی سی مسہری تھی۔ ایک جھولا چھت سے لٹکا ہوا۔ دو کرسیاں اور ایک میز۔ میز اور دونوں کرسیاں فرش میں جڑی ہوئی تھیں۔ اِس لئے کہ گھوڑے کے جھٹکوں اور گاڑی کے ہچکولوں سے اِدھر اُدھر نہ لڑھکیں۔ اپنی جگہ جمی رہیں۔ گلیور نے بڑے سے بڑے طوفانی سفر کئے تھے۔ سمندر کی موجوں کی بہتیری کھکھیڑیں اُٹھائی تھیں۔ اِس لئے ان ہچکولوں اور جھٹکوں سے اِتنا نہیں گھبرایا۔ جتنا اِس جیسے آدمی کو گھبرانا چاہیئے تھا۔

قصّہ مختصر گلیور کو اِس شاہی شہر میں موج ہی موج تھی۔ بڑے آرام سے دن گذرتے تھے۔ اور اب وہ نفرت زدہ ہونا بھی عادت ہوگیا تھا۔ اس لئے چھوٹا بڑا کوئی ایسا نہ تھا جو اُس سے بُرے سلوک کرتا۔ اس کو ستاتا یا ڈراتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو سارے محل والے اُس کو اپنا کھلونا سمجھتے۔ ہر طرح سے اس کی دلداری کرتے اور اپنے ننھے مہمان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے۔ وہاں صرف ایک چیز تکلیف دہ تھی۔ لیکن اس تکلیف کا کسی کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ قدرت کے کھیل تھے۔ دیووں میں ایک بالشتیا۔ قدوقامت کے لحاظ سے بیسیوں واقعات روزانہ ایسے پیش آتے رہتے کہ اُس کا مذاق اُڑتا۔ لوگوں کا اپنے اوپر ہنسنا اور ٹھٹھے لگانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چڑ اُڑنا ہو ہو جاتا۔ علاوہ ازیں اکثر اِس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

زمیندار کی لڑکی کبھی کبھی گلیور کو اپنے ساتھ محل کے باغ میں لے جایا کرتی تھی۔ جہاں وہ اسے چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے، اُچھلنے کودنے اور اپنا دل بہلانے کے لئے چھوڑ دیتی۔

ایک روز گلیور کسی درخت کے نیچے ٹہل رہا تھا کہ بونا آگیا۔ اس وقت تک وہ ذات شریف محل سے نکالے نہیں گئے تھے۔ گلیور نے اُسے ستانا شروع کر دیا۔ یہ حرکت کوئی عقلمندی کی نہ تھی اور اُسے فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ میں نے حماقت کی ہے۔ دو منٹ کے بعد ہی اپنی بیوقوفی کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔

(باقی آئندہ)

فلمی خبریں

تصیح الدین احمد ایم، اے

(۱) پنچولی آرٹ پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **پونجی** جس کا بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ ۱۴ر جنوری کو [illegible] کے پیلس تھیٹر میں ریلیز ہوگیا۔ اطلاع ملی ہے کہ پبلک نے بڑی فراخدلی سے خیر مقدم کیا۔ آج بھی ہال کے سامنے شائقین کا زبردست ہجوم رہتا ہے۔ بہتوں کو ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ مجمع پر قابو رکھنے کے لئے پولیس کا باقاعدہ انتظام ہے۔

"پونجی" کے گانے اور مذاحیہ خاص طور پر مقبول ہوئے ہیں۔ بمبئی، کراچی، کلکتہ اور پیشاور کی طرح ان دنوں لاہور میں "پونجی" کے چرچے ہیں اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے ابھی یہ مدت تک پبلک کے لئے باعث کشش رہے گا۔

اداکاروں میں راگنی، پنت، باسمے، اختر اور منورما کی اداکاری بہت پسند کی جا رہی ہے۔

(۲) رنجیت موویٹون کا تیار کیا ہوا فلم "تان سین" ملک کے گوشے گوشے سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے، اس فلم نے ہر شہر میں دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ "تان سین" کا پارٹ ادا کرنے کے لئے سہگل کا انتخاب یا سہگل کیلئے "تان سین" کے پارٹ کو ہر طرف جی کھول کر سراہا گیا ہے۔ "تان سین" کے بعد اس کمپنی کا دوسرا تیار کیا ہوا فلم شنکر پاربتی آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ دیش کنیا بھی تیار ہے۔ جو اپنی نوعیت کا ایک دلچسپ اور اصلاحی فلم ہے۔ اس فلم میں ساد معنا بوس اور پرتھوی راج نے کام کیا ہے کمپنی کے آئندہ پروگرام میں شہنشاہ بابر، گینش جنم، "ممتاز" اور "سیتا ہرن" شامل ہیں۔ اس کمپنی کا تیار کیا ہوا فلم "بنسری" ۱۱ر فروری سے رٹز سینما میں نہایت کامیابی کیساتھ چل رہا ہے۔

(۳) راج لکشمی پروڈکشن ان دنوں بڑی سرگرمی اور اہتمام کے ساتھ ایک فلم **کالی داس** تیار کرنے میں مصروف رہی۔ اس فلم میں مشہور اداکار پہاڑی سانیال اور سینہہ پربھا پردھان نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ کہانی اور پھر اس کے ساتھ اداکاروں کے نام دیکھکر اندازہ کیا جاتا ہے یہ فلم بہت مقبولیت حاصل کرے گا۔

(۴) راج کمل کلا مندر کا تیار کیا ہوا عظیم الشان فلم شکنتلا میٹرو سینما دہلی میں بڑی دھوم دھام سے چل رہا ہے۔ ہندوستان کے مشہور معروف ڈائریکٹر وی شانتارام نے اس فلم پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ جے شری نے شکنتلا کا پارٹ ادا کرکے فلم کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ فلم [illegible] میں چند ہفتے پورے کر چکا ہے مگر آج بھی ہال شائقین سے کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ اسکی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ ابھی مدتوں اور چلے گا۔

(۵) رامنک پروڈکشن ان دنوں ایک فلم کرن تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اطلاع ملی ہے کہ یہ فلم اب قریب قریب تیار ہے اور بہت جلد ہندوستان کے مشہور شہروں میں ریلیز ہو جائیگا۔ اس فلم کی روح رواں مشہور مقبول اشوک کمار اور لیلا چٹنس ہیں اداکاروں کے نام دیکھنے کے بعد اس فلم کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

رامنک پروڈکشن "کرن" کے بعد دوسرا فلم "تارامتی" تیار کرنے والی ہے۔ جس کی بنیاد ایک قدیم کہانی پر ہے۔

(۶) نیو ہنس پکچرز لمیٹڈ ان دنوں بڑے اہتمام کے ساتھ ایک فلم دروپدی کی تیاری میں مصروف رہا۔ اس فلم میں مشہور سوشیلا رانی کی اداکاری ارباب ذوق کے لئے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ کامیابی کے ساتھ دروپدی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے یقیناً ایک نہایت حسین اور پُر وقار شخصیت کی ضرورت ہے اس بارے میں دروپدی کے مکالمہ نگار مسٹر کیشب کا یہ بیان کافی اطمینان بخش ہے کہ اس فلم میں سوشیلا رانی کی ہر ادا سے ایک ملکہ کا جاہ و حشم ٹپکتا ہے دوسرے نمایاں اداکاروں میں چندر موہن، مظہر خاں، بابوراؤ، پند ھارکر، ڈکشت اور پرو تما دیوی کے نام کچھ کم قابل توجہ نہیں۔

(۷) پیپلس پکچرس لمیٹڈ مسٹر ایل، پی، اچاریہ نے جو بمبئی کے تجارتی حلقوں میں کافی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، حال ہی میں ایک فلمی کمپنی "پیپلس پکچرز لمیٹڈ" کے نام سے قائم کی ہے۔ مسٹر اچاریہ اس سے قبل پرجا پکچرز کے سرپرستوں میں رہ چکے ہیں۔ تھوڑے دنوں قبل وہ پرجا پکچرز کے مینجنگ ایجنٹ بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی موجودہ کمپنی پیپلس پکچرز لمیٹڈ عوام کی دلچسپی اور مفاد کو مد نظر رکھکر

فلم بنانے کی جو یقیناً ایک نیک مقصد ہے۔

اطلاع ملی ہے کہ انہوں نے اچھے اچھے اداکاروں کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔

(۸) پرکاش پکچرس

کچھ دنوں سے بہت شاندار انتظامات کے ساتھ ایک فلم بھگوان بدھ بنانے کی تجویز پر غور کر رہی تھی۔ اطلاع ملی ہے کہ اس سلسلہ میں پرکاش پکچرز کے نمائندوں کو لنکا کی بدھ خواتین کی کانفرنس کی طرف سے لنکا آنے کی دعوت ملی ہے۔ اس دعوت پر کمپنی کے نمائندے لنکا جائیں گے جو بدھ مت کا ایک بڑا مرکز ہے اور جہاں مہاتما بدھ کی زندگی اور تعلیمات کے متعلق بہت مواد مل سکیگا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ دورہ فلم کی تکمیل میں بہت مددگار ہوگا۔ اس فلم کے ساتھ یقیناً عظیم الشان توقعات وابستہ ہیں۔

حال میں ہی منروا مُووی ٹون بمبئی کے تیار کردہ فلم "رام راج" کا جو بڑا مشانی ہو چکی ہے۔

(۹) تلوار پروڈکشن

نے حال ہی میں ایک فلم شکریہ کی تکمیل کر لی ہے۔ جو بہت جلد مختلف شہروں میں ریلیز ہو جائے گا۔ امید ہے پبلک اس فلم کا پوری گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کریگی۔ منچلی کے بعد زموا کی اداکاری پیش کرنیوالے دوسرے فلم کا شاندار تعین بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ اس فلم میں ششندر، رگیانی، اروپ لیکھا اور آمر کی اداکاری بھی قابل توجہ ہے۔ کہانی ایک معاشرتی طنز ہے جس کا ساتھ دینے کے لئے گانوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کمپنی کا تیار کیا ہوا فلم "خاموشی" کمال ٹاکیز دہلی میں چل رہا ہے۔

(۱۰) جینت دیسائی پروڈکشن

کا تیار کیا ہوا فلم بھکت راج ملک کے گوشے گوشے سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ یہ فلم اپنی خوبیوں اور مقبولیت کی بنا پر ایک نہایت کامیاب فلم ثابت ہوا ہے۔ اس فلم کے بعد اس کمپنی کے زیر اہتمام دوسرا فلم "زبان" تیار ہو رہا تھا۔ اطلاع ملی ہے کہ اب یہ فلم تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اس فلم کی روح رواں کوشلیا، مبارک اور اقبال ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے یہ فلم بھی اپنی خصوصیتوں کی بنا پر ایک کامیاب فلم ثابت ہوگا۔

(۱۱) انٹرنیشنل تھیٹرز

کے زیر اہتمام پروڈیوسر بی، راجیندر اور ڈائرکٹر جی آر۔ درانی ایک فلم "جدائی" تیار کر رہے ہیں۔ اس فلم کا نصف حصہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اداکاروں میں عاشق، مس محبوب اور دوسرے اداکاران کے نام نظر آتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فلم تقریباً دو ماہ میں تیار ہو جائے گا۔

(۱۲) سلور فلمز

کے زیر اہتمام ایک شاندار معاشرتی فلم "بڑے نواب صاحب" تیار ہو رہا ہے۔ اس فلم میں نوابانِ لکھنؤ کی زندگی اور اودھ کی مخصوص روایات کی عکاسی ہوگی۔ کہانی منشی شمس کے قلم کا نتیجہ ہے۔ فلم لکھنؤ کی مخصوص تہذیب، زبان اور کلچر کا آئینہ ہوگا۔ اس فلم کے سلسلہ میں مشہور و معروف اداکاروں کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں جن میں چندر موہن۔ پہاڑی سانیال کمار۔ پرآلا۔ بتو۔ سشیل کمار۔ غوری۔ لیلا۔ مصرا۔ کملا اور شانتا پٹیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جس فلم میں ایسے ایسے اداکار یکجا ہو جائیں اس کی کامیابی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اطلاع ملی ہے کہ آئندہ ماہ اس کمپنی کے افراد لکھنؤ کا دورہ کرینگے تاکہ وہاں کی زندگی اصلیت اور صداقت کے ساتھ پیش کر سکیں۔ خاص اہتمام کے ساتھ یہ فلم تیار ہو رہا ہے یقیناً اس فلم سے شاندار توقعات وابستہ ہیں۔

(۱۳) چترا روپ لمیٹڈ

ان دنوں ایک عظیم الشان فلم "صلح" کی تیاری میں مصروف رہی۔ توقع کی جاتی ہے یہ فلم اپنی نوعیت کا ایک نہایت کامیاب فلم ثابت ہوگا۔ ہندوستان کے مشہور اور مانے ہوئے ڈائرکٹر مسٹر دیوکی بوس نہ صرف اس فلم کے پروڈیوسر ہیں بلکہ کہانی بھی انہی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مشہور کیرکٹر ایکٹر برمن بنرجی، دیوبالا اور کملا دیوی اس فلم کی روح رواں ہیں۔ فلم اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے علاوہ اپنے سامنے اتحاد کا عظیم الشان مقصد بھی رکھتا ہے۔ رائے صاحب چندلال کو یقیناً مبارکباد دینی چاہیئے کہ انہوں نے ایسا فلم چن کر لیا۔

(۱۴) شالامار پکچرز

ان دنوں بڑے اہتمام کے ساتھ ایک فلم "من کی جیت" کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جو اب تقریباً تیار ہے۔ اس فلم کی روح رواں پراسرار "نینا" ہیں۔ جو اس سے قبل "ایک رات" اور "پریم سنگیت" میں اداکاری کے جوہر دکھا کر اپنی مقبولیت کا سکہ جما چکی ہیں۔ اس فلم سے بلاشبہ عظیم الشان توقعات وابستہ ہیں۔ اسکے بعد یہ کمپنی ایک دوسرا فلم "کرشن بھگوان" پیش کریگی۔ ایک ایسی فلم کمپنی کیلئے جسکے ارباب حل و عقد مسلمان ہوں "کرشن بھگوان" جیسے فلم تیار کرنا ہندو مسلم اتحاد کی طرف ایک شاندار اقدام ہے۔ امید ہے اس فلم کے ذریعہ مسلم پبلک کو بھی کرشن جی کی زندگی کو سمجھنے کا اچھا موقعہ ملیگا۔ اس فلم کے سلسلہ میں جو اہتمام کئے جا رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا ایک عظیم الشان فلم ہوگا۔

نیشنل وار فرنٹ

یعنے

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض ومقاصد تمام عوام الناس کی فلاح وبہبود کیلئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں: —

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کے لئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بدامنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاشوں اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور اُن کا انسداد کرنے کے لئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا۔ اور اُن کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمن کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور اُن کی نگرانی کرنا تا کہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چیزوں کو اُن کی مقررہ قیمت پر فروخت کرنیکا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

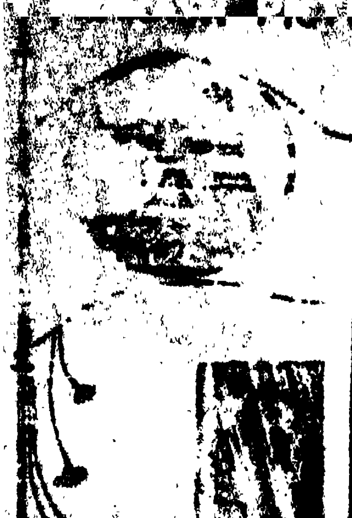
(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملے سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنے کی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا۔ اور اس کے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض ومقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور تعاون کر کے عوام الناس کی فلاح وبہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ راجپور روڈ دہلی



25
Th.
سلور جوبلی ہفتہ

RAM
RAJ

رام راج

مالکان پرکاش
پکچرز آن لاکھوں
قدردانوں اور عقیدتمندوں
اور شائقین کے شکر گذار ہیں، جنھوں نے لاثانی فلم رام راج
کی قدر افزائی کر کے اسے لازوال شہرت بخشی۔

اداکار

پریم ادیب۔ شوبھنا سمرتھ۔ اُما کانت

منروا دہلی میں ۲۵ واں سلور جوبلی ہفتہ

رٹز لاہور — پچیسواں ہفتہ — چترا امرتسر
سنٹرل کیپٹل کانپور — چھٹا ہفتہ — نشاط جالندھر

من کی جیت

جس میں
پُراسرار نینا نے اداکاری کا کمال دکھایا ہے
جس کے
مکالموں اور گانوں کیلئے ہندستان کے بہترین ادیب
اور شاعروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں
تقریباً تیار ہے

شالامار پکچرز کا دوسرا کارنامہ

سری کرشن بھگوان

ہندستان کی تاریخ کا ایک سنہرا باب
اداکاری کا شاہکار

بمبئی ٹاکیز کی بے نظیر پیش کش

ہماری بات

اداکاران :۔

دیوکا رانی۔ شاہ نواز۔ ممتاز علی۔ ڈیوڈ۔ پربھا

ثریا۔ راجکماری شکلا اور اودے کمار وغیرہ

فلم

رقص و نغمہ کا سحر آفریں مرقع ہے

پروڈیوسر : ـــــ امیہ چکرورتی

ڈائریکٹر : ـــــ ایم آئی دھرم سے

میوزک : ـــــ انیل بسواس

گیت مصنف : ـــــ نریندر شرما

ناولٹی دہلی میں تیسرا پُر ہجوم ہفتہ

جاری کردہ : جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز دہلی، لاہور، کراچی

مہاتما وِدُر

آرٹ

فن کاریوں

اور

دلاویزیوں

کا

مرقع



عظیم الشان اعلان

بھگتی بھاؤ کا سمندر

مہا بھارت کے سنہری اور جنگی زمانے کے ایک بہت بڑے مہاتما

کی داستان تپیا اور بھگتی کی گونج ۔ سنہری زمانے کے سنہری

آرٹ اور فن کا سنہرا نمونہ

جس میں

وشنو پنت پاگنیس ۔ درگا کھوٹے ۔ یشودھرا کاٹجو ۔

ڈیوڈ ۔ نیام پلی وغیرہ

نے لاجواب کام کیا ہے

جاری کردہ :۔ دیسائی اینڈ کمپنی ۔ لاہور، دہلی، کراچی

گیتانجلی موویٹون کا دلفریب شاہکار

سوال

ڈائریکٹر :- نرنجن

میوزک :- پنّالال گھوش

گانے :- ولی

موسیقی اور اداکاری کا بہترین مرقّع

جس میں

مشہور و مقبول **ممتاز شانتی** نے کام کیا ہے

دوسرے اداکار

الہاس —— رادھارانی —— آغا

عنقریب آپ کے پسندیدہ سینما ہال میں آرہا ہے

جاری کردہ :- ستارہ فلم ڈسٹری بیوٹرز۔ دھلی ، لاہور

خاموشی

جس میں سحر طراز رمولا نے اداکاری کی ہے

دوسرے اداکار: شیلا - راج دلاری - گیانی

مصنف: امتیاز علی تاج

جمعہ ۴ فروری سے کمار ٹاکیز دہلی میں بڑی آب و تاب سے چل رہا ہے

ہندوستان کے دیگر مشہور شہروں میں بے پناہ ہجوم لے رہا ہے

رامنک پروڈکشن کی مایۂ ناز پیش کش

ن

جس کی روح رواں لیلا چٹنس اور اشوک کمار ہیں

ڈائرکٹر: جی، جالسر

نور جہاں پکچرز کی انمول پیش کش

موسیقی کا شاہکار

دوست

ڈائرکٹر: شوکت حسین

کیپری پروڈکشنز

شہزادو

جاری کردہ: رتن پکچرز - چاندنی چوک

[illegible] نہیں رہتی پھر آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اس پیغام کی شگفتگی کو ان کی [illegible] سے کس طرح [illegible] کر دیا ہے۔ کہیں [illegible] سے [illegible] شروع [illegible] اور جو تغزل کی روح ہے کی جگہ جذبۂ مسرت پیدا نہ ہو یعنی ہر شعر میں ایک نصیحت ضرور ہے مگر نصیحت کی سی خشکی نہیں۔ بلکہ شاعرانہ اسلوبِ بیان کی [illegible] [illegible] ساعت بنا دیتی ہیں [illegible] کو یہ نصیحتیں، یہ پیغام اور یہ پیغامات ناگوار نہیں گزرتے۔ جو اشعار میں ابھی عرض کر چکا ہوں ان میں زندگی کی ضرورت، علم و آگہی کی تجدید، لوگوں کی مخالفت سے بچنے کی تدبیر، حیات بعد الموت کی ابدیت کا پیغام، موجودہ دور کشمکش میں کمال زندگی پیدا کرنے کی تعلیم اور موت سے ڈرنے والوں کے لئے موت کی تفسیر ایسی قوتِ شاعرانہ کے ساتھ کی گئی ہے کہ ہر سننے والا اس پر غور کرنے کے بعد اس کے قبول کرنے کے لئے مجبور نظر آتا ہے اور ہر شخص کو یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ان اشعار میں کہا گیا ہے وہ واقعی حقیقت ہے اور اس پر عمل کرنا ہی سبب نجات ہو سکتا ہے۔ اس خصوصیت نے اردو شاعری کی افادیت بھی ہماری نگاہوں میں مسلّم کر دی ہے۔ ورنہ [illegible] اردو شاعری کا کوئی مفید پہلو قابلِ تسلیم نہ تھا۔ مولانا کے یہاں تفکر و تدبر کی بھی کمی نہیں۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے :-

جو انساں کو جب حوصلہ تدبیرِ عالم کا   مری دانست میں تقدیرِ عالم بن چکی ہوگی

یہ شعر ایک ایسی اولیت کی طرف اشارہ ہے جس کا خیال بھی ہمارے شعرا کو کبھی نہیں آیا۔ تقدیر و تدبیر پر ہزاروں اشعار کہے اور سنے جا چکے ہیں لیکن سیماب نے اس شعر میں ایک بالکل نئی بات اپنے تفکر اور تدبر سے پیدا کی ہے جو شعر سننے کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے۔ یعنی انسان کی کوئی تدبیر اس دنیا میں صرف اس لئے کامیاب نہیں ہوتی کہ اس دنیا کی تقدیر پہلے سے متعین ہو چکی ہے۔ اور سنئے ! فرماتے ہیں :

[illegible] کب تک [illegible] مرجعِ ہستی   یہاں کب تک یوں ہی توہینِ خاکِ آدمی ہوگی

[illegible] کو اس کا احساس ہے کہ آدمی جو امانتِ الٰہی کا حامل ہے جسے اشرف المخلوقات کا خطاب دیا گیا ہے اس کی خاک کا اس دنیا کی خاک میں ملنا اور برابر ملتے رہنا شرفِ آدمیت کی توہین ہے۔ اس اشرف المخلوقات کی خاک تو آسمانوں میں محفوظ ہونی چاہئے تھی۔ مرنے کے بعد روح کی طرح اس کی خاک کا مرجع بھی عالمِ بالا کو بننا چاہئے تھا۔ انسان کی خاک ! اور زمین کی خاک میں ملے ! یہ بات سیماب کے احساسِ بلند پر بار ہے۔ کیا اب تک کسی دوسرے شاعر کو بھی خاکِ انسان کی اس توہین کا احساس ہوا ہے ؟

مرحبا اے شاعرِ مشرق ! مرحبا اے مجددِ شاعری ! مرحبا اے مجتہدِ اسلوب !

خدا تیری عمر میں برکت و صحت عطا فرمائے تو نے بالکل سچ کہا ہے :-

جو [illegible] سیماب سوختہ بن کے چمکتا [illegible] میں
نہ [illegible] سے مرے [illegible] اس دنیا میں کمی ہوگی

[illegible] آپ کو شک ہو کہ مولانا سیماب اکبرآبادی نے یہ غزل [illegible] کے ساتھ ایسے رنگ اور ایسے اسلوب میں کہی ہو جس میں تغزل، تخیل، تفکر، تدبر [illegible] بیک وقت موجود ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ یہ شک شبہ کی حد سے کبھی یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتا اور قطعاً غلط ہے۔ مولانا کی کوئی غزل آپ کو ایسی نہ ملے گی جس میں یہ بلند افکار موجود نہ ہوں۔ میں اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مولانا کے چند اشعار مختلف غزلوں سے اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔

(تغزل)

اب نہ دل وہ ہے نہ ہم ہیں نہ وہ شوخی دل سے ہم
پہ کہاں کا روگ لے آئے تری محفل سے ہم
دیکھئے اس خانہ ویرانی کا کیا انجام ہو
اپنے دیوانے کے نکلے ہیں کسی کے دل سے ہم

بے ہوشِ غم بھی تو ہے درمانِ غم مگر   کرم ہو حال پر میرے تو مجھے پوچھ کر کیوں ہو

جی چاہتا ہے عمرِ محبت نہ ختم ہو   مر جائیے کسی کی تمنا لئے ہوئے

دل کے معاملات بھی طرفہ معاملات ہیں   جس کو نہیں ہے مجھ سے کام مجھ کو اسی سے کام ہو

زندگی موت بنتی جاتی ہے   حد بھی ہے صبر آزمائی کی
جیسے دنیا میں کوئی تنہا ہی نہیں   ہائے باتیں تری جدائی کی

کوئی یہ شکوۂ سرایانِ جور سے پوچھے   وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے ؟

غرض کہ اسی طرح ان کی تمام غزلوں میں بلند تغزل موجود ہے۔ جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اب تخیل و فکر کی مثالیں دیکھئے۔

تخیل و فکر

محبت عقل کے بس کی نہیں دل جنوں پر چل   کہ رہبر سے زیادہ آگہی ہوتی ہے رہزن کو

[illegible] ہے عرفانِ روزگار ہنوز   [illegible] وقف نہیں بہارِ ہنوز

کہیں، آدمی کہیں نہ رہا   کوئی زردی ہے کوئی شاہی ہے
بزمِ عالم کا مجھ سے حال نہ پوچھ   انتہا کی یہ انتہائی ہے

غرورِ گریۂ سجود و قعود پر کہ وہاں   قبولِ دیدۂ تر کے سوا کچھ اور نہیں

غرضکہ اسی طرح ان کی تمام غزلوں میں بلند تخیل و تفکر کے بلند اشعار موجود ہیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح درس و پیام بھی سیماب کی غزلوں میں رچا ہوا ہے۔

درس و پیام

بجائے ہاتھ بڑھانے کے اپنے پاؤں بڑھا   دعا تو وہم اثر کے سوا کچھ اور نہیں

اے مسافر ہے وہی منزلِ مقصود تری   ختم جس گام پہ دلچسپیٔ دنیا ہو جائے

ہو انقلاب ممکن جب مرگِ بے حسی میں   وہ زندگی کا دن ہے توموں کی زندگی میں

غلامی کی فضاؤں میں نیا پھونکا نفس میں نے   کیا اعلانِ آزادی بہ اندازِ جنوں میں نے
تکلف و تبصرۂ سنجر نے لاکھوں بار دعوت دی   کیا کب سامنے باطل کے اپنا سر نگوں میں نے

ہم اے دنیا تری شاہنشہی و قیصری سمجھے   یہ ثبوت اسکو دیئے جو زندگی کو زندگی سمجھے

نوا و ساز کو رخصت کرو کہ اب دنیا   صدائے صورِ قیامت کے انتظار میں ہے

ماہ و نجوم لالہ و گل، آب و خاک و باد   لے سب کو ساتھ اور نیا کارواں بنا

مولانا سیماب کے افکار میں فلسفے کی بھی کمی نہیں۔ فلسفے کے پیچیدہ اور مشکل مضامین کو جس آسانی اور سلجھاؤ کے ساتھ سمجھایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے :-

---

فلسفہ

مصلحت یہ ہے خودی کی غفلتیں طاری رہیں   جب خودی مٹ جائیگی بندہ خدا ہو جائیگا

پیشِ نگاہ ہے [illegible]   [illegible]
اک زندگی [illegible] سمجھا ہوں [illegible]   [illegible]

عارضی وقفۂ سکوں ہے موت   زندگی اک [illegible]

یہ کائنات کہ جس میں ترا جمال بھی ہے   ہمارے حسنِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

گذر جانے دو سیلابِ حوادث کو بہ آزادی   کشادہ راستوں میں زور گھٹ جاتا ہے طوفاں کا

مبارک تجھکو اپنی خودسری لیکن یہ سمجھا جا   کہ دنیا اپنے رستے پر لگا لیتی ہے انساں کو

وہ اپنی زندگی میں بندگی کیوں لازمی سمجھے   جو اپنی زندگی کو اک تسلسل زندگی سمجھے

تکمیل ہو رہی ہے مری روح ہر نفس   تعمیرِ کائنات میں کام آ رہا ہوں میں

سیماب کی شاعرانہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسکی شاعری میں ہر دور کے واقعات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ سیاسی واقعات کو بھی اپنی شاعری میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ سیاست بھی ادب معلوم ہونے لگتی ہے دنیا کے موجودہ واقعات پر آپ کے اشعار ایک تبصرہ اور مستقبلِ عالم پر ایک نگاہ پیشگی ہیں۔ چند شعر سنئے :-

سیاست

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ   شاخوں پہ انگلیوں کے [illegible] ہوں میں

ہو جلوہ گر کسی پردے میں شورشِ عالم   جنونِ تاج و کمر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ انتہائے گردشِ دوراں ہے آج کل   انساں کا خون خاک سے ارزاں ہے آج کل

مرے پاؤں زنجیر میں ہیں تو کیا ہے   مرا ہاتھ ہے انقلابِ چمن میں

مورخینِ چمن کو یہ راز ہے معلوم   ہمارا خون بھی رنگینیٔ بہار میں ہے

[illegible] کہ نام [illegible]

[illegible] مولانا کی صرف آخری غزلوں کے [illegible] غزلوں میں بھی یہ موضوعات و خصوصیات بے حد اور [illegible] مولانا سیماب اکبرآبادی کی ایک اجتہادی خصوصیت اور ہے جس میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ وہ یہ کہ ان کے معاصرین نے تو صرف شخصی آزادی یا طبعی آزادی کی ہے مگر سیماب محبت میں بھی "آزادی" کا حامی ہے۔ وہ حُسن کی طرح عشق کو بھی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ نازِ حسن کی طرح "نازِ عشق" کا بھی قائل ہے۔ نیازِ عشق اُسے ناگوار ہے۔ وہ عشق کا سجدہ حُسن کے پاؤں پر نہیں حُسن کی جبینِ رنگیں، اور دوشِ حسین پر دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس غرور شخصیت کے ساتھ نہیں کہ؎

رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں

بلکہ اس سلیقے اور دلیل کے ساتھ کر:۔

نازِ عشق

محبت میں نیاز و ناز کے رتبے برابر ہیں — تو دوشِ حُسن پر سر کیوں نہ ہو اور پاؤں پر کیوں ہو

اور فرماتے ہیں؎

پھر دے رہا ہوں فطرتِ انساں کو درسِ ناز — سر آستانِ حُسن سے اُٹھوا رہا ہوں میں

ناز اُدھر نیاز اِدھر کتنا غلط نظام ہے — حُسن نہیں غنیم ہے، عشق نہیں غلام ہے

عشق پابندِ حُسن ہے سیماب — یہ محبت نہیں غلامی ہے

ذرا اس شعر میں خودداری کی انگڑائی دیکھئے

سر اُٹھا کے بھی ہم کو سجدہ کرنا آتا ہے — آپ اپنے گھر رکھیں سنگِ آستاں اپنا

عشق کا سر نہیں جھکتا ہے فلک جھکتا ہے — یہ وہ سجدے ہیں جو عرشِ زمیں ہوتے ہیں

اور پھر نازِ عشق کی تعلیم دُنیا کو دے کر فرماتے ہیں؎

خدا وہ دن کرے پرستش ہو دلِ بس نازمندی کی

وہ پوچھیں کس نے یہ تعلیم دی تھی ؟ میں کہوں میں نے

کیا یہ تعلیم خودداری آج تک کسی اور شاعر نے بھی دی ہے ؟

مولانا سیماب اکبرآبادی کی شاعرانہ خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ تصوف میں ان کے شاعرانہ کمالات کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ اُردو شاعری میں تصوف کی اگر کمی نہیں تو کچھ ایسی فراوانی بھی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر اُس شعر کو جس میں جلوہ یا سجدہ آجائے اسکو تصوف کا شعر مان لیا جائے۔ تصوف کا مقام بہت بلند ہے جہاں ہر شاعر کی رسائی ناممکن ہے۔ سیماب کی ہر غزل میں تصوف پر کچھ اشعار ضرور ہیں۔ اور بعض باتیں تو مولانا نے ایسی کہدی ہیں جو بڑے سے بڑے صوفی کی زبان سے بھی نہیں نکل سکتیں۔ میں نے اکثر صوفیوں کو ان کے اشعار پر جھومتے دیکھا ہے اور متحیر بھی۔ مولانا کے اشعار اکثر مجذوبوں کی زبان پر بھی رہے ہیں۔ چنانچہ جب مولانا نے یہ شعر کہا کہ؎

صورتِ منصور جو بولا وہ مارا جائیگا

پیر سندھی ہو کوئی یا ہو فقیر سرحدی

تو معلوم ہوا کہ یہ شعر ملتان کے ایک مجذوب بزرگ بہت دن تک بازاروں اور گذرگاہوں میں بہ آوازِ بلند پڑھتے رہے۔

دراصل یہ فیض ہے وارثیت کا۔ مولانا سیماب وارثی بھی تو ہیں۔ فصیح الملک مرحوم کے فیضِ روحانی سے اقبال و سیماب ہندستان میں صرف دو شاعر ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے سکول کے خلاف نئے موضوعاتِ شاعری کی نئی داغ بیل ڈالی۔ اور جنہوں نے زمانے کا رنگ دیکھکر اپنی فکر کو نیا رنگ دیا۔ سیماب نے فصیح الملک کے روحانی تصرف سے لسانی اور فنی کمالات کی معراج حاصل کی۔ اور اپنے پیر و مرشد کی توجہ سے روحانیات کی معراج حاصل کی۔ جبھی تو وہ فرماتے ہیں کہ؎

سیماب لفظ لفظ اُترتا ہے عرش سے

میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے

تصوف

کہیں وحشی نہ کر دے مجھکو یہ اُلجھاؤ عرفاں کا — خدا کو ڈھونڈتا ہوں کھوج مل جاتا ہے انساں کا

نہ گھبرا بھید اگر اسکا نمایاں ہو نہیں سکتا — ارے یہ بھی تو عرفاں ہے کہ عرفاں ہو نہیں سکتا

اُلٹ دے دلکو بھی جب دل کے سب پردے اُلٹ جائیں — اُسے بھی کر نمایاں جو نمایاں ہو نہیں سکتا

مٹا کے اپنی خودی ماسوا سے کر انکار — سکونِ روح بجز ذکرِ لا الٰہ نہیں

بٹھا کے دل کے روبرو، آگ لگا دے چارسُو — یکھ لے تجھے پہ رس ہو، کون مکان پہ چھا جا

شعور ہو شنا ہو تا کیا ہمہ دانی کی روشنی میں [illegible] کا مطلب ہے عرفان و آگہی میں
ابھی تو آدمی کا اک طلسم مجاز کا   دیوانے لگے جو سے ٹوٹ چکے ابھی ہیں

سر خوشی و قلندری، بے خبروں کا کام ہے   گرنہ ہو مستیِ بیخودی، ذوقِ خودی حرام ہے
وہ بیت حرم میں جا گزیں اسکے سوا کوئی نہیں   مجھکو ابھی خبر نہیں بُت بھی خدا کا نام ہے

میں کہاں تک اشعار نقل کروں۔ خیالات کا ایک سمندر نگاہ و ذہن کے سامنے موجزن ہے اور ابھی چند قطرے بھی نہیں اٹھا سکا ہوں۔ خیر اس موضوع پر ایک شعر اور سُن لیجئے۔ ذرا غور کے ساتھ۔ فرماتے ہیں ؎

تکبیرِ لا۔ کی اِلّا نے۔ تو رازِ حقیقت کیا جانے
توحید کا مذہب دیوانے، اِقرار بھی ہر انکار بھی ہے

ایک شعر اور یاد آگیا۔ وہ بھی سُن لیجئے:-

اب کھلا کہ میں اُن کی ذات کا خلاصہ ہوں
پوچھ کر پتہ میرا دے گئے نشاں اپنا

مولانا سیماب نے دوسرے شعرا کے خلاف ہستی المذہب ہونے کے باوجود مرثیئے اور سلام بھی بہت لکھے ہیں۔ سلاموں اور مرثیوں میں سیماب کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔ اب تک سلاموں اور مرثیوں میں جو رسمی بین دیکھا پایا جاتا تھا وہ سیماب کے سلاموں میں نہیں ہے۔ سیماب نے اس موضوع میں بھی اپنے اختیار و اجتہاد سے کام لیا ہے اس وقت تک "سرودِ غم" اور "نغیرِ غم" کے نام سے دو کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں دو ایک شعر سلام کے بھی سُن لیجئے:-

سلامی زخمِ نوکِ تیر کب شایانِ اصغر تھا
ابھی معصوم خود ہی تیرِ قاتل کے برابر تھا

فرمائیے دنیائے مراثی و سلام اس شعر کا جواب دے سکتی ہے؟

مرثیہ و سلام

وسیع الظرف تھا غم خانۂ ساقیِ شہادت کا   کوئی ہم میں کوئی کم میں مگر حصہ برابر تھا

بھلا لوہے کا تیر اور سامنا معصوم ملت سے   شکن ابرو پہ پڑ جاتی تو کٹ جاتا ندامت سے

خاک پر ہے لاش ابھی شبیر کی   حشر ہونے میں ابھی تاخیر ہے
نوک پر نیزے کی سر شبیر کا   آفتابِ حشر کی تصویر ہے

شعر و اکبر ہے [illegible]

کیا ہے بیخبر نظرِ فطرت کو تعینِ حسینی   [illegible]

زیرِ دامن دیکھوں کی ہے جانبازانِ ملت کو   [illegible]

نیازِ مشترک شبیر کا ہے پاسِ فطرت کو   بغیر سجدۂ مومن نہیں ہوتی محراب بھی

پاؤں میں سجاد کے زنجیر ڈھیلی ہو گئی   جب کہا اللہ اکبر حلقۂ زنداں و بجھکر

کٹنا تھا نہ سر کٹوانا تھا درسِ تسلیم سکھانا تھا
اُن کو تو صرف دکھانا تھا دیکھو یوں سجدہ کرتے ہیں

سرِ سبطِ نبی کا کٹ جائے زخمی بھی ذبیح اللہ نہ ہوں
اللہ کو راضی کر لینا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے

سر کہاں ہوگا اگر دوشِ نبی پر پاؤں تھے   عظمتِ کونین با سنگِ سرِ شبیر تھی

اور یہ بھی سلام ہی کا ایک شعر ہے ؎

بغیر سر فروشی، وہم ہے آزادیٔ ملت
مگر اس راز کو سمجھا نہیں ہندوستاں اب تک

موضوعِ شہادت پر کئی کتابیں اور بہت سی نظمیں سیماب کے افادات فکر سے موجود ہیں۔ میں نے سیماب کی جتنی شاعرانہ خصوصیتیں گنوا چکا ہوں۔ ان سے صد چند ابھی باقی ہیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا بیان طویل ہوتا چلا جا رہا ہے اب میں بطور اختصار چند باتیں اور کہکر خاموش ہو جاؤنگا۔

سیماب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی شاعر ہے وہ اپنے قول کے مطابق پہلے مسلمان اور پھر شاعر ہے" لیکن اس کا کوئی رسمی مذہب نہیں۔ اس کا کلام جس طرح ہمہ گیر ہے۔ اسی طرح اس کا پیام بھی عالمگیر ہے۔ جہاں اس نے پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، شہدا، خلفائے راشدین اور بزرگانِ اسلام پر نظمیں لکھکر اپنے اسلام دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں گوتم بدھ، سری کرشن اور گورو نانک وغیرہ بزرگانِ ہند پر بھی اس کی نظمیں موجود ہیں۔ ان کے لئے "کلیم نو" "سازِ آہنگ" اور کرشن گیتا ملاحظہ فرمائیے۔

سیماب کا پیغام تمام عالم کے لئے اور خصوصاً عالم انسانیت کے لئے عام ہے۔ وہ مذہب اور قومیت کی زنجیر اپنے پاؤں میں ڈال کر ہماری غلامانہ زندگی کے نغموں میں نالہ سرا نہیں ہے۔ بلکہ ہر قید و بند سے آزاد ہو کر وہ ہمیں ایسے نغمے سنا رہا ہے جو ہمارے لئے خواب آور نہیں بلکہ ہماری غفلت کی آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ جو ہمیں منزل بتاتے ہیں اور جو ہمیں آزادی اور نجات کی منزلوں سے قریب تر کر رہے ہیں۔

مولانا سیماب اپنے ایک مقطع میں فرماتے ہیں ؎

ہیں کہ پیغمبر تہذیب سخن ہوں سیماب
سلسلہ شعر مہذب کا مرے گھر سے چلا

بے شک وہ تہذیب سخن کے پیغمبر ہیں۔ لیکن دنیا انہیں خدائے سخن بھی تسلیم کر چکی ہے
ڈاکٹر اقبال کے متعلق مولانا گرامی جالندھری نے فرمایا تھا ؎

پیغمبرے کرد و پیمبر بتواں گفت

مگر علامہ سیماب کے متعلق کہا جا سکتا ہے ؎

پیغمبری کرد و خدا ہم بتواں گفت

ابھی حال میں ۲۲ر نومبر ۱۹۴۳ء کو جالندھر کی بزم ادب کی جانب سے جو سپاس نامہ علامہ سیماب کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اس کے چند اشعار پر میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

سپاس نامہ

تو اے سیماب، سودائی نہ میری — نہ عرفیت بگویم نے نظیری
سخن را در حقیقت دستگیری — : بغداد سخن پیران پیری

زشاہد ہیم اباکردن کمالت — گریز از ما سوا کردن کمالت
غزل را معجزہ کردن کمالت — تغزل با خدا کردن کمالت

دل از مرد مسلمانے ربایید — حریف گیسوئے حور ست شعرت
زسوز سینہ گوید آستانے — جواب نالۂ طور ست شعرت

ز دیوانت بلاغت را نظام است — کلام تو فصاحت التیام است
سخن داں در سخن گوئیست سیماب — چہ می گوید! سخن بر تو تمام است

ہم از اعجاز شعرت ست سیماب — کہ در تر دامنی آتش بگیرد
گر ایش زندہ سازد خواند، نہ میرد — بہ مردہ گر دمند احیا پذیرد

زہے بالائی بانگ ربابت — خہے والائی طرز خطابت
ملائک ساعت یزداں مخاطب — ز روح القدس کم آید جوابت

بجز حضرت سیماب گویند — کہ پیغمبر بدنیائے کلام است
بہ نزد من، خداوند سخن است
سلیماں بیت او بیت الحرام است

دو شعر

محفل سوز و ساز ہے دنیا — حامل سوز و ساز ہیں ہم لوگ
بے سبب التفات کیا معنی — کچھ تو اے چشم ناز ہیں ہم لوگ

مجاز

[illegible] غزل سرائی تپش افسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں ہے آئیے پہ کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پہ دل و جاں کی میہمانی

بعض نغمے جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اس قدر نازک و لطیف ہوتے ہیں کہ جامۂ سخن ان پر تنگ ہوتا ہے۔

نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے
بمعنی کہ برو جامۂ سخن تنگ است
ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بدل شو شاید کہ تو دریابی

غالب اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے ؎

سخن ماز لطافت نپذیرد تحریر
نشود گرد نمایاں زرمِ توسن ما

"سرِ دلبراں" کو "حدیثِ دیگراں" کی صورت میں پیش کرنے کا قدیم و جدید کون سا شاعر قائل نہیں۔

غالب

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اقبال

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است حدیث خلوتیاں جز برمز و ایما نیست

دونوں میں وہ حسنِ تجسس و تلاش نمایاں نظر آتی ہے۔ جو ہر عظیم المرتبت شاعر کو فطرت نے ودیعت کی ہے۔

اقبال

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں
بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا کھلتا نہیں بھید زندگی کا

غالب

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیا ہے نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اقبال اپنے پیش رو کی اس شوقِ دید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

دیدۂ تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

غالب ہماری ناواقفیت کی طرف اس شعر میں اشارہ کرتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا [illegible]
[illegible] نگاہ [illegible] ہے کہ کائنات کے وجود حقیقی [illegible] نہ ہو۔

اقبال

اگر بینی ایں کائنات در نظری [illegible]

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
حقیقت اسی وقت نظر آتی ہے جب نگاہِ شوق شریکِ بینائی ہو۔
کچھ نور ہی نظر آتا ہے کارو بار جہاں نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

غالب کے نزدیک "دیدہ ور" کی یہ تعریف ہے۔

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

غالب صوفی ہے اور یقین رکھتا ہے کہ حقیقی وجود صرف ذاتِ الٰہی کا ہے اور دیگر اشیاء کی ہستی کا محض وہم ہے۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اقبال کائنات کے وجود کو مانتے ہیں۔ اس کا وجود اس خودی کا رہینِ منت ہے جو اس کے ذرہ ذرہ میں جلوہ گر ہے۔ یہی خودی ترقی یافتہ شکل میں انسان کی ذات میں شعور حاصل کرنے کے بعد نمایاں حیثیت اختیار کرتی ہے۔

صوفی غالب کائنات کے وجود کی توجیہ کنت کنزاً مخفیاً الخ کو مدنظر رکھکر کرتے ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اس نظریہ میں اقبال بھی غالب کے ہم نوا ہیں۔

صورت گرے کہ پیکرِ روز و شب آفرید از نقشِ این و آں بہ تماشائے خود رسید

فرق صرف اتنا ہے کہ غالب عالمِ شہود کو نورِ ایزدی کا بے حقیقت پرتو مانتے ہیں اور ہیچ سمجھتے ہیں۔

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

اقبال کی دوررس نظر اس میں بھی خودی کو جلوہ گر دیکھتی ہے۔ وہ اسرار میں افلاطون کی یوں خبر لیتے ہیں۔

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت حکمتِ او بود را نابود گفت
بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود جانِ او وارفتۂ معدوم بود

البتہ عالمِ انسانی کے سامنے عالمِ فطرت کا وجود محض نفی و اعتبار ہو کر رہ جاتا ہے۔

تخلیق اندیدن و نادیدن ما ……… چونان وچه کلاں شوخی انکار منست

فطرت کی اوقلمونی در عنائی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں وہ

ں کہاں جو عالم انسانی کی دستار فضیلت ہے۔

این گلستان داغ تماشا ندشت ……… نرگس طناز او چشم تماشا نداشت

غالب اپنے شاعرانہ انداز میں عالم قدرت کی بہار کا معشوق کی بہار سے

کرتا ہے اور کس دلنشیں پیرایہ میں معشوق کو مرجح حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

ت وا نوا نرگست را تماشا ……… تو داری بہارے کہ عالم ندارد

آدم خاکی کی فضیلت اس کی تخلیق کاریوں میں مضمر ہے۔ اقبال خدا پر

کرتا ہے کہ فطرت کی دی ہوئی چیزوں کو اس نے اپنی تخلیقی قوت سے کیا سے

بنا دیا۔

ب آفریدی چراغ آفریدم ……… سفال آفریدی ایاغ آفریدم

انم کہ از سنگ آئینہ سازم ……… من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

غالب بھی اپنی ذات اور قوت ایجاد و استقلال سے ناواقف نہیں :۔

طرب ساغتیم و بادہ گرفتیم ……… ہرچہ طبع زمانہ بیہدہ سر زد

خ چہ بالا گر ارمغاں گل آورد ……… تاک چہ نازد اگر صلائے ثمر زد

دونوں شاعر فلسفہ ارتقا کی طرف مائل اور کل یوم ہو فی شان کے

ہیں۔

غالب

نش جمال سے فارغ نہیں ہنوز ……… پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اقبال

مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں ……… ہنوز بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

نات ابھی ناتمام ہے شاید ……… کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

حقائق حیات کے ترجمانوں سے انسانی زندگی کی عظمت و برتری پوشیدہ

ں۔

اقبال

نہ آداب امانت بے خبر ……… خویش را از دو جہاں بہتر شمر

غالب اپنے مخصوص رنگ میں کہتا ہے :۔

واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ……… لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ ……… رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

غالب کے نزدیک انسانی زندگی کا خاتمہ بالخیر یہی ہے کہ

دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے ……… کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

لیکن انسانی زندگی کی عظمت کا اس سے بہتر تصور نہیں ہو سکتا کہ اقبال

اس پیش بہا زندگی کو کسی حال میں بلند ترین شے سے بھی ضم ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔

چناں باذات حق خلوت گزینی ……… ترا او بیند و اورا تو بینی

بخود محکم گزر اندر حضورش ……… مشو ناپید اندر بحر نورش

اپنی دلیل بھی خوب پیش کرتے ہیں۔

اگر مائیم گرداں جام ساقی است ……… بہ بزمش گرمی ہنگامہ باقی است

مثال دانہ می کارم خودی را ……… برائے او نگہ دارم خودی را

زندگی کے لامحدود امکانات کا عقیدہ اقبال کے ہاں بڑے زور شور

سے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کے ہاں بھی اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

اقبال

این گنبد مینائی این پستی و بالائی ……… در شد بہ دل عاشق با این ہمہ پہنائی

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ……… ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں ……… یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

غالب

نہ پوچھ وسعت میخانۂ جنوں غالب ……… جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ……… ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

دونوں آتش نواؤں کے نزدیک دل تنگ سینہ ہے اگر آتشکدہ نہیں

ہے تنگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو ……… ہے عار دل نفس اگر آتش فشاں نہیں

اقبال اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرمم ……… تواں زگرمی آوازمن شناخت مرا

سوز و ساز کی زندگی دراصل زندگی ہے تپش ہی کی بدولت

فاختہ شاہین بنتی ہے۔

زندگی سوز و ساز بہ سکون دوام ……… فاختہ شاہیں شود از تپش زیر دام

سوختن ناتمام میں حیات مضمر ہے۔

تو رہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل ……… چیست حیات دوام سوختن ناتمام

تپش زندگی کو زندہ تر کرتی اور بال و پر بخشتی ہے۔

تپش میکند زندہ تر زندگی را ……… تپش می دہد بال و پر زندگی را

اقبال کی یہ تعلیم ہے کہ آرزو کو دل میں زندہ رکھ کہ تیری مشت خاک

مزار نہ ہو جائے۔

آرزو را در دل خود زندہ دار ……… تا نگردد مشت خاک تو مزار

غالب کی بھی یہی تعلیم ہے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ ……… اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

دونوں آرزوئے بیم کے قائل ہیں اور بلند سے بلند تر جانے کے طلبگار۔

اقبال

ہر لحظہ کہ مرا پیش نظر می آید   خوش نگاریست کہ لخت ازاں می باید
ز مہر و ستارہ چو بیم ز ستارۂ آفتابے   سر منزلے ندارم کہ بہ میرم از قرارے

غالب

رفت و باز آمد ہما در دام ما   باز بہر دادیم و عنقا خواستیم
ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اقبال کا دل ناصبور اسے جنت میں چین نہیں لینے دیتا۔

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے   نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

غالب بھی ہنگامہ زائیوں کی لذت آشنا ہے۔ اس کا تصور میخانۂ بے خروش یعنی جنت سے گھبراتا ہے۔

دراں پاک میخانۂ بے خروش   چہ گنجائش شورش نائے و نوش
چہ منت نہد ناشناسا نگار   چہ لذت دہد وصل بے انتظار
نہ چشم آرزومند در لالہ   نہ دل تشنۂ ماہ پر کالہ

اقبال کی تمام تعلیم کا ماحصل اعزاز نفس و عالی ہمتی آزادی اور تقلید سے بیزاری ہے۔ اردو شعرا میں غالب ہی اس سلسلہ میں ان کے شریک غالب ہیں۔

اقبال

فرد فرد آمد کہ خود را او شناخت   قوم قوم آمد کہ جز با خود نساخت
گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ   پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی   جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
زندگی از طوف دیگر رستن است   خویش را بیت الحرم دانستن است

غالب

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم   الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس   چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسید
تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم   گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا
ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال   حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم   لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے
تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد   سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

غالب ایک جگہ کہتا ہے کہ توفیق ایزدی بھی بہ اندازہ ہمت شامل حال ہوتی ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جفا طلبی و خطر پسندی اقبال کی مجبوبیت کی جان اور شاعری کا ایمان ہے۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز   حیات جاوداں اندر ستیز است
خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں   وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

سعی و کوشش کی اس سے بہتر ترغیب نہیں ہو سکتی کہ وہ ذاتی کد و کاوش کو چاہے وہ گناہ کا لباس پہنے ہو کار ثواب سمجھتا ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش   براہ دیگراں رفتن عذاب است
چو از دست تو کارے نادر آید   گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اقبال کا مشہور روزگار شیر و بھی مردانہ صفات کا مداح ہے اور جانتا ہے کہ عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد ہے۔

دلی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا   عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

اس کا شیوہ آرام سے بیٹھنا نہیں

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں   اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئیے

اید الپسند طبیعت بر احت پیکاں کو ذریعہ راحت نہیں سمجھتی۔ بلکہ اپنی دلکشائی کے لئے زخم تیغ کی خواہاں ہے

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں   وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

دشواریوں کو وہ اس طرح مجبور کرتا ہے۔

وادی کہ دراں خضر را عصا خفتست   بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

اس کی ہمت دشوار پسند کے سامنے فنا کا کام بھی آسان نکلا۔

شاعر کا یہی خیال ہے کہ بیم بلا میں اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ بلا سے براہ راست نپٹ لیا جائے۔ بلا کا ظاہری بلا کا ڈراوا ہوتا ہے اصل حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا است
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

بیم و خوف پر اقبال نے بڑی فلسفیانہ نظر ڈالی وہ کہتا ہے کہ یہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

لابہ و مکاری و کین و دروغ   ایں ہمہ از خوف می یابد فروغ
ہر شرے پنہاں کہ اندر قلب تست   اصل او بیم است اگر بینی درست

...ت کی نفسیاتی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

...بیے نداری بحر صحرا ست — وگر داری بہر موجش نہنگ است

سوائے اللہ کے کسی سے ڈرنا اپنی زندگی کا آپ رہزن ہونا ہے

...غیر اللہ عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رہزن است

اقبال جرأت خانہ امروز فردا سے بیزار ہے اور انقلاب کی صدا ...ند کرتا ہے۔ غالب بھی انقلابی جذبہ کا حامل اور تعمیر جہان نو کا آرزو مند ہے۔

...یا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

...نگ باج ستاناں شاخسارے را — تہی سبد ز درگلستاں بگردانیم

اقبال جرات رندانہ کا قائل ہے انسان اسی کی بدولت عظیم الشان ...م انجام دیتا ہے۔ محرکات عمل ہیں یہی قافلہ سالار ہے۔ عقل جس سے یہ ...ے کوسوں دور ہے۔ قافلۂ حیات کی رہبری کرنے سے قاصر ہے شوق جو سرتاسر ...ت رندانہ ہے کشاں کشاں اس قافلہ کو منزل تک لے جاتا ہے۔

عقل ہم عشق است واز ذوقِ نظر بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جرات رندانہ نیست

ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

...لب شرانہ انداز میں کہتا ہے۔

...ل ہی جائیگا بوسہ کبھی کہ ہاں — شوقِ فضول وجرات رندانہ چاہیئے

غالب کے نزدیک وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے اس ...ت سے متصف ہونے پر وہ برہمن کو بھی اس قدر لائق احترام سمجھتا ہے ...لعبہ کو اس کا مدفن ٹھہراتا ہے۔

...داری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اقبال بھی غالب کا ہم نوا ہے

...ہمراپا سوختن اندر طلب — انتہائش عشق و آغازش ادب

کافر بھی ہو تو شائستہ زنار ہو۔

...نگویم از بتاں بیزار شو — کافری شائستہ زنار شو

طلب صادق وعشق حقیقی ہی آیڈیل انسان یعنی مومن کا نشان ...یاز ہے۔

...از عشق است و عشق از مومن است — عشق را ناممکن ما ممکن است

یہ اگر موجود ہو تو کافر بھی مسلمان ہے اور اگر مفقود ہو تو مسلمان کافر و زندیق ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اقبال عشق کی کارفرمائیوں پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے۔

سنگ اگر بہ تیشہ زد ایں چہ مقام گفتگو است
عشق بدوش میکشد ایں ہمہ کوہسار را

غالب بھی عشق کی کارفرمائیوں سے ناواقف نہیں وہ کہتا ہے کہ اگر حضرت ابراہیم آتش نمرود سے نہیں جلے تو کیا بات ہوئی۔ مجھے دیکھو کہ بے شرر و شعلہ سوزاں و بریاں ہو رہا ہوں۔

شنیدہ کہ بہ آتش نسوخت ابراہیم — بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

طعن و تشنیع، شکوہ و شکایت شعرا کا عام شیوہ ہے۔ غالب سراپا ساز آہنگ شکایت ہے۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

مجازی رنگ سے قطع نظر حقیقی رنگ میں وہ کہہ گیا ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردہ
بایدت از خویش پرسید انچہ با ما کردہ

گر نہ مشتاق عرض دستگاہ حسن خویش
(جاں فدایت) دیدہ از بہر چہ بینا کردہ

اقبال بتان مجازی کو منہ نہیں لگاتا۔ وہ جبرئیل کو طعنہ دیتا ہے اور دامن یزداں سے الجھتا ہے معشوق حقیقی سے اسکی بے تکلف شوخی اس کے بلند تر مقام پر ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی زندہ جاوید نظم "شکوہ" اس صنف میں واسطۃ العقد ہے۔ دیگر منتشر گوہر ملاحظہ ہوں ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

تو نے بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

ذیل کے ہم مضمون اشعار سے غالب و اقبال کے باطنی ذوقی تعلق پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی ست (اقبال) سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است
چہ لطف رہروی آنرا کہ خار خارے نیست (غالب) مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد
درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی (اقبال) خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس (غالب) برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج (") مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
ہست این میکدہ و دعوتِ عام است اینجا (اقبال) قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا
گر نی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر (غالب) دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر
رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل (اقبال) حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل (غالب) جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے
ایں حرف نشاط آورمی گویم و می رقصم (اقبال) از عشق دل آسایہ با ایں ہمہ بیتابی
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا (غالب) درد کی دوا پائی درد لادوا پایا
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات (اقبال) علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات
رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے (غالب) انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
صف جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر (اقبال) جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصت کردار نفس یا دو نفس عوض یک دو نفس قبر کی شبہائے دراز
آخر کار نہ پیدا ست؟ کہ در تن فرد (غالب) کف خونے کہ بداں زینت دارے ندہی
دشمناں اجل از دست تو ناگاہ برند " نقد ہوتے کہ بسودائے بہارے ندہی

دونوں کے ہاں بات وہی ہے۔ لیکن غالب اسے شعریت کے غم میں رنگین کر کے پیش کرتا ہے۔ ایسے ہی مواقع پر پروفیسر ابوظفر عبدالواحد صاحب کے مشہور قول کی یاد آتی ہے۔ "غالب کی شعریت فلسفہ پر سدا غالب رہی۔ لیکن اقبال کی فلسفیت بعض اوقات شعریت پر غالب ہو جاتی ہے۔ یہی اس کی (یعنی اقبال کی) شاعرانہ کمزوری ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال غالب کے انداز فکر و بیان سے کافی متاثر تھے۔ غالب کے ہاں خودی و خودداری کی چنگاریاں موجود تھیں۔ یہی چنگاریاں اقبال کے ہاں دہکتی آگ نظر آتی ہیں۔ بقول پروفیسر موصوف اقبال کی شاعری غالب کی شاعری کا تتمہ ہے۔ اقبال نے غالب کے دیئے سے دیا جلایا اور جس منزل پر غالب نے چند نا تمام نقوش چھوڑے تھے۔ اقبال نے وہاں سے ابتدا کی اور چند اضافوں کے ساتھ اسے اِس تکمیل تک پہنچایا۔ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب بھی شاہد ہیں کہ غالب کا رنگ ان پر (اقبال) پر فطرتاً غالب تھا۔ وہ غالب کے نہ صرف مداح تھے بلکہ اس کے انداز بیان سے بھی متاثر تھے۔

غالب نے قدیم قافیہ پیمائی سے انحراف کیا اور معنی آفرینی سے کام لیا وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی شاعری معنی آفرینی ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں"۔ اقبال نے معنی آفرینی یعنی "بت گری" سے بھی انحراف کیا اور "آدم گری" کو مقصود فن شاعری ٹھہرایا۔ غالب کے ہاں "خارا شگافی" کے ساتھ "شیشہ سازی" اور "قاہری" کے ساتھ دلبری کا کافی عنصر پایا جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں "شیشہ سازی" و "دلبری" کم اور "خارا شگافی" و "قاہری" زیادہ ہے۔ اقبال نے شاعری میں نئی توانائی پیدا کی۔ غالب کی "عشق قمری" اقبال کے ہاں بانوئے شاہین بن جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال کبھی کبھی "دلبری" سے زیادہ "قاہری" پر اتر آتے ہیں۔ اور غالب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی قاہری میں بھی انداز دلبری نمایاں رہتا ہے۔ لیکن اقبال اس لحاظ سے کہ وہ ایک کلی و جامع الاطراف تصور حیات پیش کرتے ہیں۔ غالب کو منزلوں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

باوجود فکر و احساس کی مشابہت کے دونوں کے درمیان بنیادی اختلافات کی خلیج بھی حائل ہے۔ "انا" یا وجود جو اقبال کے فلسفیانہ نظام کا سنگ بنیاد ہے غالب کے ہاں سنگ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

اقبال دلدادۂ وجود اور غالب جانبدارِ عدم ہے

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اقبال کی غیرت و خودداری کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہمت پر بھروسہ کر کے اپنی منزل آپ طے کرے۔ غالب کی خودداری آزادانہ عمل کی تحریک کرنے کے بجائے اسے قناعت کا سبق پڑھاتی ہے۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

وہ اکثر اپنا دکھڑا روتا ہے اور اپنی بے بسی و بدقسمتی اس طرح بیان کرتا ہے کہ اگر کوثر بھی مجھے مل جائے تو بدبختی سے اس میں نمی باقی نہ رہے۔ اور اگر طوبیٰ بھی حاصل ہو جائے تو وہ خشک ہو کر ایندھن کے کام میں آئے۔

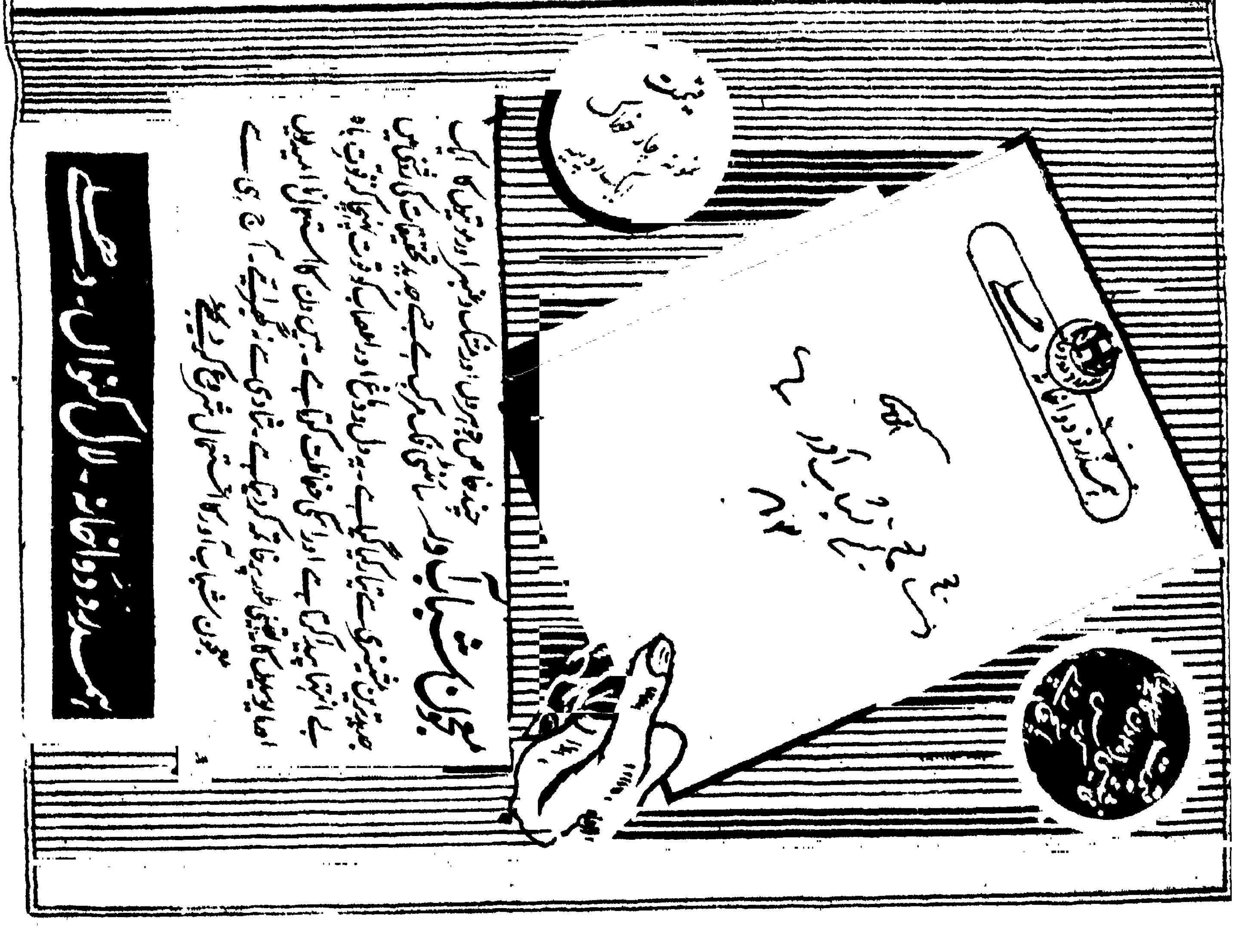
کوثر اگر بہ من رسد خاک خورم ز بے نمی
طوبیٰ اگر زمن شود ہیمہ کشم ز بے پری

اقبال اس "ذوق شیون" سے بیزار ہے وہ شاعروں سے خطاب کر کے کہتا ہے ؎

مثل بلبل ذوق شیون تا کجا
در چمن زاراں نشیمن تا کجا

بہر حال غالب اور اقبال کے کلام یعنی "نالہ طائر زیر دام" اور "نالہ طائر بام" میں فرق ہونا لازمی ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ اقبال نے سب سے پہلے "سر خودی" کما حقہ فاش کیا۔ ورنہ مشرق میں "وہی کاسہ وہی آش" تھی۔ لیکن غالب کی شخصیت اس لحاظ سے یادگار ہے کہ دیگر اردو شعرا "کنار آب رکنا باد" ہی رہ گئے۔ اور یہ اپنا مرکب "سلک خودی" تک لایا اور آفتاب اقبال کے طلوع ہونے کے آثار اپنے کلام میں پیدا کئے۔ اقبال کی طرح اس کی نغمہ پردازیوں میں بھی "دیدۂ شاعری چیزے دگر" نظر آتی ہے۔ "بانگ اسرافیل" کم سہی لیکن نغمۂ جبریل بکثرت موجود ہے۔ اور خود اقبال کہتا ہے۔

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل



بکھرے تارے

(جناب فراقؔ گورکھپوری)

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر
تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی رات
تری غزل تو نئی رُوح پھونک دیتی ہے
فراقؔ دیر سے ملتی نہیں ہے نبضِ حیات

چھلک کے کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں
نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں
زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرّہ بھی محوِ خواب نہیں

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

چاند اک گیت رات گاتا تھا
گنگناتا ہو جیسے اک مُردہ

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

بہت آہستہ اُٹھتی ہے نگاہِ فطرتِ شاعر
رُخِ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے

جگانے والے نغمۂ سحر لبوں پہ موجزن
نگاہیں نیند لانے والی لوریاں لئے ہوئے

ایران کے دو حسن

(از جناب آغا محمد اشرف ایم۔ اے)

آقائے سید حسن تقی زادے کا نام شاید آپ کو یاد ہوگا۔ پروفیسر براؤن نے انقلاب ایران کی تاریخ میں ان کا ذکر بہت وضاحت سے کیا ہے اور کہا ہے کہ ایرانی پارلیمنٹ اور دستور کی بنیادیں انہی کے ہاتھوں استوار ہوئی ہیں۔ ایران میں دستوری حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں آقائے تقی زادے کو بہت سی مصیبتوں میں سے گذرنا پڑا۔ ایک مرتبہ تو بغاوت کے جرم میں انہیں موت کی سزا مل گئی۔ مگر چند جاں نثار دوستوں کی مدد سے بچ گئے۔ جب دستوری حکومت قائم ہوگئی تو ایک عرصے تک یہ ایران کے وزیر مالیات رہے۔ اور بعد میں ایران کی طرف سے سفیر ہوکر امریکہ اور فرانس گئے۔ کچھ سال ہوئے کہ رضا شاہ پہلوی سابق شاہ ایران سے کسی بات پر ان کا اختلاف ہوگیا تھا۔ اور یہ لندن میں آن کر بس گئے تھے۔ یہاں سکول آف اورینٹل اسٹڈیز نے انہیں فارسی کا لکچرار مقرر کر دیا۔ اور جب میں ۱۹۳۹ء میں پہلی دفعہ ان سے ملا ہوں تو یہ لندن سے کالج کے ساتھ اٹھ کر کیمبرج چلے آئے تھے اور یہیں طالب علموں کو فارسی پڑھاتے تھے۔

کوئی پچاس پچپن کے قریب عمر۔ چھوٹا قد۔ بھرا ہوا جسم۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ جن میں اب سفید بال نمایاں ہو چلے تھے۔ جھکے ہوئے شانے۔ ہاتھ میں کتابوں کا تھیلا لئے آقائے تقی زادے گیارہ بجے کے قریب نہایت خاموشی کے ساتھ آن کر استادوں کے کمرے میں بیٹھ جاتے تھے۔ اس قدر خاموش کہ شروع میں ان سے بات کرتے ہوئے مجھے ذرا تکلف محسوس ہوا۔ آخر ایک دن کسی نے میرا ان سے تعارف کرا دیا۔ اور آقائے تقی زادے نے نہایت محبت سے ہندوستان کا ذکر مجھ سے کیا۔ ایک ایک لفظ ٹھہر کر بولنا اور وہی ایرانی آداب و اخلاق۔ پہلی ہی ملاقات کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس کے بعد اکثر جب کبھی ہم دونوں کو فرصت ملتی کرائسٹ کالج کے باغ میں ٹہلا کرتے۔ یہاں ایک چھوٹا سا تالاب بھی ہے۔ اس کے متعلق روایت مشہور ہے کہ انگلستان کا مشہور شاعر ملٹن یہاں تیرا کرتا تھا۔ چنانچہ اس تالاب کی زیارت کے لئے بہت سے ملٹن کے مداح اب تک آتے رہتے ہیں۔ آقائے تقی زادے اسی تالاب کے کنارے حافظ، سعدی اور عمر خیام کا ذکر کرتے تھے۔ اور کیمبرج میں بیٹھ کر مجھے شیراز و اصفہان کا لطف آ جاتا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ پہلوی تخت ایران سے دست بردار ہوئے۔ اس کے چند دن بعد میں نے اخبار میں پڑھا کہ آقائے تقی زادے کو حکومت ایران نے لندن میں اپنا سفیر مقرر کیا ہے۔ اس خبر سے واقعی مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے میرا کوئی اپنا عزیز اس عہدے پر مقرر ہوا ہے۔ کیونکہ کیمبرج کے زمانے میں ان کی خدمت میں مجھے ایسی ہی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ میں نے اسی وقت انہیں مبارکباد کا خط لکھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ ایرانی سفارت خانے میں آ کر کسی وقت مجھ سے ملو۔ ان دنوں میں لندن سے کوئی سو میل باہر رہا کرتا تھا۔ وقت اور دن مقرر کرنے کے بعد میں ایرانی سفارت خانہ میں جا پہنچا۔ ایرانی سفارت خانے کی سب سے [illegible] خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دروازے پر لندن کے اور سفارت خانوں کی طرح [illegible] انگریزی ہی نہیں بلکہ فارسی زبان میں بھی سفارت خانے کا نام لکھا ہوا ہے۔ دروازہ بند تھا میں نے گھنٹی بجائی۔ ایرانی دربان نے دروازہ کھولا۔ اور ایرانی قاعدے کے مطابق میرا استقبال کیا۔ اسے غالباً میرے آنے کی اطلاع تھی۔ یہ سیدھا مجھے سفیر ایران کے کمرے میں لے گیا۔ سبز مخمل کا پردہ اٹھا اور سامنے ایک نہایت خوبصورت میز کے پاس آقائے تقی زادے بیٹھے نظر آئے۔ ان کا کمرہ ایرانی قالینوں، فانوسوں اور ایرانی تصویروں سے اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ یہ لندن کا ایک حصہ نہیں بلکہ ایران کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ تقریباً دو سال بعد آج میں آقائے تقی زادے سے پھر مل رہا تھا۔ اس عرصے میں یہ بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ ان کی آواز پہلے ہی نحیف تھی اب اور بھی ہلکی ہوگئی۔ مگر ان کے خلوص اور محبت کی گرمی میں کوئی فرق مجھے محسوس نہیں ہوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک ہم ایرانی قہوہ پیتے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ اصل میں میں بی۔ بی۔ سی کے سلسلے میں ان سے انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ مگر ان کے مزاج میں اس قدر انکسار اور عجز ہے کہ کسی طرح ریڈیو پر اپنا نام یا اپنے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں انٹرویو دینے پر آمادہ کیا۔ اپنی زندگی میں مجھے سینکڑوں لوگوں سے انٹرویو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر جو انکسار میں نے آقائے تقی زادے میں دیکھا اس کی مثال مجھے کسی اور شخص میں نظر نہیں آئی۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ اچھا بس اتنا کہہ دینا کہ میں فلاں شخص سے

تھا۔ اور بس۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی مشرقی زندگی کا ایک جز تھا۔ ایسا جز جو اب مشرق میں مفقود ہوتا جاتا ہے۔

احمد شاہ خاندانِ قاچار کے آخری تاجدار تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اور انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی شاہزادہ حسن کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ رضا شاہ پہلوی نے خاندانِ قاچار کو ایرانی حکومت سے برطرف کیا تو احمد شاہ حسن ایران سے پیرس چلے آئے۔ احمد شاہ قاچار کا پیرس ہی میں انتقال ہوا۔ اور جب موجودہ جنگ چھڑی ہے تو اس وقت شاہزادہ حسن قاچار لندن میں مقیم تھے۔ جنوری سنہ ۴۰ء میں مجھے شاہزادہ حسن سے لندن کے ایک مشہور ہوٹل میں ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا سرخ و سپید رنگ۔ اور بشاش چہرہ دیکھکر پہلی نظر میں میں یہ سمجھا کہ یہ ایرانی نہیں بلکہ یوروپین ہیں۔ انگریزی بھی یہ فرانسیسی لہجے میں بولتے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ فرانسیسی زبان پر انہیں خوب قدرت حاصل تھی۔ بغیر فریم کی ایسی عینک جو ناک کے بانسے پر چپک جاتی ہے ان کی روشن آنکھوں کو اور نمایاں کر رہی تھی۔ اور بار بار یہ اپنی عینک کو ناک پر جماتے رہتے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ایک سال پہلے ایران کی سیاحت کر چکا ہوں تو بہت اشتیاق سے اپنے وطن کا حال پوچھتے رہے اور باتوں باتوں میں رضا شاہ پہلوی کے متعلق بہت دلچسپ قصے سنائے۔ جن میں سے ایک مجھے اب تک یاد ہے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جبکہ احمد شاہ ہر سال ایران سے یورپ جایا کرتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں شاہزادہ حسن کو اختیار حکومت مل جاتا تھا۔ رضا شاہ اس وقت صرف رضا خاں تھے۔ اور شاہزادہ حسن کے سامنے دربار میں ہاتھ باندھکر مودب کھڑے رہتے تھے۔ ایک روز کسی وزیر یا حکومت کے بڑے افسر نے کاغذات پیش کئے۔ کاغذات سے معلوم ہوتا تھا کہ افسر متعلقہ نے اپنا کام صحیح طور سے انجام نہیں دیا۔ شاہزادہ حسن اس پر ذرا ناراض ہوئے۔ مگر جب افسر نے معافی مانگ لی۔ انہوں نے کہا "بخشیدیم" یعنی ہم نے تمہیں معاف کیا۔ رضا خاں کے ہاتھ میں اس وقت کچھ اختیار نہیں تھا۔ مگر اسی وقت سر دربار کہا کہ ایسے موقعے پر افسر کو معاف کرنا سیاست شاہانہ کے خلاف ہے۔ اگر میری رائے پوچھئے تو اسے ایسی سزا کا حکم دیجئے کہ دوسروں کو اس سے عبرت ہو۔ شاہزادہ حسن نے جب مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تو کہا کہ اس وقت ہم ہنس کر چپ ہو رہے۔ مگر ہماری اس چشم پوشی اور بخشش نے ہمارا تاج و تخت ہم سے چھنوایا۔ اور آج اسی تخت پر رضا خاں بیٹھا ہے۔ یہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے اور اس وقت رضا شاہ ایران کا بادشاہ تھا۔

شاہزادہ حسن نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میری والدہ جو ملکۂ ایران تھیں ان کی اور شاہی خاندان کی عورتوں کی رضا شاہ نے بے حد عزت و حرمت کی اور اب تک سابق ملکۂ ایران کو رضا شاہ کے حکم سے برابر پنشن ملتی ہے۔

شاہزادہ حسن کبھی رضا شاہ کو رضا شاہ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ رضا خاں کہا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک رضا شاہ ایران کا جائز بادشاہ نہیں تھا۔ اور احمد شاہ قاچار کے مرنے کے بعد شاہزادہ حسن اپنے آپ کو ایران کے تخت و تاج کا حقدار تصور کرتے تھے۔

ستمبر ۱۹۴۱ء میں جب رضا شاہ تخت سے دست بردار ہوئے اور اتحادیوں کو ان کے لڑکے محمد رضا شاہپور کی طرف سے چند اندیشے لاحق ہوئے تو اڑتی اڑتی یہ خبر میں نے بھی سنی کہ اگر محمد رضا شاہپور کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہوا تو شاہزادہ حسن کو ایران کا بادشاہ بنانے کی تجویز ہو رہی ہے۔ مگر چند دن بعد سرکاری طور سے محمد رضا شاہپور کی تخت نشینی کا اعلان ہو گیا۔ اور شاہزادہ حسن انگلستان میں ہی رہے۔

شاہزادہ حسن نے لندن سے کوئی تیس میل باہر ایک چھوٹے سے قصبے میں گھر لے لیا تھا۔ اور وہیں رہا کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں مجھے خبر ملی کہ دریائے ٹیمز کے کنارے ایک روز یہ ٹہل رہے تھے کہ ایکا ایکی حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ آب رکنا باد اور گل گشت مصلے کو چھوڑنے کے بعد خاندانِ قاچار کے بدقسمت شاہزادہ کو دریائے ٹیمز کا کنارا پسند آیا۔ لندن میں چند مسلمانوں اور ان کے دوستوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ اور جب تک جنگ کی وجہ سے ان کا جنازہ نجف اشرف نہیں بھیجا جا سکتا انہیں امانت کے طور پر لندن کے ایک قبرستان میں رکھا گیا ہے۔

یہ ایران کے دوسرے حسن تھے۔

پگڈنڈی

(جناب الطاف مشہدی)

سونے چاندی کے بچھو بیٹھے ہیں تاک لگائے
کب کوئی انجان مسافر اس رستے پر آئے
زہر ان کا جھٹکے راہی کو موت کی نیند سلائے
ناداری کے جبڑوں میں دم توڑے وہ دکھیارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

حرص و ہوا کا طوفاں ہے اور ڈر ڈر ڈر پھٹ پھٹ
چیخیں، آنسو، آہیں، نالے اور کلوں کی کھٹ کھٹ
ہر سو ایک قیامت برپا ہر جانب اک کھٹ پٹ
فطرت کی آنکھوں سے بہہ نکلی ہے خون کی دھارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

رینگ رہے ہیں دھرتی کے سینے پر خونی سائے
انگڑائی لیتا ہے فتنے ذرّے میں انیائے
بگڑے موسم میں منزل تک کس سے جایا جائے
کرودھ کپٹ کی زہری ناگن اور انسان بچارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

ننگے ہیں افلاس کے پاؤں اور کانٹے زہریلے
میٹھی نظریں، کومل چہرے، ہیرے کے چتریلے
بانکے ترچھے، رنگ برنگے، نیلے، کالے، پیلے
چھینتے ہیں سینے کی ٹھنڈک آنکھوں کا اجیارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

موڑوں سے بھرپور ہے رستہ ہر موڑ ایک خرابی
قدم قدم پر جاگے دھوکے ڈگر ڈگر بیتابی
آشاؤں کی زندہ نعشیں چپتا بست شرابی
ڈوب چلا ہے غم کے بادل میں جیون کا تارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

بھوکی نظریں نکھرے جوبن پر جھکتی ہیں ایسے
ویرانے میں پردیسی کی نعش پہ چیلیں جیسے
یا سندر جوگن کی تھالی پر تانبے کے پیسے
لوبھ کی اگنی بھڑک اٹھی ہے پاکر پاپ سہارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

آگ کی ندی بہتی ہے چلتے ہیں خون کے تلے
ڈسنے والی لہریں ہیں یا سم آلودہ بھالے
پڑے ہوئے ہیں اب تک قدرت کے ہونٹوں پر تالے
رعشہ ہاتھوں میں، شل پاؤں، سر پر بوجھ ہے بھارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

جی کہتا ہے اس پگڈنڈی کو ہموار بنا دوں
تاریکی کو روشن کر دوں جلتے دیپ بجھا دوں
پستی کو دوں عرش کی رفعت، عرش کو فرش بنا دوں
خواب سے چونکے غافل انساں جاگے عالم سارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

ڈیوائن کومیڈی

جہنم

(از جناب فضل حق صاحب قریشی)

(اطالیہ کے شاعرِ اعظم دانتے کے غیر فانی شاہکار کا اختصار و اقتباس)

"اپنی حیاتِ فانی کی نصف منزل گذار دینے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں ایک تیرہ و تاریک جنگل میں ہوں۔ راہ گم کردہ مسافر کی طرح جو سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہو۔ ان کیفیات کا اظہار بھی ایک امر محال ہے۔ خدا کی پناہ! وہ جنگل کس قدر بھیانک اور وحشت ناک تھا۔ اور وہاں کی روئیدگی کس درجہ کرخت اور غیر موزوں تھی جس کا اب محض تصور ہی میرے دل میں اس خوف و ہراس کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ جو لحاظِ تلخی موت کی اذیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ تاہم ان مشاہدات سے جو عبرت حاصل ہوئی، اس کی تفصیل بلا کم و کاست بیان کر دوں گا۔"

ان تاریک راستوں میں گم ہو کر وہ اس کاوش میں سرگرداں رہ کر کسی طرح کسی تدبیر سے اس پہاڑ کی چوٹی تک جس کی بلندی فقط تقدیس سماوی سے [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] ہے کہ اس کی قوت گویائی عرصہ [illegible] [illegible] ہے — یہ لاطینی زبان [illegible] شاعر اعظم ورجل ہے جو مدت تک عقبیٰ کے لئے جو صوبہ شعر اور کوہ پارناسس کی

چوٹی پر چڑھتے وقت راہنما بنا رہا تھا۔

دانتے اپنے سفر کا حال اس سے بیان کرتا ہے۔ اس پہاڑ کی بہت جس کی جستجو ہے۔ اور ان درندوں کے متعلق بھی جن سے راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ ورجل بتاتا ہے کہ اس راستے سے ہو کر تم اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتے لیکن ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ اگر اس پر معمولی حادثات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہو تو میں رہنمائی کی خدمت پیش کر سکتا ہوں۔ تمہیں خاص قلب جہنم سے گذرنا ہوگا۔ لیکن عزم صمیم اور عقیدہ واثق کی روشنی میں اسے طے کر کے کوہِ مقدس تک پہنچ جانا ممکن ہے۔

دانتے ذرا تامل کرتا ہے۔ اس خوف کی بنا پر کہ شب دیجور کی سی تاریکیوں اور ان وحشت انگیز مقاموں سے ہو کر گذرنا ہوگا۔ جہاں گناہوں کی پاداش میں ابد تک قائم رہنے والی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔

اسے عالمِ تذبذب میں دیکھ کر ورجل یقین دلاتا ہے کہ ذاتی تحفظ کے لئے تم عرش پر متمکن رہنے والی مقدس ہستی ——— مقدس بئیٹرس ——— سے وہ فیض روحانی حاصل کر لوگے، جس کی ایک ہلکی سی ضیا مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔ دراصل بئیٹرس ہی کے ایما پر ورجل کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ طبقات سماوی کی سیر کرنے والے زائر کو ہر قدم پہ مدد دی جائے۔

یہ سن کر ممنونیت کے بارِ عظیم سے جھک جانے والا دانتے آگے [illegible] رضامند ہو جاتا ہے۔

لہٰذا دونوں شعرا [illegible] کا مقابلہ کرتے کرتے ایک [illegible] پہنچتے ہیں جس کی پیشانی پر دانتے حسب ذیل کتبہ پڑھتا ہے:-

"میرے اندر سے گذر کر تم دردِ الم میں پہنچو گے۔
میرے اندر سے گذر کر تم دائمی عذابِ جہنم میں مبتلا ہوگے
میرے اندر سے گذر کر تم اُن لوگوں میں (جا ملو گے) جو ہمیشہ کے لئے گمراہ ہو چکے ہیں۔
[illegible] تمام امیدیں ختم کر دو۔
[illegible] گذرنے والو!"

جہنم [illegible] [illegible] [illegible] اور جو یقیناً ابد تک اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتے رہیں گے۔ جہنم کے دروازے کے اس جانب سب سے پہلا طبقہ ان ہستیوں کا مسکن ہے جو نوعِ انسانی [illegible] ہی سے راندۂ درگاہ کی گئی ہیں۔ ان کی زندگی لاابالی [illegible] کے وجود کا اقرار کیا نہ انکار۔ غیر جانبدار، لاپرواہ [illegible]

"اپنے دونوں ہاتھوں سے گلا گھونٹ گھونٹ کر آہ وزاری کر رہے تھے۔
ان کا شور وغوغا اتنا بلند تھا کہ ہمیشہ کے لئے۔
ہیبت ناک گونج تمام فضا میں پیدا ہو گئی تھی۔
اور اس پر شدید تاریکی مستزاد تھی۔
ان کی حالت ایسی تھی جس طرح طوفانِ گرد و غبار میں۔
ریت کے ذرّے رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔"

ان روحوں کی لائقِ تنفّر بےچارگی پر نظر ڈال کر گذرتے ہوئے دانتے محسوس کرتا ہے کہ بے شک جہنمی قانون کے مطابق ان کی سزائیں اُن کے گناہوں کے عوض بالکل مناسب و منصفانہ ہیں۔ جس طرح بے سرو کاری کی زندگی اُنہوں نے بسر کی تھی ایسی ہی بے تعلقی کے ساتھ طوفانِ گرد و غبار اُن کو گھیرے ہوئے ہے۔

بہرحال وہاں سے گذر کر وہ جہنم کی پانچ ندیوں میں سے پہلی ندی اکیرون کے کنارے پہنچتے ہیں۔ اس جگہ شیرون ملاح ملتا ہے۔ جو اپنی شرر فشاں آنکھوں سے گھور گھور کر ملعون روحوں کو کشتی میں گھس جانے کے لیے مجبور کرتا ہے تاکہ جہنم کے ان مخصوص حصّوں میں ان کو پہنچا دیا جائے۔ جہاں ان کی قسمت میں لکھا ہوا عذابِ الیم ان کے انتظار میں پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے۔

جب ورجل واضح طور پر اپنے مختصر سماوی اختیارات کی حقیقت بیان کرتا ہے کہ کس طرح مجھے ایک فانی انسان کو دریا کے پار سیر کرانے کی اجازت مل چکی ہے تو شیرون با دل ناخواستہ دانتے کو کشتی میں بٹھا کر موت سے پرے لے جانا منظور کر لیتا ہے۔

چنانچہ وہ اصل جہنم کے پہلے دائرے میں جو سب سے زیادہ بیرونی اور کم تکلیف کا ہے اور جو خود ورجل کے رہنے کی بھی جگہ ہے۔ ایسے لوگوں کے آزردہ اور غم ناک سایوں کے درمیان پہنچتے ہیں جو مسیح سے ناواقف تھے۔ کیونکہ ان کے مبعوث ہونے سے قبل وہ دنیا میں آباد تھے۔ اب وہ جانتے ہیں کہ عشقِ الٰہی کی کیا حقیقت ہے اور یہ کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس نعمت سے محروم ہیں۔ یہ احساس ہی وہ معمولی سزا ہے جو اُن کے لئے کافی سمجھی گئی ہے۔

لیکن اس وقت مسافروں کے پاس سے دو رُوحیں تیرتی ہوئی گذر جاتی ہیں جن کے متعلق دانتے دریافت کرتا ہے۔

دراصل وہ پاؤلو اور فرانسسکا ہیں۔ جن کی درد بھری رودادِ حیات امتدادِ زمانہ کے باوجود آج بھی دل ہلا دینے کیلئے کافی ہے۔ اور جن کا وجود دانتے کے تخیل میں بالکل غیر فانی ہو کر رہ گیا ہے۔

قصّہ یوں ہے کہ فرانسسکا کی شادی اس کے باپ کی مرضی کے مطابق راوینہ کے ایک حاکم گوئید و دا پولینطہ سے ہوئی تھی۔ جو ایک قوی دل ہونے کے باوجود جسمانی رعنائیوں کے اعتبار سے اپنے بھائی پاؤلو کا ہم پلہ نہ ہو سکتا تھا پس ایسا ہوا کہ پاؤلو اور عروس فطری طور پر اپنے ذوق میں یگانگت محسوس کی۔ وہ ایک ساتھ آرتھر اور گنی ویر کی عشقیہ داستانیں پڑھتے اور سر وار لانسیلاٹ کے مجرمانہ جذبات سے جن کا تعلق شہنشاہ کی ملکہ سے تھا متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ اس کتابِ محبت بلکہ اس کتاب کے چند جملوں نے ان کی زندگی برباد کر دی۔ اور اس شوہر نے جس کی حق تلفی کی گئی تھی ان کو فنا کا جام پلا کر جہنم کے دوسرے دائرے میں پھینک دیا۔

دانتے انہیں دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔

پھر وہ جسمانی گناہ کرنے والوں کے دو اور دائروں میں سے گذرتے اور حریص لوگوں کو کیچڑ میں لوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جن پر غلیظ پانی اور اولوں کی مسلسل بوچھاڑ پڑتی ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں انہوں نے بڑی بے اعتدالی کے ساتھ شراب پی تھی ـــ سربیرس ـــ جہنم کا خونخوار کتا جس کے چار سر ہیں ـــ منہ پھاڑ کر ان پر بھونکتا ہے اور جبڑوں کے درمیان اپنے دانت اس طرح پیستا ہے جیسے ہڈیاں چچوڑتے وقت کتے عموماً کیا کرتے ہیں۔

چوتھے دائرے میں جہاں پلوتو ـــ دولت کے دیوتا ـــ کی سوگوار حکومت ہے، وہ سایوں کے دو نصف دائرے دیکھتے ہیں۔ جو جرم کی نوعیت کے لحاظ سے برابر مگر طبیعت کے اعتبار سے برعکس ہیں ـــ یعنی لالچی، کنجوس اور لاپروا فضول خرچ ـــ ان کے مشاغل نہایت دلخراش ہیں۔ ہر گروہ وزنی پتھر اُٹھا اُٹھا کر پھینکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کو زخمی کرنے لگتے ہیں۔ یہ حادثات متواتر دُہرائے جاتے ہیں۔ شور و غل اور آہ و بکا کے ساتھ آپس میں لعنت و ملامت کرتے ہوئے ـــ ایک وہ جنہوں نے لاپروائی سے دولت برباد کی۔ اور ایک وہ جنہوں نے مجرمانہ طور پر اسے جمع کیا۔

ان ملعون روحوں کی آہ وزاری کے دل خراش نوحے بھی طرح ختم ہونے بھی نہیں پاتے کہ دانتے اور اس کا راہنما ایک مکروہ اور متعفن دلدل کے قریب پہنچتے ہیں۔ اس کا نام استائکس ہے۔ دانتے دریافت کرتا ہے کہ یہ برہنہ لوگ کون ہیں جو دلدل کے اندر سے نکلتے دکھائی دے رہے ہیں۔ جن کے جسموں پر نجاست لپی ہوئی ہے۔ اور جو ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے ہیں۔ ورجل بتاتا ہے کہ یہ قاہر ہستیاں ہیں اور ان سے نیچے مغموم کاہلوں کی روحیں ہیں۔ جن کی سرد آہوں

کے باعث کیچڑ کی سطح پر بلبلے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دُنیا میں ہمیشہ گھناؤنے اور مکروہ ماحول میں معصیت کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ اور کبھی اپنے مختصر دائرے سے باہر نظر نہ ڈالی تاکہ یہ معلوم کرتے کہ کرۂ ارض کی کائنات کس قدر دلچسپیوں اور لطافتوں سے معمور ہے۔ اسی لئے ان کو ان کی فطرت کے مطابق رکھا گیا ہے۔

اس سطحِ آب پر جہاں افسردہ دکاہل روحوں کے اضطراب و ارتعاش سے سخت تموّج اور جوش پیدا ہوا کرتا ہے۔ دانتے کو جہنم کے صدر مقام یعنی شہر ابلیس کے آتشیں گنبد و مینار دکھائی دیتے ہیں۔ اب تک انہوں نے جن طبقات کی سیر کی وہ مملکتِ معصیت کے معمولی اضلاع تھے۔ یا بالفاظ دیگر محض مضافات دوزخ —— جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ان دُور اُفتادہ حصّوں میں ان لوگوں کو سزا دی جاتی ہے جنہوں نے نفس پرستی اور ریاکاری میں بے اعتدالی سے کام لیا تھا۔ لیکن اس گہر آلود شہر کے دروازوں میں سے گذر جانے کے بعد ناقابلِ بیان مصائب و تکالیف میں مبتلا ان مقہور رُوحوں کا جمِ غفیر ملتا ہے جو نوامیسِ قدرت کو توڑ کر نہایت بےحیا نہ طور پر ارتکابِ معصیت کرتے رہے تھے۔ اور جن کی تمام عمر دغا و فریب میں بسر ہوئی تھی۔

تین چڑیلیں میدوسا کا سر اُٹھائے (جس کی جھلک دیکھتے ہی ناظرین پتھر کے بن جاتے تھے) مسافر اور اس کے راہنما پر جھپٹ پڑتی ہیں۔ اور اگر عین اس وقت ایک فرشتۂ رحمت نمودار نہ ہو جاتا تو وہ دروازے جن کے پیچھے عدلِ خداوندی کے خوفناک اور رُوح فرسا اسرار و رموز سربستہ ہیں۔ اس ہستی کی نظر کے سامنے بند ہو جاتے۔ جس کا شمار گوشت و پوست کے اعتبار سے باشندگانِ ارض میں ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے ان حقائق کے علم سے محروم رہ جاتا۔

دیواروں کے درمیان، حالتِ جانکنی میں گرفتار، آتشیں غاروں میں (جن کے دہانوں پر قیامت تک تیغ نہیں لگ سکتا) مدفون اُن کافروں کی رُوحیں ہیں جنہوں نے ذاتی تمکنت کے زعمِ باطل میں مشیت و الہاماتِ خداوندی کی غلط ترجمانی کی۔ یہ چھٹا دائرہ ہے جو اُبلتے ہوئے خون کے وسیع دریا فلیگی تھون کے بیرونی ساحل سے شروع ہوتا ہے۔ دانتے کے لئے اس کو عبور کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے بغیر اس جانِ تمنا کوہِ رفعت پر نہیں پہنچ سکتا۔ جس کا چکّر دار راستہ دارالمحن کی حد میں ختم ہو چکنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس کو عبور کس طرح کیا جائے۔ اس جگہ ملاح کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ صرف سنیتور رہتے ہیں —— نچلا دھڑ گھوڑے کی مانند اور بالائی انسان کی طرح —— گویا غیظ و غضب، وحشت ناک اور رمزیہ نمونے ہیں۔ جو ساحل دریا کے ساتھ دوڑ رہے ہیں۔ اور ان دکھ بھری مبتلائے عذاب رُوحوں کو جب وہ ساحل کے باہر چپکے سے کھسک جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ تیروں سے چھید چھید کر خون کی ندی میں واپس کھینچ رہے ہیں لیکن ورجل اسی پوشیدہ قوت کو بروئے کار لاکر جو سماوی رسالت کے وقت عطا کی گئی تھی ایک سنیتور کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ ہم دونوں کو ساحل پار پہنچا دے۔

جب وہ گھوڑے کی کشادہ پشت پر سوار ہو کر خون فشاں طوفانی موجوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو ورجل بیان کرتا ہے کہ اس ساتویں منزل کے دائرے میں ان کو سزا ملتی ہے جو اپنے پڑوسیوں، خود اپنی ہستی اور ذاتِ باری کے خلاف جنگ کرنے کے سلسلے میں مجرم قرار دیئے جاتے ہیں۔ پہلی جماعت —— قاتلوں کی جماعت —— دریائے خون میں غوطے کھا رہی ہے۔ اور یہی صورت ابد الآباد تک قائم رہے گی۔ اور پھر وہ کچھ فاصلے پر ساحل کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے:-

"اور وہاں جھلستی ہوئی ریت کے اوپر پرکالہ ہائے آتشیں کے نیچے اپنی جلی قسمت کا لکھا پورا کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا، خدا کی مخلوق یا قدرتِ الٰہی کے خلاف گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔"

ورجل یہ بھی بیان کرتا ہے کہ تیسری جماعت یعنی اُن لوگوں میں جنہوں نے قدرت کے خلاف گناہ کئے ہیں۔ سود خوار بھی شامل ہیں۔ سود خواروں کا مرتبہ باعتبار نوعیتِ گناہ ملحدوں، قاتلوں، مردم آزاروں اور خودکشی کرنے والوں کے برابر سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ خدا نے آسمانی صحائف کے ذریعہ یہ حکم نازل فرمایا تھا کہ انسان محنت و مشقت سے اپنی روزی کمائے۔ صنعت و حرفت، زراعت و باغبانی اور دیگر علوم و فنون اسی مقصد کے لئے ہیں۔ لیکن ان کے برخلاف سود خوار نہ متاعِ دنیوی میں کسی قسم کا اضافہ کرنے کے بعد اسے صرف کرتا ہے اور نہ اپنی پیشانی کا پسینہ بہا کر روزی کماتا ہے۔ لہٰذا نوامیسِ قدرت کے خلاف یہ ایک زبردست گناہ ہے۔

سنیتور ان کو دریا کے اندرونی ساحل پر اُتار دیتا ہے۔ اور وہ گھنے اسرار جنگل میں گھس جاتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا مسکن ہے جنہوں نے اپنی ہی ذات کے خلاف بغاوت کی تھی —— یعنی خودکشی کرنے والے۔

"ہمارا گذر ایسے جنگل میں ہوا، جہاں قدموں کے اترنے راستے کا کوئی نشان باقی نہ چھوڑا تھا۔ وہاں کی روئیدگی، سرسبزی و شادابی سے محروم تھی۔ اسکی بجائے خس و خاشاک کا ایک انبار تھا۔ مٹیالا، سیاہی مائل۔ شاخیں ہلکی اور مخروطی نہیں تھیں بلکہ گانٹھوں کے باعث بدوضع

ڈالی اور ایک دوسری کے ساتھ گتھی ہوئی گنجان۔ پھلوں اور پھولوں کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ بلکہ ان کی جگہ کانٹے تھے۔ مہلک اور زہر آلود کانٹے۔ ان درختوں پر ایسے خون آشام پرندوں کا مسکن تھا۔ جن کے پنجے چوڑے، چپکلے اور تیز خونریز ناخنوں سے مسلح اور جو شکل وصورت میں انسان سے مشابہ تھے۔ ان کے بڑے بڑے پیٹ پردار بازوؤں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس تاریک سنسان جنگل میں یہ پرندے بیٹھے ہوئے آہ وزاری کرتے رہتے تھے۔"

دانتے ایک درخت کی ٹہنی توڑ لیتا ہے۔ اور یہ دیکھکر متحیر ہوجاتا ہے کہ اس سے خون کے فوارے چھٹنے لگتے ہیں۔ اور درخت کے اعماق قلب سے آہ وزاری کے ساتھ سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی صدا بلند ہوتی ہے:

"تم نے مجھے زخمی کیوں کیا؟"

اس جنگل میں خودکشی کرنے والے درختوں کے روپ میں کھڑے ہیں اور ان میں سے ایک بیان کرتا ہے کہ قیامت کے دن ہر روح کو اپنا اپنا جسم واپس مل جائیگا لیکن ہم پھر بھی اپنے اصلی چولے سے محروم رہینگے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ جب ہم جان بوجھکر دنیوی زندگی میں اپنے اپنے جسم سے دست بردار ہوچکے ہیں تو پھر کس طرح اس کے حقدار ہوسکتے ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ قیامت کے بعد ہمارے جسم ہمارے قریب کے درختوں کی شاخوں پر لٹکا دیئے جائیں گے۔ تاکہ ہمارے گناہوں کی افسردہ یادگار اس طرح قائم رہے۔

اس پراسرار کنج سے نکلنے کے بعد دانتے اور ورجل خشکی تھون کی ایک معاون ندی کے ساتھ ساتھ پل پر سے گذرنے والا راستہ طے کرتے ہیں۔ اس خون آلود راستے پر چل کر جس کی ریت جھلستی ہوتی ہے وسطِ جہنم تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہ ملحدوں کو دیکھتے ہیں کہ کباب سیخ کی طرح بھن رہے ہیں۔ اور اٹھنے سے معذور ہیں سود خوار مایوسی اور پریشانی کے عالم میں ٹھوڑیاں گھٹنوں پر ٹکائے پنجوں کے بل لڑھک رہے ہیں۔

اسی اثنا میں دانتے اور ورجل آٹھویں غار یعنی میل بوغ کے بالکل کنارے پر پہنچ چکتے ہیں۔ جس کی نگہداشت کریہہ المنظر ذوعنصری دیو غریون کے سپرد ہے۔ ورجل دانتے سے کمر کا پٹکا لیکر نیچے لٹکاتا ہے اور غریون اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی خاردار پیٹھ پر پاؤں رکھکر غار میں اترتے ہیں۔

نیچے جاکر دانتے دس خندقیں دیکھتا ہے۔ جن کے احاطے میں بالکل بیچوں بیچ جہنم کا وہ عمیق غار ہے جس میں دیوتا رت شیطان گاڑی کے دھرے کی مانند کمرتک منجمد کوکائتس میں دھنسا رہتا ہے۔ اوپر سے دیکھا جائے تو یہ آٹھواں طبقہ ایک وسیع بہیہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ایک ہی محور کے گرد گھومنے والے دس مرکزی حلقوں سے بنا ہو۔ اس لحاظ سے درمیانی چٹانوں پر محرابوں، پشتوں، پلوں اور کمانیوں کا دھوکا ہوتا ہے جو سنگین محیط سے مرکز تک سلسلہ وار ہیں۔ یہاں کی تاریک فضا پیپ لہو اور رال کی بساندھ اور سڑے ہوئے گوشت کی عفونت سے استفراغ کی حد تک ناقابل برداشت ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا کوڑھیوں کے شفاخانے میں پہنچ گئے ہیں۔

دانتے کا چہرہ دھوئیں کے غبار سے جو ان غلاظتوں میں سے آہستہ آہستہ نکلکر پھیلتا رہتا ہے سیاہ ہوجاتا ہے۔ وہ لپک کر اپنے راہنما کے پاس ترچھی چٹانوں کے سرے پر پہنچ جاتا ہے اور جھانک کر خندقوں میں نظر ڈالتا ہے۔ جہاں دس قسم کے فریبی اور جعل ساز اپنے گناہوں کی سزا بھگتتے ہیں۔

یہاں وہ دیکھتا ہے کہ کٹنیوں اور فرم ساقوں کی کمر پر کوڑے پڑتے ہیں۔ زمانہ ساز اور خوشامدی گہری غلاظت میں غرق ہیں۔ اور وہ جنہوں نے حصولِ منفعت کی خاطر مقاماتِ مقدسہ کو فروخت کرڈالا تھا۔ گڑھوں میں منہ ڈالے شرم سے سرنگوں ہیں۔ کچھ برہنہ لوگ جو گہری فضا کے باعث دور سے زیادہ قدآور معلوم ہوتے ہیں۔ الٹے پاؤں چل رہے ہیں۔ ان کے بند پپوٹوں میں سے رستے ہوئے آنسو سرینوں تک ان چہروں سے بہہ رہے ہیں جو پچکا کر اور پلٹ کر شانوں کے درمیان لٹکا دیئے گئے ہیں۔ یہ نجومی منجم و رمال پہلے مستقبل کا حال بتانے والے۔ چنانچہ وہ ابد تک پیچھے کی طرف دیکھتے رہیں گے اور الٹے پاؤں اس طرح چلیں گے کہ پنجے کی جگہ ایڑی ہوگی۔ اُف! کس قدر بے بسی کا مقام ہے۔

اسی بہتی ہوئی غلاظت کے سیلاب پر مبدلین کے ایک گروہ کا انبار ان کے قدموں کے پاس لگ جاتا ہے۔ سانس پھول جانے کے باعث مینڈکوں کی مانند ان کے

مجھ سے مت پوچھ "مرے حسن میں کیا رکھا ہے"
آنکھ سے پردۂ ظلمات اٹھا رکھا ہے
میری دنیا کہ مرے غم سے جہنم بردوش
تو نے دنیا کو بھی فردوس بنا رکھا ہے

مجاز

تنہا اور تھنے پیچھے جارہے ہیں۔ ساحل پر کھڑے ہوئے بزشت رو عفریت تیز اور بھالے مار مار کر ان سے دل لگی کرتے جاتے ہیں۔ ریاکاروں کا ایک گروہ گزرتا ہے جو شاندار زرّی حلوں میں ملبوس ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ریاکاروں کے سب سے بڑے سردار تیبفاس کو جو بحالت انفعال اس جلتی ہوئی زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے۔ اور ہمیشہ پڑا رہے گا۔ اپنے بھاری قدموں سے بیدردی کے ساتھ کچلتے رہیں۔ میل بورغ کی ساتویں خندق سارقوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ عجیب الجھنوں اور پیچیدگیوں کے گورکھ دھندے میں مبتلا ہیں۔ ان کی ہئیت کذائی مسلسل عمل تناسخ کے ماتحت تغیر پذیر رہتی ہے۔ یعنی سانپ سے چور اور چور سے سانپ کی شکل میں۔

آٹھویں خندق کی مرتد روحیں ناقابل شناخت ہیں۔ کیونکہ انہی کی مجرمانہ ضمیروں کے شعلے اپنے درمیان ان کو اس طرح محصور و ملفوف کئے ہوئے ہیں کہ ناظرین کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل یہ ترغیب معصیت دینے والے آتشیں ہیولے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے خدا کی عطا کردہ عقل و فہم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بھولی بھالی ہستیوں کو غلط راہ پر چلایا۔ اور خود منفعت حاصل کی۔

پھر دھندلی فضاؤں اور شدید ترین سموم بخارات سے بچ بچا کر آخری خندق کے پاس پہنچتے ہیں۔ جو جہنم کے منجمد مرکزی غار سے پہلے واقع ہے۔ اس خندق میں ہر نوع کے امراض خبیثہ میں مبتلا حقائق کی تکذیب کرنے والے نظر آتے ہیں۔ ان کی مجسم روحیں زخموں سے نڈھال، داغ دھبوں سے بے رونق اور جگہ جگہ سے پھٹ جانے اور کٹ پڑ جانے کے باعث پژمردہ اور مرجھائی ہوئی جلد ایک ہولناک مگر عبرت انگیز منظر پیش کرتی ہے۔ ان میں جعلی سکہ ساز اور کیمیاگر شامل ہیں کیونکہ انہوں نے حقیقی اشیاء کی تکذیب کی تھی۔ اور وہ لوگ بھی جنہوں نے بری نیت سے دوسروں کی شکل و شباہت اختیار کی اور روپ بدلا۔ کیونکہ یہ افعال کی تکذیب تھی۔

الفاظ کی تکذیب کرنے والوں میں پو طیفار کی شریک حیات خصوصاً قابل ذکر ہے۔

جب ان سب کے زخموں اور خارش زدہ جلد میں ٹیس اٹھتی ہے اور کھجلی ہوتی ہے تو وہ کھچا کھچا کر تیز تیز ناخنوں سے جسم نوچنے لگتے ہیں۔ اور تکلیف کے عالم میں بھی اپنی ہرزہ سرائی سے باز نہیں رہتے۔ ایک دوسرے پر فقرے کستے اور نجاست اچھالتے ہیں۔ حد درجہ متاثر ہو کر ورجل ملامت کرتا ہے کہ ایسی ذلیل ہستیوں کی یاوہ گوئی سننے سے کیا حاصل۔ تو شرمندہ ہو کر پھر ساتھ ہو لیتا ہے۔

مرکز جہنم کا کنارہ ——— منجمد جھیل کوکائٹس ——— جہاں تمام جہنمی دریاؤں کا منبع اور کبھی ختم نہ ہونے والی سوت واقع ہے۔ مہیب دیو قامت ہستیوں سے پٹا پڑا ہے۔ جن کے سامنے کہر اور دھند کے باعث منظرین زیادہ طویل ہو کر نا چتے ہیں۔ یہ نمرود کی نمائش کے ولی ہیں۔ عظیم الجثہ لیکن عقل کے اندھے گویا عتیق کے یہ وہ عفریت ہیں جن کا ذکر انجیل مقدس میں ہے۔ اور جنہوں نے انسان کو قدرت اور خالق قدرت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دی تھی۔

منجمد غار غار کے بھی سلسلہ دار چار مدور حصے ہیں۔ یہاں شیطان اپنے پروں کے زیر سایہ جو پن چکی کے پنکھوں کی مانند ہیں۔ ہمیشہ اس سعی لا حاصل میں مصروف رہتا ہے کہ کسی قدر ابھر سکے۔ لیکن ہمیشہ اپنے یخ بستہ پروں سمیت زیادہ استقامت کے ساتھ دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ اسی جگہ دو رنگی چال والے دغاباز بھی ہیں۔ جنہوں نے بیدردی کے ساتھ دھوکے دیئے۔ اپنے رفقا کو قتل کیا۔ اہل وطن کا قلع قمع اور عزیز و اقارب کا استیصال کیا۔ اور اپنے مربیوں اور بہی خواہوں کے ساتھ غداری کی۔ ہر حلقے کا نام نوعیت گناہ کے اعتبار سے جداگانہ ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق آخری حلقہ یہودا کے نام پر جس نے عیسیٰ مسیح سے غداری کی تھی ——— "یہودیائی" ——— کہلاتا ہے۔

اور اب اگر دانتے امید کی نورانی دنیا میں جلوہ گر ہونا اور آفتاب صبح کے طلوع ہوتے وقت مطلوبہ پہاڑ کے رنگین دامن میں پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ آخری خوفناک مرحلہ طے کرلے۔ ورجل جو اس تمام دل ہلا دینے والی مسافت کے دوران میں اپنے ہم سفر شاعر کے تاثرات دماغی اور جذبات قلبی کا دقیق مطالعہ کرتا رہا ہے۔ دانتے کو اونچا اٹھا کر ڈھلوان راستے پر اترنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کی منزل آخر عرش اعلیٰ اور ستاروں کی نگری ہے۔

ورجل اور اس کا دوست پیکر عفریت کے گھنے بالوں میں سے ہو کر گزرتے ہوئے اس کے ابھرواں شانوں پر اترتے ہیں۔ اور پھر زیادہ نیچے اترتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دم دانتے محسوس کرتا ہے کہ وہ بجائے اترنے کے درحقیقت اوپر کی طرف چڑھ رہے ہیں۔ اور دنیائے ظلمات سے دور آفتاب کے انوار رحمت میں پہنچنے کے قریب ہیں۔

غزل

(از نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

کیا یہ سچ ہے کہ نئی طرز جفا سے پہلے
مشورے ہوتے ہیں خلوت میں حیا سے پہلے

گونجتا ہے دلِ مشتاق کے ہر ذرّے میں
نغمۂ جنبشِ لب تیری صدا سے پہلے

پھول اس حسن سے آلودۂ شبنم نہ ہوا
رنگ دیکھا ترے عارض کا حیا سے پہلے

غیرتِ عشق نے مارا کہ گلہ ایک طرف
لب پہ جاں آگئی اقرار وفا سے پہلے

عشق کا نام نہ لے، عشق کو بدنام نہ کر
درد کو درد بنا فکرِ دوا سے پہلے

روئیے اسکو بہت، موت ہے دراصل یہی
زندگی ختم جو ہوجائے قضا سے پہلے

گرنے والا کسی گرتے کو سنبھالے کیونکر
لغزشِ اشک بھی ہے لغزشِ پا سے پہلے

مسلکِ عشق کا رہرو جو نہیں کیا سمجھے
منزلِ ترک ہے تسلیم و رضا سے پہلے

اُف وہ بے درد جو بسمل کی تسلی کے لئے
عذر کرتا ہے نزاکت کا جفا سے پہلے

اب یہ اندازہ ہے محرومی و ناکامی کا
دل سے فریاد نکلتی ہے دعا سے پہلے

تو ہی رہبر ہو کہ اے بے خبری چل نکلا
کارواں شوق کا، آہنگ درا سے پہلے

کتنے ہی نغمے فقط ایک خموشی میں ہیں
کان مانوس تو ہوں اس کی نوا سے پہلے

میں اسے شعر سمجھتا ہی نہیں، جس میں اثر
حسنِ تخئیل نہ ہو، حسنِ ادا سے پہلے

افسانہ

اُور تمہیں بھی تو ——!

(از جناب سلطان احمد)

غضب کا اندھیرا تھا اور کڑاکے کی سردی۔ باورچی خانہ میں کہرا بھرا ہوا تھا۔ چولھے میں سے کچھ انگارے راکھ میں لیے جھانک رہے تھے۔ دیوار پر میلی سی لالٹین لٹکی ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں دیواروں پر نیلی سی پرچھائیاں تیر جاتی تھیں۔ وہیں کونے میں دو ننھے بہن بھائی کمبل میں سکڑے ہوئے تھے۔ ننھی آصف بھائی سے چمٹ گئی تھی۔ اور سلیم اپنے پتلے سے کوٹ میں تھر تھر کانپ رہا تھا —— بھوک بھی کیسی ظالم ہوتی ہے۔ جیسے کوئی ان کے معدوں کو اندر سے کھرچ رہا تھا۔

"ننھی! تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟" بھائی نے پوچھا

"اور بھیا تمہیں بھی تو لگ رہی ہے!" ننھی بہن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

وہ ذرا سا کمبل دونوں کے لئے ناکافی تھا۔ سر ڈھکتے تو پیر ننگے ہو جاتے اور پیر اندر کرتے تو سر کھل جاتا۔ ہوا سوئیوں کی طرح ہڈیوں میں چبھ رہی تھی۔

"ننھی! تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"اور بھیا، تمہیں بھی تو لگ رہی ہے!" ننھی آصف کی آنکھیں چھلک آئیں۔ وہ سسکاریاں لینے لگی۔ سلیم نے پیار سے آصف کو گود میں بھینچ لیا۔ "ارے روتی کیوں ہے پگلی؟" —— اس نے ننھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "راجے بیٹے بھی کہیں روتے ہیں! —— رومت!"

"بھیا! ہمیں امی یاد آتی ہیں —— سچ!" ننھی نے اسی طرح بلکتے ہوئے کہا۔ سلیم کو بھی امی کا ہنستا ہوا چہرہ یاد آگیا۔ اُن کی زندگی میں دونوں کیسے مزے سے رہتے تھے۔ پہننے کو ریشم کے اچھے اچھے کپڑے اور چمکیلی جوتیاں —— انہیں پہن کر دونوں شاہزادے سے لگتے تھے۔ اور چٹپٹے اور مزے مزے کے کھانے —— وہ کھاتے کھاتے تھک جاتے مگر امی کہتیں۔ "نہیں اور ——!" اماں نے ڈھیر کھلونے لا دیئے تھے۔ رنگ برنگی گڑیاں۔ چھکیلے غبارے۔ پوں پوں کرتی موٹریں اور لڑھکتے گھوڑے —— مگر جب سے وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں، تب سے تو آوا کا آوا ہی ان سے خلاف تھا۔ اباّ نے نئی شادی کرلی تھی۔ نئی امی بڑی بُری تھیں۔ جی بھر کر مارتیں۔ ان کی موٹی بیٹی زینت چٹکیاں بھرتی تھی۔ اور اباّ نے تو جیسے کانوں میں گھنگھنیاں بھرلی تھیں —— اُن کو بھول ہی گئے تھے۔ جھوٹا کھانا ملتا تھا اور پھٹے ہوئے کپڑے۔ دن بھر چاکروں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا پھر بھی دھتکار اور چانٹے۔ روز روز کے۔

دالان کے پردے چھوٹے ہوئے تھے۔ قمقمے روشن تھے۔ اور انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں۔ گدیلی مسہریوں پر اباّ، نئی امی اور اُن کی بیٹی زینت رضائیوں میں دبکے ہوئے تھے۔ اباّ کہہ رہے تھے "اف! کیسی سردی ہے!" نئی امی چائے کی پیالیوں پر پیالیاں چڑھا رہی تھیں اور کہتی تھیں "ہوا ہڈیوں میں گھسی جا رہی ہے۔ بھئی توبہ!" دوسری طرف موٹی زینت پلنگ سے نیچے ادھ لٹکی جھول رہی تھی۔ اور ناک کے باجے سے بجا رہی تھی —— خُر خُر!

اباّ کو جانے کیوں اور کیا خیال آیا کہ وہ پردہ ہٹا کر آنگن میں دیکھنے لگے۔ "آج سلیم اور آصف کو کھانا دیا؟ ——" وہ امی سے پوچھنے لگے۔

امی کے پتنگے میں جا کر لگی۔ جل ہی تو گئیں وہ —— اور بھڑک اُٹھیں "کیوں جی! تمہیں کبھی زینت کا بھی خیال آتا ہے اس طرح ——؟ جب سنو اُن ہی سنپولوں کا ذکر۔ پہلے مجھے ڈولی منگا دو، میکے چلی جاؤں گی تو چاہے کتنی ہی فکر کر لینا اپنے لاڈلوں کی —— میں تو اُن کی بیرن ہوں نا!" اور وہ رو بھی پڑیں دوپٹے میں منہ دیکر۔

میاں صاحب گھبرا گئے۔ "ارے بھئی! سنو تو" اور حقے کی نے دور پھینک کر وہ مسہری سے اُتر آئے "بھئی سمجھا تو ہوتا میرا کہنا۔ میں تو صرف اتنا پوچھ رہا تھا کہ بچوں کو کھانا ملا یا نہیں؟ تم جانو۔ بن ماں کے ہیں۔ بھولے بھالے چھوٹے ہی تو ہیں ابھی۔ اللہ کے دربار میں میری پکڑ نہ ہو۔ بس اسی سے ڈرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں مجھے چلا جانے دو۔ پھر خوب جاتے سے شد مارلینا۔ میں تو تمہاری دشمن ہوں نا!" انہوں نے سسکیوں کے درمیان اور اس زور سے ناک بجائی کہ اباّ اُچھل پڑے۔ پھر تو زینت نے بھی امی کی آواز میں آواز ملا کر دہاڑنا شروع کر دیا۔ میاں صاحب سنبھل گئے اور لگے خوشامد کرنے۔ ان کی آواز "بن" اونچی تانوں" میں اس طرح معلوم ہوتی تھی جیسے کسی مہرے کے میں کوئی ننھی سی بھیڑ۔

"ارے بھئی! سنو تو! معاف کردو قصور ہوا۔ اب چپ بھی ہو جاؤ۔ خدا کے لئے!" انہوں نے کتنا ہی کہا۔ اماں بی کچھ ڈھیلی پڑ گئیں۔ بولیں: "سن لو! اب اس گھر میں مجھ سے نہیں رہا جائیگا۔ یا تو تمہارے چہیتے بچے رہیں گے یا میں ۔۔۔۔ دونوں کھلکھلا کے ہنسا کرتے ہیں۔ کبھی ذرا سا کام بتا دو تو منہ پر پھٹ سے جواب رکھ دیتے ہیں۔ میری پھول سی بچی تو آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ آتے جاتے ایسی چٹکیاں لیتے ہیں کہ بلبلا اٹھتی ہے ننھی سی جان۔ دیکھتے نہیں ہو۔ اس کے اجلے بدن پر کیسے نیلے نیلے نشان سے ڈال دیئے ہیں۔" یہ کہکر انہوں نے ننھی کو آگے بڑھا دیا۔ وہ اپنی چندی چندی آنکھوں کو ملتے ہوئے بولی۔ "اوں ابا! سلیم اور چڑیل آصف ہمیں بہت مارتے ہیں روز!"

ابا کی ممتا ابل آئی۔ "واہ بھئی واہ! ہماری ننھی کو جو ماریگا ہم اسے ماریں گے۔ اب کے اگر وہ ستائیں تو تم ہمیں بتانا!" ننھی کو اپنی فرمائش یاد آگئی۔ وہ اچھل پڑی۔ "ابھی ہماری گیند؟ ۔۔۔۔ لائے تم؟"

ابا ہنستے ہوئے اٹھے اور ایک پیکٹ اٹھا لائے۔ بولے "لو بھئی اپنی گیند ۔۔۔۔!" اور انہوں نے ایک رنگ برنگی گیند نکال کر ننھی کو دی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ "اوہو! ہماری کیسی پیاری پیاری گیند ۔۔۔۔!" اور وہ گیند لیکر آنگن میں نکل گئی، کھیلتی ہوئی۔

ایک اچھال دیا۔ گیند اڑتی ہوئی بیٹھک کے شیشوں پر پڑی اور توڑتی ہوئی چق سے باورچی خانہ میں جا گری۔ بچے چونک گئے۔ "بھیا ۔۔۔۔؟" آصف نے کہا۔ "جانے کیا ہوا؟" سلیم نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"ہماری گیند کہاں ہے؟" موٹی زینت مچل رہی تھی۔

"کیسی گیند؟ ۔۔۔۔" سلیم نے پوچھا۔

"کہاں ہے گیند؟ ۔۔۔۔" آصف نے پوچھا۔

"بھو، موٹی ننھی مچلی۔ "ابھی ہماری گیند؟ ۔۔۔۔"

باورچی خانے میں گھپ اندھیرا تھا۔ بچے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ننھی اب بھی غل مچا رہی تھی کہ "ابھی ہماری گیند ۔۔۔۔!"

سلیم اور آصف نے اٹھ کر کمبل جھاڑا اور ادھر ادھر ڈھونڈا۔ جانے گیند کہاں پڑی تھی؟ ملی ہی نہیں۔ ننھی برابر غل مچا رہی تھی کہ "ہماری گیند دو۔ نہیں تو ہم ابھی ابا سے کہتے ہیں ۔۔۔۔" دونوں سہمے کھڑے تھے۔ وہ کیا جانیں کہ کہاں سے آئی تھی اور کہاں گئی، وہ گیند۔ زینت چیختی ہوئی دالان کی طرف بھاگی کہ "ہماری گیند ۔۔۔۔!"

امی بپھر گئیں۔ ابا غصہ سے کانپنے لگے اور چلائے "سلیم! آصف! یہاں آؤ ۔۔۔۔" بچے لرز گئے اور ٹھنڈے پسینے ان کی پیشانیوں پر رینگ آئے۔ ابا پھر گرجے "سنتے ہو؟ یا نہیں؟ یا میں خود آؤں؟" بچے ہڑبڑا کر سہمے کھڑے رہے۔ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرسکے۔ پھر تو ابا کے غصہ کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ حقہ پیچھے کو دھکیل دیا اور مٹھیاں بھینچ کر اٹھ کھڑے ہوئے وہ سر سے پیر تک کانپ رہے تھے۔ امی پیچھے پیچھے تھیں اور برابر بڑھاوے دے رہی تھیں۔

ابا باورچی خانہ کی طرف بڑھے اور بچوں کو بالوں سے پکڑ لیا اور چلائے "کہاں ہے ننھی کی گیند؟"

بچے کچھ بھی تو نہ بول سکے۔ ابا پھر چیخنے لگے۔ "ننھی کی گیند کہاں ہے؟ بولو ۔۔۔۔" بچے پھر بھی دم سادھے رہے۔ خوف زبانوں پر تالے ڈال دیتا ہے!

ابا کا چہرہ غصہ ۔۔۔۔ سرخ ہوگیا۔ مٹھیاں کس گئیں اور آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو لٹک آئے۔ انہوں نے جھپٹ کر دونوں معصوموں کو اپنی پسلیوں میں بھینچ لیا۔ اور گھسیٹتے ہوئے دالان میں لے آئے۔ بچے سسکیاں لینے لگے۔ ان کی پسلیاں چرمرا گئی تھیں۔ ابا پر جنون سوار تھا۔ انہوں نے بچوں کے کملائے ہوئے گالوں پر کئی طمانچے مارے۔ اور بھنچی ہوئی مٹھیوں سے خوب خوب مارا۔

امی بولیں: "ہے ہے! بگیہ بدذات ہیں یہ! میں کیا جھوٹ کہتی تھی تم سے ۔۔۔۔ کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے ڈھیل دی تو پھر یہ ہاتھوں سے نکل جائیں گے ۔۔۔۔ توبہ میری! ۔۔۔۔"

ننھی برابر مچل رہی تھی۔ "کہاں ہے میری گیند؟ ۔۔۔۔"

ابا پھر گرجے "کہاں ہے میری ننھی کی گیند؟ ۔۔۔۔ نکالو، نہیں تو ٹکڑے کردوں گا ابھی تم دونوں کے ۔۔۔۔"

بچے چپ کھڑے ٹک ٹک تکتے رہے۔ انہوں نے وہ منحوس گیند دیکھی ہوتی تو بتاتے بھی!

ابا غصہ سے دیوانے ہوگئے۔ ننھی سے بولے "لانا میری چھڑی ۔۔۔۔!"

ننھی دوڑ کر ابا کی لوہے کی موٹھ والی چھڑی اٹھا لائی۔ ابا نے مضبوطی سے پکڑ لی اور ہوا میں نچائی۔ شڑ شڑ!

بچے گھبرا کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ ان کی سسکاریاں نکل گئیں ۔۔۔۔ وہ لمبی سی خوفناک چھڑی!

ابا نے آنکھیں بند کرکے چھڑی والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور بچوں کے کانپتے ہوئے جسموں پر بارش سی کردی۔ بچے چیخنے اور چلانے ۔۔۔۔ بھاگے

میں، پھر تو راکر گر پڑے اور ہانپنے لگے۔ امی کا پتھر جیسا دل بھی سمٹ کر چھوٹا سا لگنے لگا —— اب کیا ہوگا! زینت جو بڑی دیر سے "گیند! —— گیند!" کی رٹ لگا رہی تھی ڈر کر امی کی گود میں چھپ گئی۔ اور ابا —— وہ ہانپ رہے تھے اور بچوں کو پیٹ رہے تھے اسی چھڑی سے۔

بچوں کی چیخیں مدھم ہوتی گئیں۔ اور آخر وہ گھگیا کر چپ ہو گئے۔ وہ ننھے ننھے جسم —— فرش پر اوندھے پڑے تھے۔ سنہری بال الجھے ہوئے اور پسلیاں چل رہی تھیں —— ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں مندی ہوئی —— !

ابا کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اب بھی چھڑی گھما رہے تھے۔ اور برابر دیوانہ وار چلا رہے تھے "گیند —— ؟ میری ننھی کی گیند ؟" وہ تھک گئے تو انہوں نے چھڑی پھینک دی اور اور ہانپتے ہوئے مسہری پر گر پڑے۔ پسینوں سے پیشانی تر تھی اور رال منہ سے بہہ کر ڈاڑھی میں جذب ہو رہی تھی۔ امی آنکھیں پھاڑے کونے میں کھڑی تھیں اور ننھی —— سہمی ہوئی نظروں سے امی کی گود میں سے جھانک رہی تھی —— ٹک ٹک۔

ابا پھر کچھ سوچ کر اٹھے۔ انہوں نے ایک سہمی ہوئی نظر بچوں پر ڈالی۔ اور فرش پر لوٹتے ہوئے جسموں پر جھک گئے۔ انہوں نے بے حس و حرکت بچوں کے جھولتے ہوئے جسم پکڑ کر سیدھے کھڑے کر دیئے۔ آصف کے منہ سے خون کی پتلی سی دھار نکل کر باچھوں میں رینگ رہی تھی نیلی نیلی آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔ اور سر ڈھلک کر نیچے جھکا پڑتا تھا۔ ننھا سلیم ابا کی باہوں میں ہر پچی ہوئی بطخ کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس کی کنپٹی پھٹ گئی تھی۔ اور ننھے ننھے لب پھڑک پھڑک کر رہے تھے۔ ہانپ رہا تھا۔ ابا وحشیوں کی طرح انہیں سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر بچے گر پڑتے تھے۔

سلیم نے آنکھیں کھولیں —— اداس اور پھیکی پھیکی سی! اور ٹوٹتے ہوئے سانسوں میں بولا "ننھی! تمہیں بہت تکلیف تو نہیں ہو رہی ؟"

"اور بیٹا، تمہیں بھی تو ——" اس سے زیادہ آصف کچھ نہ کہہ سکی۔

آجا!

(از جناب جاں نثار اختر)

اے صدرِ انجمن ماہ اے مری انجم — ضیائے طالعِ اختر لئے ہوئے آجا
بہارِ نَو مری تاریک وادیوں میں کبھی — چراغِ لالۂ احمر لئے ہوئے آجا
شگفتگی کو ترستا ہے زندگی کا چمن — جبیں پہ موجِ گُلِ تر لئے ہوئے آجا
صنم کدے کے دریچے میں انکھڑیاں تیری — نظر میں عشوۂ کافر لئے ہوئے آجا
رہے تو کوئی رہے تشنہ لب بھلا کب تک — لبوں میں موجۂ کوثر لئے ہوئے آجا
جھکائے عارضِ گلفام پر حسیں پلکیں — ہر ایک پھول پہ نشتر لئے ہوئے آجا
اِدھر بھی موڑ عنانِ تبسم پیہم — اِدھر بھی بارشِ گوہر لئے ہوئے آجا
تجھے قسم ہے تری پُر جمال بانہوں کی — گلے کے واسطے خنجر لئے ہوئے آجا
ڈبو دے کشتیِ دل نُور کے تلاطم میں — تجلیوں کا سمندر لئے ہوئے آجا
لگا دے آگ مری ظلمتوں کے خرمن میں — شرار و برق کے تیور لئے ہوئے آجا
کبھی امید کے ظلمت فزا دریچوں میں — طلوعِ صبح کا منظر لئے ہوئے آجا
نہ پھول میں کوئی خوشبو نہ شمع میں کوئی نور — ہر ایک شے کا مقدر لئے ہوئے آجا

ترے بغیر تو سُونا پڑا ہے میخانہ
کبھی تو شیشہ و ساغر لئے ہوئے آجا

بچپن کی تربیت

(از واحدی)

اسکول اور کالج چھوڑنے کے بعد تعلیم ختم نہیں ہو جاتی۔ تعلیم مدت العمر جاری رہتی ہے۔ اسی طرح تربیت کا زمانہ بھی محدود نہیں ہے۔ مرتے دم تک انسان تربیت حاصل کرتا ہے۔ بالارادہ یا بے ارادہ۔

ایک عقلمند کا قول ہے کہ "انسان کے متعلق اس کے مرنے سے پہلے رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔" ہم مسلمان "خاتمہ بالخیر" ہونے کی دعا مانگا کرتے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ مرتے وقت ہم ویسے ہوں جیسا ہمیں بحیثیت انسان ہونا چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ ساری عمر انسان اچھا رہے اور آخر میں برا بن جائے۔ اور یہ بھی خدا کی مہربانی سے بعید نہیں کہ عمر بھر انسان برائیوں میں گھرا رہے اور بڑھاپے میں اسکی آنکھیں کھل جائیں۔ انسان کے طور طریقوں، انسان کی عادات اور انسان کی طبیعت پر عمر کا اثر پڑتا ہے۔ تجربوں کا اثر پڑتا ہے۔ حالات و حوادث کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ موثر جو چیز ہے وہ بچپن کی تربیت ہے۔

میرے ایک دوست ہیں جنہوں نے انگلستان میں تعلیم کی تکمیل کی ہے۔ اب تو عمر، تجربات اور حالات و حوادث انہیں بہت بدل چکے ہیں۔ لیکن جوانی میں بالکل "صاحب" تھے۔ غور و فکر کے اعتبار سے بالکل انگریز۔ تاہم تیسری تاریخ کا چاند دیکھ لیتے تھے تو مہینہ بھر پریشان رہتے تھے۔ تیسری تاریخ کے چاند کو دیکھنا ہماری عورتوں میں خدا معلوم کیوں منحوس مشہور ہو گیا ہے۔ انگریزوں کے ہاں کے توہمات میں سے یہ نہیں ہے۔

میرے دوست نے بچپن میں اپنی ماں، خالہ یا پھوپی سے سن لیا تھا کہ تیسری تاریخ کا چاند نہیں دیکھا کرتے۔ لہذا کبھی بھولے سے میرے دوست کی تیسری تاریخ کے چاند پر نظر پڑ جاتی ہے تو وہ اسے منحوس مانتے ہی نہیں ان پر اس کے نحس پن کا واقعی اثر پڑتا ہے۔ ایک اور دوست ہیں جو پہلے ورثہ نشین مولوی تھے۔ پھر مولوی فاضل۔ ایف اے۔ بی۔ اے اور ایم اے کر کے کسی کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ اکثر دیکھا ہے کہ انگریزی تعلیم پہلے اور بعد میں دینی تعلیم حاصل ہو تو دین غالب آتا ہے اور دینی تعلیم پہلے ہوئی ہو اور انگریزی تعلیم بعد میں تو انگریزیت قبضہ کر لیتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب پر انگریزیت بھی دہریت غالب ہو گئی۔ مگر پروفیسر صاحب بچپن سے نماز کے عادی تھے۔ نماز کسی طرح نہیں چھٹتی۔ نماز نہ پڑھیں تو بے چین رہتے ہیں۔ خدا کے قائل نہیں۔ لیکن روزانہ پانچ دفعہ خدا کے حضور سجدے ضرور ادا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا مذہب عرب میں پیدا ہوا۔ عرب ایسا ملک ہے جہاں پانی کمیاب ہے۔ ہندوستان جیسے دریاؤں کے ملک میں آ کر بھی مسلمانوں کے اندر پانی کی قدر باقی رہی۔ چالیس پینتالیس برس قبل تک پانی ضائع کرنا مسلمانان ہند کے نزدیک گناہ تھا۔ اور جن مسلمان گھروں میں ہنوز نل نہیں ہیں وہاں شاید اب بھی گناہ ہو۔ لیکن جن مسلمانوں نے نل لے لئے ہیں وہ آہستہ آہستہ پانی بہانے کے گناہ و ثواب کو بھول گئے۔ البتہ نلوں پر میٹر لگنے کے بعد فقط مسلمانوں کے نہیں ہندوستان کی پانی بہانے والی قوموں کے نل بھی فوراً درست ہو جاتے ہیں۔ اور جن ہندوستانیوں نے ان ملکوں کو دیکھا ہے جہاں نلوں کا رواج ہندوستان کی نسبت زیادہ ہے ہے۔ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ سڑکوں کے نل رستے اور کہار چھوڑ کر چل دیں۔ وہ ایسے نلوں کو بند کر دینا اتنا ہی ثواب سمجھتے ہیں جتنا کسی بوجھ اٹھانے والے مزدور کا بوجھ اٹھوا دینا ثواب ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نلوں کا پانی ان کی قوم، ان کے بھائیوں، ان کے شہر والوں کے روپے سے اور ان کی قوم، ان کے بھائیوں اور ان کے شہر والوں کے واسطے ضرورت کے لائق، ایک خاص مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔ وہ ضائع ہوگا تو سارے شہر کو نقصان پہنچے گا۔ سارے شہر کو تکلیف پہنچے گی۔ اور شہر والوں کے ساتھ وہ بھی نقصان اور تکلیف اٹھائیں گے۔ ان باتوں کے باوجود آپ نے ان پڑھے آدمیوں کو تو شاید مزدور کا بوجھ اٹھواتے یا سڑک کا بہتا ہوا نل بند کرتے دیکھا ہو۔ لیکن "سوک سینس" "سوک سینس" پکارنے والوں میں یہ جرات نہیں ہے۔ اس لئے کہ انگلستان جا کر تعلیم حاصل کرنے والا غریب گھر کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اور انگلستان جانے سے بہت پہلے اس کے امیر ماں باپ نے اس میں اک قسم کا احساس بھر دیا ہے کہ وہ مزدور کا بوجھ اٹھوانے اور سڑک کا نل بند کرنے کو گھٹیا اور شان سے گرا ہوا کام تصور کرتا ہے۔ نئے احساسات بچپن کے دلنشیں احساسات مٹا نہیں سکتے۔

آج کل دلی میں راشننگ کا چرچا ہے۔ آپ کسی سے پوچھئے کہ یہی افراط کی تو بات اور تھی۔ اس وقت مال لانے لیجانے کی دقت ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے صوبے نفسی نفسی میں مبتلا ہیں۔ اور صوبہ دہلی کو جو اناج وغیرہ کے معاملہ میں ان کا محتاج ہے ناپ تول کر اناج دے رہے ہیں۔ یہ اناج وغیرہ دلی کے کسی خاص طبقہ کیلئے مخصوص کر دیا جائے یا دلی کی ساری آبادی میں حصہ رسد بانٹا جائے؟ کس سے پوچھئے۔

جواب دیگا۔ "حقدار کو حقدار ملنا چاہیئے"۔ لیکن عمل اس کا قول کے مطابق نہیں ہوگا۔ اسے اگر مقدرت ہے تو وہ حقدار کو تقسیم یعنی راشننگ کے نفاذ سے پہلے ہی اپنے قول کے خلاف عمل کر رہا ہے اور موقع ملا تو انشاء اللہ نفاذ کے بعد بھی کریگا۔ اور برائی نہ جان کر کریگا۔ اس واسطے کہ اسے بچپن سے ایسا کرنے کی عادت ہے۔

اچھا اب یہ سوچئے کہ ہم اپنے بچوں کی وہ تربیت کس طرح کریں جس سے ہمارے بچے ہم سے بہتر انسان بن جائیں۔ یہ ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے۔ یاد رکھئے یہ سخت تکلیف اٹھائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کے سامنے اپنا نمونہ پیش کرنا پڑیگا۔ حقیقی نمونہ نہیں پیش کر سکتے تو بناوٹی مصنوعی نمونہ پیش کیجئے لیکن اچھا نمونہ پیش کیجئے۔ آپ ہی کے اعمال و افعال کا آپ کے بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے نیک اور شریف اٹھیں۔ تمیزدار اور با اخلاق ہوں۔ دنیا میں عزت اور عقبیٰ میں خوشنودی خالق حاصل کرنے کے کام کریں۔ تو آپ خود ویسے بن جایئے۔ یہ آسان بات نہیں ہے۔ لیکن اولاد کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی بھی کوشش کیجئے اور طبیعت پر زبردستی اور جبر کرکے اچھے بنئے۔

ضرب المثل ہے "تخم تاثیر صحبت کا اثر"۔ بچہ کی تربیت حمل قرار پانے کے وقت سے شروع ہو جاتی ہے۔ استقرار حمل کے ساتھ ساتھ ماں باپ کے خیالات وجذبات کا بھی استقرار ہوتا ہے۔ دوران حمل میں ماں بچہ کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔ اور پیدائش کے بعد ماں سے زیادہ بچہ کو کسی کی صحبت نہیں ملتی۔ باپ کا نمبر کہیں دور جا کر آتا ہے۔ اور استاد کا بہت دور۔ دوستوں کی صحبت میں بھی انسان بنتا اور بگڑتا ہے۔ لیکن دوستوں کی صحبت سے بننے اور بگڑنے کی بنیاد ماں باپ اور استاد رکھتے ہیں۔ دوستوں کی صحبت سے بننے اور بگڑنے کی صلاحیت کا بیج ماں باپ اور استاد بوتے ہیں ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

عمارتِ تربیت کے ابتدائی ردے ماں کے ہاتھ سے رکھے جاتے ہیں۔

اس وقت کی ماؤں ہی کے ہاتھ میں ہے کہ خوش بیٹیاں چھوڑ جائیں۔ ایسی بیٹیاں چھوڑیں جو شوہروں کے سینہ سے سینہ ملا کر نہیں غیرمردوں کے سینہ سے سینہ ملا کر ناچنے میں نہ جھجکیں۔

سرسید احمد۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مولانا آزاد۔ منشی ذکاء اللہ مولانا شبلی۔ حکیم اجمل خاں۔ مولانا ابوالکلام۔ مولانا راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کی مائیں تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ اور غالباً مسٹر تلک۔ مسٹر گوکھلے۔ مہاتما گاندھی پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت مدن موہن مالوی کی مائیں بھی آج کل کی ماؤں کی طرح پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ دیکھنا ہے کہ آج کل کی مائیں کیسے بیٹے اپنے ملک کو دیتی ہیں۔ ہندوستان کا مستقبل تھوڑا بہت درست ہو سکتا ہے تو ماؤں کے ہاتھ سے ہو سکتا ہے۔ ماں کی عقل میں آ جائے تو ... اولاد کیلئے نمونہ بننے کی زبردستی اپنے نفس پر کر سکتی ہے۔

"گیت"

(از جناب نخشب جارچوی)

دل میں کپٹ اور درس کی آشا کون تجھے سمجھائے
کون تجھے سمجھائے رے مورکھ لون تجھے سمجھائے

من کا بھیدی تیرو پ نہ دھارے کبھی نہ درش دکھائے
کبھی نہ درس دکھائے پیتم کبھی نہ درس دکھائے

ریت یہ اس دنیا کی نہ جانا دکھیوں کے ہردے نہ دکھانا
پاپی کے ہردے کا درپن دھندلا پڑتا جائے
دھندلا پڑتا جائے درپن دھندلا پڑتا جائے

کس کی مسجد کیسا شوالا پریت ہے من مندر کا اجالا
جس کو پی کی لگن لگی ہو کہیں نہ آئے جائے
کہیں نہ آئے جائے پریمی کہیں نہ آئے جائے

تتلی چنچل، پھول ہیں سندر اس کا جلوہ سب کے اندر
جہاں بھی کوئی دیکھنا چاہے وہیں پہ درس دکھائے
وہیں پہ درس دکھائے پیتم وہیں پہ درس دکھائے

ہم نوا!

(از جناب ایم۔ اسلم)

میری موت کا غم! تجھے؟ افسوس!
کیا تو اس لئے مغموم ہے کہ میں پستی سے نکل کر بلندی پہ جا پہنچا ہوں۔ یا تجھے یہ غم ہے کہ اب رُوح کو قرار ہے۔ اور سُود و زیاں کی فکر سے آزاد۔
بھائی! ؎
پہنچی وہاں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا!

بوٹا جب سوکھ جاتا ہے تو باغبان اسے چمن سے نکال دیتا ہے۔ دُنیا کا یہی دستور ہے
ایک فصل جب کٹ جاتی ہے تو دوسری کھیتی نظر آتی ہے۔ یہی آئینِ جہاں ہے
رُوح جب خاک سے آزاد ہوتی ہے تو پھر بھول کر بھی اُدھر کا رُخ نہیں کرتی۔ قدرت کا قانون یہی ہے۔ لیکن!
محبت اِس نظام کی پابند نہیں

یہ تو سچ ہے کہ وہ جام جس میں کبھی محبت کی مے چھلکتی تھی۔ ٹوٹ چکا۔ لیکن وہ بادہ خواری کیا جو بے پئے مدہوش نہ ہو۔

دل محبت کے "سم سم" سے دلِ بہلاتا ہے۔ اگر تیرے دل میں میری یاد ہے تو پھر قرب یا دُوری کا سوال ہی کیا؟ ذکر ہی کیوں۔

جس طرح میری یاد تجھے بیتاب رکھتی ہے۔ تو یقین مان کہ میں بھی ؎
دادیٔ قرار میں بھی تیرے لئے بیقرار ہوں

کھلونا جب ٹوٹ جاتا۔
تو بچہ روتا ہے۔ یہی اُس کی فطرت ہے۔

کتاب السلف (مسلسل)

از علامہ سیماب اکبرآبادی

(سلسلہ کے لئے "ادیب" فروری ۱۹۴۴ء ملاحظہ فرمائیں)

میر غلام حسن حسنؔ دہلوی

نام و نسب غلام حسن نام۔ حسنؔ تخلص۔ دہلی کے رہنے والے۔ پرانی دلّی میں سید واڑہ ایک محلہ تھا۔ سنہ ۱۱۴۲ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے اور میر ببر علی انیس کے دادا تھے۔

شکل و شمائل میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ خندہ جبین۔ شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع تھے۔ جسم جامہ زیب تھا۔ بانکی ٹوپی تن زیب کا انگرکھا پہنتے تھے۔ بھنسی ہوئی آستینیں اور کمر سے دوپٹہ بندھا رہتا تھا۔

تعلیم فارسی عربی کی تعلیم قریب تکمیل تھی۔ شعر کی اصلاح پہلے اپنے والد سے لی۔ پھر خواجہ میر دردؔ سے۔ لکھنؤ پہنچ کر میر ضیاء الدین ضیاؔ کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سوداؔ کو بھی غزل دکھائی ——— اتباع عمر بھر میر و سوداؔ کا کرتے رہے۔

سوانح حیات ان کے بزرگ ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ ۱۲، ۱۳ برس کی عمر ہیں اور بروایات بعض عالم شباب میں اپنے باپ کے ساتھ فیض آباد گئے۔ اور نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی خدمت میں رہے۔ کچھ مدت وہاں رہکر لکھنؤ میں آ رہے۔

تصانیف ایک دیوان اور گیارہ مثنویاں ان کی تصنیف سے ہیں۔ مگر مثنویوں میں سحر البیان نے سب سے زیادہ قبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد مثنوی گلزار ارم بھی مشہور ہوئی۔ سب ملا کر تقریباً دس ہزار اشعار کا سرمایہ چھوڑا۔ افسوس کہ ان کا دیوان اب دستیاب نہیں۔ ایک تذکرہ "شعرائے اردو" بھی آپ کی تصنیف سے ہے۔

اعتراف "میر حسنؔ فلسفۂ انسانی کا سب سے بڑا عالم ہے۔ جو ہندوستان میں گذرا ہے" (ڈاکٹر نیلن)

اولاد آپ کی اولاد ذکور میں صرف میر مستحسن خلیقؔ مشہور ہیں جو میر انیسؔ لکھنوی کے باپ تھے۔

وفات محرم سنہ ۱۲۰۱ھ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ مفتی گنج میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے نیچے دفن ہوئے۔ مصحفیؔ امروہوی نے تاریخ وفات لکھی ہے۔

چوں حسنؔ آں بلبل خوش داستاں
رُو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت

بسکہ شیریں بود نطقش مصحفیؔ
"شاعر شیریں زباں" تاریخ یافت

۱۲۰۱ھ

میر حسنؔ کے کلام پر رائے میر حسنؔ کا دیوان باوجود کوشش اب تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن انکی جو چند غزلیں دیکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصیدہ گوئی اور غزل گوئی میں کوئی امتیازی شان نہ رکھتے تھے۔ متروکات ان کے یہاں زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ خیالات اچھے ہیں مگر زیادہ بلند نہیں۔ زبان سلجھی ہوئی ہے۔ مگر میرؔ اور سوداؔ کی سی حلاوت نہیں پائی جاتی جو کلام ان کا نظر سے گذرا اسی میں سے بطور انتخاب کچھ پیش کرتا ہوں۔

پوشیدہ رہا یوں ہی یہ راز حرم و دیر
معلوم ہوا بھید یہاں کا نہ وہاں کا

جس عالم ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ
آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم ہے خزاں کا

رو رو کے کیا ابتر سب کام مرے دل کا
کھویا مری آنکھوں نے آرام مرے دل کا

صیاد کی مرضی ہے کہ اب گل کی ہوس میں
نالے نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں

نہ ہم ہوش میں مے پرستی سے گذرے
ہوئے جبکہ بے ہوش مستی سے گذرے

ہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
ہم اے زندگی ایسی ہستی سے گذرے

عیش و وصال و صحبت یاراں فراغ دل
اس ایک جان کے لئے کیا کیا نہ چاہیے

سرگرم سوز عشق رہے ہے مثال شمع
تن گھل گیا ہے اور پگھلتی نہیں زباں

یہ کیا عشق آفت اٹھانے لگا
مرے دل کو مجھ سے چھڑانے لگا

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا
کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا

گنہ چشم خوں بار کا کچھ نہیں
مرا دل ہی مجھ کو ڈبانے لگا

نہیں مجھ کو دُشمن سے شکوہ حسنؔ
مرا دوست مجھ کو ستانے لگا

میر حسن کی مثنویاں

میر حسن دہلوی کی مثنویوں میں "سحر البیان" کی بہت دھوم ہے۔ وہ صرف اِس لئے کہ قصہ دلچسپ اور مسلسل ہے۔ زبان بیگماتی ہے۔ تحلیل نفسی سے کام لیا گیا ہے۔ مناظر کی تصویر۔ واقعات کی تشریح۔ فصاحت و بلاغت۔ مناسب الفاظ۔ مربوط کلام رعایت لفظی تشبیہہ و استعارہ۔ مبالغہ۔ غرض کہ فرضی داستان میں جو کچھ ہونا چاہیئے وہ سب اس مثنوی میں موجود ہے۔ لیکن بعض مورخین کا یہ کہنا کہ "سحر البیان" کے سامنے میر تقی میرؔ۔ مرزا سوداؔ اور میر اثرؔ جیسے شہنشاہانِ سخن کی مثنویوں نے بھی فروغ نہ پایا۔ انتہائی مبالغہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات کے تسلسل اور زبان و محاورات کے رکھ رکھاؤ نے "مثنوی سحر البیان" میں یک گونہ دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ مگر متواتر متروک اور قدیم الفاظ کی بھرمار موجودہ دور کے ناقد کو اس مثنوی کے متعلق اچھی رائے دینے سے روک دیتی ہے۔

قدیم مثنویوں میں گلزار نسیم نے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ نہ اُس میں متروک اور قدیم الفاظ ہیں۔ نہ تعقید ہے۔ بلکہ صنعت ایجاز و اختصار نے مثنوی میں جان پیدا کر دی ہے۔ اُس کے بعد نواب مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنوی "زہر عشق" اپنے رومانی انداز اور زبان کی حلاوت نیز سوز و گداز کے اعتبار سے دوسرا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد فصیح الملک نواب میرزا خاں داغؔ دہلوی کی مثنوی "فریادِ داغ" کا درجہ ہر لحاظ سے ممتاز ہے۔ اور اس مثنوی پر آ کر مثنوی کا رواج ہی گویا ختم ہو جاتا ہے۔

ان مثنویوں کے سامنے "سحر البیان" کی کوئی خاص حیثیت نہیں رہتی۔ صرف اس کا قدیم ہونا ہی اس کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ اور یہ کہ اس مثنوی سے میر حسن کا نام زندہ ہے۔

میر حسن کی دوسری مثنوی "گلزار ارم" "سحر البیان" سے بھی زیادہ کم درجہ ہے۔ طویل جلی عنوانوں کے علاوہ اس میں اشعار بھی کم ہیں۔ حجم صرف ۲۸ صفحات ہے۔ اس میں بھی عنوان اس قدر طویل ہیں کہ انہیں نکال کر مثنوی کا حجم بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک عنوان ہے:-

"در توصیف بازار نگین۔ نمونۂ بہشت بریں۔ و بیان دکا کین مینو آئین" "کہ صد ہزاراں مشتری زلیخا دارد در یک پلۂ میزان نشستہ یوسف" "طفلفان پیش ہر دوکان چوں مصریانِ تماشا بیں دست بستہ از ہر طرف" "صدائے سودا فروشاں چوں الحانِ داؤدی می آید کہ دل را مے ربایند" "یا نغمۂ طوطی و ہزار است کہ ہوش مے افزاید۔"

اِدھر کو جوہری اُدھر کو بزاز
اِدھر صراف اور اُدھر طلاساز

اُردو مثنوی کی نازک بحر دیکھئے اور اُس پر فارسی کا یہ طرۂ طرار با۔

ہمیں ان مثنویوں سے صرف اس لئے محبت ہے کہ یہ قدیم ہیں۔ اور میر حسن دہلوی کی سب سے بڑی عظمت جو ہماری نگاہ اور ہمارے دل میں ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی نسل سے میر انیس لکھنوی جیسا شاعر پیدا ہوا۔ جس نے مرثیہ گوئی کی صنف محفوظ کو پامال کر کے میدانِ سخن میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اور اپنے ساتھ اپنے دادا کا نام بھی ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔

(باقی باقی)

ڈرامہ

گذشتہ سے پیوستہ

یہ دیس ہمارا ـــــ ہے!

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

چوتھا ایکٹ ـــــ پہلا سین

نواب صاحب کے مکان کا صحن۔ بیگم صاحبہ چارپائی پر بیٹھی ہیں۔ نواب صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے ہیں۔ ملازمہ بیگم صاحبہ کو پنکھا جھل رہی ہے نوکر سامنے کھڑا ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ (ملازم سے) آج شام کو دس مہمانوں کی دعوت ہے۔ بہترین قسم کا کھانا تیار ہونا چاہیئے۔

ملازم :۔ بہت اچھا سرکار۔

بیگم صاحبہ :۔ اور سنو ـــــ مکان کی جلد سے جلد صفائی کراؤ۔

ملازم :۔ بہت اچھا سرکار

(چلا جاتا ہے)

نواب صاحب :۔ (بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے) تمہارے صاحبزادے کو تشریف لائے ہوئے آج کتنے دن ہو گئے۔

بیگم صاحبہ :۔ تین دن سے تو اس کا بالکل ہی پتہ نہیں۔ پہلے تو یہ بھی تھا کہ دن میں ایک دو دفعہ صورت دکھائی دے جاتی تھی۔ لیکن اب رفتہ رفتہ وہ بھی ختم ہو گیا۔

نواب صاحب :۔ جو جی چاہے کرتے پھرو۔ ہم سے تو کوئی مطلب واسطہ نہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ اس کو ماں باپ کی فکر ہی کب ہے۔ اس کو تو ہر وقت قوم قوم پڑی رہتی ہے۔

نواب صاحب :۔ بڑی قوم کی خدمت کر رہے ہیں ـــــ ارے پہلے تو ماں باپ کا حق تھا۔ پھر بعد میں قوم کی خدمت۔

(نواب صاحب اٹھکر ٹہلنے لگتے ہیں ـــــ پھر بیٹھ جاتے ہیں)

بیگم صاحبہ :۔ اتنا بڑا ہو گیا ... اس کا بچپن نہیں جاتا۔

نواب صاحب :۔ [illegible] تباہ کر دیا اگر محمود نہ ہوتا تو میری زندگی سکون سے گذر جاتی ـــــ

بیگم صاحبہ :۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑکے کو کوسنے لگتے ہو۔

نواب صاحب :۔ کوسنے کی کیا بات ہے۔ تمہاری تو محبت پاگل ہے تمہاری محبت ہی نے اس کو اس قدر سر چڑھا رکھا ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔

نواب صاحب :۔ عاقبت میں ٹھیک ہوگا ـــــ اس کی ان حرکتوں نے تو مجھے اتنا ذلیل کروایا۔

بیگم صاحبہ :۔ کیا ـــــ کیسی ذلت ؟

نواب صاحب :۔ کلیم کی بہو نے یہ کہا کہ اگر محمود کا یہی حال رہا تو ہم نجمہ کی شادی دوسری جگہ کرینگے۔ ہم اپنی لڑکی کی قسمت کیوں خراب کریں۔

بیگم صاحبہ :۔ (کچھ گھبرا کر) تم سے کس نے کہا ؟

نواب صاحب :۔ میرے سامنے کہا۔

بیگم صاحبہ :۔ اچھا ـــــ (کچھ سوچکر) مجھے تو یقین نہیں آتا۔ نجمہ تو میری "ٹھکری کی مانگ" ہے۔ میں بھلا دوسری جگہ کیا ہونے دونگی۔

نواب صاحب :۔ جب ہوگا تو سب "مانگ" رکھی رہ جائیگی ـــــ تم پہلے اپنے بیٹے ہی کو ٹھیک کرلو۔ بعد میں کسی دوسرے کو سمجھانا۔

(بیگم صاحبہ سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہیں)

بیگم صاحبہ :۔ (خود سے) آج میں بہو کے پاس جاؤنگی۔

(نواب صاحب ملازم کو آواز دیتے ہیں)

نواب صاحب :۔ عبدل ـــــ ! عبدل ـــــ !!

عبدل :۔ جی حضور

(عبدل قریب آتا ہے)

نواب صاحب :۔ سب مکانوں کا کرایہ وصول ہو گیا ؟

عبدل :۔ سرکار بڑی مشکل سے آٹھ مکانوں کا کرایہ وصول ہوا ہے

نواب صاحب :۔ اور مکانوں کا کیوں نہیں ملا ؟

عبدل :۔ حضور اور تو مل ہی جائیگا۔ پر تین مکانوں کا کرایہ ... دکھائی نہیں دیتا ـــــ

نواب صاحب :۔ کیوں ؟

عبدل :۔ حضور ایک کرایہ دار کو تو میں نے کل نکال دیا۔ ... تھا کہ ہم کہاں سے دیں۔ ہمیں تو کھانے تک کو نہیں ...

نواب صاحب :۔ اچھا کیا سالے کو نکال دیا۔ اس کا کوئی سامان تو نہیں رہ گیا۔
عبدل :۔ نہیں سرکار
نواب صاحب :۔ اور نمبر ۹ والے مکان میں کون ہے ؟
عبدل :۔ سرکار اس میں ایک کھیت مزدور رہتا ہے ۔
نواب صاحب :۔ اس نے کب سے کرایہ نہیں دیا ؟
عبدل :۔ تین مہینے سے ایک پیسہ بھی نہیں وصول ہوا۔
نواب صاحب :۔ تم نے کہا نہیں ؟
عبدل :۔ حضور وہ کسی وقت ملتا ہی نہیں ۔
نواب صاحب :۔ اس کے بیوی بچے تو رہتے ہی ہونگے ۔
عبدل :۔ نہیں حضور۔ سب لوگ دن بھر بھیک مانگتے ہیں۔
نواب صاحب :۔ (غصہ سے) سالے کھیت مزدور ہو کر بھیک مانگتے ہیں —
اس کا سب سامان نکال کر پھینک دو —— جاؤ ——
(عبدل جانے لگتا ہے)

نواب صاحب :۔ عبدل سنو !
عبدل :۔ کیا ہے سرکار ؟
نواب صاحب :۔ مکان میں اس کا کتنا سامان ہوگا ؟
عبدل :۔ حضور بہت غریب آدمی ہے ۔ اس کے سامان ہی کیا :
نواب صاحب :۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہوگا ؟
عبدل :۔ حضور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی ہے ۔ کچھ پرانے کپڑے ہیں۔ ایک دو تھالی اور مٹی کے برتن ہیں ۔
نواب صاحب :۔ بس —— ؟
عبدل :۔ اور کیا ہوتا حضور۔ وہ تو خود ہی بھیک مانگتا ہے ۔ اور آج کل تو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔
نواب صاحب :۔ کھڑے کیا دیکھ رہے ہو —— اس کا سامان نکالکر سڑک پر پھینک دو اور اپنا تالا لگا دو۔
عبدل :۔ حضور بہت غریب آدمی ہے۔ کوئی اٹھا کر لے جائیگا ۔ میں اس سے رات کو کہہ دونگا۔
نواب صاحب :۔ (بگڑ کر) میں کہتا ہوں کہ فوراً اس بدمعاش کا سامان نکال کر پھینک دو —— چلو ——
(عبدل خاموشی سے سر جھکائے چلا جاتا ہے)
(نواب صاحب اندر چلے جاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کسی چارپائی پر بیٹھی سر جھکائے بیٹھی کچھ

سوچ رہی ہیں)
بیگم صاحبہ :۔ (خود سے) محمود کہاں چلا گیا۔ آج تین دن ہو گئے ۔ نہ جانے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ۔ ماں باپ کی ممتا کا اولاد کو کچھ بھی احساس نہیں ہوتا وہ کیا جانے کہ ہمارے دل میں اس کی کتنی محبت ہے۔ وہ یہی سوچتا ہے کہ ماں دشمن ہے اس کو محبت نہیں ۔
آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے۔ محمود داخل ہوتا ہے)
محمود :۔ اماں —— !
بیگم صاحبہ :۔ (سر اٹھا کر دیکھتی ہیں) محمود ! (رونے لگتی ہیں اور محمود کو پیار کرکے اپنے پاس بٹھا لیتی ہیں)
محمود :۔ ارے اماں جی ! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں ؟
بیگم صاحبہ :۔ محمود تم تین دن سے کہاں غائب تھے ؟
محمود :۔ اماں جی ! —— اس دوران میں مجھے ایک منٹ کا وقت نہیں ملا حتیٰ کہ میں تین دن سے سویا تک نہیں ۔
بیگم صاحبہ :۔ (اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے) محمود میں نے تم کو اس دن کے لئے پالا تھا ——
محمود :۔ اماں آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ میں اپنے ملک کے لئے رات کی نیند میں حرام کر دیتا ہوں ۔ میں اپنے ملک کیلئے اپنی جان تک قربان کرنے کیلئے تیار رہوں۔ آپ کو معلوم نہیں ملک کس مصیبت میں مبتلا ہے ۔ سڑکوں پر بھوکوں کی لاشوں کا انبار ہے جن کا کوئی پرسان حال ہی نہیں ۔ ایسے وقت میں ہم ہی اُن کے عزیز ہیں ۔ اور دوست ہیں۔ اگر ہم ہی خبر نہ لیں گے تو پھر کون لیگا ۔ بھوکوں کو روٹی دینا کیا ہمارا فرض نہیں ۔
بیگم صاحبہ :۔ یہ میں کب کہتی ہوں کہ بھوکوں کی خبر نہ لو۔ یہاں کی ممتا پاگل ہے اتنے دنوں سے تمہیں دیکھا نہیں تھا۔
(محمود کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے)
بیگم صاحبہ :۔ تمہارے کپڑے کتنے خراب ہو رہے ہیں محمود —— بالوں کو دیکھو کیا حال ہے ۔ میں کتنی بدنصیب ماں ہوں ۔
محمود :۔ اماں جی ۔ سوچئے تو حکومت نے اناج اور پیسہ اور جو کچھ مل سکا اکٹھا کیا ۔ پھر اس کا انتظام اور اب پھر جانا ہے ۔ اگر کہیں سے جمع ہو گیا تو اچھا ہے ۔
بیگم صاحبہ :۔ محمود ! اب میں نہیں جانے دونگی ۔ —— میرے لال میں پاگل ہو جاؤں گی ۔

محمود :۔ اماں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں یہاں آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤں
اور لوگ بھوکے مریں۔ میری غیرت گوارہ کریگی۔

بیگم صاحبہ :۔ تم کو جس چیز کی ضرورت ہو میں دونگی محمود ——

محمود :۔ (خوش ہو کر) اماں آپ دینگی ؟

بیگم صاحبہ :۔ ہاں جو کچھ تم مانگو گے میں دونگی

(بیگم صاحبہ تکیہ کے نیچے سے اپنا منی بیگ نکال کر محمود کو دیتی ہیں)

محمود :۔ (ماں کے گلے سے لپٹ جاتا ہے) اماں —— ! آپ مجھ سے اتنی
محبت کرتی ہیں —— آہ ان سڑکوں پر جو بھوک سے تڑپ تڑپ
کر مر رہے ہیں۔ وہ بھی کسی کے لال ہونگے۔ کاش تم اُن سے بھی
ایسی ہی محبت کرسکو۔

بیگم صاحبہ :۔ بیٹے میں کیا ان کا بُرا چاہتی ہوں۔ وہ بھی اپنی ماؤں کے سپوت ہونگے

(نواب صاحب باہر سے آتے ہیں)

محمود :۔ اباجی ! آداب عرض

نواب صاحب ۔ (غصہ میں ہیں) ہوں —— آپ آگئے ؟

(محمود سر جھکائے خاموش کھڑا ہے)

نواب صاحب :۔ مجھے تمہارا یہ فعل ہرگز پسند نہیں۔ آج تین دن سے تم
گھر سے غائب تھے ۔

محمود :۔ اباجی ! میں کام سے چلا گیا تھا۔

نواب صاحب :۔ خیر ! میں تمہارے کاموں کو تو خوب سمجھتا ہوں ۔ بہرحال
آج میں آخری فیصلہ چاہتا ہوں۔

بیگم صاحبہ :۔ (نواب صاحب سے) کیسی باتیں کر رہے ہو ۔

نواب صاحب :۔ میں تمہاری اس آوارہ گردی کو ایک سکنڈ نہیں دیکھ سکتا۔

بیگم صاحبہ :۔ آج گھوڑے سو کر اُٹھے ہو —— کیا ہوگیا ۔ چپ چاپ جاؤ
ہم نے خود کہہ لیا۔

نواب صاحب :۔ (بگڑ کر) کیوں بک بک کر رہی ہو —— میں آئندہ
اس صورت میں ان کو اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا ۔ (پھر محمود سے)
بولو خاموش کیا سوچ رہے ہو۔ یا تو اپنی حرکتوں سے باز آؤ ورنہ یہاں
قدم مت رکھنا۔ میں نے تم سے جس قدر محبت کی آج اتنی ہی نفرت
بھی کرسکتا ہوں۔ سن رہے ہو —— مجھے جلد جواب دو ——
بولو۔ خاموش کیوں ہو۔ میں تمہاری یہ پاگلوں کی سی حالت ہرگز
نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے جسم کو دیکھو گرد میں اٹا ہوا ہے۔ بالوں کی حالت کیا
ہے۔ تمہاری یہ حرکتیں میری برداشت سے باہر [illegible]

محمود :۔ اباجان ! آپ میرے کپڑے اور بال دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے ان لوگوں
کو نہیں دیکھا جو سڑکوں پر پڑے دم توڑ رہے ہیں۔ کتنی ہی آندھی
آئے کتنی ہی بارش ہو وہ اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ کیوں بک بک کر رہے ہو —— تم ہماری دنیا سے علیحدہ ہو
جاؤ —— میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ —— جاؤ سڑکوں
پر سے چماروں اور بھنگیوں کی لاشیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکو۔ تم اسی قابل ہو
تم شریفوں میں بیٹھنے کے لائق نہیں ——

(محمود کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا ہے۔ وہ دروازہ کی طرف چل دیتا ہے)

بیگم صاحبہ :۔ محمود کہاں جاتے ہو ؟ —— (لڑکے کے پیچھے دوڑتی ہے)

نواب صاحب :۔ چلے جاؤ —— اور آج سے مجھے صورت مت دکھانا ۔

بیگم صاحبہ :۔ محمود —— ! محمود —— !!

(محمود جھپٹ کر نکل جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ رونے لگتی ہیں)

چوتھا ایکٹ —— دوسرا سین

(کھانے کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ہندو اور مسلمانوں کا اجتماع ۔ سب
ملکر غذائی بحران کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ محمود اور روپا بھی تیز تیز قدم
اٹھاتے آ رہے ہیں)

مکرجی :۔ لیجئے ! وہ کامریڈ محمود بھی آگئے۔

حمید :۔ آیئے۔ آپ ہی لوگوں کا انتظار تھا۔

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

سلطان :۔ محبان وطن کے سامنے آج پھر وہی غذا کا سوال ہے۔ دماغ پریشان
ہے بنگال کو کس طرح اس مصیبت سے بچایا جائے ۔

محمود :۔ ہندو مسلمان بھائیوں کو چاہیئے کہ جلد سے جلد متحد ہو کر عوام کیلئے غذا
مہیا کریں۔ ایک یہی طریقہ ہے جس سے ہمارا ملک موت کے چنگل سے
نجات پاسکتا ہے ۔

روپا :۔ یہ وقت اتنا نازک ہے کہ مذہب اور ہر طبقہ کو ایک ہو کر کام کرنا
چاہیئے۔ ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ بھوکے ہندو اور مسلمانوں
کی مدد کریں۔

مکرجی :۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر ۱۱۲۹ موتیں ہوئیں —— کپڑے میں
لپٹی ہوئی کوئی کہہ نہیں سکتا۔ کہ یہ انسانوں کی لاشیں ہونگی ——

روپا :۔ جہاں چاول کی فصل اچھی ہے وہاں سے چاول خرید لینا چاہیئے اور عوامی لنگرخانے اور عوامی غذائی کمیٹیاں بنائی جائیں۔

سلطان :۔ ہمیں بہت جلد اس کام کو کرنا ہے ورنہ برسات کا موسم ختم ہو رہا ہے۔ اور پھر بنگال پر بموں کی بارش ہوگی —— کتنا نازک وقت ہے۔

محمود :۔ فاشسٹوں کا مقابلہ کرنے کیلئے اتحادی فوجیں تو تیار ہو رہی ہیں۔ لیکن جب تک ہم ان کی مدد نہیں کرسکتے وہ کچھ نہیں کرسکتیں۔

مکرجی :۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہم اپنے بھوکے بھائیوں سے کس طرح امید کریں کہ وہ ہمت اور خود اعتمادی دکھائیں۔

روپا :۔ اس وقت تمام محبانِ وطن کا فرض ہے کہ اپنے بھوکے ہندو بھائیوں اور مسلمان بھائیوں کو جلد سے جلد غلہ مہیا کریں۔ تاکہ وہ جاپانی حملہ آور کا مقابلہ کرسکیں۔

(کسانوں کا ایک گروہ آتا دکھائی دیتا ہے)

حمید :۔ یہ کون لوگ ہیں ؟

محمود :۔ ہمارے قریب کے گاؤں کے کسان معلوم ہوتے ہیں۔

روپا :۔ (غور سے دیکھکر) ہاں —— وہی ہیں —— کیا بات ہے ؟

سلطان :۔ کیوں آ رہے ہیں یہ لوگ !

حمید :۔ معلوم نہیں۔

محمود :۔ کچھ پوچھنے آ رہے ہیں —— ممکن ہے گاؤں میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہو۔

روپا :۔ ایسا ہوا تو نہیں کبھی ——

(گروہ قریب آ جاتا ہے)

محمود :۔ کیا بات ہے بھائی ؟

ایک کسان :۔ ہم بھوکے مرے جا رہے ہیں ہم کو کھانا چاہیئے۔

دوسرا کسان :۔ گاؤں میں اناج کا دانہ نہیں۔ ہم اٹھواروں سے بھوکے مر رہے ہیں۔ شہر میں بنیوں کی دکانوں میں بھرا ہے۔ لیکن وہ دیتے نہیں۔

(دو تین کسان قریب آکر بیٹھ جاتے ہیں)

ایک کسان :۔ کچھ لوگوں نے ہمیں یہ ترکیب بتائی ہے کہ بنیوں کی دکانوں میں گھس جائیں۔ بڑا چاول بھرا ہے۔

دوسرا :۔ اب تم جیسا کہو وہی کریں —— ہمارے بال بچے بھوکے مر رہے ہیں۔

محمود :۔ یہ پانچویں دستہ نے تم کو بھڑکا دیا ہے۔ کہیں ایسا مت کرنا۔

کسان :۔ تو پھر ہم کیا کریں ؟

محمود :۔ ہم تم کو کھانے کو دیں گے۔

حمید :۔ کامریڈ سلطان! دیکھا آپ نے یہ پانچواں دستہ کس طرح بھوکوں کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہے۔

روپا :۔ اسی لئے ہم کو جلد سے جلد کوئی انتظام کرنا چاہیئے۔ بھوکے ہیں تو وہ روٹی کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

دوسرا کسان :۔ اور ایک بات اور بتائی تھی۔ کہ سبھاس بابو برما سے چاول لے کر آ رہے ہیں۔

روپا :۔ ارے کہیں ان لوگوں کے کہنے میں مت آ جانا۔ وہ جاپانی ایجنٹ ہیں۔

مکرجی :۔ بھلا چاول برما سے کس طرح آ سکتا ہے۔ فاشسٹ دشمن تمہارے سروں پر آگ برسانے کی فکر میں ہیں۔ وہ بھلا تمہارے لئے کھانے کو بھیجیں گے۔

دوسرا کسان :۔ اور بتا رہے تھے کہ تمہارا دیس کسی کا گلام (غلام) نہ رہے گا۔ جاپان سب کو آزاد کر دے گا۔

محمود :۔ وہ لوگ تو جنتا کو بالکل ہی بے جان سمجھتے ہیں۔ جنتا کو بھیڑ بکریوں کی طرح تڑوا لیتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں برما میں کیسے کیسے ظلم کئے۔ جنتا کو کتنے دکھ دیئے۔ سبھاس بھی اب ہمارے دیس کا نہیں رہا بلکہ انہیں میں سے ایک ہے۔ وہ غدار ہے۔ اس نے اپنے دیس کے ساتھ دھوکا کیا۔

کسانوں کی آواز :۔ ہمیں کھانے کو دو —— ہم بھوکے مر رہے ہیں۔

دوسری آواز :۔ جاپان ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور ہم بھوکے مر رہے ہیں۔ کس طرح اپنے دیس کو بچائیں۔

(سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں)

چلو۔ ہم تمہیں کھانے کو دیں گے۔

چوتھا ایکٹ —— تیسرا سین

(کلیم صاحب کا مکان۔ شہناز بیٹھی ہوئی کچھ سی رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی سلیم آتا ہے)

سلیم :۔ شہناز آپا !

شہناز :۔ (چونک کر) تم کیا ـــــ !

(سلیم روتا ہوا آتا ہے۔ شہناز گھبرا جاتی ہے)

شہناز :۔ سلیم بھیا ـــــ کیا بات ہے ؟ کیوں رو رہے ہو ـــــ بولو ـــــ سوئی کو کپڑے میں لگا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور سلیم کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ سلیم اور ہچکیاں لے لیکر رونے لگتا ہے۔ شہناز اسکو پیار کرکے بڑی مشکل سے خاموش کرتی ہے۔

شہناز :۔ ابا جی نے تم کو کچھ کہا ہے ؟

سلیم :۔ (ہچکیاں لیتے ہوئے) نہیں

شہناز :۔ اماں نے ڈانٹا ہے ؟

سلیم :۔ نہیں۔

شہناز :۔ (گھبرا کر) پھر کیا ہوا ـــــ ؟ بتاتے کیوں نہیں۔

سلیم :۔ محمود بھیا کو ـــــ

(وہ پھر زور زور سے رونے لگتا ہے)

شہناز :۔ ارے جلدی کہو ـــــ محمود بھیا کو کیا ہوا ؟

سلیم :۔ محمود بھیا کو چچا جان نے گھر سے نکال دیا

شہناز :۔ گھر سے نکال دیا۔

سلیم :۔ ہاں

شہناز :۔ (پریشان ہو جاتی ہے) کب ؟

سلیم :۔ آج ہی تو ـــــ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔

شہناز :۔ تم کو معلوم ہے کیوں نکال دیا۔

سلیم :۔ ہاں ـــــ اس نے نکال دیا کہ وہ بھوکے لوگوں کیلئے کھانے کا انتظام کر رہے تھے۔

شہناز :۔ (خود سے) چچا کتنے ظالم ہیں۔ اگر وہ ملک کی خدمت کر رہے تھے تو کوئی جرم نہیں وہ خود ہی تو مصیبت جھیلتے ہیں۔ بھلا ان کا کیا بگڑتا ہے۔ چچی نے بھی چچا کو نہیں سمجھایا (پھر سلیم سے) تم کو معلوم ہے وہ کہاں ہیں ؟

سلیم :۔ نہیں ـــــ میں نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تھا

شہناز :۔ پھر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ نکال دیا ؟

سلیم :۔ ان کے نوکر نے بتایا ہے۔

شہناز :۔ (اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے) اچھا جاؤ ـــــ باہر دیکھنا۔ نظر آجائیں مجھے بتانا ـــــ اچھا بھیا !!

سلیم :۔ اچھا۔

(وہ آخر چلا جاتا ہے۔ شہناز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے روتے روتے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ شہناز کی والدہ آجاتی ہیں)

سلطانہ :۔ ہائیں ! یہ کیا ہو رہا ہے شہناز ! ـــــ کیوں رو رہی ہو ـــــ ؟

(شہناز روتے روتے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی آہستہ آہستہ ـــــ محمود ـــــ محمود" کہتی ہے)

سلطانہ :۔ ہائے میری بچی کو کیا ہو گیا ؟

(کلیم بھی آجاتے ہیں)

کلیم :۔ لیکن یہ رو کیوں رہی تھی ؟

سلطانہ :۔ مجھے کیا معلوم ـــــ میں نے تو روتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔

کلیم :۔ اچھا میں نوکر کو ڈاکٹر کے پاس بھیجتا ہوں۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ محمود داخل ہوتا ہے)

محمود :۔ چچی جان آداب عرض

سلطانہ :۔ اوہو ! آج تو محمود آگئے۔ کہو کیسے راستہ بھول گئے۔

محمود :۔ پہلے یہ بتایئے کہ شہناز کا یہ کیا حال ہے۔ میں اسی کو دیکھنے آیا ہوں۔

سلطانہ :۔ دیکھو تو بھیا ـــــ بیہوش پڑی ہے۔ جب ذرا ہوش آتا ہے تو تمکو یاد کرتی ہے۔

محمود :۔ (قریب جا کر) شہناز ! شہناز !!

(آنکھیں کھول دیتی ہے)

شہناز :۔ محمود ! ـــــ محمود !! ـــــ آپ آگئے ـــــ آگئے۔

محمود :۔ گھبراؤ نہیں شہناز میں آگیا۔ کیا بات ہے ؟

(سلطانہ کسی کام سے باہر چلی جاتی ہیں)

شہناز :۔ چچا جان نے آپ کو گھر سے نکال دیا ہے (رونے لگتی ہے)

محمود :۔ تو رونے کی کیا بات ہے۔

شہناز :۔ چچا کتنے ظالم ہیں۔

محمود :۔ ہر دولتمند ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ہماری [illegible] تہذیب یہی سکھاتی ہے تم کو ابھی تجربہ نہیں۔

شہناز :۔ (بات کا رخ بدل کر) آپ نے اپنی یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔

محمود :۔ (مسکراتے ہوئے) تم میری صورت دیکھتی ہو شہناز ! ان کی شکل دیکھو جو سڑک پہ بھوکے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔ ان کی شکل دیکھو جو ہوٹل کے سامنے کوڑے میں روٹی کے ٹکڑے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

شہناز :۔ محمود کیا میں اپنے ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی ؟

محمود :۔ کیوں نہیں کر سکتیں۔

شہناز :۔ مجھے بتایئے میں آپ کا ہاتھ بٹاؤنگی۔

محمود :۔ آپ ان لوگوں کے لئے کچھ کھانے کو دیجئے بس ایک یہی کام ہے جو آپ کر سکتی ہیں۔

شہناز :۔ (اپنے گلے سے مالا نکالکر محمود کی طرف بڑھاتی ہے) محمود! یہ کس کام آسکتا ہے؟

محمود :۔ نہیں۔ اسکو پہنے رہو اگر چچی کو خبر ہو گئی تو وہ تمہاری مصیبت کر دیگی۔

شہناز :۔ (کچھ سوچتی ہے) میں روپیہ بھی دے سکتی ہوں۔

محمود :۔ تو اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔

(شہناز تکیہ کے نیچے سے کچھ روپیہ نکالتی ہے اور محمود کے ہاتھ میں دیدیتی ہے)

محمود :۔ لیکن میں اسکا شکریہ نہیں ادا کرونگا کیونکہ یہ آپ کا فرض ہے۔

شہناز :۔ (ہنستی ہے) میری کتنی خوش نصیبی ہو اگر آپ اپنی ہر ضرورت کیلئے مجھ سے کہہ دیا کریں

محمود :۔ بس یہی میری ضرورت ہے اسی کو آپ تھوڑا بہت پورا کرتی رہا کریں۔

(سلطانہ آجاتی ہیں)

سلطانہ :۔ محمود چائے منگاؤں؟

محمود :۔ نہیں۔ دیر بہت ہو گئی ہے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔

(محمود کھڑا ہو جاتا ہے)

سلطانہ :۔ چل دیئے کیا؟

محمود :۔ جی اب اجازت دیجئے۔ اگر وقت ملا تو پھر آؤنگا۔

شہناز :۔ (قریب آکر) محمود! کیا میں امید کروں کہ تم مجھے بھولوگے نہیں۔

محمود :۔ کیسی باتیں کر رہی ہو شہناز۔ اچھا اب میں جاتا ہوں پھر آؤنگا۔

شہناز :۔ آؤگے؟ **محمود** :۔ ہاں ـــــ جاؤ بیٹھو۔

شہناز :۔ آپ کو دروازے تک پہنچا دوں۔

محمود :۔ (ہنس کر) بڑے لوگوں کو موٹر تک پہنچانے جایا کرتے ہیں۔ مجھے تو تنہا بہت بہت دور چلنا ہے۔ (دونوں ہنستے ہیں)

شہناز :۔ پھر بھی جہاں تک میں جا سکتی ہوں۔

پانچواں ایکٹ پہلا سین

(بنگال کی ایک سڑک)

کچھ لاشیں پڑی ہیں۔ جن میں بچے بوڑھے سب ہی ہیں۔ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو سڑک پر چھوڑ چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ کچھ بھوکے بچے اپنے بھوکے ماں باپ سے روٹی مانگ رہے ہیں سامنے ہی غلہ کی ایک سرکاری دکان ہے۔ جہاں عورتیں مرد بچے بوڑھے لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو رہے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ وہ زمین پر بار بار اس طرح ہاتھ چلاتے ہیں جیسے یہ مٹی آٹا بن جائیگی۔ یہ کنکر روٹی کے ٹکڑے ہو جائیگی۔

کچھ فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے محمود لیٹے ہیں اور روپا قریب بیٹھی ہوئی ہے۔ محمود کو بخار چڑھا ہے۔

روپا :۔ دیکھا نہیں جاتا ـــــ کیا ہیبت ناک سین ہے

محمود :۔ اور وہ دیکھا عورت روٹی نہ ملنے کی وجہ سے اپنے بچے کو سڑک کے کنارے چھوڑ گئی۔ کیسا رو رہا ہے۔

ایک بھوکی عورت :۔ (جس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے) یہ روٹی ہے ـــــ (زمین پر ہاتھ پھیرتی ہے) ارے کتنے ٹکڑے ہیں ـــــ آٹا ہی آٹا ـــــ

(مٹی اور کنکروں کو اٹھا کر منہ میں بھر لیتی ہے)

(بھوکے بچے دوڑ رہے ہیں)

بھوکی عورت :۔ کھاؤ ـــــ کھاؤ ـــــ دیکھو روٹی کے کتنے ٹکڑے ہیں۔

(بچے اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہیں اور پھر تھوکتے ہیں)

روپا :۔ ہائے ـــــ ہائے ـــــ بھوک بھی کیا چیز ہے۔ انسان روٹی اور پتھر میں تمیز نہیں کر سکتا۔

(محمود کراہ رہا ہے)

ایک بھوکا آدمی دو بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑا ہے۔ ایک شخص ادھر سے گذرتا ہے

بھوکا شخص :۔ (راہ گیر سے) مجھے چار آنے پیسے دے دو اور ان دونوں بچوں کو لے جاؤ ـــــ یہ تمہارا کام کر دیا کریں گے بابو جی۔

(وہ شخص بغیر کچھ توجہ کئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ بھوکا مرد اور اس کے بچے حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں)

محمود :۔ روپا کیا سوچ رہی ہو؟

روپا :۔ یہ دیکھ رہی تھی کہ بھوک ماں باپ کی محبت پر غالب آسکتی ہے۔ چند پیسوں میں لوگ اپنے بچوں کو فروخت کر رہے ہیں۔

محمود :۔ یہ بھوک ہی ہے جس نے کاریگروں کو [illegible] مجبور کر [illegible] ہو گئی کھیت مزدور جو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں جانتے [illegible] ایک نوالہ کے لئے اپنا جسم بیچ رہی ہیں۔

(محمود زور زور سے کراہنے لگتا ہے)

روپا :۔ (گھبرا کر) کیا بات ہے؟ (ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے) [illegible]

(باقی آئندہ)

گذشتہ سے پیوستہ — قسط چہارم

بدنام

(از محترمہ مہر آرا وصفی مرادآبادی)

"رات ہونے کو آئی —— راستہ پرخطر ہے —— اور میں نہایت پہنے ہوں۔"

کتنی مرتبہ کہا —— مگر جواب ہی نہیں دیتے۔ آج گھر لوٹنے کا ارادہ نہیں ہے کیا —— ؟" اس نے تیور بدل کر شوہر سے کہا۔

"میں بھابی بغیر گھر اب نہیں جاؤں گا۔" پرمود نے —— جو اس کی بدمزاجی سے عاجز آ چکا تھا، ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"تو میں چلی ——" سوشیلا نے غصہ سے لال پیلی آنکھیں نکال کر کہا۔

"اکیلی —— ؟" کمود نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"جناب وہ ڈرائیور میرے میکے کا ہے۔ اور —— اس لئے مجھے اس کے ساتھ جانے میں ڈر نہیں لگتا ——"

"سنو تو ——" پرمود نے ماں تک کے ڈر کی وجہ سے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "ماتاجی ناراض ہونگی۔ میں ڈاکٹر سے ذرا اجازت لے آؤں —— ابھی آتا ہوں —— بس دس منٹ بعد چلتے ہیں۔"

"بہت دیر ہو جائیگی ——" سوشیلا نے کہا۔

"مجھے صبح لے جانا بھیا ——" لیلا نے کہا۔ "اتنی جلدی اجازت لینا۔ اور پھر لیکر جانا یہ سب مشکل ہے ——!! تم جاؤ بھورانی کو اکیلا مت جانے دو۔ رات ہو چلی ہے۔"

"ننھے چلوگے ؟" کمود نے بر جستہ معلوم کیا اور وہ ماں کی پرواہ کئے بغیر ہنستا ہوا اس کے ہمراہ ہو گیا۔

لیلا کو —— ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مطمئن ہو گئی ہے کہ اس کے بغیر تنہا خوش رہ سکتا ہے۔

"ننھے! ماں کو پرنام کرو ——" پرمود نے بچہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

بچے نے [illegible] بیگانہ ہو گیا تھا چاروں طرف متجسس نظروں سے [illegible]

"اوہ —— یہ ماں کو پہچانتا بھی نہیں ——" [illegible] سے بچہ کو دیکھ کر کہا۔

"تمہاری سب کی محبت نے اس کو موہ لیا ہے ——" لیلا نے لیٹے لیٹے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کے چہرہ پر مسرت اور اطمینان کے ملے جلے آثار ہویدا تھے۔ اور بہت خوش نظر آ رہی تھی!

"نمستے کرو ننھے" کمود نے کہا۔ اور ننھے نے اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ لیلا نے —— اس کو قریب بلا کر خوب سینے سے چمٹا کر پیار کیا۔ لیکن جب وہ رخصت ہو رہا تھا تو غمگین سا تھا۔ اور لیلا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے جن کو لاکھ کوشش اخفا کے باوجود وہ نہ چھپا سکی۔

"اس کو یہیں رکھ لو جی جی —— اگر دل چاہے تو ——" کمود نے کہا۔

"نہیں نہیں وہ ابھی بہت کمزور ہیں اس کو نہ سنبھال سکیں گی ——" پرمود نے جواباً کہا۔ اور پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "اس کو تو وہ اپنی دیورانی کو رونمائی میں دے چکیں۔ یہ تو اب ہمارا ہے۔" بچہ کو گود میں اٹھا کر اس نے پیار کرتے ہوئے کہا —— "ننھے کس کے ہو —— ؟"

"تمہارا" ننھے نے اس کے کاندھے پر سر رکھکر جواب دیا۔

"آپ کو اس سے محبت بہت ہی ہے ——" سوشیلا نے جیسے چڑ کر کہا۔

"بہت —— بہت ——" پرمود نے کھسیا کر جواب دیا۔ وہ سوشیلا کو لاکھ بار حالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ مگر وہ لیلا اور بر جیش سے معلوم کیوں ہمیشہ ناراض ہی سی رہتی تھی۔ اور اکثر پرمود کو طعنے دیا کرتی تھی —— پرمود کے دل میں اس کی یہ عادتیں رفتہ رفتہ نفرت پیدا کر رہی تھیں —— اور وہ تاریک مستقبل کے بھیانک خواب دیکھنے کا کچھ عادی سا ہو چلا تھا —— چار ماہ کے مختصر سے عرصہ میں یہ سب کچھ ہو گیا تھا ——!!

"اجازت ہے بھابی ——" پرمود نے لیلا سے کہا۔

"جاؤ بھیا بہت دیر ہو رہی ہے۔ دیکھو بھورانی سوار بھی ہو چکیں۔" لیلا نے کہا۔

"ارے وہ گئیں بھی —— اتنی جلدی ——" پرمود نے حیرت سے کہا

"نمستے جی جی ——" کمود نے کہا۔

تھے بہن ——" لیلا نے جواباً کہا —— ! ماتا جی کے تیوروں نے تو لیلا کو [illegible] ہی کیا تھا۔ مگر آج سوشیلا کو دیکھکر اور اس کی باتیں سُنکر [illegible] کرنے پر مجبور ہوگئی کہ اب اس گھر میں ایک منٹ بھی اسکی گذر نہ ہوگی۔

—— پھر کیا کرے —— ؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جسے وہ بہت دیر تک سوچا کی —— گاؤں واپس چلی جائے !! اس خیال ہی سے وہ لرز جاتی —— کیونکہ وہ جانتی تھی وہ بُری طرح گاؤں میں "بدنام" ہو چکی تھی —— اور اب اس طرح اس کے ساتھ آنا اور پھر اس کی شادی کے بعد گھر واپس لوٹنا کیا کچھ نہ ہوگا —— وہ کیسے زندہ رہ سکے گی ؟ وہاں کے بدگمان بدظنوں سے کیونکر وہ جیت سکے گی —— ؟

سکول میں داخل ہو جاؤں —— بے دیکر یہ ایک آرزو تھی —— سہمی ہوئی سی خوفزدہ تمنا۔ مگر وہ جانتی تھی ایسا کرنے میں اسکی "بدنامی" —— اور بڑھیگی۔ نہ پرمود اس سے کنارہ کش ہو سکے گا —— اور نہ —— وہ اس بدنامی سے چھٹکارا پا سکے گی —— !!

"بی بی جی —— چٹھی آیا ہے ——" ایک نرس نے کمرے میں داخل ہو کر اسکی محویت کو توڑ دیا۔

"چٹھی —— !" وہ حیرت زدہ ہو کر بولی —— اور لفافہ چاک کر کے جلدی جلدی پڑھنے لگی۔ یہ ماتا جی کی طرف سے تھا۔ تحریر تھا:۔

لیلا ! تمہاری صحت یابی کی اطلاع کمود اور پرمود کی زبانی معلوم ہو کر باعث مسرت ہوئی۔ اب تک کی تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ مگر تم جانتی ہو اب گھر میں بھورانی آگئی ہیں۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ صحت ہونے پر تم اپنے گاؤں واپس چلی جاؤ۔ اگر تم یہاں لوٹ کر آئیں تو مفت میں بدنامی ہوگی۔ ویسے ہی جب سے بھورانی نے اپنے میکے میں شنکر نامی کسی شخص کی زبانی جو تمہارے گاؤں کا ہے تمہارے اور پرمود کے تعلقات کا حال سُنا ہے وہ ناراض سی رہتی ہیں۔ اور اب اگر تم واپس آگئیں تو پھر پرمود کی بدنامی میں کوئی کسر باقی نہ رہیگی عورت کسی حال میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا پتی اس سے زیادہ کسی اور عورت کو چاہے۔ اور اس لئے بھورانی کی ناراضگی حق بجانب ہے۔ بہت کرو گی تو تم یہ خط پرمود کو دکھا دو گی۔ لیکن میں اس سے نہیں ڈرتی۔ اس لئے کہ جس قدر ممکن تھا میں اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر چکی۔ اور اب مجبور ہو کر اس کے ساتھ بھی سختی کا برتاؤ کرنے پر آمادہ ہو گئی ہوں۔ تھوڑے لکھے کو بہت جاننا۔

راقمہ تمہاری بہی خواہ

سرودجنی

لیلا نہ جانے کتنی دیر تک ان سطروں میں جذب رہی —— بہت دیر بعد کہیں جا کر اُس کے اوسان ٹھکانے ہوتے —— غصّہ اور نفرت سے اب بھی وہ کانپ رہی تھی۔ میں —— تو بدنام ہو ہی چکی —— یہ بدنما داغ —— میری ناتوان کوشش سے تو اب مٹنے سے رہا —— اُس نے دل میں کہا —— لیکن پرمود جی —— اس فرشتہ صفت انسان کی —— تباہی اور بربادی کا سبب بھی میں ہی بن رہی ہوں —— ؟ کچھ بھی ہو ——" میں ان کو بدنام نہ ہونے دونگی ——" اس نے صدق دل سے آخری فقرہ کئی بار دُہرایا —— اور اب اس کے لبوں پر ایک دل آویز اطمینان، ہلکی سی مسکراہٹ کی شکل میں نمودار تھا —— !!

علی الصبح جب پرمود اور کمود لیلا کو مکان واپس لے جانے کو ہسپتال پہنچے تو وہ یہ سُنکر حیران رہ گئے کہ نمبر ۷ کا مریض لاپتہ ہے —— تمام ہسپتال میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی ——

"ہیلو مسٹر پرمود شاستری"! ڈاکٹر ورمن نے پریشان صورت سے اسکا استقبال کرتے ہوئے کہا —— "میں نے ابھی آپ کو فون کیا تو آپ وہاں نہ تھے۔ شاید یہاں آنے کیلئے روانہ ہو چکے تھے۔ مگر —— تعجب —— تو یہ ہے کہ اس کی ناتوانی کی حالت تو یہ تھی کہ بغیر سہارے پلنگ سے اُٹھنا محال تھا۔ اور —— آخر —— اس طرح —— وہ —— فرار —— کیسے ہوئی —— ؟ —— حیرت ہے !"

"پرانا دماغی مرض —— پھر عود کر آیا ہوگا شاید ——" کمود نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے غمگین آواز میں کہا۔

"بالکل نہیں مس صاحب —— وہ رات —— بالکل صحیح حالت میں تھی۔ نرس سے معلوم ہوا کہ بارہ بجے کے بعد رات کو ایک چٹھی اس کے نام "پرمود نواس" سے آئی تھی —— جو اُس نے لی اور مطالعہ کی —— اس وقت وہ بالکل اچھی تھی اور دماغ بالکل صحیح حالت میں تھا ——"

"چٹھی —— !" پرمود اور کمود دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا —— پرمود کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں —— اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور اس کو یقین ہونے لگا کہ اب لیلا کا ملنا مشکل ہے۔

"ہاں —— ! چونکہ وہ آپ کے یہاں سے آئی تھی۔ اس لئے اس طرف ہم لوگوں کا کوئی خاص شبہ نہیں گیا تھا ——" ڈاکٹر نے پرمود جی

کو حیرت سے دیکھ کر کہا۔"

" لاش — لاش — مجرم — مجرم۔ کوئیں۔
میں لاش — " ہسپتال کا مالی بھاگتا بھاگتا بے اوسان دوڑا ہوا
آیا — !
[illegible]
ٹیلی فون کر دیا تھا۔ اور نعش کوئیں سے نکالی گئی — یہ لیلا تھی —
بدنام اور رسوا لیلا — جو اپنی منحوس صورت یہاں چھپا کر پرمود کو بدنامی

سے بچانے کی مستحق تھی — !!

لیلا کے کمرہ کی تلاشی ہوئی۔ لفافہ برآمد ہوا۔ جس پر کہ اس پر کوئی
عبارت درج نہ تھی لیکن پرمود نے فوراً پہچان لیا کہ وہ ماتا جی کے خاص
پیڈ کا ہی لفافہ تھا — لفافہ کے اندر کیا تھا —؟ یہ راز کبھی فاش نہ ہو سکا
— پرمود کو اس کے باوجود یقین تھا کہ لیلا کی موت کی باقی انکی
اور اسی لئے وہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا — !!

تیرے بغیر

(از محترمہ ک۔ ف بیگم)

رہتی ہے کھوئی کھوئی طبیعت ترے بغیر
ملتی نہیں ہے رُوح کو راحت ترے بغیر

بے کیف سی فضائیں ہیں افسردہ کائنات
مفقود ہے جہاں سے مسرت ترے بغیر

ذوقِ نشاط ہے، نہ اُمنگیں، نہ ولولے
جینے سے ہو گئی مجھے نفرت ترے بغیر

نوحہ ہے گویا نغمۂ بُلبل مرے لئے
صحنِ چمن سے ہوتی ہے وحشت ترے بغیر

گلزار بھی نظر مجھے آتے ہیں خار زار
باقی نہیں گلوں میں لطافت ترے بغیر

جو تھے مرے لئے کبھی دلچسپ مشغلے
اُن سے رہی نہیں مجھے رغبت ترے بغیر

تجھ بِن دکھائی دیتی ہے بے نُور چاندنی
مہتاب کی بھی زرد ہے رنگت ترے بغیر

(سلسلہ کیلئے ادیب جنوری ۱۹۴۲ء ملاحظہ فرمایئے)

اوراقِ پریشاں

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ)

---

۱۰ ستمبر ۱۹۴۰ء

آج کا دن خوب گذرا۔ شعر و ادب میں کھو کر اکثر میں اپنی ناکامیوں کو بھول جاتی ہوں۔ بزمِ ادب شملہ کی جانب سے ایک عظیم الشان مشاعرہ آج شب کو کیا گیا تھا مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ تمام مشاہیر شعرا شریک تھے۔ جگر کی غزل بہت خوب تھی۔ آہ! کتنا اچھا کہا ہے ؎

بیتاب ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء

آج لیڈی ..... جگ نے مشہور شاعروں اور اپنے مخصوص احباب کو ڈیویکو میں پارٹی دی تھی۔ ہم لوگ بھی مدعو تھے۔

شملہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی روح ڈیویکو میں کھنچ آئی تھی۔ رنگا رنگ ساڑیوں سے لالہ زار ہر جانب کھلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رنگا رنگ کی نمائش ہو رہی ہے۔ یہ شاعرانہ فضا اور اس پر شعرا کا اپنا بہترین کلام سنانا مئے دو آتشہ کا مصداق ہو گیا۔

جمالی سے میرا تعارف سر..... جگ نے یہ کہکر کرایا یہ ہیں میری عزیز بھتیجی اور مشہور شاعرہ نیلوفر بانو۔ وہ یہ سنکر ذرا چونکا۔ اور ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔ میں اُس کے اِس انداز سے متعجب ہو گئی اور وہ بھی اپنی بیساختہ بیباکی پر نادم ہوا اور بہت پُر خلوص انداز میں معافی مانگی۔ اور اُس نے کہا کہ وہ میری نظموں سے بہت متاثر ہے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ جمالی کی شاعری تو بہت حسین و لذیذ ہے۔ بہرحال آدمی دلچسپ ہے۔ یہ صحبت پُر لطف تھی۔

۱۴ ستمبر ۱۹۴۰ء

گذشتہ ۲ روز میں اپنی نظم "شاعر کا خواب" مکمل کرنے میں اس قدر یکسو رہی کہ روزنامچہ لکھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ آج کا دن بہت خوشگوار تھا سنہری دھوپ کا ذرہ ذرہ پر پھیلی ہوئی ایسی بھلی معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی حسینہ کی دوشیزہ حیا نے جگہ جگہ حلقات ...

ساڑی پر سنہرا کام کر دیا گیا ہو۔ آج شب کو سر..... جگ اور لیڈی جگ کو کھانے پر بلایا تھا۔ جمالی اُن کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس لئے وہ بھی آیا اُس نے آج اپنی کئی دلکش نظمیں سنائیں۔ قدرت نے اسکو فیاضی کے ساتھ شاعرانہ جوہر عطا کئے ہیں۔ خوب لکھتا ہے اور خوب پڑھتا ہے۔ کسی بہتے ہوئے آبشار کے مانند اُس کے کلام میں روانی ہے۔ اور پڑھنے کا انداز بھی موجوں کے جزر و مد سے ملتا ہے۔ وقت کہاں گذرا، معلوم ہی نہ ہوا۔ جب گھنٹے نے ٹن ٹن بارہ بجائے تو مہمان رخصت ہوئے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۴۰ء

آج بھی خوشگوار دن ہے۔ میرے دل کو قدرے سکون ہے۔ دماغ شگفتہ ہے۔ تھیٹر میں "صبح بوس" دیکھنے سعیدہ کے ساتھ چلی گئی۔ یہ چشمہ کا مشہور اور کامیاب کھیل ہے۔ اداکار بھی اچھے تھے۔ اس لئے خوب لطف آیا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۴۰ء

کل اور آج بے حد مصروف رہی۔ تمام دن مہمان آتے رہے۔ آج سہ پہر کو جمالی کا خط ملا۔ لطیف و رنگین خط! اس کی دلکش تحریر کو پڑھکر میرے بے رنگ لبوں پر ہلکا سا تبسم آ گیا۔ لیکن جواب نہیں دونگی۔

۲۵ ستمبر ۱۹۴۰ء

اب شملے سے روانگی کے دن قریب ہیں اس لئے وقت بہت مصروف گذرتا ہے۔ آج مسز پرشاد نے کھانے پر بلایا تھا۔ واپسی بہت دیر سے ہوئی۔ اس لئے تکان سے جسم چُور چُور ہے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۴۰ء

پچھلے تین روز سامان سفر درست کرنے اور آنے جانے میں اتنی مصروف رہی کہ روزنامچہ نہ لکھ سکی۔ ظاہری زندگی کا جتنا عیش، جتنا سکون، جتنی خوشی ممکن ہے وہ سب ان دنوں مجھے میسر رہا۔ لیکن دل کے خلا کو کیا کیا جائے جو کسی سامانِ عیش سے پُر نہیں ہو سکتا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۴۰ء

آج دوپہر کو شملے کے دلکش مناظر اور خوبصورت مرغزاروں کو خدا حافظ کہا۔ اب ٹرین وطن کی جانب لئے جا رہی ہے۔

۲ اکتوبر ۱۹۴۰ء

وطن پہنچے دو روز ہو گئے۔ لیکن تکان اُتارنے گھر درست کرنے عزیزوں سے ملنے کے باعث میں روزنامچہ نہ لکھ سکی۔ موسم کافی اچھا ہے۔ میری طبیعت بھی زیادہ نڈھال نہیں ہے۔

۴ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

کل تمام دن شریر شاہدہ اور شوخ چندرا نے دھماچوکڑی مچائی ۔ ان شریروں کے دلآویز لطیفوں کی بدولت خوب وقت گذرا۔ شاہدہ نے اپنی بڑھی ساس کی گنوار بولی کی نقل ایسے مزے سے اتاری کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ۔

آج جمالی کا خط ملا۔ اُس نے پہلے خط کا جواب۔ پاکر بڑے دلکش انداز میں شکوہ کیا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ وہ پرسوں شام کی چائے پہ ہمارے ہاں ہوگا۔ خوب! یہ شخص تو کچھ دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی مثل ہے ”مان نہ مان میں تیرا مہمان“۔

۵ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

شاہدہ آج پھر دوپہر سے نازل ہوگئی تھی۔ جمالی لکھنے کے مطابق ٹھیک دو بجے پہنچ گیا۔ دلچسپ باتوں، ادبی بحث اور پھر جمالی کی دلکش مسحورکن نظمیں سنتے سناتے شب کے ۸ بج گئے۔ اس لئے میں نے اسکو شب کے کھانے کے لئے روک لیا۔ شاہدہ ایک پرکالۂ آفت سے بہت روکا لیکن ۸ بجتے ہی چل دی۔ یہ کہکر کہ میرا میاں بچارا میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ میں اس نگوڑے شاعر کی نظمیں یہاں سُن رہی ہوں اور وہ بچارا مجھے یاد کر رہا ہوگا۔ اس کی شرارت بھری باتیں خدا کی پناہ !

۱۷ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

کل شب کو دیر سے سوئی تھی اس لئے طبیعت سست ہے۔ آسمان پر ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا ہے۔ خوشگوار ہواؤں نے فضا کو سکرآلود کر دیا ہے بہت خوشگوار دن ہے ۔ میں رگ رگ میں ایک زندگی سی محسوس کر رہی ہوں۔ تمام دن کتب بینی میں گذرا۔

۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

آج صبح کا وقت مطالعہ میں گذرا۔ شام کو شاہدہ کے پاس چلی گئی۔ اُس نے بڑے منکسرانہ انداز سے کہا۔ ارے سنبھل ! یہ جمالی تو معلوم ہوتا ہے تیرے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ چل ایسے ہر راہ چلتا میرے پیچھے دیوانہ ہوتا نظر آتا ہے۔ بھلا میں تو ایسی ہی خوبصورت ۔ لیکن دل میں جمالی کے طور و طریق پر غور کرتی ہوں ۔ اور اس کی حرکات پر تبصرہ کرتی ہوں۔ تو شاہدہ کی بات کا تو سے فی صدی یقین کر لینا پڑتا ہے میں بچ رہی ہوں اور وہ میرا دامن پکڑنا چاہتا ہے۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

آج کا دن بہت روشن تھا۔ نیلا آسمان کسی پاکباز کے دل کی مانند صاف تھا۔ میں آج تمام دن اپنے لباس کی درستی میں مصروف رہی۔ سعیدہ کی شادی لگے ہفتے میں ہو رہی ہے۔ تمام دن جگر کی ایک غزل گنگناتی اور سیتی رہی۔

۷ر نومبر ۱۹۴۴ء

سعیدہ کو کل وداع کر کے شب کو بارہ بجے کے قریب گھر آئی۔ مسلسل ایک ہفتے شادی کے ہنگامے میں مصروف رہنے کے بعد بہت تھک گئی تھی۔ آج تمام دن بستر پہ پڑی رہی۔ سردی بھی اب دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۴۴ء

گزشتہ دو روز سخت زکام میں مبتلا رہی۔ سارے جسم میں درد بھی رہا۔ یہ شاید تکان کا نتیجہ تھا۔ آج کا تمام دن کتب بینی اور خطوط کے جواب دینے میں گذرا۔ شام کو شاہدہ کے ساتھ کچھ دور تک چہل قدمی کی۔

۱۲ر نومبر ۱۹۴۴ء

آج صبح کافی ٹھنڈ تھی۔ میں دوپہر تک اپنی ایک نظم مکمل کرتی رہی۔ کھانے کے بعد جمالی کا خط ملا۔ اُس نے لکھا ہے وہ ایک مشاعرے کی شرکت کیلئے ..... جا رہا ہے۔ واپسی پر دو دن کیلئے یہاں بھی ٹھیرے گا۔ میں بار بار اُس سے ملنا نہیں چاہتی مجھے مردوں پر اعتبار نہیں رہا اور پھر یہ شاعر! خودغرض۔ فریب کار مرد۔ آہ فخری! میں کل اسکو اطلاع دیدونگی کہ میں مصروف ہوں اسلئے اُس سے نہ مل سکونگی۔

۱۳ر نومبر ۱۹۴۴ء

آج مطلع ابرآلود تھا۔ میں صبح سے دوپہر تک لکھتی رہی ہوں۔ دوپہر کو کھانا کھا کر بیٹھی ہی تھی کہ شاہدہ آگئی اُس نے رسالہ ”قوس وقزح“ دکھایا۔ اُس میں میری نظم ”بیتے دنوں کی یاد“ ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپی ہے میں اپنی اس کامیابی پر خوش ہوں۔ مگر اُف بیتے دنوں کی یاد.......

۱۴ر نومبر ۱۹۴۴ء

آج بارش ہو جانے کے باعث ٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔ میری مطبوعہ نظموں کے مجموعے پر آج ناز صاحب نے جو ریڈیو پر تبصرہ کیا تھا وہ خوب تھا۔ دوپہر کی ڈاک سے ایک صاحب کا خط بھی ملا۔ انہوں نے میری مدح و ثنا میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ اس خط کو پڑھکر میرے لبوں پر ایسی ہنسی آگئی جیسے پاگل خانے کے کسی پاگل کو دیکھکر ڈاکٹر کے لبوں پر آجائے۔ بیچارے پر بحران طاری ہے۔ میں اس خط کا جواب کیا دوں۔ خاموشی ہی کافی ہے۔

۱۵ر نومبر ۱۹۴۴ء

آج صبح دس بجے شاہدہ کے ساتھ میں خرید و فروخت کیلئے گئی۔ ہماری کار پھاٹک سے باہر نکلی ہی تھی کہ جمالی آتا ہوا نظر پڑا۔ شاہدہ نے کار روک لی۔ میں نے مصروفیت کا عذر کیا۔ معاف کیجئے گا جناب شاعر صاحب تکلیف فرما کر نہ آئیں میں جا رہی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بدنام نہ کیجئے گا۔ نہ میری ہونگی

شاہدہ نے شرارت بھرے لہجے میں فاضی نظریں ڈال کر بے تکلفی سے کہا۔ وہ محبت سے محروم ہوگیا۔ اور چند بے ربط جملے معذرت کے کہکر چلا گیا۔

۱۷ر نومبر سنہ ۴۰ء

آج کئی روز بعد دھوپ نکلی تھی۔ اس لئے اچھا معلوم ہورہا تھا۔ جمالی کا خط سہ پہر کو ملا۔ لفظ لفظ سے مایوسی ٹپک رہی ہے۔ میں نے کج خلقی کی حد تک لاپروائی برتی۔ مگر کیا کروں مجھے اندازہ ہے کہ میرے لئے یہ برا ہے۔ بہت برا کہ میں کسی سے بھی اپنے ماحول کے خلاف ربط بڑھاؤں۔ مناسب و مختصر جواب دیدونگی۔

۱۸ر نومبر سنہ ۴۰ء

آج یوم غالب آل انڈیا ریڈیو پر منایا جارہا تھا۔ میں نے اپنی نظم "غالب" نشر کی۔ اس کی بہت تعریف کی گئی۔ شام کو چندرا کے ساتھ پلازہ میں چلی گئی — تصویر اچھی تھی۔

یکم دسمبر سنہ ۴۰ء

گذشتہ بارہ روز یوں ہی گذر گئے۔ بڑے بھائی جان کے ایک دوست بمع بیوی کے ہمارے مہمان تھے۔ ان کی تواضع میں مصروف رہکر وقت گذرتا معلوم ہی نہ ہوا۔ سیر و تفریح پکنک، سینما انہی ہنگاموں میں یہ دن گذر گئے۔

۲ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج غضب کی سردی تھی۔ بہت پریشان کن ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایسی ہوائیں مجھ جیسی تخیل پرست طبائع کیلئے بہت پژمردہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ صبح سے شام تک میں اپنے دریچے کے سامنے بیٹھی ہوئی رسائل پڑھتی رہی۔ میری نظموں کی مانگ رسائل کے لئے دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ میری یہ ادبی کامیابی میرے لئے مسرت افزا ہے — پر آہ! غم دل کا علاج ...... کاش فکری کو میں بھول سکتی۔

۳ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج شکر ہے ہوا تیز نہیں تھی۔ دن بھی خوب روشن تھا۔ چمکیلی دھوپ ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ آج رسا صاحب بمع ایک اور صاحب کے ملنے آئے تھے۔

۴ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج سردی کی شدت کے باعث مجھے زکام ہوگیا۔ سر میں درد بھی تھا۔ دوپہر کے بعد ذرا طبیعت سنبھلی۔ سہ پہر کو یکایک جمالی آگیا۔ چونکہ گذشتہ مرتبہ میں نے بہت بے رخی برتی تھی اس لئے اس دفعہ میں نے بہت مہربانی کا برتاؤ کیا۔ وہ یاس مجسم ہے۔ کرب و یاس کا گہرا رنگ اس پر چھایا ہوا تھا۔ نظمیں بھی اس نے جو آج دفعہ کا ذکر ہی نہیں بہت زیادہ سوز تھا۔ میں گفتگو میں ہمیشہ اسکو سمجھانے کی کوشش وہ جگہ خلاف سے کرتی ہوں کہ وہ مجھے پانہ سکے گا۔ لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتا ہے۔ شب کے کھانے کے بعد رخصت ہوا۔

۶ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج کا دن خوشگوار تھا۔ میں بستر سے دیر سے اٹھی تھی۔ اخبار ڈاک دیکھنے میں ہی دوپہر ہوگئی۔ آج ایک زنانہ مشاعرے کی صدارت میں نے کی۔ مجمع کافی خواتین کا تھا۔ اب عورتوں میں بھی شعر و ادب کا شوق ہو چلا ہے۔ گو ابھی یہ شوق بالکل رسمی ہے۔ حیا، ناز و عصمت خوب کہتی ہیں۔ شاہدہ کا مزاحیہ کلام بھی خوب رہا۔ اس کی وہ شوخ دلربا صورت اور اس کے پڑھنے کا دلکش انداز دلاویز ترنم غضب یہ کہ ظالم نے اس دور کے دو تین جدید شاعروں کی نظموں کی پیروڈی کی تھی اور مزے لے لے کر پڑھ رہی تھی۔ اس کی شرارت نے تمام مشاعرے میں زندگی سی دوڑا دی۔

۷ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج صبح سعیدہ کا تار ملا۔ وہ دوپہر کو آگئی۔ میں اسے لینے اسٹیشن پر گئی تھی۔ گاڑی بھیج کر میں نے شاہدہ اور چندرا کو بھی بلا لیا۔ وقت خوب گذرا۔ سعیدہ کل صبح کی ٹرین سے لکھنؤ جارہی ہے۔ اس کے دلکش حسن کو ہولئے تاہل کی خوشگوار پون نے اور چمکا دیا ہے کتنی دلربا معلوم ہوتی ہے۔ وہ حسن و شباب میں زندگی کی دلاویز تصویر!

۸ر دسمبر سنہ ۴۰ء

کل اور آج تمام دن میں اپنے سرمائی لباس کی دیکھ بھال میں مصروف رہی شام کو شاہدہ کے ساتھ "پکار" فلم دیکھا۔ اور ہندوستانی تصویروں سے یہ بہتر ہے۔

۹ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج بہت ٹھنڈا دن تھا۔ تمام دن آتش دان کے قریب بیٹھی ہوئی شیلے کا دیوان دیکھتی رہی۔ دوپہر کو ایک اجنبی ادیب صاحب کا خط ملا۔ وہ شاعرہ خواتین کا ایک تذکرہ مرتب کر رہے ہیں اور اس میں مجھ سے امداد کے طالب ہیں — مجھے حیرت ہے بغیر جانے بوجھے کسی اجنبی دوشیزہ کو یہ لوگ کیسے خط لکھ دیتے ہیں۔ ایسے خطوط کو میں ردی کی ٹوکری میں ڈالتے ڈالتے تنگ آگئی ہوں۔

۱۰ر دسمبر سنہ ۴۰ء

غنیمت ہے کہ آج تھوڑی دیر کو دھوپ نکل آئی تھی۔ میں نو بجے کے قریب سو کر اٹھی تھی۔ رات کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے مشاعرہ سنا۔ یہ مشاعرہ کافی دلچسپ رہا۔ جمالی کی نظم بہت اچھی تھی۔ اور صبا کی غزل تو حاصل مشاعرہ رہی۔

...نمبر ۵

...دسمبر ۴۸ء

آج خدا کا شکر ہے مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اور خوشگوار دھوپ ہر جانب پھیلی ہوئی تھی مشاہدہ دوپہر کو آئی۔ وہ جمالی کی کل والی نظم کی بہت تعریف کر رہی تھی۔ واقعی یہ نظم اس درجہ حسین اور اتنی دلکش ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

...ار دسمبر ۴۸ء

آج سخت سردی تھی۔ گذشتہ شب تمام رات بارش ہوتی رہی۔ میں نے تمام دن آتش دان کے قریب بیٹھ کر مطالعہ کرنے میں گذارا۔ شب کو مشاہدہ کے ہاں گئی۔ اس نے آج کی دعوت میں بہت سے لوگوں کو بلایا تھا۔ اس سخت سردی کے باوجود بڑا دلچسپ مجمع تھا۔ مسز سین خوب گاتی ہیں۔ ان بنگالیوں کی آواز میں کا جادو ہوتا ہے۔ گیارہ بجے کے بعد واپس آئی۔

...ار دسمبر ۴۸ء

کل کا تمام دن بستر پر گذرا۔ سخت زکام ہو گیا تھا۔ آج خدا کا شکر ہے طبیعت درست ہے۔ بیگم . . . خاں کے ہاں ایٹ ہوم میں شرکت کی۔ بہت لوگوں سے ملنا ہوا۔ یہ دن انہیں معروفیتوں میں گذر رہے ہیں۔ روز کہیں نہ کہیں جانا رہتا ہے۔

۲۰ار دسمبر ۴۸ء

آج کا دن خوشگوار تھا۔ چمکیلی دھوپ نے رگ و پے میں تازگی پیدا کر دی۔ ...ی۔ دونوں بھائی اور بھاوجیں کرسمس کی تعطیلیں گذارنے ۱۸ار دسمبر کو آئے ہیں۔ تمام وقت باتوں سیر و تفریح میں گذر جاتا ہے۔

۲۱ار دسمبر ۴۸ء

آج بھی شکر ہے سردی زیادہ نہیں ہے دونوں بھاوجوں کے ساتھ خریداری کیلئے چلی گئی۔ دوپہر کو ایک بجے کے بعد صبح کے نکلے ہوئے گھر واپس آئے۔ کھانے کے بعد ڈاک دیکھی۔ جمالی کا خط ملا۔ کل شام کو ملنے آئیگا۔ یہ خبر مسرور کن ہے کل ہمارے ہاں شب کو ایک بڑی دعوت بھی ہے۔ جمالی کی موجودگی اس موقعہ پر یقیناً دلچسپ ہوگی۔

۲۲ار دسمبر ۴۸ء

آج کا تمام دن دعوت کی تیاریوں میں گذرا ہے۔ میں نے خمیری سموسے بنائے میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے سموسے بڑے بھائی جان کو بہت پسند ہیں۔ بڑی بھابی نے انڈوں کا حلوہ بنایا اور چھوٹی بھابی نے مرغ مسلم دم کئے۔ جمالی بھی شام سے ذرا قبل آگیا۔ دونوں بھابیاں آج بہت بھلی لگ رہی ہیں۔ بڑی بھابی کے گورے رنگ پر عنابی بروکیڈ کی ساڑی بہت پھب رہی تھی اور پھر یاقوت کا زیور ان کے دلربا حسن کو دوآتشہ کر رہا تھا۔ چھوٹی بھابی کی من موہنی سانولی سلونی صورت ہلکے گلابی رنگ کی کارچوبی ساڑی اور موتیوں کے زیور میں دل میں کھبی جاتی تھی۔

مجھے بھی ان دونوں کے اصرار سے ضرور تزئین بننا پڑا۔ اس کے بعد ترتیب و زینت کے بعد ہال میں جاتے ہوئے شرم محسوس کر رہی تھی۔ اور ابھی سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہوئی اپنے پر ناقدانہ نظریں ڈال رہی تھی۔ کہ مشاہدہ آگئی اور آتے ہی ایک دھپ رسید کر کے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ادہو ! یہ صاحبہ کس غریب کے حلال کرنے کو سنور رہی ہیں۔ بڑی بھابی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ابھی سرکار آرائش گیسو میں مصروف ہیں۔ تم خود کیا کم قیامت بنی ہو۔ تمہاری یہ نیلی روپہلی تاروں بھری ساڑی اور اس میں تمہارا دلربا چہرہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے نیلے آسمان پر چاند چمک رہا ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ چل جھوٹی اپنے یہ سیاہ زرکار ساڑی میں ناگن تو بنی ہوئی ہے۔ تیرا کاٹا تو آج پانی بھی نہ مانگے گا۔ اور پھر یہ تیرے کانوں کی بجلیاں تو ایک بیچارے شاعر کو پھنسا لینے کے لئے سنہری ملتے ہیں۔ اور یہ چندن ہار تو قیامت ہی ڈھا رہا ہے۔ اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی لغویات سے اکتا کر میں نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا چل بک نہیں۔

ہم دونوں ایک ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ چھوٹے بھائی جان کے دو تین بنگالی دوست وقت سے کچھ پہلے ہی آگئے تھے۔ ان سب سے میرا بھائی جان نے تعارف کرایا۔ دونوں بھابیاں یہاں ابھی نہ آئی تھیں۔ شاید کھانے کے متعلق باورچی کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔ میں اور مشاہدہ ہی صرف خواتین میں یہاں تھیں۔ میں کچھ تو بھاری ساڑی اور زیور سے محجوب تھی۔ کچھ اتنے اجنبی مردوں کو دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔ بھائی جان کے ایک بیرسٹر دوست خواہ مخواہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور میرا دل اُن کے اس طرح گھورنے کی وجہ سے یہاں سے اٹھ کر بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔ میرے مقابل بیٹھی ہوئی مشاہدہ میری سراسیمگی سے لطف لے رہی تھی۔ اور جمالی سے جو اس کے قریب بیٹھا تھا سرگوشی کرتی جاتی تھی۔ جمالی بھی آج سیاہ شیروانی میں رعنائی و زیبائی کا مجسمہ بنا ہوا شان و وقار سے بیٹھا تھا لیکن افسردگی کی ایک ہلکی سی جھلک اب بھی اُس کے چہرے پر پائی جاتی تھی۔ دعوت بہت بڑی تھی۔ دونوں بھائیوں کے دوست، اُن کی بیویاں، کچھ میری سہیلیاں سب چالیس سے زیادہ مہمان تھے۔ پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ قیمتی ساڑیوں اور سینٹ و لونڈر کی خوشبو سے فضا جگمگائی ہوئی اور معطر تھی۔ میرے ذوق ادب سے جن صاحبوں کو واقفیت تھی وہ لوگ میرے گرد تھے اور شعر سنانے کی فرمائش مجھ سے کر رہے تھے۔ بھلا جمالی کے سامنے میں کیا اپنے شعر سناتی۔ گلے کی خرابی کی معذرت کرتے کرتے تنگ آگئی۔ جمالی پر بھی فرمائشوں کی بوچھاڑ ... اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی دلکش نظمیں سنا کر سب کو محظوظ فرما... کلام بہت کیف آور و رنگین ہے۔ کہیں یہ رنگین جال ...

کس قدر حسین و معطر انگیز شعر کہا ہے۔

کھانے بیشمار اور بہت لذیذ تھے۔ دلچسپ گفتگو اور قہقہوں کے درمیان کیا کھایا کچھ یاد نہیں۔ میرے ایک جانب کیپٹن آفریدی شاہدہ کے شوہر اور دوسری جانب نواب زادہ اکبر چھوٹے بھائی جان کے عزیز دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ شریر شاہدہ عین مقابل میں تھی۔ اور اُس کے پاس جمالی بیٹھا تھا۔ شاہدہ اپنی مخصوص نظروں اور شوخی آمیز کنایوں سے مجھے بار بار نادم کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد بھی جمالی کے دلکش کلام کی رنگینی میں کھو کر ایک گھنٹے اور سب ٹھیرے اور بارہ بجے سب مہمان رخصت ہوئے اور یہ دلچسپ و یادگار دعوت ختم ہوئی۔ مجھے آج بہت تکان محسوس ہو رہی ہے۔ مسلسل باتوں اور ہنسی نے بہت تھکا دیا ہے۔

۲۲ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج کا تمام دن بستر پر گذرا۔ گذشتہ شب کی خوشگوار دعوت کا تمام دن ذکر رہا۔ اور جمالی کی دلکش نظموں کو ہم سب گنگناتے رہے۔

۲۳ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج صبح چائے کے بعد میں غسل کرنے جا رہی تھی کہ جمالی کی آمد کی اطلاع ملی۔ میں نے چھوٹی بھابی کو کہا۔ اس سے باتیں کریں۔ میں بھی غسل کر کے پہنچی۔ شعر و ادب اور دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے کرتے کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے کے بعد ندی پر ٹہلتے ہوئے چلے گئے۔ اور وہاں سے واپس آکر جو باتیں شروع کیں تو چائے کا وقت ہو گیا۔ چائے کے بعد جمالی رخصت ہوا۔ اس کی معیت میں میرا وقت اچھا گذرتا ہے۔ میرے اور اُس کے خیالات بالکل ہم آہنگ ہیں۔ شاید اس لئے!

۲۴ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج صبح سے دوپہر تک خطوط لکھتی رہی۔ اس کے بعد بڑے بھائی جان کے ایک دوست کے ہاں بھابیوں کے ساتھ کھانے پر گئی۔ واپسی پر شاہدہ کے ہاں ٹھیری۔ وہ بغیر چائے پلائے بھلا کیسے آنے دیتی۔ کہیں مغرب کے وقت چھٹکارا ہوا۔

۲۸ر دسمبر سنہ ۴۰ء

گذشتہ چار روز بہت مصروف گذرے۔ اس لئے کچھ بھی نہ لکھ سکی۔ آج بڑی خالہ جان کے ہاں میلاد شریف میں گئی۔ وہاں خوب دلچسپی رہی۔ آئینہ سے ایک مدت کے بعد ملنا ہوا۔ بیچاری کی صورت ہی بدل گئی ہے۔ کہاں سکول کی وہ شوخ آئینہ جو سارے سکول میں تھرکتی گنگناتی پھرتی تھی اور کہاں یہ مُردہ دل آئینہ جسکو بیٹھ کر اٹھنا دشوار ہے۔ ہمارے ہندوستان کی ہر بات نرالی ہے۔ یہ بھی کوئی یاد رکھنے کی بات ہے۔ کہ شادی کو ابھی چار سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ اور وہ ابھی پورے دن کا ذکر بھی نہیں ہے کہ تین بچوں کی ماں بن گئی۔ کس طرح غریب ان تین چھوٹے وہ بچہ خطرات سے

بچوں کو سنبھالتی ہوگی۔ میں تو اس کے خیال سے گھبرائی جاتی ہوں۔

یہ ہے ہمارے ہاں کی ازدواجی زندگی کا تاریک رُخ۔ بھوکا اور مفلس ہندوستان کمزور، کمسن مائیں اور مریض ریں گھتے ہوئے بچے۔

۲۹ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج سخت سردی تھی۔ تمام دن آتشدان کے قریب میں اور بھابیاں باتیں کرتی اور نٹنگ کرتی رہیں۔

۳۰ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج کا تمام دن خرید و فروخت میں گذرا۔ شام کو پلازا چلے گئے۔ "میجر باربرا" کافی اچھی تصویر تھی۔

۳۱ر دسمبر سنہ ۴۰ء

اس سال کا یہ آخری دن تھا۔ صبح سے دوپہر تک میں اشعار منثور لکھتی رہی۔ کھانے کے بعد بھابیوں کے ساتھ ندی پر چلی گئی۔ واپس آکر باورچی کو ضروری ہدایات دیں۔ آج چھوٹے بھائی جان نے صرف چند شعرا کو کھانے پر بلایا تھا۔ وہ بھی میری طرح لیلائے ادب کے دیوانے ہیں۔ یہ مجمع خالص ادبی تھا۔ جمالی بھی اس دعوت کی شرکت کیلئے شام کو ہی آیا تھا۔ شاہدہ بھلا کیوں نہ ہوتی۔ وہ تو ادبی محفلوں کی جان ہے۔ جمالی تو خیر اپنی خصوصیات میں کامل ہے۔ لیکن جاذب بھی خوب کہتا ہے۔ ابھی بالکل نوجوان ہے۔ یہ بھی خدا کی دین ہے۔ عمر کا سوال نہیں۔ رسا، ہمدم اور ہیکش کا کیا کہنا۔ ان لوگوں کی تو عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گذری ہے۔ ایک بجے کے بعد یہ دلچسپ بزم برہم ہوئی۔ نئے سال کا آغاز تو بہت دلکش انداز سے ہوا ہے خدا خیر کرے۔ یہ سال میرے لئے بھی خوشی و مسرت لایا ہو۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

آج نئے سال کا پہلا دن ہے۔ چھوٹے بھائی جان کے ایک ہندو دوست کی شادی تھی۔ اس میں چار بجے جو گئے تو کہیں رات کو بارہ بجے چھٹکارا ہوا۔

۳ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

کل مجھے تکان سے حرارت ہو گئی تھی۔ تمام دن بستر پر گذرا۔ آج ننھی پروین کی سالگرہ تھی۔ تمام دن اس کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے درمیان میں بہت مسرور تھی۔ یہ ننھے مہمان اپنے ٹوٹے پھوٹے فقروں سے ہم سب کو محظوظ کر رہے تھے۔

پروین سُرخ غرارے اور قمیص میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اور تحفے اور کھلونے پا کر وہ بہت مسرور تھی۔

---

۴ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

آج صبح سے دوپہر تک میں ایک رسالہ کیلئے ادبی مضمون لکھتی رہی۔
دوپہر کو جمال کا خط ملا۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے غصہ آگیا۔ یہ شخص مجھے بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیسی محبت! کہاں کی محبت! ۔ دھوکا، فریب، دغا فقری کا وہ۔ کیسے پیمان وہ جانفزا دعوے، اس کا اخلاص بھرا برتاؤ اور پھر اسکی بالکل تبدیلی میں بھول نہیں سکتی۔ بھلا نہیں سکتی۔ یہ مرد ہم عورتوں کو خوبصورت کھلونا سمجھتے ہیں۔ اور محبت کو ایک کھیل، چاہا جب تک کھیلتے رہے اور جب اس کھیل سے جی بھر گیا ایک دم چھوڑ دیا۔ میں نے آج ہی اس کو بہت سخت جواب لکھدیا تاکہ آئندہ وہ کوئی بیباکانہ قدم نہ اٹھائے۔ میں اب اس کے کسی خط کا جواب نہیں دونگی۔

۷ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

گذشتہ دو روز بہت پریشانی میں گذرے۔ ننھے خالد کو نمونیہ ہوگیا تھا۔ بیچاری بڑی بھابی نے مسلسل دو راتیں آنکھوں میں گذاری ہیں۔ اور بے چین تو ہم سب ہی تھے۔ آج شکر ہے خطرہ باقی نہیں رہا۔ خالد آج ہوشیار ہے اور ماں پرسکون ہے۔

(باقی آئندہ)

اعلان

ادیب کی ایک کرم فرما اور معاون نے ادبی حلقوں میں محترمہ شیریں کے نام سے معروف ہیں، یہ تجویز پیش کی ہے کہ "ادیب" کے مئی ۱۹۴۴ء کے پرچہ میں زیادہ سے زیادہ اچھے اور منتخب افسانے شائع کئے جائیں۔ اور اس سلسلہ میں اُنہوں نے "ادیب" کے مردانہ اور زنانہ شعبوں کے بہترین افسانوں کے واسطے چالیس چالیس روپیہ کی پیشکش مقرر کی ہے۔

اِس پرچہ کیلئے تمام افسانے مارچ کے آخری ہفتہ تک۔ دفتر "ادیب" میں پہنچ جانے چاہئیں۔ افسانوں کا غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔

افسانوں کے انتخاب کے متعلق آخری فیصلہ اڈیٹر "ادیب" کا ہوگا۔

(منیجر)

نقوشِ ماضی

(از محترمہ آمنہ برجبیں)

مجھے آج تک یاد ہے وہ زمانہ — گذرتی تھی جب زندگی والہانہ
فضاؤں میں رقصاں مسرت کی لہریں — محبت میں ڈوبا ہوا تھا زمانہ
ہر اک بات تھی دلنوازی کے شایاں — ہر اک فکر تھی نکتۂ شاعرانہ
ہر اک ذوق باطن، ہر اک شوق پنہاں — وفا کی حقیقت، جنوں کا فسانہ
نظر روحِ سرشار کا اک تبسم — نفس بربطِ عشق کا اک ترانہ
منانا کہوں یا بگڑنا کہوں میں — خفا ہو کے وہ دردِ سر کا بہانہ
کبھی نرم لہجوں میں رنگیں شکایت — کبھی دشمنی میں کرم کا فسانہ
کبھی شوخ و رنگیں جوانی کی باتیں — مذاقِ محبت کبھی عارفانہ
کبھی روح پرور ادائیں تمہاری — کبھی برہمی تھی سخن گسترانہ
تغافل کے پردے میں دیکھی لگاوٹ — تجاہل، محبت کا رنگیں بہانہ

مگر اب وہ پُر کیف باتیں نہیں ہیں
وہ دِن اب نہیں، اب وہ راتیں نہیں ہیں

تکمیل

(از محترمہ مہر آرا وصفی مُراد آبادی)

ہیرو اور ہیروئن دونوں نوجوان تھے۔ اور ایک دوسرے کے عشق میں سرشار۔ لیکن لڑکی کا باپ اس نوجوان کو مفلس ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے اور اس نے ایک متمول شخص کے ساتھ لڑکی کی بات چیت لگا رکھی ہے۔ یہ آدمی گاؤں کا ضلعدار ہے۔ تین بیویاں دِق میں مر چکی ہیں —— چوتھی زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے (اس ہی موذی مرض میں گرفتار ہو کر) اسی ہی پرانے پلنگ پر اور اس ہی تنگ و تاریک کوٹھری میں گذار رہی ہے۔ جس میں وہ پہلی تینوں زندگی کا آخری لمحہ گذار کر ہمیشہ کیلئے اس ناپائیدار دنیا کو الوداع کہہ گئی ہیں ——— !! یہ ضلعدار صاحب —— ہیروئن کے باپ سے عمر میں چار چھ سال بڑے ہیں اور ایک ہی گاؤں میں رہنے سہنے اور ہم عمر ہونیکی وجہ سے آپس میں دوست بھی ہیں۔ اس ہی لئے ہیروئن ان کو چاچا جی کہتی تھی اب کچھ دن سے وہ اُن سے پردہ کرنے لگی ہے ورنہ اس سے قبل ——— وہ ضلعدار کی سرشادی پر ضلعدار کے ہمراہ ضلعکر کے گھوڑے پر بھی ضرور بیٹھا کرتی تھی۔

شادی کی تاریخیں ٹھہر گئی ہیں —— اگلے ماہ چاند کی اکیس کو بارات آنے والی ہے۔ ہیروئن —— سخت پریشان ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ پھانسی کے اس سخت اور جان لیوا پھندے سے کیسے آزاد ہو ——— باوجود منع کرنے اور ہر ممکن کوشش سے اپنی نارضامندگی ظاہر کرنے کے وہ بجز اس کے اور کچھ حاصل نہ کر سکی کہ اسکی ان کوششوں نے ——— اسکو والدین کی نظروں میں باغی بنا دیا تھا۔ اور وہ سختی سے اسکی رکھوالی کرنے لگے تھے ———

یہاں آکر اُس کا قلم رُک گیا ——— اُس نے میز پر رکھے ہوئے چھوٹے سے خوبصورت رومال سے حسب عادت عینک کے آئینے صاف کئے۔ ایک طویل انگڑائی لی —— اور —— سامنے کھلنے والے دریچہ پر نظریں جما کر ——— دُور —— بہت دُور —— بظاہر وہ پھولوں کے حسین خطے پر نظریں جمائے محویت کے عالم میں ساکت بیٹھی تھی۔ لیکن دراصل وہ سوچ رہی تھی کہ اب افسانے کو کس طرح تکمیل دے ——— !!

ٹریجڈی ——— روح کو لرزا دینے والی — آنکھوں —— سے بیساختہ دریا اشک بہا دینے والی ٹریجڈی —— یا —— پھر — بہترین — دلکش —— کامیڈی —— نہیں —— نہیں —— یہ بھی نہیں ——

اور — وہ —— بھی نہیں —— ! پھر اَور — کیا —— ؟

طرح طرح کے رنگین خیالات —— اُس کے دماغ میں گھوم رہے تھے ——سنیما کی متحرک تصاویر کی طرح نہ جانے کتنے نقشے مختلف انسانی زندگیوں کے دلکش اور روح فرسا نقشے اُس کی آنکھوں کے سامنے لرزاں تھے۔

اور وہ سوچ رہی تھی ——— عورت — مجبوری — پابندی —— لیکن —— کیا وہ ہمت اور استقلال سے کام لیکر بھی —— سماج کے ان دل اور دماغ کو ماؤف کر دینے والے ——— اور رُوح کو پائمال کر دینے والے ——— خوفناک خونی ——— بندھنوں سے کبھی آزاد نہیں ہو سکے گی —— کیا اس کا ہر کوشش ——— سوسائٹی —— کے ماتھے پر کلنک کا ایک سیاہ داغ ہی ہوتا ہے —— ؟ ایثار —— ! وہ اس کی قائل نہ تھی۔ اس کا خیال تھا ——— مشرقی عورت کی غلط تعلیم اور تربیت نے ——— اسکو غلام بنا دیا ہے ——— اور اسی شکل میں یہ "ایثار" ——— اس کی نظر میں انتہا سے گذری ہوئی بزدلانہ حرکت کا ——— نام تھا !!

"باجی ——— باجی ——— باجی ——— جان! یہ نیلوفر کی آواز تھی جو حسب عادت چیختی، چلاتی ——— اُس کی لائبریری میں گھسی چلی آ رہی تھی ——— ڈرائنگ روم میں ——— اُس کے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آوازصات سُنائی دے رہی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ نیلوفر کی عادت تھی ——— جب پروین اس کو تلاش کرنے پر کہیں نہ ملتی۔ تو وہ اس کی لائبریری میں آکر اس کو تلاش کر لیتی ——— ! اس کی اس وحشیانہ حرکت اور بیجا مداخلت نے اکثر ——— پروین جیسی مطالعہ کی عاشق زار ہستی کو برہم بھی کر دیا تھا — کبھی اس کی اس شور و غل اور بے تحاشہ بھاگ کر آنے کی وجہ سے اُس کے افسانے ——— ادھورے ہی رہ جاتے تھے ——— وہ آتی ——— اور باوجود غصّہ اور انکار کے ——— پروین کو زبردستی اُٹھا لے جاتی ——— اور اس طرح اس کا وہ افسانہ جو اس وقت وہ لکھتی ہوتی ناکمل رہ جاتا ——— اور پھر کبھی مکمل نہ ہوتا ——— آج بھی اسی نے ——— پروین ——— کی سفید اور خوبصورت پیشانی پر چند

اہد ـــــ وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگی ـــــ عجب ـــــ بے ہنگم طبیعت پائی ہے۔ اس نے آخر ـــــ اس کی یہ طفلانہ شرارتیں ـــــ کبھی کم بھی ہونگی ـــــ نامعقول کہیں کی ـــــ سامنے کے ـــــ ریشمین پردے کو جنبش ہوئی ـــــ اور نیلو فر ہانپتی کانپتی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا اور بمشکل سانس پر قابو پاکر ـــــ وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔

"باجی ـــــ جان ـــــ اللہ سارے باغ میں ڈھونڈ ڈالا ـــــ کون کم بخت سمجھ سکتا تھا کہ بھلا آپ صبح ہی صبح مطالعہ کے کمرہ میں بلی کی طرح چھپ کر بیٹھ سکتی ہیں۔ غضب خدا کا اتنے سویرے ہی سے کمرہ میں بند ـــــ دماغ خراب ہو جائیگا ـــــ اس طرح ـــــ میرا ـــــ گلا خشک ہوگیا ـــــ باغ میں آوازیں دیتے دیتے ـــــ بھاگتے بھاگتے تھک گئی ـــــ سانس ـــــ پھول گیا ـــــ تب سوچا کہ باجی ـــــ کو اگر تلاش کرنا ہے ـــــ تو اُن کے بِل میں ڈھونڈو ـــــ دن نکلے ـــــ چوہیاں ـــــ بھلا علاوہ بل ـــــ کے اور کہیں ملا کرتی ہیں ـــــ !

"کیا بکواس ہے ـــــ؟" پروین نے چیں بجبیں ہو کر کہا ـــــ بیٹھ جاؤ ـــــ آرام لو ـــــ ذرا سانس قابو میں آئے ـــــ تو پھر کہنا ـــــ آخر کیا قصہ ہے ـــــ؟ اس قدر کیوں پریشان ہو ـــــ لاکھ بار کہا ـــــ کہ میرے حال پر کرم کیا کرو ـــــ جب میں لکھتی یا پڑھتی ہوں ـــــ اُس وقت مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کرو ـــــ مگر تو بہ ہے ـــــ یہ کب ممکن ہے ـــــ میرے کتنے ہی افسانے اسی شریر کی حرکت کی بدولت کبھی پورے نہ ہو سکے ـــــ پروین ـــــ دریچہ پر نظریں گاڑے ـــــ زیرِ لب بڑبڑاتی رہی ـــــ جیسے ـــــ دل ہی دل میں باتیں کر رہی ہو۔

"باجی ـــــ نیلو فر نے غصہ سے گھور کر کہا ـــــ ہم تو آئے ہی اس لئے تھے کہ آپ کو ایک سچا قصہ سنا دیں۔ بڑا حیرت انگیز ـــــ اور پھر آپ اس میں جھوٹی سچی باتیں ملا کر اس کا افسانہ بنا دیں ـــــ اور ـــــ اور ـــــ رسالہ میں شائع کرا دیں۔ غضب خدا کا ـــــ سارے گھر میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی ـــــ اور ـــــ آپ کو اب تک بھی خبر نہیں ـــــ اور اگر میں نہ کہوں تو نہ جانے کب تک پتہ چلے۔

"کیسی خبر ـــــ؟ کیا ہوا ـــــ؟" پروین نے حیرانگی سے سوال کیا۔

"باجی ـــــ وہ ـــــ بھاگ گئی۔ مالی کی لڑکی شامو ـــــ

یاد دہ

دفعہ کا ذکر ہے

قت بھاگ گئی ـــــ ابھی اُس کی ماں روتی ہوئی امی جان کے پاس

وہ جگہ خطرات سے خالی

آئی تھی ـــــ اور باجی ـــــ وہ ـــــ ہمارا ہیرا ـــــ بھی تو رات سے غائب ہے۔ ـــــ سب میں تلاش کرا لیا امی نے ـــــ مگر اس کا پتہ نہیں ـــــ امی کہہ رہی تھیں شامو کی ماں سے ـــــ کہ للتو ـــــ کو وہ کئی ماہ سے بغور دیکھ رہی تھیں۔ اسکی وہ پہلی سی باتیں ہی نہ رہی تھیں ـــــ نہ دل سے کام کرتا تھا اور ـــــ نہ پہلے کی طرح خوش و خرم رہتا تھا ـــــ ہر دم چپ سا رہتا۔ اور کھویا ہوا سا ـــــ باجی! شامو کی ماں ـــــ کہہ رہی تھی کہ شامو کے باپ نے ـــــ بڑی اچھی جگہ شامو کا بیاہ بھی ٹھہرا دیا تھا ـــــ اور اب آٹھ دن بعد اُس کی بارات آنے والی تھی ـــــ اس کا ہونے والا دولہا بہت کھاتا پیتا آدمی ہے اس کے گھر دو بھینسیں ہیں۔ چار کھیت اُس کے ذاتی ہیں ـــــ شامو کی ماں رو رو کر کہہ رہی تھی کہ بدنصیب تھی۔ اگر اس گھر جاتی تو راج کرتی۔ وہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی ـــــ مگر ـــــ (ہنس کر) کمی تھی تو ایک ـــــ کہ لڑکا ـــــ کانا تھا ـــــ اور شامو سے بیس سال بڑا بھی تھا ـــــ پہلی بیوی سے لڑکیاں تو سات ہوئیں اور ہیں۔ مگر لڑکا نہیں تھا ـــــ اور اس لئے دوسری شادی اپنے شوق اور دل سے کر رہا تھا ـــــ

نیلو فر ـــــ کہتی رہی ـــــ اور پروین نے قلم سنبھالا ـــــ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی ـــــ مگر چہرہ ـــــ باسی پھولوں کی طرح اُداس تھا ـــــ اور آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

نیلو فر نے حیرت سے اس اجتماعِ ضدین کو دیکھا ـــــ! مسکراہٹ ـــــ افسردگی ـــــ اور آنسو ـــــ بیک وقت یہ تینوں چیزیں ـــــ!! اُس کے ننھے سے دماغ میں باوجود کوشش اور جستجو کے کچھ بھی نہ آسکا ـــــ!!

افسانہ مکمل ہو چکا تھا ـــــ مگر اب پروین کے دونوں رخساروں پر دو آنسو آنکھوں سے مچل کر لڑھک ہی پڑے تھے۔ جنہیں اُس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں جذب کر لیا ـــــ اب بھی وہ باہر دریچہ کے باہر نظریں گاڑے محو تھی ـــــ بظاہر وہ حسبِ عادت گلاب کے حسین تختہ پر نظریں جمائے محو دید تھی ـــــ لیکن اس کا دماغ ـــــ اب بھی اسی اُلجھی گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا ـــــ کہ عورت کی ہمت ـــــ اور جرأت بھی ـــــ سوسائٹی کے ـــــ ماتھے پر ایک بدنما داغ ـــــ اور سماج جیسے صاف و شفاف آئینہ پر ـــــ ایک ایسی خراش ہے ـــــ جو مٹائی نہیں جا سکتی ـــــ!!

(طلعت زاد)

فلم سٹار

(از سوشیل چندر سانیال)

"محترم اڈیٹر صاحب تسلیم۔

میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں ایک مدت سے فلم سٹار بننے کی آرزو رکھتی ہوں۔ مگر میں نے ہمیشہ فلم کمپنیوں کے دروازے اپنے لئے بند پائے ہیں

میری عمر اُنیس سال اور قد پانچ فٹ تین انچ ہے۔ میں بظاہر ایک دُبلی پتلی لڑکی ہوں مگر ویسے کافی تندرست ہوں سخت سے سخت محنت کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں میری مدد کرسکتے ہیں اور کسی کمپنی سے میرا تعارف کراسکتے ہیں میں اپنی تصویر بھی روانہ کررہی ہوں۔

نیاز مند

مس ناکام"

مندرجہ بالا تحریر ایک خط کی نقل ہے جو میرے ایک اڈیٹر دوست نے مع ایک عدد تصویر کے مجھے روانہ کردی۔ میں نے خط پڑھا اور پھر تصویر پر نظر ڈالی۔ یقیناً یہ ایک نہایت بدصورت عورت کی تصویر تھی۔ اور اُس کے خد و خال کا بھونڈا پن تصویر سے صاف نمایاں تھا۔ میں نے فوراً اس خط کا جواب یوں لکھوادیا کہ "میری اور ایڈیٹر صاحب دونوں کی یہ رائے ہے کہ آپ براہ مہربانی فلمی دنیا کی طرف رُخ کرنے کی کوشش نہ کریں اس راہ میں مایوسی کا سامنا زیادہ کرنا پڑتا ہے اور کامیابی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ تصویر واپس کی جارہی ہے۔ یادآوری کا شکریہ"

تھوڑے ہی دنوں بعد میرے اڈیٹر دوست کو ایک مشہور فلم کمپنی نے رنگا رنگ تصویروں کا ایک سٹ بھیج دیا۔ یہ سب تصویریں مس ناکام کی تھیں۔ ان تصویروں کی اشاعت اور مس ناکام کے متعلق نوٹ لکھنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اڈیٹر صاحب [illegible] تمام مشہور فلمی رسالوں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ نظر آئیں۔ مس ناکام نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کرلی اور انہیں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مس ناکام کا پہلا فلم دیکھنے کے بعد جس میں وہ ایک مشہور ایکٹر کے ساتھ نمایاں تھیں میں نے یہ نوٹ لکھا۔ "دُنیا میں کوئی عورت بدصورت نہیں ہے۔ اور اگر ایسی ہے تو اُسے حسین بننا نہیں آتا۔"

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

کوئی دس کا واقعہ ہے جب بنگال کے ایک مشہور فلم سٹوڈیو میں میں نے اپنا دفتر کھول رکھا تھا اور بہت بڑے پیمانے پر فلمی کاروبار جاری تھا۔ بنگال کی ایک اداکارہ جو اس وقت ایک مشہور فلمی ہیروئین ہیں پہلی دفعہ ایک فلم میں پیش ہوئی تھیں اور اس فلم کو ریلیز کرنے کی تیاری ہورہی تھی اس فلم میں یہ ایک بیکار گریجویٹ بیوی کی حیثیت سے نمایاں ہوئی تھیں۔ یہ ایک نہایت دُبلی پتلی اور کمزور لڑکی تھیں۔ جاذبیت اور کشش سے قطعی خالی۔ میرے ایک فربہ اندام دوست نے جو اب ایک نہایت کامیاب فلمی ادارہ کے مالک ہیں مجھ سے کہا "آپ کو شرمندہ ہونا چاہیئے یہ تمام روپیہ جو اس ایکٹرس کی پبلسٹی اور تشہیر پر صرف کیا گیا ہے ضائع ہوا ہے۔" یہ سُنکر مجھے سخت کوفت ہوئی۔ مگر اس [illegible] نمایاں ہونیوالی ہیروئن کی قسمت مسکرارہی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اس لڑکی کی شخصیت میں ایسی غیر معمولی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی جسکو دیکھکر خیال ہوتا تھا یہ کسی جادو کا نتیجہ ہے۔ وہی دبلی پتلی کمزور لڑکی ایک حسین وجمیل اور ایک باوقار ہیروئن بنکر فلم میں نمایاں ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد وہ [illegible] اور دیوی بن جیسے ڈائرکٹروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ جنہوں نے اسکا تعارف نہ صرف سارے ہندستان سے کرلیا بلکہ اسے اس بلندی پر کھڑا کردیا جہاں مشکل سے کوئی ہیروئن اسکی حریف تھی۔ اور اب میرے وہی دوست جنہوں نے میرے انتخاب پر ملامت کی تھی اس کی شہرت و مقبولیت دیکھکر حیرت زدہ ہیں۔

کوئی ایک سال کا واقعہ ہے میرا تعارف ایک لڑکی سے ہوا یہ ایک بہن لڑکی تھی۔ اور اسکے چہرے پر کہیں ذہانت کے آثار نہ تھے۔ میں نے فو

میں مقبولیت کی قطعی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لڑکی کو دیکھکر میرے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد صرف دو فلموں میں پارٹ کرکے اس لڑکی نے اداکاری کا وہ اعجاز دکھایا کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان فلموں میں یہی خاموش اور شرمیلی لڑکی شگفتگی اور ذہانت کا مجسمہ بن کر سامنے آئی۔

خورسں چندرا وتی مجھے معاف کرینگی اگر میں یہ کہوں کہ آج سے بیس سال قبل یہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی ایک کامیاب آرٹسٹ بنکر سامنے آسکتی ہیں۔ ہر چند کہ اس زمانہ میں ایک خاموش فلم میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کی ایک جھلک پیش کردی تھی۔ وہ اس وقت سترہ سال کی ایک شرمیلی لڑکی تھیں۔ اتنی شرمیلی کہ ان کا اچھی اداکارہ ثابت ہونا بہت مشکل نظر آتا تھا۔

چھایا دیوی جب پہلی دفعہ ایک خاموش فلم میں نظر آئیں تو پریس اور پبلک نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر وہ اپنے سامنے شاندار امکانات رکھتی تھیں اور تھوڑے ہی دنوں بعد دوسرے فلموں میں اداکاری کرکے اپنی شہرت اور مقبولیت مسلم کرالی۔

اوما ساشی جو کافی مشہور و مقبول ہیروئن رہ چکی ہیں پہلے کیا تھیں۔ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ معمولی پبلک سٹیج پر یہ گانے والی لڑکی کسی دن مشہور فلم سٹار بن جائیگی آخر کار بنگال کے ایک مشہور و مستند ڈائرکٹر نے "چنڈی داس" جیسے فلم میں پارٹ دیکر انہیں شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔

مشہور و معروف رقاصہ سادھونا بوس بہتوں کیلئے ایک مدت تک خاصا معمہ رہ چکی ہیں۔ جو لوگ ان کے رقص کے کمالات پر سر دھنتے تھے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ایک کامیاب اداکارہ بھی ثابت ہوسکتی ہیں۔ ہر چند کہ اس باب میں خود میری رائے کسی قدر مختلف تھی۔ میں ان میں ایک اچھی اداکارہ کی صلاحیتیں پاتا تھا۔

لیلا دیسائی میرے نزدیک صرف اتفاق سے ایک کامیاب فلم سٹار بن گئی۔ میں ان کو خوبصورتی کے مقابلہ کیلئے تو بیشک ایک موزوں شخصیت سمجھتا تھا۔ مگر ان میں اداکاری کی صلاحیت مجھے نہیں نظر آتی تھی۔ اب اسکو کیا کہیئے کہ فلمی حلقوں میں انہوں نے آج بے شمار قدردان پیدا کرلئے ہیں۔

یاد داں مرد اداکاروں میں سہگل کی مثال سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ جو انسان دنعہ کا ذکر ہے بعض کے مطابق کسی طرح ہیرو بننے کے لائق نہیں اور جسکا لب و لہجہ خود بنگالیوں کے لئے اجنبیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنی شہرت و مقبولیت کا سکہ ملک کے طول و عرض میں جما لیا ہے۔ یہ اسکی آواز کا افسوں ہے جس نے اسے بہترین اداکاروں کی صف میں نمایاں اور بہت نمایاں جگہ دلادی۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد آتا ہے کہ جب دوستوں کی ایک مجلس میں میں نے محض اس وجہ سے اس کا گانا سُننے سے انکار کردیا تھا کہ اس کی شخصیت اور آداب و طریق کوئی دلکشی نہیں رکھتے تھے۔

ایک دوسری مثال بروا کی ہے۔ انکے بہت سے دوستوں کو یہ گمان نہیں تھا کہ مسٹر بروا اتنے کامیاب ڈائرکٹر اور اداکار بن سکیں گے۔ انکے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ ایک حوصلہ مند نوجوان ہیں اور کچھ نہیں۔ بالکل یہی صورت جمنا کی تھی۔ کسے یقین آسکتا تھا کہ وہ کسی بنگالی فلم میں ہیروئن بن سکتی ہیں۔ لیکن دیوداس میں اداکاری کرکے دونوں نے اپنے کمالات کو تسلیم کرالیا۔ دیوداس میں ان کی اداکاری فلم کی تاریخ میں ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

میرے دوست مسٹر امر ملک خود اپنے متعلق یہ رائے قائم نہیں کرتے تھے کہ وہ کبھی ایک کامیاب ایکٹر بن کر سامنے آسکیں گے۔ کیونکہ اداکاری کا وہ کچھ ایسا ذوق بھی نہیں رکھتے تھے نہ وہ اپنے میں اسکی مناسبت پاتے تھے۔ لیکن اپنے پہلے فلم میں اور پھر "بڑی دیدی" میں انہوں نے ثابت کردیا کہ وہ نہایت کامیاب اداکار بن سکتے ہیں۔

نہین وجمیل جونی پرکاش ایک نہایت شرمیلا نوجوان تھا۔ سب سے پہلے قانی نے ان کی طرف توجہ کی اور مشہور فلم "ڈاکٹر" میں اس کو ہیرو بنا کر پیش کردیا۔ اور اس فلم میں اس نے اپنا پارٹ انتہائی کامیابی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

میں ایسی ہی کتنی مثالیں پیش کرسکتا ہوں جس میں توقعات کے خلاف صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ فلم کی طرف آنے والے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے بارے میں ہم نے کچھ رائے قائم کی اور وہ کچھ اور ثابت ہوئے۔ خود میں نے اپنے مشاہدات اور تجربات خلوص کے ساتھ پیش کردیئے ہیں اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر آپ اداکار بننا چاہتے ہیں تو ممکن ہے آپ کی بھیجی ہوئی دس تصویروں میں سے نو واپس آجائیں۔ لیکن آپ مستقل مزاجی کے ساتھ اسی دھن میں لگے رہیں تو کامیابی بعید از قیاس نہیں۔ ان خوبصورت لڑکیوں کا یہاں ذکر نہیں جن کی طرف ڈائرکٹر خود کھنچتے ہیں۔ یا جنہیں وہ خود کہیں نہ کہیں دریافت کرلیتے ہیں۔

فلمی دُنیا

(از نصیح الدین احمد ایم۔ اے)

(۱) جینت دیسائی پروڈکشن

کا تیار کیا ہوا فلم جگت راج ملک کے گوشے گوشے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ فلم کی کہانی دلچسپی و دلکشی کے علاوہ ایک بلند روحانی و اخلاقی مقصد بھی رکھتی ہے۔ یہ فلم آج بھی موتی ٹاکیز دہلی میں بے شمار شائقین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اس کمپنی کا دوسرا آنے والا فلم زبان ہے۔ اس فلم میں کوشلیا۔ مبارک اور ایشور لال نے اداکاری کی ہے۔ اس فلم سے بھی شاندار توقعات وابستہ ہیں۔

(۲) پنچولی آرٹ پکچرز

کا تیار کیا ہوا فلم پونجی بمبئی، کلکتہ اور پنجاب میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ فلم چودہ جنوری سے لاہور میں بھی شروع ہو چکا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ لاہور کے شائقین فلم ہر شام کو آج بھی ہزاروں کی تعداد میں ہال کے سامنے جمع رہتے ہیں۔ آج بھی کئیوں کو ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے واپس ہونا پڑتا ہے۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے ابھی یہ عرصہ تک لاہور کے شائقین کے لئے باعث کشش رہے گا۔ دلی کے شائقین بھی اس فلم کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے دلی میں بھی اس فلم کا پوری گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جائیگا۔ اس فلم میں راگنی۔ پنت پانڈے اختر۔ منورما کی اداکاری خاص طور پر پسند کی گئی ہے۔ فلم میں اداکاری کے علاوہ گانے اور مذاحیہ پبلک کے لئے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

(۳) بمبئی ٹاکیز

کا تیار کیا ہوا فلم ہماری بات ناولٹی سنیما دہلی میں بڑی دھوم سے چل رہا ہے۔ اس فلم کی روح رواں دُنیائے فلم کی مقبول اور ہر دلعزیز ہیروئن دیویکا رانی ہیں۔ دیویکا رانی ایک عرصہ دراز کے بعد اپنی دیرینہ آب و تاب اور اپنی اداکاری کے مخصوص کمالات کے ساتھ اس فلم میں نمایاں ہوئی ہیں۔ دوسرے اداکاروں میں ممتاز علی کا نام بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں۔ اس فلم نے ہر جگہ خاطر خواہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ دلی نے بھی اس فلم کے خیر مقدم میں پوری گرمجوشی کا ثبوت دیا ہے۔

اطلاع ملی ہے کہ اس کمپنی کے زیر اہتمام سوشیل مزدور ایک اور معاشرتی فلم کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اس فلم کی روح رواں لیلا چٹنس۔ جیراج اور ممتاز ہیں۔

(۴) نیو ہنس پکچرز

کے زیر اہتمام ایک فلم دروپدی تیار ہو رہا تھا۔ گذشتہ کمپنی اس فلم کی تیاری میں بہت تیزی کے ساتھ مصروف رہی۔ فلمی دنیا میں اس فلم کے متعلق مختلف قسم کی خیال آرائیاں ہو رہی ہیں۔ گو جو اطلاعات ہم تک پہنچی ہیں ان کی بنا پر اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ فلم اپنی نوعیت کا ایک نہایت شاندار فلم ہوگا۔ دروپدی کا تاریخی پارٹ ادا کرنے کیلئے سوشیلا رانی کا انتخاب ہوا ہے۔ اور یہ انتخاب ہر طرح لائق تحسین ہے۔ اسکے علاوہ مشہور کیریکٹر ایکٹر مسٹر چندر موہن کی اداکاری بھی اپنی مخصوص اہمیت رکھتی ہے ایک نئی چیز جو اس فلم میں خاص طور پر نمایاں ہے "رس لیلا" ہوگی۔ "رس لیلا" دنیا کے مشہور رقاص مسٹر رام گوپال کا ناچ ہے۔ جسے فلم میں نہایت مناسبت اور دلآویزی کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

(۵) بروا پروڈکشنز

اِن دنوں بڑے اہتمام کے ساتھ ایک فلم "رانی" بنانے میں مصروف رہی۔ اس فلم میں بروا نے خود اور دیوداس کی مشہور ہیروئن جمنا نے اپنی معیاری اداکاری کا ثبوت دیا۔ ان دونوں کے نام دیکھکر فلم کی کامیابی میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ مسٹر بروا فلمی دنیا میں ایک مخصوص مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب ڈائرکٹر ہیں بلکہ ایک نہایت کامیاب اداکار بھی ہیں۔ موصوف نے اس فلم پر بڑی محنت اور توجہ صرف کی ہے۔ گانوں کا معیار نہایت بلند ہے۔

(۶) رنجیت موویٹون

کے تازہ ترین فلم شنکر پاربتی کا رائل اوپیرا ہاؤس بمبئی میں بڑی دھوم دھام سے خیر مقدم ہوا ہے اس فلم میں مشہور و معروف رقاصہ سادھونا بوس نے اس انداز سے اپنے رقص کے کمالات پیش کئے ہیں جو خواص کے علاوہ عوام کیلئے بھی مخصوص دلکشی رکھتا ہے۔ سادھونا بوس نے سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت شنکر پاربتی میں پیش کیا ہے۔ اس فلم کا جس دلچسپی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا ہے اسکو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ ہر جگہ مہینوں توجہ کا مرکز رہے گا۔

(۷) منروا موویٹون

کے زیر اہتمام ہندستان کے مشہور و معروف ڈائرکٹر مسٹر سہراب مودی ان دنوں بڑے عظیم الشان پیمانہ پر ایک فلم "پرتھوی ولبھ" کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ مسٹر سہراب مودی فلمی حلقوں میں ایک نہایت وسیع مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس سے قبل وہ پکار اور سکندر جیسے شاندار فلم تیار کر چکے ہیں۔ یہ فلم ملک کے ہر گوشے سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ شائقین فلم کے دلوں میں ابھی تک ان فلموں کی یاد تازہ ہے۔ تازہ فلم پرتھوی ولبھ کی شاندار تاریخی فلم جس کی کہانی بمبئی کے سابق منسٹر...

ے قلم کا نتیجہ ہے۔ مکالمے اور گیت ہندوستان کے مشہور ادیب سدرشن نے لکھے ہیں۔ یہ فلم یقیناً ایک معیاری فلم ثابت ہوگا۔

(۸) موہن پکچرز

ان دنوں بڑی سرگرمی کے ساتھ ایک فلم "رتن" کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ بااطلاع ملی ہے کہ اب یہ فلم تیار ہو چکا ہے۔ اس فلم کی روح رواں دنیائے فلم کی مشہور و معروف ہستیاں اشوک کمار اور لیلا چٹنس ہیں۔ ان مقبول عام اداکاروں کے نام دیکھنے کے بعد اس فلم کی مقبولیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

اس کے بعد یہ کمپنی دو اور فلم بہت تیزی کے ساتھ رانی تاراستی اور جادوئی قسمت تیار کر رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے یہ فلم بھی موہن پکچرز کے شایان شان ثابت ہونگے۔

(۹) چترا روپا لمیٹڈ

کے زیر اہتمام اور مشہور و معروف ڈائرکٹر دیوکی بوس کی نگرانی میں ایک فلم "صلح" تیار ہوا ہے۔ یہ فلم اپنی کہانی، گانوں اور اداکاری کے لحاظ سے یقیناً ایک کامیاب فلم ہے۔ اس فلم میں مشہور کیرکٹر ایکٹر مسٹر برمن اور انکے علاوہ دیو بالا اور کملا دیوی نے اداکاری کی ہے۔ کہانی خود ڈائرکٹر دیوکی بوس نے لکھی ہے جو بڑی خوبی کے ساتھ فلم میں پیش کی گئی ہے۔

(۱۰) وشنو سینی ٹون

ان دنوں ایک عظیم الشان قدیم کہانی کو فلمانے میں مصروف رہی یہ فلم مایا نگری کے نام سے پبلک کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ اس فلم میں نسوانیت کا تصور اپنی تمام عظمت کے ساتھ نمایاں ہے۔ ڈائرکٹر دھیرو بھائی دیسائی نے اس فلم پر خاص توجہ صرف کی ہے کمپنی اس سے قبل "نور سمندر" "جادو نگری" اور "شاہی فقیر" پیش کر چکی ہے جو خاطر خواہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ تازہ فلم "مایا نگری" کے ساتھ بھی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

(۱۱) نیو تھیٹرز

جو ایک زمانہ میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا فلم پبلک کے سامنے پیش کر چکی ہے ایسے فلم جنکی یاد آج بھی دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ ان دنوں ایک فلم "واپس" کی تیاریوں میں مصروف رہی نیو تھیٹرز کو فلمی دنیا میں جو درجہ و مرتبہ حاصل ہے اسکو مدنظر رکھتے ہوئے اسکی ہر پیشکش شائقین کیلئے ایک مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تازہ فلم "واپس" جس کی روح رواں ایک طرف ہندوستان کے مشہور کیرکٹر ایکٹر نواب اور دوسری طرف مشہور و مقبول بھارتی ہیں اپنے سامنے مقبولیت اور کامیابی کے پورے امکانات رکھتا ہے۔

(۱۲) تلوار پروڈکشن

کا تیار کیا ہوا فلم "خاموشی" کمار تھیٹر میں بڑی دھوم کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس فلم میں مشہور و مقبول ہیروئن رتن مالا نے اداکاری کے کمالات دکھلائے ہیں۔ رتن مالا نے فلمی دنیا میں جو شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے اسکو دیکھتے ہوئے آج یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ فلم بہت دنوں تک پبلک کی دلچسپی کا باعث بنا رہیگا۔ اس فلم کا ذکر مکالمے وغیرہ ہندوستان کے مشہور ادیب امتیاز علی تاج کے زور قلم کا نتیجہ ہیں وہ جگہ خیالات سے کا ادبی معیار بلند ہے۔

غزل

نجمہ تصدق

حادثہ کوئی نیا ہونے کو ہے　　آج میں کیوں اس قدر مسرور ہوں
اللہ اللہ مستی آغوشِ دوست　　خاک ہو کر بھی سراپا نور ہوں
رو رہا ہے دل مگر ازپئے مصلحت　　مسکرانے کے لئے مجبور ہوں
دل اگرچہ آشنائے راز ہے　　کیوں بہک جاؤں کوئی منصور ہوں

میں فقط خود دار ہوں نجمہ مگر
لوگ کہتے ہیں بڑی مغرور ہوں

ہم نہیں تو کیا؟

از محترمہ نواب سیدہ اختر حیدرآبادی

دردِ نیاز و دیدۂ بے نم نہیں تو کیا؟　　محفل میں انکی غیر تو ہے! ہم نہیں تو کیا؟
اے چارہ سازِ درد وفا کم نہیں تو کیا؟　　اس زخمِ آرزو کا جو مرہم نہیں تو کیا؟
اے آفتاب تیری شعاعیں ہوں جاوداں　　ہمراہ تیرے قطرۂ شبنم نہیں تو کیا؟
اُن کے فراق میں ہمیں جینا ہے ناگزیر　　غم بھی بقدرِ حوصلۂ غم نہیں تو کیا؟
کیا خوب یہ عجیب تمہارا ہے جبرِ حسن　　تم ہو تو کائنات ہے اور ہم نہیں تو کیا؟
آنکھوں میں انتظار کی چنگاریاں تو ہیں　　نرگس کے پاس دیدۂ پُرنم نہیں تو کیا؟

اختر کی یہ نوائے پریشاں یوں ہی رہیں
شیرازۂ خیال منظم نہیں تو کیا؟

دیوؤں کے ملک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

(دسویں قسط)

ہوتا تاک میں رہا۔ جونہی گلیور ایک سیب کے درخت کے نیچے پہنچا جو پھلوں سے لدا ہوا تھا تو بونے ... نے کیا کام کیا کہ جھٹ درخت کو جھڑ جھڑ لیا کوئی دس بارہ سیب ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر گرے۔ دیوؤں کے ملک کے سیب تربوز کے تربوز۔ خدا بچا تا رکھے سر بچا ... ایک سیب جو پیٹھ پر آ کر گرا تو اوندھے منہ جا پڑا۔ خوش نصیبی سے زمین زیادہ ... چوٹ لگی مگر کچھ یونہی سی۔ ہاتھ پاؤں کی خیر رہی۔

اگلے دن زمیندار کی لڑکی نے گھاس کے ایک صاف ستھرے تختے پر جا چھوڑا اور وہ اپنی دایہ یعنی زمیندار کی لڑکی کے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ بھادوں کے دن تھے۔ ابر چھایا ہوا۔ اچانک بے سان گمان اولوں کی ایک جھال آ گئی۔ اولے بھی وہاں کے گولے سمجھنے چاہئیں۔ بیچارے کو لمبا لمبا لٹا دیا۔ اب جو اس پر اولے پڑتے ہیں تو یہ معلوم ہوا جیسے آسمان پر کوئی کرکٹ کھیل رہا ہے۔ اور گیندیں اچھل رہی ہیں۔ جوں توں کر کے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل سرکتا ہوا ایک ببول کے پیڑ کے نیچے پہنچا۔ اور اوندھے لیٹ کر اولوں کی بارش سے پناہ لی۔ اگر وہ کھلے میدان میں گھبرایا پڑا رہتا یا پہلے ہی وار میں ایک اولا بھی اس کے سر پر پڑ جاتا تو فیصلہ تھا۔ زندہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

اس باغ میں ایک دوسرا اور واقعہ اُسے پیش آیا۔ خدا نے بڑی مہربانی کی۔ نہیں تو مرحلہ اتنا خطرناک تھا کہ غریب کی لاش کا بھی پتہ نہ لگتا۔ گلیور اکثر لڑکی سے کہا کرتا تھا کہ تھوڑی دیر مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دیا کرو۔ وہ اکیلا بیٹھ کر اپنی آئندہ زندگی کے متعلق سوچنے کیلئے کچھ مہلت چاہتا تھا۔ اپنے گھر اپنے بیوی بچوں کی یاد آتی تھی۔ تصورات کے ذریعے تو کم از کم وہ ان سے مل لیا کرتا ... چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گلیور کو زمیندار کی لڑکی نے کسی جگہ بٹھا دیا۔ اُس کی دانست میں وہ جگہ خطرات سے خالی اور بالکل امن کی تھی۔ گلیور کو اس کی مرضی کے مطابق وہاں چھوڑ کر لڑکی ذرا فاصلے پر چلی گئی۔ اتفاق سے محل کی چند بیگمات بھی اس وقت سیر کے لئے آئی ہوئی تھیں اُن کی باتیں سُننے لگی۔ بیگمیں آپس میں باتیں کرتی اور ٹہلتی جاتیں۔ ٹہلتے ٹہلتے دور نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ لڑکی بھی انکے ساتھ ساتھ تھی۔ اُن کا آنکھوں سے اوجھل ہونا تھا کہ ایک چھوٹا سا سفید کتا دوڑتا ہوا باغ میں آیا۔ یہ باغ کے داروغہ کا جھبرا کتا تھا۔ ہونی شدنی۔ کتا دوڑتا کلیلیں کرتا اس جگہ آ پہنچا۔ جہاں گھاس پر گلیور صاحب تشریف فرما تھے۔ اور اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ خدا جانے تصورات کی دنیا میں کہاں ہوگا۔

کتا اِدھر اُدھر سونگھتا سیدھا چھوٹے آدمی کے پاس آیا۔ اور نہ جانے کیا سمجھا کہ جھٹ اسے منہ میں اٹھا اپنے آقا کی طرف چلا۔ آقا کے سامنے جا کر دم ہلانے لگا اور اپنے شکار کو سہج سے زمین پر رکھ دیا۔ خوش نصیبی سے جانور ذات کا شریف اور پورا تربیت یافتہ تھا کہ اس نے کوئی شرارت نہیں کی اور اس طرح منہ میں اٹھا کر لایا کہ گلیور کے کپڑوں پر بھی اس کے دانتوں سے کوئی کھرونچ نہیں آئی۔

ملکہ صاحبہ گلیور سے بڑی دیر تک باتیں کیا کرتیں۔ باتوں میں عموماً اس کے سمندری سفروں کے حالات سُننا انہیں خاص طور پر پسند تھا۔ جب کبھی وہ اُداس نظر آتا تو طرح طرح سے اُس کا دل بہلانے کا سامان بہم پہنچاتیں۔ وہ یہ سمجھ گئی تھیں کہ گلیور کو پانی سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے ایک دن اُنہوں نے کہا کہ اگر تم ایک چھوٹی سی کشتی کا نقشہ بنا دو تو میں اپنے مستری سے تیار کرا دوں۔

گلیور :۔ حضور کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن میں اسے چلاؤں گا کہاں؟ اس دیوستان کے دریاؤں، ندیوں اور تالابوں سے تو مجھے ہول آتا ہے۔ یہ اتنی گہری اور بے کنار معلوم ہوتی ہیں کہ کہیں ڈوب نہ جاؤں۔

ملکہ :۔ کشتی تو بن جائے۔ پھر اس کا انتظام بھی ہو جائیگا۔ میں ایسی جگہ بھی بنوا دونگی کہ تم بے کھٹکے کشتی چلا سکو۔

گلیور :۔ جیسی آپ کی مرضی۔

چنانچہ مستری بلایا گیا۔ گلیور نے اس سے باتیں کیں تو وہ بڑا کاریگر نکلا۔ اس نے دس دن کے اندر اندر ایک چھوٹی سی نہایت خوبصورت کشتی تیار کر دی۔ یہ کشتی دیوؤں کا تو واقعی کھلونا تھی مگر تمام سامان سے لیس۔ اور اتنی بڑی کہ گلیور جیسے آٹھ آدمی اس میں بیٹھ گئے۔

(باقی آئندہ)

دوائی رجسٹرڈ

کیا ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کی آرزو ہے؟

وہ کون سی خاتون ہے جو نہیں چاہتی کہ اسکی گود ہری بھری رہے۔ دُنیا میں اولاد سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ اولاد کے لئے ہزاروں روپیہ صرف کردیا جاتا ہے۔ مُرادیں اور منتیں مانی جاتی ہیں۔ گنڈے تعویذ کئے جاتے ہیں۔ لیکن اب بہت کم عورتوں کو اس کا علم ہے کہ سیلان الرحم کی وجہ سے اولاد نہیں ہوتی۔ یہ ایک مرض ہے جو خفیہ جسم سے پانی کی شکل میں بہتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شباب آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگتا ہے طبیعت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے۔ بھوک اُڑجاتی ہے۔ قبض رہتا ہے۔ اور جب تک یہ مرض رہتا ہے استقرار حمل ناممکن ہے لہٰذا دَوائی کیلیہ مستورات کو استعمال کرائیے۔ جو ندکورہ مرض کو ہمیشہ کیلئے نابود کرکے اولاد ہونے کی بشارت دیتی ہے۔ اور ماہواری ایام بھی اس دوا کے استعمال سے درست ہوجاتے ہیں۔ قیمت ۲۰ خوراک ۱ روپیہ (ترکیب استعمال دوا کے پیکٹ پر تحریر ہے)

مشہور دَواخانہ۔ فراشخانہ۔ دہلی

نزلہ اور زکام کھانسی کے مریضوں کے لئے سائنٹی فک ایجاد



جدید تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ نزلہ اور زکام کا اصل سبب جراثیم ہیں اور اب ان سائنٹی فک دوائیں نزلہ اور زکام کو دور نہیں کرسکتیں۔ ہمدرد کی مجلس تجربات نے پیہم کوششوں کے بعد نزلی ایک سائنٹی فک دوا ایجاد کی ہے۔ اس کو جراثیم کش دواؤں سے مرکب کیا گیا ہے اور جدید سائنٹی فک آلات سے بڑی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔

نزلی کی چند خوراکیں ہی جراثیم کو فنا کردیتی ہیں اور مرض کو دور کردیتی ہیں۔ ناک کھل جاتی ہے اور سانس صاف ہوجاتا ہے سینے سے بلغم صاف ہوجاتا ہے۔

نزلی جراثیم کو ہلاک کرتی ہے۔ نزلہ اور زکام سے نجات دلاتی ہے۔ شدید کھانسی کو اس کی چند خوراکیں روک دیتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ دماغ کو قوت بھی دیتی ہے۔ اس سائنٹی فک دوا کو آج ہی منگائیے۔

قیمت فی شیشی (دس خوراکیں) ایک روپیہ چار آنے

رسالہ ہمدرد صحت اور ہمدرد شباب مفت طلب فرمائیے۔

ہمدرد دواخانہ۔ لال کنواں ۵۲ دہلی

اہلِ قلم حضرات سے

درخواست ہے

کہ "ادیب" کے لئے مضامین خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھکر روانہ کریں ٹکٹ نہ آنیکی صورت میں نامنظور شدہ مضامین کی واپسی کی ذمہ داری ادارہ پر نہ ہوگی۔

مینیجر "ادیب"

گھر میں ضرورت سے زیادہ غلہ بھرنیکی ممانعت

(ضروری تنبیہ)

زیرتحت دہلی راشننگ ریسٹرکشن آف ایکویزیشن آرڈر ۱۹۴۴ء نافذشدہ ۴ مارچ ۱۹۴۴ء کسی کارخانہ دار یا دوکاندار یا ادارہ وغیرہ کو اختیار نہیں ہوگا کہ وہ بلا لائیسنس مندرجہ ذیل اشیاء خوردنی اس قدر خریدے یا حاصل کرے یا رکھے جو کہ ایک ماہ کے خرچ سے زیادہ ہوں۔

گندم

آٹا۔ میدہ۔ روا۔ سوجی۔ چوکر اور دیگر اشیاء جو گندم سے بنیں

چاول

دھان اور ایسی اشیاء جو چاول سے بنیں

چینی

اس حکم کے خلاف ورزی کرنا جرم ہے نیز اس حکم کا مقصد محض یہ ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہوئے کہ راشننگ کے بعد مندرجہ بالا اشیاء نہیں ملیں گی ضرورت سے زیادہ جمع نہ کرسکیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ راشننگ ہوجانیکے بعد یہ چیزیں نہیں ملیں گی

دہلی راشننگ


بروا پروڈکشنز کا بہترین
کا اعجاز
خود بروا اور مشہور و معروف جمنا
نے معیاری اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے
میں کلاوتی
اور دوسرے اداکار بھی نظر آتے ہیں
ڈائرکٹر: پی سی بروا
میوزک: کمل داس گپتا
جاری کردہ: منورنجن پکچرز دہلی لاہور اور کراچی

سالانہ ... روپے علاوہ محصول ڈاک　　　　قیمت فی پرچہ :- ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب
دہلی

ایڈیٹرز :-
سید محمد ارتضیٰ واحدی　　فصیح الدین احمد　　(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔اے، بی، ٹی

جلد ۶　　اپریل سنہ ۱۹۴۴ء　　نمبر ۶

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد ایڈیٹر نے ... پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ادیب ماندی محل دہلی سے شائع کیا)

از فصیح الدین احمد ایم اے

نئی کتابیں

(۱) ۱۹۴۳ء کی معیاری نظمیں اور غزلیں

شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی ۔ قیمت ایک روپیہ

اس سال مختلف ادبی اداروں سے نظموں کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر تالیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ۔ ہندوستانی پبلشرز نے اس کتاب میں ۱۹۴۳ء کی بہترین نظموں اور غزلوں کو یکجا کر دیا ہے ۔ نظموں اور غزلوں کے انتخاب کے سلسلے میں پبلشرز نے خاص توجہ کا ثبوت دیا ہے ۔ کتاب دور حاضرہ کے تمام معروف شعرا کی نمائندگی کرتی ہے اور ان کے ایک سال کے بہترین کلام کا آئینہ ہے ۔

(۲) فرحت جہاں

از جناب ایم اسلم صاحب

شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی

قیمت ایک روپیہ

زیر نظر کتاب اردو کے مشہور افسانہ نگار ایم اسلم صاحب کے تین افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ پہلا افسانہ "فرحت جہاں" کے عنوان سے کتاب کی زینت ہے ۔ یہ افسانے معاشرتی پس منظر رکھتے ہیں ۔ اور اسلم صاحب کی مخصوص طرز نگارش کا آئینہ ہیں ۔ ہندوستانی پبلشرز اس سے قبل بھی اسلم صاحب کی کئی کتابیں شائع کر چکے ہیں ۔ زیر نظر کتاب ان تصانیف میں ایک خوشگوار اضافہ ہے ۔

(۳) شوہر کا روگ

از جناب نسیم انہونوی

شائع کردہ نسیم بک ڈپو ۔ لکھنؤ ۔ قیمت ۱۲/

زیر نظر کتاب نسیم انہونوی صاحب کا ایک افسانہ ہے جو ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس افسانہ میں ایک شریف خاتون کا جذبہ ایثار پیش کیا گیا ہے ۔ اس افسانہ کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شوہر سے محبت کرنے والی بیوی شوہر کے لئے کیا کیا قربانیاں کر سکتی ہے ۔ اور کیا کیا برداشت کر سکتی ہے ۔ افسانہ پُراثر بھی ہے اور سبق آموز بھی ۔ یقیناً یہ گھریلو زندگی کا ایک کامیاب مُرقّع ہے ۔ زبان صاف اور ستھری ہے ۔

(۴) کنول اور دیگر افسانے

از جناب اعظم کریوی

شائع کردہ عبدالحق اکیڈیمی ۔ اشاعت منزل ۔ اردو گلی ۔ حیدرآباد (دکن)

قیمت ۱۲/

زیر نظر کتاب اعظم کریوی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ اعظم کریوی صاحب اردو کے ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں ۔ ان کے افسانے ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو کر پڑھنے والوں کے دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ چکے ہیں ۔ پریم چند سکول کے افسانہ نگاروں میں اعظم صاحب ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۔ ان کے تمام افسانے عموماً دیہاتی پس منظر رکھتے ہیں ۔ ان کے افسانوں کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر ہندو کردار پیش کئے گئے ہیں کسی مسلمان ادیب کے لئے کامیابی کے ساتھ ہندو کردار اور ہندو سماج کی عکاسی کرنا یقیناً ایک کارنامہ ہے ۔ فرقہ دارانہ تعصب کے زمانہ میں یہ ایک خوش آئند اقدام ہے ۔ زیر نظر کتاب میں تمام افسانے اس خصوصیت کے حامل ہیں کتاب کے آغاز میں پیش کلمہ کے عنوان سے پنڈت دتاتریہ کیفی کی ایک تقریظ بھی شامل ہے ۔ جس میں اعظم کریوی صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے ۔

بچوں کا ادب

(۵) ننھی منّھی بتیاں از جناب شجاع احمد قائد قیمت ۱/

(۶) پرواس

(۷) لاڈلا اکبر	از جناب شجاع احمد قائد		قیمت	۱۰/
(۸) سندری جہاز	"	"	"	۲/
(۹) کپڑے	"	"	"	۳/
(۱۰) سادہ زندگی	"	"	"	۳/
(۱۱) چھو منتر کا دھاگا	"	"	"	۲/
(۱۲) جنگ کے بعد کیا ہوگا	"	"	"	۲/
(۱۳) دستر خوان	"	"	"	۳/
(۱۴) کارخانہ	"	"	"	۳/
(۱۵) عید	"	"	"	۸/
(۱۶) چھتری فوج	"	"	"	۳/
(۱۷) رابنسن کروسو	"	"	"	۱۰/

شائع کردہ عبدالحق اکیڈیمی ۔ اشاعت منزل ۔ اردو گلی ۔ حیدرآباد (دکن)

خوشی کی بات ہے کہ اس طرف بعض اہل قلم حضرات نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ کی ہے جو یقیناً ایک تعمیری اور بنیادی کام ہے۔ ہم اس سے قبل بھی بعض بچوں کی کتابوں پر تبصرہ کر چکے ہیں زیر نظر تصانیف جناب شجاع احمد قائد صاحب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ چیزیں حیدرآباد ریڈیو سٹیشن سے وقتاً فوقتاً براڈکاسٹ ہو چکی ہیں۔ عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد نے انہیں کتابی صورت میں پیش کرکے ایک نہایت اہم فرض انجام دیا ہے ان میں بچوں کیلئے عام معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ یقیناً اس باب میں شجاع احمد صاحب قائد نے بڑی محنت و کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ زبان مجموعی حیثیت سے صاف اور سادہ ہے۔

بچوں کی کتابوں میں کتابت کی غلطیاں بھی کم سے کم ہونی چاہئیں۔ کیونکہ ان کا ذہن ان چیزوں کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ مضامین کا تنوع لائق ستائش ہے بچوں کے کتب خانوں میں ان کتابوں کو ضرور ہونا چاہیئے۔

(۱۸) خانقاہ

از جناب ایم اسلم

مجلد مع گرد پوش صفحات ۲۶۴ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

شائع کردہ عبدالحق اکیڈیمی اشاعت منزل ۔ اردو گلی ۔ حیدرآباد دکن قیمت ۱۲/ عہ

شائع شدہ فروری ۱۹۴۴ء

اردو افسانوں کا کون سا ایسا دلدادہ ہوگا جو ایم اسلم کے نام سے واقف نہ ہو۔ ایم اسلم صاحب کے پہلے ناول سے جو غالباً ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا ان کا نام افسانہ نویسوں کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول کا نام "نرگس" تھا۔ میں نے اس ناول کو صرف ایک ہی بار پڑھا تھا مگر اس میں وہ کچھ تھا کہ "نرگس" کا نام آج تک میری یاد سے محو نہیں ہوا۔ اس کے بعد اسلم صاحب نے بیشمار افسانے اور ناول لکھے جن کی تعداد یقیناً سو سے زائد ہوگی۔ "نرگس" کے پڑھنے کے بعد میں ان کی طرز تحریر کا اتنا گرویدہ ہوگیا تھا کہ کم از کم ان کی ستر فی صدی تصنیفات کو تلاش کر کر کے پڑھا۔ ان کے ہر افسانے کا پلاٹ بالکل نیا ہوتا ہے۔ ان کی قلم سے رومانیت ٹپکتی ہے۔ جس طرح عمدہ سے عمدہ شاعر کی ہر غزل کا ہر شعر عمدہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسلم صاحب کی کم و بیش سو تصانیف سب کی سب اوّل درجہ کا لٹریچر کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتیں۔ مگر چالیس فی صدی کا ضرور اردو کے بہترین افسانوں اور ناولوں میں شمار ہوگا۔ تیس فی صدی اوسط درجے کے قرار پائیں گے۔ اور باقی تیس فی صدی کو اوسط درجہ سے بھی نیچے جگہ ملیگی۔

بحیثیت اڈیٹر مجھے اسلم صاحب کی غیر معمولی رفتار قلم پر تعجب ہوتا ہے ایک ریویو کی ہوئی کتاب کی سیاہی خشک نہیں ہونے پاتی کہ ملک کے کسی گوشے سے اسلم صاحب کا دوسرا مجموعہ ریویو کیلئے چلا آ رہا ہے۔ ان کی مقبولیت صرف پنجاب ہی میں نہیں بلکہ ملک کے تمام اردو داں طبقے میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے ہر حصے سے ان کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی لاہور سے کبھی دلی سے کبھی بمبئی سے اور کبھی حیدرآباد سے۔

زیر نظر مجموعہ اسلم صاحب کی اوسط درجہ کی تصانیف میں سے ہے۔ اس میں نو افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ ایک نئے راز کا انکشاف کرتا ہے۔ رومانیت ہر جگہ موجود ہے۔ افسانوی زبان پر پورا قابو ہے۔ کہانی کے زیر و بم کے استاد بن چکے ہیں۔ مگر سوال صرف یہ ہے کہ دماغ کہاں تک قلم کا ساتھ دے سکتا ہے ؟ شاعر کی طرح افسانہ نویس کو بھی "آمد" اور "آورد" کے مسئلے سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جہاں اسلم صاحب کو "آمد" ہوتی ہے وہاں ان کا مقابلہ مشکل ہے لیکن طبیعت پر جبر کرکے لکھنے بیٹھے اور "آورد" کا دور شروع ہوا۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

(۱۹) تنقید شعر العجم

مولفہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب

قیمت مجلد چھ روپے۔ بلا جلد پانچ روپے

شعر العجم علامہ شبلی مرحوم کی وہ تصنیف ہے جس کی ادبی عظمت مسلّم ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس عظیم اور یادگار تصنیف میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں جو تاریخی اعتبار سے مشتبہ اور بحث طلب ہیں۔

زیر نظر کتاب تنقید شعر العجم میں فاضل پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے شعر العجم

کا اسی [illegible] نظر سے جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے۔ رطب و یابس جو کچھ ان کے مطالعہ میں آجاتا ہے بے تکلفیہ دلچسپ ہو حوالہ قلم کر دیتے ہیں۔ بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعر العجم میں قابل عزت جگہ پائی ہے۔ ظاہر ہے اس کتاب کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنا ایک ایسی ہی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جو ادب اور تاریخ ادب پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اور یقیناً پروفیسر محمود شیرانی فارسی ادب پر گہری اور عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب بلاشبہ عمیق مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ بعض واقعات کی کڑیاں تلاش کرنے کے سلسلہ میں کتنی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

اعتراض عالمانہ اور محققانہ ہیں اور ان کی بنیاد تاریخی حقائق پر ہے۔ اس تنقید سے شعر العجم کی ادبی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ اس کے بہت سے گوشوں کا تاریخ کی روشنی میں مطالعہ ہو جاتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ کتاب ایک تعمیری پہلو رکھتی ہے اور ادب کے ایک طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

(۲۰) مکالمات افلاطون

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

قیمت مجلد [illegible] - بلا جلد [illegible]

فلسفی کی حیثیت سے افلاطون کا نام ہمارے ہاں ضرب المثل بن گیا ہے مگر درحقیقت خالصاً اردو داں طبقہ میں بہت کم لوگ افلاطون کے نظریات اور اس بلند مرتبت فلسفی کے غور و فکر کے نتائج سے واقف ہیں۔ انگریزی زبان میں تو نہ صرف افلاطون کی تصانیف کا ترجمہ ہو چکا ہے بلکہ اور بھی بہت سا ایسا مواد مل جاتا ہے جس کی روشنی میں یونان کے اس مفکر کے نظریات کا مطالعہ ہو سکتا ہے۔ اردو کا دامن اب تک خالی رہا ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب افلاطون کی تصنیف "ریاست" اردو میں منتقل کر چکے ہیں جو علمی حلقوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جا چکی ہے۔

زیر نظر کتاب جو ڈاکٹر سید عابد حسین کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ افلاطون کے آٹھ مکالمات پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ جویٹ کے مشہور انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے۔ مکالمات کے انتخاب کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس خیال کو مد نظر رکھا ہے کہ انہیں مکالمات کا ترجمہ کیا جائے جو نہ صرف علمی حلقوں میں پڑھے جائیں بلکہ عام ناظرین کے لئے بھی دلچسپی رکھتے ہوں۔ اور ان کو بھی دعوتِ غور و فکر دیتے ہوں۔

جہاں تک ترجمہ کی زبان کا تعلق ہے اس باب میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی [illegible] زبان [illegible] اور اسلوب سلجھا ہوا ہے۔ علمی حلقوں میں یقیناً یہ کتاب قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

(۲۱) مشاہیر یونان و روما

ترجمہ از مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

قیمت مجلد [illegible] - غیر مجلد [illegible]

زیر نظر کتاب یونان کے حکیم پلوٹارک کی مشہور کتاب "السیئر" کا ترجمہ ہے۔ "السیئر" کا شمار یورپ کے ادبیات عالیہ میں کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں پلوٹارک نے اپنے وطنی اسلاف کے ساتھ ساتھ روم کی نمایاں شخصیتوں کے حالات اور ان کی سیرتیں بھی قلمبند کی ہیں۔ نسلی طور پر پلوٹارک یونانی تھا اور اسے یونان کا مدح سرا ہونا چاہئے تھا۔ مگر روم کی حکومت اس سے اس نے [illegible] دیانتداری کے ساتھ پیش آئی کہ اس نے روم کے افراد کو بھی تذکرے کیلئے منتخب کر لیا۔ کارناموں کا تذکرہ کرتے وقت یونان اور روم کے درمیان ایک خاص توازن برقرار رکھا گیا ہے۔ ہر یونانی کارنامے کے مقابلہ میں روم کا ایک کارنامہ پیش کیا گیا ہے۔ یونان و روم کے تاریخی اور عظیم الشان کلچر کے مطالعہ کیلئے زیر نظر کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ترجمہ سلیس اور صاف ہے جس میں کتاب کی افسانوی دلکشی کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

(۲۲) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ

مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ

قیمت مجلد [illegible] - غیر مجلد [illegible]

زیر نظر کتاب ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے ڈی لٹ لیکچرار پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ صرف اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں ہندوؤں نے کیا اضافہ کیا یا کہاں تک حصہ لیا ہے۔ بلکہ اس رشتہ اخوت و محبت کا بھی پتہ چلتا ہے جو پچھلی صدیوں میں ہندو اور مسلمانوں میں رہا ہے۔ مغل عہد حکومت میں مسلمان حکمرانوں نے کس حد تک ہندوؤں کو اپنا لیا تھا۔ ان کے دلوں پر اپنی تہذیب کا اتنا گہرا نقش چھوڑا کہ ان کی زبان تک بدل گئی۔ انہوں نے بلا تکلف فارسی اختیار کر لی اور اس حد تک اختیار کر لی کہ اس کے سرمایہ شعر و شاعری میں کافی اضافہ کیا۔ کتاب اپنے اندر نہایت دلچسپ تاریخی سرمایہ رکھتی ہے۔ جا بجا ایسے واقعات کا ذکر ہے جن سے اس زمانے کے معاشرتی اور تمدنی اتحاد کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب نہ صرف ادبی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ اپنے اندر بیش بہا تاریخی مواد بھی رکھتی ہے۔

(۲۳) دیوانِ بہرام

مرتبہ جناب مسلم ضیائی، ایم، اے
قیمت مجلد دو روپے چار آنے

اردو زبان کسی مخصوص فرقہ کی ملکیت نہیں ہے۔ اردو زبان ملک کے مختلف فرقوں کے باہمی میل جول اور ان کے معاشرتی و تمدنی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس زبان کے ارتقا میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی سبھی نے کم و بیش حصہ لیا ہے۔ زیر نظر کتاب انیسویں صدی کے ایک پارسی شاعر بہرام جی جاماسپ دستور کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ ان اشعار میں ایسی پاکیزہ اور چیدہ زبان استعمال کی گئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

خیالات و تصورات کے اعتبار سے بھی اردو کی مخصوص روایتی غزلگوئی سے ہم آہنگی نظر آتی ہے۔

(۲۴) فردوسی پر چار مقالے

از پروفیسر شیرانی صاحب
قیمت مجلد ہے، غیر مجلد ۱۲؍

زیر نظر کتاب ان چار بسیط مقالوں پر مشتمل ہے جو پروفیسر شیرانی صاحب نے ایران کے زندہ جاوید شاعر فردوسی پر لکھے ہیں۔ پہلا مقالہ شاہنامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ پر ہے۔ دوسرے مقالہ کا عنوان ہجو سلطان محمود غزنوی ہے۔ تیسرے مقالہ میں فردوسی کے مذہب سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھا مقالہ یوسف زلیخا فردوسی پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ فردوسی کا شمار دنیا کے چند بہترین شعرا میں کیا جاتا ہے۔ فردوسی کی غیر فانی تصنیف "شاہنامہ" کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق خود انگریزی میں کافی مواد موجود ہے۔ زیر نظر کتاب میں شیرانی صاحب نے فردوسی کے متعلق کافی ادبی اور تاریخی مواد پیش کیا ہے۔ فردوسی کے مذہب۔ فردوسی اور محمود غزنوی کی سرپرستی اور بعد ازاں محمود غزنوی کی عہد شکنی کے بارے میں عجیب عجیب غلط فہمیاں رہی ہیں۔ اس کتاب میں ان مسائل پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ واقعات کو تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ یہ چاروں مقالے ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔

(۲۵) ہمارے بینک

از جناب محمد احمد سبزواری ایم، اے
قیمت مجلد ۲؍۱۲ غیر مجلد ۲؍

ہماری سوسائٹی، ہماری تہذیب اور تہذیب کے ارتقا کی بنیاد وہی معاشیات پر قائم ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی معاشیات کے مسئلہ کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی اب دی جا رہی ہے۔ اس وقت تمام مسائل حیات کو اسی عینک سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر مسئلہ کی جڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ محمد احمد سبزواری ایم، اے نے زیر نظر کتاب لکھکر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہمارے ہاں کتنے ایسے ہیں جو بینک کی اہمیت بینک کے مقاصد، اس کے فوائد و نقصانات سے بے بہرہ ہیں۔ اس کتاب میں بینک کے نظام اور اس کے عمل پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲۶) نظریۂ تعلیم

مترجمہ ڈاکٹر قاضی عبد الحمید ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (برلن)
قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد ہے؍

زیر نظر کتاب یورپ کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر جارج کرشین اسٹائنر کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر بحیثیت فن کے روشنی ڈالی گئی۔ یہ کتاب تعلیمی لٹریچر میں ایک وقیع مرتبہ رکھتی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہماری زبان میں تعلیمی لٹریچر کی سخت کمی رہی ہے۔ بعض حضرات نے اب اس طرف توجہ کی ہے۔ زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ ترجمہ میں زبان کی صفائی اور شستگی نمایاں ہے۔

(۲۷) مانڈو (شادی آباد)

مترجمہ مرزا محمد بشیر صاحب
قیمت مجلد ہے، غیر مجلد ۱۲؍

مالوہ کے ساتھ شیب مالوہ کا تذکرہ آتا ہے۔ مالوہ کے ساتھ بہت رنگین اور شاداب روایتیں وابستہ ہیں مگر بہت کم لوگ مالوہ کے دار السلطنت مانڈو کی صحیح تاریخی عظمت سے واقف ہیں۔ مانڈو عہد قدیم کی ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ شہر جو اب ایک ویرانے سے زیادہ کچھ نہیں فن تعمیر کے عظیم الشان نمونے پیش کر چکا ہے۔ زیر نظر کتاب اس شہر کی عظمت رفتہ کا آئینہ ہے۔

یہ کتاب جناب غلام یزدانی صاحب کی انگریزی کتاب "مانڈو دی سٹی آف جوائے" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے ہندستان کے کیسے کیسے گوشوں میں تہذیب کن بلندیوں تک پہنچ چکی ہے۔

(۲۸) کیفیہ

از پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی
قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد ہے؍

زیر نظر کتاب انجمن ترقی اردو کے سرگرم رکن پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ ہے کتاب میں نہ صرف اردو زبان کا تاریخی ارتقا پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ انشا و املا سے متعلق ضروری امور سے بھی بحث کی گئی ہے۔ پنڈت کیفی ان چند نامنہاد بزرگوں میں سے ہیں جن کو ہمارے کلاسیکل ادب پر عبور حاصل ہے۔ یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد الفاظ کی تکنیک سے بحث کی گئی ہے۔ جو صرف مطالعہ بلکہ کافی غور و فکر کا بھی نتیجہ ہے۔ اس بحث سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کے لئے قواعد اُردو کی معلومات بے حد ضروری ہے۔ انشاء کے سلسلے میں زبان کے بعض نہایت نازک پہلوؤں کی تصریح کی گئی ہے۔ ہمارے تعمیری ادب میں یہ کتاب یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

(۲۹) چند ہمعصر

از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

قیمت مجلد ۴؍ غیر مجلد ۳؍

زیر نظر کتاب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعض اہم شخصیتوں کے بارے میں دوران قیام حیدرآباد دکن میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ یہ مضامین مختلف رسائل و صحائف میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ شیخ چاند صاحب ایم۔ اے مرحوم نے جو انجمن ترقی اُردو کے ایک سرگرم رکن اور مولوی صاحب کے رفیق کار تھے۔ ان مضامین کو بڑی تلاش و تجسس کے بعد یکجا کیا تھا۔ مگر افسوس ان کی حیات میں یہ شائع نہ ہو سکے۔ ان مضامین میں ان اہم اکابرین اُردو کی سیرت اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جنھیں مولوی صاحب نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں کیسے کیسے صاحب جوہر پیدا ہوئے۔ یہ مضامین صداقت و خلوص کا آئینہ ہیں۔ زبان میں مولوی صاحب کی مخصوص سادگی نمایاں ہے۔

(۳۰) کتاب الہند (جلد دو)

مترجمہ جناب سید اصغر علی صاحب

قیمت مجلد للعہ۔ غیر مجلد ہے۔

زیر نظر کتاب مشہور سیاح مورخ البیرونی کی اس مشہور کتاب کا ترجمہ ہے جو اپنے اندر بیش بہا تاریخی سرمایہ رکھتی ہے۔ البیرونی نے ہندستان کے حالات، یہاں کے علوم فنون، یہاں کے رسم و رواج اور تہذیب پر جو گہری نظر ڈالی ہے اور انہیں جس تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ بسیط تصنیف ایک سیاح کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کا ترجمہ شائع کر کے ایک اہم علمی و تاریخی خدمت انجام دی ہے۔

(۳۱) الف لیلہ و لیلہ (حصہ سوم)

مترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد مرحوم

قیمت مجلد صہ۔ غیر مجلد للعہ

الف لیلہ دنیا کی چند مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اختصار و اقتباس کے ساتھ الف لیلہ کے بے شمار تراجم اور ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ خود اُردو میں الف لیلہ کی کہانیوں کے کتنے انتخابات مختلف صورتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب الف لیلہ کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد مرحوم کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے مرحوم کو ترجمے سے خاص شغف تھا۔ اگر عمر وفا کرتی تو کیسے کیسے جواہر پارے اُردو میں منتقل کر دیتے کتاب میں ایک کامیاب ترجمہ کی جملہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ انشاء کی دلکشی شروع سے آخر تک برقرار ہے۔

(۳۲) بھابی جان

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب دہلی قیمت ۲؍

جناب فضل حق قریشی دہلوی کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے افسانے ملک کے ممتاز ادبی رسائل میں شائع ہو کر ناظرین سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کا طرز تحریر ایک خاص رنگینی اور دلکشی رکھتا ہے۔ زیر نظر کتاب ان کے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان تمام افسانوں کی روح رواں "ایک بھابی جان" ہیں۔ ہر افسانے کے پلاٹ کا ارتقا انہیں بھابی جان کے گرد و پیش ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان مزاحیہ افسانوں میں تنوع ہیں۔ اور مزاح کی روح شروع سے آخر تک برقرار ہے۔ ہمارے مزاحیہ ادب میں یہ کتاب یقیناً ایک نہایت دلکش اور خوشگوار اضافہ ہے۔

(۳۳) سادہ و رنگین افسانے

از جناب ظفر قریشی

شائع کردہ عبدالحق اکیڈیمی۔ حیدرآباد دکن

قیمت ۲؍

ظفر قریشی صاحب صحافتی اور ادبی دنیا میں ایک عرصے سے روشناس ہیں۔ ان کے افسانے وقتاً فوقتاً ملک کے ممتاز ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔

ان افسانوں میں زندگی کی حقیقتیں سانس لے رہی ہیں۔ افسانوں کے کردار ہمارے ہی ماحول میں بسنے والے افراد کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ لکھنے کا انداز کافی شعریت لئے ہوئے ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب ہمارے افسانوی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

غالب اور ہنگامۂ حیات

(از علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری۔ بیرسٹر ایٹ لا)

جس طرح عام طور پر ہر شخص ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور ماحول ہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ادیب اور شاعر بھی ماحول کے تحت میں اپنے تخیل اور فکر کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کسی قوم و ملک میں رجائیت رہی تو سلطنت ادیب و شاعر اس سے متاثر ہے۔ ہومر اور ورجل یونان کے رفعت کے وقت پیدا ہوئے۔ شیکسپیر اور ملٹن نے اس وقت انگلستان میں سکہ جمایا جب وہ ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ فردوسی اُس وقت کا شاعر ہے جب ایران میں عرب کے تمدن کے خلاف ردعمل تھا اور ساری قوم میں ایک رزمی کیفیت پیدا تھی۔ حافظ کا طوطی اُس وقت بولا جب تغزل اور تصوف اپنا گہرا اثر رکھتے تھے۔ اردو شاعری کا رواج ایسے وقت میں ہوا جب دلی کی بادشاہت لال قلعہ تک محدود تھی اور گو دلوں میں جبروت کے سے شکوہ کی اب بھی تمنا تھی لیکن یاس و حرماں کا سماں ہر طرف طاری تھا۔ اردو شاعری ایسے ہی اثرات میں ڈوبی ہوئی تھی اور رازِ حیات سے معرا رہی۔ ایسی حالت میں کسی ایسے شاعر کا پیدا ہونا جو سماجی کیفیت سے الگ تھلگ ہو کر ہنگامۂ حیات پر نظر ڈالے اور فلسفۂ حیات کا پیامبر بنے آسان نہیں تھا۔ ایسا شاعر ایسی فضا میں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی مضحکہ خیزی کی جاتی ہے۔ اس پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ اس کا فلسفہ بے معنی کہا جاتا ہے اور اس طرح وہ نظروں سے گر جاتا ہے۔ اور اس کی وہ وقعت نہیں ہوتی جس کا وہ مستحق ہے۔ لیکن اگر وہ ان تمام مصیبتوں کو سہہ کر اپنی ضمیر اور ادراک کی قوت سے مطمئن رہا اور غاکنائے جبرالٹر کی طرح اپنے فلسفہ پر مستحکم رہا تو ایک وقت ضرور آتا ہے جب اسی کا دور دورہ ہوتا ہے اور اس کا فلسفہ اور پیغام لوگوں کو گرویدہ کر لیتا ہے۔ ٹھیک یہی حالت غالب کی تھی۔ غالب پیدا تو اُس وقت ہوا جب اسکے لئے اس کا موقع نہ تھا کہ وہ اپنے فلسفہ کو پیش کرے اور رازِ حیات کی حقیقت کو سمجھائے لیکن ممکنات کی بندش سے آزاد ہو کر اس کا دماغ ماحول سے ہٹ گیا اور اس کی نظریں آگے دیکھنے لگیں۔ اور اُس نے اپنے کلام سے لوگوں کو حقیقت آشنا بنانا چاہا۔ اس وقت اس کی بے قدری ہوئی جیسا کہ ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن آنے والے دور نے جس میں موجودہ دور بھی شامل ہے اُس کے کلام پر عمیق نظر ڈالی اور اُسے صحیح طور پر ایک سچا فلسفی ایک بڑا مدبر اور دریائے حیات کا بہترین تیراک سمجھا۔ خود کیا صحیح پیشین گوئی کی ہے۔

گوئیم اللہ در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ خود بہ گیتی بعد من خواہد شدن

اس کے کلام میں ہر جگہ حیات سے ہم آہنگی اور حقیقت سے یگانگی نمودار ہے۔ انسان کا مرقع کھینچتا ہے تو سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مناظرِ قدرت پر نظر ڈالتا ہے تو اُس کے کلام پڑھنے والوں کو مشاہدہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ خوشی کا ذکر کرتا ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں۔ غم کا بیان کرتا ہے تو آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے محبت کا ذکر کرتا ہے تو پریم کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ وفا۔ بیوفائی۔ وصل۔ فراق اشک و نیاز منی طبیعت ہر چیز پر اس کی روانی قلم ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ وہ مشکلات کو بیان کرتا ہے لیکن اس کا رونا نہیں روتا بلکہ اس کا حل پیش کرتا ہے۔ غم کو مٹانا چاہتا ہے تو اس طرح کہتا ہے کہ اس کا اثر بالکل محو ہو جائے۔

پھیر کر غالب نے رخ سجادۂ تخییل کا
اک نیا میخانہ کھلوا بادۂ تخییل کا

غالب کے دیوان سے چند اشعار منتخب کئے جاتے ہیں اُن کو ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کتنا صوفیانہ شعر ہے اور رازِ حقیقت کا کتنا بڑا نکتہ اس میں مضمر ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نقاشِ حقیقی کے اس شوخی سے جس سے صفائی مراد ہے پیکرِ انسانی کے صفحۂ ہستی پر بھیجا ہے کہ تصویر اس شوخی سے فریاد کرتی ہے یعنی اس جدائی سے جو ہستی کی صورت میں ظہور میں آئی ہے۔ ہر تصویر خالقِ اکبر سے فریاد کر رہی ہے۔ اس تخیل کو اور شاعروں نے بھی ادا کیا ہے مگر جو خوبی اس میں ہے اوروں میں نہیں ہے۔ اور نہ اور اشعار ہم کو حقیقت سے اتنا قریب تر کرتے ہیں جتنا یہ۔

مولانا روم کہتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ؎ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

یعنی نے کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ اپنے مرکزِ اصلی یعنی نیستاں سے جدا ہوگی تو اس میں کرب ہوگا۔ درد ہوگا اور ایک آواز بھی محسوس کی جاوے گی۔ مولانا کی کیا بات ہے بحرِ تصوف کے غواص، آسمانِ رفعت کے حقیقت شناس، لیکن دونوں کے اشعار پر غور کیجئے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ غالب حقیقت کا مرقع حقیقت کے ذریعہ پیش

کرتا ہے۔ مولانا [illegible] تخیل کو آلہ بنا کر حقیقت کے راستے کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ دونوں کا منشا یہ ہے کہ مبداء حقیقی نے جو نئی صورت پیدا کی ہے وہ انسان کی حقیقی نہیں ہے بلکہ اضطراری ہے۔ اس لئے وہ پیچ و تاب میں مبتلا ہے۔ غالب کے شعر میں یہ مفہوم بھی ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو ایک طرف اسکو مقام آلام پاتا ہے۔ دوسری طرف وہ سوال نظر آتا ہے جس کا اظہار پہلی مخلوق نے یوں کیا تھا۔ "اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء" اس لئے اس کا دل کڑھتا ہے۔

اسی خیال کو دوسرے شاعروں نے اس طرح ادا کیا ہے۔ آتش کہتے ہیں ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا

مولانا عاصی کہتے ہیں ؎

دریا سے حباب کی ہے یہ صدا تو اور نہیں میں اور نہیں
مل جاؤنگا تجھ سے بعد فنا تو اور نہیں میں اور نہیں

اس شعر پر غالب کے وقت میں ہی بہت نکتہ چینیاں ہوئیں اور غضب تو یہ ہے کہ طبا طبائی اس کو بے معنی ٹھیر لیتے ہیں۔

(۲) اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اس شعر کا مطلب صاف ہے کہ جس طرح مجھکو وہم غیر سے پیچ و تاب رہتا ہے اسی طرح حقیقت سے بُعد ہے۔ یعنی صوفیانہ خیال میں جب تک غیر اور غیریت کا تخیل ہم میں ہوگا یا ماسوا اللہ کی گنجائش ذہن میں کسی طرح بھی ہوگی ہم حقیقت آشنا نہیں ہوسکتے۔ اور مرکز حقیقی سے دور رہیں گے۔ اسی خیال کو شیفتہ یوں کہتا ہے ؎

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں جو محو ہوا آفتاب میں
سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی
رہزن کی یہ مراد کہ رہرو ہو خواب میں
سب اس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ
آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

شیفتہ کے اشعار اچھے ہیں لیکن اثر پذیر نہیں ہیں۔ غالب نے دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ اور ایک شعر میں جو کچھ کہہ گیا ہے اس کا نقش بھی دل پر ہوتا ہے اور داد سخن بھی نکلتی ہے ؎

(۳) نقش ناز بت طناز بآغوش رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

شاعر کو اس شعر میں رقیب کی ہجو کرنا مقصود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رقیب ایسا بدصورت ہے کہ جب معشوق کی تصویر اس کی ہم آغوشی کی صورت میں کھینچی جائے تو [illegible] معشوق کے حسین ہونے کے وہ بہت بدنما معلوم ہوتی ہے اور مصور کے قلم کی بجائے مصور کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں پائے طاؤس کا قلم ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے اس لئے کہ طاؤس کے سب اعضا حسین ہوتے ہیں لیکن اسکے پاؤں بہت ہی بدصورت ہوتے ہیں۔ یہ شعر رقیبانہ کیفیت کی بہترین تصویر ہے۔ گو کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کیفیت کی پوری تصویر سامنے رکھی ہوئی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ معشوق کیلئے جو الفاظ چنے ہیں اس سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور اس کے تیور کی شان بڑھ جاتی ہے لیکن پھر بھی اس کو رقیب کے ساتھ اس طرح دکھلایا ہے کہ وہ نظروں سے گر جاتا ہے۔ رقابت کی تصویر اور شاعروں نے بھی کھینچی ہے مگر یہ بات پیدا نہ ہوئی مثلاً ؎

حاصل ہوئے مزے ترے خنجر کے غیر کو
سر پر ہمارے مفت کا احسان ہو گیا

(۴) بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہو جاتا ہے اس کی دلیل مصرعہ ثانی میں بیان کی ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے اس کا بھی انسان یعنی انسان کامل ہونا مشکل ہے۔ یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ بہت سے آسان کام بعض وقت بڑے دشوار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی دلیل غالب نے ایسی دی ہے کہ جس کا ہر انسان کو ذاتی تجربہ ہے یعنی انسان اگر اپنی ذاتی تصویر دیکھ لے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہ طرز بیان غالب ہی کا ہوسکتا ہے۔

(۵) ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

اس شعر میں بالکل اچھوتے طور پر اس فطرت انسانی کا بیان ہوا ہے کہ انسان کو جس قدر تھوڑی فرصت ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے وہ کام انجام دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں جس قدر چہل پہل ہے وہ اس یقین کی بدولت ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا زمانہ تھوڑا ہے۔

وقت یا عمر کی قلت دکھلاتے ہوئے شعرائے اور فلسفیوں نے طرح طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مر جاؤ تو بہتر [illegible] کہ تم مرد ہی دنیا سے الگ ہو جاؤ۔ خدا کے دھیان میں مصروف ہو جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ زمانہ بھاگا ہے اس کی قدر کرو۔ اور جتنا عیش و عشرت کرسکتے ہو کرلو۔ امراؤ القیس عرب کے زمانہ جاہلیت کا شاعر بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے

لیکن غالب ہمارے سامنے دُنیائے عمل پیش کرتا ہے۔ اور وقت کی قلت کو بیان کرتے ہوئے نتائج کی تصویر دکھا کر ایک حقیقت پہ بھی ہماری نظر ڈالتا ہے اور ہم میں اُمنگ بھی پیدا کرتا ہے۔ جو حیات کی جان ہی میں ہم کو مدد دیتا ہے۔

(۶) گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر میں دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام دستور ہے کہ جام کی حیثیت دیکھکر شراب دی جاتی ہے۔ اسی طرح لقاء رب کے بار اُٹھانے کا ظرف انسان میں تھا طور میں نہ تھا۔ اس لئے ہم اس کے مستحق ہیں۔ یہ تخیل قرآن پاک سے لیا گیا ہے۔ جس میں یوں کہا گیا ہے کہ ہم نے اپنی امانت زمین، آسمان اور پہاڑوں کو پیش کی مگر وہ متحمل نہ ہوئے۔ ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

بعض اور شعراء اس خیال کو اس طرح اظہار کرتے ہیں :۔

(۱) دردؔ

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

(۲) حافظؔ

آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(۳) خسروؔ

پرتوِ حُسنت نہ گُنجد در زمین و آسماں
در درونِ سینہ حیرانم کہ چوں جا کردہ؟

ان تینوں اشعار میں بہترین شعر خسرو کا ہے۔ دوسرا مصرعہ گو عام دستور کو بتاتا ہے لیکن آج بھی بعض بڑی ہستیوں کیلئے غور طلب ہے۔ غالب کا یہ کمال ہے کہ اس نے پہلے مصرعہ کو بطور ایک قضیہ کے پیش کیا ہے اور دوسرے مصرعے سے اس کو ثابت کیا ہے۔ مجھے شعر کا اتنا ٹکڑا کہ "گرنی تھی برق" پسند نہیں۔ کیونکہ گرنی اور برق دونوں سے ایک تخیل غیر پسندیدہ پیدا ہوتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ محاورہ ناقص ہے یا یہ کہ ایسے موقع پر اسے استعمال نہیں کرتے۔ لیکن میں "لقاء رب" کے لئے اسکو موزوں نہیں سمجھتا۔

(۷) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ دونوں شعر تقریباً ایک ہی خیال کو ادا کرتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ ایک شعر دوسرے شعر کی شرح ہے۔ یہ خیال بہت سے شاعروں نے ظاہر کیا ہے کہ "اے خدا میرے گناہ بہت ہیں انہے مت پوچھ۔ تیرا کرم جو اس سے کہیں زیادہ ہے اس کی طرف دیکھ۔" مثلاً ؎

ہرچند ہم لائقِ بخشش تو
بر من منگر بر کرمِ خویش نگر

مگر غالب کا یہ تخیل بالکل انوکھا ہے۔ کہ جتنے گناہ ہیں اتنے ہی ناکردہ گناہوں کی حسرت کے داغ ہیں۔ اس لئے گناہوں کا حال نہ پوچھ کیونکہ جو گناہ نہیں ہو سکے ان کی یاد آجاتی ہے اور حسرت رہ جاتی ہے۔ بات انوکھی نہ سہی لیکن بالکل سچی ہے۔ انسان کو جب ان چیزوں کی یاد آتی ہے جو اس سے سرزد ہوئیں تو درواقع اُس نے کھو دیئے ہیں ان کی حسرت رہ جاتی ہے۔ یہ ایک نفری بات ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ غالب جو کہ ان جبات پر گہری نظر ڈالتا ہے سب کچھ کہہ دیتا ہے جو اوروں سے نہیں بنتا۔ اسی مضمون کو حضرت داغ یوں فرماتے ہیں ؎

میں گنہگار نہ ہوتا تو الٰہی مجھ کو
ہر برس نامۂ اعمال دکھایا جاتا

(۹) مارا دیارِ یار میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھلی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

بظاہر اس شعر کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ میں بیکس تھا مفلس تھا اس لئے جو وطن سے دُور مرا تو اچھا ہوا کیونکہ میری حالت چھپی رہ گئی۔ لیکن اصل میں شاعر کا مطلب اور مقصد اہلِ وطن کی شکایت ہے کہ انہوں نے میری قدر نہ کی۔ اس تخیل کو بالکل نئے طریقہ سے ظاہر کیا ہے۔ اور اس طرزِ بیان نے اس کیفیت کی تصویر کھینچ دی ہے جو ایسی بے بسی اور بے قدری میں ہوتی ہے۔ اور بھی شعراء نے اس مضمون پر خیال آرائیاں کی ہیں۔ لیکن وہ یہ نفری کیفیت پیدا نہیں کر سکے۔ آتش کا شعر ہے ؎

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

مولانا ناطق فرماتے ہیں ؎

رونے والے نہ تھے غربت کی اجل پر نہ سہی
ہنسنے والا تو وہاں کوئی دلِ زار نہ تھا

(۱۰) غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا وجود میں آنے کے بعد سے مرگ تک غم میں رہنا ایک فطری امر ہے اور جس طرح شمع شام سے صبح تک جلتی رہتی ہے ٹھیک وہی حالت انسان کی ہے۔ اس شعر میں فطری حالت کو ایک قابلِ قبول تشبیہ کے ذریعہ سے اس قابل بنا دیا ہے کہ دل میں جگہ ہو جائے۔

---

(۱۱) مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ جس طرح دہقان اپنا کھلیان جمع کر کے بجلی کو موقع دیتا ہے کہ وہ اُس پر گرے۔ اسی طرح ہم میں جبلّتاً ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو ہماری خرابی کا باعث ہیں یا دوسرے الفاظ میں: انسان فنا ہونے والے عنصروں سے بنا ہے اس لئے ضرور فنا ہوگا۔ انسان کے فنا ہونے کا نقشہ اس سے بہتر کون کھینچ سکتا ہے۔

---

(۱۲) نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

اس شعر میں شاعر نے دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس شخص کو دنیا کی کوئی خوشی نہ ہو اُسے دنیا کی بیوفائی کا غم کیا۔

(۱۳) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ جب دریا میں مل جاتا ہے تو بظاہر فنا ہو جاتا ہے کیونکہ پھر اس کو قطرے کے نام سے کوئی نہیں پکار سکتا۔ مگر یہ فنا دراصل اس کی بقا کا موجب ہے کیونکہ ظاہر ہے بالکل علیحدہ رہ کر وہ مٹ جاتا اور اب دریا میں مل کر وہ مٹ نہیں سکتا۔ صرف اس کا نام تبدیل ہو گیا ہے۔ اسی طرح جب درد حد سے بڑھ جاتا ہے تو بظاہر فنا کر دیتا ہے مگر دراصل وہ درد کی دوا ہو جاتا ہے۔ اور فنا کر کے عالم بقا میں پہنچا دیتا ہے۔

مرنا تو سبھی کو ہے۔ لیکن انسان موت کے تخیل سے ڈرتا ہے اور بھاگتا ہے شاعر اس تخیل کو دور کرنا چاہتا ہے اور بتاتا ہے کہ فنا مقصد اصلی کا حصول ہے۔ اس شعر سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ موت اگر سامنے ہو اور یہ شعر پڑھا جائے تو بجائے قنوطیت کے ایک رجائی کیفیت پیدا ہو جائیگی۔

کوثر لکھنوی نے بھی اس خیال کو ادا کرنا چاہا ہے مگر وہ اثر نہیں پیدا ہوا۔

آخر غمِ فراق ہی راحت فزا ہوا
جب درد بڑھ گیا تو وہی اک دوا ہوا

(۱۴) رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب عشق محبت کے طفیل سے ہے۔ عشق و محبت سے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی معشوق مجازی کی محبت ہے بلکہ زن و فرزند، مال و دولت، ملک و ملت سب پر حاوی ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر خرمن میں برق یعنی دل میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس مجلس کی ہے جس میں شمع نہیں ہے۔

---

(۱۵) قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

مطلب یہ ہے کہ منصور کا ظرف چھوٹا تھا اس لئے چھلک پڑا۔ بلند پایہ انسان جب کسی رفعت کو پہنچے تو اس کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ جوش میں اپنے کو بھول جائے اور کم ظرفی دکھانے لگے۔ "ایاز قدر خود بشناس" کیسے اثر پذیر طریقہ سے غالب نے ایک ضروری سبق دیا ہے۔

---

(۱۶) قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی کا فلسفہ اس سے بہتر کیا بیان کیا جاسکتا ہے۔

غالب عشق و درد تڑپ غم سوز و گداز کو بھی ہمیشہ نئے پیرائے میں پیش کرتا ہے اور ایسے پیرائے میں کہ جو بالکل فطری معلوم ہوتا ہے اور جس سے اثر ہونا لازمی ہے۔

---

(۱۷) دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

غالب کے اشعار رازِ حیات کی ایسی تصویریں ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں ہر پہلو سے مفید ہیں۔ غم ہو تو غم کاٹیں۔ خوشی ہو تو اس میں اور اضافہ کر دیں۔ مشکل ہو تو اس کے حل کرنے کی صورت بن جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اور ضرب المثل کا کام دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

(۱) رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

(۲) عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(۳) تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

(۴) آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۵) مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے

(۶) مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

(۷) دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

(۸) منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

غالب کے کلام میں بیشتر مصرعے اور شعر ایسے ملیں گے جو حیات کے مختلف پہلوؤں کے مضامین کے لئے سرورق بن سکتے ہیں۔ یعنی اتنا بولتا ہوا کلام ہے کہ وہ موضوع متعلق کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ میرے ایک دوست ایک دیوان کا مقدمہ لکھ رہے تھے۔ کہنے لگے زبان اچھی ہے۔ ردیف قافیہ سے اچھا کام لیا ہے۔ لیکن غضب ہے پورا دیوان پڑھ گیا اور میرے مقدمہ کے سرورق کے لئے ایک مصرعہ نہ ملا۔

غالب پر یہ اعتراض ہے کہ اس کی زبان ثقیل ہے۔ بیشک غالب کی زبان میر کی نہیں۔ میر صرف سوز و گداز اور درد و غم کے دریا کا ماہر شناور تھا۔ مگر غالب پیغامِ عمل لیکر آیا۔ جہاں ضرورت ہو وہاں سوز و گداز کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن وہ انسان کو حقیقت آشنا بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ بلند خیال و عالی فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے وہی زبان چاہیئے جو غالب کی ہے معمولی الفاظ ان خیالات کو ادا نہیں کر سکتے۔ ایسے ہی موشگافیوں سے بچنے کیلئے اقبال نے فارسی زبان کی تحت میں پناہ لی۔ اپنے خیالات کے اظہار کیلئے غالب کو نئے محاورے تلاش کرنے پڑے۔ جو اسکے وقت میں قبول نہ ہوئے مگر آج زبان کا زیور بنے ہوئے ہیں۔ ارتقائی کیفیت جتنی بلند ہوتی جائیگی اتنی ہی بلند الفاظ تلاش کریگی ایسے غیر ارتقائی خیالات اور جذبات کسی نہ کسی طرح ادا ہو ہی سکتے ہیں۔ جیسے "مجھے موہ لیو جھلنیاں والی نے دیا" "موہے نیناں مارے رے" وغیرہ۔ مگر جب انسان ارتقائیت کے رتبہ پر چڑھنے لگے گا تو یہ اندازِ بیان کام نہیں دیگا۔ اور ایک وقت آئیگا کہ اس کو میر کی تلاش ہوگی اور تخیل کا دائرہ اور وسیع ہوگا تو بلا غالب کے زبان کے مفر نہیں۔ جو کام صوفیوں نے بڑے بڑے مضامین اور مثنوی وغیرہ سے لیا ہے وہ کام غالب اپنے مصرعوں سے لیتا ہے اور سارے مضمون کی کیفیت ایک دو مصرعے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ درسِ عمل جس پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی ہیں وہ غالب کے چند شعروں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور حاصل ہوتا ہے۔ وہ مناظرِ قدرت جن کے مشاہدے کی کیفیت صفحوں میں ادا نہ ہو۔ غالب اس کو اس طرح ادا کرتا ہے گویا ہم غیبی طور پر اس کیفیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا کی کشاکش اکثر اوقات لاینحل معلوم ہوتی ہے لیکن غالب ہمیشہ ان کا حل پیش کرتا ہے۔ غرض غالب ایک ایسا فلسفی ہے جو رازِ حیات کی حقیقت کو خوب سمجھتا ہے اور اس کی ہماہمی حیات میں ہمارا ہادی بن جاتا ہے۔ وہ شاعر ہے اس معنی میں نہیں کہ ردیف و قافیہ سے موضوع کلام مرتب کر لیتا ہے بلکہ اس معنی میں کہ وہ جذبات کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ ان سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہ ضمیر و ادراک کی قوت و طاقت کو پہچانتا ہے اور اس کو جلا دیتا ہے۔ غرض غالب اصلی معنی میں شاعر ہے۔ غالب کا مقابلہ کسی نے ٹینیسن سے کیا کسی نے ورڈس ورتھ سے کسی نے شیکسپیر و ملٹن سے کسی نے گیٹے وغیرہ سے کیا ہے۔ میرے خیال میں غالب نے عمر خیام اور حافظ کے جام سے مے لی اور اس کا مزہ چکھا۔ رومی کا نغمہ سنا۔ کرشن کی بانسری سنی مختلف باغوں کی سیر کی۔ اور گل بوٹوں کا عرق چوسا اور مثل شہد کی مکھی کے ایک نرالا شہد تیار کیا جو نہایت خوشبودار اور نہایت شیریں ہے۔ اور لطافت میں اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ جذبۂ دل ابھارنا چاہتا ہے۔ تو شبلی و حافظ کا تغزل پیش کرتا ہے۔ حیات کی گتھیوں کو سامنے لاکر حل بتانا چاہتا ہے تو گیٹے کے قالب میں نمودار ہوتا ہے۔ وجدان اور معرفت میں ڈوبتا ہے تو رومی سے سبق لیتا ہے مناظرِ قدرت کا سماں دکھاتا ہے تو ورڈس ورتھ روپ میں آ جاتا ہے۔ درسِ عمل دینا چاہتا ہے تو سعدی اور جامی کی اخلاقی کشتیوں میں تیرتا ہے۔ مے سے مستفید ہونا چاہتا ہے تو عمر خیام کی طرح بے خودی پیدا کرتا ہے۔ غرض وہ ایک ہی وقت میں شاعر، فلسفی صوفی اور معلمِ اخلاق ہے۔

چکبست کی شاعری

از جناب عبداللطیف بی۔ اے (علیگ)

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں پائی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی ۱۹۲۶ء میں انتقال فرمایا۔ مرزا کاظم حسین صاحب نے آپ ہی کے مصرعہ سے تاریخ نکالی۔

مصرعہ سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کی پیدائش کے وقت غدر کا پچیسواں سال ختم ہو رہا تھا اور اسکے ...کے تمام ... ظاہر ہو رہے تھے۔ ایک طرف کچھ لوگوں میں اضمحلال اور بے سکتی پیدا ہو رہی تھی تو دوسری طرف کچھ لوگوں کو اپنا تمدن اور مذہب خوف و خطر کے بھنور میں گرفتار نظر آرہا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو مغربی اثرات کو قوم کے حق میں زہر سمجھتے تھے دوسری طرف وہ لوگ تھے جو مغربی فہم و فراست، تہذیب و تمدن کے آگے نہ صرف سر تسلیم خم کر چکے تھے بلکہ مہذب محکوم کی سی زندگی گذارنے کے لئے ان چیزوں کا اختیار کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اس موخر الذکر طبقہ کی نمائندگی سر سید احمد خاں نے کی۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے ہندوستانیوں کی نظریۂ زندگی میں ایک انقلاب رونما کر دیا۔ جس کا گہرا اثر سیاست اور مذہب دونوں پر پڑا۔

سیاسی اعتبار سے بھی یہ وقت اہم تھا مختلف جماعتیں و تحریکیں مثلاً کانگریس، لبرل اور Servants of India society نہایت خلوص اور تندہی سے اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ سیاسی تغیرات بڑی سرعت کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ بایں وجہ ہر ہندوستانی غلامانہ زندگی سے بیزار، آزادی کا خواستگار اور "بطن گیتی" سے "آفتاب تازہ" کے پیدا ہونے کا نہایت سختی سے انتظار کر رہا تھا۔

یہ تھا سیاسی ماحول جس میں چکبست پیدا ہوئے۔ ان کا تمدنی ماحول لکھنؤ کے شرفاء کا ماحول تھا جس کے تہذیب و تمدن، معاشرت و اخلاق کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگ رہے تھے۔ اسی لئے چکبست نے لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی کو پورے طور پر اپنایا نہیں لیکن بعد میں اصلاح و ترمیم کر کے اس کے مخصوص و بہترین روایات کو انہوں نے اپنی زندگی میں داخل ضرور کیا۔ وہ کشمیری پنڈت تھے۔ جن میں کشمیری پنڈتوں کی مشہور و معروف صفات خلاً ذکاوت و جدت پسندی بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔

جن شخصیتوں سے چکبست متاثر یا مستفید ہوئے ان میں ڈر. گوکھلے اور تلک کے علاوہ شعر و شاعری کی دنیا میں انیس۔ آتش و غالب ہیں۔ پنڈت بشن نرائن در کی انسانیت و اخلاق اور اخوت کے جذبوں سے بھی چکبست بہت متاثر ہوئے۔ وہ ان کے علم اور بلندی نظر کے قائل تھے۔ چنانچہ ان کو گلشن علم و ادب کا چمن آرا اور مطلع دانش و بینش کا ستارا کہکر پکارتے ہیں۔ تلک اور گوکھلے کی بے لوث زندگی اور قومی جانفشانی کو وہ بہت سراہتے ہیں۔ اور اس میدان میں وہ انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

چکبست کی زندگی پر جن شعراء متقدمین کا اثر پڑا ہے۔ ان میں تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زبان کی صفائی۔ روزمرہ کا استعمال۔ بندش الفاظ اور کلام میں کہیں کہیں شان استغنا ہمیں آتش کی یاد دلاتی ہے۔ علوئے تخیل، فلسفیانہ زاویۂ نگاہ۔ فارسی کی لطیف تراکیب غالب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ کلام کی روانی، شوکت الفاظ سلاست و جوش بیان دیکھکر انیس کا رنگ یاد آجاتا ہے۔ لیکن ان تینوں میں سب سے گہرا اثر انیس کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چکبست کے بعض بندوں کے اتار چڑھاؤ۔ رکھ رکھاؤ اور تراکیب الفاظ پر انیس کے بند کا دھوکا ہوتا ہے۔

چکبست کی شاعری کے تین دور کئے جاسکتے ہیں۔ پہلا دور ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۵ء تک۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک اور تیسرا دور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۹ء تک۔

چکبست نے (بعض حضرات کا کہنا ہے) نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور سولہ برس کے عرصہ تک یعنی ۱۸۹۸ء تک وہ اچھے خاصے شاعروں میں شمار کئے جانے لگے تھے۔ یہ زمانہ ان کی طالب علمی کا تھا۔ اس دور کی چند غزلیں اور کل آٹھ نظمیں ہمیں "صبح وطن" میں ملتی ہیں اور "مرقع عبرت" ان میں سب سے اہم ہے۔ کیونکہ اس نظم میں ان کے تمام مرکزی تصورات یکجا طور پر مل جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چکبست دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس نظم سے معلوم ہوتا ہے۔ چکبست میں غیر معمولی صلاحیت قدرت نے ودیعت کی تھی اور اس پر انیس کی شاعری نے

گہرا اثر چھوڑا تھا کیونکہ "مرقعِ عبرت" تمام تر انیس کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اور کہیں کہیں الفاظ تک انیس کے مرثیوں کی تقلید کی گئی ہے۔ وہی جوشِ بیان وہی طرزِ ادا جو انیس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں یہ بھی ہے لیکن چھوٹے پیمانے پر اس نظم میں جہاں انہوں نے کشمیر کا کشمیر کی فضاؤں کا اور ڈل جھیل کا تذکرہ کیا ہے وہاں منظر کشی میں کمال کر دکھایا ہے۔ وہ دامنِ کہسار میں لالے کے پھول کھلاتے ہیں۔ ترنمِ لبِ آبجو کو معنی کے گلے سے نکلی ہوئی صدا بتاتے ہیں۔ ڈل جھیل میں عکسِ چراغاں بستاروں کی طرح چمکتا ہوا دکھاتے ہیں اور پہاڑوں سے برف کے جھالے منجمد شکل میں بہاتے ہیں۔ اور اس کے بعد قوم کی ناگفتہ بہ حالت پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ کیونکہ پیروں میں ان کو بصیرت اور جوانوں میں جوانمردی، ہمت، عزم و استقلال کی کمی نظر آتی ہے۔ لیکن وہ رو کر ہمیں افسردہ نہیں کرتے بلکہ دور کرتے پاتے اور آزادی واصلاح کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اس کے حصول کی راہ میں مذہب انہیں روڑا معلوم ہوتا ہے لہٰذا مذہب کے خود غرض پجاریوں اور "پیرانِ نکوکار" پر طنز کرتے ہیں اور ان کو پیروی عہدِ کہن" اور "بیجا نمائشِ مذہب" سے منع کرتے ہیں۔ آخر میں سب کو تنبیہ کرتے ہیں جن میں وہ قوم کی غفلت، خیرہ گی نشۂ دولت، معز دلی آئینِ شرافت اور دشمنِ اخلاق شرابیت کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور انسانوں کیلئے ایک معیار پیش کرتے ہیں۔ جس میں انسان سے انسان کی محبت و اخوت بنیادی اصول ہے۔

اس دور کی دوسری قابلِ ذکر نظم "جلوۂ صبح" ہے۔ یہ بھی ۱۸۹۸ء میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی اعلیٰ درجہ کی منظر کشی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ "آبِ انگور" میں شراب کے اثرات اور اس کے بُرے نتائج کا ذکر نہایت عمدہ اور لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔ انکا خیال ہے کہ مے نوشی سے انسان کے دل میں انسان کی بھی محبت باقی نہیں رہتی ہے۔ وہ زبان کے لئے اس کو گو رشکِ انگبیں سمجھتے ہیں لیکن جگر کے لئے یہ آبِ آتشیں سے کم نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کا سرور خمار رنگ لاتا ہے۔ مگر ان کا قد انسان کے قلب کو خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ یہی وہ شے ہے جو کلیوں میں آگ لگاتی ہے۔ یہ وہ عصمت کو چاک کراتی شباب کو برباد کرتی اور آرزو و اُمنگ کو بالآخر پامال کرتی ہے۔ لہٰذا چکبست جن کے دل میں قومی درد اور محبت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگتے ہیں کہ ع

کسی کے دل میں الٰہی نہ ہو ہوائے شراب

اس دور میں قومی اور اصلاحی نظموں کے علاوہ دو نوحے بھی ملتے ہیں۔ ایک "مہادیو گووند رانا ڈے" اور دوسرا "پرتاپ کشن گرٹو" کا۔ پہلا ۱۹۰۱ء میں دوسرا ۱۹۰۴ء میں لکھا گیا۔ ان میں سیرت نگاری اور ماتم دونوں ملتا ہے اور جہاں تک طرزِ بیان کا تعلق ہے۔ یہ کافی حد تک درد اور محاکاتی رنگ لئے ہیں۔

زبان عموماً سادہ اور عام فہم ہے۔ اس لئے پُر اثر بھی۔

اس دور میں چند غزلیات بھی ملتی ہیں۔ جن میں پیامی رنگ نہیں بلکہ حُسن و عشق کا رنگ کارفرما ہے۔ وہی بے خودی، وہی ساغر و شباب، او رحُسن ولت ط، وہی بلبل و قفس، وہی زاہد سے چھیڑ چھاڑ۔ ان غزلوں میں بھی ملتا ہے جو پُرانی رنگ کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

چکبست کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں بہت کم نظمیں ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں وہ نثر کی طرف متوجہ تھے لیکن اس دور کی نظموں میں احساس حب الوطنی کی پہلے سے زیادہ کارفرمائی ملتی ہے اس دور کی سب سے مشہور نظم "خاکِ ہند" ہے۔ جس میں چکبست کی وطن پرستی کا پوری طرح سے مظاہرہ ہوا ہے۔ یہاں ان کا اسٹائل بھی نکھرا اور پختہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم میں تشبیہوں اور استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کام لیا گیا ہے۔ وہ پہلے خاکِ ہند کی عظمت، سطوت اور زینت کو بیان کرتے ہیں۔ اس کی تاریخ کو بے نقاب کر کے موجودہ زبون حالی کا رونا روتے ہیں۔ اور مادرِ وطن کو ایک لاش بے کفن کہکر اس سر کو انتہائی درد و کرب اور مصیبت و ابتدار کا سامان بخشتے ہیں۔ اور بالآخر مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹانے اور اس راکھ سے اٹھتے ہوئے شرارے دکھانے کی "صورِ حبِ قومی" سے التجا کرتے ہیں اور "مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو" کہکر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایک غزل نما نظم "مذہبِ شاعرانہ" کے عنوان سے ملتی ہے۔ جس میں وہ اپنا نظریۂ زندگی یوں بیان کرتے ہیں:-

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بُت خانہ ہے میرا

اس دور میں ہمیں پختگی اور انفرادیت زیادہ ملتی ہے۔ فارسی تراکیب اعتدال کے ساتھ ہیں۔ سادگی اور شگفتگی بھی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ الغرض اب شاعر پہلے سے بہتر شعر کہتا ہے۔

چکبست کی شاعری کا تیسرا اور زریں دور ۱۹۱۱ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کی شاعری ان کی شخصیت کی پوری طور پر ترجمان ہے۔ پہلے دور میں چکبست انیس کی تقلید کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے دور میں انیس کا رنگ چھوڑ کر اپنا ذاتی رنگ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن تیسرے دور کی شاعری میں نہ صرف انفرادیت جلوہ فگن ہے بلکہ ایک خاص قسم کی پختگی اور بلند آہنگی بھی ملتی ہے۔ یہاں آکر چکبست خالص ہندی بن جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو ہندوستان کی روشنی میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ اہلِ ہند میں قوم کا سودا، وفا کا شوق اور خدمت کا جذبۂ پاک پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور قوم کی خدمت اور وطن کی آزادی ان کا

کے ساتھ ان کی شخصیت آجاتی ہے۔

نظموں کے علاوہ انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور ایسی غزلیں جس کو "حسرت صاحب" روحِ روانِ اُردو کہتے ہیں۔ "طبع خداداد، ذہن فلسفہ دان" ذوق ادبی بلند۔ طبیعت حساس اور ملکۂ شعری بے حساب پایا تھا۔ شروع میں پرانی طرز پر چند غزلیں لکھیں۔ کیونکہ جس وقت انہوں نے لکھنؤ میں ہوش سنبھالا۔ امیرؔ و ناسخؔ کا رنگ لکھنؤ پر چھایا ہوا تھا اور داغؔ کے صنم خانۂ عشق کی ہر غزل گو شاعر پرستش کرتا تھا۔ لیکن چکبست نے لکھنؤ کی فضا کے بجائے ملک کی عام فضا کا اثر لیا اور جلد ہی اس رسمی شاعری سے کنارہ کشی کی اور حالیؔ کے مشورے کے مطابق غزلوں میں وسعت پیدا کرنے کے لیے مضامین کو باندھنا شروع کیا جن میں قومی، مذہبی اور اخلاقی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس طرح چکبست نے نظموں کی طرح اپنی غزلوں سے بھی صحیح شاعری اور بلند شاعری کا کام لیا۔ وہ اپنی غزلوں میں آزادی کا پیام بھی دیتے ہیں اور نظام حکومت کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ فلسفۂ زندگی بتاتے اور اخلاق کی اہمیت بتاتے ہیں۔ وطنیت کی اشاعت اور مغربیت کی برائی کرتے ہیں۔ اور یہ سب اس طرح کہ ان میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ زندگی کو "عناصر میں ظہور ترتیب" اور موت کو "انہیں اجزا کا پریشاں ہونا" کہکر زندگی کی اہمیت کیلئے اقبالؔ کی طرح وہ مرد کامل کی پرستش کو اپنا دین اور "تمنائے وفا" میں مرنے کو اپنی آبرو سمجھتے ہیں۔ اقبالؔ کی سوز آرزو کی طرح درد الفت کو وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یہی زندگی میں برق و شرار کی تیزی و تمکنت پیدا کرتی ہے۔ اور پستی اور کم ہمتی سے ہم کو نجات دیکر بلند ہمت و بلند تر بہت کرتی ہے اور منزل مقصود تک ہمیں پہنچاتی ہے اسی سے ہم میں "پاسِ انسان" اور "خدمت انسان" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ "خدمتِ انسان" کی سب سے احسن صورت انسان کو آزاد و خود مختار کرانا ہے اس کے لئے "دوسرے سے خون بہانے" پر بھی تیار ہوتے ہیں۔ اور یہیں سے اپنی بداعمالی کی بنا پر اپنے کو گرفتار بلا پاکر "آزادی کا دیوانہ" بنانا چاہتے ہیں۔ دیوانگی میں پہلا سبق پریشانی اور مصیبت کا ہوتا ہے۔ اس میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ ؎

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں

جوہر مردانہ ذوق و شوق کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور یہ جذبہ صدق و خلوص کی مدد سے ہر کام کو تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ وہ دریا کو بھی اپنی پیاس بجھانے کیلئے پاس بلاتا ہے لیکن اس درجہ پر پہنچ کر عمر خودی میں گریبان چاک نہیں کر لینا چاہیئے۔ بلکہ چکبست کے نزدیک ضبط کرنا احسن ہے۔ ورنہ شہرت تو سب سے زیادہ "شیطان" کو ملی ہے۔ ان کی غزلوں میں نوی راگ۔ شراب و شاہد کی عشوہ و ساز اور فلسفہ و اخلاق کا معیار سبھی کچھ کم و بیش ملتا ہے۔

لیکن ان سب کے ساتھ جو شئے خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ چکبست کی بعض غزلوں میں ایسی شادابی اور پختگی آگئی ہے کہ وہ تغزل کا ایک اچھا نمونہ بن گئی ہیں۔ ان کی غزلوں میں سب سے زیادہ نمایاں اثر آتشؔ و غالبؔ کا ہے ؎

یہی بے خودی ہے وہ بے خودی کہ خودی کا وہم و گماں نہیں
یہ سرور ساغر مے نہیں یہ خمار خواب گراں نہیں
یہ حیات عالم خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علم رازِ جہاں نہیں

چکبست کے یہاں شانِ تغزل کے علاوہ محاکات، حسن تخیل، جوش بیان اور جذبہ نگاری کی بھی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ وہ صحیح الفاظ کے انتخاب پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان کو بندش و ترتیب اس طرح دیتے ہیں کہ شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔

ان خصوصیات اور تعلیات کو مد نظر رکھکر چکبست کا درجہ جدید اردو شاعری میں متعین کرنا نہایت آسان ہے۔ جدید شاعری سے مراد جدید خیالات کا جدید سانچوں میں پیش کرنا ہے۔ جس کی ابتدا کرنل ہالرائڈ کی مدد سے آزادؔ نے کی۔ جس کی دوکان کو حالیؔ اور اسمٰعیلؔ نے رنگ برنگ کے گل بوٹے بنا کر سنوارا اور سجایا۔ اس تحریک کی بنیاد لاہور میں پڑی۔ اس کا اثر دہلی اور علی گڑھ نے قبول کیا۔ مگر لکھنؤ کے شعرا اسی پرانی طرز کو زیب وہ سرمایۂ شاعری سمجھتے رہے۔ وہ نئی تحریک سے ذرا بھی متاثر نہ ہوتے اگر صفیؔ لکھنوی ان میں قومی اور مذہبی رنگ اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کرنا شروع نہ کرتے۔ ان میں شک نہیں کہ صفیؔ کی شاعری محدود اور مخصوص طبقہ میں روح پھونک سکی۔ لیکن اس سے ان کی اوّلیت۔ اجتہاد اور خلوص میں فرق نہیں آسکتا۔ انہوں نے ساز پرانا ہی رکھا۔ لیکن اس سے آواز نئی پیدا کی۔ گو کہ وہ حالیؔ کی آواز تھی نہ اقبالؔ کی۔ چکبست کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے ایسے فرسودہ ماحول میں جہاں تکلف تصنع و آرائش اور زیبائش ہی سب کچھ تھا۔ صفیؔ سے بہتر اور تیز تر آواز حب وطن کی خدمت کے لئے بلند کی۔ شاعری میں حب الوطنی کو انہوں نے کوٹ کوٹ کر بھرا اور آزادی کی تڑپ۔ ہوم رول کی آرزو۔ انسان کی محبت وعظمت کا راگ دلنشیں پیرایے میں گایا۔ صفیؔ، حالیؔ کی تحریک سے متاثر تھے۔ چکبست اس کے پر زور حامی و مبلغ۔ صفیؔ نے نئے سانچے نہ بنائے نہ استعمال کئے۔ چکبست نے دونوں میں انقلاب پیدا کیا۔ یہی نہیں بلکہ جہاں تک جدید قومی رنگ کو ایک خاص شاہراہ پر ڈالنے کا

نصب العین بن جاتا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں پیامی رنگ غالب ہے۔ چکبست کی اس دور کی شاعری کو ہم تین حصوں میں اس لحاظ سے تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) قومی اور وطنی (۲) اصلاحی و مذہبی (۳) نوحے۔

"صبحِ وطن" کے حصہ اوّل میں تمام تر قومی اور وطنی نظمیں ملتی ہیں۔ "وطن کا راگ"۔ "آوازۂ قوم" اور "ہم ہونگے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" میں قوم کی آزادی کے متعلق انہوں نے اپنے نظریہ کو بڑی خوبی اور شدت سے پیش کیا ہے۔ "آوازۂ قوم" ۱۹۱۶ء اور "وطن کا راگ" ۱۹۱۷ء میں۔ ان نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ چکبست حریت کے دلدادہ تھے مگر تھے اعتدال پسند۔ وہ آزادی چاہتے تھے مگر "برطانیہ کا سایہ سر پر" بھی قبول کرنے کو تیار تھے۔ وہ ہوم رول کو پائے بغیر چین لینا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک ہوم رول ہی سب کچھ ہے ؎

اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

حتیٰ کہ ہوم رول کے بدلے وہ بہشت بھی لینے کو تیار نہیں۔

ان کے علاوہ "فریادِ قوم"۔ "قوم کے سورماؤں کو الوداع"۔ "نالۂ درد" اور "مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "فریادِ قوم" میں انتہا درجہ جوشِ بیان کے ساتھ شعریت بھی پائی جاتی ہے۔ اور جذبات اور خیالات کے لحاظ سے حقیقتاً یہ قوم کا مرثیہ ہے۔ یہاں چکبست ہندو اور مسلمان دونوں کی زبونِ حالی پہ روتے ہیں۔ اور ان کو ہمت و جرأت سے کام لینے کی ترغیب و تحریص کرتے ہیں۔ اسی طرح "قوم کے سورماؤں"۔ "نالۂ درد" میں وہ اپنے جذبات کا نہایت خلوص سے نہایت شاعرانہ انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ "نالۂ درد" میں درد و تڑپ ہی نہیں ایک مفکرانہ پختگی اور بلند نصب العین کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

اس دور کی دوسری نظمیں اصلاحی و مذہبی ہیں جن میں "قومی مسدس"۔ "گائے"۔ "کرشن کنھیا"۔ "رامائن کا ایک سین"۔ "سیر دہرہ دون"۔ "آصف الدولہ کا امام باڑہ" بھی شامل ہے۔ یہ سب نظمیں بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں "رامائن کا ایک سین"۔ "سیر دہرہ دون"۔ "آصف الدولہ کا امام باڑہ"۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چکبست میں انتہا درجہ کی شعریت، نفاست سلاست و روانی تھی۔ وہ اُن فن کاروں میں سے تھے جو الفاظ کے سچے نگینے تلاش کرتے ہیں اور انہیں اپنی اپنی جگہ نہایت خوبی سے بٹھلاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ترنم ہے خلوص ہے۔ اور اثر پذیری۔ کبھی کبھی نفسیاتی تحلیل و تجزیہ بھی وہ بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ اور یہ چیز ان کی سیرت نگاری میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ "رامائن کا ایک سین" اس معنی میں اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ "سیر دہرہ دون" میں اور "آصف الدولہ کا امام باڑہ" میں منظر کشی کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

اِن نظموں کے علاوہ اِس دور کی باقی نظموں میں "دردِ دل" اور "نالۂ یاس" قابلِ ذکر ہیں۔ "پھول مالا" عزت قوم کی لڑکیوں سے خطاب" ۱۹۱۷ء کی یادگار ہے جوانوں کی بے راہ روی سے وہ نالاں تھے۔ وہ لڑکیوں سے خطاب کرتے وقت انہیں "مردوں کی روشِ خام" پہ جانے سے منع کرتے ہیں۔ اور "وفا کی دیوی" باحیا و باشرم بننے کی تلقین کرتے ہیں۔

"دردِ دل" میں چکبست کا اپنا انفرادی رنگ خاص طور پر نمایاں ہے۔ وہ مغرب کی نمائش سے بیزار اور مشرق کی کاہلی اور حیلہ سازی سے پریشان ہیں۔ اس کا علاج وہ انسانیت کی محبت میں پاتے ہیں۔ لہٰذا وہ درد کر اس کا شعر نہایت دلپذیر انداز میں الاپنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ان میں بلا کی روانی ہوتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ان کی نظمیں خاص طور پر بلند پایہ بھی جا سکتی ہیں۔

اِس دور کی ایک نظم "نالۂ یاس" ہے جس میں بخلاف اور نظموں کے کسی قدر سیاست کی جھلک آگئی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی امیدوں کی قوم کی غفلت شعاری اور لاپروائی کی بنا پر "انتہا" سمجھ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بادِ بہاری کے پیغام پہ چمنِ ہند کی آبیاری کیلئے اہلِ چمن کی آمد کی اُمید رکھتے ہیں۔

چکبست کی اِس دور کی نظموں میں اُن کے نوحے خاص طور سے مشہور ہیں۔ چکبست انیس سے سب سے زیادہ متاثر و مستفید ہوئے تھے۔ انیس مرثیہ گو تھے۔ لہٰذا چکبست بھی مرثیوں میں ہی اپنی اصلی شکل و صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے مرثیوں کی زبان سادہ، سلیس، شیریں اور لطیف ہے۔ کلام میں روانی، آمد اور ترنم ہے۔ مبالغہ سے پرہیز اور واقعیت و اصلیت کو زیادہ دخل ہے۔ استعارات اور تشبیہات نہایت لطیف و سنجیدہ ہیں۔ جذبات میں خلوص ہے لہٰذا کلام میں سوز و گداز اور تاثیر ملتی ہے۔ اور سیرت نگاری میں ان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ہر شخص کا مرثیہ جداگانہ خصوصیات اور مردہ کی ذاتی صفات کا حامل ہے۔ یہ نہیں کہ رسمی باتیں ہوں۔ اصلی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اور مراتب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لہٰذا چکبست کا ہر مرثیہ مثالی ہونے کی بجائے شخصی اور انفرادی ہے۔ پنڈت بشن نرائن در کے حسنِ اخلاق، مروت، آدمیت، جذبۂ خیر اندیشی و فروتنی کی وہ تعریف کرتے ہیں۔ گوپال کرشن گوکھلے کو "حبیبِ قوم" کہکر پکارتے ہیں کیونکہ وطن کو سنوارنے اور اپنے حسن و شباب کو بڑھانے اور اس میں انقلاب پیدا کرنے کا باعث وہی تھے۔ گنگادھر تلک کی توصیف مردِ میدان وفا، جسمِ وفا جانِ وفا کہکر ایک اور ہی انداز میں کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی ہستی فانی "نذرِ وطن" ہوگئی تھی۔ اسی طرح چند اور حضرات کا بھی مرثیہ چکبست نے کہا ہے۔ ان کی انفرادیت اور ذاتی صفات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھتے ہی آنکھوں

حجابِ جلوہ

جنابِ مسکین اکبرآبادی

اچانک وہ بالائے بام آگئی
مجھے سامنے پا کے گھبرا گئی

بچائی بہت مجھ سے لیکن نظر
بچاتے بچاتے بھی ٹکرا گئی

سنبھالی جو ساری ڈھلکتی ہوئی
تو رخسار پر زلف بل کھا گئی

ہر اک شے پہ ڈالی نظر بے سبب
مگر مجھ پہ ۔ اور پھر بھی شرما گئی

ہر اک شے سے آخر نظر پھیر لی
ہر اک سمت الفت نظر آگئی

دکھاتی رہی غیریت اپنی شان
محبت ہر انداز پہ چھا گئی

نگاہ محبت کی طالب تھی اور
نگاہ محبت کو ٹھکرا گئی

محبت کو تابِ توجہ نہیں
نظر پھیر کر دل کو سمجھا گئی

بہت طرح سنبھلی مجھے دیکھ کر
بہت طرح ۔ آخر کو شرما گئی

میں دیکھا کیا یہ تو سب کچھ مگر
گئی اس ادا سے کہ تڑپا گئی

رلانے کو تھا مجھ کو میرا جنوں
تری وحشتوں پہ ہنسی آگئی

تو ہی اب کوئی اور رستہ بتا
طبیعت محبت سے اکتا گئی

ا[illegible] کی تلوّن مزاجیاں

(از جناب سید وزارت علی)

الحکم بنی فاطمیہ کا چھٹا خلیفہ تھا۔ جب مصر کے ایک قریہ میں اس کے والد العزیز کا انتقال ہوا تو وہ اُس کے ہمراہ تھا۔ مورخ مقریزی لکھتا ہے کہ العزیز کی نعش ایک پالکی میں اونٹ پر مصر لائی گئی۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اگلے روز ابن نعمان نے غسل دیا اور بوقت شب محل شاہی کے ایک کمرہ میں المعز کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ اس وقت الحکم کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ بچپن ہی میں اس کے استاد برجوان نے اس میں متضاد صفتیں ملاحظہ کی تھیں۔ اس وجہ سے چھپاسنے کے نام سے خطاب کیا کرتا تھا۔ یہ خلیفہ بڑا تلون مزاج، خوش طبع، سنکی اور فیاض تھا۔ مثل دیگر خلفائے بنی فاطمیہ کے فیاضی فضول خرچی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی جس کی وجہ سے بڑی مالی مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ ساتھ ہی اس خلیفہ کی داستان مظالم سے صفحات تاریخ رنگین ہیں جیسا کہ آگے بیان کیا جائیگا۔ سریر آرائے خلافت ہو کر سب سے پہلا جو حکم خلیفہ الحکم نے صادر کیا وہ یہ تھا کہ کوئی شخص اُسے "ہمارا خداوند"۔ "ہمارا آقا" کے الفاظ سے خطاب نہ کرے۔ بلکہ صرف "امیرالمومنین" کہے۔

الحکم میں متعدد خصوصیات تھیں جو دیگر خلفائے بنی فاطمیہ میں نہیں پائی جاتیں۔ منجملہ ان کے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ رات کو دن پر ترجیح دیتا تھا اس سے بعضوں کا خیال تھا کہ خلیفہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ سارے کام رات کے وقت ہوتے تھے۔ دربار بھی رات کے وقت منعقد ہوتا تھا۔ حکم تھا کہ ساری رات چراغاں رہے اور تمام بازار اور دکانیں کھلی رہیں۔ خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے دکاندار رات کے وقت ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر روشنی کا انتظام کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام شب قاہرہ اور فسطاط کے کوچہ و بازار روشنی سے جگمگاتے رہتے تھے۔ یہ رسم و رواج کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ چنانچہ مسلسل پانچ سال تک یہی عمل رہا۔

ابتدا میں الحکم بہت متحمل مزاج تھا۔ عیسائی اور مسلم رعایا اُس سے خوش تھی۔ اور اس کی فیاضی کی وجہ سے تمام اہلکار و صاحب بھی خوش تھے۔ اس کی سیر چشمی کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ لکھا ہے کہ جب عیش گورنر شام کا انتقال ہوا تو اُس کا بیٹا ایک دستاویز لیکر خلیفہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ یہ دراصل وصیت نامہ تھا جو اُس کے والد نے بحق خلیفہ الحکم تحریر کیا تھا اور اس طرح بیٹوں کو اپنی جائیداد میں حقوق سے محروم کر دیا تھا۔ جائیداد کی مالیت دو لاکھ دینار تھی۔ وصیت نامہ کو پڑھکر خلیفہ نے ارشاد فرمایا "جاؤ یہ تمام تمہاری ہی ہے۔ امن و چین سے رہو اور مزے اڑاؤ۔"

دارالخلافہ قاہرہ میں شب کی رنگ رلیاں جن کا ذکر اوپر ہوا اہالیان مصر کی طبائع کے عین موافق تھیں۔ لیکن ان سے بہت سی خرابیاں رونما ہوئیں لہذا احکام صادر کئے گئے کہ لوگ شب کو گھروں سے باہر نہ نکلیں اور تمام بازار بند رہیں۔ لیکن خود خلیفہ مزید دو سال تک بدستور شب کو گشت لگاتا رہا۔

ایک روز الحکم کا "شہری حماموں" کے قریب سے گذر ہوا۔ شور و غوغا کی آواز آئی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ مستورات شور مچا رہی ہیں۔ حکم دیا کہ دروازے اور دریچے اینٹیں چُن کر بند کر دیئے جائیں اور مستورات کو بھوکوں مرنے دیا جائے۔

عورتوں کے لئے حکم تھا کہ گھروں سے باہر نہ نکلیں اور نہ دریچوں میں سے جھانکیں اور نہ حماموں میں جا کر غسل کریں۔ اس امر کی نگہداشت کے لئے خوجے اور سپاہیوں کے دستے شہر میں گشت لگاتے رہتے تھے اور جو مستورات تعمیل حکم سے گریز کرتی تھیں انہیں پکڑ کر دریائے نیل میں غرق کر دیا جاتا تھا۔ فاحشہ عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ کے حضور میں رپورٹ پیش ہوئی کہ چند ضعیف عورتیں جنکی گذر اوقات چرخا کاتنے اور بازار میں جا کر سوت بیچنے پر تھی اپنے گھروں میں بھوکوں مردہ پائی گئیں۔ اس پر احکام صادر ہوئے کہ جن دکانداروں کا ایسی عورتوں سے لین دین ہے وہ خود ان کے مکانوں پر جا کر خرید و فروخت کریں۔ لیکن عورتیں اپنا چہرہ اور ہاتھ ان کو نہ دکھائیں۔

اس کے استاد برجوان نے اس کے مزاج کی خوب تشخیص کی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد خلیفہ نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے شروع کئے۔ اب مذہب کا جنون سر پر سوار ہوا۔ یہ خلیفہ مذہباً شیعی تھا۔ گویا تمام خلفائے بنی فاطمیہ شیعی مذہب رکھتے تھے۔ نماز کے اوقات بدل دیئے گئے۔ "صلوٰۃ الضحیٰ" کی ممانعت کر دی گئی۔ لوگوں کے مذہب میں مداخلت شروع کی۔ اور انہیں زبردستی "تشیع" بنانا شروع کیا۔ پھر ایک حکم جاری ہوا کہ لوگ اسمٰعیلی مذہب اختیار کریں

[illegible]

[illegible] سے آگ [illegible]

میں دب کر مر گئے۔

[illegible] ایک جرمانہ [illegible] کے

سے انکار کیا تو ان کے ہزار دوں سے ٹکڑے کرکے حتیٰ کہ وہ جاں بحق ہو گیا۔ ایک دفعہ بیت شہر میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ خلیفہ لکڑیوں کا بڑا انبار جمع کروا رہا ہے اور ان میں حکم عدولی کرنے والوں کو جھونکا جائیگا۔ تو لوگوں کی ایک کثیر جماعت خلیفہ کے محل کے سامنے جمع ہو کر معافی کی خواستگار ہوئی۔ خلیفہ نے سب کو معاف کر دیا۔

اب چند تعمیرات کی مثالیں لو۔

خلیفہ الحکم نے دو عالیشان مسجدیں تعمیر کرائیں۔ باب الفتوح کے متصل جو مسجد بنائی گئی اس کی تعمیر در اصل اس کے والد خلیفہ العزیز کے دور میں شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ الحکم کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس لئے یہ "جامع حکم" کے نام سے مشہور ہوئی شہر قاہرہ میں یہ دوسری جامع مسجد تھی۔

خلیفہ الحکم نے "جامع راشدہ" کو بھی از سر نو بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا۔ اور بہت سے فرش، پردے اور جھاڑ و فانوس تحفۃً دیے۔

ایک دفعہ ماہ رمضان میں "جامع قدیم" واقع فسطاط کیلئے ایک عالیشان جھاڑ گاجے باجے اور تہلیل و تکبیر کے نعروں کے ساتھ بھجوایا۔ جھاڑ مذکور کا وزن ایک لاکھ درہم تھا۔ اور اس کے اندر بارہ سو شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ نیز قرآن مجید کے ایک ہزار دو سو نوے نسخے جن میں بعض مطلّا تھے۔ جامع مذکور کے لئے ہدیۃً پیش کئے۔

پھر دفعۃً طبیعت نے پلٹا کھایا۔ بہت سے عیسائی اور یہود اہلکار جو محکمۂ مال میں ملازم تھے یک قلم برخاست کر دیئے گئے۔ کئی وزرا یکے بعد دیگرے موقوف کئے اور تبرا بازی کا دور شروع ہوا۔ تمام کوچہ و بازار، سراؤں، دوکانوں وغیرہ پر تبرائی کتبے لکھوا دیئے گئے۔ استاد پر ہاتھ صاف کیا۔ قاضی القضاۃ حسین بن نعمان کو بلا وجہ برطرف کیا گیا۔ بعد ازاں قتل کروا دیا۔ اور نعش نذر آتش کی گئی۔ نیز بہت سے شہری تہ تیغ کئے گئے۔ جس سے عام بے چینی پھیل گئی۔

شہر کے کتوں پر بھی بلا نازل ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک کتا خلیفہ کے گھوڑے پر بھونک اٹھا تھا۔ اور بھی بہت سے احکام صادر ہوئے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص سوار ہو کر مصر کے بازاروں میں نہ پھرے۔ اور نہ پیدل محل شاہی کے قریب سے گذرے۔ حکم عدولی کی سزا موت سے کم نہ تھی۔ "Scary" کے مصنف

[illegible]

سالانہ [illegible]

اے [illegible] کے پاس [illegible]

یہودی [illegible]

قبیل نسل کے [illegible]

کر گھوڑوں پر سواری کی بھی ممانعت تھی۔ اور [illegible] بیٹھنے کی اجازت تھی۔ حکم تھا کہ گلے میں لکڑی کی [illegible] فروخت کیا جائے۔ اب گرجاؤں کا مال [illegible] جائدادیں [illegible] ضبط کر لی گئیں۔ اور ان کی اندوختہ دولت کے خزانے [illegible] گئے۔ [illegible] صلیبیں جلوا دی گئیں۔ بیت المقدس کا عالیشان گرجا "القیامہ" مسمار کر دیا گیا۔ نیز شہروں کے بہت سے گرجا گرا دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ نصاریٰ کے جشن ظہور مسیح، عید فصح، اور جشن صلیب بڑی دھوم دھام سے ہر سال دریائے نیل کے کناروں پر منایا کرتے تھے یہاں پر بہت سے کھیل کود ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ وقت ان تقریبوں میں بنفس نفیس شرکت کرتا تھا۔ لیکن یہ سب جشن حکماً بند کر دیئے گئے۔

خلیفہ الحکم کی تلون مزاجی مشہور تھی۔ جب اس قسم کی مکروہات سے طبیعت سیر ہو گئی تو سابقہ تمام احکام یک قلم منسوخ کر دیئے گئے۔ تبرا بازی موقوف کر دی گئی۔ بلکہ تبرا بازوں کو سخت سزاؤں کے مستوجب قرار دیئے گئے۔ نماز اور اذان کے متعلق جو جدتیں رائج تھیں ان پر بھی خط تنسیخ کھینچ دیا گیا۔ اب عیسائیوں کو گرجاؤں کی مرمت اور جدید تعمیر کی عام اجازت مل گئی۔ تمام ضبط شدہ جائدادیں متعلقہ گرجا واپس کر دی گئیں اور کسی کے مذہب سے کوئی تعرض نہ تھا۔ لباس وغیرہ کے متعلق تمام پابندیاں اٹھا لی گئیں۔

خلیفہ الحکم نے بہت سے رواجوں کو بھی منسوخ کیا۔ ایک یہ رواج مدت مدید سے چلا آتا تھا کہ بادشاہ کے سامنے زمین بوسی کی جائے اور ان کے ہاتھ یا رکاب پر بوسہ دیا جائے۔ خلیفہ الحکم نے یہ دستور منسوخ کر دیا۔ کیونکہ اس سے دربار بازنطینی کی تقلید مقصود تھی۔

خلیفہ الحکم ماہ رمضان کا خاص احترام [illegible] کرتا تھا [illegible] "مسجد راشدہ" میں نماز کے لئے سادہ لباس میں [illegible] تھا اور خود نماز پڑھاتا تھا۔ لباس میں [illegible] سادہ ہوتا تھا۔ کوئی سونا نہ لگا ہوتا تھا۔ چھتری سادہ [illegible] ہمراہ اس کے شہری حاضر ہوتا تھا۔ [illegible]

[illegible] علا آ [illegible] کے
[illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] خلیفہ تک رسائی کا حق حاصل تھا۔

ایک دن [illegible] بازاروں میں گشت کر رہا تھا۔ ایک ضعیف العمر نے چیخ کر کہا کہ اس کے احکام کی پیروی نا روا کیوں؟ [illegible] نزدیک پہنچا۔ ضعیفہ کے ہاتھ میں ایک درخواست تھی۔ ایک نوکر کو حکم دیا کہ درخواست ضعیفہ کے ہاتھ سے لے اور اسے گرفتار کرے۔ نوکر نے جب اس پر ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ وہ کاغذ کی پتلا تھا۔ اور درخواست میں خلیفہ کی ہمشیرہ کی پاکدامنی کے خلاف کئی الزام درج تھے۔ مضمون درخواست کو پڑھ کر خلیفہ بہت طیش میں آیا اور محل میں پہنچ کر اپنی ہمشیرہ کو بہت سخت سست کہا۔ اس کی تہ میں کسی دشمن کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مورخین نے اس کی ہمشیرہ کو نہایت شریف اور پاک دامن لکھا ہے۔

خلیفہ الحکم نے اگلے روز اپنے زبردست عربوں، بربریوں، یونانیوں اور حبشیوں کو شہر میں آزاد چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ اسے لوٹ لیا جائے۔ یہ لوگ مکانوں کے قفل توڑ کر ان میں داخل ہوئے۔ عورتوں کی بے حرمتی کی۔ جو مقابلہ کو نکلے انہیں تہ تیغ کیا۔ شریف خاندانوں کی دوشیزہ لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اور فسطاط کا بڑا حصہ خاکستر کر ڈالا۔

خلیفہ الحکم روزانہ قبرستان قرافہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر آتا تھا۔ اور اہل شہر کے مصائب سے ذرا متاثر نہ ہوتا تھا بلکہ نظر حقارت سے دیکھتا تھا۔ شہریوں نے بہت شور و غوغا مچایا۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ چوتھے روز شرفائے شہر قرآن ہاتھوں میں لئے مساجد میں جمع ہوئے اور امداد خداوندی کے طالب۔ بالآخر بربر اور ترک محافظین کو ان کی حالت زار پر رحم آیا اور انہوں نے خلیفہ سے عام معافی حاصل کی۔ خلیفہ نے اس واقعہ پر بہت کچھ اظہار ندامت کیا اور حکم دیا کہ قیدیوں کو فدیہ لیکر آزاد کرا لیا جائے اور روپیہ خزانہ عامرہ سے ادا کیا جائے۔ جب امن و چین ہوا تو معلوم ہوا کہ شہر کا ایک تہائی حصہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اور نصف حصہ نذر غارت ہو گیا۔

مروی ہے کہ یہ خلیفہ اپنی ہمشیرہ کے ایما سے قتل ہوا۔ اور اس نے ۲۵ سال تک حکمرانی کی۔

خلیفہ الحکم مسئولیت اور نامعقولیت کا مجسمہ تھا۔ اس کے بعض احکام معقول تھے۔ اور بعض سخت قابل نفریں۔

تحریم شراب کے متعلق اس کے احکام بہت معقول اور سخت تھے۔ انگوروں کے ذخائر جہاں کہیں پائے جاتے تھے انہیں دریائے نیل میں پھنکوا دیا جاتا تھا۔ یا کیچڑ میں ڈلوا کر بیلوں کے پیروں تلے روندوا دیا جاتا تھا۔ خشک کشمشوں کی فروخت کی بھی ممانعت تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ خشک کشمشوں سے بھرے ہوئے دو ہزار تین سو چالیس صندوق جلوا دیئے گئے۔ جن کی مالیت پانچ سو دینار تھی۔ یہ بھی حکم تھا کہ تازہ انگور ایک وقت میں چار پونڈ سے زیادہ بازار میں نہ فروخت کئے جائیں۔ روایت ہے کہ ایک سوداگر نے اپنا تمام اثاثہ میوۂ ممنوعہ کی خرید میں لگا دیا تھا۔ بہ تعمیل احکام خلیفہ تمام مال ضبط ہو کر تلف کر دیا گیا۔ سوداگر نے قاضی کی عدالت میں استغاثہ بدیں مضمون دائر کیا کہ خلیفہ الحکم کو بذریعہ سمن طلب کیا جائے اور جو نقصان کہ اسے خلیفہ کے اہلکاروں کے فعل سے پہنچا ہے اس کی تلافی کی جائے۔ چنانچہ خلیفہ الحکم قاضی کی عدالت میں جوابدہی الزام کے لئے حاضر ہوا۔ قاضی دیگر شہریوں کی طرح پیش آیا۔ سوداگر کی استدعا تھی کہ ایک ہزار دینار اسے بطور معاوضہ دلائے جائیں۔ الحکم نے پیروی کرتے ہوئے کہا کہ شراب بہ تعمیل احکام قرآنی ممنوع قرار دی گئی ہے اور چونکہ ستغیث کا منشا وانگوروں سے شراب بنانے کا تھا۔ اس لئے ان کی تلفی جائز طور پر عمل میں آئی ہے۔ لیکن اگر سوداگر حلفیہ یہ بیان دے کہ اس کا منشاء شراب کشی کا نہ تھا تو وہ قیمت دینے کے لئے تیار ہے۔ سوداگر نے حلف اٹھانے سے انکار کیا تاوقتیکہ خلیفہ اول عدالت میں رقم مذکور نہ داخل کرے۔ چنانچہ خلیفہ الحکم نے خزانہ سے رقم منگوائی اور سوداگر نے حلفیہ بیان دیا کہ انگور کھانے کے لئے مقصود تھے نہ کہ شراب کشی کے لئے۔

قاضی نے رقم سوداگر کو دلوادی اور اس نے باقاعدہ رسید تحریر کر کے خلیفہ کو دیدی۔ پھر سوداگر نے خلیفہ سے پروانہ راہداری کی درخواست کی اور یہ بھی منظور کر لی گئی۔

زاں بعد قاضی نے کھڑے ہو کر خلیفہ کو تعظیماً سلامی دی۔ خلیفہ قاضی کے اس فعل سے بہت خوش ہوا اور اسے بہت کچھ انعام دیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بنی فاطمیہ میں فضول خرچی درجہ عیب تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور الحکم بھی اس سے مستثنےٰ نہ تھا۔ اس کی داد و دہش سے خزانہ عامرہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ مزید برآں اس کے عہد خلافت میں بسا اوقات قحط سالی کا دور دورہ رہا۔ غلہ از حد گراں قیمت پر فروخت ہوتا تھا جس کی وجہ سے لوگوں نے سخت مصائب برداشت کیں۔ ایک دفعہ شکایت گذری کہ غلہ فروشوں نے بہت سا غلہ جمع کیا ہوا ہے۔ اس پر اعلان کیا گیا کہ جن لوگوں کے پاس غلہ کے انبار

[illegible]

[illegible] ... سال رحلت فرما گئے۔

[illegible]

[illegible]

... زندہ ... دن ... [illegible]

... خلیفہ نے ... شرکت ... [illegible]

... اقدام ... کی ... لیکن ... [illegible]

... ہوا ... بہت ... ہوئے تھے ... دمشق و شام ... [illegible]

... جنگ ... کی گرم بازاری تھی۔ لیکن یہ خلیفہ ... آتا تھا۔

اور ... پر غالب آ گیا تھا۔ ایک زمانہ میں اس کی طاقت کا وہ ... تھا کہ

سلطان محمود غزنوی کو اطاعت قبول کرنے کے متعلق خطوط تحریر کئے۔ لیکن محمود نے خطوط کے پرزے پرزے کر ڈالے اور قتل پر عمل کیا۔ ... تیرہ بازی ... بھی کا بڑا باعث تھا۔ انجام کار اس کی موقوفی کیلئے احکام صادر ہوئے حکم تھا کہ تیراندوں کے کھوتے لگائے جائیں اور شہر کے بازاروں میں تشہیر کی جائے (ملاحظہ ہو مقریزی جلد دوم صفحہ ۲۰۶ و ابن خلدون جلد سوم صفحہ ۴۶۰)

اپنے آخری دور خلافت میں یہ خلیفہ اسمٰعیلی فرقہ کے زیر اثر مدعی الوہیت بن بیٹھا تھا۔ یہ بڑا منجم بھی تھا۔ شہر کے نجومی اس سے بہت خائف رہتے تھے۔ ایک دن حکم دیا کہ تمام نجومیوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ نجومی قاضی شہر کے حضور میں حاضر ہوئے اور تحریری اقرار نامے لکھ کر اپنے پیشے سے تائب ہو گئے۔ تب انہیں شہر میں رہنے کی اجازت ملی۔ اسی قسم کے احکام تنفنیوں پر بھی عائد کئے گئے۔

اس خلیفہ کے قتل کی داستان بہت دردناک ہے۔ قتل سے ایک روز پہلے زائچے سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ آنے والی رات اس کے لئے بہت خطرناک ہے۔ جب علامت موت نظر آئی تو تالیاں بجاتا ہوا بولا۔ "اے منحوس ساعت! بالآخر تو آ ہی گئی۔"

صبح کا وقت تھا۔ خلیفہ اپنے ایک غلام کی معیت میں وادی مقطم میں سے گذر رہا تھا۔ اس کے دو قاتل یوسف بن دوابس مصری کے ایما سے وہیں چھپے گھات میں بیٹھے تھے۔ جوں ہی خلیفہ ان کے نزدیک آیا وہ اس پر ٹوٹ پڑے۔ الحاکم چلایا۔ "بدبختو! تم کیا چاہتے ہو؟" حملہ آوروں نے خلیفہ کے دونوں ہاتھ قلم کر ڈالے۔ پیٹ چیر کر انتڑیاں نکال ڈالیں۔ اور نعش کو جامہ میں لپیٹ کر یوسف کے پاس لے گئے۔ اس نے شہزادی کو اطلاع دی۔ جس کے ایما سے درحاصل یہ قتل عمل میں آیا تھا۔ قاتلوں کو انعام دے کر رخصت کیا گیا۔

خصوصی مقالہ

مرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی

(از جناب آزاد گالندی ایم ۔ جے ۔ ایس (راجپوتانہ) جے پور)

زمانہ دہلی میں غدر سے برس دن اور مہر چھپلوں کے کوچہ میں مرزا مغل بیگ کے بچے کی بسم اللہ کا جلسہ تھا۔ دہلی کے شرفا اور قریب قریب سبھی پڑھے لکھے شریک تھے۔ مرزا غالب بھی شریک تھے۔ رسم کے مطابق بسم اللہ بچے کو پڑھائی گئی مہمان شیرینی لیکر بچے کو پروان چڑھنے کی دعائیں دیکر چلے گئے۔ اس بچہ کا نام محمد تقی بیگ تھا۔ ہمایوں کے وقت میں ان کے بزرگ ایران سے آئے تھے۔ تیمور کی نسل ہو کر [illegible] بھی یہ سپہ گری کرتے تھے یعنی فوج میں کوئی عہدہ تھا۔ دہلی میں ان کا مکان جامع مسجد کے عقب میں مٹیا محل میں تھا۔ مغل بیگ کا اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ وہ خود بادشاہ کے درباریوں میں تھے۔ مگر غدر میں بڑی تنگی سے دن بسر کرنے لگے۔ تقی بیگ کو وہیں محلے میں پڑھنے کو بٹھا دیا۔ ابھی تعلیم ادھوری ہی تھی کہ مغل بیگ چل بسے۔ اور تقی بیگ یتیم رہ گئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں بنارس کے ایک شہزادہ خسرو مرزا کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ نوکری کی تلاش میں کی مگر کہیں نہ ملی۔ ۱۸۵۷ء میں گوالیار چلے گئے۔ وہاں بھی قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ تب جے پور چلے آئے۔ جے پور میں مہاراجہ رام سنگھ جی کا عہد تھا۔ دہلی کو اجڑتے اور وہاں کے شرفا کو بگڑتے دیکھکر ان کے دل پر خاص صدمہ تھا۔ جو کوئی [illegible] جے پور تک آیا آنے لگے نہ بیٹھنے دیا۔ نہ اپنے وطن لوٹنے دیا۔ اپنی ریاست کی حیثیت کے مطابق تنخواہ مقرر کردی اور یہیں رکھ لیا۔ سچ پوچھئے تو لکھنؤ اور دہلی اجڑکر بہت سے شہر آباد ہوئے۔ ان میں کچھ سپوتوں کی بستی یہ ایک جے پور بھی ہے۔

شاعروں میں انور۔ ظہیر۔ رونق۔ آگاہ۔ راقم۔ جست۔ زکی وغیرہ۔ عالموں میں مولوی رشید الدین۔ مولوی سلیم الدین نارنولی۔ مولوی جلال الدین رامپوری وغیرہ ہی نہیں بلکہ خوشنویس۔ شمشیر ساز۔ ساز گری فن جاننے والے [illegible]

[illegible]

[illegible] ہوگئے۔

مرزا تقی بیگ ۱۸۶۱ء میں جے پور آئے اور لشکروں کے محلے میں رہے۔ ۱۸۶۸ء میں ریاست میں نوکر ہوئے۔ لیکن ان کے اخراجات کے زیادہ تر کفیل نواب احمد علی خاں صاحب رونق جاگیردار ٹونک و جے پور تھے۔ جو خود ایک مشہور شاعر اور شاعر نواز رئیس تھے۔ جب خان بہادر مولوی احمد علی خان صاحب فرخ آبادی ممبر کونسل ریاست ہوئے تو مرزا صاحب کے کمال شاعری سے واقف ہوکر آپ نے ان کو صدر میں فوجداری کا سررشتہ دار کردیا۔ ۱۹۲۵ء میں پنشن ہوئی آخر اٹھاسی برس کی عمر میں ۲ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو جمعہ کے دن انتقال کیا۔

جے پور کے شاعروں میں ایک بوڑھا شخص صدر میں بیٹھا نظر آتا تھا۔ سب لوگ اس کی تعظیم کرتے تھے۔ جتنی اس کی تعظیم ہوتی تھی اتنا ہی وہ اور بھی جھکا جاتا تھا۔ یہ مرزا محمد تقی بیگ مائل تھے۔ اکہری ہڈی۔ چھریرا بدن۔ نکلتا ہوا قد۔ گندمی رنگ سفید اور کسی قدر گھنی سی ڈاڑھی۔ اور کبھی چوگوشیہ مخملی سرخ یا سبز مخمل کی ٹوپی۔ اچکن کبھی نہیں پہنی۔ گرمیوں میں سفید لٹھے کا اور جاڑوں میں روئی کا انگرکھا ہمیشہ ململ کا ہاتھ کا سلا ہوا کرتہ سفید لٹھے کا پاجامہ اور سادہ نری کا سلیم شاہی جوتہ پہنا۔ جب جاڑا زیادہ ہوتا تھا تو دھار دار چادر اوڑھ لیتے تھے۔ گز بھر لٹھے کا رومال کندھے پر رہتا تھا لیکن چلتے وقت جبکہ سفر ہوتی تھی تو ہاتھ میں لے لیتے تھے اور تیز چلتے تھے۔ کیسی ہی دھوپ یا بارش ہو چھتری کبھی نہیں لگائی۔ غرضیکہ اس بیسویں صدی کے وسط میں سلطنت مغلیہ کے آخری شرفاء دہلی کا نمونہ تھے

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

مرزا مائل نے چودہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے جناب نواب مرزا انور دہلوی کو غزل دکھلاتے تھے۔ مگر جب انور دماغی اختلال میں مبتلا ہوگئے تو حضرت مولانا سلیم الدین تسلیم کو دکھلاتے رہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں زبان کی خوبیاں مرزا انور کا فیض ہیں۔ اور فنی پختگی کا اثر ہے۔ مولانا تسلیم کی اصلاح کا۔ مرزا صاحب کی تمام عمر شعر گوئی میں گذری۔ اکثر وہ اپنے مسودات کو دیوان کی صورت میں صاف کرلیا کرتے تھے۔ اس وقت مرزا صاحب کے شاگردوں کے پاس نو سو پندرہ غزلیں عاشقانہ اور ایک سو نعتیں وسلام وغیرہ ہیں۔ کل اشعار صرف اٹھارہ ہزار ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں غزلیں ضائع ہوگئیں۔ یا لوگ لے گئے۔ ان کا دیوان چھپنے کی کوشش جو ہو رہی ہے سو مرزا کی زبان کے تو کیا کہنے لیکن اسلوب بیان اس بلا کا ہے کہ ان کے اشعار سنکر جسکو ذرا سا بھی شعر سے لگاؤ ہو مزا لینے لگتا ہے۔ بیت [illegible] اور شوخی تو ان کا خاص حصہ ہے۔

[illegible] ان کے کلام میں بھی لئے دیتے ہیں [illegible]
بیان [illegible] ہر حیثیت سے مائل [illegible] شعری کا
[illegible] اور آج دلی کے شاعروں میں ان سے اچھے [illegible]
[illegible]

اب مائل کے وہ اشعار پڑھئے جن میں شوخی [illegible]

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا — کام آپڑا ہے رحمتِ پروردگار سے

جنت میں مجھے بھیج کہ بخشش پہ کروں ناز — دوزخ میں تو مجھ جیسے گنہگار بہت ہیں

اُس نے وہ دریچہ رحمت کا بنایا مجھے پردہ — قسمت تری دامان دکھا دیکھ رہی ہیں

بت خانہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے سے

زاہدوں کی حقیقتیں کہتیں — ان بتوں کو خدا بنایا تھا

نیت کے ساتھ ہوتے ہیں مائل تمام کام — ڈالی بنا جو کعبہ کی بت خانہ بن گیا

دیکھ ماتحسن آل بت پرستی دیکھنا — آج مائل کی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

ہر درد و سوز عشق کا لذت چشیدہ ہوں — میں در سے بت مے کے خدا تک سیدہ ہوں

خمریات ملاحظہ ہوں سے

زاہد کو بادہ خواری کا چسکا لگا دیا — یہ کام عمر بھر میں ہوا ہے ثواب کا

بے سبب باران رحمت قبر واعظ پر نہیں — کوئی پتھر لگ گیا بت خانہ کی بنیاد کا

قطرہ قطرہ کا ہے نصیب جدا — کوئی گوہر کوئی شراب ہوا

مائل نہیں تو رات کہیں رہ کے کاٹی — مسجد میں جا پڑیں گے جو مے خانہ بند ہے

گھبرا لیا ہے آمد فصل بہار نے — نکل پڑے ہیں طاق سے شیشے اتار نے

تعریف اسے کہتے ہیں کہ بت خانہ سمجھ کر — واعظ نے بہت مرکے بھی جنت نہیں دیکھی

[illegible]

[illegible]
اتنا تو کرم ہے کہ ہو بعد [illegible]
[illegible]
[illegible] کا اعلیٰ نمونہ ملاحظہ کیجئے سے
اچھی کہی ہے بات کسی خاکسار نے — [illegible]

نہ ترا لطف نہ آلائیں کہیں لے تو یہ — آج [illegible] آئے ہیں

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے سے

اللہ رے اہتمام تری بزم ناز کا — نالہ نہ جا سکا جہاں اہلِ نیاز کا

وہ شکر فصل گل کا طرہ طرار رہتا ہے — کف ساقی میں جب تک ساغر

حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرزا کو "دلی کا آخری شاعر" کہتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب اُن کے ساتھ مسوری گئے تو حکیم صاحب نے مرزا مائل کا تعارف وہاں کے لوگوں سے انہیں الفاظ میں کرایا۔ مرزا صاحب کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

مرزا صاحب نے [illegible] کی طرف اشارہ کر کے مطلع پڑھا سے

جلوے صنم کدے میں وہ حسنِ بتاں کے ہیں — ہر اک سے پوچھتا ہوں یہ پتھر کہاں کے ہیں

تو ایک شور مچ گیا۔ بار بار پڑھوایا گیا۔ اور بے انتہا داد ملی۔ یہ شعر [illegible]

دل ہے حرم سے دیر سے اس کے سوا بھی اور — رستے بہت سے کوچہ جانِ جہاں کے ہیں

اتنے نشان سجدہ نہ پوچھو کہاں کے ہیں — کچھ اُن کی رہ گزر کے ہیں کچھ آستاں کے ہیں

لوگ یہ شعر سنکر سر دُھنتے تھے۔ آہستہ آہستہ مائل کی وضع قطع کو دیکھے اور قدرتاً یہ دریافت کرنے کے لئے بے چین تھے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اتفاق دیکھئے کہ مقطع میں مائل نے اسی کیفیت کے جواب کا اظہار بھی کیا ہے۔

مائل لئے ہوئے ہیں جو وضع قدیم کو
ہر ایک پوچھتا ہے یہ حضرت کہاں کے ہیں

دہرہ دون کی ایک صحبت میں کہتے ہیں سے

ہیں لے تو دہرہ دون کو سرسبز کر دیا — موسیٰ تو کوہ طور جلا کر چلے گئے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اتفاق سے مرزا مائل دہلی تشریف لے گئے۔ مرزا صاحب کو بھی بڑا اس کے ساتھ ہی دفتر جمعدار میں جانے پر مجبور کیا۔ آپ جانتے ہیں جمعدار کا دفتر جو جیلوں کے کوچہ میں تھا اپنی شان [illegible]
[illegible] کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔ اتفاق سے [illegible]

[illegible] حضرت علی [illegible] بیٹھے تھے۔ [illegible] پر مرزا مائل تشریف رکھتے تھے۔ دوران تعارف میں یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی کے والد عبد العلی صاحب مرحوم مرزا صاحب کے [illegible] ہے۔ مولانا محمد علی [illegible] متاثر ہوئے لیکن اس لئے کہ مرزا صاحب کی شخصیت دلچسپ نہیں تھی۔ مرزا صاحب الفت سے شعر سناتے رہے اور حاضرین داد دیتے رہے۔ لیکن جب مرزا صاحب نے یہ شعر پڑھا ؎

خیال آتا تھا مجھکو جب غلاف کعبہ پڑتی تھی   کہ یہ جھگڑے میں ڈالیگا بہت گبرو مسلماں کو

تو محمد علی کھڑے ہوگئے اور بار بار فرمایا لیے یہ شعر آپ کا ہے اور لشکر بڑے احترام سے مرزا صاحب کو بیچ میں بٹھایا اور اب جو شعر سننے شروع کئے ہیں تو معلوم نہیں کتنی مصر قیمتوں کو محویت شعر کے نذر کرگئے۔

شاعر کی ساری دنیا سے کچھ گھر میں نہیں رہتی اور گھر کی ملکہ یعنی بیوی ہمیشہ چھپی رہتی ہو اور یہ بھی یوں کہ گھر میں بچوں کی افراط، سہانوں کا تانتا اور حال یہ کہ پتوہ ہیں جن کو کوڑی بھی نہیں چولہا بجھا پڑا ہے ایسی حالت میں فکر شعر میں قارون کے خزانے پر لات مارتے خدا کی دین کو نظر انداز کرتے چلے جاؤ تو بتاؤ نیک بخت کا دل جلے یا نہ جلے۔ مرزا مائل کی بی بی یہ ہی مصیبت تھی۔ چنانچہ ایک بار انتے تنگ ہوکر فرمایا ؎

لڑتی ہے بات بات پر آفت سے کم نہیں
جورو اگر یہی ہے تو قاتل کا دم نہیں

ہچکیاں

صدیقہ بیگم سیوہاروی کے تازہ ترقی پسند افسانوں کا مجموعہ جس میں مصنفہ نے زندگی کی تلخ حقیقتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان افسانوں میں گرد و پیش کے ماحول کا بہت کامیاب جائزہ ملتا ہے۔ ان میں ہماری روز و شب کی زندگی سانس لیتی نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں ہماری سماج کی پستی کا عکس ملتا ہے جس سے طبقاتی کشمکش اپنے تمام عیوب کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے ابھر آتی ہے۔

"ہچکیاں" میں زیادہ تر نفسیاتی افسانے شامل ہیں جنہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کردار کا معائنہ انکی حرکات و سکنات ہی سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ معلوم کرنا زیادہ ضروری ہے کہ وہ کردار کیا سوچتے ہیں انکی ہر فکر و انکا ہر عمل کن کن نفسیات پر مبنی ہو۔ حقیقت اور زبان کے امتزاج نے ان افسانوں میں ایک جان ڈالدی ہے۔

ادارہ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن

"برگِ حنا"

رابعہ پنہاں

(از محترمہ سیدہ انیس ناہید صاحبہ)

میری گذارش

"برگِ حنا" کی اوّلین قسط کی اشاعت کے بعد اس اثنا میں ملک کے طول و عرض سے جو خطوط مجھے وصول ہوئے ہیں ان کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کردوں۔ مجھے امید ہے کہ میری شاعر بہنیں ان سطور کو اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گی جسکے ماتحت کہ یہ لکھی جا رہی ہیں۔

میری سب سے پہلی کوشش تو یہ ہے کہ زیر ترتیب تذکرہ بذاتِ خود اُردو زبان کے "ادبِ عالیہ" میں جگہ پا سکے۔ جسکے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی شاعرہ کو بھی اسکے "عورت" ہونے کی کوئی رعایت نہ دی جائے۔ میرا مطلب ہے کہ انکے کلام کا جائزہ لیتے وقت وہی معیار قائم رکھنا چاہیئے جو کسی بڑے سے بڑے شاعر کی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے کسی اعلیٰ پایہ کے تبصرہ میں ہونا لازمی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ محض شاعرات کا تذکرہ ہے لیکن یہ عصرِ حاضر کی ایک اہم ادبی دستاویز بھی ہو گی۔ اور میں ہر اعتبار سے اسکا اتنا بلند معیار رکھنا چاہتی ہوں کہ اُردو زبان آنے والا کوئی مبصر یا مورخ جب ہمارے ادب کی تاریخ قلمبند کرنے بیٹھے تو اس تذکرہ کو پوچ یا پست سمجھکر نظر انداز نہ کر سکے۔

اس تذکرہ کا امتیازی، لیکن میرے واسطے نہایت نازک پہلو، شاعرات کے کلام پر تنقید کرنا ہے۔ اگرچہ کسی تبصرہ و بحث [illegible]

[illegible] سے بھی کچھ زیادہ ...

تنقید ایک نازک ترین [illegible] کا پورا احساس ہے اور میں تنقید میں کوشش کروں گی کہ [illegible] تعصب یا محبت کے جذبات میرے قلم پر اثر انداز ہونے پائیں۔ در حقیقت بے لاگ تنقید اور مخلصانہ تبصرہ کو میں اس تذکرہ کا بنیادی اصول اور امتیازی وصف رکھنا چاہتی ہوں۔ خدا مجھے اسکی توفیق دے۔ آمین۔

لیکن تنقید آخر نقاد کے ذاتی تاثرات کے اظہار کا نام ہے لہٰذا بہت ممکن ہے کہ میری کسی رائے یا فیصلے سے کسی کو اختلاف ہو۔ "بہت ممکن" کے کیا معنی، ایسا ہونا یقینی و قدرتی ہے۔ میں اپنی ہر رائے کو درست منوانے پر اصرار بھی نہیں کرتی کیونکہ ہر انسان کا عرفان، مذاق اور وجدان فنون الگ الگ ہو سکتا ہے۔ بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ جس چیز کو میرا وجدان جس طرح سے محسوس کریگا، وہی تاثرات اپنی دیانت داری کے ساتھ لکھدینا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری کوئی بات میری کسی بہن کو ناگوار گذرے۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ ایسی کوئی بات لکھتے ہوئے خود مجھے کتنا قلق ہوگا۔ لیکن یہ ناگوار فرض چونکہ بہر نوع مجھے ادا کرنا ہے اس لئے میں شاعرات کی خدمت میں اپنی "مجبوریاں" کو بطور معذرت پیش کر دینا چاہتی ہوں۔ مگر جہاں کسی بھائی یا بہن کو مجھ سے اختلاف ہو، یا مجھے غلطی پر پائیں تو میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں اپنے نقادوں سے ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی جستجو میں رہتی ہوں۔ اور آپ مجھے اپنی غلطیوں کے اقرار میں کافی مستعد پائیں گے۔

ایک اور بات قابلِ گزارش یہ ہے کہ میری تنقید کا سلسلہ انحصار اُسی کلام پر ہے جو شاعرات نے خود منتخب کر کے بھیجا ہے۔ اور یہ اکثر حالتوں میں نہایت ہی مختصر و محدود ہے۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ میری تنقید اُن کے چند کلام پر حاوی نہ ہو سکے لیکن جو کلام میرے سامنے ہے وہ چونکہ شاعرات کا اپنا منتخب کردہ ہے لہٰذا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اُن کی شاعری کی [illegible] بڑی خصوصیات اور نمایاں [illegible] خیال میرا اطمینان [illegible] شاعرات سے [illegible]

...ہیں جن کے پڑھنے کا قریباً سارا کلام میرے سامنے ہوگا۔ اور ان کے کلام پر تنقید بھی اُسی نسبت کے ساتھ زیادہ وسیع ہوگی۔

میں اُمید رکھتی ہوں کہ میری شاعر بہنوں کے حساس دل نے اُس بنیادی سچائی کو محسوس کر لیا ہوگا، جو ان سطور کے عقب میں سے جھانک رہی ہے — دل و روح کا وہ خلوص جس کا پورا اظہار الفاظ کے پیکر میں ہونا شاید کبھی ممکن نہیں۔ (ناہید)

حالاتِ زندگی

پنہاں رضمطراز ہیں — "نام رابعہ تخلص پنہاں۔ وطن بریلی — بہت حالاتِ زندگی؟ تو ہندوستانی عورتوں کے حالاتِ زندگی کیا؟

عورتیں کیا ہند کی کارنمایاں کر گئیں
شادی ہوئی، بچے ہوئے، بیمار ہو کر مر گئیں

بہر حال، ابھی مرنے کی نوبت تو نہیں آئی۔ البتہ بیمار تو ایسی ایسی ہوئی ہوں کہ زندہ رہنا حیرت انگیز ہے — ۱۹۰۶ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئی۔ بچپن کا زمانہ ابتداء میں کچھ دن میرٹھ میں گذرا۔ اس کے بعد الٰہ آباد آنا ہوا۔ یہاں بارہ، تیرہ سال گذرے تھے کہ قبلۂ گرامی نے ۱۹۲۲ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اپنے وطن بریلی رہنے کا اتفاق ہوا۔

۱۹۲۸ء میں شادی ہوئی اور جب سے سالِ گذشتہ (۱۹۴۲ء) تک منظفرنگر، امرتسر اور دہلی رہنا ہوا۔ گذشتہ سال پھر الٰہ آباد آنے کا سلسلہ ہوگیا۔

کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آبا جان مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم ایک خاص شخصیت کے مالک تھے۔ دیگر اوصاف کے ساتھ طبیعت کو علم و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اُس وقت کی روشِ زمانہ کے خلاف آپ کو لڑکیوں کی تعلیم سے بھی ویسا ہی شغف تھا جیسا لڑکوں کی تعلیم سے ہوتا ہے۔ اور اگرچہ لڑکیاں، لڑکوں سے بڑی تھیں لیکن اُنہوں نے اس بارے میں خاص خیال رکھا۔ ہم لوگوں نے باقاعدہ سکول میں تو نہیں پڑھا۔ تاہم کچھ اپنا شوق تھا کچھ مرحوم کا نیضانِ طبیعت۔ چھ سات سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کر کے تینوں زبانوں (اُردو، فارسی، انگریزی) میں کچھ نہ کچھ شُد بُد حاصل کر ہی لی۔

آبا جان مرحوم نہ شاعر تھے نہ ادیب، لیکن دل و دماغ شاعرانہ اور ادیبانہ تھا۔ نکتہ سنج اور نکتہ رس تھے۔ آپ کی رائے مستند ہوتی تھی۔ اس لئے ہمیں بھی مطالعہ و شعر سے فطری لگاؤ تھا اور لاتعداد اشعار از بر تھے۔ مطالعہ کی کثرت سے کچھ عرصہ بعد خود لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اگرچہ نہ کوئی نمونہ تھا، نہ اردگرد نگارش کا چرچا — ۱۹۱۸ء میں، میں نے اور آپا جان آمنہ عفت صاحبہ نے نثر نگاری شروع کی۔ کچھ دن بعد عزیزہ بلقیس جمال جن کی عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی، بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئیں۔ آبا جان اس نئے شوق سے بیحد خوش ہوئے اور اپنے دوستوں کو بھی اس خوشی میں شریک کیا۔ اصلاح خود فرماتے تھے لیکن لفظی ترمیم سے زیادہ کبھی تصحیح کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

۱۹۲۱ء میں، میں نے اور عزیزہ بلقیس جمال نے نظم کہنا شروع کیا۔ اگرچہ ہم دونوں کو عروض سے فنی لحاظ سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ مگر کبھی عروض کی معمولی سی غلطی بھی بفضلہ تعالیٰ سرزد نہیں ہوئی۔ مجھے فارسی سے طبعاً اُنس ہے۔ اس لئے میری سب سے پہلی نظم ایک فارسی غزل تھی جسے بیحد پسند کیا گیا۔ اور اُس میں ایک آدھ لفظ کے علاوہ کوئی خاص اصلاح نہیں ہوئی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، آبا جان شاعر نہ تھے اس لئے ہماری منظوم چیزیں اپنے شاعر دوستوں کو دکھلا دیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں بھی ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ کبھی لفظی تغیر و تبدل سے زیادہ ترمیم نہیں ہوئی۔

کچھ دنوں بعد اس اصلاح کا براہ راست تعلق جناب بھائی سید طالب علی صاحب قبلہ کی ذات سے وابستہ ہوگیا۔ بھائی صاحب موصوف نے جس فراخ دلی اور مہربانی کے ساتھ ہماری ہرزہ سرائیوں کو درست فرمایا وہ آپ ہی کا حصہ تھا — وقت بے وقت ہمارا دفتر اُن کے سر پہ سوار ہو جاتا تھا۔ لیکن اُنہوں نے ہمیشہ بکمال خندہ پیشانی اصلاح دی۔ حتیٰ کہ ؎

زفیضِ چشمِ کرم ریز سید طالب
شدہ فرازِ سعادت بہ آسماں غالب

اور دو تین سال کے بعد موصوف نے تحریر فرمادیا کہ اب ضرورت نہیں —

بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی چیز کو جمع نہیں کر سکی۔ سوائے اُن نظموں کے جو آبا جان مرحوم کی یاد سے وابستہ ہیں۔ ان کا مجموعہ "اشکِ خونیں" کے نام سے شائع ہوا ہے — اللہ تعالیٰ جنت آشیاں کے فیضِ روحانی اور استاذی المکرم طالب علی صاحب، ظلہ العالی کے لُطفِ معنوی کو ہمیشہ رہبر و معاون رکھے۔ لیجئے یہ ہے میری ساری داستان ؎

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا

تنقید نامہ

مشق کے اعتبار سے پنہاںؔ ہمارے ملک کی اُن گنی چنی شاعرات میں شمار ہوتی ہیں جنکی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پہ گنی جا سکتی ہے۔ شاید اس سے بھی کم۔ وہ ہماری شاعرات کی صف اوّل کی ایک ممتاز رکن ہیں۔ اُن کی پختہ گوئی اور کہنہ مشقی ان کے کلام میں سے صاف جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ان کی پختہ کلامی ہے۔ ان کے کلام پر کسی اُستاد کے فرمودات کا گمان ہوتا ہے۔

لیکن فنی پختگی کے ساتھ ساتھ پنہاںؔ کے کلام میں شگفتگی اور موسیقیت کا وہ دلآویز امتزاج جس سے شعر ایک خیال آفریں نغمہ بن جاتا ہے بہت کم ملتا ہے۔ ان کی بیشتر شاعری سے ہمارا دماغ ضرور کسی قدر مستفید ہوتا ہے لیکن ہمارا دل کبھی کبھی ہی لذت یاب ہو سکتا ہے۔ مثلاً ؎

آسماں ہلتا ہے لایا جائے گا زنداں میں آج
اُٹ وہ مجنوں جس کے دم سے تھا بیابانِ جنوں

نازپروردہ تمہارا آج دُنیا سے چلا
السّلام اے شامِ حسرت اے بیابانِ جنوں

تم نظر بھر کر نہ دیکھو چشمِ یاسِ عشق کو
چُبھ نہ جائے حُسن کے سینے میں پیکانِ جنوں

جنبش اے پنہاں ہوئی مژگانِ قاتل کو کہیں
ہیبت پیکاں میں ہے خونِ شہیدانِ جنوں

جذب ہو جائیں نہ آنسو وقتِ اظہارِ الم
کچھ تو قطرے گفتگوئے نوکِ مژگاں میں رہیں

بے خبر اے دستِ وحشت دامن سی تار کی
آج حیرانِ جنوں بیٹھے ہیں کچھ بیکار سے

کیا ان میں دل و رُوح کو تڑپا دینے والا کوئی نشتر ہے؟ —— "جذب ہو جائیں نہ آنسو وقتِ اظہارِ الم" کی نفسیاتی کیفیت یقیناً ایک قابل قدر چیز ہے۔ لیکن کیا اس ... میں ... کوئی لہر بھی پیدا ہوتی ہے؟ ... یہ نہیں کہتی کہ پنہاںؔ کا ہر شعر ... ایسی توقع ہم شاید کسی عظیم سے عظیم شاعر سے بھی نہیں کر سکتے ... عبث ہے۔ لیکن ان ہر شعر میں قافیہ و ردیف کے علاوہ کوئی ... کوئی اچھوتی شیرینی موجود ہونی چاہیئے۔ جو شعر کا ایک رنگین ... ایسی لطافت جو روح کے تہہ در تہہ پردوں میں لذت اور ... کی ایک ... بناتی ہوئی چلی جائے۔ پنہاںؔ کے یہاں یہ چیز کلیتہً مفقود تو نہیں لیکن کمیاب ضرور ہے۔ وہ الفاظ کی صوتی لطافت اور موسیقیت کا اتنا التزام نہیں کرتیں۔

لیکن اس میں پنہاںؔ کی فطری ذہانت و ذکاوت کا کوئی قصور نہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ وہ عصرِ حاضر کی ممتاز ترین شاعرات میں سے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے ادب کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ وہ ایک مستقل اندازِ سخن رکھتی ہیں۔ اور بعض دوسری معاصرین کی طرح بھکی بھکی نہیں پھرتیں۔ یہ ان کی امتیازی خوبی ہے —— وہ اس کیلئے ہمارے ادب میں زندہ رہیں گی۔ وہ ادب میں اپنے لئے ایک مستقل قیام پیدا کر چکی ہیں۔ مگر چونکہ اُن کے شعورِ شاعرانہ نے ایک ایسے دور کے اندر آنکھ کھولی۔ جو اب تقریباً گذر چکا ہے۔ یا بڑی تیزی کے ساتھ گذرتا جا رہا ہے۔ اس لئے ایسا ہونا قدرتی تھا۔ ادب ہمیشہ زندگی کے ساتھ بدلتا جاتا ہے۔ جو ادب ایک نکتہ پر آ کر جم جائے اس میں وسعت و ندرت نہیں رہتی۔ وہ مُردہ ہے۔

ادب کی بنیادی نوعیت کے ساتھ ہی اس کی ظاہری ہیئت میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی آ جاتی ہے۔ بعض الفاظ، تراکیب، اسالیبِ بیان جو کسی وقت شعر کا حُسن اور شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں شعر کی ثقالت کی دلیل سمجھے جانے لگتے ہیں۔ نگاہوں سے گر جاتے ہیں۔ گویا معنوی انقلاب رونما ہوتے ہی ہمارا وجدانِ شعری بھی متغیر ہو جاتا ہے۔ بلکہ ذاتی طور پر میں تو سمجھتی ہوں کہ معنوی انقلاب اس وقت تک معرضِ ظہور میں نہیں آ سکتا۔ جب تک کہ انسان کا تصورِ حیات، شعورِ ادب اور وجدانِ شعر پہلے تغیر پذیر نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کے اشعار میں "خنجرِ ابرو" (ابرو نوکِ خنجر ابرو کی نرالی ادا) ایسی تراکیب دیکھتے ہیں تو ہماری سماعت، جو اب خوبصورت اور نرم تر شاعری کی عادی ہو چکی ہے، اس کی ناخوشگوار ثقالت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پنہاںؔ یہاں بھی اکثر فارسی کی گرانبار و ثقیل ترکیبوں سے اپنے کلام کو کچھ بوجھل بوجھل سا بنا دیتی ہیں۔ مثلاً ؎

بہت ہی مست ... چارہ گر کی سوزنِ دل ... ہمارا سینۂ صد چاک یوں ہو گا نوکِ ... تک

ؔ ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں (نجمہ)

نظم میں بھی ملتا ہے۔ دیکھئے ؎

ہر تقاطرِ شبنمِ گل ریزہ کا گوہر طراز
دامنِ سبزہ ہے تابش کار دُرِّ شاہوار

پنہاں شاعری کے جدید رنگ جو میرے نزدیک بہتر رنگ ہے ـــــ سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ گو بہت زیادہ نہیں ـــ لیکن جب وہ اس سے میں کوئی نغمہ چھیڑتے ہیں (غزل ہو یا نظم) تو شعر کے سارے پیکر ـــ اس کے شوشہ شوشہ میں ایک بکراں سرشاریت جھومنے لگتی ہے۔ سنیئے ؎

عشق کی وہ آخری نیرنگیاں دیکھا کئے　　خون کے قطروں میں کچھ تبدیلیاں دیکھا کئے
مٹ گئے کتنے کون سے ارمان دقتِ نزعِ آہ　　مرنے والے یوں جو سوئے آسمان دیکھا کئے
آج کس برباد ہستی کا ہوا ماتم یہاں　　مضطرب ذرّاتِ خاکِ آشیاں دیکھا کئے
آہ کھینچی کس گرفتارِ قفس نے اس طرح
بجلیوں کی زد پہ صحنِ گلستاں دیکھا کئے

مے کدے کی نگاہیں آج بھی اس درجہ سرکش ہیں　　نظامِ دو جہاں سے سرگراں معلوم ہوتی ہیں
یہیں ٹوٹا کیا تھا قافلہ امید واروں کا　　جہاں اب یاس کی سنسانیاں معلوم ہوتی ہیں

رہِ طلب میں ہیں جادہ پیما، نہ راہبر ہے نہ رہنما ہے
ہم اپنے قدموں سے نقشِ منزل بنا رہے ہیں مٹا رہے ہیں

نیاز و ناز نامقبول دونوں　　نہ سمجھی میں کہ ہے تیری رضا کیا
ہوئی جنبش جو مژگانِ کرم میں　　نگاہِ آرزو نے کہہ دیا کیا
جفا و ناز کی خوگر ہوں پنہاں　　خدا معلوم ہے رسمِ وفا کیا

دیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ　　شیشۂ چشم میں شراب کا رنگ

بجھ گیا آخر چراغِ شام بھی　　اک یہی باقی مرا ہمراز تھا
دیر تک گونجی صدائے بازگشت　　آخری نغمہ شکستِ ساز تھا

قصۂ راہِ طلب ہے مختصر　　ایک ٹھوکر حاصلِ ہر گام ہے
مژدہ باد اے جذبۂ خاموشِ عشق　　اک تجلی آج زیرِ بام ہے

ان اشعار میں سے اکثر اگرچہ خیال کے اعتبار سے قدیم ہیں لیکن الفاظ کی ہم آہنگی اور اسلوبِ بیان کی گھلاوٹ کے لحاظ سے بہت حد تک جدید ہیں ـــ نظم میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ جھلک اٹھتا ہے۔ اور اس خوبی کے ساتھ کہ داد نہیں دی جا سکتی ملاحظہ ہو ایک نظم "عشرتِ نو" کے چند اشعار پیش ہیں ؎

اک سکونِ مطمئن قلبِ فضا میں جلوہ ریز　　کیفیت یوں شام کی آفاق پر راحت فگن
ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوا میں ہیں سات وسعتِ آسماں　　کچھ شفق کی دامنِ مغرب میں رنگیں دھاریاں
ہلکا ہلکا سا تقاطر شبنمِ گل ریز کا　　سبزۂ رنگیں پہ موتی سے ڈھلکتے حباب
بند کلیاں دلربا انداز سے کھلتی ہوئی　　سیم گوں غنچوں سے بوئے زندگی ملتی ہوئی

پنہاں نظم کو استعارہ و تشبیہ سے بھی اکثر مزین کرتی ہیں جو ہمیشہ لطیف و دل آویز ہوتی ہیں۔ ارشاد ہے ؎

کرن سورج کی برگِ گل پہ ایسے جھلملاتی ہے
عروسِ ناز آئینہ میں جیسے مسکراتی ہے

جبینِ گل پہ افشاں شبنمِ گل ریز چنتی ہے
کہ تارِ زر سے سورج کی کرن زربفت بنتی ہے

صفائے آب جو ہے دیدنی دامانِ منظر میں　　ستارے جھلملاتے ہیں مسلسل حوضِ کوثر میں

پنہاں کا جس قدر کلام اس وقت میرے سامنے ہے اس کے مطالعہ سے ایک اور صرف ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ پنہاں کی شاعری قدیم و جدید رنگ کا ایک امتزاج ہے۔ وہ ایک لہراتی ہوئی ندی ہے جو اجاڑ بیابانوں اور بے رونق صحراؤں کو قطع کرتی ہوئی جنت نگاہ خیابانوں میں سے ہو کر بھی گزر جاتی ہے۔ اور جب وہ ان بہار آفریں سبزہ زاروں سے گزرتی ہے تو اس کے نغمات زیادہ لطیف، زیادہ پُرکیف اور زیادہ پُرخمار ہو جاتے ہیں۔ سنیئے! ؎

دل نے کیا ہے تجھ کو دو عالم سے انتخاب　　اب حوصلہ ہو لغزشِ بے اختیار کا
نظریں ملیں تو ضبط کی منزل ہوئی تمام　　آنسو نہ رک سکا نگہِ انتظار کا
پنہاں نگاہِ یاس کی وہ آخری جھلک　　بجھتا سا ایک شعلہ چراغِ مزار کا

عورت کے نازک و لطیف جذبات اور وہ نرم رو موسیقی جو صرف ایک عورت ہی کے دل سے ابھر سکتی ہے ـــ ان دونوں کے خمیر سے جو شعر تیار ہوگا وہ [illegible] بے جان پیکر نہیں، بلکہ کسی دوشیزہ کا دھڑکتا ہوا دل ہوگا۔ کاش پنہاں ابھی زندہ ہوتیں۔ [illegible] (کلام کے مفصل نمونے کتاب میں شامل ہوں گے)

کیا عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکتی ہیں؟

(از محترمہ سلمیٰ رشید صدیقی)

عورتوں کے متعلق مردوں کی عام رائے یہ ہے کہ وہ ذہنی اعتبار سے مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ رائے بالکل غلط ہے۔ کیونکہ جس طرح مرد زندگی کے مسائل کو سلجھاتا اور بناتا ہے۔ اور جس طرح دیکھتا اور سمجھتا ہے اسی طرح عورت بھی تو ان مسائل کو بنا اور سنوار سکتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ عورت کو یہ سب کچھ کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور جب موقع نہیں دیا جاتا یا نہیں ملتا تو وہ آخر اپنی قابلیت کا اظہار کیونکر کر سکتی ہے۔ اگر عورت کو موقع دیا جائے تو وہ بڑی خوش اسلوبی سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سلجھا سکتی ہے۔ اور بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتی ہے۔ اور کون نہیں واقف جب بھی عورت کو روشن اور کھلی فضا اور تھوڑی سی بھی آزادی میسر آئی ہے تو اس نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے۔ اور پھر یہ چیز بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ اس نے یہ تمام کام اپنی ہمت قابلیت اور قوت کے بل پر انجام دیئے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرنے پر ہمیں ہر جگہ عورت کی سچائی، محبت، دیانت اور فرض شناسی کے اعلیٰ نمونے ملیں گے۔ مرد کہتے ہیں کہ عورت کے ارادوں میں پختگی نہیں ہوتی۔ یعنی وہ کسی خاص ارادے کی پابند نہیں ہوتی اور اس کے ارادوں کو ایک لمحہ میں ہی ملیامیٹ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عورت جب کسی بات کا مضبوط ارادہ کر لیتی ہے تو اسکے سامنے کسی رکاوٹ کا خیال نہیں کرتی۔ اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے ارادے کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عورت کے ارادے کو ثبات نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ عورت زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش رہ کر ہر کام کر سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مردوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا پسند نہیں کرتی۔ یہ چیز قابل قدر ہے۔ اور اس سے عورت کے نظام ... کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں عورت کے اس فطری خلوص کا احترام کرنا

... میں اس [illegible] عورت اور [illegible] پڑھی لکھی بھی ہے اور ذہنی [illegible] اعتبار سے [illegible] نہیں ہے لیکن وہ مردوں کے [illegible] اپنے شایان شان نہیں خیال کرتی۔ اور اس [illegible] ہے کہ عورت کا تمام کام مردوں سے قطعاً مختلف ہے اور ان [illegible] صف میں کھڑا ہونا یا کھڑے ہونے کی کوشش کرنا عقل پر [illegible] ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آخر عورتیں اپنے ان تمام کاموں اور فرائض اور ذمہ داریوں کو جن کا پورا کرنا ان کا نہایت خوشگوار اور مقدس فرض ہے۔ کیوں اس قدر معمولی اور ہلکا سمجھے ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں ان کے وہ تمام معمولی اور ہلکے کام جس قدر اہم اور دیر طلب ہیں اتنا اہم کوئی دوسرا کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ عورت کوئی دوسرا کام کرتے ہوئے اس قدر باوقار معلوم ہوتی ہے جتنا اپنی ان ذمہ داریوں اور فرائض کو پورا کرتے وقت نظر آتی ہے جو اس پر عائد ہیں۔

میں نے اکثر بڑی بوڑھیوں کو لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کرتے محض اس وجہ سے پایا کہ ان کا خیال ہے کہ لڑکیاں پڑھ کر گھر کے کاموں کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتیں۔ اور ان لڑکیوں کے نزدیک خاندانی روایات کا برقرار رکھنا یا ان کا پابند رہنا کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور اس کا الزام وہ تعلیم پر رکھتی ہیں۔ حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے۔ تعلیم کہیں بھی یہ نہیں بتاتی یا سکھاتی کہ ہم خاندان کے لئے باعث زحمت اور گھر والوں کے لئے بلائے جان ثابت ہوں۔ یہ تمام چیزیں تو ہماری فطرت پر منحصر ہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ موجودہ تعلیم تو ہمیں وہ کچھ سکھاتی اور بتاتی ہے کہ جن کے جاننے پر ہم اپنی فطرت بھی سدھار سکتے ہیں۔ اور میں تو تعلیم کو مردوں سے کہیں زیادہ ضروری عورتوں کے لئے سمجھتی ہوں۔ کیونکہ عورتوں کی فطرت میں قدرتی طور پر کچھ الجھاؤ ہوتے ہیں جن کا سلجھنا عورتوں کی زندگی اور مردوں کی عافیت دونوں کے لئے ضروری ہے۔ ذرا ذرا سے بے معنی بے سروپا اور من گھڑت واقعات کو جس قدر اہمیت عورتیں دیتی ہیں اور جتنا ذرا ذرا سی بات پر میں نے عورتوں کو مشتعل ہوتے دیکھا ہے۔ اتنا کیا اس کا عشر عشیر بھی مردوں کو نہیں دیکھا۔ عورت کی اصلاح کی [illegible] ضرورت ہے۔ اور یہ محض تعلیم کے ذریعے ہو سکتی ہے [illegible] کی اچھائی یا خرابی انسان کے اعمال و افعال پر منحصر ہے۔ اور افعال کی درستی تعلیم و تہذیب پر! لہٰذا اگر ہماری تعلیم [illegible]

کی ہے تو یقیناً ہماری خانگی زندگی بھی اچھی طرح کامیاب بنے گی۔ اگر عورت کی تعلیم میں اس کا ذہن نہ ڈالا گیا اور اس کو صحیح تعلیم دی گئی تو مجھے یقین ہے کہ تعلیم کو گہرا اور عام بنانے کے سلسلے میں عورتیں بہت کچھ مدد دے سکتی ہیں۔ کیونکہ قوم کی ترقی کا انحصار آئندہ نسلوں پر ہے۔ اور آئندہ نسلوں کی اچھائی یا برائی کی ذمہ دار موجودہ عورتیں ہیں اور بچوں کی طبیعت کا اندازہ جس خوبی اور آسانی سے عورت لگا سکتی ہے وہ مرد کے لئے ناممکن ہے۔ اور اسے تو بڑے بڑے ماہرین نفسیات نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ طبیعت میں لوچ اور گھلاوٹ پیدا کرنا صرف عورت کا کام ہے۔

افسانہ

مُورکھ

(از جناب محمد امین شرقپوری)

پنڈت جی کے گھر سے رادھا روٹی کے باسی ٹکڑے لے آئی۔ جب اس نے گُڑ کا ملیدہ بناکر موہن کے آگے رکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "ماں آج تو حلوہ بنایا ہے تم نے"۔ پتلے ملیدہ میں حلوے کی سی تری اور مزہ کہاں سہی۔ میٹھا اس کا من بھاتا کھاجا تھا۔ ماں سے چوری چھپے گُڑ نکال کر کھا جاتا۔ اور جب وہ کہتی "ارے پھر کھا لیا گُڑ تو نے۔ کھانسی آئے گی"۔

وہ بولا۔ "ماں گُڑ کھانے سے کھانسی تھوڑا ہی ہوتی ہے"۔

وہ بولی۔ "تو نے سب کیوں کھا لیا۔ تجھے ملیدہ بنا دیتی"۔

بولا۔ "روز کہتی ہو کبھی بنا کر تو کھلایا نہیں"۔

بولی۔ "گیہوں کی روٹی سے بنتا ہے۔ باجرے کا کیسے بنا دوں"۔

موہن یہ جانتے ہوئے کہ گیہوں کی روٹی اُن کے گھر میں نہیں پکتی۔ بولا "باجرے کا آٹا لاتی ہو۔ گیہوں کا لے آیا کرو"۔

رادھا آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "یہی کھانے کو ملتا ہے تو بہت ہے تیرے پتا جی کے ہوتے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اُن کی پیٹھ پھرتے ہی بھاگ پھوٹ گئے۔ مہنگے سمے میں جینے کے لالے ہیں۔ جو مل جائے وہی غنیمت ہے بیٹا"۔

موہن مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ باسی ٹکڑے آج سواد دے رہے تھے۔ مسکرا کر بولا۔ "یہ تو بہت اچھا ہے۔ روز کھلاؤ گی نا ماں؟"

ماں جو بیٹے کی مسکراہٹ کو برقرار دیکھنا چاہتی تھی۔ بولی "بہت اچھا لگ رہا ہے؟"

"ہاں ماں! جی چاہتا ہے کہ کھائے جاؤں"۔

"یہ تو بہت ہے۔ خوب کھا لو پیٹ بھر کر"۔ ماں محبت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور کلیجہ کا ٹکڑا۔ امیدوں کا ننھا سا پیڑ جسے وہ پسینہ بہا کر سینچ رہی تھی۔ آج اُسے خوش دیکھ کر اس کا دل ناچ رہا تھا۔ اس گھڑی دو گھڑی کی خوشی کے لئے تڑکے ہی آ سے پنڈت جی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ پنڈت جی [illegible] انہوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو رادھا کھڑی تھی۔ انہوں نے [illegible] یہ وقت ان کی بھگتی کا تھا۔ اشنان کر کے بیٹھے تھے۔ [illegible] زیر لب گنگناتے ہوئے انہوں نے پھر ایک کنکھیوں سے [illegible] گردن موڑ لی۔ یہ حواس کے خلاف [illegible] سے بولے "چلی جاؤ"۔

رادھا گردن ڈالے پنڈت جی کو جھکی جھکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پنڈت جی پیپل کو سینچ رہے تھے۔ رادھا کو موہن کا دھیان تھا جو اس کے من کے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا بسور بسور کر کہہ رہا تھا "ماں آج ملیدہ تو بناؤ گی نا"۔

"مہاراج" وہ دبی آواز سے بولی۔ "باسی ٹکڑے ہوں تو دیدو"۔

پنڈت جی کچھ نہیں بولے۔ آنکھوں کے ساتھ انہوں نے کان کے سوراخ بھی بند کرنے چاہے مگر رادھا کی موجودگی کا احساس نہ ہری اوم کا بلند آواز دبا سکی اور نہ کان روک سکے۔ خطرے کی ہلتی ہوئی زنجیر انہیں بار بار جھنجھوڑ رکھ رکھ کر جگا دیتی۔ دھوتی سنبھالتے ہوئے اُٹھے۔ کھڑاؤں سے کھٹ پٹ کرتے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھوں میں باسی ٹکڑے لے کر آئے دور ہی سے اُس کی جھولی میں پھینک کر بولے "دن تو نکلنے دیا ہوتا۔ صبح ہی صبح چلی آئی۔ یہ سمے بھگتی کا ہے مانگنے کا نہیں۔ مُورکھ اگر بھوکا نہیں مرے گا تو کیا پیٹ بھر کر کھائے گا۔ چوبیس گھنٹے پیٹ کی چنتا ہے"۔

رادھا چپ چاپ چلی آئی۔ پنڈت جی نے کیا کہا؟ اس نے سنا۔ کیا وہ تھوڑی دیر کے لئے سب بھول گئی۔ پنڈت جی سے کہتی بھی کیا بھوکے پیٹ بھگتی بھی نہیں ہوتی۔

موہن انگلیاں چاٹتے ہوئے بولا۔ "ماں کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں" وہ چونک پڑی۔ بھوک، بھگتی اور مُورکھ اس وقت تینوں اس کی "کچھ نہیں" میں چکر کاٹ رہے تھے۔

پنڈت جی کے دروازے پر نفیریاں بج رہی تھیں۔ لوگوں کا [illegible] دھوم دھڑکے میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

"کیوں کھڑی ہے؟" ایک بولا۔

"پنڈت جی کے پاس آئی ہے"۔

"دیکھتی نہیں ہو اُن کے بیٹے کا بیاہ ہے۔ کام میں لگے ہوئے ہیں"۔ ایک اور بولا۔ "چھوڑو۔ بھکارن ہے"۔

"بھگوان۔" پھر چونک کر بولا۔ "اندر کہاں گھسی چلی آ رہی ہے؟"
"مہتر لجھوک کر بولا۔" سامنے پیڑ کے نیچے کیوں نہیں بیٹھتی جاکر وہاں۔
تیرے اور بھائی بھی ہیں۔"
رادھا نے دیکھا پیڑ کے نیچے کتنے بیٹھے تھے۔ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔
"مٹھائی میں کھاؤں گا"
"ابھی تو کھلایا تھا اُس روز۔"
"آج پھر بنا دو۔ گڑ رکھا ہے۔"
"گڑ کھالو" وہ بولی
"تم ہی تو کہتی ہو کہ کھانسی ہوتی ہے گڑ کھانے سے۔"
"رو رہا ہے۔"
وہ ہمت کر کے آگے بڑھی "میں بھکارن نہیں ہوں۔"
"بھکارن نہیں تو کیا براتی ہے۔" ایک بھاری بھرکم دھکیل کر بولا۔ رادھا گیند کی طرح اُچھل کر دیوار سے جا لگی۔
"سبھی کہہ رہے ہیں، مانتی نہیں۔" وہ غصے سے بوکھلا رہا تھا۔
"مان جاؤ بیٹا۔"
"وہ بسور کر بولا "نہیں ماں۔"
"روٹی پکائی ہے۔ کھا لو گڑ سے۔" محبت سے بولی
"میں آج کچھ نہیں کھاؤں گا۔"
"ہائے بھوکے رہو گے۔"
وہ چونک کر اُٹھی۔ کونے میں کوئی جھوٹے پتل پھینک رہا تھا۔ رنگ برنگ کی بچی کھچی مٹھائی گر رہی تھی۔
"یہ جھوٹ ہے۔" رادھا کانپ گئی۔ "یہ سب جھوٹ کہاں ہو گی؟" جی ہی جی میں بولی "پنڈت جی کے بیٹے کا بیاہ ہے سبھی براتی بھی پنڈت ہونگے۔"
مٹھائی جلدی جلدی دونے میں چننے لگی۔
"یہ کون ہے؟" دور سے مہتر جھاڑو لے کر بڑھا۔ رادھا دونا دونا چھپا کر بھاگی۔ مہتر چند قدم پیچھا کرتے ہوئے بولا "سسری ہمارا حق کھائے ہے۔"
ماں کو دیکھ کر موہن دوڑ کر آیا۔
"دیکھ تیرے لئے کیسی اچھی مٹھائی لائی ہوں۔ اب ضد نہ کیجو۔"
وہ بے صبری سے دونے پر لپک کر بولا۔ "یہ نئی لڈو کہاں سے لائی ہو ماں؟"

"پنڈت جی کے بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے نا۔"
"میں میرا بیاہ نہ کرو گی ماں۔" لڈو دکھاتے ہوئے بولا۔
"جب تو بڑا ہو جائیگا تیرا بھی ہوگا۔"
"اوں"۔ وہ بولا "پنڈت جی کا بیٹا میرے برابر کا ہی تو ہے۔"
"تجھ سے بڑا ہے بیٹا۔"
"نہیں ماں۔ ایک روز میں اُس کے ساتھ کھیلا تھا مجھ سے کچھ ہی بڑا ہوگا۔"
ماں کو یاد آیا ایک روز موہن روتا ہوا آیا تھا۔
"کیا ہوا بیٹا؟"
"پنڈت جی نے مارا ہے۔ میں کشن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔"
"تو نے کچھ کہا ہوگا اُسے۔"
"نہیں ماں۔ پنڈت جی اُس سے بولے غلیظ لڑکوں کے ساتھ کیوں کھیلتا ہے۔"
"تجھے کس نے مارا؟"
"میں کھیل جو رہا تھا اُس کے ساتھ۔"
ماں کی نظریں بیٹے کے میلے کچیلے کپڑوں پر پڑی۔
"تو وہاں نہ جایا کر۔"
برفی منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ بیاہ پر خوب پیٹ بھر کر مٹھائی ملتی ہے۔ جس کا بیاہ ہوتا ہے وہ اچھے کپڑے بھی تو پہنتا ہے ماں۔"
"ہاں بیٹا۔" وہ بولی۔ "اب سو جاؤ جاکر۔"
آج اُس کا بیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔

سڑک پر چھڑکاؤ ہو رہا تھا، رنگ برنگ کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔
"پنڈت جی کے بیٹے کی برات آئے گی۔" ایک بولی۔
"دوسری بولی "ایک ہی تو بیٹا ہے اُن کا۔"
"اتنی چھوٹی عمر میں بھاگوان ہی بیاہ کر سکتا ہے بیٹے کا۔"
"ہاں بہن۔" رادھا بولی۔
پھر اُسے بیٹے کی باتیں یاد آ گئیں۔ "ماں میرا بیاہ نہ کرو گی" اور جیسے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا موہن جوان ہو گیا ہو۔ اُس کے بدن پر زرق برق پوشاک جھلک رہی ہو۔ گھوڑے پر دولہا بنا بیٹھا ہو۔ سوچتے ہوئے رادھا خود کو بھول گئی۔ اُس کے کانوں میں نفیریاں بجنے لگیں۔ لوگ گیس کے ہنڈے اُٹھائے آ رہے تھے۔ گلاب چھڑکا جا رہا تھا۔ پھولوں کی مہک اور

خواب کی سی فضا میں اڑ رہے تھی۔

"کس کی برات آ رہی ہے؟" ایک بڑھیا اُس کے برابر میں کھڑی ہو کر بولی۔

رادھا پھریری لے کر بولی "دیکھتی نہیں ہو۔ میرے موہن کا بیاہ ہو رہا ہے۔"

بڑھیا بھویں سکیڑ کر پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے بولی "تیرے بیٹے کا بیاہ ہے اور تو یہاں کھڑی ہے۔"

"اری تو میں کیا جھوٹ کہتی ہوں" جیسے اُس وقت وہ پاگل ہو گئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر بولی "وہ دیکھو دولھا آ رہا ہے۔ میرا بیٹا دولھا۔ کیا میرے موہن کو نہیں پہچانتی ہو؟ سونے کی تاروں کا سہرا باندھے ہوئے ہے سر پر مکٹ ہے۔ اور یہ اونٹوں پر سوار لاوارث بچے میرے بیٹے کی ساری بلائیں دور کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

عورتوں نے مسکراتے ہوئے چونک کر دیکھا۔ اُس کا موہن میلے کچیلے کپڑے پہنے اونٹ پر سوار جھنڈا ہاتھ میں لئے نشان کا ہاتھی بنا برات کے آگے آگے آ رہا تھا۔

ایک افسانہ... جس کا کوئی عنوان نہیں

(از محترمہ سیدہ اختر حیدرآبادی)

افسانہ لکھنا سہل بھی ہے اور دشوار بھی ـــــ سہل ان کیلئے جو افسانے کیلئے پہلے سے کوئی موضوع یا عنوان تلاش کر لیا کرتے ہیں ـــــ اور مشکل اُن کے لئے جو افسانہ لکھتے وقت نہ کوئی موضوع رکھتے ہیں اور نہ عنوان ـــــ خدا رحم کرے اس قسم کے افسانہ نویسوں پر ـــــ اور بس !

کائنات کے دامن میں افسانے کے بے انتہا عنوانات بکھرے پڑے ہیں

لیکن ؎ اِس قدر فرصتِ حیات کہاں

کہ .... کوئی موضوع تلاش کرنے میں زندگی کے بیش قیمت لمحات ضائع کئے جاسکیں۔ میرا افسانہ بہرحال افسانہ ہے "جس کا کوئی عنوان نہیں" ـــــ اور اگر آپ پسند کریں تو یہی میرے افسانہ کا عنوان بھی ہو سکتا ہے ـــ بہرکیف

؎ برگِ سبز است تحفۂ درویش

لیجئے ملاحظہ ہو۔ (سیدہ اختر)

شاہدہ ـــــ عالم کمسنی ہی سے ایک پاکیزہ مزاج، روشن دماغ، اعلےٰ جذبات اور بلند نظری کی مالک تھی ـــــ تحریر کی ملکہ، تقریر کی خطیبہ، شاعری کی ناہیدہ۔ یہ تھے اُس کے خطابات! ـــــ جو اس کی قوم اور اس کے ملک کی طرف سے اس کو نذر کئے گئے تھے ـــــ حقیقت بھی یہی تھی کہ ـــ پبلک پلیٹ فارموں سے اخبارات و رسائل تک ـــــ شاہدہ خود اپنا آپ شہود تھی اور اس کے علمی و ادبی اور قومی و سیاسی کارنامے پکار پکار کر دُنیا سے کہہ رہے تھے کہ "خاتونِ مشرق "شاہدہ کا نام ہے ـــــ دوشیزۂ ہند کو انہیں صفات کا مالک ہونا چاہیئے ـــــ ایک طرف اگر شاہدہ قوم و ملک کیلئے ایک شجاع نڈر اور بہادر خدمتگزار تھی تو دوسری طرف! یعنی ـــــ دُنیائے شعر و ادب میں وہ ایک ممتاز شخصیت کی مالک تھی ـــــ !! شاہدہ با ایں ہمہ صفات زندگی و کائنات کے متعلق بالکل اچھوتے اور نئے نظریات و خیالات رکھتی تھی۔

اُس نے اکثر اپنے "عالمِ حال" میں کہا ـــــ کہ زندگی کا مقصد صرف محبت ہے زندگی محبت کا دوسرا نام ہے ـــــ کائنات کی ہر چیز منتشر و غیر منظم ہے ـــــ اُونچے اُونچے پہاڑ ـــــ گہری گہری وادیاں۔ بلند و بالا درخت پست و نادمیدہ سبزہ، غار و گل، شام و سحر، ستارے اور ماہتاب! خورشید اور اُسکی بکھری شعاعیں، بہتے ہوئے دریا، ساکن تالاب، اگرچہ ـــــ تمام چیزیں متضاد حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ مگر ان کے اندر ایک ربطِ معنوی موجود ہے۔ اور اسی ربطِ معنوی کا نام "محبت" ہے۔ "خدا" محبت ہے۔ اور محبت خدا ـــــ اسی لئے "شاہدہ" کائنات کے ہر منظر میں "محبت" یا نورِ محبت کو جلوہ گر دیکھتی تھی ـــــ اس کا ایمان تھا ـــــ کہ انسان صرف محبت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

وہ اکثر کہتی تھی کہ جب آدم نے جنت میں "گناہ گندم" کیا تو پھر نسل انسان بڑھانے کی اللہ کو کیا ضرورت تھی؟ اسی جنت میں آدم و حوا کی خوشنما قبریں کیا مقبرے تیار کئے جاسکتے تھے ـــــ مگر با ایں ہمہ آدم و حوا کو اس کرۂ ارض پر بھیج دیا گیا۔ اور ان کو بافراط اولاد عطا کی ـــــ وہ بھی صرف اِس لئے کہ اِنسان محبت کی تلوار لیکر اِس کائنات پہ حکمرانی کرے۔ جب سے اب تک کائنات پہ انسان صرف محبت کی آڑ لیکر حکمرانی کر رہا ہے۔ اور خدا جانے کب تک حکمرانی کرتا رہے گا؟ موجودہ جنگ اور اس کے انسانیت سوز مظالم کو جانے دو ـــــ یہ ایک وقتی چیز ہے! میرا عقیدہ ہے کہ دُنیا صرف برائے محبت زندہ ہے ـــــ دُنیا کے بوالہوس دُنیا پر اپنا اقتدار جمانے کے لئے کتنی ہی خونریزیاں، تباہیاں اور سرکشیوں کا حشر اُٹھالیں ـــــ مگر یاد رہے کہ یہ دُنیا صرف محبت سے اپنی بنائی جاسکتی ہے ـــــ تاریخ عالم گواہ ہے کہ تلواروں، نیزوں اور خنجروں سے دلوں کو فتح نہیں کیا جاسکا۔ البتہ محبت نے بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکا دیے ـــــ وغیرہ ـــــ وغیرہ یہ تھے "شاہدہ" کے بلند و پاکیزہ اور جذبات میں ڈوبے ہوئے تاثرات! اب آپ ہی تصور کیجئے کہ شاہدہ آپ کی نظروں میں اب کیا معلوم ہوتی ہے؟

الغرض شاہدہ اپنی جگہ شاہدہ تھی۔ اور اُسے باستثنائے کائنات شاہد سے بھی محبت تھی ـــــ محبت تھی نہیں! ہوگئی تھی! اور وہ بھی صرف اس لئے کہ "محبت" مقصود حیات ہے۔

...وہ حسین و خوشنما خدوخال کا انسان ... پاکیزہ بات ... کہنے والا شاہد ایک ایسا انسان ——— جس کی پاکیزہ مزاجی پر فرشتے بھی اگر چاہیں تو رشک کر سکتے ہیں ——— الغرض شاہد و شاہدہ ایک ایسا حسین و پاکیزہ شعر تھے جس کے مصرعے ایک دوسرے سے جدا کئے جا سکتے تھے ——— یا با الفاظ دیگر ان کے سینے کے اندر ایک ہی سا ایک ہی جذبہ موجزن تھا۔

شاہد کو شاہدہ سے اور شاہدہ کو شاہد سے بے پناہ محبت تھی۔ محبت میں پہل کس کی جانب سے ہوئی، اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے ——— صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ دونوں نے اپنی اپنی جانب سے پہل کی اور دونوں بیک وقت "حادثۂ محبت" کا شکار ہوئے ———

جوں جوں دن گذرتے گئے دونوں کے دل اور دلوں کی محبت ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی چلی گئیں۔ لیکن قدرت گواہ ہے کہ دونوں اس قدر قریب ہو کر بھی ملنے کی طرح نہ مل سکے ——— دونوں کا ذاتی عقیدہ تھا کہ ——— محبت کبھی نہ ملنے کا دوسرا نام ہے۔ ناکامی و نامرادی، دوری و مجبوری یہ محبت کے صفات ہیں ——— ؎

ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈ لیا
آخرش کامیاب ہونا تھا!

ایک دن ایک خاص بزم طعام و سماع منعقد تھی ——— شہر کے اہل ذوق و شوق شریک محفل تھے ——— کچھ شعرا بھی خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے ——— پہلے ماحضر تناول کیا گیا۔ اور پھر ضیافت روح کا سامان ہوا ——— شعرا کے تازہ بتازہ نو بہ نو کلام نے حاضرین کو بے حد محظوظ کیا۔ لیکن جس وقت شاہدہ غزل سرا ہوئی تو ایسا محسوس ہوا کہ تمام فضا ساکن ہے ——— ساری کائنات گوش بر آواز ہے ——— اور فضا کا سکوت بطور داد و تحسین یہ کہہ رہا تھا ——— ؎

کون ہے مطرب کے ہاتھوں میں یہ دلکش ساز ہے
بزم قدرت، روح فطرت گوش بر آواز ہے

یہ تو سب کچھ تھا ——— لیکن اس وقت شاہد کی منتظر نگاہیں متبسم ہوا اور بیتاب تھیں جس کے اندر محبت کے پاکیزہ و لطیف جذبات جاری و ساری تھے ——— قابل دید تھے! اہل محفل تو شاہدہ کے سحر ساز ترنم اور روح نواز اشعار کی داد و تحسین میں مصروف تھے۔ لیکن شاہد! ——— شاہد اس منظر سے ہٹ کر بہت دور سے شاہدہ کے سرخ و سفید رخساروں

... محبت کی حسین شام ... ——— ... یہ امانت ... تھا کہ شاہدہ شاہد کے ... شمار کرتا ہے ——— کی قدر ... ہے ———

الغرض زمانہ گذر گیا اور زمانے کے ساتھ ساتھ دونوں کی پاکیزہ محبتیں معراج کمال تک پہنچ گئیں ——— ... پرکھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح محبت آزمائش و ابتلا کی کسوٹی پر جانچی اور پرکھی جاتی ہے ——— ؎

عجب زمانہ ہے کرتا نہیں کسے تسلیم
کسی سبب سے بظاہر جو بے قرار نہ ہو

آخرش شاہد و شاہدہ کی محبت کی آزمائش کا موقع جلد ہی آگیا ——— شاہد کے والدین اپنے ہی خاندان میں شاہد کی شادی کر دینا چاہتے تھے ——— اور شاہد کو انکار تھا ——— کچھ تو شاہدہ کی محبت کا تقاضا اور احترام! ——— اور کچھ مغربی تعلیم کا اثر جس نے ذہن شاہد سے شادی کے نظریے کو یکسر تبدیل کر دیا تھا ——— اس کا خیال تھا کہ شادی صرف ایک سوسائٹی کا بنایا ہوا قانون ہے، جس کو موثر بنانے کیلئے مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے ——— ورنہ رشتۂ شادی سے زیادہ مضبوط وہ "رشتۂ محبت" ہے جو دو دلوں میں از خود پیدا ہو گیا ہو ——— شاہد کے ماں باپ شاہد کے ان عجیب و غریب خیالات سے تنگ آگئے ——— اور ایک زمانہ بحث و اصرار میں گذر گیا۔ جب سب تدبیریں ناکام ہو گئیں تو شاہد کے والدین کو ایک نئی تدبیر سوجھی ——— یعنی شاہدہ کو "مقصد برآری" کا ذریعہ بنایا جائے ——— کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ شاہدہ کا ایک ادنیٰ سا اشارہ شاہد کیلئے نقش کالحجر کا درجہ رکھتا ہے ———

آخرش ایک دن شاہد کا "خاندانی وفد" شاہدہ سے ملا اور ضروری حالات سے شاہدہ کو باخبر بنا کر امداد چاہی ——— شاہدہ آج تک اس راز سے ناآشنا تھی ——— اور ہوتی بھی کیوں ——— ؟ شاہد نے برنائے محبت کبھی شاہدہ سے اپنی شادی کا ذکر نہ کیا تھا ——— شاہدہ ایک عجیب کشمکش میں تھی ——— اگر وہ شاہد کو شادی کرنے پر مجبور کرتی ہے تو اس کی اپنی محبت کا خون ہوتا ہے۔ اور اگر شاہد کو اسی طرح رہنے دیتی ہے ——— تو دنیا اس کو خود غرض کہہ کر ... گی۔ اور شاہد کا خاندان شاہدہ کو اخلاقی مجرم سمجھے گا ———

"محبت" اگر انسان کی بلند ہے تو بلند تر ہو جاتی ہے۔ ...

ہے تو صرف محبت۔ شاہدہ چونکہ پہلے نفرت اور پاکیزہ جذبات محبت کی قائل تھی۔ اس لئے اس نے یہ کہکر اپنی کشمکش کو ختم کر دیا ——

محبت کبھی دو دلوں کو ملنے نہیں دیتی —— محبت "ناکامی دوام" کا نام ہے۔ محبت "دریا ہے اور ظاہر ہے کہ دریا کے دونوں کنارے کبھی آپس میں نہیں ملتے —— جب یہ حقائق ہیں تو پھر میں کیوں اپنی محبت کی خاطر دوسروں کے جذبات و توقعات کو مجروح کروں —— وغیرہ وغیرہ —— نہیں شاہد کو ضرور شادی کرنی ہوگی —— عالم خیال میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد شاہدہ نے مسکراتے ہوئے شاہد کے اعزا کو اطمینان دلایا اور وعدہ کر لیا —— ! غریب شاہد اب تک ان تمام نتیجہ خیز کوششوں سے بے خبر تھا —— لیکن جس وقت وہ شاہدہ کی خدمت میں باریاب ہوا ——

شاہد! تمہیں کسی کی خاطر نہیں تو میری ہی خاطر سہی! شادی کر لینا چاہیئے۔ شاہدہ نے تقدیم کرتے ہوئے کہا۔ میری دنیا تاریک ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری دنیا بھی تاریک ہو —— میں تمہارے مستقبل کو تابناک درخشاں دیکھنا چاہتی ہوں —— شاہد نے پہلے حیرت اور پھر درد کے ساتھ شاہدہ کے حکم کو سنا —— اور پھر گلوگیر لہجہ میں کہا —— بہت بہتر —— اگر آپ مجھے بے موت ہی مار ڈالنا چاہتی ہیں تو مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہیں!

تم موت سمجھو! مگر میں تمہاری شادی کو تمہاری زندگی کو سمجھتی ہوں۔ شاہدہ نے جواب دیا

"شادی! خدا کیلئے اب تم بھی اس لفظ سے بار بار ذبح نہ کرو۔ تمہارا حکم بجالایا جائیگا" —— شاہد نے کہا۔ اس مختصر گفتگو کے بعد شاہد اٹھکر چلا گیا لیکن اس طرح کہ اس کا چہرہ گلنار تھا اور آنکھیں نمناک!

شاہدہ کی متوقع اور ادا اور شاہدہ کا اپنا ایثار —— شاہد کے اعزا کیلئے موجب مسرت ہوا اور جلد جلد تقریب شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں —— یوم شادی کے دن شاہدہ نے ایک بیش قیمت ہار شاہد کی دولہن کو بھیجا —— البتہ وہ خود شریک شادی نہ ہوئی۔ اور ہوتی بھی تو کیونکر ؎

محبت اپنے سوا کچھ دیکھنا نہیں چاہتی

شاہد و شاہدہ اب ایک الگ الگ دنیا میں تھے لیکن اس بعد مکانی کے باوجود انکی روحیں ایک دوسرے کے قریب تر تھیں —— گویا شاہد ایک مادی شادی کرنے کے بعد محبت کی روحانی تقریب مسرت کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اور شاہدہ دفور مسرت سے یہ شعر پڑھ رہی تھی ؎

یہ لالہ و گل یہ ماہ و انجم یہ موج و دریا یہ ریگ صحرا
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں، یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

صداءِ واپسیں

(از محترمہ شکیلہ اختر)

"لے آلو" ــــ "لے پھول، ساگ، توریں" ــــ "لے ترکاری ... [illegible] کریلا، بینگن" ــــ "لے آر وی" ــــ ہوا کی طوفانی سنسناہٹ پانی کے شور کے ساتھ تھرتھراتی ہوئی مسلسل آواز گلیوں سے آ رہی تھی تیز جھڑی کے ساتھ زور کی بارش ہو رہی تھی اور کپکپا دینے والی سردی سے جیسے بدن ساری ہڈیاں اکڑی جا رہی تھیں۔ سڑک سنسان تھی۔ دوکانوں پر ٹاٹ اور بانس ... [illegible] پڑی تھیں۔ سامنے ہر لحظہ گردش کرتی ہوئی دنیا کی طرح چکر لگاتا ہوا کولہو ... آج خالی پڑا تھا ... [illegible] کے ساتھ چٹائی کے سایہ میں دبکا ہوا ... [illegible] ... اپنے مالک کے ... [illegible] ... منہ کو پیٹ میں چھپائے بے خبر سو رہا تھا۔ ایسی خاموش فضا میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا بھی گردش کرتے کرتے تھک کر اپنے ... [illegible] ... بیدار تھا۔

[illegible] ... برسنے لگا تھا۔ میں نے باورچی کو پکار کر کہا۔ "خوب ... [illegible] ... کہاں اب ... [illegible] ... چٹنی تھی اور انڈے کا املیٹ بنا دوگے ... [illegible] ... پانی میں بازار جاؤ گے۔"

دروازے کے اندر آتے ہوئے ایک تیز آواز آئی۔ "ترکاری ... [illegible] ... کریلا، بینگن، ساگ، پیاز، نیبو" وہ ... [illegible]

[illegible]

"[illegible]"

اس نے ٹوکرے کے اوپر سے بانس کی ترازو ... [illegible]

باورچی سامنے برتن رکھتا ہوا بولا "بھلے بھاؤ ... [illegible]"

"بھاؤ کا آج نیا ہے۔ ... [illegible] ... توریں ... [illegible] ... آنے پھول۔ آٹھ آنے پیاز۔ آنے آنے نیبو ... اور کا ... [illegible]"

باورچی حیرت سے کہنے لگا کہ کیا وہ آج لوٹ مچانے کیلئے آئی ہے۔ میں ان داموں کو کبھی نہ لوں گا۔

بانس کی ترازو ٹوکرے میں رکھتی ہوئی بڑھیا بولی "اچھا تو ست لا۔ اپنی اپنی مرضی"۔

"تو تول نہ بڑھیا ٹھیک ٹھیک" باورچی غرضمندانہ طور پر بولا۔

ترازو کا پاسنگ برابر کرتی ہوئی بڑھیا کہہ رہی تھی کہ کوئی ... [illegible] ... ایسے میں ہاٹ۔ یہ اسی کا دل و جگر تھا جو ایسی دلدلاتی ہوئی سردی میں گھر سے باہر نکلی ہے۔

اس نے بڑے اہتمام سے ٹوکرے پر سے کپڑا سرکایا۔ ٹوکرا لال اور سبز رنگ کے ساگ سے بھرا ہوا تھا۔ اور ٹوکرے کے ارد گرد ... [illegible] ... کر کے ٹکڑے کئے گئے تھے جیسے ... [illegible] ... کر رہے ہوں۔

[illegible] ... آج صرف ساگ ہی ... [illegible] ... لے آئی ہے

[illegible]

بھلا کہ اسکی دی ہوئی ترکاری میں کوئی خرابی نہیں ہے اور نہ بدلنے کی ضرورت۔ اُس نے بعض توریوں کو بیچ سے توڑ کر دکھا بھی دیا کہ وہ خراب سودا کبھی نہیں دے سکتی۔ مگر باورچی پھر بھی اس ترکاری کو بدلنے پر مصر تھا۔ اُس نے ترکاریوں کی ٹوکری میں سے ساگ کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے دوسری پسند کرنا چاہا۔ بڑھیا زور سے چیخ اُٹھی "دیکھو دیکھو ہاتھ نہ لگاؤ۔ میری سب ترکاری مل مل جاتی ہے۔" مگر باورچی نے سارے ساگ کو ترکاری پر سے ہٹا دیا جیسے بڑھیا کے چہرے پر سے دبیز نقاب کو اُٹھا کر اسکی جھریوں کو نمایاں کر دیا۔ ٹوکرا گویا خالی پڑا تھا۔ صرف اس کے پیندے پر ہر قسم کی تھوڑی تھوڑی ترکاریاں جھترائی ہوئی تھیں مجھے یہ مذاق سین دیکھکر ہنسی آ گئی۔

پھول اور توریوں کو بڑھیا کے ٹوکرے میں پھینکتے ہوئے باورچی بکتا ہوا چلا گیا دُور سے اسکی آواز آ رہی تھی۔ وہ دوسرے نوکروں سے کہہ رہا تھا کہ بڑی ترکاری بیچنے چلی ہے۔ پاؤ بھر پھول آدھ پاؤ آلو لے کے بیٹھی ہے جیسے کنجڑن ہی تو بن گئی ہے جھوٹ موٹ میں اس نے اتنی دیر سے پھنسائے ہوئے تھی۔ دوسرے نوکروں کو حیرت تھی کہ مول تول کیسے کر رہی ہے جیسے دادا جی کے کھیت میں سے من بھر ترکاریاں توڑ کے لا رہی بھرتی ہے۔

شکست خوردہ اور ملتجیانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بڑھیا رو پڑی۔

"ہم غریب ہیں مالکن بہت غریب۔" اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی مٹیالی دھندلی پتلیاں بے تھاہ ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح آنسوؤں میں تیر رہی تھیں۔ اس کے لبوں کے گوشوں جھریوں کی لمبی لمبی لکیروں میں رال بھر گئی تھی۔ مسوڑھوں کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہوئے لمبے لمبے پیلے دانت بولنے [illegible] اُبھر اُبھر آتے تھے۔ وہ اپنی کہانی سناتی گئی وہی ایک سادہ سی کہانی۔ وہ تین جوان بیٹوں کی ماں تھی۔ کھیتوں میں کبھی ترکاریاں لہلہاتی تھیں۔ مگر اس کے سارے بیٹے مر گئے [illegible] تینوں بیٹوں کی قبریں ایک ساتھ ہی اسکے اپنے گھر میں ہیں۔ [illegible] تو پھر کھیت کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ اب اس کے دکھوں [illegible] نشانی جسم کی رو گئی ایک پوتی رہ گئی تھی۔ [illegible] کرتا اگر مرتے [illegible] بیچنے لگی ہے۔ قرض واپس کرکے [illegible] کے پیٹ کے منگی دوائے [illegible]

[illegible] ہو گئی۔ اسکی نگاہیں نہ جانے آسمان پر گھر کی [illegible] جھریوں والے رخسار جھلے ہوئے [illegible] اس کی جھریوں کے نشیب و فراز سے ہوتی ہوئی اس کے بھیگے ہوئے آنچل میں جذب ہو رہی تھی۔ اور کچھ ترکاریوں پر بھی ٹپک پڑی تھی۔

اُس نے بڑی لجاجت سے مجھ سے کہا کہ میں اس سے کچھ بھی لے لوں۔ میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ ترکاریوں پر بڑھیا کے آنسو ابھی تک چمک رہے تھے۔

باورچی خانے سے نوکروں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں "نام گنانے کو سو ٹو۔ پھول لو۔ آلو لو۔ بیگن لو۔ جھوٹی۔ آخر یہ بڑھیا کا سمجھے ہے کہ نام لیوے سے ٹوکرا بھر جائے گا۔"

ان کو کیا معلوم تھا کہ نام لینے سے ٹوکرا کبھی بھر بھی جاتا ہے۔ جن کے پاس کچھ نہ ہو اُن کے پاس بس نام ہی تو رہ جاتا ہے۔ اور یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر آج وہ ان ناموں کو بھی بھول جائیں تو پھر دنیا میں ان کا باقی کیا رہ جائیگا۔ کھوکھلے نام اور ہر آنے والے کل کا انتظار یہی تو ان کی زندگی کا سہارا ہے۔ دنیا بھر کی ترکاریوں کے نام کی صدائیں وہ اپنے کو فریب دیتی تھی یا گاہکوں کو۔ ایک ہی سانس میں اتنے ناموں کو گنتے ہوئے وہ ایک لطیف سا خواب دیکھنے لگتی جہاں ترکاریوں کی رنگ برنگی توس و قزح میں اس کے ارمانوں کی دنیا شاداب نظر آتی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی۔ وہ اپنے کو ایک کامیاب بیوپاری تو سمجھ لیتی تھی۔ کسی طرح وہ اپنا سودا بیچ لینا چاہتی تھی۔ تاجرانہ فریب۔ سب ہی تاجر ایسا کرتے ہیں۔ شاید فریب بڑا ہو کر فریب نہیں رہتا۔ اسی لئے بڑے جھوٹوں کی پکڑ نہیں ہوتی۔

بڑھیا مجھ سے پھر کہنے لگی "کچھ لے لو بیٹی۔"

میں نے اپنے ضمیر کی سرگوشیوں کو خاموش کر دینے کیلئے وہاں سے اُٹھکر جاتے ہوئے کہا۔ "کل ضرور لوں گی بڑھیا۔" مجھے اسکی سُرسُراتی ہوئی ناک اور بہتی ہوئی آنکھوں سے پھر گھن آنے لگی۔ جانے کہاں کہاں کتنے آنسو جذب ہو چکے ہونگے۔

[illegible] چپ چاپ ساگ کو سمیٹتے ہوئے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے ٹوکرے کو [illegible] سر پر رکھ کر [illegible] تیز ہوا [illegible] میں جب [illegible] کو بند کرنے [illegible] سے پال کے [illegible] آواز آ رہی تھی۔

"لے آلو۔ پھول۔ لے ساگ۔ [illegible] لے کریلا، بیگن۔ لے ترکاری — لے سبھی ترکاری ——"

ڈرامہ

گذشتہ سے پیوستہ

یہ دیس ہمارا ہے!

قسط چہارم

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

محمود :۔ سینے میں بہت درد ہے۔ روپا تم بھی لیٹ جاؤ۔ کب تک بیٹھی رہوگی۔

روپا :۔ اب ہم کام کیسے کرینگے محمود ــــــ یہاں کی حالت ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ ابھی تک غذائی بحران میں کمی نہیں ہوئی۔ دیکھو اس دوکان کے سامنے کتنے لوگ جمع ہیں اور کل ان کو چاول ملے گا۔

محمود :۔ (آنکھیں کھولتا ہے) اور بچا ہے رات بھر میں ختم ہوجائینگے اور جو بچیں گے وہ کیچڑ پانی میں تڑپتے ہونگے۔

روپا :۔ یاد نہیں پرسوں ہی کی تو بات ہے جب بارش ہوئی تھی تو ہم نے کتنی لاشیں کیچڑ میں سے اٹھائی تھیں۔

محمود :۔ تاہم دیگر جگہوں سے کافی غلہ آرہا ہے۔ اور امید ہے کہ بہت جلد ہم اس مصیبت پر قابو پالیں گے۔

روپا :۔ لوگ کم ہی اس طرف توجہ کرتے ہیں جو رئیس ہیں وہ اپنی دولت میں مست ہیں۔ ان کو کیا پرواہ چاہے دنیا بھوکی مر جائے۔

محمود :۔ آج ہر انسان کا فرض ہے خواہ وہ ہندو ہو خواہ مسلمان کہ جو کچھ بھی وہ بنگال کیلئے کر سکتا ہے کرے۔ جو شخص دو وقت کھاتا ہے وہ ایک وقت کھائے اور اپنے بھوکے بھائیوں کو موت کے چنگل سے بچائے۔

(محمود پھر کراہنے لگتا ہے)

روپا :۔ تمہارا بخار اور کچھ کم ہوجائے تو میں تم کو کامریڈ مکرجی کے گھر پہنچا دونگی۔ اور پھر میں کام پر چلی جاؤنگی۔

محمود :۔ مجھے بھی تو بہت کام کرنا ہے روپا

روپا :۔ نہیں تمہاری طبیعت بہت خراب ہے

(محمود کو کھانسی اٹھتی ہے)

محمود :۔ روپا! ــــــ میری چند دنوں کی زندگی ہے۔ اس وقت کہیں بیکار کروں۔ اپنے ملک ہی کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ مادر وطن کا تقاضہ تو ایسا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا آخری سانس تک اپنے ملک کی حفاظت پر صرف کر دے۔

(روپا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

محمود :۔ روپا پریشان نہ ہو وہ دیکھو سامنے کس طرح بھوکے تڑپ رہے ہیں ہم ان کیلئے کیا کچھ نہ کر ڈالیں۔ سامنے بھوک سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ وہ لوگ جو لوہے کے ٹکڑوں کو با آسانی اٹھا لیتے تھے۔ آج زمین پہ ہاتھ پیر رگڑ رہے ہیں۔ "روٹی۔ روٹی" ــــــ کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کتے اچھلتے کودتے ان کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ لیکن ان کے ہاتوں میں اتنی طاقت نہیں کہ ان کو ہٹا سکیں۔ روپا ان سب پر نظر ڈالتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سر کو گھٹنوں پر رکھ لیتی ہے۔

روپا :۔ آج رات میں مجھے چاول اکٹھا کرنا ہے۔ کل صبح یہاں ایک عوامی لنگر خانہ کھلنا چاہیئے۔

محمود :۔ ہاں ــــ اس طرح ہندو مسلمانوں سب ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ اور بھوکوں کی ایک بڑی تعداد موت سے بچ جائیگی ــــــ اچھا اب ہمیں چلنا چاہیئے۔

روپا :۔ لیکن تم کیسے جاؤگے ؟

محمود :۔ میں ابھی چل سکتا ہوں روپا ــــــ اور پھر صبح جب یہ لوگ کھانا کھائیں گے تو میں بالکل تندرست ہو جاؤنگا۔

(کھانستا ہے)

(محمود اور روپا کندھوں پر بوریاں ڈال کر چل دیتے ہیں)

محمود :۔ روپا کوئی گیت سناؤ۔

روپا :۔ اچھا

(روپا گارہی ہے اور دونوں چلے جارہے ہیں)

پانچواں ایکٹ ــــــ دوسرا سین

(محمود کی والدہ ریڈیو بجارہی ہیں)

ریڈیو کی آواز :۔ بنگال بھوکا مر رہا ہے۔ اس لئے ہندو مسلمانوں کو متحد ہوکر کام کرنا چاہیئے۔ خوشحال گھرانوں اور شہروں میں چندہ جمع کرنا چاہیئے۔ ملک کی حالت روز بروز نازک ہوتی چلی جا رہی ہے۔ محبانِ وطن کو چاہیئے کہ اپنے کھانے میں سے آدھا بچا کر بنگال کے بھوکوں کی مدد کریں۔

بیگم صاحبہ :۔ (خود سے) یہ تو وہی کہہ رہا ہے جو میرا محمود کہا کرتا تھا ——— "بنگال کے بھوکوں کی مدد کرو"۔ محمود بھی یہی کہتا تھا۔ وہ ان کے لئے جگہ جگہ سے اناج اکٹھا کرتا پھرتا تھا۔ اُس دن جب وہ آیا تھا تو تین دن سے سویا بھی نہیں تھا۔

(نوکر آتا ہے)

نوکر :۔ ڈپٹی صاحب کا ملازم آیا ہے۔ آج شام کو ڈپٹی صاحب کی بیگم صاحبہ تشریف لائینگی۔

بیگم صاحبہ :۔ نہیں ——— اس سے کہدو کہ بیگم صاحبہ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔

(نوکر چلا جاتا ہے)

بیگم صاحبہ :۔ یہ عورتیں آ آ کر مجھے پریشان کرتی ہیں ——— جانے آتے سے ان کی طبیعت بھی تو نہیں گھبراتی۔

(کُرسی سے اُٹھکر چارپائی پر آکر بیٹھ جاتی ہیں)

یہ بھی تو ہے کہ میرا دل سکھی نہیں محمود ——— میرا محمود کہیں چلا گیا۔ میں اکیلی بیٹھی سوچا کرتی ہوں۔ مجھے اسی میں سکون ملتا ہے۔ اور انھیں ——— انھیں کون سا غم ہے۔ جو میری طرح ملنے جُلنے سے جان چُرائیں۔

(نوکر پھر آتا ہے)

نوکر :۔ انھوں نے پوچھا ہے کہ بیگم صاحبہ کب تک آجائیں گی؟

بیگم صاحبہ :۔ کہہ دو معلوم نہیں۔

(نوکر چلا جاتا ہے)

(نواب صاحب آجاتے ہیں)

نواب صاحب :۔ کیا سوچ رہی ہو؟ ——— بیگم!

بیگم صاحبہ :۔ کیا سوچتی وہی ایک بیراگ ہے۔ دن رات اسی میں لگی رہتی ہوں۔

نواب صاحب :۔ باپ کا غصہ اس کو اتنا بُرا معلوم ہوا ——— اسی وقت چلا گیا اور پھر آج تک نہ آیا۔ دروازہ کو تکتے تکتے آنکھیں پتھرا گئیں۔

بیگم صاحبہ :۔ اولاد ماں باپ کی ممتا کو کیا جانے۔ ماں باپ غصہ کرتے ہیں تو کوئی بُرے دل سے تھوڑا ہی۔

نواب صاحب :۔ کاش اسکو معلوم ہوتا کہ اس کی صورت دیکھنے کیلئے اسکے ماں باپ پاگل ہو رہے ہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ معلوم نہیں اُس کو کھانے کو بھی ملتا ہے یا نہیں۔

نواب صاحب :۔ نہ جانے کس حال میں ہوگا ——— کہاں ہوگا ——— ہم روٹی کھاتے ہیں نہیں معلوم اس کو بھی ملتی ہے یا نہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ جہاں بھی وہ ہو خدا اس کی مدد کرے ——— وہ نیک کام کر رہا گیا ہے۔ ہزاروں جانیں اُس نے بچائی ہونگی۔ خدا اس کی جان کی حفاظت کرے۔

نواب صاحب :۔ مخلوق خدا کی بھلائی کے لئے اس نے اپنے ماں باپ سے بھی مُنہ موڑ لیا۔ اب تو بس ایک ہی آرزو ہے کہ محمود کی صورت دیکھ لیں۔ چاہے اگلے دن ہی آنکھیں میچ جائیں۔

بیگم صاحبہ :۔ تم نے کہیں پتہ بھی لگایا ——— کسی سے کہا تو ہوتا۔

نواب صاحب :۔ میں نے قریب کے گاؤں میں کہلا دیا ہے۔ اب ہماری قسمت ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ کسی طرح اس کی خیریت ہی معلوم ہو جاتی۔

نواب صاحب :۔ وہ آجائے۔ میں سب کچھ اس کے حوالے کر دوں ——— میری کتنے دن کی زندگی ہے جو اس دولت کو سمیٹ کر بیٹھوں ——— جو اس کا جی چاہے کرے۔

بیگم صاحبہ :۔ (سوچتے سوچتے سر اُٹھاکر) یہ دولت ——— یہ دولت بھی کتنی بُری چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہمارا محمود کیوں جاتا۔

(نوکر کھانا لیکر آجاتا ہے اور میز پر رکھدیتا ہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ اُٹھکر کھانے کی میز پر چلے جاتے ہیں)

نواب صاحب :۔ بیگم تم سچ کہتی ہو ——— آدمی کے پاس جتنی دولت ہوتی ہے اتنا ہی اس کا دل سخت ہوتا ہے۔ غریب کے پاس اگر ایک روٹی ہوتی ہے تو وہ آدھی دوسرے کو دیتا ہے۔ مگر رئیسوں سے ایسا نہیں ہوتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا ملک مُصیبت میں مبتلا ہے لیکن ہم نے اپنی دولت میں سے ایک پیسہ بھی ان کو دینا پسند نہ کیا۔ جو مہینوں سے بھوکے مر رہے ہیں یہاں تک کہ محمود نے اپنی جان لگا کر ان بھوکوں کی مدد کی۔ لیکن ہمیں وہ بھی گوارا نہ ہوا۔

بیگم صاحبہ :۔ کل کچھ لوگ چندہ مانگنے آئے تھے ——— شاید محمود ہی کی پارٹی کے ہونگے؟

نواب صاحب :۔ ہاں ——— وہ بھوکوں کی مدد کیلئے کچھ روپیہ لینے آئے تھے۔

بیگم صاحبہ :۔ تو تم نے کچھ دیدیا تھا؟

نواب صا[illegible] :۔ [illegible]

بیگم صاحبہ :۔ اچھا کیا۔ بچے کھائیں گے تو دعا دیں گے۔

نواب صاحب :۔ بیگم! تم کھا نہیں رہی ——— اور کچھ منگوا لو۔

بیگم صاحبہ :۔ نہیں ——— آج مجھے کھانا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ نہ جانے میرا بچہ کیسا ہوگا؟

نواب صاحب :۔ تم نے سنا ہے کل شہناز کی شادی ہے؟

بیگم صاحبہ :۔ ہوا کرے ——— اپنا دل ہی چین سے نہیں ——— آج ہمارا محمود ہوتا ———

(رونے لگتی ہے)

(دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ نوالہ پلیٹ میں ویسے ہی چھوڑ دیتے ہیں)

کسی کے چلانے کی آواز آ رہی ہے)

بیگم صاحبہ :۔ یہ کون گھنٹوں سے چیخ رہا ہے؟

نواب صاحب :۔ ہوٹل والے کی آواز ہے ——— کسی پر بگڑ رہا ہے۔

"روٹی" ——— "روٹی" ——— ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی ہے)

بیگم صاحبہ :۔ کوئی روٹی مانگ رہا ہے۔

(دروازہ کا پردہ ہٹا کر دیکھتی ہیں)

ہوٹل کے سامنے بھوک کے مارے بچے، جوان، بوڑھے سب ہی آس لگائے کھڑے ہیں۔ شاید کچھ مل جائے بچا کھچا ——— سب کے چہرے بھوک سے خشک ہیں۔

ہوٹل والا :۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ یہاں سے ہٹ جاؤ۔

ایک بچہ :۔ روٹی!

دوسرا :۔ ایک ٹکڑا!

ہوٹل والا :۔ ہٹو ——— ہٹو ——— (پھر خود سے) اِن لوگوں نے پریشان کر دیا ہے۔ نہ جانے کہاں سے وحشی آ گئے ہیں۔ کوڑا کرکٹ سب ہی کھا جاتے ہیں۔

ہوٹل کے اندر لوگ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں۔ ہوٹل والا برتن صاف کر کے جھوٹن باہر پھینکتا ہے۔ سب لپٹ پڑتے ہیں۔ اور کتوں کی طرح ایک دوسرے سے چھین چھین کر کھانے لگتے ہیں۔ کچھ فاصلہ پر ایسے لوگ پڑے ہیں جن میں یہاں تک آنے کی طاقت بھی نہیں ہے۔ کچھ ان میں سے آنکھیں بند کئے ہیں اور کچھ دیکھ رہے ہیں لیکن اُٹھ نہیں سکتے۔

نواب صاحب :۔ بیگم جتنا کھانا بچا ہو سب ان لوگوں کو بھجوا دو۔

[illegible]

اتنے میں کیا ان کا پیٹ بھرے گا۔

(نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کمرے سے نکل جاتے ہیں)

پانچواں ایکٹ ——— تیسرا سین

کلیم کا مکان۔ شہناز کی شادی ہو رہی ہے۔ مکان خوب سجا ہوا ہے۔ کلیم اور سلطانہ باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ شہناز کمرہ میں بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔ سلیم آتا ہے۔ بہن کو روتا دیکھ کر ———

سلیم :۔ شہناز آپا ——— تم کیوں رو رہی ہو؟

(شہناز جواب نہیں دیتی۔ سلیم پھر جھنجھوڑتا ہے)

سلیم :۔ بولو ——— آپا ——— بولو کیوں رو رہی ہو؟ محمود بھیا کو نہ بلاؤ گی؟

شہناز :۔ (چونک کر) ہاں ——— وہ کہاں ہیں؟

سلیم :۔ وہ مجھے روز ملتے ہیں۔

شہناز :۔ کچھ پوچھتے تھے؟

سلیم :۔ سب کو سلام کہا تھا اور تم کو بھی پوچھا تھا۔

شہناز :۔ تو تم نے کیا کہہ دیا؟

سلیم :۔ میں نے ان کو بتا دیا کہ شہناز آپا کی شادی ہو رہی ہے۔

شہناز :۔ (گھبرا کر) تم نے کہہ دیا (پریشان ہو جاتی ہے) تو پھر وہ کیا بولے؟

سلیم :۔ وہ خاموش ہو گئے ——— اور آپا تم کو معلوم ہے وہ بیمار بھی تو ہیں۔

شہناز :۔ (پریشان ہو کر) کیا بیمار ہیں؟

سلیم :۔ کھانسی بہت ہے۔

شہناز :۔ (خود سے) کھانسی ہے ——— دق ——— سِل ——— نہیں نہیں ——— میں پاگل ہوں۔ جو بد دعا کر رہی ہوں۔ زکام کھانسی ہو رہا ہوگا۔

(برآمدے میں سلطانہ اور کلیم باتیں کر رہے ہیں)

کلیم :۔ محمود کو تو دق ہو گئی ہے۔ منہ سے خون آتا ہے۔

سلطانہ :۔ دق ہو گئی! تم کو کیسے معلوم؟

کلیم :۔ وہ مجھے ہسپتال میں ملا تھا۔ ایک ہندو عورت اُس کے ساتھ تھی۔

(شہناز غور سے سننے لگتی ہے)

شہناز :۔ منہ سے خون آتا ہے ـــ وق ـــ اب کیا ہوگا ؟

(دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے)

سلطانہ :۔ کچھ حال ہو جائے۔ لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیگا۔

کلیم :۔ بڑا ہی آوارہ لڑکا نکلا۔ ہم تو اس کو بہت ہی نیک سمجھتے تھے۔

سلطانہ :۔ ہمیشہ سے چُپ شیطان تھا۔

کلیم :۔ نہیں تھا بھی سمجھدار۔ لیکن اب تو خدا جانے اس کو کیا ہو گیا۔ بالکل وحشی ہو گیا ہے۔

سلطانہ :۔ یہ بھائی کی تقدیر ہے کہ ایک لڑکا ہوا وہ بھی ان گنوں کا۔

کلیم :۔ ان کی تو قسمت ہی کھوٹی ہے۔ مجھے تو اس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔

سلطانہ :۔ بھابی نے تو خوب جال بچھائے کہ کسی طرح شہناز سے شادی ہو جائے۔

کلیم :۔ ارے واہ ہماری لڑکی کوئی فالتو تھی۔ وہ تو رات دن گاؤں گاؤں سڑکوں سڑکوں مارا مارا پھرتا ہے۔ بھنگی اور چماروں کے مُردے اُٹھا اُٹھا کر ہسپتال لے جاتا ہے۔

سلطانہ :۔ ارے کوئی اس سے پوچھے کہ لوگ کبھی مرتے تھے کیا ان کی لاشیں ہمیشہ اسی نے اُٹھائیں تھیں۔ اس کو تو نہ تن کا ہوش ہے، نہ بدن کا۔ خدائی فوجدار بنا پھرتا ہے۔ اُس دن آیا تھا میں نے تو بیٹھنے کو کہا نہیں ـــــ وحشی جیسا۔

کلیم :۔ ان لوگوں نے گاؤں میں کتنی آفت مچا رکھی ہے۔ وہاں سے اناج کا ایک ایک دانہ لے آتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بدمعاش کمیونسٹوں کا کیا علاج کیا جائے۔ اور محمود کو تو سب گاؤں والے جانتے ہیں۔ جب جاتا ہے کسان سب دیدیتے ہیں۔ اور جب ہم وصول کرنے جاتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ہم نے لوگوں کی مدد کے لئے سب دیدیا ہے۔ ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔"

سلطانہ :۔ اپنے بھوکے ہوئے۔ ہم کیا کریں۔ اگر ایسی ہی ہمدردی ہے تو اپنے میں سے کیوں نہیں دیتے جو ہمارا دیدیتے ہیں۔ (ذرا خاموشی)

میں تو اب شہناز کے سامنے محمود کا نام بھی لینا اچھا نہیں سمجھتی۔

کلیم :۔ شہناز تو شاید خود بھی اس کو پسند نہیں کرتی۔

سلطانہ :۔ ارے کوئی پاگل ہی اس کو پسند کریگا۔ جس کا دماغ صحیح ہوگا وہ تو ایسے وحشی کا نام لینا پسند نہ کریگا۔

کلیم :۔ قمر لڑکا بڑا فرمانبردار ہے۔ اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہو گیا ہے۔ ہماری شہناز اور اس کا مزاج بالکل ایک ہی جیسا ہے۔

سلطانہ :۔ اللہ رکھے شہناز اور قمر کی جوڑی خوب ملی ہے۔ صورت شکل میں بھی دیکھنے کے لائق۔

کلیم :۔ اور دیکھو رہتا کیسی شان سے ہے۔

سلطانہ :۔ تو اللہ رکھے وہ انسان ہے۔ دیوانگی تو خدا نے محمود ہی کو دی ہے۔ جسے تن بدن کا کچھ بھی ہوش نہیں۔

کلیم :۔ خیر کچھ بھی ہو ماشاء اللہ ہماری شہناز کی قسمت بڑی اچھی ہے وہاں بھی جاکر عیش ہی کریگی۔

سلطانہ :۔ آمین! اللہ مبارک کرے ـــــ ہے تو بڑی بھاگوان

کلیم :۔ اچھا ـــــ اب ان تمام باتوں کو تو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔

سلطانہ :۔ ضرورت کس چیز کی ہوتی۔ میں نے تو مہینوں پہلے سب تیاری کر لی تھی۔

کلیم :۔ چاول تو کم نہیں پڑے گا؟

سلطانہ :۔ پُرانا چاول تو ہمارے یہاں اتنا ہے کہ چار شادیاں ہو جائیں۔

کلیم :۔ یہ شادی بھی ہم ایسی ہی کرینگے کہ برسوں لوگوں کو یاد رہے۔

سلطانہ :۔ میں تو آج رات کو رنڈیاں نچواؤں گی۔ مولوی چاہے کتنا ہی اعتراض کریں۔ میرے ایک ہی تو لڑکی ہے۔ پھر لڑکوں کے کیسے ہی ہوتے رہیں جانے جیوں جانے مروں۔ اپنی حسرت نکالوں گی۔

کلیم :۔ بیگم گھبراتی کیوں ہو۔ یہ روپیہ، یہ دولت کس دن کے واسطے ہے لوگ کرنے سے جو گھبراتے ہیں اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ ہوتا نہیں۔

سلطانہ :۔ پڑوسن کو نہیں دیکھا۔ بیٹی کے بیاہ میں خاک بھی نہ کیا۔ اور ابھی پرسوں کی بات ہے کہ جانے کاہے کے چندہ میں سو روپے اور نہ جانے کتنا اناج بھر دیا۔

کلیم :۔ لعنت ایسے لوگوں پر جو برادری کے سامنے منہ چھپائیں۔ شادی بیاہ کوئی روز روز تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس نہ ہو تو اور بات ہے۔

سلطانہ :۔ ہو یا نہ ہو برادری کے لئے تو سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔

(اندر سے ہچکیوں کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ سلطانہ چونک کر)

سلطانہ :۔ ائیں ـــــ یہ رو کون رہا ہے؟

(اندر جاتی ہیں)

سلطانہ [illegible] :- — یہ روکیوں رہی ہو؟

(شہناز آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ماں کو دیکھتی ہے)

ماں :- (بگڑ کر) میری کچھ میں نہیں آتا کہ تم ہر وقت روتی کیوں رہتی ہو۔ اٹھو، منہ دھو کر کپڑے تبدیل کرو۔ مہمان آرہے ہیں۔

(قریب آکر ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہے اور ایک سرخ جوڑا اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ میں دیدیتی ہے۔ شہناز کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ اور وہ روتے روتے بیہوش ہو جاتی ہے)

ماں :- (گھبرا کر) سلیم! — سلیم!! — جلدی اپنے ابا کو بلاؤ۔

(پھر شہناز کی طرف مخاطب ہوتی ہے) شہناز — شہناز — ذرا یہ تم کو کیا ہو گیا؟ (پھر خود سے) کل صبح رخصتی ہے۔ ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا؟

شہناز :- (آہستہ آہستہ) محمود! — محمود!! —

(شہناز کے والد مع ڈاکٹر کے اندر آجاتے ہیں)

کلیم :- شہناز بیٹی — بیٹی شہناز!! —

شہناز :- (آہستگی سے) محمود — محمود —

ڈاکٹر :- یہ کس کو پکار رہی ہیں؟

کلیم :- محمود اس کا چچازاد بھائی تھا۔ وہ کہیں چلا گیا ہے۔ یہ ہر وقت اسی کو یاد کرتی رہتی ہے۔

(ڈاکٹر اس کے سر پر کوئی دوا رکھواتا ہے اور کوئی چیز ناک کے قریب کر دیتا ہے)

ڈاکٹر :- بیٹی! آنکھیں کھولو۔ ہم محمود کو ابھی بلائے دیتے ہیں۔

(شہناز آنکھیں کھول دیتی ہے لیکن خاموش ہے)

(نائن آتی ہے)

نائن :- بیگم صاحبہ! پالکی آگئی۔ رخصتی کب ہوگی؟

بیگم صاحبہ :- کہہ دو کل صبح رخصتی ہوگی۔

نائن :- اچھا — (چلی جاتی ہے)

چھٹا ایکٹ — پہلا سین

گاؤں کا سین

گاؤں کے لوگوں کا اجتماع۔ بڑے، بچے، جوان، لڑکیاں سب ہی جمع ہیں۔ اور ان سب کے [illegible] رہا دونوں ہاتھوں سے ان کو [illegible] لرز رہا ہے۔ جب اس کو کھانسی اٹھتی ہے تو [illegible]

محمود :- "ماؤں، بہنوں، بھائیو!!! [illegible] بھوک کے شکار ہو رہے ہیں۔ تم اگر وہ وقت [illegible] وقت کا اپنے ان بھائیوں کیلئے بچا دو جو بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔ ماؤں کے جسم میں جان نہیں۔ بچے بلبلاتے [illegible] کا خون پی رہے ہیں۔ وہ خون تھوک رہی ہیں۔ بچوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔"

(محمود کو کھانسی اٹھتی ہے۔ سب لوگ پکڑ لیتے ہیں۔ پھر سنبھل کر بولنے لگتا ہے)

"ماں کی ممتا کون نہیں جانتا۔ لیکن بھوک ممتا پر غالب آتی ہے۔ اور مائیں اپنے بچوں کو بے یار و مددگار سڑکوں پر چھوڑ جاتی ہیں۔ [illegible] ایک نوالہ روٹی دیکر بھوکی عورتوں کی عزت چھین لیتے ہیں۔"

محمود کو کھانسی اٹھتی ہے — سب لوگ پکڑ لیتے ہیں۔ کھانستے کھانستے بیہوش ہو کر گرنے لگتا ہے۔ رضو پا جھٹ تھام لیتی ہے۔ سب لوگ محمود کو اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیتے ہیں۔ مجمع میں ایک شور ہو جاتا ہے۔ عورتوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ کوئی اپنے کان کی بالی نکال کر دے رہی ہے۔ کوئی انگلیوں میں سے چھلے، کوئی چوڑیاں، بچے اور مرد گھروں میں سے اناج بھر بھر کر لا رہے ہیں۔ کوئی روپیہ دے رہا ہے، کوئی پیسہ، غرض ہر ایک جو کچھ دے سکتا ہے وہ دے رہا ہے۔ ایک عورت چاول کوٹ رہی ہے۔

ایک کسان عورت :- ارے تو ابھی تک چاول ہی کوٹ رہی ہے۔ [illegible] ان سے کچھ دے۔

عورت :- [illegible] اس مہینے میں میری لڑکی کا گونا ہونے والا ہے)

پہلی عورت :- [illegible]

[illegible]

عورت :- (سوچنے لگتی ہے) [illegible] کروں — [illegible] کروں گی۔ بہن چاہے برادری کچھ بھی کہے [illegible] لا دے۔

تو کبھی تکر بیچ جلتا ہے۔ اور اناج پھر برگرانے لگتی ہے۔
اناج کا ایک بہت بڑا ڈھیر ہو گیا ہے۔ جس پر سب لا لا کر ڈال رہے ہیں۔

روپا :۔ گاؤں کے لوگ کتنی محنت سے کماتے ہیں۔ لیکن پھر بھی عوام کے لئے سب کچھ دے دیتے ہیں۔ اور سرمایہ دار محنت بھی نہیں کرتا۔ پھر بھی اپنی دولت میں سے ایک نوالہ دوسرے کو نہیں دے سکتا۔

(بچے سب کام کر رہے ہیں اور گا رہے ہیں)
"ہندی ہم چالیس کروڑ"

چھٹا ایکٹ ——— دوسرا سین

(لنگر خانہ)

(محمود بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ روپا قریب بیٹھی ہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ چارپائی کے قریب کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ سامنے عوام کو کھانا تقسیم ہو رہا ہے۔ ہندو مسلمان سب ہی کھا رہے ہیں۔)

محمود :۔ روپا! سب لوگ کیسے خوش ہو ہو کر کھا رہے ہیں۔

روپا :۔ ہاں ——— اور وہ دیکھو بچے کیسے اچھل کود رہے ہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ روپا! ———

روپا :۔ جی (مڑ کر دیکھتی ہے)

بیگم صاحبہ :۔ بیٹی جاؤ تم جلدی جلدی سب کو کھانا بٹوا دو۔

نواب صاحب :۔ ہاں بیٹی! تم چلی جاؤ۔ کوئی بھوکا نہ رہ جائے۔ اگر کچھ کمی ہو تو آ کے بتاؤ۔ میں اور کھانے کا انتظام کرا دوں۔

روپا :۔ اچھا ———

(روپا چلی جاتی ہے)

محمود :۔ اماں! دیکھو اس وقت میری طبیعت بالکل اچھی ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ [illegible] اب تم کو بخار بالکل نہیں۔ دو چار روز [illegible] طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

نواب صاحب :۔ [illegible] تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔

بیگم صاحبہ :۔ [illegible] تم ہی سے آنکھوں میں روشنی ہے۔

(روپا جلدی جلدی چاول بھر بھر کر تھالی کو دے رہی ہے۔ بچے خوشی سے اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ ہنس رہی ہے)

محمود :۔ اماں! روپا کیسی خوش ہو رہی ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ ہاں ——— بڑی پیاری لڑکی ہے محمود۔ میں نے اپنے خاندان بھر میں ایسی لڑکی نہیں دیکھی۔

محمود :۔ اماں بڑی محنتی لڑکی ہے۔ میں تو بیمار تھا اس نے بیحد کام کیا۔ اور میری خبر گیری بھی برابر کرتی رہی۔

(نواب صاحب اور بیگم صاحبہ روپا کی طرف دیکھ رہے ہیں)

بیگم صاحبہ :۔ محمود! ایک بات کہوں اگر مان جاؤ۔

محمود :۔ ہاں ——— ہاں ——— کہئے۔

بیگم صاحبہ :۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی روپا سے کر لیں۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔

(محمود ہنس کر خاموش ہو جاتا ہے)

بیگم صاحبہ :۔ یہ ہماری آخری آرزو ہے۔ بیٹے پھر کیا ہم قبر میں سے اٹھ کر خوشیاں دیکھیں گے۔

(نواب صاحب اٹھ کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ اور جہاں عوام کھانا کھا رہے ہیں جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

بیگم صاحبہ :۔ محمود! ——— اگر تم اس رشتہ کو پسند کرو تو میں شادی کا انتظام کروں۔

محمود :۔ لیکن ———

بیگم صاحبہ :۔ لیکن کیا؟

محمود :۔ میری تندرستی بہت خراب ہو گئی ہے ——— میں نہیں چاہتا کہ روپا ———

بیگم صاحبہ :۔ (بات کاٹ کر) کیسی باتیں کر رہے ہو محمود ——— بیماری ہوا ہی کرتی ہے۔ اچھے ہو جاؤ گے۔

(روپا آتی ہے)

بیگم صاحبہ :۔ (روپا سے) روپا بیٹی یہ سب انتظام تمہارے سپرد ہے۔ ہم تو بوڑھے ہو گئے ہیں ہم سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔

روپا :۔ (ہنس کر) جلدی ہو [illegible] آپ کو کام کرنے کی کیا ضرورت [illegible] ہم ہی [illegible] کر سکتی ہیں۔

(نواب صاحب آتے ہیں)

نواب صاحب :۔ روپا بیٹی نے بڑا اچھا انتظام کیا ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ شاباش ——— اور دیکھو بیٹی صرف ایک دو جگہ ہی کام نہیں چلے گا۔ اور مختلف جگہوں میں بھی جتنی جلد ہو سکے

کھر جانے کھلوا دو۔

روپا :۔ اچھا ——— میں ابھی جا کر انتظام کئے دیتی ہوں۔

محمود :۔ روپا ——— آج تم کو اکیلے کام کرنا پڑ رہا ہے —— میں چلوں۔

روپا :۔ (جھک کر محمود کے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی ہے) نہیں۔ آپ خاموش لیٹے رہیئے۔

محمود :۔ تم تھک گئی ہو گی روپا۔

روپا :۔ مجھے تو آج کام کرنے میں بے حد لطف آ رہا ہے۔ بس آپ لیٹے دیکھتے رہیئے۔

(کھڑکی بند ہو جاتی ہے)

روپا :۔ بس یہی آپ کا کام ہے ——— اب میں جا رہی ہوں۔

(محمود ہنستا ہے۔ روپا بھی ہنس کر چل دیتی ہے)

ہر ایک کے چہرے پر آج ایک عجیب خوشی ہے۔ سامنے کھانا تقسیم ہو رہا ہے۔ بچے اچھل کود رہے ہیں۔ آج ہندو مسلمان سب ہی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں۔ محمود لیٹے لیٹے دیکھ رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ بھی بڑی محبت سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ (پردہ)

دیوؤں کے ملک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

گیارھویں قسط

کشتی بن کر آ گئی۔ ملکہ صاحبہ اس کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئیں کہ بے تحاشہ دوڑتی ہوئی بادشاہ کے پاس پہنچیں اور انہیں کشتی دکھائی۔ بادشاہ بھی بہت خوش ہوئے اور فوراً حکم دیا کہ لمبے پانی کے بھرے ہوئے ایک ٹب میں ڈال کر گلیور کو اس کے اندر بٹھا دو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کس طرح اس کو چلاتا ہے۔

ملکہ کو اس تجویز سے بہتر ایک اور تجویز سوجھی۔ اس نے اپنے مستری سے کہا کہ لکڑی کا ایک حوض سا تیار کیا جائے جس میں یہ کشتی بخوبی تیرتی پھرے۔ اور اس حوض کے پیندے پر کوئی ایسا مسالہ لگاؤ کہ رِستا نہیں۔ حکم کی دیر تھی۔ یہ حوض بھی تیار ہو گیا۔ ملکہ نے اس کو باہر کے کمرے میں دیوار کے سہارے رکھوا دیا۔ اس کے پیندے کے قریب ایک ٹونٹی لگی ہوئی تھی کہ جب پانی گدلا ہو جائے تو نکال سکیں۔ دو آدمی آدھے گھنٹے میں اس کو بھر سکتے تھے۔

اس چوبی تالاب کے اندر کشتی میں بیٹھ کر گلیور صاحب اکثر اپنا دل بہلایا کرتے اور انہیں اکثر چپو چلاتے دیکھ کر ملکہ اور محل کی دوسری بیگمات بھی خوش ہوتیں۔ ان سب کا بیان تھا کہ ایسا تماشہ اور اس طرح ایک ننھے سے آدمی کو ایسی پھرتی کے ساتھ چپو چلاتے کبھی نہیں دیکھا۔ کشتی میں بادبان بھی لگے ہوئے تھے اور اگرچہ کمرے کے اندر ہوا نہیں ہوتی تھی جو بادبانوں کو اڑاتی۔ لیکن جب ہوا کی ضرورت ہوتی تو بیگمیں اپنے پنکھوں سے ہوا دیتیں۔ اور کشتی کے بادبان اڑنے لگتے۔ اس صورت میں گلیور کا کام صرف کشتی کو موڑنا ہی رہ جاتا۔ یہ مصنوعی ہوا وہ جدھر چاہتا لے اڑائے لئے پھرتی۔

اگر بیگمات پنکھے ہلاتے ہلاتے تھک جاتیں تو نوکر جا کر پھونکیں مارتے۔ اُن کی پھونکیں بھی اس کشتی کے حق میں ہوا کے جھونکے تھے۔ اس طرح خاصا وقت نہایت دلچسپیوں کے ساتھ گذر جاتا۔ جب یہ تماشہ ختم ہوتا تو زمیندار کی لڑکی کشتی کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جا کر رکھ دیتی۔ رکھ کیا دیتی بلکہ خشک ہونے کے لئے کھونٹی پر لٹکا دیتی۔

نوکروں میں سے ایک کی یہ نوکری تھی کہ ہر تیسرے دن حوض کا باسی پانی نکال کے تازہ پانی بھر دیا کرے۔ لیکن وہ ایسا بے احتیاط نکلا کہ اس لکڑی کے تالاب میں کہیں سے ایک مینڈک آ داخل ہوا۔ اور اس وقت تک تہہ میں چھپا بیٹھا رہا کہ گلیور کی کشتی اس میں ڈالی گئی کشتی پانی میں ڈالتے ہی مینڈک صاحب پھدک کر جھٹ کشتی پر آ بیٹھے۔ مینڈک ویسے ہی گھناؤنا ہوتا ہے۔ پھر یہ تو دیوؤں کے ملک کا مینڈک تھا۔ گلیور ڈر گیا اور ایک چیخ ماری۔ وہ تو اتفاق سے زمیندار کی لڑکی پاس ہی تھی۔ اُس نے لپک کر مینڈک کو نکالنا چاہا۔ اتنے میں گلیور کے بھی اوسان آ گئے تھے۔ دل میں خیال کیا کہ مینڈک سے ڈرنا خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کچھ اچھی بات نہیں۔ اس لئے اس نے لڑکی سے کہا "تم اسے چھوڑ دو اور سیر دیکھو کہ میں اس کا کیا علاج کرتا ہوں۔ میری اور اس کی لڑائی کا تماشہ دیکھو"

مینڈک سے مقابلہ کرنے میں گلیور نے تلوار سے کام نہیں لیا۔ بلکہ چپو لے کر اس پر وار کئے اور اُسے ایسا گھبرایا کہ آخر وہ پھدک مار پانی میں کود گیا۔ یہ مرحلہ گلیور کے لئے سخت تو ضرور تھا مگر کسی خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔

اس ملک میں گلیور کے ساتھ جتنے واقعات گذرے ان میں سب سے بڑھ کر خطرناک بندر کا واقعہ تھا۔ جو شاہی باورچی خانے کے کسی آدمی نے پال رکھا تھا۔ گرمی کے دن تھے دوپہر کا وقت۔ زمیندار کی لڑکی اپنے کمرے میں بند کر کے کہیں اِدھر اُدھر چلی گئی تھی۔ یہ اپنی ابنیہ کے آگے چپ چاپ بیٹھا خیالات کی اُدھیڑ بن میں تھا کہ لڑکی کے کمرے کی کھڑکی میں سے کسی کے اندر کودنے کی سی آواز سنائی دی۔ اور یہ معلوم ہوا کہ کوئی اس طرف سے اُس طرف اور اُس طرف سے اس طرف زقندیں لگا رہا ہے۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک بندر بڑی آزادی کے ساتھ اوپر نیچے قلابازیاں مارتا۔ اچھلتا اور ناچتا کبھی ادھر جاتا ہے اور کبھی اُدھر۔ چکر پھیریاں لگا لگا کر ایک ایک کھڑکی اور ایک ایک دروازہ میں جھانکتا اور کلکاریاں مارتا ہے۔ گلیور بہت ڈرا اور ڈر کے مارے اپنے بکس یا کمرے کے آخری کونے میں جا بیٹھا۔

اول اول تو بندر نے گلیور کو دیکھا نہیں۔ لیکن جھانکتے جھانکتے اور دانت نکوستے نکوستے اور بھبکیاں دیتے دیتے کچھ دیر بعد اس کی نظر حضرت پر پڑ گئی۔ بندر کی ذات بڑی شریر ہوتی ہے۔ ننھا سا آدمی جو دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ دروازے میں ہاتھ اندر بڑھایا اور گلیور کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا یہ اپنا ہاتھ لپکارہا تھا اور وہ کمرے میں چاروں طرف اس کی گرفت سے بچنے کے لئے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ بالکل یہ کیفیت تھی کہ جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔

(باقی آئندہ)

غزل

(حضرت جگر مرادآبادی)

شعر و نغمہ رنگ و نکہت جام و صہبا ہو گیا
زندگی سے حسن نکلا حسن رسوا ہو گیا

اور بھی، آج اور بھی ہر زخم گہرا ہو گیا
بس کر، اے چشمِ پشیماں کام اپنا ہو گیا

اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے
جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اُس کا ہو گیا

میں نے جس بُت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں
دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا

اُٹھ سکا ہم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی
مرحبا وہ جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا

ہم نے سینے سے لگایا دل، نہ اپنا ہو سکا
دل کی جانب تم نے دیکھا دل تمہارا ہو گیا

وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گزرے بے نقاب
دیر تک ہر ایک گُل کا رنگ گہرا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگر
قیس دیوانہ تھا محوِ روئے لیلیٰ ہو گیا

"ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا"

(از جناب خلیق ابراہیمی)

نوٹ:۔ اس نظم کے شاعر کے ساتھ ستم ظریفی یہ ہے کہ بورژوا اور پیٹی بورژوا ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ اس قسم کے اشعار کہہ سکتا ہے۔

یہ عقبتِ نگاہ ہے کہ ناعقبت عصمتیں ہی جنوں کے رازِ شوق کی بلندیاں لیے ہوئے!

نتیجہ ظاہر ہے۔ ناکامی، نامرادی اور کبھی کبھی خونچکانی! ایک ایسے ہی خونچکاں دور میں ایک ہمدم و ہمراز نے جو سوائے بادۂ دیرینہ و معشوقۂ نوخیز کسی اور فلسفۂ زندگی کے قائل نہیں نویدِ عیش و نشاط دی تاکہ قلب و روح سے پھٹتا ہوا جوان، گرم و تومند خون آتشِ سیال کی موجیں اور نسوانی جسم کی سیمیں و گداز لہروں میں سرد و منجمد ہو جائے۔ یہ خیالاتِ پریشاں اسی "نویدِ جانستاں" سے متعلق ہیں۔

ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا
شرابِ ساتگیں آرزو کو دل میں لا نہیں سکتا
محبت اور صداقت کو ابھی جھٹلا نہیں سکتا
ابھی خود اپنے ہاتھوں روح کو جھلسا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

یہ مانا دل کی بربادی محبت کا قرینہ ہے
محبت زیست کے گرداب میں نازک سفینہ ہے
سفینے میں صداقت اور عفت کی حسینہ ہے
حسینہ کے دلِ مضطر کو یوں ٹھکرا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

اگرچہ دردِ ناکامی خجالت ساتھ لاتا ہے
خجالت ساتھ لاتا ہے ندامت ساتھ لاتا ہے
ندامت ہی نہیں بلکہ جراحت ساتھ لاتا ہے
مگر میں ایسے چرکوں سے ابھی گھبرا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

ابھی ہے دیوِ دولت کی کلائی موڑنا باقی
سماجی بندشوں کو بھی ابھی ہے توڑنا باقی
ابھی الفت کا رشتہ حسن سے ہے جوڑنا باقی
ابھی ٹوٹے ہوئے دل کی ہنسی اڑوا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

ابھی تو عشق کو تعمیرِ نو کا گُر سکھانا ہے
جفاؤں کو وفا کے آستاں پر سر جھکانا ہے
ابھی عفت کا قلبِ حُسن پر سکہ بٹھانا ہے
کہ میں ناموسِ اُلفت کو کبھی لٹوا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

ابھی تو عشق کی تنہائیوں کو آزمانا ہے
ابھی تو حُسن کی رعنائیوں کو آزمانا ہے
ابھی تو بزم کی برنائیوں کو آزمانا ہے
ابھی تو میں فریبِ عیش و عشرت کھا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

زمانہ ہو گیا اُس کے شکستہ عہد و پیماں کو
بہت دن ہو گئے دیکھے ہوئے اُس روئے خنداں کو
مگر اب تک کھٹک محسوس ہوتی ہے رگِ جاں کو
ابھی تو میں شعلہ انگیز نغمے گا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

لبھاتی ہے مجھے یہ مے بہاروں کی رنگینی
رجھاتی ہے مجھے ساقی کے رخساروں کی رنگینی
بلاتی ہے مجھے پُر شوق ارمانوں کی رنگینی
ابھی لیکن میں تابِ رنگِ محفل لا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

مرے جذبات کو انگڑائی پر انگڑائی آتی ہے
کوئی رقاصہ جیسے توڑا لیکے بیٹھ جاتی ہے
مری فطرت مری مجبوریوں کو منہ چڑاتی ہے
اگرچہ فطرتِ انساں کو بھی جھٹلا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سک

ضمیر اب تک مری راہوں میں آ کر مسکراتا ہے
غمِ حرماں رہِ جذب و شوق کی شمعیں جلاتا ہے
ابھی تو ایک آنسو چشمِ تر میں جھلملاتا ہے
یہ آنسو خاک کی آغوش میں گرا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں

فر یب ... مجاز

از جناب اسرار الحق صاحب مجازؔ بی۔ اے (علیگ)

خود کو بہلانا تھا آخر، خود کو بہلاتا رہا
میں بہ ایں سوزِ نہاں ہنستا رہا گاتا رہا
مجھکو احساسِ فریبِ رنگ و بُو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریبِ رنگ و بُو کھاتا رہا

عینِ ہنگامِ طرب روحِ طرب تھرّا گئی
دفعتاً دل کے اُفق پر اک گھٹا سی چھا گئی
ایک آغوشِ تمنّا کا تقاضا دیکھکر
ایک دل کی سرد مہری بھی مجھے یاد آگئی

میری دنیائے وفا میں کیا سے کیا ہونے لگا
اک دریچہ بند مجھ پر ایک وا ہونے لگا
اک نگاہِ ناز کی پھرنے لگیں آنکھیں مجازؔ
اک محبت کافر کا دل درد آشنا ہونے لگا

مُجرمِ سرتابیٔ حُسنِ جواں ہو جائیے
گلفشانی تا کُجا، شُعلہ فشاں ہو جائیے
کھائیے گا اِک نگاہِ لطف کا کب تک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جائیے

غزل

(جناب احسان بن دانش)

عکسِ جانانہ شہیدِ جلوۂ جانانہ ہم
آشنا کے آشنا بیگانہ کے بیگانہ ہم

جب کھڑے ہیں درمیانِ کعبہ و بت خانہ ہم
کس سے کہدیں کس طرح کہدیں ترا افسانہ ہم

نغمہ و ماتم بھی دھوکا شکر و شکوہ بھی فریب
کہہ رہے ہیں جانے کیا افسانہ در افسانہ ہم

جب یہ دیکھا اپنے مرکز پر ہی ہر شے برقرار
آ گئے آخر ترے قدموں میں بیتابانہ ہم

جیتے جی کی رنجشیں ہیں جیتے جی کا سوز و ساز
ہو گئیں جس وقت بند آنکھیں نہ پھر دُنیا نہ ہم

وہ محبت ہی نہیں جس میں نہ ہوں شکوے گلے
اِک کہانی تم سُنائے جاؤ اِک افسانہ ہم

آؤ بھی اب فیصلہ کر لیں مُقدم کون ہے
حاصلِ میخانہ تم ہو رونقِ میخانہ ہم

طُور ٹھنڈا ہو چکا ہے آ گیا موسیٰ کو ہوش
اب تجھے تکلیف دیں گے جلوۂ جانانہ ہم

رُک چلیں احسان نبضیں آ گیا ہنگامِ موت
اب یہیں سے چھیڑتے ہیں دوسرا افسانہ ہم

حشرِ خراماں

از

جناب سروشؔ عسکری طباطبائی

کون آرہا ہے حسن کا طوفاں لئے ہوئے
عارض میں جلوۂ مہِ تاباں لئے ہوئے

قامت میں موجزن کئے اک آبشارِ نور
شانوں پہ ایک ابرِ پریشاں لئے ہوئے

رنگین قہقہوں سے کھلاتا ہوا چمن
رفتار میں ترنمِ باراں لئے ہوئے

کاکل کے خم میں جذب کئے شامِ شبنگال
عارض کی تہ میں صبحِ بہاراں لئے ہوئے

آغوش وا، ترانہ بلب، میکدہ بدوش
رنگ و شراب و شعر کا طوفاں لئے ہوئے

الفاظ میں تراوشِ شبنم کی نغمگی
انفاس میں شمیمِ گلستاں لئے ہوئے

مشکیں سوادِ زلف و جبینِ صبح میں
تعبیرِ خوابہائے پریشاں لئے ہوئے

پیغمبرِ جمال و خداوندِ عاشقی
موزوں خطابِ یوسفِ دوراں لئے ہوئے

دامانِ نادریدۂ و بندِ قبائے چست
درسِ جنون و چاکِ گریباں لئے ہوئے

نظروں میں طائرانِ سبک سیر پرفشاں
آنکھوں میں آہوانِ گریزاں لئے ہوئے

گیسوئے تابدار و جبینِ عرق عرق
آذر کدے کی شانِ چراغاں لئے ہوئے

رخسارِ شعلہ بار و نگاہِ شرر فشاں
آتش کدے کا حسنِ فروزاں لئے ہوئے

سینے میں جوش زن کئے اک سیلِ آتشیں
آنکھوں میں ایک شعلۂ رقصاں لئے ہوئے

قشقے کی چھوٹ جسم کے نازک خطوط میں!
قوس و قزح کے رنگ فراواں لئے ہوئے

چہرے سے پھوٹتی ہوئی کرنیں شباب کی
سینے میں ایک مہرِ درخشاں لئے ہوئے

کیفیتیں جبیں میں طلوع و غروب کی
انوارِ صبح و شامِ بہاراں لئے ہوئے

آباد میکدے کئے چشمِ سیاہ میں
نظروں میں کیف موسمِ باراں لئے ہوئے

ہونٹوں میں سرخیاں بھرے لعلِ مذاب کی
رخسار میں شراب کا طوفاں لئے ہوئے

سانسوں کے جزر و مد میں چھپائے کسی کا بھید
جذبات میں تلاطمِ پنہاں لئے ہوئے

آئی ہوئی سی ہونٹوں پہ رہ رہ کے دل کی بات
نظروں میں ایک رازِ گریزاں لئے ہوئے

ہلچل میں ولولوں کی خجل عصمتِ خیال
جھونکوں میں ایک شمعِ فروزاں لئے ہوئے

ناگفتہ حرفِ شوق کا پرتو جبین پر!
آنکھوں میں نورِ وعدہ و پیماں لئے ہوئے

نظروں میں تولتا ہوا کل کائنات کو
نوکِ مژہ پہ عالمِ امکاں لئے ہوئے

آمد کسی کی اور بپا ہیں حشرِ دلبری
اٹھو سروشؔ نذرِ دل و جاں لئے ہوئے

رخصت

از
جناب جاں نثار اختر

جاتے ہی ترے لطفِ بہاراں نہ رہے گا
اے دوست گلستاں یہ گلستاں نہ رہے گا

ہر پھول کی آنکھوں میں چھلک آئیں گے آنسو
اک غنچۂ خوش و خرم و خنداں نہ رہے گا

اک گیت بھی بھولے سے نہ گائیں گی ہوائیں
اک ذرہ بھی رقصاں و غزلخواں نہ رہے گا

اس طرح سرِ عرش نہ جھلکیں گے ستارے
اس طرح دمکتا مہِ تاباں نہ رہے گا

ظلمات میں کھو جائے گا انوار کا عالم
جلووں سے جھلکتا یہ شبستاں نہ رہے گا

بربط سے نہ گونجے گا کوئی نغمۂ داؤد
طوفاں نہ رہے گا کوئی طغیاں نہ رہے گا

مینا سے نہ جھلکے گی زلیخا کی جوانی
ساغر میں فروغِ مہِ کنعاں نہ رہے گا

تو ہے تو ہر اک چیز کا ارماں ہے دل میں
پھر دل میں کسی چیز کا ارماں نہ رہے گا

سو جائے گی سینے میں تمنا کی ہر اک موج
ہر سانس میں یہ عالمِ طوفاں نہ رہے گا

اے دوست یقیں کر مری وحشت کا یقیں کر
یہ جیب یہ دامن یہ گریباں نہ رہے گا

جاتے ہوئے آنے کا کوئی عہد تو کر جا
تا عمر تو حاصل غمِ ہجراں نہ رہے گا

تا زیست تو ترسے گی نہ آغوشِ تمنا
تا حشر تو پہلو مرا ویراں نہ رہے گا

ممکن ہو تو جھوٹی ہی تسلی مجھے دے جا
مانا یہ ترا عہد یہ پیماں نہ رہے گا

غزل

جناب نخشب جارچوی

اِشارتاً بھی نہ قصے بیاں کئے ہوتے
سِئے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے

تمہاری یاد سہارا دیئے رہی ورنہ
جُدائی نے تو قدم ڈگمگا دِیئے ہوتے

ہمیں اور اُن سے وفا کی اُمید خوب کہا
ہم اِس خیال میں رہتے تو مر لئے ہوتے

تُمہارے عہد کا پھر بھی کوئی جواب نہ تھا
خضر کی عُمر بھی لے کر اگر جیئے ہوتے

نگاہِ شوق کا سارا بھرم گیا ہوتا
جو اُس نے بُھول کے پردے اُٹھا دِیئے ہوتے

ہمیں کچھ ہوش نہیں یہ تو سچ کہا لیکن
جھجک کے بات نہ کرتے اگر پیئے ہوتے

تُمہارے زُہد میں نخشب نہ فرق آجاتا
جو وہ بضد تھے تو دو گھونٹ پی لِئے ہوتے

قطب مینار

حضرت فیض جھنجھانوی

اے کہ افسوں تری صنعت ادہم پہ لواہ
ایک مدت سے ہے انگشتِ شہادت تیری

کب سے اک پیر کھڑا ہے تو سرِ بزمِ جہاں — دوشِ نازک پہ لئے بارِ روایاتِ کہن
پھر بھی یوں پڑتی ہے تجھ پر نگہِ حسن جواں — جس طرح سرو پہ سورج کی سنہری سی کرن

اے کہ اس جلوہ گہِ خنجرِ ابرو میں ابھی
ہے گریبانِ مہ نو میں ترا دستِ بلند

تو نے جب چاک کیا گوشۂ دامانِ فلک — نکلا انگڑائیاں لیتا ہوا ارمانِ زمین
جس طرح اشک لرزتا ہے سرِ نوکِ پلک — یوں لرزتے ہیں ترے سر پہ ستاروں کے نگیں

اے کہ ہے سینۂ گردوں میں ترا نیزۂ سرخ
تنگ ہے تنگ ترے سر پہ کلاہِ خورشید

ثبت ہے جادۂ ہستی پہ ترا نقشِ قدم — دل کے آئینۂ روشن میں ہے تصویر تری
خطرۂ گردشِ ایام نہ تخریب کا غم — خشتِ دل خونِ تمنا سے ہے تعمیر تری

اے کہ تعمیرِ جہاں، قصرِ زمانہ کے لئے
سنگِ بنیاد ہے ہر ذرۂ معصوم ترا

تیری آغوش میں ہر ذرۂ خورشید نشاں — زینۂ بامِ فلک، حسن کی معراج بھی ہے
تجھ سے وابستہ ہیں اس قوتِ اسلام کی شان — جو مہ و مہر پہ انگشت نما آج بھی ہے

اے کہ دیوانِ خودی کا تو ہے وہ شعرِ عجیب
تشنۂ مصرعِ ثانی نہیں جس کا مصرع

چاک ہو جائینگے خود جبرِ مسلسل کے غلاف — تیز ہے نیزۂ فولاد سے شاعر کا قلم
مطمئن ہو نہ فلک، اس کے تشدد کے خلاف — ہے بلند آج بھی دنیا میں بغاوت کا علم

اے کہ ہے دامنِ رنگیں پہ ترے لالہ فروش
سینۂ ہند سے پھوٹا ہوا فوارۂ خوں

دیکھ آئینۂ عالم کی وہ تصویرِ حسیں — جس کا ہر نقش تھا فردوس نشاں خلد نظیر
آج ہے دودِ چراغِ سحری، گردِ زمیں — حلقۂ دامِ بلا، پنجۂ حسرت میں اسیر

اے کہ معمورۂ وحشت میں ترا اقرارِ جنوں
ہے کفِ پائے زمیں کو خلش آموز ابھی

یہ خموشیِ جگر سوز یہ تاریکیِ شام — اشہبِ شوق بہت سست ہے مہمیز لگا
تشنۂ خونِ عدو ہے دلِ بے نیل و مرام — تیرے قبضے میں ہیں جو خنجرِ خوں ریز لگا

زندگی

از
محترمہ للتا کماری

ہارڈنگ لائبریری کی زنانہ ادبی سوسائٹی کا جلسہ پیر ۲۷ مارچ ۱۹۴۴ء کو منعقد ہوا تھا۔ جس کی پوری روئداد "ادیب" ماہ مئی میں شائع ہوگی۔ مگر اپنے قارئین کی دلچسپی کیلئے فی الحال صرف ایک پیروڈی جو "للتا کماری" صاحبہ کے زور قلم کا نتیجہ ہے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ پیروڈی درحقیقت معین احسن صاحب جذبی کی مشہور نظم "موت" کو نشانہ بنا کر لکھی گئی ہے۔ اس پیروڈی سے کماری صاحبہ کی شوخی طبع کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور سے پڑھنے سے پیروڈی میں کہیں کہیں خود ان کی نفسیاتی کشمکش کا بھی پتہ چلتا ہے۔ (فصیح الدین احمد)

اپنے دھوئے ہوئے بالوں کو سکھا لوں تو چلوں
اپنی ننھی کو ذرا دودھ پلا لوں تو چلوں
اپنے نوکر پہ ذرا رعب جما لوں تو چلوں
ابھی چلتی ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

وہ مرے بچے کی شلوار کہاں ہے لانا
میرے خاوند کی دستار کہاں ہے لانا
وہ مری جوتی وہ پیزار کہاں ہے لانا
ایک دو پان ذرا اور بنا لوں تو چلوں

میں تھکی ہاری تھی اتنے میں جو آیا دھوبی
اور کمبخت نے چپکے سے بڑھا دی لا دی
دیکھتی کیا ہوں کہ بھیگی ہے گلابی ساری
اپنی بھیگی ہوئی ساری کو سکھا لوں تو چلوں

اور دکھلائے گی کیا مجھکو یہ شب بیداری
یعنی اس وقت اندھیری ہے یہ دنیا ساری
رات جاگی ہوں تو اب تک ہیں پپوٹے بھاری
سرمہ آنکھوں میں ذرا اور لگا لوں تو چلوں

رو رہے ہیں جو مرے لال تو رونے دو انہیں
جان کھونے پہ ہیں آمادہ تو کھونے دو انہیں
ہیں جو بے حال تو بے حال ہی ہونے دو انہیں
نظم پڑھنی ہے مجھے نظم سنا لوں تو چلوں

راہ میں کار جو بگڑی تو مصیبت ہوگی
دیر ہو جائیگی اور مفت کی خفت ہوگی
گھر اگر دیر سے پلٹی تو قیامت ہوگی
اپنے دیور کو بھی میں ساتھ بٹھا لوں تو چلوں

داستانِ غم

(از محترمہ ک۔ ف بیگم)

گریں گی تابکے دِل پہ یہ میرے بجلیاں غم کی
اُٹھاؤں میں کہاں تک اے خدا یہ سختیاں غم کی

تبسم کے گلوں میں ہیں الم کے خار پیوستہ
چھپی ہیں قہقہوں کی لذّتوں میں تلخیاں غم کی

نہیں شعلے یکایک جو بھڑک کر خاک کر ڈالیں
سلگتی رہتی ہیں دل میں مرے چنگاریاں غم کی

زمانہ بے سبب کیوں درپئے آزار ہے میرے
مجھی پر ختم کر دیں اے فلک بربادیاں غم کی

اُٹھا بہرِ خدا ہرگز نہ زحمت چارہ سازی کی
نہیں جانے کی ہیں اے چارہ گر بیماریاں غم کی

نہیں ہے اُف بھی کرنے کی اجازت دِل پہ کچھ گذرے
بنی ہیں کاہشِ جاں آہ یہ مجبوریاں غم کی

ہوئی جاتی ہے عادت اب تو دِل کو غم اُٹھانے کی
بدلتی لذتوں میں جا رہی ہیں تلخیاں غم کی

کیفِ تغزّل

(نجمہ تصدّق)

یادِ عقبےٰ، فکرِ دُنیا کیجئے
عُمرِ دو روزہ میں کیا کیا کیجئے

آنکھ روشن، دِل کو بینا کیجئے
اپنا جلوہ آپ دیکھا کیجئے

جس میں خود ہو چارۂ دردِ حیات
دِل میں ایسا درد پیدا کیجئے

عشق میں غم ہو، حوادث ہوں کہ درد
جو بھی مل جائے گوارا کیجئے

جاگزیں ہو جس میں سوزِ زندگی
اُس دھڑکتے دِل کو سجدا کیجئے

حُسن ہو جس کے لئے خود بیقرار
عشق میں وہ رنگ پیدا کیجئے

جانتی ہوں شوق کی دُشواریاں
آہ اِس دِل کو مگر کیا کیجئے

عِشق بنکر دو جہاں پر چھائیے
دِل کے ہر ذرّے کو دُنیا کیجئے

نجمہ جب اپنے نہ اپنے بن سکے
اور پھر کِس کا بھروسا کیجئے

بغاوت

از
محترمہ نواب سیدہ اختر حیدرآبادی

اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو
ہیں محبت کو ہوں محبوب محبت مجھ کو

اب میں اِس عالمِ امکاں سے بہت ہوں بیزار
کرۂ ارض کے اِنساں سے بہت ہوں بیزار
رسمِ دیرینۂ یزداں سے بہت ہوں بیزار

خالقِ دیر و حرم سے ہے بغاوت مجھ کو
نہیں جُز اپنے کِسی کی بھی ضرورت مجھ کو

میرے پہلو میں ہے دل، دل میں تمنّا لاکھوں
میں وہ ذرّہ ہوں کہ گُم مجھ میں ہیں صحرا لاکھوں
قطرہ ہوں مجھ میں مگر غرق ہیں دریا لاکھوں

اپنی معلوم ہے سب اصل حقیقت مجھ کو
نہیں جُز اپنے کِسی کی بھی ضرورت مجھ کو

اب کوئی لُطفِ غمِ عِشق کی آہوں میں نہیں
حُسن کے ارض و سما کچھ بھی نگاہوں میں نہیں
منزلِ زیست مرے شوق کی راہوں میں نہیں

جب سے معلوم ہوئی قلب کی وسعت مجھ کو
نہیں جُز اپنے کِسی کی بھی ضرورت مجھ کو

درد وہ دل میں مرے ہے کہ مداوا بیجد!
شاعرہ ہوں مرے افکار کی دُنیا بیحد!
میرے احساس میں ہے قیدِ تمنّا بیحد!

خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت مجھ کو
نہیں جُز اپنے کِسی کی بھی ضرورت مجھ کو

کیا بتاؤں کہ ہر اک شعر مِرا بین ہے کیا؟
زندگی ہے غم و اندوہ و خلش! چین ہے کیا
تاج کیا؟ تخت ہے کیا؟ دولتِ کونین ہے کیا

صرف کافی ہے مِرا دردِ محبّت مجھ کو
نہیں جُز اپنے کِسی کی بھی ضرورت مجھ کو

دیر کیا؟ کعبہ ہے کیا؟ مجھکو لبھاتا نہیں کچھ
کیا کہوں؟ میری نگاہوں میں سماتا نہیں کچھ
اللہ اللہ! خدا بھی نظر آتا نہیں کچھ

اپنا جس دِن سے ہے عرفانِ حقیقت مجھ کو
نہیں جُز اپنے کِسی کی بھی ضرورت مجھ کو

زندگی اک "شئے معدوم" ہے مجھ کو اختر
شاعری جذبۂ معصوم ہے مجھ کو اختر
کون دے داد؟ کہ معلوم ہے مجھ کو اختر

اپنے بے ساختہ اشعار کی قیمت مجھ کو
نہیں جُز اپنے کِسی کی بھی ضرورت مجھ کو

......کی یاد میں

از
محترمہ اختر قریشی بی،اے۔بی،ٹی

جی رہی ہوں گو مرا دل زیست سے بیزار ہے — اک تسلسل مرگ ہے، اک مستقل آزار ہے
ایک غمگیں خواب میں کھوئی ہوئی رہتی ہوں میں — جاگتے ہنستے میں بھی سوئی ہوئی رہتی ہوں میں
مضمحل، افسردہ دل، غرقِ تخیل روز و شب — کس لئے ہوں غمزدہ، آشفتہ حال و جاں بلب
ہو گئی عالم کے ہنگاموں سے وحشت آہ کیوں ؟ — بن گئی دوزخ، مری دنیا کی جنت آہ کیوں؟
زندگی میں لوچ باقی اب نہ کیفِ آرزو — خشمگیں تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں چار سُو
ایک ویرانہ کنارِ آبِ جُو میرے لئے — زندگی کا گلستاں بے رنگ و بُو میرے لئے
گلستانِ عشق میں میرے بھی آئی تھی بہار — وہ لرزتے دل کی خوابیدہ تمناؤں کے تار
وہ جبیں، وہ سجدہ گاہِ آفتاب و ماہتاب — وہ جوانی، آہ وہ گہوارۂ شعر و شباب
صبح کی نورانیت، خورشید کی پہلی کرن — کھل رہی تھی صبحدم یا گلستاں میں نسترن
گا رہی تھی زندگی کے گیت دل کے ساز پر — جھومتے تھے دو جہاں ہر تان ہر آواز پر
چاندنی راتوں میں ہم دونوں کے نغماتِ جواں — ایک نکتے پر سمٹ آئی تھیں سب رنگینیاں
وائے قسمت گلستاں سے ہو گئی رخصت بہار — ہو گئے سارے شکستہ بربطِ الفت کے تار
عشق کے رنگیں چمن میں آ گئی اک دم خزاں — یک بیک تاریک نظروں میں ہوا سارا جہاں
چھپ گیا نظروں سے میری ماہتابِ زندگی — توڑ ڈالا دستِ گردوں نے ربابِ زندگی

اب تو میں ہوں اور اُن گذرے دنوں کی یاد ہے
نوحہ خوانِ زندگی میرا دلِ برباد ہے

"کون ہو تم"

(از محترمہ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری)

آبشاروں کے ترنم میں نہاں کون ہو تم
گوشِ احساس میں فردوس نشاں کون ہو تم

رُوپ میں انجمِ افلاک کے، ملبوس ضیا
چشمِ دل کیلئے حیرت کا سماں کون ہو تم

بادۂ عشق سے سرشارِ دلِ اہلِ نظر
دافعِ کشمکشِ سُود و زیاں کون ہو تم

راز در راز ہے گلشن کی حقیقت اب تک
گُل کے پردہ میں یہاں خندۂ لباں کون ہو تم

قلبِ عاشق سے ہے ہر اک گام پہ کیوں جلد کناں
باعثِ مژدۂ اندوہ و فغاں کون ہو تم

رُوح سرمستِ مئے نغمۂ لاہوت ہے آج
بر ربطِ قلب پہ مضراب زناں کون ہو تم

اب تو لو دینے لگا میرا ہر اک موئے بدن
قطرۂ اشک میں یوں شعلہ فشاں کون ہو تم

کس تخیل میں خدا جانے ہے قمری بیتاب
قامتِ سرو کے پیکر میں نہاں کون ہو تم

ساجدہ دیر و حرم کیا ہیں نظر کی تنگی
کہ یہاں کون ہو تم اور وہاں کون ہو تم

غزل

منانے کے لئے آ

(از محترمہ عشرت سلطان رضویہ)

یوں بھی تیرا احساں ہے، آنے کے لئے آ
اے دوست کسی روز نہ جانے کے لئے آ

ہر چند نہیں شوق کو یارائے تماشا
خود کو نہ سہی مجھ کو دکھانے کے لئے آ

یہ عمر، یہ برسات، یہ بھیگی ہوئی راتیں
ان راتوں کو افسانہ بنانے کے لئے آ

جیسے تجھے آتے ہیں نہ آنے کے بہانے
ایسے ہی بہانے سے نہ جانے کے لئے آ

پابندِ محبت ہے ہر اک لمحۂ رفتہ
یہ فلسفۂ عشق سنانے کے لئے آ

مرنا مجھے منظور، جلانا تجھے منظور
اس زیست کا مفہوم بتانے کے لئے آ

مانا کہ محبت کا چھپانا ہے محبت
چپکے سے کسی روز جتانے کے لئے آ

تدبیر بھی مجبور ہے، تقدیر بھی مجبور
ان کہنہ عقائد کو مٹانے کے لئے آ

عارض پہ شفق، دامنِ مژگاں پہ ستارے
یوں عشق کی توقیر بڑھانے کے لئے آ

عشرت کو یہ کیا علم، ستم ہے کہ کرم ہے
اک روز اسی طرح منانے کے لئے آ

سودا گیمیں — از فصیح الدین احمد - ایم ، اے

فلمی خبریں

(۱) منروا مووی ٹون

پبلک کے سامنے کئی معیاری فلم پیش کر چکی ہے اس فلم کمپنی کے تیار کئے ہوئے بعض فلم بلاشبہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دنوں مشہور و معروف ڈائرکٹر اور ایکٹر مسٹر سہراب مودی ایک اور تاریخی فلم پرتھوی ولبھہ کی تیاریوں میں مصروف رہے یہ فلم بڑے عظیم الشان انتظامات کے ساتھ تیار ہوا ہے اور ہر حیثیت سے ایک معیاری فلم ہے فلم کی کہانی ملک کے مشہور ماہر قانون سیاست داں اور ادیب مسٹر کے، ایم منشی کے ایک مشہور ناول سے لی گئی ہے۔ اس ناول کا نام ہی "پرتھوی ولبھہ" ہے۔ مکالمے ملک کے مشہور ادیب مسٹر سدرشن نے لکھے ہیں جو سماجی کہانیاں لکھنے والوں میں ایک بلند درجہ رکھتے ہیں۔ پھر سونے پر سہاگہ خود مسٹر سہراب مودی کی اداکاری اور ڈائرکشن ہے۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فلم ایک نہایت کامیاب اور مقبول فلم ثابت ہوگا۔

(۲) راج کمل کلا مندر

کے زیر اہتمام ملک کے مستند ڈائرکٹر مسٹر شانتارام نے جو فلم **شکنتلا** کے نام سے پیش کیا ہے وہ آج بھی بے شمار شائقین کے لئے باعث دلچسپی ہے۔ ڈرامہ "شکنتلا" کالی داس کا وہ کارنامہ ہے جسکی عظمت ہندوستان کے باہر بھی تسلیم کی جا چکی ہے۔ اور اس ڈرامہ کی بنیاد پر کالی داس کا نام دنیا کے چند گنے چنے لکھنے والوں میں لیا جاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ ایسے عظیم الشان ڈرامہ کو اور ایک ایسے بلند کردار کو فلم میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ مسٹر شانتارام نے جو ہندوستانی اور مغربی فلموں کی تکنیک میں ماہر ہیں، اسے ایک شاندار فلم کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

یہ فلم میجسٹک سنیما دہلی میں پبلک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی دیکھنے والوں کا شوق کم نہیں ہوا ہے۔ ہال آج بھی کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔

(۳) نیو تھیٹرز

کے نام کے ساتھ آج بھی دلوں میں کیسے اچھے اچھے فلموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کمپنی نے جو فلم پبلک کے سامنے پیش کئے ہیں، ہندوستان کی فلمی دنیا میں مدتوں یاد کئے جائیں گے اب کے اس کمپنی نے خاص اہتمام کے ساتھ ایک فلم **واپس** تیار کیا ہے۔ اس فلم کی روح رواں مقبول ہر دلعزیز ہیروئن بھارتی ہیں۔ اور اداکاروں میں نواب، اشیت برن، اور لتیکا جیسی ہستیاں نظر آتی ہیں۔ کہانی مسٹر بنائے بنرجی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اور میوزک مشہور و معروف مسٹر بورال کا کارنامہ ہے۔ اس فلم کے ساتھ عظیم الشان توقعات وابستہ ہیں۔

(۴) رامنک پروڈکشن

کے زیر اہتمام مشہور و معروف ڈائرکٹر مسٹر جی جاگیردار نے ایک نہایت کامیاب فلم کرن کے نام سے پیش کیا ہے اس فلم میں کہانی اور گانے دونوں اپنی اپنی جگہ مخصوص دلکشی رکھتے ہیں۔ اس فلم میں مشہور ہر دلعزیز ہیرو اشوک کمار اور مقبول ہیروئن لیلا چٹنس نے اداکاری کا کمال پیش کیا ہے۔ یہ دونوں ہستیاں عوام میں جو مقبولیت رکھتی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے فلم کی کامیابی میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

(۵) پردھان پکچرز

ان دنوں اپنی اولین پیشکش **داسی** کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ اس فلم میں ہندوستان کے بعض مشہور اداکار اپنے کمالات کا ثبوت دے رہے ہیں۔ جن میں راگنی، نجم الحسن، گیانی اور کندنی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس وقت فلم تکمیل کی آخری منزل میں ہے۔ اس فلم کے ساتھ بہت خوشگوار توقعات وابستہ ہیں۔

(۶) چترا پروڈکشنز

نے ایک نہایت کامیاب فلم "پرتگیا" کے نام سے پیش کیا ہے۔ کمپنی کے ارباب حل و عقد نے ایسی

...جانی تو صرف کی ہے۔ اداکاروں کا انتخاب بھی پوری خوش مذاقی کا ثبوت دیتا ہے۔ اس فلم کی روح رواں مشہور و معروف نام سورن لتا۔ بی مینا۔ ... کماتی ہیں۔ یہ ہستیاں فلمی دنیا میں جو شہرت و مقبولیت رکھتی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے فلم کا کامیاب ہونا یقینی ہے۔

(۷) بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ کے تیار کئے ہوئے فلم **قسمت** نے جو مقبولیت حاصل کی ہے ... فلم کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ یہ فلم بمبئی ٹاکیز کا وہ کارنامہ ہے جس پر کمپنی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اس فلم کی جوبلیت کا عظیم الشان مظاہرہ دہلی میں ہوا۔ جوبلی ٹاکیز دہلی نے بڑی دھوم کے ساتھ اس فلم کی گولڈن جوبلی منائی تھی۔ کسی فلم کی گولڈن جوبلی اس فلم کے پروڈیوسروں کے لئے مایۂ افتخار ہے۔ یہ فلم اب پچاس ہفتے پورے کر چکا ہے۔ لیکن شائقین کی گرم جوشی ہنوز قائم ہے۔

(۸) پنچولی آرٹ پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **پونجی** ملک کے طول و عرض میں دھومیں مچا چکا ہے۔ یہ فلم بمبئی، کلکتہ اور پشاور میں اپنی مقبولیت کا سکہ جما چکا ہے۔ لاہور سے فلم کے متعلق جو خبریں

[illegible] بمبئی ... وہاں کبھی بڑی ... کر شہرت حاصل کی ہے ...
... شائقین نے اس فلم کا انتہائی گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے ... [illegible]

کے شائقین نے بھی اس فلم کا بہت بے چینی کے ساتھ انتظار کیا ہے۔ ۲۰ مارچ سے یہ فلم موتی ٹاکیز دہلی میں چل رہا ہے۔ یہاں بھی اس فلم کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس فلم میں راگنی۔ پنت۔ پانڈے۔ اختری ادھوما کی اداکاری خاص طور پر بہت پسند کی جا رہی ہے۔

ہیرو اپروڈکشنز کے سلسلہ میں ہندوستان کے مشہور و مقبول ڈائرکٹر اور اداکار مسٹر ... اپنی ایک نئی فلم ... معروف ہیں۔ اس فلم میں معروف مسٹر ... نے ... اداکاری کی ہے بلکہ دیو داس کی مشہور ہیروئن جمنا نے ان کا ساتھ دیا ہے ... دیوداس میں جمنا نے جس بیمثال اداکاری کا ثبوت دیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مسٹر ... فلمی دنیا میں اداکاری اور ... کے لحاظ سے ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس فلم میں انہوں نے خاص ... کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً یہ فلم خاطر خواہ مقبولیت حاصل کریگا۔

رنجیت کی عظیم الشان پیشکش

بمبئی پنجاب سی پی میں ہٹ ثابت ہونے کے بعد

دہلی میں بھی

شنکر پاربتی

ڈائرکٹر چترنجن

برف پوش ہمالیہ کی گود میں
ایک عظیم المرتبت مقدس کردار
الوہیت کے پیغام کے ساتھ

اس فلم میں
مشہور و معروف رقاصہ سادھونا بوس نے کام کیا ہے

دوسرے اداکار
ارون۔ کملا چٹرجی۔ برج مالا۔
بھگوان داس اور راجیندر

ہماری لبرٹی فلم
دہلی ٹاکیز بیورو۔ دہلی، لاہور، کراچی

تاریخ خود کو دہرایا کرتی ہے

لیکن

تاریخ نے اپنی سچائی سے خود کو کبھی نہیں دہرایا

"پکار" ـــــ اور ـــــ "سکندر" ـــــ کے بعد

منروا کا تیسرا لاثانی شاہکار



پرتھوی ولبھ

جسے دیکھ کر آپ فخر سے اپنی تاریخ پر ناز کریں گے !!

(اداکاران):

سہراب مودی ۔ درگا کھوٹے ۔ سنکھٹا پرساد ۔ مس جگن ۔

مینا ۔ کے، این سنگھ

ڈائریکٹر: ـــــ سہراب مودی

کہانی: ـــــ کے ایم منشی (سابق منسٹر بمبئی)

جاری کردہ

ڈیسائی اینڈ کمپنی ۔ لاہور، دہلی، کراچی

[illegible] کی آواز!!

[illegible] ٹاکیز دہلی میں پونجی نے سب کو مات کر دیا !!!

دلسکھ ایم پنچولی کا مہکتا ہوا گلدستہ

پنچولی آرٹ پکچرز کا تازہ تحفہ

پونجی

ہندستانی عورت کی شوہر پرستی ! تین لڑکیوں کی داستان محبت !! رومان اور جذباتی اداکاری کا مرقع !!!

ڈائرکشن: شنو پنچولی اور روندر دوے ——— افسانہ: دلسکھ ایم پنچولی

میوزک: ——— غلام حیدر ——— مکالمے: سید امتیاز علی تاج

(خاص اداکاران)

راگنی — جینت — منورما — اسمٰعیل — بے بی اختر — جی، این، بٹ

پالنے — اجمل — درگا موٹا وغیرہ

جاری کردہ: امپائر ٹاکی ڈسٹری بیوٹرز — دہلی، لاہور

رائٹنگ پروڈکشنز کی شاندار پیشکش

کنگن

رومان و موسیقی
کا
شاندار مظاہرہ

اداکاری
کا
شاہکار

جس میں

مشہور و معروف ہیرو **اشوک کمار** اور مقبول ہر دلعزیز ہیروئن **لیلا چٹنس**

نے اداکاری کی ہے

ڈائرکٹر — جاگیردار

این۔ آر۔ دیسائی پروڈکشنز کا عظیم الشان فلم

امانت

اداکاران:۔ حسن بانو۔ ہریش۔ بدھوا ڈوانی۔ گلزار۔ قائم علی

۷۔ اپریل سے لکھنہ ٹاکیز (پہاڑ گنج) میں چل رہا ہے

کیرتی پروڈکشنز کا تحفہ

آشیرباد

اداکار:۔ بلونت سنگھ۔ للتا پوار۔ رام پیاری۔

پُرلطف گانے — دلچسپ واقعات

کمار ٹاکیز میں عنقریب آرہا ہے

جاری کردہ۔ رتن پکچرز، چاندنی چوک ۔ دہلی

بمبئی ٹاکیز کا انوکھا شاہکار

قسمت

بار بار دیکھنے پر بھی طبیعت نہیں بھرتی

اداکاران

اشوک کمار ممتاز شانتی

وغیرہ

جوبلی ٹاکیز دہلی میں

۵۱ ویں ہفتہ میں

نہایت آب و تاب کے ساتھ چل رہا ہے!

آج بھی ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ہزاروں شائقین کو مایوس واپس جانا پڑتا ہے

جاری کردہ:

جنرل ٹاکیز لمیٹڈ۔ دہلی

راج کمل کلا مندر کی انمول بھینٹ

شکنتلا

ڈائرکٹر: شانتارام

گانے: دیوان شرر، رتن پیا

اداکاران

جے شری چندرموہن

وغیرہ

کائنات کی مصوری اور بہشت کا حسن

اگر دیکھنا ہو

تو "شکنتلا" ملاحظہ فرمائیے

یہ مشورہ دنیا کے مشہور فلاسفر گوئٹے نے دیا ہے

میجسٹک سنیما میں ۱۶واں ہفتہ

نہایت رش لے رہا ہے

جاری کردہ:

جنرل ٹاکیز لمیٹڈ۔ دہلی

[illegible] کی [illegible] اصلاح [illegible]

[illegible] تمام [illegible] کی اصلاح و بہبود کیلئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں:۔

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کیلئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بد امنی پھیلانے [illegible] کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستان کی مختلف اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرنا اور اسکے لئے کوشش کرنا۔

(۳) [illegible] معاش اور [illegible] کی دیکھ بھال اور ان کا [illegible] کرنے کیلئے عوام کی [illegible] کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا اور ان کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) باغی یا ظالم یعنی دشمن کے ایجنٹوں اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا اور ان کی نگرانی کرنا [illegible] کر [illegible] نہ لا سکیں۔

(۶) کھانے پینے [illegible] ضروریات زندگی کی چیزوں کو ان کی مقررہ قیمت پر فروخت کرنا [illegible] ناجائز منافع [illegible] کو روکنا [illegible] رپورٹ کرنا [illegible] کرنا۔

(۷) [illegible] اور [illegible] کی [illegible] عوام الناس کی [illegible] کے [illegible] کرنا۔

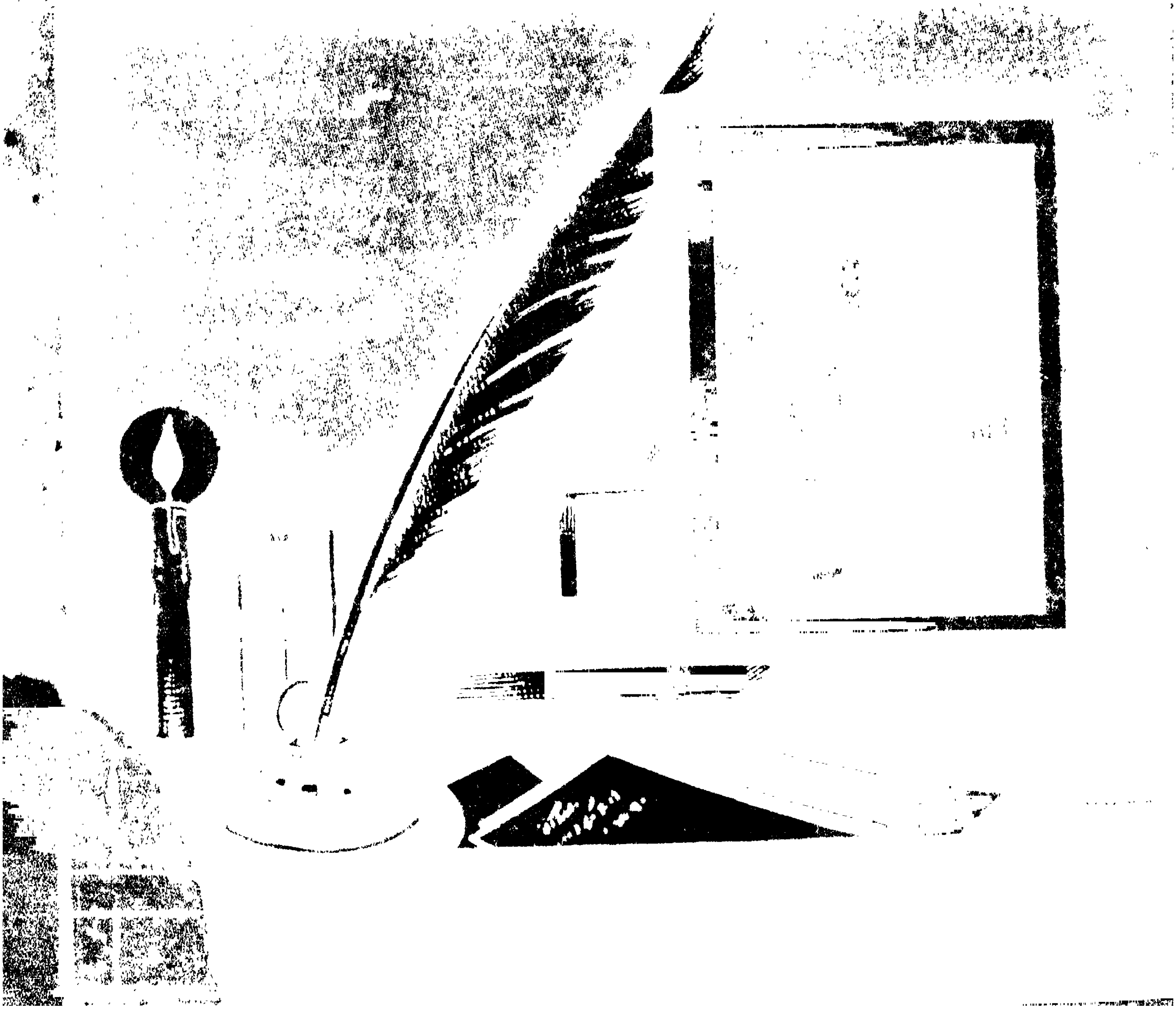
(۸) [illegible] ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

[illegible] کے [illegible] مقاصد [illegible] کسی سیاسی [illegible] تعلق نہیں [illegible]
عوام الناس کو [illegible] حاصل کرنا چاہیے [illegible]

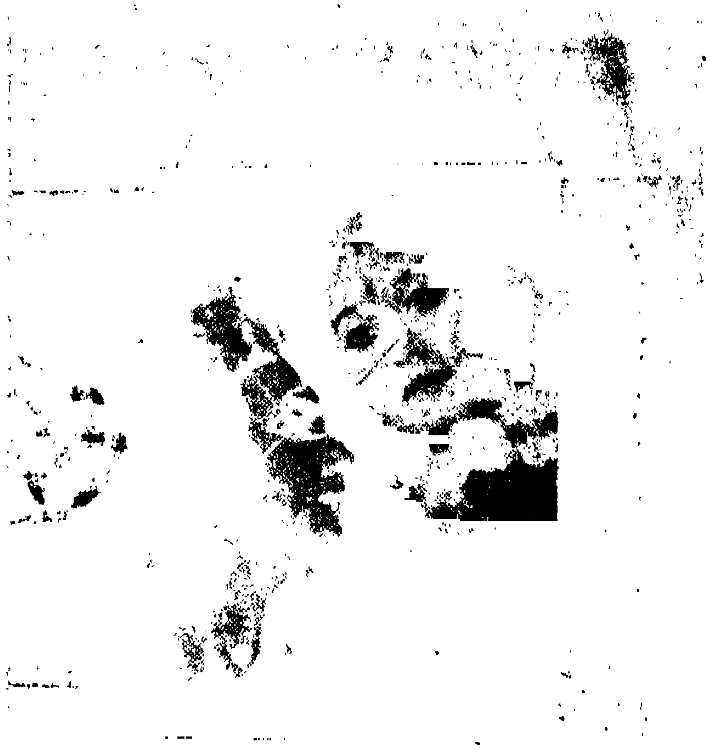
پراونشل نیشنل [illegible] فرنٹ [illegible]

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)

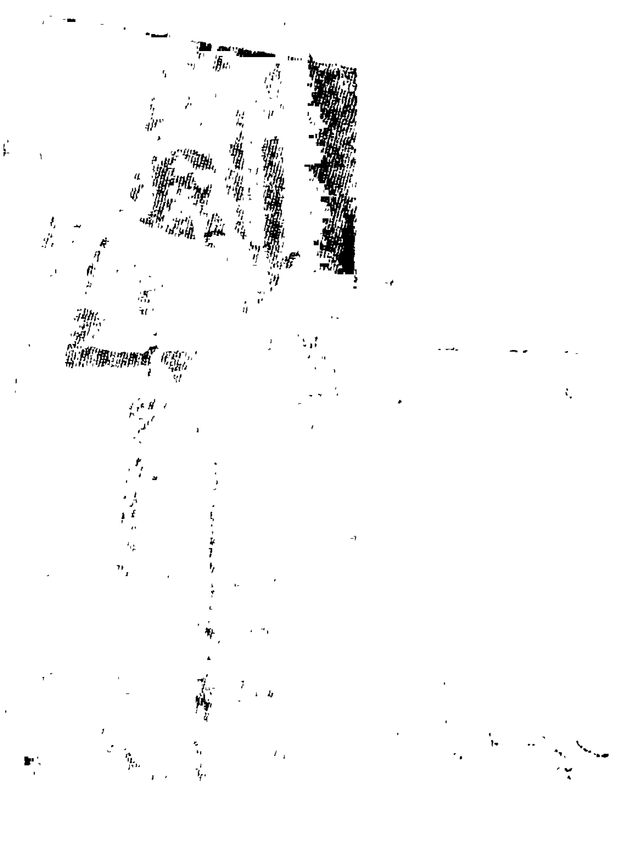






سادھنا بوس اور اروِن فلم "شنکر پاروتی" میں

فلم "کنگن" میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس





[illegible] محصول ڈاک

قیمت فی پرچہ: - ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب

سید محمد ارتضیٰ واحدی — صبیح الدین احمد ایم اے — (آنسہ) نجمہ تصدق ایم اے ۔ بی ٹی

جلد	مئی سنہ ۱۹۴۴ء	نمبر ا

فہرست مضامین

نئی کتابیں

(از وسیم الدین احمد [illegible])

(۱) لندن سے آداب عرض

از آغا محمد اشرف

شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی۔ قیمت عہر

آغا محمد اشرف دلی کے ایک جواں قسمت فرزند ہیں۔ ان کی ہمت بھی جوان رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فطرت نے انہیں اچھے اچھے موقعے بھی عطا کئے۔ یا دش بخیر ایک زمانہ میں جبکہ وہ آل انڈیا ریڈیو میں تھے تو "آداب عرض" کے نام سے ان کی شہرت ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی۔ اس وقت ان کی مقبولیت خود آپ کے بہت سے دوستوں کے لئے باعث رشک تھی۔ کسے معلوم تھا ایک دن ان کی آواز اور لہجہ کا افسوں ہندستان کی سرحد سے نکلکر "بی بی سی" لندن کی معرفت دنیا کے بے شمار ریڈیو سننے والوں کے دلوں پر ایک گہرا نقش جما دیگا۔ یقیناً ریڈیو کی تاریخ میں بہت کم اناؤنسر اس مقبولیت کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ اشرف صاحب اپنی اس ریڈیائی شہرت کے ساتھ ساتھ اپنے پس پشت عظیم الشان ادبی روایات رکھتے ہیں۔ وہ اردو کے جلیل القدر ادیب مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے ہیں۔ دلی کی ٹکسالی زبان ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ زیر نظر کتاب موصوف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے لندن کے دوران قیام میں لکھے ہیں۔ ان مضامین کے پڑھنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں لندن کی کیا زندگی رہی ہے۔ یہ سب مضامین اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ اور ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جس نے لندن کے حالات کا عینی مشاہدہ کیا ہے۔ بعض مضامین میں اکابرین حکومت سے ملاقات کے تذکرے ہیں۔ جن سے ان کی شخصیتوں پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے فرشتہ خصلت ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہے اور مخصوص دلکشی رکھتی ہے۔ دلی کی زبان کے چٹخارے جابجا نمایاں ہیں۔ انتساب کے سلسلے

ہی مصنف نے خلوص اور وفا کا ثبوت دیا ہے۔

(۲) بچوں کا لندن

از آغا محمد اشرف

شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی۔ قیمت عہر

زیر نظر کتاب آغا محمد اشرف صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً بی بی سی لندن سے خاص طور پر بچوں کے لئے براڈکاسٹ کئے۔ ان بچوں کی دنیا میں وہ "اشرف چچا" کہلاتے ہیں۔ ان مضامین کے ذریعہ "اشرف چچا" نے انہیں لندن کی سیر کرائی ہے۔ وہاں کی زندگی کی جھلکیاں نہایت سادہ موثر اور دلکش انداز میں پیش کی ہیں۔ ان مضامین کا مصنف بچوں کی نفسیات پر غیر معمولی گہری نظر رکھتا ہے۔ اشرف صاحب ایک نہایت کامیاب اور ہردلعزیز استاد بھی رہ چکے ہیں۔ جہاں بھی انہوں نے درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے ہیں ان کی مقبولیت اور کامیابی مسلّم رہی ہے۔ ان مضامین میں بچوں کی نفسیات کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے۔ مضامین کا پیرایہ نہایت سادہ اور دلکش ہے مضامین پر از معلومات بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ مضامین پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے لکھتے وقت خود ایک [illegible] محسوس کی ہوگی۔ اور یہی پہلو ان مضامین کی کامیابی کی دلیل ہے مصنف ان مضامین میں کسی سخت مزاج استاد کی طرح بچوں کو خشک [illegible] نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ بچوں سے گھلا ملا نظر آتا ہے۔ لندن کی سیر میں وہ ہر قدم پر ان کے ساتھ اور ان سے بہت قریب ہے۔

(۳) فروزاں

از معین احسن جذبی

شائع کردہ مکتبہ اردو ملا ہے۔

جذبی ایک نوجوان شاعر ہیں مگر ان کی کلام میں ان کے بہت سے عمر سے کہیں زیادہ پختگی ہے۔ چار سال ہی کے شاعروں سے بچتے ہیں۔ اندوہ اسفہ تشیع پسند کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا یہ بنیادی پہلو ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ زیر نظر کتاب "فروزاں" ان کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اکثر بیشتر شعرا کی طرح جذبی کی شاعری کا ارتقا بھی غزلوں کی صورت میں شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ مگر وہ دراصل ایک غزل گو کا مزاج رکھتے ہیں۔ اور ان کے بہترین جواہر پارے ان کی غزلوں میں ملتے ہیں۔ کتاب کے ابتدائی صفحہ پر یہ شعر نمایاں ہیں۔

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارہ کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارہ کرتے ہیں

یہ شعر ان کی شاعری کی صحیح تفسیر ہے۔ جذبی کے ہاں شاعری کی بنیاد غم پر قائم ہے۔ مگر یہ بنیاد ان کے ہاں بہت مستحکم اور پائیدار ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اس پہلو کو پورے خلوص اور انصاف کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی شاعری کا بہترین حصہ قطعی طور پر داخلی ہے۔ جب تک وہ کسی تاثر کو پورے طور پر اپنا نہیں لیتے شعر نہیں کہتے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری زمانہ کے بہت سے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ مگر اس بحرانی دور کے گذر جانے کے بعد ان کے بہت سے اشعار ایک مستقل قدر و قیمت کے مالک ہونگے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے مصنف کو دنیائے ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتی ؎

پھول چننا بھی عبث، سیرِ بہاراں بھی فضول
دل کا دامن ہی جو کانٹوں سے بچایا نہ گیا

دامن ہی رکھا میں نا کامی تقدیر نے   لا کھ تو نے خود کو نزدیک رگِ جاں کر دیا

میری خاکِ دل بھی آخر ان کے کام آ ہی گئی
کچھ نہیں تو ان کو دامن ہی بچانا آ گیا

مختصر یہ ہے ہماری داستانِ زندگی
اک سکونِ دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کئے

احساس تھا بھی مجھے احساس تھا ہے   یہ کون سرِ بزم مجھے دیکھ رہا ہے

شکستہ ساز چھیڑیں اپنی آنکھیں خونفشاں کر لیں
وہ آئیں یا نہ آئیں ہم تو بزم آرائیاں کر لیں

ہزار بار کیا عزم ترکِ نظارہ   ہزار بار مگر دیکھنا پڑا ہم کو

میری عرضِ شوق بے معنی ہے ان کے واسطے   ان کی خاموشی بھی اک پیغام ہے میرے لئے

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں   یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا

مرے قہقہوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی   مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخئ زمانہ

زندگی گو لاکھ بن جائے تبسم آفریں   زندگی لیکن تبسم کے فسانوں میں نہیں

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

وہ دور ہیں جنھیں دعویٰ قرب ہے تجھ سے   وہ پاس ہیں جو ترے پاس آ نہیں سکتے

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں   میری پائندگیِ غم کو تو دیکھا ہوتا

اے جوشِ وفا ان قدموں کی عزت تو بڑھا دی سر رکھ کر
اب ہم کیسے اس ذلت کے احساس سے چھٹکارا پائیں

جذبی کی شاعری میں جو لوگ سرشاری و مستی اور جوش و خروش تلاش کریں گے۔ انہیں ایک حد تک مایوسی ہوگی۔ ان کی شاعری میں ایک قسم کی غمگینی، ایک خاص قسم کا سوگ ملے گا۔ وہ اپنے سینے میں ایک درد مند دل رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں "اے کاش" اور "موت" اپنا مخصوص معیار رکھتی ہیں اور اس دور کی کامیاب نظموں میں سے ہیں۔

زارینہ

ترجمہ از جناب ... رحیم ...

شائع کردہ ادیب بک ڈپو دہلی

صفحات ... مجلد ... قیمت ...

روس جہاں اس وقت اشتراکی نظام قائم ہے نہایت ہولناک ملک تھا۔ انقلاب روس سے قبل زار شاہی کا جبر و استبداد آپ اپنی مثال ہے۔ زیر نظر کتاب زارینہ جو ایک جرمن شہزادی روسی ملکہ کی داستان حیات ہے۔ اس دور کے نظام کی جھلک پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زار کی انحطاط پذیر شہنشاہیت کن عیوب کا گہوارہ بن گئی تھی۔ کیسی کیسی سازشیں عمل میں آتی تھیں۔ اور اس نظام کے ارباب حل و عقد اپنے مفاد کے سلسلہ میں کیسے کیسے حربوں کا استعمال روا رکھتے تھے۔ زیر نظر کتاب شروع سے آخر تک دہلا دینے والے واقعات سے لبریز ہے۔ کس طرح زارینہ قیصر جرمن کی ایک ایجنٹ بن کر راسپوٹین سے ساز باز کرتی ہے اور اپنے مقصد کے لئے کیا کیا چالیں اختیار کرتی ہے۔ درویشی کے لباس میں دغا بازی کا مجسمہ راسپوٹین کس کس طرح اس کی مدد کرتا ہے۔ اور پھر ان تمام درباری سازشوں اور شطرنجی چالوں کا انجام کس قدر عبرتناک صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے کتاب زار کے عہد کے حالات اور اس دور کے مختلف درباروں کی خفیہ سازشوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور انقلاب روس کے قبل کے حالات کا جائزہ پیش کرتی ہے۔

زبان نہایت سلیس اور سلجھی ہوئی ہے۔ یقیناً یہ کتاب نہایت دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

ضروری اعلان

ارادہ تھا کہ مئی کے "ادیب" میں اُن مردانہ اور زنانہ افسانوں کو جو مقابلے میں کامیاب سمجھے جائینگے شائع کر دیا جائیگا لیکن چند وجوہات کی بنا پر مئی کی بجائے "ادیب" ماہ جون میں تمام موصول شدہ افسانے شائع ہونگے اور "ادیب" کی کاپیاں مندرجہ ذیل حضرات کے پاس برائے مشورہ ارسال کر دی جائینگی۔ اور کثرت رائے پر انعامی افسانوں کا فیصلہ کیا جائیگا۔

مشیران کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں

(۱) پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم اے۔ آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ)

(۲) پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی ایم۔ اے

(۳) اڈیٹر "ادیب"

زنانہ افسانوں کے لئے

(۱) محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین

(۲) محترمہ شیریں

(۳) اڈیٹر ادیب

(نصیح الدین احمد اڈیٹر)

امت کی مائیں

شائع کردہ احمد ... ... دہلی

صفحات ... مجلد ... قیمت ...

زیر نظر کتاب "اُمت کی مائیں" علامہ راشد الخیری مرحوم کی ایک یادگار تصنیف ہے۔ جو نہایت عمدہ طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہوئی ہے۔ علامہ مرحوم نے مسلمان خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے قلم سے جو ناول نکلے ہیں وہ ہمارے ادب میں ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب رسول اللہ صلعم کی ازواج مطہرات کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اور اُن کی پاکیزہ زندگی کا آئینہ ہے۔

اس کتاب میں آغاز اسلام کے زمانہ کے حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کی نجی زندگی پر پورے خلوص اور صداقت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہادی اسلام کی ازدواجی زندگی، ان کے خانگی مسائل ان کے طرز رہائش کے بارے میں بیش بہا معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ یہ سب کچھ اس قدر دلنشین اور لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ دل میں اُترتا جاتا ہے۔ دلی کی دھلی ہوئی ٹکسالی زبان کتاب میں جا بجا اپنی اثر آفرینی دکھا رہی ہے۔

نیا ادب

چند غلط فہمیاں اور اُن کا ازالہ

(از جناب اصغر عثمانی ۔ مدیر معاون نیرنگ خیال ۔ لاہور)

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں اُن فسانوں کو نہ چھیڑ (اقبالؒ)

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ کتے بھونکتے ہی رہتے ہیں اور
وان گزرا ہی چلا جاتا ہے"۔ زندگی کے ہر میدان میں یہ معرکہ پیش آتا ہے
رمالبا حیات کی ناصیاتی قدروں میں اسی یسار یت سے پختگی و استواری پیدا
تی ہے۔ کشمکش کے اس بحرانی دور میں سماجی مسائل کے ساتھ جدید ادب
بی اسی قسم کے نعرے لگائے گئے ہیں۔ اور شدتِ مخالفت میں آج
ا کوتاہ پردازی نظر نہیں آتی، یہ دوسری بات ہے کہ ذہنی محکومیت نے
ہ کا رُخ ماہیت کی طرف پھیر دیا ہے۔ لیکن اس یساریت سے بجائے
مات پہنچنے کے نئے ادب کی افادی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے۔
غیر شعوری طور پر یہ حضرات بھی اس کے فروغ اور کبھی کبھی اپنی غلط روی
، اس کے دامن کو آلودگی سے ہمکنار ہونے سے بچانے میں بھی
یک ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ خدا کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچتے
مسلسل انکار کا مفہوم ہی یہی ہے کہ وہ کسی غیر مرئی، زبردست قوت
مخالفت ضرور ہیں اور اپنے آپ کو جھوٹی تسلیوں سے اس سے بے لوث
یا تے ہیں۔ لیکن ان کا مسلسل انکار ہی خدا کے وجود کی دلالت ہے۔
۔ ایک وقتی چیز سے بہلو تہی کے کیا معنی ؟ یہی حال نئے ادب اور جدید
انات کے منکرین کا ہے۔ ان کا ہر انکار اور ان کا ہر لعنتی مضمون جدید ادب
یاد کو اور بھی استوار کر دیتا ہے۔ اور اس کی ضرورت ہمہ گیر ہیت اور
یت جو بدن نمایاں ہوتی جاتی ہے۔

کتنی افسوسناک بات ہے کہ نیا ادب کے آج بھی اکثر لوگوں کو حیرت

ہے اور وہ اس لفظی شوں سے ایسے دلتنگ ہو گئے ہیں کہ حقیقت کے
چہرے سے نقاب کشائی کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔ وہ ہر گندے، مبتذل
اور فرسودہ ادب کو نیا ادب تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام
غلامانہ ذہنیت ہر طبقہ میں کارفرما ہے۔ لیکن تصوریت کو حقیقت کا پہلو بنانا
سب سے بڑی نادانی ہے۔ سہل پسندی کو چھوڑ کر اگر ادب کے ساتھ جدید
میلانات کا تعمیری جائزہ لیا جائے تو غلط فہمیاں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔

تاریخی تجزیہ

ہندستان میں مسلمان بادشاہ فاتح کی حیثیت سے آئے اور عجمی
تصورات و آلودگیوں کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر فارسی "شاہی زبان" قرار
دی گئی۔ جیسے کہ انگریزیت کے دورِ آغاز کے وقت انگریزی زبان اور مغربی
علوم و تواریخ اور فلسفہ نے فارسی قدیم اور ہندی زبانوں کے اتصال
سے جو نئی زندگی اور نیا ادب پیدا ہوا تھا اس میں انقلاب برپا کر دیا اور
میکالے کی کوششوں نے دورِ متاخرین کے ادیبوں کو بھی انگریزی تشبیہات
کے استعمال کرنے پر مجبور کر دیا تاکہ ایک جدید ادب پیدا ہو سکے۔ اور شاید
اس طریقہ پر ہندستان کے مردِ بیمار کو ایک نئی زندگی مل سکے۔ اسی طرح پراکرتی
بھاشا میں بھی انقلاب ہوا اور ایک نیا ادب پیدا ہوا۔ اور ایک نئی زبان کا
ظہور ہوا جسے "اُردو" کہتے ہیں۔

دار الحکومت کے عساکر اور باشندوں میں ربط و اتحاد لازمی امر
تھا اور تمدنِ عالم کے ترکیبی عناصر کا ایک حصہ تھا۔ اس لئے ایک قوم کو دوسری
قوم کے افکار و خیالات سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک دوسرے کی زبان
سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن عجمی تصورات کی آلودگیوں نے کچھ تعصب اور ناروائی
برتی جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک اس "نئے ادب" کی تخلیق نہ ہو سکی۔ اور فاتح
و مفتوح کے درمیان ایک پردہ حائل رہا۔ انسان کی جبلت پسندی نے اسلام کے
وہ زرّیں اصول سرزمینِ فارس و ایران میں قطعاً فراموش کر دیئے تھے۔
جو بیداریٔ جمہور کے دلنشیں خواب کی خوشگوار تعبیر تھے۔ لیکن عربی و عجمی خیالات
کی ہم آہنگی نے ایک جدید تمدن کی بنیاد ضرور ڈال دی تھی جس میں بعض مجلسی
اقتدار کی نمائندگی کے ساتھ انسانی فطرت نے آمرانہ طرز اختیار کرنے سے
دریغ نہ کیا تھا۔

اس نئے تمدن نے قدیم عجمی تصورات میں ایک زبردست انقلاب
ضرور پیدا کیا لیکن جمہور کی حیثیت مفعولی ہی رہی۔ یہی فرسودہ تصور تھا جس

[illegible] پہنچے [illegible] ہے
[illegible] کی ہوں میں ایک بیمار [illegible] کے تحت
کے [illegible] جا بجا [illegible] پرستی [illegible] ہو گئے تھے۔
[illegible] پہنچنے کے باعث [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] کر [illegible] عوام الناس پر حکومت کی۔ مسند خلافت کو [illegible] کے [illegible]
[illegible] نے اسلام میں بھی بادشاہ کو ظل الٰہی قرار دیا اور [illegible] ان کی خواہشات
و [illegible] کو [illegible] ربانی بنا دیا۔ اسلام جو جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار تھا اس طرح
شخصی [illegible] کا شکار ہو گیا۔ اور جمہوری اقدار [illegible] غبار آلود مسافت میں کھو کر رہ گئیں۔
[illegible] وجہ ہے کہ آج مسلمان راکھ کا ڈھیر ہے۔ جس کی چنگاریاں تک سرد ہو چکی ہیں۔ اس
طرح قدیم عجمی تصور اپنی تسلیم رہبانیت کے ساتھ اسلام کے دامن پر بدترین داغوں کی
شکل میں نمودار ہوا۔ اور اس نے بھی محلوں اور خانقاہوں میں ایک ربط باطنی پیدا کر دیا
یہ کاہنی دور انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کے وقت تک قائم رہا اور
مشرق میں تو بیسویں صدی کے آغاز تک اس کا غلبہ رہا۔ لیکن مادیت کی بڑھتی
ہوئی حقیقت پرستی نے ڈھول کا پول ظاہر کر دیا۔ اور بتدریج یہ ذہنی محکومیت ایک آمرانہ
استبداد میں تبدیل ہوتی گئی۔ جو جماعتی شکل میں ظاہر ہوا۔

انقلاب فرانس کے اثرات سطحی ہے گو مادہ پرستی کی اقدار اسی وقت
مستحسن قرار دی گئیں۔ اکثر مغربی مفکرین ان سے متاثر بھی ہوئے اور ان کی شاعرانہ
فکر نے اس فیل بے زنجیر کی آزادروی بھی ان کے سامنے بے نقاب کر دی۔ لیکن بجائے
حالات حاضرہ کا مقابلہ کرنے کے ان کی ذہنی محکومیت نے رومانی اور رائیت کی تحریک
کا آغاز کیا اور انہوں نے بھی تصوریت میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ اس کشمکش کا اندازہ
اس زمانے کے ادب سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ لیکن اب وہ قدریں جو کلیسا کے ہاتھ میں
کٹھ پتلی تھیں، سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں مکمل طور پر آ چکی تھیں ——— یہ
دور ملکہ الزبتھ کی عہد حکومت سے لیکر گذشتہ عالمگیر جنگ کے وقت تک رہا
اور اس کا خاص ادب جنگ زرگری ہے۔

انگریزی ادب میں قدیم مروجات سے پہلا باغی طامس ہارڈی تھا۔
اس کے مشہور آفاق ناول ٹس (Tess of Dubervilles)
نے مغربی قدامت پرستوں میں ایک انتشار پھیلا دیا تھا۔ اور لوگ ہارڈی کو نظام
زندگی کے لئے خطرہ تصور کرنے لگے تھے۔ اس کا دوسرا ناول "جیوڈ دی آبسکیور"
(Jude the Obscure.) ایک کھلی ہوئی بغاوت تھا۔
مشہور جواں مرگ ادیب رالف فاکس نے ایملی برانٹی کے ناول "وودرنگ ہائٹس"
سیمول بٹلر کے "دی وے آف فلیش" اور طامس ہارڈی کے "جیوڈ دی آبسکیور"

[illegible] کہ [illegible]
چیخنا کہا ہے [illegible] کی [illegible]
چارہ نہ تھا [illegible] ہے۔ اور [illegible]
جس کی شدت گذشتہ جنگ عظیم کے بعد [illegible]
مشرق ان تحریکات سے خواہ مخواہ [illegible]
بھی وہی تعصبانہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو [illegible]
ہوا تھا۔ [illegible] ہماری اقتصادی بدحالی نے ہماری ذہنی [illegible]
میں تبدیل کر دیا تھا اور بہت تھوڑے سے سکوں پر ہماری [illegible]
اور خود داری خریدی جا سکتی تھی۔

سلطنت مغلیہ کے آخری ایام میں جب مسلم تمدن کا آخری چراغ [illegible]

ذرا ٹھہرو ملے رہ نوردان منزل
چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

کا حسرت خیز مرقع پیش کر رہا تھا۔ عوام میں سراسیمگی اور بے چینی کے آثار
نہایت شدت سے نمایاں تھے جس کی جھلک اس زمانے کے ادب میں موجود ہے
لیکن ہماری ذہنی محکومیت کی جڑیں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ بظاہر ان کا اکھاڑنا
قطعی ناممکن نظر آتا تھا۔ اس زمانے کے ادیبوں میں "روح عصر" تو موجود تھی
لیکن لاچاری و بے بسی کا احساس اس قدر غالب آ گیا تھا کہ

آشیاں اجڑا کیا اور ناتواں دیکھا کئے

آخرکار ۱۸۵۷ء میں اجنبی اقتدار سے آزادی کی پہلی جنگ نے اس احساس
کمتری پر مہر صداقت ثبت کر دی۔ لیکن اس کا رد عمل بھی ضروری تھا اور
اصلاح مذہب، اصلاح زبان، اصلاح معاشرت اور اسی قسم کی دوسری
تحریکات شروع ہوئیں۔

غدر کے بعد اردو ادب میں نمایاں فرق پیدا ہوا۔ رومانی اور مادیت
کی تحریک کی طرح آزاد اور حالی نے بھی نیچرل شاعری کی طرح ڈالی۔ نثر نگاری
نے بھی نئے چولے بدلے اور نئے اسالیب بیان پیدا ہوئے۔ نئے افکار و
خیالات نے فرسودہ تخیلات کی دھجیاں اڑا دیں۔ موجودہ ادب جسے "جدید
ادب" سے موسوم کرتے ہیں اسی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ جس کی قیادت سرسید
حالی اور آزاد کے بلند پرواز دماغوں نے کی تھی۔

انگریزی ادب اور علوم مغربیہ سے مہارت حاصل کرنے کے بعد
اردو ادب میں بھی یہ جدید طرز فکر آ گئی۔ اس زمانہ میں [illegible]
ہوا کہ ادب کو عوام الناس کی زندگی کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ [illegible]

[illegible] ہوگئی [illegible] ہندوستانی نوجوان [illegible] ترکی کی طرح خلافت [illegible] اور اپنی قربت [illegible] نظر کے قصیدے [illegible] ہندوستان [illegible] حکومت کی بنیادیں [illegible] استوار ہوگئیں۔

لیکن جب تک یہ تحریکیں کامیابی کی منزل تک پہنچیں اور نئے بہت سے باشندوں نے ان جدید میلانات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مخالفت کے اونچے منصوبے پر اُتر آئے۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا اور آج بھی جاری ہے لیکن قدامت پرستی کی کہنہ دھجیاں اُڑتی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ نیا ادب ——— ترقی پسند رجحانات ——— اور جدید میلانات لیتے جا رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے فکری ارتقاء نے احساس خودداری پیدا کر کے شروع کر دیا اور انقلاب کی سست رفتار نہایت تیزی سے متحرک نظر آئی۔ اس ذہنی بیداری کے ساتھ حصولِ آزادی کی تحریک میں نمایاں شدت پیدا ہوئی اور اصلاحات و حقوق کے کھلونوں سے ہمیں بہلایا جانے لگا۔ غیر ملکی حکمراں اکثر و بیشتر مراعات، نمائندگی کے ذریعہ خواب دکھا کر ہمارے جذبۂ آزادی کو سرد رکھتے تھے۔ اس لئے اصلاحات مجلس قوانین، رعایات حقوق، ہوم رول، میثاق لکھنؤ، ڈیرہ مین اسٹیٹس، تحریک خلافت، ستیہ گرہ، چرخہ اور گاندھی جی کی جے وغیرہ اور اس قسم کی چیزیں موجود اور بہت کثرت سے تھی ہیں۔ لیکن ذہنی، معاشی و اقتصادی کشمکش میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ ہماری زندگی کے ان تقاضوں نے ہمیں کرب و بے چینی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اب یہ جذبہ کسی صورت سے بھی دب نہیں سکتا تھا۔ مختلف رعایات و حقوق سے اس کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی کی پیاس چند گھونٹ پانی سے نہیں بجھائی جا سکتی۔

گذشتہ عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی بعض تحریکوں نے ہندوستانی نوجوانوں کے رجحانات اپنی طرف منعطف کرانے شروع کئے۔ بعض ممالک جو سخت اقتصادی

---

1. دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز
(فراقؔ گورکھپوری)

خلافت سے وہ چاہتے تھے کہ قدامت پرستیوں کو چھوڑ کر اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ ترکی کی قدامت پرستی پر کمال اتاترک نے کاری ضربیں لگائیں۔ جس کی صدیوں کا نام نہاد خلافت کی اس تحریک کے خاتمے کے ساتھ ہندوستانی مسلمان پہلے تو بہت بڑے تعطل کے شکار ہوگئے اور اقبالؔ مرحوم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے؂

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

لیکن ان کی حساس طبیعت نے بہت جلد نئے رجحانات کی طرف اُن کی توجہ رجوع کر دی۔ اور وہی اقبالؔ جو کل تک اتاترک کے مخالف تھے۔ مرحوم کی حمایت پر آمادہ نظر آئے۔ جدید ترکی کی کامیابی نے وہاں کی اقتصادی حالت استوار کر دی۔ روس میں اشتراکیت کی تحریک نے بھی کم و بیش ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ قدیم سامنتی نظام اور مروجہ روایات سماج پر اشتراکیت نے زبردست تازیانے لگائے۔ اس لئے ہندوستان کے دورِ شہنشاہیت سے تنگ آئے ہوئے نوجوانوں کے لئے لازمی تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ علاوہ ازیں یورپ کی فاشی تحریکات نے بھی ہمیں دلکش باغ دکھلائے۔ ہم اقتصادی بدنظمی سے ایسے آزردہ تھے کہ ان تحریکوں کی خامیوں پر تنقیدی نظریں نہیں گئیں اور ہم یک وقت اس نئے موسم کی شان میں دھاڑنے لگے کر اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے لگے۔ ہندوستان کا نوجوان طبقہ کیا، بڑے بڑے مفکر اور صاحبِ فہم و تدبر ان میلانات کی طرف بہت جلد راغب ہوگئے۔

ہندوستان کی قدیم جدت پسندی یہاں بھی غالب آئی۔ اتاترک کی تحریک سے صرف مسلمان متاثر ہو سکے۔ لیکن فاشی و اشتراکی نظام نے تو سارے نوجوانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ جن کے دلوں میں ذرا بھی قومی جذبہ کارفرما تھا اور جو صحیح معنوں میں تعرضِ اغیار سے اپنی پاکدامنی چاہتے تھے لیکن فاشی تحریکوں سے زیادہ نوجوان اشتراکیت کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیونکہ اس نے منظم طور پر اپنا پیغام ہر خاص و عام تک پہنچایا اور فوجی پریڈ و قواعد کی طرح روسی ادیبوں کو بھی سرخ لباس پہنا کر باقاعدہ کام لیا۔ ۱۹۳۲ء کی خارخاف اشتراکی کانگریس کے بعد تو ایک لائحہ عمل کے تحت کام شروع کر دیا گیا۔ جرمنی میں بھی باوجود ادب کی مذمت کرنے اور اُسے "دماغی عیاشی کا آلہ ہوا بھین" کہنے کے فیوہرر و گوئبلز نے محسوس اور غیر محسوس طور پر ادبیات سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اور قومی اشتراکی انقلاب کے بعد ڈاکٹر گوئبلز نے فضائی کمپین نشر کرنی شروع کر دیں۔ لیکن ان میں "روحِ عصر" (جسے جرمن زبان میں (Zeitgeist) کہتے ہیں) کے ہوا ابھی جمالیاتی تجربہ نہیں تھا

مذہب سے بغاوت

اشتراکیت چونکہ پہلے نظامِ اس کے خلاف ایک منظم اور کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس نے وقتی طور پر ہر اس شے کے خلاف بغاوت ہے جو مروجہ ہیئتِ اجتماعی کا جز ہو۔ مذہب بھی اسی ذیل میں ٹھکرا دیا گیا تھا۔

جب ہماری آنکھیں اس جدید میلان کی طرف اٹھیں تو اپنی موجودہ حالت کو خوشگوار بنانے کیلئے ہم نے اس کے جزئیات تک قبول کر لئے ———— شاید اس طریقے سے ہم ان بندھے سلاسل کو توڑ دیں جو ڈیڑھ صدی ہمارے گلوں میں قری کا طوق بنا ہوا ہے۔ شاید اسی طرح سے ہم اس لعنت کے ذکر سے کو دور پھینک دیں جو ہمارے سینے پر آویزاں ہے۔ اس ذہنی بیماری نے ہمارے احساسات کو اس قدر پژمردہ کر دیا تھا کہ صرف ایک ضرب شاں کرنے نے ہمیں اس کے مقابلے میں اتنا حساس بنا دیا کہ ہم جذبات کی رو میں دریا کے بہاؤ پر خس و خاشاک کی طرح بہنے لگے کہ حسن و قبح، سرد و گرم، صدق و کذب اور لطیف و کثیف میں تمیز ہی نہ کر سکے۔ یہ بھی اسی طرح کی ایک ذہنی بیماری ہے جس نے ہمارے احساسات میں تشنج پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے ایک آلودگی سے نکلنے کی کوشش کی۔ اور دوسری معصیت میں گرفتار ہو گئے۔ آسمان سے تو گر پڑے۔ مگر کھجور پر آ کر اٹک رہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم ایک بار پھر بہیمیت و بربریت کے شکار ہو گئے۔ لیکن یہ بربریت بھی فطرتِ انسانی کا تقاضا اور اس کی نامیاتی حیثیت کو برقرار رکھنے کا بہانہ ہے۔ کیونکہ بقول ادماں دی گاکور[1] "دنیا کو از سرِ نو زندہ کرنے کے ہر چار پانچ سو سال کے بعد بربریت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ دنیا تہذیب کے ہاتھوں ہی فنا ہو جاتی" علامہ اقبال نے اسی حالت اور ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا ہے ؎

آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

مذہب سے بغاوت کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مذہب کی دیرینہ

[illegible]

آپ ہول کا مو[illegible] [illegible] سے نیست و نابود ہو گیا تھا ———— [illegible] ———— [illegible] اس کو حقیقت پارینہ بنا کر صرف یا دِ ماضی کے ایک طلسم کو مقفل بنا چھوڑ رکھا تھا۔ علامہ اقبال نے بھی تو اسی کا شکوہ کیا ہے ؎

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

احساسِ محکومیت نے جب یہ خیال دلایا کہ مذہب بھی اجارہ داروں کے ہاتھوں میں میراث ہو کر رہ گیا ہے تو انسانی جبلتِ پسندی و ملوکی مزاج نے جذبات کو غلط راستہ پر ڈال دیا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے ———— انحطاط اور بے چارگی کے اس دور میں جب ہم میں زندگی کا ولولہ پیدا ہوتا اور جذبۂ آزادی ہمارے دلوں میں موجزن ہوتا تو ہماری نگاہیں سب سے پہلے مذہب ہی کی طرف رہنمائی کے لئے اٹھتیں۔ لیکن کلیساؤں، مندروں اور مسجدوں کی پُر حسرت فضاء مرقعِ یاس پیش کرتی۔ جس میں ولولہ کی آخری کرن بھی نہیں باقی رہی تھی اور شفق کی طرح جس میں تڑپ مفقود ہو گئی وہاں نفس کشی، علائقِ دنیا سے بیزاری اور فراریت کا جذبہ کارفرما پا کر انسانیت کی دکھی ہوئی رگوں میں خونِ بغاوت دوڑنے لگا اور وقتی طور پر وہ ہر چیز کو آزادی پر قربان کر دینے کیلئے آمادہ ہو گیا۔ "جنت کے ٹھیکیدار" زمانے کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہ تھے۔ اور نہ ہی عقلی دلائل سے اس کی مخالفت پر آمادہ۔ اس تعطل خیز دور کو دیکھکر وہ روشن طبیعتیں جو سحر خیزی کے باوجود انقلاب کے خواب دیکھتی ہیں، اس قسم کے مذہب سے مایوس ہو جاتی ہیں۔ اور عالمِ عبادت میں اس طرزِ عبادت کو ڈھکوسلے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔ منظر حسن [illegible] نے "کلیسا" کے عنوان سے ایک نظم میں اسی نظریئے کی نمائندگی کی ہے ؎

جادۂ عشرت سے ہٹ کر، حالتِ انساں بھی دیکھ!
آہ اے ساحل نشیں، خمیازۂ طوفاں بھی دیکھ!
درس دے انسانیت کا، آدمِ بے درد کو!
یوں وقارِ زندگی، جھوٹی جہالت میں نہ کھو!

[1] ادماں دی گاکور (Edmand de Goncort) فرانس کا ایک مشہور ادیب
ا۔ع۔

[illegible] خواب کیجئے کے جام و مینا توڑ دے
چھوڑ دے [illegible] یہ ہے حسن حیات چھوڑ دے
[illegible] کی [illegible] ، [illegible] شان
[illegible] کے [illegible] سے ، دیکھ وہ اٹھا دھواں
[illegible] ، تیرے ترنم سے لطف
[illegible] ، درد و بیم کی صدا
کس قدر ناآشنائے درد و غم ہے کائنات
یا خدا تو ہی بدل دے میرا عنوانِ حیات
(مضطر بنارسی)

مشرق پر مغرب کے اس جابرانہ تسلط اور بے کسی و لاچاری کے احساس کے ساتھ متواتر ہماری سیاسی ہیم کو خاک و خون میں لتھڑتے ہوئے دیکھکر [illegible] کا سوگوار دل چیخ اٹھتا ہے ؂

تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں

اور انسانیت کے ان علمبرداروں کا مرقع وہ کس "دلخراش انداز" میں پیش کرتا ہے۔ لیکن یاسیت کے بجائے اس سے ہمارے دلوں میں خونِ انقلاب دوڑنے لگتا ہے[1] ؂

اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ——— اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی
(دریچے کے قریب)

——— لیکن یہ جذباتی آوازیں سطحی ہیں۔ اور وقت کی راگنی سے زیادہ ان کی وقعت نہیں ——— وقت گذرتے ہی برسات کے پتنگوں کی طرح یہ خود بخود ناپید ہو جائیں گی۔ نہ ان میں دائمی اقدار پنہاں ہیں اور نہ یہ دوام حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مادریت کی دنیا میں یہ لطیف ہذیان وقت کے اعتدال پر آتے ہی ختم ہو جائے گا۔ اصلیت تو یہ ہے کہ متواتر غلامی کے احساس نے ہمیں اس قدر نازک بنا دیا ہے کہ شدت احساس سے مجبور ہو کر ہم سب کچھ کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ادب قنوطیت کے ساتھ روحانی جذبہ بھی نہایت شدت سے بیدار ہے۔ لیکن جب وقت کا یہ خلفشار دور ہو جائے گا۔ اور زمانہ تکمیلِ انقلاب کے بعد اعتدال پر آجائے گا۔ اس وقت انسانیت روحانی قدروں پر دوبارہ غور کریگی اور ایک بار پھر اسے مذہب کی طرف لوٹ کر آنا پڑیگا۔ جیسے موجودہ جنگ کی کلبیت نے روس میں حقیقت کو بے نقاب کرکے "مذہبی آزادی" کا اعلان کرا دیا ہے ——— اس وقت بھی اگر مذہب کی صحیح اقدار اور اس کی دیرینہ شکل لوگوں کے سامنے پیش کی جائے تو انہیں خود ہی اپنی غلط روی کا احساس ہو جائے گا۔ لیکن اس کے لئے خلافتِ راشدہ کا ماحول اور اس زمانے کے سادہ حقائق پیش کرنے پڑیں گے۔ جو تاویلات نام نہاد قصوں، قوالیوں اور بے شمار ڈھکوسلوں سے پاک ہیں۔ لیکن ابھی اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی ———؟

علامہ اقبال نے یقیناً ہماری غلط روی سے ہمیں آگاہ کیا اور عہد سلف کی یاد تازہ کرکے نئے ادب میں بھی ایک روح پھونک دی۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہم جدید ادب کی صرف ان "ترقی پسند برائیوں" کو چن لیتے ہیں جو کفر و الحاد، عریانی و ناشائستگی اور بے ہودگی و شیطنت کا مرقع ہوتی ہیں۔ یوں تو دنیائے تسلیم سے آج تک یزداں و اہرمن میں دائمی جنگ رہی ہے۔ اور ہمیشہ مخلوقِ خداوندی دو گروہوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ اور ہر زمانے میں یساریوں (Leftists) کا ایک طبقہ ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ خود قدیم اردو شاعری کو دیکھئے، اس اعتراض سے قطع نظر کرکے یعنی اردو شاعری گل و بلبل، ناز و غمزہ اور دشنہ و خنجر تک محدود تھی۔ جس کا خود غالب کو شکوہ رہا۔ اگر آپ غور کریں تو غیر شعوری طور پر یہ یساری جذبہ ہر زمانے میں دبستانِ شاعری پر محسوس اور غیر محسوس طور پر مسلط رہا[2]۔

(باقی آئندہ)

[1] اگرچہ "ماورا" میں فراری ذہنیت کارفرما ہے اور تکنیک و افکار و خیالات کے اعتبار سے آنجناب مشہور اشتراکی ادیب ڈی ، ایچ ، لارنس سے بہت متاثر ہیں۔ لیکن "رقص گہ کے چور دروازوں" اور "بیرہ جسم" کی یاد سے فرار حاصل کر کے کی کوشش کرتے ہیں لیکن زندگی کا جذبہ غالب ہی آجاتا ہے جسکی مثالیں اس مضمون میں دی گئی ہیں۔ ا۔ح

[2] مضمون کی طوالت کے پیش نظر مثالیں اور حاشئے جبراً نظر انداز کر دیئے پڑے ہیں۔ ا۔ح

اگلے وقتوں کی باتیں

(از جناب پرنسپل مشتاق احمد صاحب زاہدی)

پہلے بھی اس ملک ہندستان میں راج کرتے تھے۔ ہم یعنی ہندو اور مسلمان۔ کہیں مسلمان راجہ کے پرجا تھے۔ اور کہیں ہندو مسلمان بادشاہ کی رعایا تھے۔ ہندو راج میں بہت سے عہدے مسلمان سرداروں کو بھی ملتے تھے اور مسلمان حکومت میں ہندو بھی نہ صرف جلیل القدر عہدوں پر مقرر ہوتے تھے بلکہ امراء کے زمرے میں بھی آجاتے تھے۔ سیاسی جنگ میں ہندو مسلمان خلط ملط ہوتے تھے۔ اور جب ہندستان پر باہر سے کوئی حملہ کرتا تھا تو خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو ہندو راجاؤں کے ساتھ مسلمان سردار بھی مل کر اُس کے مقابلے میں آڈٹتے تھے۔ اسی طرح ہندو سردار بھی مسلمان بادشاہوں کے مسلمان حملہ آوروں سے جا بھڑتے تھے۔ جیسے پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم لودی کی طرف سے مغلوں کے مقابلہ میں ہیمو سپہ سالار نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس سے پہلے جب بابر نے ہندستان پر چڑھائی کی تھی تو آگرے کے قریب بیانہ کے مقام پر رانا سانگا کے ساتھ میوات کے مسلمانوں کا سردار حسن خاں بھی اس جنگ میں جان توڑ کر لڑا۔ اس وقت کے مسلمان اور ہندو پولٹیکل مذہب نہ رکھتے تھے۔ جہاں مذہب کا اصلی معاملہ آجاتا تھا وہاں جان دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ سیاسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مذہب کی آڑ نہ لیتے تھے۔ مسلمان مسلمان تھے اور ہندو ہندو۔ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے تھے اور ایک دوسرے کے مذہب کا پورا پورا احترام کرتے تھے غرضکہ اُس زمانہ میں مشرقی یعنی ایشیائی تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا۔ اخلاق کی بنا مذہب پر تھی۔ یعنی خدا کے بنائے ہوئے قانون پر۔ اس لئے بڑے سے چھوٹے تک سب خوف خدا رکھتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست بادشاہ قہر الٰہی کے خوف سے کانپ اُٹھتے تھے۔ جرم اور گناہ میں فرق نہ تھا کیونکہ یہ بات دل میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ہمارے ہر کام کو خدا دیکھتا ہے اور اگر ہم نے کوئی جرم کیا اور اس دنیا میں پکڑے نہ گئے تو دوسری دنیا میں ہم سے مواخذہ ہوگا۔ رعایا بادشاہ کو ظل اللہ سمجھتی تھی۔ اور بادشاہ رعایا کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اور اُن کو کبھی دُکھ میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں نہ ایسا پیچیدہ قانون تھا۔ نہ قانون کو زیادہ پیچیدہ بنانے والے وکیل تھے

[illegible] مثلاً [illegible] کی جو کے پیچھے [illegible] مد پکڑ [illegible] بادشاہ کے انصاف [illegible] ان کو قرار واقعی سزا دی جاتی تھی [illegible]

(۱) سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں [illegible] نے ایک غریب کو کوڑوں سے اتنا پٹوایا کہ وہ مر گیا۔ متوفی کی بیوہ بادشاہ کے پاس فریادی ہوئی۔ ثبوت جرم کے بعد سلطان نے ملک [illegible] کو بھی [illegible] کروا دیا [illegible] مر گیا۔ اس کے بعد دوسروں کی عبرت کے لئے اس کی لاش بداؤں کے دروازے کے باہر لٹکوا دی گئی۔

(۲) اسی طرح شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں اس عہد کے ایک مشہور امیر خان عالم کے بھتیجے ہوشنگ نے ایک غریب کو مار ڈالا۔ بادشاہ نے خود مقدمے کی تحقیقات کی اور قاتل کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

(۳) جہانگیر کے اٹھارہویں سنہ جلوس میں لشکر شاہی چھاؤنی دکن میں عجیب فساد برپا ہوا۔ سید کبیر ایک بہادر شخص تھے۔ اُن کے بھائی شہزادہ پرویز کی فوج میں نوکر تھے۔ ان کا جھگڑا تلوار کے صیقل کرانے کے واسطے پر صیقل گر سے ہو گیا جس کی دوکان راجہ گردھر کچھواہا کے محل کے متصل تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سید نے صیقل گر کو لکڑی سے پیٹا۔ راجہ گردھر کے پہرہ داروں نے صیقل گر کی حمایت کی اور سید اور اُس کے نوکروں کو زدوکوب کیا۔ اتنے میں خبر ہونے پر سید کبیر تیس چالیس سوار لے کر موقع واردات پر آگئے۔ اُدھر راجہ گردھر کے راجپوت سپاہی محل سے باہر نکل آئے۔ اور دونوں میں خوب تلوار چلی۔ جب راجہ گردھر کو جو چوکے میں بیٹھے بھیم رہے تھے۔ خبر ہوئی تو اُنہوں نے کھانا چھوڑا اور اپنے سپاہیوں کو محل کے اندر بلا لیا۔ سید کبیر محل کے پھاٹک کو آگ لگا کر کسی طرح اندر محل میں مع سپاہیوں کے پہنچ گئے۔ اور وہاں پھر سیدوں اور راجپوتوں میں تلوار چلی۔ چار سید قتل ہوئے اور چھبیس راجپوت مارے گئے۔ مہابت خاں سپہ سالار کو جب یہ خبر ملی تو اُس نے حکمت عملی سے پہلے فریقین کا جوش ٹھنڈا کیا۔ پھر مقدمہ کی تحقیقات کر کے سید کبیر کو قتل کی سزا دی۔

(۴) شیر شاہ سوری کے عہد کا ایک ایسا عبرت ناک واقعہ ہے کہ جس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شیر شاہ کا بڑا بیٹا عادل خاں ہاتھی پر سوار ایک گلی میں سے گذر رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے مکان میں ایک بقال کی عورت برہنہ نہا رہی تھی۔ شہزادے نے ہاتھی پر سے اُسے دیکھا اور ایک پان کا بیڑا اُس کی طرف پھینکا۔ عورت پاکدامن تھی۔ خودکشی کیلئے تیار ہو گئی مگر اس کے خاوند نے اُسے اس حرکت سے باز رکھا۔ اور دوسرے دن پان کا بیڑا لے کر بادشاہ کے حضور فریادی ہوا۔

[illegible] کہ بادشاہ کا بیٹا [illegible]
[illegible] مظفر خان کی عورت اس کے سامنے کی گئی
[illegible] بہت عرض معروف
کی کہ بادشاہ [illegible] میں بادشاہ کا بیٹا اور ایک بقال سب برابر ہیں۔
اور بقال نے اسی طرح [illegible] سے انکار کیا تب معاملہ [illegible] ہوا۔

(۵) عالمگیر کے عہد کا ایک واقعہ ہے کہ بادشاہ کا بھتیجا گورنر تھا۔ اُس کے بیٹے نے ایک ہندو کی برات کو جاتے دیکھکر اپنے سپاہیوں سے دُلہن کا ڈولا اٹھوا منگایا۔ بادشاہ کو خفیہ پرچہ نویسوں نے اصل واقعہ کی اطلاع کر دی بادشاہ نے فوراً اپنے بھانجے کو قید میں ڈالدیا۔ لڑکے کی ماں روتی ہوئی بادشاہ کے پاس گئی۔ بادشاہ نے ملنے سے انکار کیا۔ بہن نے عرضی لکھی کہ بھانجے کو قید کر دیا۔ میرے صدمے کا خیال نہ کیا۔ میں اس کی جدائی میں زندہ نہ رہونگی۔ بادشاہ نے اپنے قلم سے عرضی پر حکم لکھا کہ مجرم کی رہائی نہیں ہو سکتی۔ اُس کی والدہ کو اگر جدائی کا صدمہ ہے تو اُن کو بھی اُن کے بیٹے کے پاس پہنچا دیا جائے۔ یہ پہلے زمانے کے انصاف تھے۔ اور یہ بادشاہوں کی عدل گستری۔ اب اس کو زمانہ جہالت کی سادگی کہیئے یا ایمانداری اور حق پرستی۔

مُسلمان بادشاہ ہندوستان میں خواہ ملک گیری کے خیال سے آئے یا جہاد کرنے کیلئے۔ لیکن جب ایک دفعہ لڑائی ختم ہوگئی اور ہندوستانی اُن کی رعایا بن گئے تو وہ بھی سب پہلی باتیں بھول گئے۔ اور کابل سے آئے یا ایران توران سے یہاں آکر تو ہندوستانی ہوگئے۔ یہیں شادی بیاہ کرنے لگے۔ یہیں کی بولی بولنے لگے۔ یہیں کے رسم و رواج اور لباس اختیار کرلئے۔ بس فقط ایک بات میں جُدا تھے یعنی مذہب میں۔ رعایا ہندو اور بادشاہ اور اس کے ہمراہی سردار مُسلمان۔ دونوں مذہبوں میں بڑا فرق یہ تھا کہ مُسلمان ایک خدا کے ماننے والے اور ہندو کئی دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے اور بُت پرست۔ لیکن جب ہر وقت کا ساتھ رہتا تھا اور کہیں کہیں آپس میں رشتے ناتے بھی ہوگئے تو مذہبی تعصب کہاں [illegible]۔ بادشاہ اور دوسرے لوگوں کو تو چھوڑو۔ اس وقت کے اسلامی پیشوایان دین اور علمائے شرع متین بھی ہندو مذہب کے متعلق نہایت فراخدلی اور غیر تعصبی سے اظہار خیال کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمتہ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اہل ہند کا مذہب کفار و مشرکین عرب کی طرح کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔ اور اگر اصلیت رکھتا ہے تو کیا دیگر ادیان کی طرح منسوخ ہو گیا ہے۔ تو انہوں نے دلائل پیش کرکے جواب دیا کہ اصل مذہب میں ایسا نظم نسق پایا جاتا ہے کہ وہ بھی مرتب لیکن منسوخ شدہ ہے۔ ہماری شریعت میں ادیان منسوخہ میں صرف یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے۔ دیگر ادیان منسوخہ کا نہیں۔ دین ہنود بھی انہیں میں سے ہے۔ ہمارے جناب خاتم الرسل سے پہلے ہر قوم میں ایک نبی بھیجا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی زمانہ ماضی میں رہنما اور پیغمبر بھیجے گئے ہیں جیسا کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اور جبکہ ہماری شریعت اکثر انبیا کے حال سے ساکت ہے تو ہم کو بھی ان لوگوں کے حق میں سکوت اختیار کرنا چاہیئے اور بے نص شرعی کسی کو کافر نہ کہنا چاہیئے۔ بُت پرستی کی حقیقت یہ ہے کفار عرب بتوں کو تصرف الٰہی کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن کو بلا واسطہ مؤثر اور متصرف خیال کرتے تھے۔ اور ان کو خدائے زمین اور خدا کو خدائے آسمان سمجھتے تھے اور یہ شرک ہے۔ مگر ہندو ایسا نہیں سمجھتے۔ بتوں کو سجدے کی رسم اُن میں بغرض عبودیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ سجدہ سجدہ تحیت ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں ماں باپ اور اُستاد اور گرو کے لئے بجائے سلام کے سجدہ معمول ہے۔ تناسخ کا اعتقاد رکھنا مستلزم کفر نہیں۔

اسی طرح اُس زمانہ کے فاضل اور مورخ علامی ابوالفضل و البیرونی وغیرہ نے ہندو دھرم کی خوبیاں اس طرح بیان کیں کہ موحد مُسلمانوں کے دل میں ان کی طرف سے نفرت نہ پیدا ہو۔ بلکہ رغبت ہو۔ مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی علیہ الرحمتہ جو بڑے پایہ کے محدث اور عالم تھے کسی نے کنھیاجی کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ بہتر تو یہ ہے کہ اُن کے حق میں چُپ رہنا چاہیئے۔ لیکن بھاگوت سے جو ہندوؤں کی معتبر کتاب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنھیاجی اولیا میں سے تھے۔ مولوی عبد العزیز صاحب لکھنوی مصنف بشارت احمدی نے اپنی کتاب میں مُسلمانوں کو نصیحت کی کہ اُن کو لازم ہے کہ راجہ رام چندر اور کنھیاجی وغیرہ جیسے بزرگوں کو بُرا کہنے سے توبہ کریں۔ البتہ جو ہندو اِن کو خدا سمجھکر پوجتے ہیں اُن سے دُور بھاگیں۔

اس زمانہ کے مُسلمان علماء نے بادشاہوں کو بھی ہندوؤں کے مذہبی فرائض ادا کرنے میں دخل اندازی کرنے سے ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر منع کیا۔ چنانچہ سکندر لودھی ایک دفعہ تھانیسر کے مشہور اشنان کے میلے کو بند کرنا چاہتا تھا تو میاں عبداللہ اجودھی نے جو بڑے مشہور عالم اور بزرگ تھے۔ بادشاہ کی مخالفت کی اور نہایت دلیری سے کہا کہ تیرتھ کو ویران کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ اور جس حوض یا دریا میں قدیم سے غسل ہوتا ہوا چلا آیا ہے اسکی ممانعت کرنا کسی طرح بادشاہ کے لئے روا نہیں۔ بادشاہ نے غصے سے خنجر نکال لیا اور کہا کہ تو کفار کی حمایت کرتا ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ شریعت کا حکم پیش کرنا میرا فرض ہے۔ ماننا نہ ماننا آپ کا کام ہے۔ اس پر بادشاہ اس خیال سے درگذرا۔

[illegible]

نومسلم نے ہندوؤں پر بہت سختیاں کیں اور بہت سے ہندو ملک بدر کر دیئے۔ سکندر کی وفات پر جب اس کا بیٹا زین العابدین تخت پر بیٹھا۔ تو اس نے [illegible] سے مشورہ کیا اور نومسلم وزیر کے عہد کے تمام احکام جو ہندوؤں کے خلاف تھے منسوخ کئے اور فرار شدہ ہندوؤں کو سفر خرچ بھیجکر واپس بلایا۔ انکو جاگیریں دیں۔ اور ان کے مندر جو گرا دیئے گئے تھے پھر تعمیر کرائے۔ اور مندروں کے متعلق جاگیریں وقف کیں۔ اور جن لوگوں کو نومسلم وزیر نے زبردستی مسلمان کیا تھا انکے لئے حکم دیا کہ جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں۔ اس سلطان نے بغرض تلافی جزیہ بھی معاف کر دیا۔ اور گاؤ کشی کی ممانعت کر دی۔ غرضیکہ فارسی تاریخوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان بادشاہوں نے اور عام مسلمانوں نے اہل ہند کے دل ہاتھ میں لینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بت پرستی کی طرف سے بھی چشم پوشی کی۔ اور اسی دلدہی اور فراخدلی کا یہ نتیجہ تھا کہ باوجودیکہ مسلمان غیر ملک سے آئے تھے اور غیر مذہب والے تھے پھر بھی دونوں آپس میں ایسے رل مل گئے تھے کہ بہت موقعوں پر یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ اور باانیہمہ اپنے اپنے مذہب پر دونوں قائم رہے۔ یعنی ادائے فرائض مذہب اور اپنے اپنے اعتقادات میں علیحدہ علیحدہ تھے۔ باقی ہر بات میں "من تو شدم تو من شدی" کا معاملہ تھا۔ مگر یہ اُن مسلمانوں اور ہندوؤں کا ذکر ہے جو خود مختار اور حکومت کے اہل تھے۔ اور جو ہندوستان کی لاتعداد دولت کے بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ نہ کہ اُن مسلمان اور ہندوؤں کا جو طوطے کی طرح "دریں چہ شک" کا سبق دہرانے بیٹھے ہیں اور "آنچہ استاد ازل گفت ہمیں میگویم" سے زیادہ لیاقت نہیں رکھتے۔

مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی حکومت راجپوتوں کے ہاتھ میں تھی۔ برہمنوں کے بعد چھتری قوم کی سب سے بڑی عزت تھی۔ اور راجپوت اصل نسل چھتری تھے۔ بڑے غیور اور شجاع۔ کبھی اپنی مونچھ نیچی نہ ہونے دیتے تھے تلوار کے سوائے بات نہ کرتے تھے۔ لڑائی پر جاتے تھے تو جوہر کرکے جاتے تھے۔ یعنی اپنی بیوی اور لڑکیوں کو مار جاتے تھے۔ کہ لڑائی پر سے تو زندہ واپس آنا نہیں پھر عورتوں کو دشمن کے ہاتھ پڑنے کیلئے کیوں زندہ چھوڑا جائے۔ مسلمانوں نے پہلے اس قوم پر اپنی بہادری اور فضیلت کا سکہ جمایا۔ اور فتحمند ہونے کے بعد اپنی فراخدلی۔ فیاضی اور مروت و خوش اخلاقی سے اس جنگجو قوم کو ایسا رام کیا کہ نہ صرف راجپوت مسلمان بادشاہوں کی طرفداری میں اُن کے دشمنوں کے

[illegible]

اور یہ [illegible] بات ہے کہ بہادر قوم [illegible] کرتی ہے۔ [illegible] ایسے ہوئے کہ راجپوت مغل راج کے حصہ دار بن گئے۔ [illegible] بھارا مل نے اکبر کے تعلقات اور فیاضی سے متاثر ہو کر [illegible] دی۔ اکبر نے بھی اس خاندان کو تباہی سے بچایا تھا۔ بھارا مل [illegible] کچھواہا راجپوت اور [illegible] گوت والوں کا سب سے بڑا سردار تھا۔ اور اس نے شیر شاہ سوری کے غلام حاجی خاں کے ساتھ مل کر مجنوں خاں قاقشال حاکم نارنول کو پہلے محصور کرلیا اور پھر اس پر رحم کرکے مجنوں خاں سے صلح کرا دی۔ مجنوں خاں نے بادشاہ اکبر سے بھارا مل کی بہت تعریف کی۔ چنانچہ اکبر نے راجہ کو دربار میں طلب کرکے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ جب راجہ رخصت ہونے لگا تو بادشاہ مست ہاتھی پر سوار تھے۔ اور یہ ہاتھی جھوم جھوم کر ادھر ادھر کی طرف جھکتے جھکتے راجہ کے راجپوت سواروں کی طرف بھی جھکا۔ اور لوگ تو ڈر کر بھاگ گئے مگر راجپوت نڈرپنے سے اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ اکبر کے دل میں یہ بات کھپ گئی۔ راجہ کی طرف متوجہ ہوکر ارشاد فرمایا: "ترا نہال خواہم کرد۔ عنقریب سے بینی کہ اعزاز و افتخارت زیادہ بر زیادہ میشود"۔ پانچ برس بعد مرزا شرف الدین حسین صوبیدار میوات نے آنبیر کو فتح کرلیا۔ راجہ بھارا مل بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپا۔ جب بادشاہ کو خبر پہنچی تو اجمیر شریف جاتے ہوئے سانگیر کے مقام پر راجہ کو شرف ملازمت عطا کیا۔ اور سلطنت مغلیہ کے سب سے بڑے منصب پنج ہزاری پر ممتاز کرکے آنبیر اسکی جاگیر میں بخش دیا۔ اس وقت تک پنج ہزاری سے بڑا منصب مقرر نہ ہوا تھا۔ اس شفقت اور مہربانی کا نتیجہ یہ تھا کہ راجہ نے خوشی خوشی یہ رشتہ منظور کرلیا۔ یہ لڑکی راجہ بھگوان داس کی بہن اور راجہ مان سنگھ کی پھوپی ہوئی اور اکبر مان سنگھ کا پھوپا ہوا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راجہ مان سنگھ اودے پور سے گذرا تو رانا پرتاپ نے بڑی دھوم دھام سے اس کا استقبال کیا۔ اور اودے پور ساگر جھیل کے کنارے ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو رانا نے سر کے درد کا بہانہ کرکے بیٹے کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ حاضری سے مجبور ہوں۔ مان سنگھ مطلب تاڑ گیا اور اس نے پیغام بھجوایا کہ آپ کا مرض میں سمجھ گیا۔ مگر یہ مرض لاعلاج ہے۔ پرتاپ نے جواب بھیجا کہ جس شخص نے بہن ترک کو بیاہ دی تو اس کے ساتھ کھانا بھی مکروہ [illegible]۔ راجہ مان سنگھ یہ جواب سنکر غصے سے کانپ گیا۔ چاول کے چند دانے [illegible] کو چڑھائے اور پھر اپنی پگڑی میں رکھ لئے۔ اور چلتے وقت کہا کہ تیری غیرت بچانے

[illegible] ترک کر دی۔ مگر [illegible] نظر [illegible] ہے۔ مان سنگھ [illegible] پرتاب بھی گیا۔ مان سنگھ نے [illegible] کہا۔ راجا جی اگر [illegible] تو میرا نام مان سنگھ نہیں۔ پرتاب نے [illegible] یہاں آتے جاتے رہنا۔" کسی بے ادب نے کہا "اپنے پھوپا کو بھی ساتھ [illegible]۔ مان سنگھ کے جانے کے بعد پرتاب نے جس زمین پر مان سنگھ بیٹھا تھا کھدوا ڈالا اور گنگا جل سے دھلوا کر پاک کیا۔ اور سب حاضرین نے نہا کر کپڑے بدلے اور اس طرح پوتر ہو گئے۔ یہ پرائیوٹ معاملہ ایک زبردست جنگ کا پیش خیمہ ہوا۔ جو مغل بادشاہوں اور پرتاب اور اسکی اولاد میں پشتوں تک ہوتی رہی اور جو بات مان سنگھ نے کہی تھی وہ سچ ہو گئی کہ رانا پرتاب کی زندگی اس کے بعد سے ہمیشہ خطرے میں رہی۔ گوہلدی گھاٹ کی خونریز جنگ سے پرتاب بھاگ کر اپنی جان بچا لے گیا۔ غرضیکہ اگلے وقتوں میں ہر قسم کے آدمی اور ہر طرح کے واقعات ہوتے تھے۔ راجہ بہاڑامل اور بھگوان داس جیسے راجپوت بھی ہوتے تھے جو زمانہ شناس اور صلح پسند تھے اور مصلحت وقت دیکھتے رہے اور پرتاب اور اودے سنگھ جیسے بھی راجپوت تھے جو آن کے آگے جان کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ میں دونوں کا نام اپنی اپنی جگہ سونے کے حرفوں میں لکھا گیا ہے۔ مغل بادشاہوں سے دوسرا رشتہ بہاڑامل کے بیٹے راجہ بھگوان داس نے اپنی بیٹی کو شہزادہ سلیم کے نکاح میں دیکر پیدا کیا۔ سلیم بادشاہ کا اکوتا بیٹا اور تخت و تاج کا وارث تھا۔ اس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک غیر مسلم عورت کے ساتھ نکاح کس طرح ہو سکتا ہے۔ مگر اس وقت اکبر کی بادشاہت تھی اور بادشاہ ظل اللہ ہوتا ہے۔ نکاح ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں مفصل نقشہ اس شادی کا پیش کرتے ہیں شہزادے کی عمر اس وقت ۱۶ برس کی تھی۔ بادشاہ مع امراء و قاضی و مفتی و شرفاء اسلام برات لیکر بھگوان داس کے گھر گئے۔ قاضی نے دو کروڑ تنگہ مہر پر عقد پڑھایا۔ ہندوؤں کی بھی کل رسوم مثل پھیرے، ہون وغیرہ عمل میں آئیں۔ راجہ نے کئی طویلے گھوڑے سو ہاتھی۔ صد ہا حبشی۔ جرکسی۔ ہندی لونڈی غلام اور بے شمار جواہرات سونے چاندی کے برتن اور مرصع آلات جہیز میں دیئے۔ اور امیروں کو ہر ایک کی حیثیت کے مطابق جوڑوں کے خلعت مع گھوڑوں اور سنہری رپہلی زینوں کے عطا کئے۔ علامہ ابوالفضل نے تہنیت میں اس طرح طبع آزمائی کی۔

دین و دنیا را مبارک باد کیں فرخندہ عقد
از برائے انتظام دنیا و دیں بستہ اند
دو نگارستان دولت نور چشم شاہ را
مجلہ چوں پیوہ باستے دیدہ رنگیں بستہ اند

فیضی نے یہ تاریخ لکھی:۔

زہے عقد دُر پاش سلطان سلیم
کہ پرتو دہد سال اُمید را
ز پیوستن آفتاب دوَل
قرانی شدہ ماہ و ناہید را

ابوالفضل کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شادی سیاسی و ملکی مصلحت کو مدنظر رکھکر کی گئی تھی۔ سلیم نے دلہن کو شاہ بیگم کا خطاب دیا اور انکے بطن سے خسرو اور سلطان النساء بیگم تولد ہوئے۔ شاہ بیگم افیم کھانے کی عادی تھیں۔ غالباً اس کی زیادتی سے دماغ میں خشکی زیادہ ہو گئی۔ اور جب خسرو باپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوا تو اس کے صدمے سے ایک دن حالت جنون میں شاہ بیگم نے اس قدر افیم کھائی کہ جانبر نہ ہو سکیں۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے "ازخیر تیکہ لازمہ طبیعت راجپوتانی است خاطر بمرگ خود قرار دادہ .... افیون بسیار در عین شوریدگی دماغ خوردہ و اندک زمانے درگذشت" تاریخ وفات ہوئی۔

چوں چرخ فلک زگردش خود آشفت
در زیر زمیں آئینہ مہ بہ نہفت
تاریخ وفات شاہ بیگم جستم
از غیب ملک بخلد شد بیگم۔ گفت

یہ تاریخ لوح مزار پر کندہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ شاہ بیگم مسلمان ہو گئی ہوں گی۔ جو اُن کی تجہیز و تکفین کی گئی۔ اور دفن کیا گیا۔ انسان کیا چاہتا ہے اور قدرت کیا چاہتی ہے اور آخر میں قدرت ہی جیتتی ہے۔ خاندان کچھوا ہا دلی کی سلطنت اپنے خاندان میں لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مان سنگھ نے خسرو کو جہانگیر کا جانشین کرنے کیلئے کیا کچھ نہ کیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا تخت کا وارث نہ خسرو ہوا نہ پرویز۔ جس کو نورجہاں چاہتی تھی بلکہ خرم ہوا جسکی ماں جودہ بائی جودھپور کے راجپوت خاندان راٹھور سے تھی۔ اس راج کنواری کا نام مان متی تھا اور وہ جگت گسائیں کے نام سے بھی مشہور تھی۔ چونکہ یہ بیگم جودھپور کی تھیں اس لئے محل میں جودہ بائی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ شادی بھگوان داس کی بیٹی کی شادی سے ایک سال بعد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ یہ بیگم بہت شیریں کلام اور حاضر جواب تھیں۔ چنانچہ نورجہاں جیسی لائق اور خوش بیان بیگم سے ان کا مقابلہ رہتا تھا۔ اس نوک جھونک کا ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک دن

[illegible] بھی ہوئی تھی۔ نورجہاں سفید براق لباس زیب تن کئے بادشاہ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ عطر جہانگیری سے لباس و در و دیوار پر ڈالا گیا تھا [illegible] معطر ہو رہا تھا۔ کہ جہانگیر نے جودھا بائی کو بلا لیا۔ جودھا بائی سرخ لباس پہنے [illegible] کہ جہانگیر کے پہلو میں دوسری طرف بیٹھ گئی۔ بادشاہ اُس سے باتوں میں مشغول ہوئے تو نورجہاں کو رشک پیدا ہوا چنانچہ نورا اُس نے جودھا بائی پر چوٹ کی۔ کہنے لگی "تعجب ہے زمیندار کی بیٹی۔ اِس وقت سرخ لباس کا کیا موقع تھا۔ ہر طرف جلوہ مہتاب ہویدا ہے۔ چاروں طرف نور کی بارش ہو رہی ہے۔ فرش نسترین و نسترن بچھا ہوا ہے۔ ایسے ماحول میں سرخ لباس کس قدر بے موزوں ہے"۔ جودھا بائی نے فوراً جواب دیا کہ موزونیت اس طرح ہے کہ تیرا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ اور میرا سہاگ قائم ہے۔ اور فوراً ہی یہ دوہا پڑھا ؎

چاروں نار تانس کا ہتیا
ایک چھوڑ جن دوجا کیا

یہ اشارہ نورجہاں کی پہلی شادی کی طرف تھا (یہ لطیفہ بہت عام ہو گیا ہے۔ مگر اسکا درج کرنا اس طرح قابل معافی ہے کہ اس قسم کی چیزیں قند مکرر کا کام دیتی ہیں حقیقت میں اس مقالے میں جس قدر بیانات ہیں سب تاریخوں میں بیان ہو چکے ہیں اور اکثر ناظرین کی نظر سے گذر چکے ہونگے۔ مگر یہ واقعات ایسے ہیں کہ ان کا بار بار ذکر ہونا خالی از دلچسپی و مفاد نہیں ہے) کچھواہا راجپوتوں کی دیکھا دیکھی اور راجپوتوں نے بھی اپنی بیٹیاں محل میں داخل کیں۔ مثلاً رائے کلیان مل بیکانیری نے جو راٹھور خاندان سے تھا اپنی بھتیجی کی شادی اکبر سے کر دی اور جیسلمیر کے راجہ بھیم نے اپنی لڑکی کی شادی سلیم سے کر دی۔ سلیم نے اس بیگم کو ملکۂ جہاں کا خطاب دیا۔ جہانگیر نے سنہ جلوس میں کنور جگت سنگھ کچھواہا ولد راجہ مان سنگھ کی بیٹی سے بڑی دھوم دھام سے ایک اور شادی رچائی۔ اسی ہزار روپیہ بادشاہ نے مان سنگھ کے پاس ساچق کا بھیجا۔ مجلس عقد مریم زمانی والدہ سلیم کے دولتخانے پر منعقد ہوئی۔ راجہ نے ساٹھ ہاتھی اور لاکھوں روپے کے زیورات، مرصع آلات و زر نقد جہیز میں دیا۔ سلیم کے محل میں اتنی راجپوت رانیاں تھیں کہ اگر اسے راجستھان کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس آخری شادی کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ مان سنگھ کے تعلقات جہانگیر سے اچھے نہ تھے۔ چنانچہ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ (ترجمہ) راجہ مان سنگھ بھی خان اعظم کی طرح منافقوں اور اس سلطنت کے پرانے پاپیوں میں سے ہے۔ جو انہوں نے مجھ سے کیا اور مجھ سے ان کے ساتھ ہوا خدا ہی خوب جانتا ہے۔ کہ کوئی کسی سے اس طرح گذارہ نہیں کر سکتا۔ راجہ نے سو ہاتھی [illegible] بھی گذرانے۔ ایک بھی اس قابل نہ تھا کہ فیلخانہ خاصہ میں داخل ہو سکے۔ چونکہ یہ [illegible]

[illegible] پر نہیں لایا اور [illegible] [illegible] دیکھتی ہے کہ مان سنگھ نزدیک تر ہو جائے اور سر نہ اٹھا سکے

مان سنگھ سے جہانگیر کی ناراضی کی اصل وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کا بیٹا خسرو مان سنگھ کا بھانجا اور خان اعظم کا داماد تھا۔ چنانچہ مان سنگھ اور خان اعظم دونوں اس کوشش میں رہتے تھے کہ اکبر کا دل جہانگیر سے پھر جائے تو خسرو کو ولیعہد کرا دیا جائے۔ مگر اکبر کو جہانگیر سے عشق تھا چنانچہ مرتے وقت مان سنگھ اور خان اعظم دونوں کو دلی سے چلتا کر دیا کہ مبادا میرے مرنے کے بعد یہ دونوں زبردست امیر اپنی فوج کی مدد سے قلعہ پر قبضہ نہ کر لیں اور جہانگیر کو قید کر کے خسرو کو تخت نشین کرا دیں۔ مان سنگھ نے اکبر کا حکم مان لیا اور فوراً مع خسرو کے بنگالہ چلا گیا۔ اور اکبر کے مرنے پر جہانگیر بخیریت سے تخت نشین ہو گیا۔ تخت نشین ہونے پر جہانگیر نے مان سنگھ کو دربار میں بلایا۔ خلعت چارقب۔ شمشیر مرصع۔ اسپ خاصہ با زین زرین مرحمت فرمایا اور اسکو بنگالہ کی حکومت پر بدستور سابق سرفراز کیا۔ اور پچھلی باتوں کو دل سے بھلا دیا۔ مگر جب چند ماہ بعد خسرو نے بغاوت کی تو جہانگیر کو مان سنگھ اور خان اعظم کی طرف سے شبہ ہوا۔ راجہ مان سنگھ کی نسبت مشہور ہے کہ انکی پندرہ سو رانیاں تھیں اور جب شہر گیاس ہوئے تو ساٹھ رانیوں نے ستی ہو کر حق رفاقت ادا کیا۔

اگلے وقتوں کے بادشاہوں کی فراخدلی اور دریا دلی ایسی تھی کہ اب اسکی مثال ملنی ناممکن ہے۔ جہانگیر ہی کا ذکر ہے کہ اکبر نے مان سنگھ کی ماتحتی میں یلغار پرتاب کے ملک کو فتح کرنے کیلئے بھیجی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چتوڑ اور رنتھمبور کے قلعے مغلوں کے ہاتھ آئے اور پرتاپ شکست کھا کر پہاڑوں میں جا چھپا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا امر سنگھ جانشین ہوا۔ اسکی سرکوبی کیلئے جہانگیر نے شہزادہ خورم کو بھیجا امر سنگھ شاہی افواج کا مقابلہ نہ کر سکا اور شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کی اور گرانبہا تحفے بطور پیشکش نذر کئے شہزادے نے انکے بیٹے کرن کو دربار شاہی میں حاضری کیلئے روانہ کیا۔ جہاں پہنچکر بادشاہ کو اس نے سجدہ کیا۔ بادشاہ نے اسے خلعت پہنا کر دست راست کے امراء کے زمرے میں شامل کیا۔ اپنی تزک میں جہانگیر رانا کرن والئی اودے پور کے بیٹے کی نسبت لکھتا ہے "ایسے وحشی کے رام کرنے کیلئے میں نے ہر روز اسے نئی نئی نوازشوں سے سرفراز کرنا چاہا۔ چنانچہ دوسرے دن خنجر مرصع اور تیسرے دن عراقی گھوڑا [illegible] اپنی طرف سے اور خلعت فاخرہ اور شمشیر مرصع اور اسپ [illegible]

مرحمت فرمایا جس کے بعد نہایت قیمتی مروارید کی تسبیح ۔ تین بار تین جڑے ۔ ایک قبضہ خنجر ایک بکتر ایک جوشن ۔ دو انگوٹھیاں جن میں سے ایک میں لعل اور دوسری میں ہیرا لگا ہوا تھا مرحمت فرمائے ۔ اور آخر میں ہر قسم کی خوشبوئیں ۔ طرح طرح کے کپڑے ۔ بہت سے طلائی برتن ایک سو تھالوں میں لگا کر دربار میں منگوائے اور سو دو پیل گجراتی کے کرن کو مرحمت فرمائے ؛ غرضکہ ان نوازشات شاہی کے بعد کرن کو واپس اس کے وطن روانہ کیا اور منصب پنج ہزاری ذات اور سوار پر سرفراز کیا ۔ ناظرین کو یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ یہ سلوک اُس دشمن کے پوتے سے ہو رہا ہے جس سے برسوں خونریز لڑائیاں رہیں ۔

مان سنگھ اس معاملہ میں بہت خوش نصیب رہا ہے ۔ اس سے قبل اکبر کے عہد میں جب محمد حکیم مرزا نے کابل میں بغاوت کی تو اکبر نے راجہ مان سنگھ کو بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجا ۔ اور خود بعد میں کابل کی طرف روانہ ہوا ۔ ابھی اکبر راولپنڈی کے مقام پر پہنچا تھا کہ مان سنگھ کابل میں امن وامان قائم کرکے اپنے بیٹے جگت سنگھ کو وہیں جگہ چھوڑ کر واپس آ گیا ۔ اور اکبر کی قدمبوسی حاصل کی ۔ بادشاہ نے خلعتوں اور جاگیروں کے علاوہ چھپن لاکھ چھیاسٹھ ہزار روپیہ انعام میں دیا ۔

فی زمانہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑی ترقی کر لی ہے اور اگلے وقتوں کے مقابلے میں اب ہندوستان بہت دولتمند ملک ہو گیا ہے ۔ اور ہم پہلے سے بہت زیادہ خوشحال ہیں ۔ تاجروں کا حال معلوم نہیں ۔ لیکن جب اگلے وقتوں کی دولت کا اندازہ کیا جاتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ وہ سب دولت زیادہ تر ہندوستان ہی میں خرچ ہوتی تھی ، تو یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ تاجر بھی اس زمانے میں اب کے مقابلے میں زیادہ امیر ہونگے مگر شاہی عہدیداروں کی تنخواہوں کا جب اندازہ کیا جاتا ہے اور اُس وقت کے روپے کی قیمت کا اس وقت کے روپے کی قیمت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اور جب میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ مثلاً اس وقت ہندوستان میں زیادہ سے تنخواہ وائسرائے کی ہے اس کے بعد گورنروں کی ۔ وائسرائے کو پچیس ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں اور گورنروں کو دس دس ہزار روپے ماہوار ۔ اُس کے مقابلے میں مغل بادشاہوں کے عہد میں وائسرائے اور گورنر کا کام امراء کرتے تھے ۔ ان امراء کے عہدے کو منصب کہتے تھے ۔ ان میں بھی تین مدارج ہوتے تھے ۔ ہشت ہزاری اور نہ ہزاری کی تنخواہوں کا پتہ نہیں چلتا ۔ مگر باقی منصبوں کی درجہ اوّل کی تنخواہیں ماہوار حسب ذیل تھیں ۔

ہفت ہزاری پینتالیس ہزار روپیہ ماہوار ۔ پنج ہزاری تیس ہزار روپیہ ماہوار چہار ہزاری و پانصد چھبیس ہزار روپیہ ۔ چہار ہزاری بائیس ہزار ۔ سہ ہزاری و پانصد انیس ہزار ۔ سہ ہزاری سترہ ہزار روپیہ ۔ دو ہزار و پانصد چودہ ہزار ۔ دو ہزاری بارہ ہزار یک ہزاری و پانصد دس ہزار ۔ ہزاری آٹھ ہزار دو سو ۔ نہ صدی سات ہزار سات سو ۔ ہشت صدی پانچ ہزار ۔ ہفت صدی چار ہزار ۔ شش صدی ساڑھے تین ہزار ۔ پانصدی دو ہزار آٹھ سو ۔ حتی کہ دو صدی کی نو سو پچھتر روپیہ ماہوار تنخواہ تھی ۔ اور سب سے ادنےٰ منصب یوزباشی کہلاتا تھا جسکی تنخواہ سات سو روپیہ ماہوار ہوتی تھی ۔ ان تنخواہوں کا آج کل کی ترقی یافتہ زمانے کی تنخواہوں سے مقابلہ کیا جائے تو ہنسی آتی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان تنخواہوں کے ساتھ ایک بڑے عملے کا بھی خرچ تھا مثلاً ہفت ہزاری کو چھ قسم کے گھوڑے ذیل کی تعداد میں رکھنے لازمی تھے ۔ عراقی ۴۹ مجنس ۴۹ ۔ ترکی ۹۸ ۔ یابو ۹ ۔ تازی ۹۸ ۔ جنگلہ ۹۸ ۔ کل ۹۰۴ گھوڑے ۔ اسی طرح مختلف اقسام کے ۱۴۰ ہاتھی ۔ ۱۱۰ اونٹ ۔ ۲۷ خچر اور ۲۲۰ عرابہ یعنی ایک قسم کی گاڑی رکھنی پڑتی تھی ۔ یوزباشی کو صرف ۔ ۸ گھوڑے تین ہاتھی دو اونٹ اور پانچ عرابے رکھنے پڑتے تھے ۔ مگر یہ یاد رہے کہ فوج کی تنخواہ جو منصب دار کو رکھنی پڑتی تھی خزانہ شاہی سے علیحدہ ملتی تھی ۔ سوار کی تنخواہ بارہ روپے سے تیس روپے ماہوار تک تھی ۔ پیدل کی چھ روپے سے ساڑھے بارہ روپے تک ۔ چارپائے کا نصف خرچ خزانہ شاہی سے ملتا تھا ۔ اکبر کے عہد تک پنج ہزاری یعنی پانچ ہزار سواروں کا افسر تک کا منصب تھا صرف راجہ مان سنگھ کو بطور خاص ہفت ہزاری کا منصب عطا ہوا تھا ۔ شاہجہاں کے عہد میں یمین الدولہ آصف خاں خانخاناں کو بطور خاص منصب نہ ہزاری حاصل ہوا ۔ مگر عام طور پر اس عہد میں منصب پنج ہزاری سے زیادہ کوئی امیر نہ بڑھا ۔ آخر دور میں مرزا راجہ جے سنگھ اور مہاراجہ جسونت سنگھ کو ہفت ہزاری کا منصب ملا ۔ قابل غور امر یہ ہے کہ مسلمانوں کا راج ہے اور آصف خاں کے سوائے اعلیٰ ترین منصب ہندو راجاؤں کو دیئے گئے ۔ اس کی وجہ ان کی خدمتگذاری ہو یا رشتہ داری مگر اس سے یہ ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں تعصب ایسا نہ تھا جیسا اب ہے اور ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات دوستانہ تھے ۔ ایک دوسرے پر بھروسہ تھا ۔ اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ امراء کے زمرے میں کس کس منصب پر کتنے ہندو تھے ذیل کا نقشہ ملاحظہ ہو ۔

	ہفت ہزاری	شش ہزاری	پنج ہزاری	چہار ہزاری	میزان	سہ ہزاری سے ہزاری تک کل تعداد ہندو منصب داران کی
عہد اکبر	۱	۰	۴	۴	۹	۱۶
عہد جہانگیر	۱	۰	۸	۷	۱۶	۳۸
عہد شاہجہاں	۲	۰	۱۱	۸	۲۱	۹۱
عہد عالمگیر	۳	۲	۹	۴	۱۸	۴۹

(باقی آئندہ)

؎ ماخوذ از امرائے ہنود مولفہ منشی سید احمد صاحب

میری زندگی کے چند موڑ

(از واحدی)

ہر شخص کو ایسے واقعات پیش آیا کرتے ہیں جو چلتے چلتے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا کرتے ہیں۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ انگریزی میں ایسے واقعات غالباً ٹرننگ پوائنٹس کہلاتے ہیں۔ ایسے واقعات سبق آموز تو ہوتے ہی ہیں۔ اوروں کے لئے نہیں تو اُس کیلئے جس کی زندگی میں ان کی وجہ سے تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن اوروں کے لئے دلچسپ ضرور ہوتے ہیں۔ یہی سمجھکر میں اپنی زندگی کے چند انقلابی واقعات پیش کر رہا ہوں آج میرے دماغ میں دوسرا کوئی مضمون نہ تھا۔ میں نے سوچا یہی لکھ ڈالوں۔

۷ مئی ۱۸۸۸ء میری پیدائش کی تاریخ ہے۔ میرا خاندان ملازمت پیشہ ہے۔ دلّی (شاہجہان آباد) کے بسنے کے وقت سے ہم لوگ دلّی میں بستے ہیں۔ شاہجہاں اور شاہجہاں کی اولاد کے زمانہ میں بھی ہم نے ہمیشہ ملازمت کی۔ اور انگریزوں کا تسلط ہو جانے کے بعد بھی ہمارے نزدیک ملازمت بڑا معزز پیشہ ہے اب تو شاید نہیں، مگر میرے بچپن تک، میرا خاندان کیا، سارا دلّی تاجر کو کچھ احترام کی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ اپنے خاندان میں میں پہلا شخص ہوں جس نے ملازمت سے بغاوت کی۔ کس طرح ملازمت سے میری طبیعت پھری۔ یہی سنانا چاہتا ہوں۔

میرے والد محکمہ نہر میں اسسٹنٹ انجنیر تھے ۱۸۹۰ء سے پہلے کی بات ہے۔ کیونکہ ۱۸۹۸ء تک میں والد مرحوم کے ساتھ دلّی سے باہر رہا۔ اور ۱۸۹۸ء میں مجھے پڑھنے لکھنے کے خیال سے دلّی چھوڑ دیا گیا تھا۔ میری عمر دس یا دس سے کم ہوگی۔ ضلع متھرا میں کوسی ایک جگہ ہے، وہاں والد کی تعیناتی تھی۔ ایک دن میں نے اپنی قیام گاہ کی چھت پر سے دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار ہے اور میرے والد اس کے ساتھ پیدل چل رہے ہیں۔ ہمارے ہاں گھوڑے گھوڑیوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن وہ انگریز اتنا بڑا افسر تھا کہ اس زمانہ میں اتنے بڑے افسر کے سامنے ماتحت گھوڑوں پر نہ چڑھ سکتے ہونگے۔ یا ممکن ہے گھوڑے سے اُتر کر چلنے کا باعث کچھ اور ہو۔ بہر حال مجھے انگریز کا گھوڑے پر سوار ہونا اور اپنے باپ کا انگریز کے ساتھ ساتھ پیدل چلنا ناگوار گزرا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے ابا نوکر نہ ہوتے تو

آئیں یہ ذلت اٹھانی نہ پڑتی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں کبھی نوکری نہیں کیا کرونگا۔ یہ اس وقت میں نہیں جانتا تھا۔

میرے والد نے پانچویں چھٹی جماعت تک پڑھا تھا۔ اس طرح کہ میرے دادا نے چھپ کر ایک انگریزی مدرسہ میں داخل ہوگئے تھے۔ میرے دادا اس زمانے کے تمام مسلمانوں کی مانند انگریزی پڑھنے اور عیسائی ہو جانے کو یکساں سمجھتے تھے۔ میرے والد کو اپنی تعلیم کے ناقص رہ جانے کا قلق تھا اور وہ چاہتے تھے کہ میں اس نقص کی تلافی کروں۔ انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کا ایک لمبا پروگرام بنایا تھا۔ مگر اور جو خیالیم ذلک درجہ خیال۔ میں دلّی کے سب سے اچھے سکول سینٹ سٹیفنز مشن ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میری تعلیمی رفتار بہت ٹھیک تھی۔ شامت اعمال اس سکول میں ایک استاد بالکل بندر کی شکل کے تھے۔ بچوں نے انکا نام بندر ہی رکھ دیا تھا۔ البتہ یہ نام ماسٹر صاحب کے پیچھے لیا جاتا تھا۔ مجھے جو حماقت سوجھی میں نے ماسٹر صاحب کے منہ پر بندر کہہ دیا۔ کہنے کو تو کہہ گیا۔ مگر پھر اس سکول میں ٹھہرنے کی ہمت نہ پڑی۔ سارٹیفکیٹ لے اینگلو عربک ہائی سکول میں جا داخل ہوا۔ یہاں کی فضا مجھے سازگار نہ آئی۔ گرتا پڑتا انٹرنس تک پہنچا۔ لیکن انٹرنس پاس نہ کر سکا۔ صرف ایک لفظ "بندر" کے نامناسب استعمال سے میری اعلیٰ تعلیم رہ گئی۔ سینٹ سٹیفنز مشن ہائی سکول سے میں نہ نکلتا تو میرے باپ میری اعلیٰ تعلیم کی حسرت لیکر دنیا سے رخصت نہ ہوتے۔ مجھ میں تعلیم حاصل کرنے کی ہر صلاحیت موجود تھی۔ محض فضا کے بدلنے سے میرا تعلیمی پروگرام درہم برہم ہوگیا۔

میں نے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ حضرت خواجہ حسن نظامی نہ ملتے تو آپ مجھے ڈاکخانہ کے آگے اُجرت لے لیکر چٹھیاں اور منی آرڈر لکھتے دیکھتے۔ آج یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ استاد کو بندر نہ کہتا اور سینٹ سٹیفنز مشن ہائی سکول ہی میں پڑھتا رہتا تو یا اپنے دوست مسٹر آصف علی کے ساتھ کانگریس ہائی کمانڈ کا ممبر ہوتا اور ان سب کے ساتھ جیل میں ہوتا۔ یا آصف علی کے دوست سر سلیمان مرحوم سے پہلے فیڈرل کورٹ کی ججی حاصل کرتا اور پھر حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے قبرستان میں جا کر سوتا۔ سوؤں گا انشاء اللہ اب بھی۔

اینگلو عربک ہائی سکول میں داخل ہونے کے بعد میری طبیعت درسی کتابوں سے آہستہ آہستہ ہٹتی گئی اور حالی۔ آزاد۔ سر سید۔ نذیر احمد۔ شبلی وغیرہ کی تصنیفات سے لگتی گئی۔ دسویں جماعت میں تھا کہ میں نے اخبارات و رسائل میں لکھنا شروع کیا۔ اتفاق ہے کہ ایک کے سوا میرے کسی مضمون کا انتخاب و

رسائل نے پہلے سے انکار نہیں کیا۔ اس سے ہمت بڑھی اور پڑھنے کی بجائے لکھنا چھٹ گیا۔ میرے پھوپی زاد بھائی قاری سرفراز حسین صاحب عزمی ایک دفعہ میڈل پر مجھے سکول تشریف لے گئے تو سکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی فضل الدین صاحب نے فرمایا "یہ آوارہ ہوگئے ہیں"۔ میں اس فقرہ سے ششدر رہ گیا۔ کیونکہ آوارگی کی سعادت مجھے ساری عمر میسر نہیں آئی۔ خیر مولوی صاحب نے فوراً اپنے فقرہ کو واضح کر دیا کہ "انہیں اخباروں رسالوں میں لکھنے کا بہت شوق ہوگیا ہے"۔ لکھنے کے شوق میں نمایاں اور ممتاز ہونے کا شوق پوشیدہ تھا۔ سکول میں دو چار تقریر کرنے والے جو تھے ان میں بھی میرا شمار تھا۔ شمار کیا، میں چھایا ہوا تھا۔ یہی شوق میرے اور حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے تعلقات اور ازدیاد تعلقات کا باعث بنا۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم جو اس وقت دلی میں لیڈر گر تھے خواجہ صاحب کے ساتھ اُن کے ہاں بھی جانا آنا شروع کیا۔ اور نمایاں اور "ممتاز" ہونے کی خواہش زور پکڑنے لگی۔ دلی میں اب تو جتنے ڈاکٹر ہیں اتنے لیڈر ہیں لیکن سنہ ۱۹۱۰ء تک دو گھر تھے ایک حکیم اجمل خاں کا۔ اور ایک حکیم رضی الدین کا۔ جو ان گھروں کے طواف کرتا تھا لیڈر بن جاتا تھا۔ پھر بھی ایسے لیڈروں کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں تھی۔

میں نے نثر لکھنے سے پہلے نظم لکھنی شروع کی تھی۔ اور خدا کی شان ہے میری ایک غزل مولانا راسخ نے اپنے رسالہ میں چھاپ دی تھی۔ خادم میرا تخلص تھا۔ جو خوشی مجھے اس غزل کے چھپنے سے ہوئی تھی وہی خوشی مجھے جب ہوئی جب پہلی دفعہ حکیم اجمل خاں صاحب کا اس قسم کا بلاوا میرے نام آیا کہ سر آغا خاں مسلم یونیورسٹی کے چندہ کے سلسلہ میں دورہ کرتے ہوئے دہلی سے گزر رہے ہیں ان کی ملاقات کے لئے سٹیشن پر آیئے۔

چنانچہ میں اپنے آپ کو لیڈر تصور کرتا سٹیشن خوشی خوشی جا پہنچا۔ سر آغا خاں تشریف لائے۔ یعنی سر آغا خاں کی ٹرین تشریف لائی۔ مولانا شوکت علی سر آغا خاں کے سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ ٹرین سے اُترے۔ مگر سر آغا خاں نے اُس وقت تک درشن نہیں دیئے جب تک ٹرین کی روانگی کا وقت نہ ہوگیا۔ اُن کے باہر نہ آنے سے میں نے جانا کہ اجمل خاں سب سے بڑے آدمی نہیں ہیں۔ اجمل خاں کے ساتھ حیدرآباد کے مولوی عزیز مرزا (آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے سکریٹری) بھی تھے۔ اور دلی کے پانچ چھ آدھے نیچے لیڈر تھے سب کی آؤ بھگت میری نگاہ میں نیچائی سے بدل گئی۔ اور میرا تو خاتمہ ہی ہوگیا بالکل تنت کے سے سر آغا خاں نمودار ہوئے اور انہوں نے فقط حکیم اجمل خاں سے ہاتھ ملایا۔ اور چھوٹتے ہی کہا۔ "پانیئر" چاہیئے۔ "پانیئر" اُس زمانہ کا بڑا مشہور اخبار تھا اور چار آنے فی پرچہ اس کی قیمت تھی۔ حکیم صاحب نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو صرف دیکھا۔ اور خواجہ صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور میں بک سٹال کی طرف دوڑا اور چار آنے خرچ کرکے "پانیئر" لایا اور خواجہ صاحب کی نذر کر دیا۔ خواجہ صاحب نے حکیم صاحب کو پہنچایا اور حکیم صاحب نے سر آغا خاں کو۔ اور سر آغا خاں "پانیئر" ہاتھ میں آتے ہی یہ جا وہ جا

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم کہ بہار آخر شد

کاش سر آغا خاں مجھ سے براہ راست فرماتے کہ پانیئر چاہیئے۔ یا کم از کم میں اُن کی خدمت میں پانیئر براہ راست پیش کر سکتا۔ میرے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا کہ چونی بھی کھوئی اور آغا خاں کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکا۔ میرے دل پر یہ اثر ہوا کہ جس طرح روپے کو خطرہ میں ڈالے بغیر روپیہ نہیں کمایا جا سکتا۔ اسی طرح عزت بھی عزت کو خطرہ میں ڈالے بغیر نہیں پیدا کی جا سکتی۔ مجھے لیڈر پیشگی حقیر معلوم ہونے لگی۔ میں نے لیڈر بننے سے توبہ کی۔ حکیم صاحب سے میرے تعلقات رہے۔ لیکن کاروباری، لیڈرانہ نہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے اخبار طبیب نکلوایا اور وہ مجھ پر مرتے دم تک مہربان رہے۔ لیکن میری لیڈری اُن کے مرنے سے بہت پہلے مرگئی۔

(باقی آئندہ بہت کچھ لکھنا ہے بشرطیکہ آپ یہ نہ کہیں کہ کاغذ کی مہنگائی کے زمانہ میں کاغذ کو خواہ مخواہ کالا کیوں کیا۔ میں نے نوکری سے نفرت کا ذکر کرکے مضمون شروع کیا ہے۔ نوکری سے نفرت ہی پر مضمون ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے پنشن لینے کی عمر میں ایک نوکری کرلی ہے۔ اس نوکری تک کے موڑ میرے سامنے ہیں۔ یہ نوکری مجھے کدھر موڑے گی۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہے)

(سلسلہ کیلئے ادبِ لطیف بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء ملاحظہ فرمائیے)

اوراقِ پریشاں

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ)

۸ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

آج شاہدہ جمالی کا خط لیکر آئی۔ یہ ۸ صفحے کا طویل خط ہم دونوں نے کمرہ بند کرکے پڑھا۔ خط دوپہر کی ڈاک سے شاہدہ کو ملا۔ جمالی نے بہت التجا آمیز انداز میں شاہدہ سے درخواست کی ہے۔ کسی نہ کسی طرح جمالی کی گستاخی کو میں معاف کر دوں۔

شاہدہ خود کیا کم بلا ہے۔ اُس پر تازیانہ یہ خط ہوا۔ خوشامدیں بھی کیں۔ رُوٹھی بھی۔ گالیاں بھی سنائیں۔ گلے میں ہاتھ بھی ڈالے۔ اس کی دلربایانہ ادائیں اُف خدا کی پناہ! اس کا نرہ سے کون جیت سکتا ہے۔ جب تک اُس نے مجھ سے معافی کا اقرار نہ لے لیا نہ ٹلی۔ اور چلتے چلتے شرارت بھرے لہجے میں کہتی گئی۔ تو تو بد دماغ ہے۔ میں ہوتی تیری جگہ تو خوشی سے دیوانی ہو جاتی۔ مفت میں تیری شان میں یہ نظمیں روز ہوتی ہیں۔ اری کم بخت ادب میں ایک گرانقدر اضافہ تیری بدولت ہو رہا ہے۔ اور تو ہے کہ تیرا مزاج ہی نہیں ملتا۔ وہ موا بھی بد دماغ ہے۔ نگوڑے کو کوئی لڑکی نہ ملی سوائے اس مزاج دار کے۔ ہائے وہ اسی کے کاکل پریشاں اور رنگین شاعری! شاہدہ کی بے تکی ہانک کا جواب نہ دینا ہی بہتر تھا۔ جتنی میں اُس سے محبت کرتی ہوں اتنا ہی ڈرتی ہوں۔ یہ کالہ آفت ہے۔

۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

یہ تین روز بڑی بھابی اور بھابی جان کے جانے کے باعث بہت مصروف گذرے۔ وہ دونوں کل شب کو سدھارے۔ گھر میں سناٹا ہو گیا۔ پروین کی پیاری باتیں اور ننھے خالد کا بھولا مُنہ ہر وقت یاد آتا ہے۔

۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

آج شاہدہ نے . . . . میں پکنک پارٹی دی تھی۔ موسم بہت دلکش تھا۔ جمالی کو بھی شاہدہ نے بلایا تھا۔ چندرا اور نملا بھی آئی تھیں۔ دو تین کپتان آفریدی کے دوست تھے۔ کافی بڑا مجمع تھا۔ کھانے سے قبل مختلف کھیل ہوتے رہے

کھانے کے بعد چندرا اور مسز ریٹن نے ۔۔۔ کا ۔۔۔ انداز میں دکھایا۔ اور جمالی نے اپنی دو رنگین و دلکش نظمیں سنائیں۔ ۴ بجے کے بعد سب واپس آئے۔ جمالی کو مجھو نے بھائی جان اپنے ہمراہ لے آئے۔ آج وہ بہت افسردہ تھا۔ مجھ سے بہت ادب و عاجزی سے مخاطب ہوتا رہا۔ باتیں بھی ۔۔۔ سے کم کیں۔ لیکن جس قدر بھی گفتگو کی شگفتہ لہجے میں۔ کھانے کے بعد وہ میرے قریب آیا اور دھیمی آواز سے معافی مانگ کر اور خط کے جواب دینے کا وعدہ لیکر رُخصت ہوا۔

۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

آج بڑا ٹھنڈا دن تھا۔ سارے دن سخت ہوا چلتی رہی ہے۔ مطلع ابر آلود رہا۔ میں آتش دان کے قریب بیٹھی ہوئی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ تخیل نے کتنے ہی محل بنائے اور ڈھائے۔ اتنی سخت سردی میں دماغ منجمد سا ہو جاتا ہے۔ اور کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

آج ۔۔۔ سے دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ کل اس سخت سردی کے باوجود چھوٹی بھابی کے ساتھ اُن کی خالہ زاد بہن شہلا کی شادی میں شرکت کی۔ ہندستانی شادیاں بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ ہماری بڑی بوڑھیاں کھینچ تان کر جوڑ لگانے میں فن کارانہ مہارت رکھتی ہیں۔ بیچاری شہلا جیسی خوبصورت و ذہین لڑکی کو جس نے بی۔ اے میں امتیازی نمبر حاصل کئے ایک ایسے صاحبزادے سے باندھ دیا گیا ہے جو ایک امیر و نامور باپ کے فرزند ہونے کے لحاظ سے تو ممتاز ضرور ہیں۔ لیکن الف کے نام ——— کندہ ناتراش ہیں۔ کاش شہلا کی شادی جمیل سے ہوتی۔ لیکن غریب جمیل ڈھائی سو روپے ماہوار پانے والا شہلا کو کیسے پا سکتا تھا۔ جو اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی اور اتنی بڑی جائداد کی تنہا وارث ہے۔ ایسے خواب ہمیشہ تشنۂ تعبیر ہی رہ جاتے ہیں۔

غربت شاید سب سے بڑا نقص ہے۔ مجھے ایسی شادیوں میں جانے سے کوفت ہوتی ہے۔ لیکن نہ جاتی تو بھابی بُرا مان جاتیں۔ شہلا کی حسین صورت پر ناکامی کی مایوسی اور میگوں آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسو دیکھ کر دل تڑپ گیا۔

(آہ ہندستان تیری روایات)

خدا جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی بھینٹ لیں گی۔

۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

آج کا تمام دن خطوط کے جواب دینے میں گذرا۔ شام کو ۔۔۔ "نوش و فرح" لیکر آئی۔ اس میں جمالی کی نئی نظم ۔۔۔

بچپنے ... نظم خوب ہے۔ شاہدہ کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا ہے۔ گاگا کر بڑے شوق سے پڑھتی رہی۔ اُس کی شوخی بعض اوقات بہت خطرناک ہو جاتی ہے۔

بس اللہ ہے۔

۱۷ر جنوری ۱۹۴۱ء

کل عید الضحیٰ ہے۔ آج تمام دن گھر کی صفائی اپنے سامنے کرائی۔ لباس کی دیکھ بھال کی۔

۱۸ر جنوری ۱۹۴۱ء

شکر ہے آج سردی زیادہ نہیں ہے۔ دھوپ کافی تیز ہے۔ چھوٹے بھائی جان اور بھابی کے ہونے سے گھر میں ماشاءاللہ رونق رہی۔ کاش بڑے بھائی جان بھی عید تک رہ سکتے۔ پروین مجھے آج بہت یاد آتی رہی۔ صبح سے دوپہر تک عزیزوں سے ملنے ملانے میں وقت گذرا۔ کھانے کے بعد پھوپی اماں کے ہاں چلے گئے۔ شام کو واپس آئی تو چندرما، شاہدہ آگئیں۔ جمالی بھی آگیا۔ چھوٹے بھائی جان نے اپنے دو ہندو دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ جمالی کو بھی امّاں نے روک لیا۔ کھانے کے بعد یہ سب رخصت ہوئے۔

۱۹ر جنوری ۱۹۴۱ء

آج تمام دن بھائی جان اور بھابی جان کے جانے کی وجہ سے مصروف رہی۔ شام کو ۵ بجے کی ٹرین سے وہ بمبئی سدھارے۔ اب گھر میں سناٹا ہے۔ دل گھبرا رہا ہے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۴۱ء

آج چائے کے بعد سے جو میں لکھنے بیٹھی تو ۱۲ بجا دیئے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام لیا۔ نماز ظہر پڑھکر بیٹھی ہی تھی کہ جمالی آگیا۔ اُس نے اپنی نئی نظم سنائی اُس کی یہ نظم بولتا ہوا جادو ہے۔ میں بہت متاثر ہوئی۔ کیا وہ مخلص ہے؟ اے کاش .... !

چائے کے بعد وہ رخصت ہوا۔ اور میں سوچ میں ڈوب گئی۔ کچھ ماضی کی یاد، کچھ حال کا فکر اور مستقبل کا اندیشہ

۲۱ر جنوری ۱۹۴۱ء

گذشتہ شب بارش ہو گئی۔ اس لئے آج خوب ٹھنڈ ہے۔ میں تمام دن پلنگ پر پڑی ہوئی رسائل پڑھتی رہی۔

۲۸ر جنوری ۱۹۴۱ء

مجھے چند دنوں سے اپنا روزنامچہ نہیں لکھا۔ کوئی بات ہی نہ تھی لکھتی کیا ... طبیعت کبھی کبھی اس قدر بے تاثر ... ہو جاتی ہے۔ زندگی کے دن گذر رہے ہیں۔ بہرصورت گذرے چلے جا رہے ہیں۔ خدا جانے خشش عمر کہاں جا کر تھمے۔

۲۹ر جنوری ۱۹۴۱ء

آج ایک زنانہ ادبی کانفرنس میں شرکت کی جانے والی خواتین سے ملنا ہوگا۔ پروگرام کافی دلچسپ تھا۔

۳۰ر جنوری ۱۹۴۱ء

آج دوپہر کو جمالی کا خط ملا۔ ۱۲ صفحے کا طویل خط۔ میں حیران ہوں کہ وہ اتنے لمبے خط کیسے لکھ سکتا ہے۔ اُس نے مجھے اُلجھانے کو وہم گمین داس پھیلا دیا ہے۔ لیکن میں ! ....

یکم فروری ۱۹۴۱ء

آج تمام دن میں سوچتی رہی۔ خدا جانے کیا کیا سوچا۔ شاید کچھ بھی نہیں نہ جانے کیوں آج مجھے نفری یاد آ رہے ہیں۔ یاد بخیر! شاید ہم کبھی بھی اب نہ مل سکیں گے۔ پر اُن کی یاد .... !

۲ر فروری ۱۹۴۱ء

آج کا دن بہت اچھا ہے۔ موسم بہار شروع ہو چکا ہے۔ گلاب کی جھاڑیاں شگوفوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اور سرسوں ہر جانب پھولی ہوئی نظر آتی ہے سعیدہ کا خط ملا۔ وہ لاہور جا رہی ہے۔ دو دن کے لئے میرے ساتھ ٹھیرے گی اس کی آمد کی خبر نے مجھے خوشی سے بے قابو کر دیا ہے۔ بقول ذوق مرحوم "کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بھی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔"

۳ر فروری ۱۹۴۱ء

آج تمام دن سعیدہ کی آمد کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ پورے گھر میں گڑبڑ ہوتی رہی۔ اُس کے لئے کمرہ درست کیا۔ اور ضروری انتظامات کئے۔

۴ر فروری ۱۹۴۱ء

آج صبح سعیدہ آگئی۔ اس کی موہنی صورت پر بکھری ہوئی شگفتگی اس بات کا اعلان ہے کہ اسکی ازدواجی زندگی مسرت بخش ہے۔ بہت سی باتیں سنیں اور بہت سی سنائیں۔ تمام دن دلچسپ گفتگو اور دل لگی میں گذرا۔ شام چندرما بھی شام کو آگئی تھیں۔ شب کا کھانا کھا کر رخصت ہوئیں۔

۵ر فروری ۱۹۴۱ء

آج صبح چائے کے بعد سعیدہ کے ہمراہ پھوپی اماں کے ہاں گئی۔ شام کو واپس آئی۔ رات کا کھانا شاہدہ کے ہاں کھایا۔

فروری سنہ ۱۹۴۱ء

آج بہت سویرے اٹھنا پڑا۔ سعیدہ کو علیکہ کی میل سے لاہور جانا تھا۔ اسٹیشن تک اس کو چھوڑنے گئی۔ واپس آکر دل افسردہ سا رہا۔ ہم دونوں بچپن ہی میں گذارے تھے۔ اس لئے اب کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ تمام دن پلنگ پر پڑی انگڑائیاں اور جمائیاں لیتی رہی۔

۷ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

آج تمام دن خطوط کے جواب لکھنے اور کتب بینی میں مصروف رہی۔ شام کو عزیز بھائی آگئے۔ اور بہت اصرار سے سنیما لے گئے۔ "آزاد" کافی اچھی تصویر ہے۔ ہندوستانی فلم سازی کی رفتار دیکھی سہی لیکن ناقابل اطمینان نہیں ہے۔ آرٹ دراصل دولت کی چھاؤں میں پھولتا پھلتا ہے۔ آہ مفلس ہندوستان! ..... بھوکوں غلاموں اور بھکاریوں کا ملک خدا جانے کب آزاد ہوگا۔

۱۰ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

حسب عادت تین روز میں نے پھر روزنامچہ نہیں لکھا۔ آج تمام دن جمالی کی نظمیں گنگناتی رہی۔ کل اس نے اپنا دیوان مجھے بھیجا ہے۔ بعض نظمیں اتنی دلکش، رنگین و مترنم ہیں کہ دل بے اختیار جھوم جاتا ہے۔ مناسب و مختصر الفاظ میں اس کو اس بیش بہا تحفے پر شکریہ لکھ دونگی۔

۱۱ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

چندا کے ہاں آج بسنت پارٹی تھی۔ موسم بہت دلکش تھا۔ سنہری دھوپ ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ بسنتی رنگ کے لباس۔ بسنتی کھانے بسنتی پھول غرضکہ جدھر نگاہ جاتی تھی۔ در و دیوار بسنتی رنگے نظر آتے تھے۔ جمالی کو بھی چندا نے بلا لیا تھا۔ بقول (شاہدہ) کے کوئی دعوت، کوئی پارٹی، کوئی پکنک سوسائٹی تک پر لطف نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس میں جمالی نہ ہو۔ اس کی نظم "بسنت رت" سب نے بہت پسند کی۔ ہندی گیتوں کا سا مدھر رس اس میں تھا۔ رقص بہار، آندو، شیلا، نملا نے ملکر کیا۔ بسنتی رنگ کی ساڑیوں میں ملبوس مصروف رقص یہ تینوں تیتریوں کی مانند معلوم ہو رہی تھیں۔

۱۴ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

موسم کی دلکشی نے میرے دماغ پر اچھا اثر کیا ہے۔ دل میں ایک تازگی محسوس کرتی ہوں۔ نامکمل چیزیں آج کل مکمل ہو رہی ہیں۔

۱۵ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

آج رسالہ "شگفتہ" کا بہار نمبر ملا۔ کافی معیاری نکلا ہے۔ نظرافروز نظمیں۔ دلچسپ افسانے۔ پُرازمعلومات مضامین اور تحقیقی مقالے۔ جمالی کی نظم "بسنت رت" بہار کی تصویر کے عنوان سے ہے۔ اس کی حقیقی اور زندہ اس تصویر میں ادا ہوا نظر آتی ہے۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے اس کو سب شاعرانہ جوہر عطا کئے ہیں۔ میں اکثر سوچتی ہوں۔ کیسا چاہنے والا خوبصورت لڑکیاں پاسکتا ہے۔ پھر میرے لئے کیوں دیوانہ ہو رہا ہے۔ کچھ بھی یہ سمجھ میں ہو سکتا۔

۱۸ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

میرے پچھلے تین روز ایک خاندانی تقریب میں گذرے۔ کل تمام مشکل سے چھوڑ واپس آئی ہوں۔ آج بھی جسم میں درد سا ہے اور طبیعت افسردہ ہے۔ ہنگامے اور تقاریب کی شرکت مجھے ہمیشہ نڈھال کر دیتی ہے۔

۲۰ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

گذشتہ شب مجھے خفیف حرارت ہوگئی تھی۔ جسم میں تمام شب بلا کا درد رہا۔ شکر ہے اب سکون ہے۔ لیکن تمام دن بستر پر ہی پڑی رہی۔

۲۲ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

آج صبح سے دوپہر تک خانگی حسابات دیکھتی رہی۔ شام کو جمالی آگیا۔ وہ ایک مشاعرہ کی شرکت کیلئے کلکتے جا رہا ہے۔ اپنی ایک نامکمل نظم اس نے سنائی۔ اس کی شاعری کا مرکز مشاہدہ کے کہنے کے مطابق اب صرف میری ذات ہی رہ گئی ہے۔ میرے علاوہ وہ گویا سب کچھ بھول سا گیا ہے۔ لیکن یہ بھول بھلیاں کب تک ...... !

۲۵ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

آج موسم پر خاصی گرمی برس رہی ہے۔ ایسے دن بہت خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ میں دوپہر تک ایک رسالے کیلئے مضمون لکھتی رہی۔ دوپہر کو پھوپی اماں اور زکیہ آپا آگئیں۔ شام تک ان کی باتوں میں مصروف رہی۔ زکیہ آپا سدھاریں۔ پھوپی اماں ایک دو دن رہیں گی۔

۲۶ر فروری سنہ ۱۹۴۱ء

ہماری پھوپی اماں کی باتیں بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ وہ میری شادی کے مسئلہ پر اماں بی سے تبادلہ خیالات فرما رہی تھیں۔ جب انہوں نے کہا۔ اے یہ لڑکی عجیب ہے کوئی اس کو پسند ہی تو نہیں آتا۔ تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ بیچاری پھوپی اماں! جن کی شادی بارہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ بھلا میرے جذبات کیا سمجھیں گی۔ جس نے اپنی عمر کے کم و بیش سال ضائع کر دیئے ہیں۔ اور کسی کو بھی مخلص نہیں پایا۔ مگر شاید جمالی ——— توبہ! یہ کب ممکن ہے ——— کاش ——— !

۲۷ فروری ۱۹۴۱ء

آج پھوپی اماں دوپہر کے کھانے کے بعد سدھاریں۔ تو ذرا سکون ہوا۔ ان کے لیکچر سنتے سنتے دماغ خراب ہوگیا تھا۔ ان بڑی بوڑھیوں کو دوا اور دو چار کرنے کے علاوہ کوئی لطیف خیال کبھی نہیں سوجھتا۔ میں سوچتی ہوں کہ بڑھاپے میں انسان کے دماغ سے لطافت کیوں بالکل غائب ہوجاتی ہے۔ خدا کرے میرے لئے تو یہ نہ ہو۔ میں اس دن کے لئے زندہ نہ رہوں۔

۲۸ فروری ۱۹۴۱ء

آج صبح خطوط لکھے۔ غسل کیا۔ کھانے کے بعد ذرا دیر کیلئے سوگئی۔ ابھی میں سو رہی تھی کہ شاہدہ کھٹ پٹ کرتی مخصوص انداز سے داخل ہوئی۔ میری آنکھ اس کی آہٹ سے کھل گئی۔ لیکن میں نے جان کر آنکھیں بند رکھیں اور سوتی بن گئی۔

"اوہ رے شان! مس صاحبہ خوابِ ناز میں ہیں۔ کہاں گئے یہ گوڑے شاعر اس وقت دیکھیں تو اس ادا کے خواب پر پورا دیوان مرتب کر دیں۔" اس نے مجھے گدگداتے ہوئے کہا۔ میں ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

کچھ دیر بے تکی ہانک لگانے کے بعد اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں رازدارانہ انداز سے کہا۔ "اے دیکھ خفا نہ ہوجائیو۔ یہ بتا بیچارے جمالی کو تو کب تک تڑپائے گی۔"

میں نے اس کے انداز گفتگو سے چونک کر کہا "پھر وہی بے محل مذاق۔ میں کیوں کسی کو تڑپانے لگی۔ واہ ——— !"

"ہوں ہوں۔ بڑی بھولی بڑی سیدھی" اس نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"دیکھو شاہدہ مذاق کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ تم خواہ مخواہ میرے سر الزام رکھ رہی ہو۔" میں نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔

"دیکھو نجو یہ ہر ایک سے آنکھ مچولی کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ تم تو جان بوجھ کر بنتی ہو۔ کچھ میں ہی نہیں، تمہارے اور جمالی کے جاننے والوں میں کون ایسا ہے کہ نہیں جانتا۔ کہ وہ تمہارے لئے دیوانہ ہو رہا ہے۔ تجاہل کی بھی ایک حد ہوتی ہے حقائق پر رنگینی کے پردے کب تک۔" اس نے شوخی سے آنکھیں نچا کر کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں۔ آئندہ سے جمالی سے نہ ملونگی" ذرا کھسیانی ہوکر میں بولی۔

"ہوں چلو پھر وہی نازو انداز۔ اری نجو جو گھٹ گھٹ کے مر رہا ہو اس کو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اس کے دل کی ملکہ بن جاؤ۔" اس نے دلربایانہ ادا سے مسکرا کر کہا۔

"پھر وہی مذاق۔ میں تمہارا منہ نوچ ڈالونگی۔" میں نے سچ مچ تھپا کر کہا۔

"اے واہ۔ میرا منہ کیوں نوچنے لگیں۔ نوچو اپنے اس چہیتے شاعر کا جس نے یہ گل کھلایا ہے۔" اس نے منہ چڑا کر شوخ لہجے میں کہا۔

"یا میرے اللہ! میں کیا کروں۔" میں نے بے بس ہوکر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"ہم پہلے ہی منع کرتے تھے۔ لڑکی ان شاعروں سے نہ ملا کر۔ مگر تجھ کو تو شاعروں کی قدر دانی کا بھوت سوار تھا۔ بیگم صاحبہ اپنے حساب ملکہ نور جہاں بنی ہوئی تھیں۔ اب کیوں گھبراتی ہے۔ جیسا کیا ویسا بھگت۔" اس نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

میرا دل اس وقت رونے کو چاہنے لگا۔ نہ جانے کیوں؟

مجھے اتنا افسردہ دیکھکر شاہدہ گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ "ارے تو تو ہنسی میں بگڑ گئی۔ یقین جان میں تیری مدد کو ہر وقت تیار ہوں۔ لیکن یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے کہ اگر تو نے انکار کیا تو ایک شاعر کا خون ہو جائیگا۔"

مجھے اس کے ان فقروں نے لرزا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میری نظروں کے سامنے جمالی کی شاندار لیکن کچھ غمگین صورت آگئی۔ اور اس کی رس بھری آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

"میں سوچوں گی شاہدہ!" میں نے دھیمی آواز سے کہا۔ اور وہ رخصت ہوئی۔

(نیلوفر صاحبہ کی ڈائری کے کئی صفحے اس صفحہ کے بعد غائب تھے۔ صرف ایک صفحہ تھا جس پر یہ منتشر سطور تھیں۔)

۲۸ جون ۱۹۴۱ء

آج بہت زیادہ گرمی ہے۔ تمام دن اپنے کمرے میں بند پڑھتی رہی۔ شام کو چندرا آگئی۔ اس سے یہ سنکر حیران رہ گئی کہ جمالی نے کشمیر کے قیام میں ایک مہوش ——— دوشیزہ سے پیمان محبت کر لیا ہے۔ وہ اس کو طول طویل خط لکھتا ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میرا دم گھٹ سا گیا۔ اور میں نے سنبھل کر کہا۔ "لیکن چندرا تم کو تو معلوم ہے کہ ———" چندرا بات کاٹ کر بولی "ہاں ہاں اسی لئے تو مجھے حیرت ہوئی۔ ہرگز بھی میں یقین نہ کرتی۔ لیکن وہ لڑکی چھوٹی بھابی کے ساتھ کی پڑھی اور بڑی سہیلی ہے۔ اس نے بھابی کو جمالی کے خط اور وہ نظم دکھائی جو

بھیجنے لگے تھے۔ یہ نظم رسالہ "قوسِ و قزح" کے کسی نمبر میں چھپی ہے۔ تم تو ہوگی، برگمان ہوتی ہو اور خفا ہو کر میں ایک دو دن میں لا کر دکھاؤں گی۔ وہ لے گئی۔ مجھی میں دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ کچھ دل کو اتنی تکلیف پہنچی کہ سانس کا لینا مشکل ہو گیا۔ نظم میں نے "قوسِ و قزح" میں دیکھی تھی۔ اور یہ میرے مشتبہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ کیونکہ واقعی اس میں جس طرح حسن کی تعریف تھی اس کی میں مالک نہ تھی۔ اس سے قبل کی نظمیں محض میرا عکس ہوتی تھیں۔ اور یہ نظم کسی الھڑ کمسن حسینہ کے دلربا حسن کا آئینہ تھی۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ جمالی اتنا فریبی نہیں ہو سکتا۔ کاش یہ اس پر اتہام ہو۔

۳۰ رجون ۱۹۴۱ء

مجھے چندرا کے کہنے پر پورا یقین نہ تھا۔ پر آہ! یہ تحریر تو

[illegible]

وہ رنگین دلکش نظمیں، وہ والہانہ بے خودی، وہ بے پایاں خلوص و عقیدت کا اظہار۔ وہ دیوانگی و اضطراب۔ سب جھوٹ! فریب ——— !!

میں نے اس کو آزمانے کی خاطر لبوں پہ مُہرِ خاموشی لگا لی۔ لیکن دل پر اس کی نظموں کا تاثر باقی رہی۔ میں نے جس وقت اس کو صادق سمجھ کر اس پر اعتماد کرنا چاہا، عین اس وقت وہ ایک اور حسین دوشیزہ کے حسن سے متاثر ہو کر میری عنایات اور سادگی و خلوص کو بھلا بیٹھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ اگر مجھ کو نہ پا سکے گا تو دیوانہ ہو جائے گا۔

آہ! یہ مرد ———

شاعرِ صحرا

شاہ عبداللطیف سندھی

(از محترمہ وحیدہ عزیز بی اے)

پیش لوگوں میں جوہر قابل کا ظہور ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی تشریح ابھی سے یقریباً ایک معمائے لاینحل ہے۔ وراثت اور ماحول ناکافی توجیہات ہیں مختلف زبانوں میں ایک انسان جس طرح سرآمد روزگار بن جاتا ہے وہ ایک رازِ سربستہ ہی ہے۔

شاہ عبداللطیف سندھی بھی اس الہامی حقیقت کی ایک نظیر ہیں۔ کہ "الشعر تلامیذ الرحمٰن"! شاہ صاحب موصوف ساداتِ سندھ کے ایک نامور خاندان سے تھے جو عرصہ سے فضل و تقدس کا سرچشمہ چلا آتا تھا۔ ان کے پردادا شاہ عبدالکریم نامی ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ جن کا ذکر سرزمین سندھ میں آج تک سننے میں آتا ہے۔

شاہ عبداللطیف کا مجموعہ کلام "رسالو" رسالہ سندھ کے ادب کا شاہکار ہے۔ شاہ صاحب کے بہت سے اشعار سندھ میں اس طور پر زبان زد ہیں کہ عوام لطیف کے نام سے بھی واقف نہیں۔ مگر صاحب نظر ان کے کلام کو صاف طور پر پہچان سکتے ہیں ۔۔۔ مقبول و محبوب "رسالو" (Risalo) اپنے ماقبل و مابعد کی تمام ادبیات سندھی میں بے نظیر واقع ہوا ہے۔

شاہ صاحب موصوف کے سوانح حیات کا سارا ساز و برگ زبانی روایات ہی ہیں۔ ہم موجودہ نسل کے لوگوں کے جو بزرگ تھے انہوں نے شاہ صاحب کا زمانہ پایا ہوگا۔ مختلف قیاسات کی تنقیح کے بعد شاہ صاحب کا زمانۂ حیات متعین کیا جا سکتا ہے۔ وہ غالباً ۱۶۸۹ء اور ۱۷۵۲ء کے درمیان واقع ہوا ہے۔

شاہ عبداللطیف کا ظہور سندھ کی تاریخ سیاست میں خاندانِ کلہورا کے عروج کے زمانہ میں ہوا۔ عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے وقت شاہ صاحب کا سترہ سال کا تھا۔ نادر شاہ نے جب دہلی کو غارت کیا اور سلطنت مغلیہ کے صوبہ سندھ کا الحاق ایران سے کر لیا تو اس حادثہ کا مشاہدہ شاہ عبداللطیف کی پچپن سالہ چشم عبرت نے کیا۔ اس انقلاب کے آٹھ ہی سال بعد جوابی انقلاب ہوا۔ اور احمد شاہ درانی نے جہاں طلب دہلی پر مہلک ضرب لگائی۔ اور سندھ کو افغانستان جدید کے ساتھ ملحق کر لیا۔

ان تمام طوفانی ایام و سنین میں شاہ عبداللطیف شمالی ضلع حیدرآباد کے ایک قصبہ میں عزلت نشیں رہے۔ مذکورہ بالا واقعات و حوادث نے جو تاثرات شاہ صاحب کے قلب بیدار پر اتنا گہرا پیدا کئے ہونگے وہ ہمارے لئے غیر معلوم اور غیر مکتوب ہیں۔

شاہ عبداللطیف دنیائے فکر اور ارضِ خاکی دونوں کے سیاح اور سیلانی تھے۔ اپنے عہد کے فقرا صوفیہ اور اہل کشف و طریقت سے عموماً انکی یاد اللہ تھی۔ حافظا سیر و گشت ان کا خاص مسلک تھا۔

ان کی رسم بسم اللہ خوانی کا ایک ماجرا قابل ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب ان کے معلم نے انہیں اولین سبق ابجد دیا۔ تو انہوں نے حرف الف سے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک مادر زاد ازلی مجذوب جلوۂ توحید تھے۔

بچپن ہی سے ان کی جمالی فطرت کا یہ کرشمہ دیکھنے میں آیا کہ جب کبھی وہ کسی جانور پر سوار ہوا کرتے تو تازیانے وغیرہ کے استعمال سے اپنے کو عاری پاتے وہ دوسروں کے ہاتھوں بھی حیوانات کی چوب زنی کے منظر کی تاب نہ لا سکتے تھے۔

عدیم النظیر شاہ عبداللطیف نے کوئی اولاد نہ چھوڑی۔ از روئے روایات ان کی خانگی زندگی ایک بے داغ جریدہ ہے۔

شاہ عبداللطیف سندھی اپنے علم و کسب کے معاملہ میں کم و بیش ایک امی ہی کی شان رکھتے ہیں۔ تلمذ رحمانی کے بعد اگر کوئی اور ان کا سرچشمہ علمی تھا تو وہ ان کی خود آموزی ہی تھی۔ ان کے منظومات میں فارسی و عربی ادبیات کا تتبع بھی نظر آتا ہے۔ رومی و عطار وغیرہ سے بھی ان کی آشنائی بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی تصوف جس رنگ میں ہندوستان کی بزم عرفاں میں داخل ہوا ان کے ارتقائی منازل پر انہیں پورا عبور معلوم ہوتا ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ شاعر صحرا اپنے منظومات کو قلم خود رقم نہ کیا کرتا تھا۔ بلکہ ان کی کتابت بصورتِ املا کرائی جاتی تھی۔ اور جو کاتب وقت پر حاضر خدمت ہوتے تھے۔ قلمبندی کا یہ فریضہ ادا کیا کرتے تھے۔ یہ طریق کار کسی قدر غیر معمولی نظر آتا ہے اور شاعر متصوف کے ذہن و فن کو ایک فوق العادت شان بخشتا ہے ان کے کلام کے متعدد قلمی نسخے اور مجموعے موجود ہیں۔

شاہ عبداللطیف اپنے خانۂ دل کی خلوت اور عامۃ الناس کے تصورات کے یکساں ترجمان و مصور ہیں۔ یہ تفسیریں اور تصویریں ان کی چشم مشاہدہ، انکے احساس

شعر و سخن کی نشست بیان کے ——— ہاں شجر جنون نے اپنی
وحدت تسلیم کرالی ہے۔

شاہ صاحب کی ذات میں سندھ کی متعدد خصوصیات نمایاں ایک جان اکٹھا ہو گئی ہیں۔ شعر و موسیقی کی ہمنوائی کا فن قوالی میں ساز و ضمیر کی لطیف ہم آہنگی میں وجد لاتی ہیں۔ یہ سب حسن ازل کے عشق کا فیض ہے۔ ان کا کلام آمیزش تصوف سے متاثر ضرور ہوا ہے۔ یہ نتیجہ ہے ادبی و علمی روایات سے نا آشنا لوگوں کی تدوین و تالیف کا! "رسالہ" اہل سندھ کا مقدس صحیفہ ہے شاہ عبداللطیف معراج عشق و عرفان کے مخبر صادق و ترجمان حقیقت ہیں۔

شاہ عبداللطیف کے کلام و پیام کی تقریب سے سندھ کی مخلوق کا یہ حال ہے کہ ساربان و گاڑیبان، خورد و کلاں صحرائے لق و دق میں بادیہ پیمائی کرتے ہوئے۔ یا کسی قصبہ و شہر کے کوچہ ہائے تنگ و تاریک سے گذرتے ہوئے ان کے شعر پڑھتے ہیں۔ جس سے ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے۔ کہ

از کجا می آید ایں آواز دوست

شاہ عبداللطیف کا دامن تخیل کیا کیا جواہر پارے رکھتا ہے۔ صحرا، کوہستان، آب رواں، نخلستان، شجرستان دکف دست میدان، ستارگان و کہکشاں، باران خزاں و طراوت گلستاں، ابر و باد اور پر سکوت منظر طلوع و غروب، شتر و غزال سب کے موثر ترین بیانات ان کے منظومات کی مرقع سازی کرتے ہیں۔ یہ وسعت حیرت انگیز ہے اور یہ تنوع تازگی ریز۔

شاہ عبداللطیف، بخلاف متعدد مغربی شعرائے تفلسف کے فطرت اور خدا کے درمیان تفریق دوئی کے قائل ہیں۔ مظاہر فطرت کو وہ اسی جان عالم کا پیکر ترجماں سمجھتے ہیں۔ وہ پیہم و دائم روح آدم کو صلائے عام سناتے ہیں کہ اسی برقع پوش و نقاب آراستہ حقیقت کے انداز قد کو پہچانے اور نگاہ ہائے دزدانہ سے اس کے حسن و جمال کو اٹھالے۔

ز طرف چشم حقیقت بہ بیں کہ جلوہ گر ست
تو بنگار حقیقت تہ لباس مجاز!

افسوس ہے کہ شاہ صاحب کا کلام غیر سندھی دنیا کیلئے ایک صحیفہ سربستہ ہے۔ یہ نا معلوم معمولی محرومی نہیں کہ ہندوستان کا سواد اعظم اس خوشنوا عاشق و مطرب ازل سے متعارف نہیں۔

شاہ عبداللطیف کا تصوف عمیق مذہبیت سے سرشار ہے۔ وہ محض فلسفیانہ تصوف کا خیال نہیں۔ توحید پر تاکید۔ مجرد واردات قلبی و انکشافات روحی کی یکرنگی۔ بحر سرمدی میں قطرہ خودی کی غرقابی و آسودگی

وغیرہ بھی مقبول کر ... کی آواز ہی کا۔
یہ سندھی شاعر کسی قدر [illegible]

و تصوف کے بھی مفہوم معلوم ہوتا ... لیکن ... ذوق کے اندر ایک گوشہ میں ان کی جلوہ گاہ ازل کا تہی۔ مغربی شاعر [illegible] کے ساتھ بھی ان کی شرکت برائے نام ہی ہے۔ شاہ عبداللطیف کا ہم مشرب میں اگر کوئی قریب ترین مثیل ہے تو وہ کرشنا (CHESRTA) اور والٹس (WATTS) ہیں۔ "رسالہ" کا اصلی نام پیام مذہبی ہے۔ اور یہی مابہ الامتیاز ہے ان کے اور شیلے اور براؤننگ کے درمیان!

شاعر کے کلیات میں بعض نہایت جامع قسم کے عمیق و بے خودانہ واردات پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نفسیاتی استفسارات و روحانی استفہامات ہیں جن کی روح براؤننگ کے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ مزید برآں چند جواہر سخن متغزلانہ روح سے پر کیف ہیں۔ جو شیلے اور ورڈز ورتھ کی یاد دلاتے ہیں۔ ان مقامات پر شاعر پوری شاعرانہ معراج تک پرواز کرتا ہے اس کا وسیلہ اظہار شعر کی آفاقی زبان ہوتا ہے۔ جو مکان و زمان اور انفرادی نفس کے ظرف تنگ سے بالا و برتر ہوتا ہے۔

باوجود اپنی ممتاز روح اخلاص کے یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا شاہ صاحب کو اپنی ہمہ گیر ہر دلعزیزی حاصل ہوتی اگر وہ اپنی بعض مشہور ترین مثنویوں کی نقشہ بندی سندھ کے دیہات کی چند عوامی داستانوں کے گرد اگرد نہ کرتے۔ ان کے انتخاب میں پانچ عاشقانہ قصوں کا گویا ایک پنجسورہ ہے۔ جن کے موضوع "سسی پنہوں"۔ "سوہنی ماہیوال"، "لیلا و چنیسر"۔ "مومل و ماروا" وغیرہ کے خزینے ہیں۔ ہر قصہ دلکش و جگر دوز ہے اگرچہ بکثرت خوارق عادات سے زیر بار ہے جو مشرقی ادبیات کی اتنی عام چیز ہے۔ تخیل کی یہ پیداوار ہیں پر کیف ترین شعریت سے مالا مال ہیں۔

ان قصوں کی فنی ساخت کا جائزہ لیتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ شاعر کے مد نظر صرف قصہ کی معراج رہتی ہے۔ یعنی وہ نقطہ داستان جو ڈرامائی تاثر کا بنا ہے۔ ان قصوں کا پیکر ڈرامہ کیلئے بہترین موضوع بہم پہنچاتا ہے۔ اگرچہ آرٹ دل کیلئے اتنا ہی ساز و برگ رکھتا ہے۔

منتخب میں بعض قصے ہندی الاصل واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً "مومل و ماروا" اس رنگین و خونیں رومان کا گہوارہ صحرائے تھر و عمرکوٹ ہے۔ سندھ کے ہندو بجا طور پر اس نظریے کے مدعی ہیں کہ سندھ کے آخری تمدنی مرکب کے بننے کا ... مسلم تہذیب

... سے مشتمل ہے۔ اس سے کچھ عقائد سنے کر کے ہم تیسرے پہنچاتے ہیں۔
پہلی جماعت حضور شاہ عبد اللطیف کی۔ وہ ان رسیدگان حق اور
اعیانِ عشق میں سے تھے۔ جنہوں نے عشق و حقیقت کی لذت آشنائی کی اور ساقیانہ
اُس کے شربتِ دیدار کی جام پیمائی فرمائی ہے
"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"
(المرسلہ۔ ملتان چھاؤنی)

ڈیوائن کومیڈی

اعراف

(اٹلی کے شاعر اعظم دانتے کے غیر فانی شاہکار کا اختصار و اقتباس)

(از جناب فضل حق قریشی دہلوی)

دانتے دنیائے معصیت کے افسردہ کن طبقات سے چھٹکارا پانے کے بعد مسرت و شادمانی کے ساتھ ادھر ادھر نظر ڈالتا ہے۔ اس کی روح صبح کاذب کی شعاعات اور ضیا بار رنگینیوں سے سرشار ہونے لگتی ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ آسمان کی عریاں پیشانی اور بہت سے ستارگان کی نورانی جبیں جو چار اخلاقی صداقتوں ——— حیا و انصاف اور استقلال و اتفاق ——— پر مشتمل ہے۔ غازۂ شفق کی لالہ زاریوں سے بتدریج گہری ہوتی جا رہی ہیں۔

اس اثناء میں وہ کوہ اعراف کے دامن میں پہنچ چکتے ہیں
وہ خوش ہیں لیکن متحیر۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ تاج الجبل تک رسائی حاصل کرنے کا صحیح راستہ کون سا ہے۔

ذرا سی دیر میں عہد قدیم کا ایک انسان خلعت فاخرہ میں ملبوس ان سے آملتا ہے۔ یہ ارض روم کا نیک نام کیٹو ہے۔ جس نے آزادیٔ وطن کی خاطر اپنی جان عزیز قربان کر دی تھی۔ ورجل تعارف کراتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ میرا ہم سفر بھی اسی آزادی کا متلاشی ہے جو رومیوں کی نگاہ میں بہت گراں قدر تھی۔ تب کیٹو، ورجل کو ہدایت کرتا ہے کہ دانتے کو نیچے ساحل سمندر تک لے جاؤ جہاں عجز و انکساری کے نرسل اگتے ہیں۔ ہر شخص کیلئے ضروری ہے کہ مقدس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے سے قبل ان نرسلی ریشوں سے اپنی کمر ہمت کس لے۔ اس طرح دنیا کی آلائشوں سے جسم انسانی منزہ و پاک ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ سمندر کی جانب ڈھلوان راستے پر چلتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس سمندر کے کنارے پہنچ کر جو نسیم صبح کی اٹھکیلیوں سے موجیں مار رہا تھا، ورجل اپنی ہتھیلیاں درخشاں شبنم سے تر کر لیتا ہے۔ اور اس نمی کے ذریعہ جہنمی اشو کبریت کے باقی ماندہ اثرات کو دانتے کے چہرے سے پونچھ کر صاف کرتا ہے۔ اور پھر ہدایت کے مطابق نرسل کا پٹکا بنا کر اس کی کمر کس دیتا ہے۔

[illegible]
[illegible] ایک اسلامی [illegible] نجات [illegible]
[illegible] طرف لارہا ہے۔ [illegible]
پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر وہ دونوں [illegible]
ہیں کہ کون [illegible] ہے [illegible] کچھ [illegible] ایسے لوگوں کا جھنڈ دور سے [illegible] ہیں۔ جنہوں نے گرجا کے قوانین سے سرکشی کی تھی اُن کے لئے ضروری ہے کہ [illegible] جتنے عرصہ نافرمانیاں کی تھیں۔ اس کے مقابلے میں تیس گنا زیادہ مدت تک اعراف کی تلہٹی میں پڑے رہیں۔

یہ روحیں بہرہ ور زائرین کو بتلا دیتی ہیں کہ سامنے دّرۂ کوہ کا تنگ راستہ مناسب ہے۔ چنانچہ وہ اسی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ اور اس قسم کی روحوں کو دیکھتے ہیں جو کاہلی و تاخیر کے بعد اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے پشیمانی کا اظہار کرتی ہیں۔ اور اس لئے اصولاً انہیں آستانۂ اعراف پر ایک مخصوص مدت تک منتظر رہنا پڑتا ہے۔

اس جگہ کے رہنے والے ارواح سے نیچے کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے گرجا کے خلاف قانون شکنی کی تھی، دانتے سے عجز و انکساری کے ساتھ التجا کرتے ہیں کہ تم دنیا میں جانے کے بعد ہمارے حق میں دعائے خیر کرنا۔ کیونکہ صرف دعا ہی کی برکت سے اُن کی نجات بہت جلد ممکن ہو سکتی ہے لیکن وہ خود اعراف میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے حق میں کسی قسم کی دعا نہیں کر سکتے۔ اور اس طرح دنیا والوں کی امداد ان کیلئے بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی نجات ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔

جب دانتے اور اس کا راہنما ایک صاف ستھری جگہ پہنچتے ہیں جو دنیا کے ان بڑے بڑے فرمانرواؤں کی جائے قیام ہے جو عیش و عشرت اور ذاتی اغراض و مقاصد پر مبنی جنگ و جدال میں منہمک رہ کر اپنے فرائض منصبی سے غافل ہو گئے تھے تو اس وقت سورج غروب ہونے لگتا ہے اور شام کی سیاہیاں چاروں طرف پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں۔

اس نوع کے گنہگار حکمرانوں کی آرامگاہ ایک کافی دلپذیر کنج عزلت کی شکل میں ہے۔ جس کو باغ عدن ہی کا نعم البدل کہا جا سکتا ہے۔ ان پر نازل ہونے والے عذاب کی نوعیت صرف اس قدر ہے کہ اس تمام کی [illegible] اور فرحت بخش رنگینیاں ان کے حافظے کی لوح پر بیتے ہوئے [illegible] آرزوئیں اور تمنائیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کی تکمیل [illegible] ہو سکی تھی۔ [illegible] روح [illegible] ہے اور وہ اپنے [illegible]

دہاں کے کلمات تک دو کے بادصف دوزخ ہی کا ایک حصہ تھا وہ گوشہ بھی کے لیے ہے۔

اس مصنوعی باغ عدن میں بھی رات کے وقت سانپ کا گذر ہوتا ہے۔ گویہ یاد دلانے کیلئے کہ ابھی تک تمہارے دلی مقاصد بے لوث نہیں ہوئے ہیں۔ دو سبز لباس فرشتے شکستہ شمشیر ہاتھوں میں لئے باغ میں اترتے ہیں۔ اور تمام رات پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ تاکہ ارواح خبیثہ پاس نہ آسکیں۔

اس اثنا میں اخلاقی صداقتوں کے رہرو سیارگان غروب ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ پہاڑ کی چوٹی پر نور ہدایت کی تین مشعلیں روشن ہوجاتی ہیں —— اعتقاد، امید، اور سخاوت ——

اصولاً رات کے وقت روحیں پہاڑ کی جانب صعود نہیں کرسکتیں۔ لہذا دانتے اور ورجل کو رک جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ عدن میں ان کا سفر اخلاقی نقطۂ نظر سے ہے۔ ایسی صورت میں لازمی قرار پاتا ہے کہ اس کا سلسلہ روشن میں چمکنے والے ستاروں کے زیر سایہ عمل میں آئے۔

دانتے اس کنج میں ایک طرف سو جاتا ہے اور صبح کے وقت اعراف خاص کے صدر دروازے کے باہر اپنے آپ کو بیدار پاتا ہے۔ چنانچہ ان طبقات کوہ سے گذرتے وقت اسی معمول کے مطابق وہ روزانہ کے مسلسل سفر کے بعد ہر رات کو صبح کاذب سے ذرا پہلے ایک الہامی خواب دیکھتا ہے —— ایک ایسا خواب جو اسرار و رموز کا پردہ چاک کردیتا ہے۔ اس خواب کے ذریعہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ میرے مقدس سفر کو معراج کمال حاصل ہوتی جارہی ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ ایک سنہری عقاب مجھے اپنے پروں پر اٹھائے فلک الافلاک کی سمت پرواز کئے جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خواب کی تعبیر یہی ہوسکتی ہے کہ دنیا میں حیات ثانیہ صرف اصطباغ کا ذریعہ ممکن ہے۔

تین سیڑھیاں —— صداقت، رفاقت، محبت —— طے کرکے اس دروازے پر پہنچتے ہیں جہاں ایک فرشتہ متعین ہے۔ وہ دانتے کے جسم کو اپنے تھپیڑوں کے لمس سے منزہ و پاک کردیتا اور پیشانی پر سات نشان کھود دیتا ہے —— یہی گناہ کبیرہ کے سات نشان —— پہاڑ کے تدریجی حلقوں میں وقتاً فوقتاً عذاب جھیلتے رہنے کے بعد جوں جوں نجات ملتی رہتی ہے۔ وہ رمزیہ نشان ایک ایک کرکے لوح پیشانی سے محو ہوتے جاتے ہیں۔

اولین منزل سے گذرتے وقت سنگین چٹانوں پر کندہ ہوئے نقوش دیکھکر دانتے کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوجاتی ہے۔ یہ عجز و انکساری کے مختلف النوع مظاہر تمثال ہیں۔ مثلاً ایک تصویر میں کنواری مریم کو کنواری بشارت دی جارہی ہے۔ دوسری میں حضرت داؤد سفینۂ نوح کے سامنے رقص کرتے دکھائے گئے ہیں۔ غرض اسی طرح دینی اور دنیوی تواریخ کے بہت سے تمثیلی خاکے منقوش ہیں۔ یہ وہ حصہ ہے جہاں کرۂ ارض کی مغرور و متکبر ہستیاں عرق انفعال میں غرق رہتی ہیں۔

یہ معلوم کرنے کیلئے کہ ان پر کس طریقے سے عذاب نازل کیا جاتا ہے۔ دانتے کو زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑتا۔ مبہم سی شکلوں کا ایک گروہ چٹان کے ساتھ ساتھ اس کی طرف بڑھتا آتا ہے۔ اور جب وہ قریب آجاتے ہیں تو یہ دیکھکر اسکی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ ان میں سے ہر ایک وزنی سنگین سلوں کے بار عظیم سے جھکا ہوا چل رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس بھاری بوجھ کے دباؤ سے خمیدہ ہوکر زمین بوس ہوئے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان کا غرور و تکبر اظہار پشیمانی کے بعد لائق معافی قرار دیدیا گیا ہے اور محض سزا کے طور پر انہیں مقررہ چکر دھونے ضروری ہیں۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ کسی پھیرے میں وزن کی مقدار کم نہ ہونے پائے تاکہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے وہ نجات پاکر قرب الٰہی حاصل کرلیں۔

ان ہی لوگوں میں دانتے اپنے ایک قدیمی دوست —— اوڈری رائسی —— کو پہچان لیتا ہے۔ جو عرصۂ حیات میں خورد تصاویر کا نقاش تھا۔ اسے زبردست گھمنڈ تھا کہ فنی اعتبار سے کوئی اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ لیکن اب دانتے کے سامنے دوسروں کی فضیلت و فوقیت کا اعتراف کرتا ہے۔ یہاں کے مصائب برداشت کرلینے کے بعد وہ اچھی طرح سمجھ جاتا ہے کہ شہرت کا وجود کس قدر عارضی اور مختصر ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مصوری یا شاعری کا ایک مسلک دوسرے مسلک پر بہت جلد سبقت لے جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قائم رہتا ہے۔ اور پھر خود بھی انسان کی ترجیحی تاویلات کی چکی میں پیس کر رہ جاتا ہے۔

مصوری کی دنیا میں کبھی سیماآبو کو شہرت تھی، اب گیوتو کو ہے اور بہت جلد یہ امتیاز کسی اور کو حاصل ہوجائیگا۔ شاعری کے ضمن میں خود دانتے اور اس کے پیرکار قابل ذکر ہیں۔ جن کا عقیدہ ہے کہ صداقت کو حسین الفاظ میں پیش کرنے سے بہتر ہے کہ حسین واقعات کو صداقت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا مسلک اس کی جگہ لے لیگا۔ اور پھر کوئی اور اس کی جگہ —— غرض سلسلہ ابد تک قائم رہے گا۔

جب وہ آگے بڑھتے ہیں تو ورجل دانتے کی توجہ نیچے پڑی ہوئی ایک سنگین لوح کی طرف مبذول کراتا ہے۔ غرور و تکبر کی چند تاریخی اور نیم تاریخی حکایتیں اس پر منقوش ہوتی ہیں۔ نمرود —— جس کا عکس شیطان وہ جہنم میں دیکھ چکا تھا۔ اس نمرود نے انسان کو ترغیب دی تھی کہ معبدوں کی بجائے ایک بلند مینار تعمیر کیا جائے جس کے ذریعہ ایوان الٰہی میں پہنچا جاسکے۔ نیوبی جسے اپنے چودہ بچوں پر

[illegible] تھا — اور [illegible] — وہ مغرور اور ازلی — اور ایسے ہی [illegible] کے [illegible] لوگ۔

دوسری منزل تک پہنچنے کیلئے جب وہ زینے پر چڑھنے لگے ہیں تو حلقۂ متکبرین کا ایک دل فرشتہ دانتے کی پیشانی سے ایک گناہ — غرور — مٹا دیتا ہے۔ گویا وہ غرور سے پاک ہو گیا ہے۔ اور شاید اسی لئے اوپر کی جانب صعود کرنا پہلے کی نسبت اب اسے آسان معلوم ہونے لگتا ہے

دوسری منزل حاسدوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ یعنی وہ لوگ جنکی آنکھیں اپنے ہم عصروں کو عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے دیکھکر پیچ و تاب اور غیظ و غضب کے باعث اشک آلود ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کے پپوٹے تاروں سے چھید دیئے گئے ہیں۔ اور وہ ٹٹول ٹٹول کر اعراف کوہ میں بمشکل چل رہے ہیں۔

ان کو اس حالت میں دیکھکر دانتے محسوس کرنے لگتا ہے کہ خود اسے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے طور پر اس منزل میں کچھ عرصہ رہنا پڑیگا۔ پھر کہیں جنت میں پہنچنے کی نوبت آئیگی۔ تاہم حاسدوں کی منزل سے زیادہ عرصہ اسے منزل متکبرین میں رہنا پڑیگا۔

دانتے دنیا کے سب سے بڑے حاسد — گوئیدو دا دیوسا کا تصور کر کے کچھ متفکر سا ہو جاتا ہے۔

سا پیہ نوع انسان کے خلاف صدائے ملامت بلند کر چکا ہے۔ وہ ایسی چیزوں میں اپنے دل کیوں لگاتے ہیں۔ جن کے ساتھ کسی قسم کی شرکت تک خارج از بحث ہے۔

ورجل وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اشیائے دنیوی، اشیائے مادی اور منفعت روحانی کے درمیان کیا فرق ہے۔ اور یہ کہ اگر کوئی شخص اول الذکر کا زیادہ حصہ حاصل کرے تو لازمی طور پر وہ شے دوسروں کیلئے کم مقدار میں رہ جائیگی۔ اس کے برعکس سکون، محبت اور علم ایسی نعمتیں ہیں کہ ان میں سے ایک شخص جس قدر زیادہ حاصل کرے اسی قدر زیادہ وہ دوسروں کے حصے میں آسکتی ہیں۔ اشیائے مادی کی طمع درحقیقت رشک و حسد کی جڑ ہے۔

اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے وہ تیسری منزل پر چڑھ جاتے ہیں۔ جو قاہر اور غضبناک لوگوں کی بستی ہے۔ یہاں پہنچ کر دانتے کنواری مریم اور سینٹ سٹیفن کو جسے ظالموں نے پتھر مار مار کر ہلاک کیا تھا۔ عالم خیال میں دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے عقیدے کے مطابق یہ دونوں عجز و انکساری اور صبر و استقلال کے مثالی نمونے ہیں۔

پھر گہری اور زہریلی فضا میں سے گزرتے وقت ان کو مدھم سروں میں "خدا کی بھیڑ" والا گیت سنائی دیتا ہے۔ یہ گیت [illegible] معافی کی [illegible] دعا ہوتی

ہے جہاں [illegible] تھے۔ اسی جگہ مارکو لمباردو [illegible] تھا۔ وہ اعراف میں رہتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اس کا [illegible] دور اضطراب و انحطاط سے گزر رہا ہے۔

غم و اندوہ کی ان مغموم مثالوں کو عالم خیال میں [illegible] شاعر پھر اگلی منزل کی طرف چڑھنے لگتے ہیں اور اس وقت ورجل کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے شاگرد کو نظام اعراف سمجھا سکے۔

وہ بتاتا ہے کہ فطرتاً تمام مخلوق نیکی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ انتہائی نیکی یعنی خود خدا کی محبت ہر انسانی خصلت میں اس طرح ودیعت ہوتی ہے جیسے ہر پودے کی قوت نمو کہ اپنے اصل ماحول کو سمجھتی ہے۔ آگ کی حرکت اپنے محیط کی جانب ہوتی ہے۔ یا تمام اجرام سماوی اپنے محور کے گرد گھومتے ہیں۔ لہذا فطری محبت کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی۔ لیکن اس سے قطع نظر اکتسابی محبت بھی ہوتی ہے۔ جس میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ مقلوب ہو یا غیر متناسب۔

پھر یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ کوئی مخلوق فطرتاً خود اپنے نفس یا اپنے خالق حقیقی کے خلاف گناہ کر کے محبت یا دلی مسرت حاصل نہیں کر سکتی۔ تا وقتیکہ اس کی روح پر عفریتی سایہ نہ پڑ جائے۔ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مقلوب محبت کو اپنے پڑوسیوں سے بدی کرنے میں خوشی اور طمانیت قلب حاصل ہوتی ہے۔ تکبر، حسد اور غصہ مقلوب اکتسابی محبت کی مثالیں ہیں۔ باقی چار گناہ کاہلی، حرص، جوع البقر اور شہوت پرستی غیر متناسب محبت کی مثالیں ہیں۔ کاہلی محبت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے اور باقی تین گناہ ان چیزوں پر جو اعلیٰ ترین نیکی کا جزو نہیں ہیں، غیر متناسب محبت کا اثر ڈالتے ہیں۔

اس گفتگو کے اختتام پر وہ کاہلوں کی بستی کے سرے پر پہنچ جاتے ہیں اور اس وقت اچانک طوفان باد کی مانند ایک تیز جھونکا آتا ہے اور ان کو اٹھا کر دامن کوہ میں پھینک دیتا ہے۔ وہ جھونکا اس منزل کے کٹہرے کے قریب برابر چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس توقع پر کہ شاید اس محبت کی کمی پوری ہو جائے۔ جس سے وہ لوگ لاپرواہ رہے تھے۔

دن کے تارے غروب ہو جاتے ہیں۔ رات کی سیاہی پھیلتی ہے اور کوہ مقدس کے قوانین کے مطابق صبح نمودار ہونے سے قبل کوئی مسافر آگے نہیں چڑھ سکتا۔

دوسرے دن وہ دونوں [illegible] کی سیاحت

کرتے ہیں۔

خصوصیت سے ان کی زندگی بسر کرنے والوں کی روحیں فرش زمین سے اس طرح چپکی ہوئی نظر آتی ہیں گویا وہ اب بھی دنیوی مال و متاع کے ساتھ لپٹی پڑی ہیں۔ ان بدروحوں کی آنکھیں شرم و انفعال کے باعث اوپر اٹھنے سے قاصر ہیں۔ انہیں پوپ سلسٹائن پنجم کا سایہ نظر آتا ہے۔ جس نے اپنی حریصں عادتوں سے توبہ تو کر لی تھی مگر بہت وقت گذر جانے کے بعد۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ عیش دوروزہ پر بھروسہ کرنا ایک فعل عبث ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ زندگی کے تار ٹوٹ جانے کے بالکل قریب تھے۔

ان کو سلطنت روما کے بعض نصرانی شاعر بھی نظر آتے ہیں ——

شاہ شاعر اعظم سٹاٹیس سے ملاقات ہوتی ہے۔ عالم سماوات کے یہ دونوں زائرین اس کو حریصوں کے مجمع میں دیکھکر بہت متعجب ہوتے ہیں۔ ان کی حیرت کو دور کرنے کے لئے وہ بیان کرتا ہے کہ وہ دنیا میں درحقیقت فضول خرچ تھا۔ لیکن جہنم کی طرح اعراف میں بھی ان مختلف بُری خصلتوں کو ایک ہی قسم کا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور دونوں کی سزا ایک ہی طریقے سے ملتی ہے۔ کیونکہ چیزیں بے ضرورت جمع کی جائیں یا بیجا طور پر خرچ ہوں، بات ایک ہی ہے۔

دوسری منزل میں بسنے والے بیٹو لوگ نجات حاصل کرنے کیلئے بالکل بھوکے پیاسے رہکر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف پھلوں سے لدے ہوئے درخت اور لطیف و خنک پانی کی نہریں موجود ہیں۔ مگر وہ ان نعمتوں کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔

وہ آخری منزل کے تنگ ترین راستے سے گذرتے ہیں۔ جس نے عدن کے بالکل نیچے پہاڑی کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ یہاں حرامکاروں اور عصمت فروشوں کی روحیں آتشیں شعلوں کی لپٹ سے منزہ و پاک کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے خلافِ فطرت افعال کا ارتکاب کیا۔ اور دوسرے وہ جو حد اعتدال سے گذر کر اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے۔

عدن میں پہنچنے کیلئے خود دانتے کو بھی ان شعلوں کی لپٹ میں سے گذرنا ہے۔ اس وقت تک اعراف میں اس کو کوئی جسمانی تکلیف اٹھانی نہیں پڑتی ہے۔ علاوہ اس کے کہ وہ ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچنے میں کچھ تھکن محسوس کرتا ہے جو حقیقتاً دیکھا جائے تو وہ تھکن بھی کچھ زیادہ ناقابل برداشت نہیں ہوتی کیونکہ فرشتوں کے پروں کا لمس لطیف ہر منزل سے گذرتے وقت پیشانی پر سے ایک گناہ کے نشانات کو یکے بعد دیگرے مٹاتا رہتا ہے۔ اور جوں جوں وہ نشانات مٹتے ہیں، تھکن کا احساس بھی کم ہوتا جاتا ہے

لیکن عدن میں اسے بیٹرس سے ملاقات کرنی ہے —— بیٹرس!

جو ابھی کے عہد شباب میں ایک مثالی محبوبہ تھی —— لہٰذا ملاقات سے پہلے ضروری ہے کہ وہ شعلوں میں جل بھن کر بالکل پاک ہو جائے۔ وہ شعلے درحقیقت جسمانی گناہ کرنے والوں کی ضمیر کی آواز ہے۔ جس نے رقیق عکس آتشیں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

دونوں شاعر عدن میں داخل ہو جاتے ہیں۔

عدن کی فضا چڑیوں کے چہچہوں، باد صبا کے لطیف جھونکوں اور پھولوں کی عطر بیز نکہتوں سے مرکب ہے۔ وہ ایک ندی کے قریب پہنچتے ہیں۔ جو بلور کی طرح صاف و شفاف ہے۔ یہ ندی گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان اس طرح بہتی ہے کہ چاند سورج کی شعاعیں اس کی سطح تک نہیں پہنچ سکتیں۔

یک وقت وہ دونوں ندی کے دوسرے ساحل پر بہت دور ایک حسین و جمیل خاتون کو گل چیننے میں مصروف پاتے ہیں۔ یہ ماٹلڈا ہے —— یعنی عملی زندگی کا ایک پیکر لطیف جسے دانتے نے اپنے تیسرے خواب میں پہلے سے دیکھ لیا تھا۔ سیاحت عدن کے دوران میں اسی خاتون کو دانتے کی راہبری کرنی ہے۔ وہ اس کی زبانی معلوم کرتا ہے کہ وہ ندی عدن کی دو مشہور ندیوں میں سے ایک ہے۔ اور اس کیلئے ضروری ہے کہ سماوی مسرتوں میں حصہ لینے سے قبل ان ندیوں کا پانی پیئے۔

ایک ندی کے پانی کا اثر باطل خیالات اور رکیک مشاہدات کے مذموم نقوش کو حافظے کی لوح سے مٹا دیتا ہے اور دوسری ندی کا پانی ان نیک اعمال کو از سر نو اجاگر کر دیتا ہے۔ جن کے نقوش بدی کے زیر اثر مدھم پڑ چکے ہوتے ہیں۔ پانی کا محض ایک جرعہ اپنے اعجاز سے روحوں کی کایا پلٹ کر دیتا ہے۔

عین اس وقت جب کہ ندی کے ایک ساحل پر دانتے اور ورجل اور دوسرے ساحل پر وہ ذی وقار خاتون خراماں خراماں ایک سمت میں چلتی ہوتی ہے۔ ایک عجیب و غریب نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک نہایت شاندار رتھ ہے جو عموماً مذہبی جلوسوں میں کام آتی ہے۔ اس رتھ کو ایک محیر العقل جانور کھینچ رہا ہے۔ جس کا نصف حصہ شیر کی مانند ہے اور باقی نصف عقاب سے مشابہ ہے۔ حکومت الٰہیہ کے ساتوں وزیر —— سات نیکیوں کے مظاہر خاص —— اس گاڑی کے پاسبان ہیں۔ باقی بزرگان دین اور مقدس ہستیاں صحائف آسمانی کی ایک ایک جلد اپنے ہاتھوں میں لئے ان کے جلو میں چل رہی ہیں۔ یہ جلوس جوں جوں قریب آتا ہے، نظارہ کی کیفیات روشن تر ہوتی جاتی ہیں۔

[illegible] شباب [illegible] ہے اور

[illegible] ہو جاتی ہے۔ وہ [illegible] کہ [illegible] کے اندر

[illegible] اور بہت سی برگزیدہ روحوں کا [illegible]

[illegible] پر جلوہ افروز ہے۔

"ایک حسین دوشیزہ میری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔

ذی حیات شعلوں کے رنگ میں ملبوس، سبز نقاب میں منہ چھپائے۔

اور چھاگئی میری روح پر جو عرصہ دراز سے،

اس کی موجودگی کے طفیل خوف و ہراس کی لپیٹ میں تھی۔

لیکن حقیقت ہے کہ میری آنکھیں اسکے دیدار کی تاب نہ لاسکیں،

کیونکہ ایک پُراسرار صداقت اسکے وجود سے الگ ہو کر فضا

میں طاری ہونے لگی تھی۔

جس کا لمس لطیف پاتے ہی میں نے دل کی گہرائیوں میں

الفتِ رفتہ کی قوتوں کو بیدار ہوتے محسوس کیا۔"

اب دانتے کی راہنمائی کرنا خود ورجل کے اختیار میں نہیں ہے۔ کیونکہ اس سماوی سفر کی اگلی منزلوں تک رسائی حاصل کرنے کیلئے عقلِ انسانی سے کہیں زیادہ الوہیت کی ضرورت ہے۔

بیٹریس سب سے پہلے دانتے کو ملعون کرنے لگتی ہے کہ تم نے میرے شباب کے متعلق جو بلند تصورات قائم کر رکھے تھے، ان کو افضل سطح سے نیچے کیوں گرنے دیا؟ تم نے مجھے خوابوں کی دنیا میں دیکھنے کی کوشش کیوں کی جبکہ تمہیں معلوم تھا کہ میں اپنے جسم کو دنیا میں خیرباد کہکر آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی ہوں۔

طعن و ملامت کے یہ الفاظ سنکر انفعال و ندامت میں ڈوب کر دانتے پر غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ چکرا کر سطحِ زمین پر بیٹریس کے قریب گر پڑتا ہے۔

جب اس کیفیت کے دور ہونے پر وہ دوبارہ ہوش سنبھالتا ہے تو اسے پہلی ندی سے پانی پینے کا حکم ملتا ہے۔ تاکہ وہ آلائش دنیوی سے پاک ہو جائے۔

اس حکم کو دائرہ عمل میں لاتے ہی دانتے محسوس کرتا ہے کہ بیٹریس کی درخشاں ہستی اس کی نگاہوں میں زیادہ روشن ہوتی جا رہی ہے۔ وہ معجزات کو خود بخود اسرار کے پردوں سے منکشف ہوتا دیکھتا ہے۔

اب وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ایک سماوی اور ایک ارضی ہستی کا باہمی اتصال بیٹریس کی نورانی شکل میں تخلیق پا رہا ہے۔ بیٹریس کو تمام ارتقائی مدارج طے کر لینے کے بعد دنیا کی کسی مخلوق سے تعلق نہیں رہتا۔ وہ عقلِ کل بنکر

[illegible] ہے [illegible] کی [illegible]

[illegible] کے ساتھ [illegible] ہے [illegible]

[illegible] کے [illegible] کر [illegible] جاتی ہے

پھر [illegible] تمام رنگ [illegible] تمام [illegible]

اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور صرف چار ہستیاں باقی رہ جاتی ہیں [illegible] ماٹلڈا اور دونوں شاعر —— یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر واقعی وہ فانی انسان جس نے ابھی جامِ فنا نہیں پیا ہے —— اس وقت اس جگہ موجود نہ ہوتا تو اس چمن کا گوشہ گوشہ مسرور روحوں سے معمور ہو جاتا ——

اس کے بعد بیٹریس دانتے سے کہتی ہے کہ وہ رسمی تکلفات کو بالکل ترک کر کے میرے ساتھ ساتھ چل۔ اور آخرکار وہ اسے دوسری ندی کے کنارے لے جاتی ہے تاکہ اس کا بھی پانی پی کر بالکل منزہ و پاک ہو جائے۔ جلتے پانی پیتا ہے اور اس کے حافظے کی لوح ان تمام نیک کاموں کی آئینہ بردار ہو جاتی ہے، جو اس نے اپنی زندگی میں انجام دیئے تھے۔

اسٹرائک

(از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی)

اسٹیشن پر ٹرین کھڑی ہے۔ آدمی پہ آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں تل رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔ کوئی صندوق پہ بیٹھا ہے۔ کوئی بستر پہ۔ کوئی لڑنے پر آمادہ۔ کوئی مرنے کو تیار۔ پر جگہ دینے کو راضی نہیں۔ ایک موٹے سے ساہوکار دری بچھائے بستر سے ٹیکا لگائے پیر پھیلائے آدھی سیٹ گھیرے بیٹھے ہیں۔ سلسلے مسافر انہیں دیکھ دیکھکر کھسک رہے ہیں۔ لیکن وقت یہ ہے کہ اچھے خاصے مٹاٹے ہاتھ پیروں سے کیل دو لٹھ بند نوکران کے ساتھ ہیں۔ کوئی دم نہیں مارتا۔ اتنے میں دو جنٹلمین سوٹ کیس لٹکائے اس ڈبہ میں آئے۔ اول تو دروازہ ہی پر دھینگا مشتی گا زوری کرنی پڑی۔ اب اندر جا کر جو دیکھا تو کہیں جگہ نظر نہیں آتی۔ یہ سیٹھ جی کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کے دونوں بوڈی گارڈ مزاحم۔ یہ جنٹلمین بھی نرے بابو نہیں تھے۔ سیٹھ جی کے نوکروں کو دیوار میں ٹھونس دیا۔ تھے ڈیل ڈول کے بھٹو کر کھاکر دم ہلانے لگے۔ یہ دیکھ کر سیٹھ جی صاحب کی ٹانگیں سکڑنی شروع ہوئیں اور ان میں سے ایک سیٹ پر اور دوسرا موٹے بھائی کے پیروں پر کچھ اس طرح بیٹھا کہ ان کی چیخ نکل گئی۔ اور پاؤں توند کے زیر سایہ پہنچ گئے۔ اب ہمارے سیٹھ جی نے اپنے ہزیمت خوردہ نمک خواروں کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے اراجواری تاش کے اس پتہ پر نظر ڈالتے جو وقت پر دغا دے گیا ہو۔ اور بولے رکھو یہ بسترا ہٹالے نا۔

اب کیمرہ پھیرا اور فرسٹ کلاس کا پر تکلف ڈبہ نظر آیا۔
صدی پہلے بچی ہوئی بانسے سیٹ پر اعلیٰ قسم کا قالین بچھا رہا ہے
پھلکے تکیے مرہانے اور بیش قیمت کمبل پائینتوں رکھ رہا ہے
اتنے میں ایک حسین نازک اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہر بالشت کا فیشن کا
ڈنڈا بغل میں دبائے سر پہ ہیٹ لگائے ایک ہاتھ میں ۹۹۹ کا ٹین سے
نہایت ٹھاٹھ سے تشریف لائے۔

ڈبہ میں داخل ہو کر نوکر سے دریافت کیا۔ سب ٹھیک ہے؟ اس نے کہا۔ جی حضور۔ بولے۔ اچھا تم سرونٹس میں جاؤ۔ اور خود پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے۔ اتنے میں میگزینز بیچنے والا آیا۔ جناب نے کچھ انگریزی کی اور کچھ اردو کی خرید فرمائیں۔ پانچ کا نوٹ اسے دیا۔ وہ ایک روپیہ کچھ آنے واپس کرنے لگا۔ سرکار نے وہ اس ہی کو بخشش کر دیا۔ وہ سلام کرکے سیدھا ہو لیا۔

اتنے میں ایک جوان خوبصورت لڑکی گنی کی ساڑھی باندھے قلی کے ساتھ ساتھ گھبرائی، بوکھلائی تھرڈ کلاس کے زنانہ درجہ پہ پہنچی۔ یہاں قیامت صغرا بپا تھی۔ نفسا نفسی کا عالم۔ دروازہ کا کھلنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس کے پیچھے نہ صرف سامان کے ڈھیر تھے بلکہ انسانوں کے انبار بھی لگے تھے۔ نیز پانچ سات درجن عورتیں اندر قلعہ بند ہوئی بیٹھی تھیں۔ اس نووارد کو دور سے آتا دیکھ کر فوج کی فوج کھڑکیوں پہ آن جمی۔ یہ ان کے دمدمے تھے۔ اور چشم ہائے خشم آلود سے تیر برسنے شروع ہوئے۔ جب دشمن قریب تر آیا تو بد کلامیوں کا ایک گراپ برسایا۔ حملہ آور تیورا گئی، پر ہمت نہ ہاری۔ اڑی کھڑی رہی۔ لیکن یہ اکیلا چنا وہ سورما بھی سہی بھاڑ کو کیا پھوڑ سکتا تھا۔ یہ زنان تیغ زبان اب گرم گفتار ہو چکی تھیں ——— گارڈ دوسری سیٹی دے رہا تھا کہ ہمارے حملہ آور یکہ سپاہی نے آخری وار کیا۔ اور کھڑکی کے راستہ ہراول کے طور پر اپنا اٹیچی کیس داخل کرنا چاہا۔ ٹڈی دلوں نے اسے ہاتھوں کی سنگینوں پر باہر ہی روکا۔ کوشش ناکام گئی۔ اٹیچی کیس ٹرین کے نیچے گرا۔ گاڑی چلنی شروع ہوئی۔

ہمارے فیشن ایبل چھیلا منہ میں سگریٹ لگائے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ماں کی جائی آج جانے کی ٹھان چکی تھی۔ ان کا دروازہ کھلا دیکھکر اوپر چڑھ آئی۔ کچھ انہوں نے بھی مدد کی قلی نے سامان اندر پھینک دیا۔ اب قلی پیسوں کیلئے لپکا چلا آ رہا ہے۔ اور محترمہ جیبیں ٹٹول رہی ہیں کہ صاحب بہادر نے جیب میں سے ایک روپیہ نکال باہر پھینک دیا۔ اب ٹرین پلیٹ فارم سے گذر چکی تھی۔ اور ان ہم قفس پرندوں نے آنکھیں بچا بچا کر ایک دوسرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جنٹلمین نے سامنے کی خالی سیٹ پہ بیگم کا بستر رکھا اور سوٹ کیس ایک طرف لگا دیا۔ اب ایک میگزین تو خود سنبھالی اور باقی ان کے سامنے رکھکر خموش ہو بیٹھے۔ موجودہ تہذیب بغیر باقاعدہ تعارف کے انسان کو انسان سے بات کرنیکی اجازت نہیں دیتی تھوڑی دیر بعد ڈائننگ کار بوائے کھانے کی بابت دریافت کرنے آیا۔

[illegible] ڈنر لاتے ہوں گیا [illegible] صاحب [illegible] بوئے نے کہا اور بیگم صاحب؟ اس سوال پر بیگم کے جسم کو تعصب خفیف ہو گا لیکن زبان کو نہیں۔ صاحب بہادر نے سر ہلایا اور فرمایا: "تم جو ڈنر لاؤ وہی آئے۔"

بوئے کا جانا اور بیگم صاحبہ کو غصہ آیا۔ بولیں: "آپ نے میرے لئے کھانا کیوں منگایا ہے؟" میر نے نہایت شرافت اور انسانیت سے جواب دیا: "کیا عرض کروں۔ ڈنر ٹائم ہونے والا ہے۔" یہ بولیں۔ "میں نہیں کھاؤں گی۔" وہ بولا۔ "کیا مضائقہ ہے۔ پکا ہے گا۔"

اس پر تو وہ آگ بگولا ہو گئی۔ بولی: "آپ امیروں کو رزق کی قدر نہیں روپیہ کی قیمت نہیں معلوم۔ ڈنر ٹائم ہو گیا تو ڈنر آنا لازمی کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ آج دنیا میں لاکھوں بندگان خدا بھوک کے مر رہے ہیں۔ کسی کا بچہ دودھ کو بلک رہا ہے کوئی مریض رنگترے کے عرق کو۔ ٹھہرے رہئیے یہ کچھ دن کے دھندے ہیں۔ یہ تفوق اب زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ دولت کا غیر منصفانہ سب بٹوارہ ختم کر دیا جائیگا۔ امتیازات اٹھا دیئے جائیں گے۔ ذرا مزدور کی آنکھ کھل جانے دیجیے۔"

ہمارا ہیرو نہایت اطمینان خاطر کے ساتھ یہ سب سنتا رہا۔ جب وہ چپ ہوئیں تو بولا: "کیا آپ سوشلسٹ ہیں؟"

لڑکی نے جواب دیا: "جی ہاں سوشلسٹ امیروں کی دشمن۔ غریبوں کی ہمدرد۔ مزدوروں کو بھوکا مار کر ڈنر کھانے والوں کی دشمن۔"

بیگم کی زبان پر یہ آخری جملہ تھا جو بوئے ڈنر لے کر آیا۔ اور اس فقرہ سے کچھ ایسا گھبرایا کہ اگر ہمارا ڈنر پرست ہیرو ٹرے نہ سنبھال لیتا تو رزق خاک میں مل ہی گیا ہوتا۔

بوئے نے نہایت تہذیب کے ساتھ کہا Excuse me sir

جنٹلمین نے کہا It is all right

بوئے نے قرینے سے میز پر ڈنر لگایا اور جاتے ہوئے پوچھا: "حضور کیا پئیں گے؟"

لڑکا بولا: "پانی۔"

بوئے :۔ اور بیگم صاحب؟

لڑکا:۔ برف کا پانی۔

بوئے کے چلے جانے کے بعد لڑکی بگڑ کر بولی: "یہ آپ نے کیا تماشہ بنا [illegible] نہایت [illegible] جواب دیا: "خدا گواہ ہے میں [illegible]

ایک کرنے [illegible]

دیا: "سپاہی؟" اس نے [illegible] صاحب [illegible] ہے؟" بوئے نے سر جھکایا اور کہا۔ "[illegible] بیگم صاحب؟"

ہیرو بولا: "دیکھو مس صاحب پڈنگ کھائیں گی۔"

بوئے ایک فش سیلاڈ کی اور ایک پڈنگ کی [illegible] لڑکے سے باہر ہی سے لیں کہ [illegible] اور بات نکل آئے۔

اب بیرے کے ترتیب سے [illegible] ڈشز کے کور کو [illegible] شروع کئے اور بولا "ابھی تو گرم گرم ہے کھا لیجئے۔ ٹھنڈا ہو کر بے کار ہو جائیگا۔"

مس صاحب نے جواب نہ دیا۔ اور اس طرف سے بیگانہ پن کی آڑ کر لی۔ —— اب ہیرو نے مزے لے لے کر مچھلی چکھنا شروع کی۔ اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا۔

"یہ تلی ہوئی مچھلی ہے۔ صبح سویرے [illegible] غریب مچھلی [illegible] اپنے بچوں کو سوتا چھوڑ، گھٹنوں گھٹنوں تک پانی میں جا کر اسے پکڑ لایا اور دکاندار کے ہاتھ بیچی۔ وہاں سے ہوٹل کے ملازم نے خریدا۔ باورچی نے نکالی۔ بوئے میم تک لایا —— گھونگٹ والی باندی نے سویرے ہی سویرے [illegible] دیا۔ دہی بلویا، گھی بنایا اور شہر میں بکا۔ ہوٹل کے باورچی خانہ تک آیا۔ پھر اس میں مچھلی تلی گئی۔ اب اگر ایسے پیسے والے کھانا چھوڑ دیں تو مچھلی والے کے بچے فاقوں مر جائیں۔ باندی کی بھینسیں بک جائیں۔ دوکاندار کا دیوالہ نکل جائے۔ ہوٹل کا عملہ نوکری سے برخاست کر دیا جائے۔ میں یہ کھانا نہیں صرف اپنا پیٹ بھر رہا ہوں بلکہ سینکڑوں غریبوں کا بھی پیٹ پال رہا ہوں۔"

اس اشتہا انگیز تمہید کے بعد اس نے ایک ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولا: "خوب بنائی ہے۔ اور ٹماٹو سوس کے ساتھ تو عجب مزا دے رہا ہے۔ یہ مٹن چاپس تو ظالم نے غضب کے تیار کئے ہیں —— گوشت حلق میں [illegible] انسان بڑا بے درد ہے۔ لذت طعام کے لئے لاکھوں کی جان لیتا ہے [illegible] بے زبان بکرے کے پارچے کر کے مزے لے لیکر کھاتا ہے —— [illegible] جذبہ آج مجھ میں پہلی دفعہ پیدا ہوا ہے۔ شاید [illegible] بائیں جانب کچھ کسک سی ہو رہی ہے [illegible] —— تو کیا [illegible]

اس لڑکی نے سامنے سے بکھری پیشانی نیچے بیٹھے ہوئے سے پھیر کر
دیکھا اور کہا۔ "بیچارہ کا بچہ کبھی گرتے ہوئے بچ جاتے ہیں۔"

لڑکا: "اچھا تو آپ کی رائے یہ ہے کہ پھر اس کا خیر میں شریک کیوں نہ ہو جائیے۔ یاد رکھئے خودکشی حرام ہے۔ اور نہ کھانے سے آدمی کا مرجانا لازمی ہے۔"

لڑکی نے نہایت طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "بیشک انسان ان کا کیڑا ہے۔ اسی واسطے اسے پیٹ کا کتا کہا گیا ہے۔"

لڑکا: "نہایت خوب خطاب ہے ماشاء اللہ۔ کتنا بڑا وفادار جانور ہے۔ رزق دینے والے ہاتھ کو پہچانتا ہے۔"

بس صاحبہ اس پر بگڑ گئیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ بولیں "رزق دینے والا اللہ ہے رزق دینے والا ہاتھ۔ امیروں کی اصطلاحیں۔ رئیسوں کے خوشنما نکتے۔ غلط ذہنیت کی اختراعیں۔ غلامی زدہ دماغوں کی تراشیں۔ کوئی کسی کو رزق نہیں دے سکتا۔ یہ سب بکواس ہے۔ لہو چوسنے والے اپنے کو رزاق تصور کرتے ہیں مجھے ان امیروں کی صورت سے نفرت ہے۔ اب بھی ایک سونے کے پجاری کی دنیا الٹنے جا رہی ہوں۔"

لڑکا: "یہ کام تو آپ اب بھی کر رہی ہیں۔ بہرکیف وہ ایسا کون سا خوش بخت ہے جس کی دنیا آپ تہ و بالا اور الٹنا چاہتی ہیں؟"

لڑکی: "ایک سرمایہ دار ملز اونر۔ سر احمد کریم۔ مزدوروں کی محنت پر عیش کرنے والا۔"

(یہ نام سنکر لڑکے کے ماتھے پر ایک شکن پڑی۔ لیکن خموشی سے سنتا رہا)

لڑکی: "انتہائی آوارہ۔ عیاش۔ آپ اسے جانتے ہیں؟"

لڑکا: "جی ہاں۔ کچھ یوں ہی سا۔"

لڑکی: "کہتے ہیں کہ ایک ایک رات میں اس کا ہوٹل کا بل چار چار ہزار روپیہ کا ہوجاتا ہے۔"

لڑکا: "ممکن تو ہے۔"

لڑکی: "جی ہاں ممکن کیسے ہوگا۔ جب شراب پانی کی طرح بہیگی تو آپ سمجھئے کئی ہزار تک جاتا ہے۔ اگر میاں کو خود صبح سے شام تک شراب پیتے رہے تو پتہ چلے۔"

لڑکا: "مجھے اس کا اتفاق نہیں ہوا۔ پھر ایک ایک رات کا اتنا بل کس طرح ہوجاتا ہے؟"

لڑکا: "کیا عرض کروں آپ شاید واقف نہیں۔ تاج میں اچھا ڈنر دس روپے پر ہیڈ (Per Head) پڑ جاتا ہے۔ سو اگر چار سو مہمان بلائے تو چار ہزار کا بل ہوجانا کوئی تعجب خیز چیز نہیں۔"

لڑکی: "مفت کا آتا ہے نا۔ ملیں چل رہی ہیں۔ گھر بیٹھے رقمیں برس رہی ہیں۔ ان کیلئے چار چار سو مہمان بلا لینا کون سی بڑی بات ہے۔"

لڑکا: "بعض اوقات بزنس کیلئے بھی ڈنر دینے ضروری ہوتے ہیں۔"

لڑکی: "بزنس۔ مزدور کا گلا کاٹنا۔ زیادہ سے زیادہ کام لینا۔ کم از کم اُجرت دینا۔ انسان کو جانور کی طرح استعمال کرنا۔ پیسے کی چیز کا روپیہ وصول کرنا۔ اسی کا نام اگر بزنس ہے تو اس ہی بزنس کی جڑیں اکھیڑنے میں جا رہی ہوں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں۔ مزدور اب تنگ آگئے ہیں اور سر احمد کریم کی ملز میں اسٹرائک ہوگئی ہے۔"

اس فقرہ پر لڑکے کے چہرہ پر فکر کے آثار نمایاں ہونے اور اس نے کہا۔ "کتنے عرصہ سے؟"

لڑکی: "آج چار روز ہوگئے۔ مزدور کام پر نہیں جاتے۔ مجھے بذریعہ تار بلایا گیا ہے۔ میاں کی عقل ٹھکانے لگا دوں گی۔ مجھے امیروں کی شکل سے نفرت ہے۔"

(وہ اتنا کہکر خوش ہوگئی۔ لڑکے نے پھر کہا)

لڑکا: "آپ کھانا تو کھا لیجئے۔"

لڑکی: "جناب آپ کو معلوم ہوجانا چاہئیے کہ مجھے امیروں کی اغذیا سے بھی دلی نفرت ہے۔ غریبوں سے ہمدردی پیدا کرنے کیلئے آج پورا ایک مہینہ ہونے آیا کہ میں نے سوائے چٹنی روٹی کے اور کچھ نہیں کھایا ہے۔"

لڑکا: "کیا معقول نقطہ ہے۔ آپ ٹماٹو سوس اور ڈبل روٹی ہی سے شوق فرمائیں۔"

لڑکی: "جناب کو معلوم ہوجانا چاہئیے کہ مجھے امیروں سے بات کرنی بھی گوارا نہیں۔ محض اتفاق سے میں اس ڈبہ میں آگئی ہوں۔ اگلے سٹیشن تک اپنی زبان مُبارک کو آرام دے لیں تو کرم ہوگا۔ وعدہ کرتی ہوں کہ اسکے بعد میں آپ کی ہم سفر نہیں رہونگی اور اپنی غریب بہنوں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں جا بیٹھوں گی۔"

یہ فقرہ سنکر لڑکے نے خموشی اختیار کی اور آہستہ آہستہ پوٹیٹو چپس کھاتا رہا۔ اتنے میں سٹیشن آیا۔ اور لڑکی اس ماحول پر ایک نفرت آمیز نظر ڈالتی ہوئی ڈبہ میں سے اتر گئی ——— تھرڈ کلاس کی خواتین نے جواب تک قطعہ بند

[illegible] میں [illegible] سے [illegible] کے [illegible]

اور ایک [illegible] بازم [illegible] کے [illegible] سادہ بس صاحب اُن کے پیچھے [illegible] ہوئی ڈبے میں داخل ہو گئیں۔ قریب کی سیٹ پر ایک صاحب تشریف فرما تھیں۔ خوش قسمتی سے اُن کی [illegible] پر ایک ذرا سا دانت [illegible] لگ گئی۔ اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ [illegible] صاحب جو گھبرا کر پہرے کو سر کیں تو دائیں جانب کسی کا تین سالہ بچہ کھڑا تھا اس کی ناک پر اُن کا گھٹنا لگا اور زخم بجت کی نکسیر پھوٹنے لگی۔ اتنے میں ریل چل پڑی ——— ہم نہیں کہہ سکتے کہ ڈبے میں کیا گزری۔ اس لئے کہ پہرے کا نقشہ پھر گیا اور پھر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ آنکھوں کے سامنے آگیا۔ برابر کے ڈبے میں سے چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں اور ہمارا ہیرو سخت مضطرب و پریشان ٹہل رہا تھا۔

خدا خدا کر کے سٹیشن آیا۔ ابھی ریل پوری طرح رُکی بھی نہ تھی اور ہمارا ہیرو دروازہ کھول رہا تھا کہ نوبت کی ولدادہ لیڈی بنی صاحبہ بحال تباہ مثل آدم و حوا جنت الغربا سے خارج کر دی گئیں ——— لڑکے نے یہ منظر دیکھا اور دروازہ کھول ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ محترمہ نہایت جز بز پھر اُسی کمپارٹمنٹ میں تشریف لے آئیں۔ اور لڑکے نے دروازہ بند کر کھڑکی میں سے باہر منہ نکال دیا۔ لیکن تماشہ پر نکھیوں سے دیکھتا رہا ——— بیگم نے پہلے تو بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اپنی خون آلود ساڑھی پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکالے۔ اب اِدھر اُدھر ٹٹولنا شروع کیا۔ کبھی ہاتھوں سے بالوں کو درست کرتیں۔ کبھی سوٹ کیس کی جیبوں میں کچھ تلاش کرتیں۔ ہیرو تاڑ گیا کہ کنگھا برش ڈھونڈا جا رہا ہے۔ ——— اُس نے نہایت خوشی سے اپنا ڈریسنگ کیس اٹھایا اور کھول کر ٹوئلٹ میں رکھ آیا اور پھر کھڑکی کے باہر منہ نکال یہ گیت ذرا آواز سے گانے لگا۔

گوری کنگھا برش تیار ہے
گوری کنگھا برش تیار ہے
تیرے جوبن پہ آئی بہار ہے
گوری کنگھا برش تیار ہے
تیرے ریشم سے بال۔ تیرے گورے گورے گال
تیری قمری سی چال۔ مورا جیا نثار ہے
گوری کنگھا برش تیار ہے

بس صاحبہ نے لڑکے کی طرف تیکھی چتون سے دیکھا اور اپنے کپڑے بغل میں مار ٹوئلٹ میں داخل ہو گئیں۔ لڑکا اتنے ایک غزل گا رہا ———

اب [illegible]

[illegible]

اس سے [illegible]

[illegible] سمجھ لیا۔ میں کہتا ہوں آپ [illegible]

لڑکی :- جی ہاں۔

لڑکا :- لیکن اگر آپ رات کو آرام سے نہ سوئیں تو صبح دماغ تھکا ہوا ہوگا۔

لڑکی :- یہی میں سوچ رہی ہوں۔

لڑکا :- اچھا تو میری ایک عرض قبول کر لیں۔ ماحضر [illegible] ملاحظہ فرمالیں تاکہ نیند اچھی آئے۔

لڑکی :- مہربانی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

لڑکا :- دیکھئے آپ جس کام کو جا رہی ہیں وہ آپ کو عزیز ہے؟

لڑکی :- بیشک۔

لڑکا :- اچھا تو اب یہ بتائیے کہ مزدوروں پر آپ اپنی تقریر سے [illegible] سکتی ہیں کہ وہ کام پر نہ جا سکیں۔ تمام دقتیں برداشت کر لیں مگر اپنی بات سے نہ ٹلیں۔ جان پر کھیل جائیں۔ لیکن مطالبات منظور کرکے دم لیں۔

لڑکی :- یقیناً۔

لڑکا :- اچھا تو اب یہ خیال کیجئے کہ اگر نقاہت کی وجہ سے آپ کی تقریر کمزور رہ گئی اور ان کے جذبات میں آگ نہ لگا سکی تو پھر آپ اپنے مشن میں ناکام رہیں گی۔ میں اسی لئے عرض کر رہا ہوں کہ کچھ کھا لیں۔ پھر آرام سے سو جائیں۔ تاکہ صبح تازہ دم اُٹھیں اور اپنے کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ یقین جانئے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس قسم کے معاملات انصاف اور ایمانداری سے طے پا جائیں۔

لڑکی :- لیکن میں تو صرف چٹنی روٹی کھاتی ہوں

لڑکا :- اس کا بھی انتظام ہے۔ دیکھئے اس لڑکی پر چٹنی لکھا ہوا ہے اور [illegible] روٹی حاضر ہے۔ اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے تو یہی سہی۔ لیکن کچھ کھا تو لیجئے۔

لڑکی :- بہت اچھا۔

اب لڑکی نے چٹنی روٹی کھانی شروع کی۔ اور لڑکا بھی [illegible] ساتھ دیتا رہا۔ باقی طشتریاں سامنے رکھی رہیں۔

لڑکی :- آپ یہ چیزیں کیوں نہیں کھاتے؟

لڑکا :- کچھ بھلا نہیں لگتا۔

لڑکی :۔ دیکھا! یہ بھی بھلی رہی گی۔ مذاق بھی ہوگا۔

لڑکا :۔ کیا عرض کروں۔ مجھے بھوک کے مارے جینے کا اچھا احساس
نہیں ہے۔ مجھ کو یہ ڈر تا ہوں کہ مذاق سامنے رکھا ہے اور آدمی
کیسے کھاتے نہیں۔ گوشت لیے یہ غذا کو پڑا لگتا ہے اور اس کے ذائقہ
بھی لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کھڑا ہی نعمت ہوا۔ پھر تو جو مقدر
میں ہے سو ہوکر رہے گا۔ لیکن مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ چٹنی
سالن کھائیں اور میں مٹن چاپس۔

لڑکی :۔ آپ کے خیالات اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے حق نہیں کہ آپ کو کسی
ایسی حرکت پر مجبور کروں جو آپ اچھی نہ سمجھیں —— خیر
بحالت مجبوری۔

لڑکا :۔ میری خاطر سے

یہ کہکر اُس نے چاپس کی طشتری سامنے کی۔ اب سلسلہ شروع ہوگیا۔
منہ کے ساتھ ساتھ زبان بھی حرکت میں آئی۔

لڑکی :۔ اجازت دیجئے کہ میں ایک بار پھر جناب کے کنگھے برش کا شکریہ ادا کروں
لیکن مجھے تعجب یہ ہے کہ آپ سمجھے کیونکر کہ مجھے ان چیزوں کی تلاش
ہے۔

لڑکا :۔ بندہ نواز! عورت اس بے تابی سے سوائے سنگار کی چیزوں
کے اور کوئی چیز تلاش نہیں کرتی۔

غرض کہ اس محترمہ نے کھانے کے دوران میں ہمارے ہیرو کو بتلایا کہ ان کا
نہ صرف سنگار کا سامان اس اٹیچی کیس میں تھا جو سٹیشن پر گر گیا بلکہ ٹکٹ اور
روپیہ پیسہ بھی سب اسی میں تھا۔ اگلے سٹیشن پر لڑکے نے گارڈ کو ایک فرسٹ
ٹکٹ کا کرایہ ادا کر دیا اور اب یہ دونوں آرام سے بیٹھ کر باتیں بنانے لگے۔

لڑکا :۔ معاف کیجئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ سو جائیں تاکہ صبح دماغ تازہ
ہو۔ اور آپ اچھی طرح تقریر کر سکیں۔ آپ نے تقریر تو تیار کر لی ہوگی۔

لڑکی :۔ میں تو پہلے سے کبھی تقریر تیار نہیں کرتی۔

لڑکا :۔ تعجب ہے۔

لڑکی :۔ کیوں

لڑکا :۔ ہمیں تو آکسفورڈ سے فن تقریر جو سکھایا ہے اور ہم کو سب سے
پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ کبھی کسی جلسہ میں تقریر تیار کئے بغیر بولنے کو مت
کھڑے ہونا۔ نیز گاندھی جی کو والا بھائی نیرو جی نے بھی یہی ہدایت کی تھی
جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

لڑکی :۔ صاحب میں تو ہمیشہ یونہی بولنے کھڑی ہو جاتی ہوں جس طرح خیالات
آتے جاتے ہیں سامعین کے سامنے پیش کرتی جاتی ہوں۔

لڑکا :۔ یہ صحیح ہے کہ دوران تقریر میں جو خیالات حسب موقع آئیں انہیں روکنا
نہیں چاہیئے۔ ورنہ تقریر میں روانی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اصل تقریر پہلے
سے تیار ہونی چاہیئے۔ اور اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتی ہیں
تو اسی ماحول پر کاربند ہو جائیے۔

لڑکی :۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے تو صبح وہاں پہنچتے ہی بولنا ہوگا اور
اور میری اس تقریر کے نتیجہ پر دنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔

لڑکا :۔ اگر آپ کوئی مضائقہ نہ سمجھیں تو بولنا شروع کریں۔ میں سنتا رہوں گا۔
تقریر تیار ہو جائے گی۔

لڑکی :۔ لیکن آپ کو جو تکلیف ہوگی۔

لڑکا :۔ آپ اس کی پرواہ نہ کیجیے۔ میں آپ کی کامیابی میں بیش از بیش
دلچسپی رکھتا ہوں اور اس کام کو اپنا ہی کام سمجھتا ہوں۔

غرضکہ ذرا حیل حجت کے بعد لڑکی نے کھڑے ہوکر تقریر شروع کی۔

لڑکی :۔ بھائیو! تم نے آج کے جلسہ میں بلا کر میری عزت افزائی کی ہے۔
یقین جانو مجھے تم سب ایسے ہی عزیز ہو جیسے میرے سگے بھائی۔
سرمایہ داروں نے تمہاری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ محنت تم کرتے
ہو۔ پھل وہ پاتے ہیں۔ تم جھونپڑیوں میں گذر بسر کر رہے ہو
وہ محلوں میں عیش منا رہے ہیں۔ تمہاری محنت سے جو مال حاصل
کیا جاتا ہے اس کا ایک لاکھواں حصہ بھی تمہارے حصہ میں نہیں
آتا۔ روس میں مزدور اٹھے انہوں نے سرمایہ داری کو ختم کر دیا۔ اب
وہاں امیر غریب کا فرق باقی نہیں۔ سب ایک حال میں ہیں۔ خدا کا شکر
ہے کہ ہمارے ملک کے مزدوروں کو بھی اپنے حقوق طلب کرنے کا خیال
پیدا ہوا۔ لیکن میری تم سے استدعا ہے کہ جب اس کام پر کھڑے
ہوئے ہو تو آخر تک پہنچا دینا انسان یا تو کوئی کام کرے نہیں۔ اور
کرے تو تنت تک پہنچائے۔

لڑکی یہاں تک پہنچی تھی کہ لڑکے نے ڈریسنگ کیس کھول ناخن کترنے
شروع کر دیئے۔ وہ رک گئی۔

لڑکا :۔ ہاں آگے۔

لڑکی :۔ میرا مطلب —— میں آپ لوگوں سے کہنا چاہتی ہوں ——
میرا مدعا ہے کہ ——

اٹھ کھڑے ہوں گے۔ [illegible] بیان [illegible]

لڑکا :۔ آپ [illegible] کیوں ہو گئیں ؟

لڑکی :۔ آپ [illegible] تو ہے نہیں۔

لڑکی :۔ محترم ! آپ کے سامنے جو دو ہزار کا مجمع ہوگا آپ توقع کرتی ہیں کہ وہ سب ہمہ تن گوش تبھی کی مورتیاں بنے بیٹھے رہیں گے ایک کا [illegible] ایک [illegible]۔ ایک ٹوپی اتار کر اپنا گنجا سر کھجائے گا دوسرا اس پر [illegible] گا۔ تیسرا اسے چپ رہنے کی ہدایت فرمائے گا۔ ایک آپ کے [illegible] کو گھورے گا اور برابر والے کو کہنی مارے گا۔ ایک آئیگا، ایک جائیگا۔ کسی کا بچہ رونے لگا۔ کسی کا پرس گم ہو جائیگا۔ وہ آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ یقین جانئے بعض اونگھ جائیں گے برابر والے ان کو ٹہوکا دے کر جگائیں گے ——— اگر اتنی سی بات پر آپ رک گئیں اور آپ کے خیالات کی ریل پٹڑی سے اتر گئی تو جب یہ سب ہوتے رہے گا تو آپ تقریر کا توازن اس کی روانی اور Tempo کس طرح قائم رکھ سکیں گی۔ میں نے تو جان کر ناخن کترنے شروع کئے تھے تاکہ آپ کے دماغی رجحان و یکسوئی کا امتحان کروں۔ نیز ہم کو کالج میں اسی طرح مشق کرائی جاتی ہے۔ جلسہ میں ہر نیا واقعہ مقرر کو موقع دیتا ہے کہ وہ اس سے اپنی تقریر کو ابھار کرلے جائے۔ جلسہ میں ہر غیر متوقع بات مقرر کے لئے ایک پیغام لاتی ہے۔ کامل فن اس سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ متوسط مقرر اسے نظر انداز کر جاتا ہے اور گھٹیا تو اذن دماغی ہاتھ سے دے دیتا ہے۔

لڑکی :۔ اچھا یہ فرمائیے کہ میری تقریر کے اس ٹکڑے کی بابت آپ کا کیا خیال ہے ؟

لڑکا :۔ صحیح صحیح عرض کروں۔

لڑکی :۔ بیشک

لڑکا :۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی ؟

لڑکی :۔ ہرگز نہیں۔

لڑکا :۔ اگر آپ اسی طرز پر چلیں تو یقین جانئے اشتراک جاری نہیں رکھ سکے گی۔ آپ کی تقریر میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو مزدوروں میں آگ لگا دیتی۔ انہیں بھڑکا دیتی۔ ان کی دکھتی رگ دبا کر تڑپا دیتی۔ نیز لیکچر شروع کیجئے اگر شروع میں آپ جلسہ پر چھا جائیں گی تو بیچ میں خدا نخواستہ کبھی اکھڑ سکتی ہیں۔ اور جو ابتدا ہی میں تقریر پھیکی رہ گئی تو پھر مجھے کوئی بات [illegible] نہیں رہتا۔

لڑکی :۔ اچھا پھر میری تقریر [illegible]

لڑکا :۔ آپ ناراض تو نہیں ہو گئیں ؟

لڑکی :۔ اطمینان رکھئے۔

لڑکا :۔ آپ نے ابتدا ہی غلط الفاظ سے کی تھی۔ ہر مقرر سے وہی [illegible] ہی کہکر خطاب کرتا ہے۔ سامعین اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ ان کے دماغ سو جاتے ہیں۔ تخاطب ان الفاظ سے ہونا چاہیئے۔ جن کیلئے وہ تیار نہ ہوں۔ تاکہ جاگ اٹھیں۔ سننے اور سمجھنے کا شوق ان میں پیدا ہو جائے۔ یاد رکھئے آپ کی تقریر کی بنیاد پہلے لفظ پر ہوتی ہے۔ آپ کو آگے جو عمارت بنانی ہے بنا اس کے مطابق ڈالئے تو پھر دیوار بھی خود بخود اٹھتی چلی جائیگی۔ ورنہ عمارت کمزور ہو جائیگی۔ اور نیو کمزور رہ جائیگی۔ عام دیکھنے والے یہ تو نہ بتا سکیں گے کہ عمارت میں عیب کیا ہے۔ لیکن نظر فریب نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر تقریر کا پہلا لفظ ساری تقریر کے مناسب نہیں ہے خطاب ... نامناسب الفاظ میں ہو گیا تو سننے والے اثر لے کر نہیں جائیں گے

لڑکی :۔ اچھا تو آپ کیونکر شروع کرتے ؟

لڑکا :۔ مجھے مشق نہیں رہی۔ ہاں کچھ اصول یاد ہیں جو عرض کر دیئے۔

لڑکی :۔ پھر بھی۔

غرض کہ لڑکی کے اصرار پر لڑکا کھڑا ہوا اور یوں بولنا شروع کیا۔

لڑکا :۔ آگ اور لوہے سے کھیلنے والے مزدورو ! فولاد کو پانی کر کے رکھ دینے والے جوانو ! آج میں تم کو خوشخبری دینے آئی ہوں۔ تمہارے دلوں کی دھاڑ سنکر پتھر کے بت پانی ہوئے جا رہے ہیں۔ سنگدل اپنی جگہ تھرا رہے ہیں۔ سرمایہ داری کی سربفلک عمارت لرزہ بر اندام ہے۔ استبداد کا جھنڈا جھک گیا ہے۔ ظالم مظلوم کے قدموں پر جھکنے کو ہے۔ دولت محنت کے دربار میں حاضر ہونا چاہتی ہے۔ محنت بہادروں کا دربار سجا ہوا ہے۔ اب لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ تم لاج رکھنے والے ہو۔ یاد رکھو تمام عالم کی نظریں تم پر ہیں۔ آج دنیا تمہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ ایک بھاری بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے۔ لیکن مزدور کے کندھے ہی جو جھک نہیں سکتے ——— یاد رکھو اگر اس وقت ایک قدم پیچھے ہٹے تو تمہاری اولادیں تمہیں کوسیں گی۔ آنیوالی نسلیں تمہاری قبروں پر لعنت بھیجیں گی

جبکہ تم اپنے لئے نہیں لڑتے۔ بلکہ اپنی اولاد کیلئے لڑتے ہو ——
تم جون جولائی کی گرمی میں جب آسمان سے آگ برستی ہے اور زمین تانبے کی طرح تپتی ہے اپنے کو بھٹیوں میں کس کیلئے جھونکتے ہو۔

لڑکی :۔ (بے ساختہ) اولاد کے لئے۔

لڑکا :۔ تم برفانی جاڑے میں ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر انجنوں کی پیاس بجھاتے ہو کس کے لئے؟

لڑکی :۔ اولاد کے لئے۔

لڑکا :۔ وہی اولاد جس کیلئے تم یہ سارے پاپڑ بیلتے ہو آج تم سے کہہ رہی ہے کہ بتاؤ جی پیچھے نہ ہٹنا —— فرض کرو ایک درندہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے۔ اور تمہارا بچہ تمہاری گود میں ہے۔ کیا تم بچے کو آگے کر دو گے؟

لڑکی :۔ ہرگز نہیں

لڑکا :۔ خود آگے بڑھ جاؤ گے۔

لڑکی :۔ بیشک۔

لڑکا :۔ اب میں ان ماؤں سے پوچھتی ہوں جو میرے بائیں ہاتھ بیٹھی ہیں۔ جن میں سے اکثر اپنے لعلوں کو سینے سے لگائے بیٹھی ہیں۔ جو خود گیلے میں سوئیں اور بچوں کو سوکھے میں سلایا۔ فرض کیجئے آگ بھڑک رہی ہے۔ آپ اپنی ممتا کو گود میں لئے کھڑی ہیں۔ سینوں پر ہاتھ رکھکر بتائیے۔ آپ بچے کو آگ سے دور رکھیں گی یا اپنے کو۔

لڑکی :۔ بچے کو۔

لڑکا :۔ بس تو سمجھ لیجے کہ اس وقت بھی دنیا میں آگ بھڑک رہی ہے۔ اب سرمایہ چاہتا ہے اپنے بچوں کو جھونک دیجے چاہے خود کود جائیے۔ —— اگر آپ اس وقت ان شعلوں سے گھبرا اٹھے تو یاد رکھئے کہ یہ آگ آپ کی موجودہ اولاد کو جھلس دیگی بلکہ آپ کے پوتوں اور پڑپوتوں کو خاک سیاہ کر دیگی اور آپ بھی اسکی لپٹ سے بچ نہیں سکیں گے۔ یہ آزمائش کا وقت ہے اور کندن کا کس نے جانچیے۔ منزل دور نہیں۔ یہ مزدور کے قدم ہیں۔ امیر کے نہیں۔ منزل سے ڈیرے تک نہیں سکتے۔

لڑکی جو اب تک بے خودی کے عالم میں ساکت و جامد بیٹھی سن رہی تھی کو سب چونکی۔ اور تھوڑی دیر بعد بچے کے رونے کی سی آواز نکالی ——

مقرر ایک لمحہ کے واسطے رکا اور پھر بولا۔

لڑکا :۔ غریب کا بچہ رو رہا ہے امیر کا ہنس رہا ہے۔ غریب کا بچہ پیدا ہوتے ہی بھوک کے معنی جان جاتا ہے۔ امیر مرتے دم تک اس لفظ سے ناآشنا رہتا ہے —— وہ وقت دور نہیں جب غریب اپنے بچوں کے رونے کی نہیں بلکہ ان کے قہقہوں کی آوازیں سنا کریں گے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے ہمیشہ ہنستے رہیں تو اس وقت ذرا سی کڑی جھیل لو۔ تو ملے دن آنے ہیں۔ تم یوں بھی تو اپنی اولاد کے لئے چوبیس گھنٹے خون پسینہ ایک کرتے ہو۔ صرف فرق اتنا ہے کہ ان مصیبتوں کے تم عادی ہو چکے ہو۔ اور یہ نئی بات تم کو کٹھن معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ یاد رکھو روزمرہ کی مصیبت سے ایک دفعہ کی آفت جس سے ہمیشہ کو نجات مل جائے نعمت ہے —— میرا تم پر بھروسہ ہے تم میری امیدوں کو ڈھاؤ گے نہیں ——
تم نے مجھے بلایا میں آ گئی۔ پر ایک سوال لیکر آئی ہوں۔ تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ میرے بھائی مجھے خالی ہاتھ نہیں جانے دینگے۔ غریب ہندوستانی بھائی بہنوں کا حق ادا کیا کرتے ہیں۔ یہ بہن بھکارن تمہارے دروازہ پر آئی ہے اور تمہاری بلائی ہوئی آئی ہے۔ اب لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ رکھو گے؟

لڑکی :۔ ہاں رکھیں گے۔

در و دیوار سے یہی آواز آئی۔ لڑکا تھک کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد لڑکی نے پانی کا گلاس بھر کر دیا اور کہا۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ کاش آپ اس کام میں میرے ساتھ ہوتے۔

لڑکا :۔ میں اب بھی ساتھ ہوں۔

لڑکی :۔ ایک بات رہ گئی

لڑکا :۔ وہ کیا؟

لڑکی :۔ اس تقریر میں مل اونرز کے خلاف میں نے مزدوروں کو بھڑکایا نہیں اور یہ لازمی ہے۔ مجھے اس سے قلبی نفرت ہے۔ ایک مرتبہ اس کے گھر کو آگ لگوا دینی چاہتی ہوں۔

لڑکا :۔ میں معافی چاہتا ہوں (کہکر پھر اٹھا اور بولنے لگا)

لڑکا :۔ آپ کو معلوم ہے وہ بھکشا کیا ہے جسے دینے کا آپ نے اتنی آسانی سے وعدہ کر لیا۔ سنئے میں کل سنگدل مل اونر کے پاس گلے میں جھولی ڈالکر جاؤں گی۔ گڑگڑاؤں گی۔ خوشامد کروں گی۔ کہ میرے بھائیوں

کا تو ہے۔ یہ وہ [illegible] داعی
[illegible] دکھائی نہیں دیتا [illegible] سب کچھ کر دیگی۔ لیکن [illegible]
دھتکاری جاؤں ٹھکرائی جاؤں نراش واپس آؤں تو [illegible] یہ
بھیک مانگتی ہوں کہ مجھ کو [illegible] کام ہو جاتا۔ ان [illegible] ہوں کر
یہ بھی تمہارے ساتھ جان دے دیگی۔

لڑکا پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور لڑکی نے ایک خاص نگاہ سے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ اور اسٹیشن ماسٹر نے ان کے کمپارٹمنٹ پر آکر پوچھا کہ سر احمد کریم اس ڈبہ میں ہیں۔ لڑکے نے کہا میں ہی ہوں۔ اس نے ایک تار دیا ——— لڑکی یہ نام سنکر پریشان سی ہو گئی اور لڑکا تار پڑھنے لگا۔ چہرہ پر ایک سکنڈ کے واسطے کچھ سایہ سا پڑا لیکن فوراً گذر گیا۔ جیسے سورج کے سامنے لکۂ ابر ایک لمحہ کیلئے آئے اور چلا [illegible] ——— اتنے میں ملازم آیا۔ بیش بہا کمخواب کا ڈریسنگ گاؤن اور [illegible] کا سلیپنگ سوٹ۔ سیپ کی تسبیح۔ قالین کی جانماز نکال سیٹ پر رکھ گیا لڑکا اٹھ باتھ روم میں گھس گیا۔ ہیروئن عورت ذات تجسس کی پتلی۔ خوا کی بنی [illegible] اور چپکے چپکے آن تار پڑھ لیا۔ لکھا تھا ——— پتہ نہ معلوم ہونیکی وجہ سے پیشتر اطلاع نہ کر سکے۔ ابھی معلوم ہوا کہ آپ اس ٹرین سے آرہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ مزدوروں نے اسٹرائک کر رکھی ہے۔ اسی گاڑی سے ایک سوشلسٹ لیڈر مس [illegible] ان کی بلائی ہوئی آ رہی ہیں۔ مزدور بگڑا ہوا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے خیر مقدم کو اسٹیشن پر موجود ہوگا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب ایک اسٹیشن پہلے اُتر جائیں۔ مزدوروں سے کوئی نازیبا حرکت ہو جانی بعید نہیں۔

ہیرو تھوڑی دیر بعد شب خوابی کے کپڑوں پر گراں بہا ڈریسنگ گاؤن پہنے بڑی سج دھج کے ساتھ باتھ روم سے برآمد ہوئے۔ قطب نما دیکھ جانماز بچھائی۔ لڑکی کے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے تھے۔ بولی اگر مضائقہ نہ ہو تو کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ تار کس بارے میں تھا۔ خدا نخواستہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔

لڑکا :۔ کچھ نہیں۔ بزنس تار تھا۔ ایک نیا معاملہ ہو رہا ہے۔

لڑکی :۔ کس قسم کا۔

لڑکا :۔ بارود اور دیا سلائی کا۔

اتنا کہہ جانماز بچھا نیت باندھ لی۔ جب نماز سے فارغ ہوا تو تسبیح لے سیٹ پر آن بیٹھا۔ لڑکی [illegible] ہے کہ کروٹیں بدل رہی ہے۔ آخر نہ رہ سکی تو پوچھا آپ بمبئی پر اُتریں گے؟ اس نے تسبیح دکھاتے ہوئے سر سے ہاں کا اشارہ کیا

[illegible] تسبیح [illegible] ہوا اٹھا۔ [illegible] ایک [illegible] کے تمام [illegible] کی جانب کروٹ لے [illegible] تو یہ سو چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تو ٹہلتی رہی۔ [illegible] میگزین بڑے [illegible] سے سیٹ پر [illegible]۔ ایک [illegible] کھانسی۔ کھنکاری۔ غرضکہ اپنی سی سب کچھ کی۔ پر وہ تو [illegible] سو رہا تھا۔ میرا خیر ٹس سے مس نہ ہوا ——— صبح جو لڑکی کی آنکھ کھلی تو یہ بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا۔ اور ملازم بستر طے کر رہا تھا۔ بیگم [illegible] گھس گئیں۔ اتنے میں یہ بھی نماز سے فارغ ہوئے۔ وہ بھی [illegible] نکل آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ چاء نہایت سلیقہ سے میز پر چنی ہے۔ تھوڑی سی ردو قدح کے بعد یہ پینے ہو بیٹھیں۔ اب باتیں ہونے لگیں۔

لڑکی :۔ ٹرین بمبئی کس وقت پہنچے گی؟

لڑکا :۔ آٹھ بجے

لڑکی :۔ اب کیا وقت ہے؟

لڑکا :۔ سات۔

لڑکی :۔ ابھی کے اسٹیشن بیچ میں آئیں گے۔

لڑکا :۔ کوئی تین۔

لڑکی :۔ تو کیا آپ بمبئی ہی پر اُتر جائیں گے؟

لڑکا :۔ جی ہاں۔

لڑکی :۔ میں کہتی ہوں ایک اسٹیشن اِدھر کیوں نہ اُتر جائیں۔

لڑکا :۔ کیوں؟

لڑکی :۔ یونہی میرا دل چاہ رہا تھا کہ بمبئی کی نواح کو صبح صبح دیکھوں۔

لڑکا :۔ آپ تو کچھ عرصہ ہمارے شہر میں ٹھیریں گی سیر کیجئے گا۔ میں سیر کرا دوں گا۔

لڑکی :۔ جناب نے اب تک اپنا پتہ تو مجھکو بتایا نہیں۔

لڑکا :۔ نہیں کہہ سکتا بمبئی پہنچ کر میرا پتہ بھی رہے گا یا نہیں۔

لڑکی :۔ کیا کہا۔

لڑکا :۔ کچھ نہیں میری مراد ہے کہ شاید وہاں پہنچ کر مجھے انتقال کرنا پڑے۔

لڑکی :۔ خدانخواستہ۔ میں آپکا مطلب نہیں سمجھی۔

لڑکا :۔ میرا مطلب ہے کہ میں جس مقام پر اب ہوں وہاں سے [illegible] اس وجہ سے فی الحال کوئی پتہ پیش نہیں کر سکتا۔

لڑکی:۔ جناب کا اسم گرامی بتایا۔ میرا نام انجم ہے اور جناب کا؟

لڑکے نے خوشی کے ساتھ اپنے سرہانے سے لفافہ جس میں تقرر نامہ تھا لفافہ کھول کر دیا۔ لڑکی نے اُسے پڑھا۔ پھر لڑکے کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے قصائی بکرے کو دیکھے یا اوپریشن سے پہلے ڈاکٹر مریض پر نگاہ ڈالے۔ پھر ہتھیار نکال کر بیٹھنے لگی۔ لڑکے نے احتجاج کیا۔ لیکن اُس نے ذرا پرواہ نہ کی ــــ اب آنچل اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ڈبہ میں ٹہلنے لگی۔

لڑکی :۔ آپ بمبئی پر اُتریں گے ؟

لڑکا :۔ جی ہاں۔

لڑکی :۔ معلوم ہے مزدور آپ کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔

لڑکا :۔ میں مقدرات کا قائل ہوں۔

لڑکی :۔ موت کے مُنہ میں جانا کس نے بتایا ہے۔

لڑکا :۔ موت وقت سے پہلے نہیں آتی۔

لڑکی :۔ آپ ڈرتے نہیں۔

لڑکا :۔ میں مرد ہوں۔

لڑکی :۔ میں آپ کو نہیں بچا سکوں گی۔

اس کے جواب میں لڑکا عجب انداز سے شانہ اُچکا کر کے مُسکرایا جس کے معنی تھے کہ آپ کیا اور آپ کی بساط کیا ــــ وہ پھر تھوڑی دیر ٹہلتی رہی۔ ذرا غصہ دھیما ہوا اور اب اُس نے نئے ہتھیاروں سے حملہ کیا اور خوشامدانہ لہجہ میں بولی۔

لڑکی :۔ کیا آپ کو میری خاطر عزیز نہیں ؟

لڑکا :۔ مجھے اپنی عزت دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

لڑکی :۔ آپ کو موت کشاں کشاں لے جا رہی ہے۔

لڑکا :۔ موت وقت سے پہلے آ نہیں سکتی اور آ کر ٹلتی نہیں۔

لڑکی :۔ آپ بے عزتی سے نہیں ڈرتے ؟

لڑکا :۔ یہ نامرد کے لئے بے عزتی ہے۔

لڑکی :۔ اچھا تو آپ بمبئی ہی کے سٹیشن پر اُتریں گے ؟

لڑکا :۔ ارادہ تو یہی ہے۔

لڑکی :۔ میرا ارادہ کچھ اور ہے۔

اتنا کہہ وہ خموشی سے دروازہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک سٹیشن آیا۔ یہ دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر اُتری۔ پھر اپنی جگہ آن کھڑی ہوئی۔ ریل چلنے لگی۔ پلیٹ فورم سے گذر رہی تھی کہ یہ کود پڑی۔

لڑکے نے گھبرا کر زنجیر کھینچ لی۔ ابھی ٹرین ٹھہرنے نہ پائی تھی کہ وہ بھی کودا۔ اب تو اژدہام ہوگیا۔ لڑکی کے سر میں چوٹ آئی تھی خون جاری تھا۔ لڑکے کا گھٹنا زخمی۔ سامان گارڈ کے حوالے کیا۔ ملازم ٹیکسی لایا۔ دونوں مقامی ڈاکٹر کے ہاں پہنچے۔

لڑکی سر کی تکلیف سے بے چین تھی لیکن چہرہ پر فتحمندی کے آثار کھیل رہے تھے۔ معمولی مرہم پٹی کے بعد دونوں بمبئی پہنچے۔ لڑکی ہسپتال میں داخل کر دی گئی۔ مزدوروں کا جم غفیر سٹیشن سے مایوس واپس گیا۔ اطلاع ملی جے ابھی ہوسپٹل میں زخمی پڑی ہیں۔ چند نمائندہ وہاں ملنے گئے وقت کی خوبی جب یہ کمرے کے دروازے پر پہنچے تو لڑکا مل کا مالک لنگڑاتا ہوا نکل رہا تھا۔ مزدوروں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا ــــ اب یہ کمرے میں داخل ہوئے۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد دریافت کیا کہ جلسہ کب کیا جائے۔ بات چیت کے دوران میں ایک نے کہا۔ آپ سر احمد کریم کو جانتی ہیں؟ لڑکی کچھ سٹپٹا سی گئی۔ یہ تھوڑی دیر باتیں کر کے بعد چلے گئے۔ لیکن مُشتبہ۔ اب چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ ایک بولا بک گئی۔ دوسرے نے کہا دھوکا ہے۔ غرضکہ افواہ کی لاکھ زبانیں جنبش میں آئیں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لڑکی کو کچھ خبر نہیں۔ وہ غریب ہوسپٹل میں پڑی ہے کہ اتنے میں سر سہراب جی مل اونر کا ایجنٹ آیا۔ کارڈ پر لکھا تھا بہت ضروری کام ہے۔ لڑکی نے بُلا لیا۔ یہ ایک جہاں دیدہ شخص پہلے تو خیریت مزاج دریافت کی۔ پھر کہا سر سہراب جی نے کہا ہے کہ ہم ہر خدمت کیلئے حاضر ہیں شام کو سیر کیلئے موٹر بھیج دی جائے۔ لڑکی نے شکریہ کے ساتھ انکار کیا۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے یہ ذکر بھی چھیڑ دیا کہ سر احمد کریم سے ان کی تجارتی رقابت ہے اور اس کی مل میں ہڑتال جاری رکھنے میں وہ ہر طرح مدد دینے کو تیار ہیں۔ اِس بات پر لڑکی کے تیور بدلے۔ لیکن کچھ سوچ کر خموش ہوگئی۔ ان حضرت نے بر سبیل تذکرہ یہ بھی فرمایا کہ مل ہینڈز میں آپ کے خلاف خیالات پیدا ہوگئے ہیں۔ نیز شہر میں یہ بھی چرچا ہے کہ سر احمد کریم سے آپ کی رسم ہے۔ لوگوں نے انہیں یہاں آتے جاتے بھی دیکھا ہے۔ لڑکی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور کہا مجھے زیادہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پر یہ کب ٹلنے والے تھے۔ بولے۔ بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ آپ ہرگز نہ بولئے۔ میں باتیں کرتا رہونگا تا کہ آپ کا دل بہلے۔ اب اس نے دُنیا بھر کے قصے شروع کر دیئے۔ اور باتوں باتوں میں یہ بھی کان میں ڈال دی کہ سر احمد کریم نے آپ کی پوزیشن خراب کرنے کے لئے اپنے اور آپ کے تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے۔ ہمارے

کہ تو تی۔ ڈی میں کی مل ہی بنتے ہیں۔ ہم گورنمنٹ کی خبر لیتے ہیں۔ لڑکی کا ہاتھ بستر سے اٹھ کر اُن کے منہ کی طرف ارہا تھا۔ لیکن رُک گیا اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک سی آگئی۔ اتنے میں نرس نے آکر اطلاع دی کہ مسٹر احمد کریم آئے ہیں۔ یہ نام سنکر مسٹر سہراب کے ایجنٹ بغلیں جھانکنے لگے اور لڑکی سے اجازت لیکر رخصت ہوئے۔ دروازے پر دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ انہوں نے نہایت تپاک سے سلام کیا۔ لڑکے نے متانت سے جواب دیا۔ اندر آنے کے بعد ہونے زخموں وغیرہ کی بابت دریافت کیا پھر کہا۔

لڑکا :۔ میں ایک بات کی معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ احتیاط کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

لڑکی :۔ کیا بات؟

لڑکا :۔ میں بغیر وقت کا تعین کئے آجاتا ہوں۔

لڑکی :۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔

لڑکا :۔ تاہم آپ کے پاس دس اور بھی ملنے والے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی میرے سامنے آنا پسند کرے۔ کوئی نہ کرے۔ اور شاید آپ بھی اسے اچھا نہ سمجھیں۔

لڑکی :۔ مطلب؟

لڑکا :۔ کچھ نہیں۔ یہ سیاست کی دنیا ہے۔ اس میں سب ہی رنگ کرنے پڑتے ہیں۔

لڑکی :۔ (بستر پر اٹھ بیٹھی) صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ جناب مجھکو مسٹر سہراب کا ایجنٹ تصور فرماتے ہیں۔

لڑکا :۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ اس قدر جانتا ہوں کہ ان کا ایجنٹ یہاں آیا تھا میں آتا تھا کہ وہ نکلے۔

لڑکی :۔ جناب کو معلوم ہونا چاہئیے کہ مجھے پورا پورا اختیار ہے جس سے چاہوں ملوں اور جس سے چاہوں نہ ملوں۔ نیز یہ امر بھی گوش گذار کر دینا چاہتی ہوں کہ میں بھی یہاں لیٹی لیٹی سب افواہیں سنتی رہتی ہوں

لڑکا :۔ کیا افواہ؟

لڑکی :۔ کچھ نہیں۔ صرف اتنی کہ مل ہینڈز کی نگاہوں میں میری پوزیشن خراب کرنے کیلئے حضور میری اور اپنی اتفاقی شناسائی کو شہرت دے رہے ہیں۔ بہرکیف یہ سیاست کی دنیا ہے۔ اس میں سب رنگ کرنے پڑتے ہیں۔

لڑکا یہ الفاظ سنکر کھڑا ہو گیا۔ چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زہر آلود نشتر دل و جگر کے پار ہو گیا ہو اور وہ بھی کسی دوست کے ہاتھ سے ـــــــ

نہایت ۔۔۔

منہ چھپا کر رونا شروع کیا ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

لڑکا تمام رات حق تعالیٰ ۔۔۔ ۔۔۔ جہاں ۔۔۔ ۔۔۔

دولت لا کر ۔۔۔ شربت کی ۔۔۔ میں شراب ۔۔۔ ۔۔۔ سینہ پھیرا۔ لیکن زہر میں بجھی ہوئی سوئیوں سے۔ پھول کا ۔۔۔ ۔۔۔ پھول دیکھ کانٹوں میں گھس گیا۔ دامن تار تار ہو گیا۔ پھول اٹھنے آیا ـــــــ پیاسا شراب سے خشک ہونٹ تر کرنے چاہتا تھا۔ ۔۔۔ ۔۔۔ گھر میں ۔۔۔ ڈھونڈتا پھرا۔ گا ۔۔۔ کا پورا آنکھ کا اندھا کنچن کو کندن سمجھا ـــــــ لیکن جب اس دنیا سے تھکا ہوا واپس آیا تو زبان پر یہ شعر تھا۔

بے یار جا کے ہم نے گلستاں میں کیا کیا
ہاں یہ کیا کہ داغ کہن کو ہرا کیا

دوسرے دن لڑکی کے پاس پھوپی سہراب جی کے ایجنٹ آن موجود ہوئے اور لگے الٹی سیدھی باتیں کرنے۔ آج لڑکی کا رویہ بدلا ہوا تھا وہ اُن کی باتیں غور سے سُن رہی تھی۔ رجحان طبع دیکھکر انہوں نے کہہ ہی دیا کہ اگر وہ مسٹر احمد کریم کی طرز میں اسٹرائک ابھی اور جاری رکھوائیں تو پانچ ہزار روپیہ روز کے حساب سے نذر کیا جا سکتا ہے۔ یہ فقرہ لڑکی نے تلخ دوا کے گھونٹ کی طرح حلق سے اُتارا۔ اب انہوں نے لڑکی کو ان تمام لوگوں کے نام بتا دئیے جو اُن کی جانب سے مل میں فساد کرانے کے لئے چھوڑے گئے تھے۔ لڑکی نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

لڑکی :۔ لیکن میری پوزیشن تو مل ہینڈز میں خراب ہو چکی ہے۔ وہ اب میری کیوں سُننے لگے۔

ایجنٹ :۔ اس کا انتظام کر لیا جائیگا۔ بشرطیکہ آپ ہمارے کہنے پر چلیں

لڑکی :۔ آخر کس طرح؟

ایجنٹ :۔ دیکھئے اوّل تو اسٹرائک کے تمام لیڈر ہمارے آدمی ہیں اور کرائے ڈور اُن کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرف چاہیں گے موڑ دینگے۔ دوسرے آپ کی تقریر میں ایسے پہلو رکھے جائیں گے جن سے آپ کی پوزیشن صاف ہو جائے اور سارا الزام مل کے مالک کے سر جائے۔

لڑکی :۔ اس کے لئے آپ کیا پہلو اختیار کریں گے؟

ایجنٹ :۔ واقعات کو دوسرے رنگ میں ڈھال لیا جائے گا۔ مثلاً آپ یہ کہیں سے بس لئے کہ میں کہ مسٹر احمد کریم آپ کی عزت پر ہاتھ ڈال رہے تھے۔

لڑکی :- پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں میں نے عدالت کا دروازہ کیوں نہ کھٹکھٹایا۔

ایجنٹ :- اصل تو سب ان تفصیلات کو سوچا نہیں۔ تاہم اس کا جواب بھی تو ہے۔

لڑکی :- وہ کیا ؟

ایجنٹ :- آپ نے ترک موالات کے زمانہ سے انگریزی عدالت میں جانے کا عہد کر لیا ہے۔ اس لئے ان کو قرار واقعی سزا نہ دلا سکیں۔

لڑکی :- میں سمجھ گئی۔ اچھا میرا دماغ زیادہ کام نہیں کر رہا۔ آپ یہ تقریر لکھوا کر بھیج دیجئے۔ اور ان کے نام مجھے لکھ دیجئے جو آپ کے ایجنسی میں کام کر رہے ہیں۔

نام تو ان صاحب نے فوراً لکھ دیئے اور تقریر بھیجنے کا وعدہ کر گئے ——— لڑکی کو اول تو پہلے ہی سے رنج تھا پھر مرضی کے خلاف باتیں سنیں اور ضبط کیا۔ بخار تیز ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ تھوڑی دیر بعد نرس نے لا کر ایک موٹا سا لفافہ دیا۔ جس میں ہیرو کی جانب سے خط تھا اور چند کاغذات۔ لکھا تھا ——— افسوس ہے کہ راقم الحروف نے آپ کی پوزیشن دانستہ یا نادانستہ خراب کی۔ بہرکیف منسلکہ تقریر اس کی تلافی کر دیگی۔

ظالم نے وہی پہلو لیا تھا جو ایجنٹ نے تجویز کیا تھا۔

تقریر کا پڑھنا تھا کہ لڑکی کی حالت خراب ہو گئی۔ اب جو ڈاکٹر نے آ کر دیکھا تو بے ہوش پڑی تھی اور ہذیانی کیفیت۔ بار بار کریم کا نام لیتی۔ اور کہتی تھی۔ کس قیامت کے بینامے میرے نام آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے سر کریم کو ٹیلیفون کر کے حالت بتائی۔ وہ گھبرایا ہوا آیا۔ ڈاکٹر نے کہا بخار بگڑ گیا ہے۔ وہ بڑی دیر تک سر جھکائے لڑکی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ وہ بار بار آنکھ اٹھا کر دیکھتی مگر پہچانتی نہ تھی۔ بیہوشی کے دورے آتے رہے۔ جس کا نام لیکر پکارا اس نے آنکھ بھر کر دیکھا بھی مگر نظر میں تفہیم و تفہیم سے خالی تھیں مسلسل بہک رہی تھی۔ کبھی کہتی۔ کریم۔ انجم غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ تم کو کبھی نہیں۔ لیکن مر جاؤں گی جھکے گی نہیں۔ اپنے نام کی لاج رکھو۔ بجاؤ۔ کبھی تقریر کے فقرہ دہراتی۔ گاہ اپنی پوزیشن خاک میں ملانے پر آمادگی ظاہر کرتی تو کبھی بیہودہ سر سہراب کو برا بھلا کہنے لگی۔ رات گئے لڑکا وہاں سے واپس آیا۔ انجم کی طبیعت بھی قدرے سکون پذیر تھی۔ ادھر یہ پریشانی خاطر لئے پہنچا اور لڑکی کی آنکھ کھلی۔ سر پر ہاتھ رکھا۔ کچھ سوچا۔ اب دماغ کی حالت درست تھی لیکن سخت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ نرس کی نگاہیں مریض پر جمی تھیں۔ مریضہ کی طرف اٹھی مگر کریم کے دو گھونٹ دیئے۔ نبض دیکھی۔ سر کا کپڑا بدلا اور کہا سو جاؤ۔ اور خود چارٹ پر کچھ نوٹ کرنے لگی۔ انجم نے کاغذ قلم مانگا۔ نرس نے دینے سے انکار کیا۔ مریض نے لجاجت سے کہا۔ بس دو سطریں لکھونگی اس کے بغیر مجھے سکون نہیں ہوگا۔ ایک فرض انجام دینا ہے۔ نرس کو ترس آ گیا۔ کچھ مناسب بھی یہی سمجھا۔ فاؤنٹین پن اور کاغذ دے دیا۔ لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ زیادہ نہ لکھیں۔ اب کمزوری اور جذبات سے کپکپاتے ہاتھوں سے لڑکی نے لکھنا شروع کیا۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

جناب کی مل میں مندرجہ ذیل ملازمین سر سہراب سے ملے ہوئے ہیں نیز اسٹرائک بھی انہوں نے ہی کرائی ہے

مطلع کنندہ

ایک غلط فہمی کا شکار ۔ خوددار

لفافہ پر کریم کا پتہ لکھ بند کر تکیہ پر سر رکھ پھر پڑ گئی۔ انتہائی کمزور ہو چکی تھی۔ اتنی تکان بھی برداشت نہ کر سکی اور بے سدھ پڑ گئی ——— صبح ہی کریم کو خط ملا۔ پڑھ کر بے چین ہو گیا۔ سیدھا ہسپتال پہنچا۔ موقع شناس نرس ٹل گئی۔ مگر جاتے جاتے اتنا کہہ گئی کہ زیادہ باتیں نہ کیجئے گا۔ یہ بہت کمزور ہیں۔ تھوڑی دیر تو خموشی طاری رہی۔ وہ ہم سے چپ ہیں ہم ان سے چپ ہیں۔ منانے والا کوئی تھا نہیں جو مناتا۔ لڑکا سر جھکائے کرسی پر بیٹھا رہا لڑکی کا سر تکیہ پر پڑا رہا۔ تھوڑی دیر میں انجم کے آنسوؤں سے تکیہ تر ہو گیا۔ اب لڑکے نے آنکھ اٹھا کر دیکھا گھبرا کر اٹھا۔ پانی کا گلاس بھر کر دیا اور پھر پاؤں پکڑ لئے۔ درمیان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت ——— بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر ——— جانبین سے آنکھوں آنکھوں میں اظہار ندامت و پشیمانی ہوا۔ اور یہ قرار پایا کہ آئندہ کسی حالت میں بھی ایک دوسرے کی طرف سے غلط فہمی میں نہیں پڑیں گے۔ جو بات ہوگی صاف صاف پوچھ لیں گے ——— انجم کے اصرار پر یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ وہ سہراب سے ساز باز کے معاملات کی تہہ تک پہنچ جائے اور پھر جیسا مناسب ہو اقدام کیا جائے۔ اتنے میں نرس دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آئی۔ کریم اجازت لے کر رخصت ہوا۔ انجم اس روز سوائے سر سہراب کے ایجنٹ کے اور کسی سے نہ ملی۔

اسٹرائک ابھی تک جاری تھی۔ انجم کی علالت نے پروگرام اپسٹ کر دیا تھا۔ لیڈر سر جوڑ کر بیٹھے۔ آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی شعلے بھڑکتے رکھنے

فنڈ۔ مزدوروں کو کسی نہ کسی دُھن میں لگائے رکھنا بہت ضروری ہے سکون پیدا کرنے کا کام تو دیتا ہے اور بیٹھے بٹھائے کام بھی آتا ہے۔ جہاں کے تنخواہ داروں نے ہڑتال شروع کر دی تو کیا جائے۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ اوّل تو مزدوروں ہی سے کافی چندہ جمع کیا جا چکا تھا۔ علاوہ بریں سرمایہ داروں کی سرپرستی بھی شامل حال تھی —— بڑے بڑے مزدور پرست شعرا علاوہ ہندوستان سے بلائے گئے۔ علاوہ سفر خرچ کے کسی نے دو سو لئے۔ کسی نے چار سو ایک صاحب تو ٹھیرے بھی ناچ میں۔ ان میں سے ہر ایک کا سواگت سٹیشن پر بڑے زور شور سے ہوا۔ گلے میں ہار پڑے، پھول نچھاور کئے گئے۔ مزدوروں کی گاڑھی کمائی ٹھیک لگی۔

چوپاٹی پر مشاعرہ ہونا قرار پایا۔ مزدور کے گھر اندھیرا تھا۔ یہاں دن نکلا ہوا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ننگے پھر رہے تھے۔ یہاں آرائش میں تھان کے تھان خرچ کر دیئے گئے تھے۔ وہاں ٹکڑا کھانے کو نہ تھا۔ یہاں پان سگریٹ سوڈا لیمن کا دور تھا۔ اس کے بچوں جلوسوں کے ساتھ ننگے پیر پھرتے پھرتے چھالے پڑ گئے تھے۔ یہاں مزدور نواز شعراء کے لئے موٹریں دوڑ رہی تھیں —— سامنے سے ایک جوگی اور جوگن گاتے ہوئے گذرے۔

دُنیا ایک تماشہ بابا۔ دُنیا ایک تماشہ

مُورکھ کے گھر فاقہ بابا۔ مُورکھ کے گھر فاقہ

ایک کمائے ایک لٹائے دُنیا یہی کہلائے

مُورکھ کے گھر فاقہ بابا۔ مُورکھ کے گھر فاقہ

بھبوت ملے بال بکھیرے یہ بھی مجمع میں مل گئے۔ اب منتظمین پریشان خاطر ادھر اُدھر دوڑتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ ایک شاعر صاحب پی کر بگڑ گئے ہیں اور بیٹھے تمام چھوٹے بڑے لیڈرز کو بے نقط سنا رہے ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ اپنے ساتھ ایک بین چھلا لائے ہیں اور ان کے نام کے پچاس مزید چاہتے ہیں ورنہ مشاعرہ میں آنے سے قطعاً انکار۔ چار سو کی رقم پہلے چیر چکے ہیں۔ منتظمین کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ یا تو وہ رقم بھی آئی گئی سمجھیں یا پچاس اور بھینٹ چڑھائیں۔ یہ آوازیں جوگی جوگن کے کانوں تک پہنچیں۔ جوگی مسکرایا۔ جوگن نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

اب مشاعرہ شروع ہوا۔ کسی نے غزل پڑھی۔ کسی نے نظم بعض نے گیت گائے۔ ایک مقبول ہوا۔ ایک مردود۔ سامعین نے کسی کو بٹھانے کا حکم صادر کیا۔ کسی کو پڑھوانے کا۔

ایک صاحب نے یہ گیت الاپا اور داد سخنوری لی۔

ہم باپ کی دُنیا ڈھا دیں گے

ایک [illegible] ہو گئے

ایک اور بزرگ کھڑے ہوئے انہوں نے بڑے پُر جوش انداز میں یزید کی شان میں قصیدہ پڑھ ڈالا۔ سامعین میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کفر کفر کی آوازیں بلند ہوئیں۔ صدر اور منتظمین نے خوشی اشتعال کے [illegible] گئے۔ دو چار پتھر بھی سٹیج تک پہنچے۔ مجمع قابو سے نکلا جاتا تھا۔ صدر نے کھڑے ہو کر سکون کی تلقین فرمائی۔ لیکن جذبات بھڑک چکے تھے۔ نکال دو کی صدائیں بلند تھیں۔ آخر سامعین میں سے ایک شخص اُٹھا۔ جناب صدر سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے دریافت کیا کہ ان کی تقریر کا مدعا کیا ہوگا؟ جواب ملا مجمع کو پُر سکون بنانا۔ صدر کی اجازت سے یہ مرد خدا سٹیج پر آیا۔ سامعین اس سے روشناس معلوم ہوتے تھے۔ مائک کے پاس جا کر آپ نے کہا بھائیو! اوّل تو میں جناب صدر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے از راہ ذرہ نوازی اس کمترین کو سٹیج پر آنے کی اجازت عطا فرمائی۔ اور آپ سے دو دو باتیں کرنے کا موقعہ دیا۔ پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو شعرا تشریف فرما ہیں ان کے سفر خرچ اور اس سے بہت زیادہ کی مزدور سبھا کفیل ہوئی ہے ذرا اس کا خیال ہے نیز ہر شخص کو اپنے بزرگوں کی تعریف کرنے کا حق ہے۔ جیسا کہ ہم اپنے اپنے بڑوں کی توصیف کرتے ہیں۔ ان صاحب نے اپنے بزرگوں کی ثنا خوانی کی۔ ان کے بزرگ یزید، شیطان اور ابوجہل ہی ہوں گے ——

یہ الفاظ سن کر مجمع ہنسنے لگا اور پُر سکون کیفیت طاری ہو گئی۔ لیکن شیطان پرست یزید نواز شاعر صاحب مشاعرے سے نہایت برہم ایک باڈی گارڈ کے ہمراہ نکلے۔ سنا ہے راستہ میں واد بے داد ہوئی۔ اور ان بزرگ نے مسجد میں پناہ لی —— تیری شان تجھے بُرا کہنے والے بھی تیری ہی دامن کرم میں پناہ لیتے ہیں۔ جلّ جلالہٗ۔

اب ایک اور صاحب نہایت معشوقانہ انداز سے بل کھاتے ہوئے سامنے آئے اور ایک مختصر سی تقریر کے بعد یہ بول الاپے۔

مزدور کے دم سے ہے سنسار

مزدور ہے سب کا پالن ہار

اس "پالن ہار" نے سنسار ہلا دیا۔ جلسہ بالکل بے قابو ہو گیا۔ ٹوپیاں بھی اُچھلیں۔ جوتیاں بھی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ جو تم بیزار ہوئی۔ محفل مشاعرہ ایک [illegible] تھا جہنم کا۔ مزدور کو پاس رکھنے والے [illegible] چور پاس سب دوسرے وقت پر [illegible]۔ انتہائی [illegible] ایک دوست کے گھر میں جا کر چھپے۔ جوگی جوگن نے بھی [illegible] ایک طرف

بند ہوا کر رہی تھی۔ تھوڑا تھوڑا سے ان کو آتا دیکھکر وہ دفعہ کھول دیا۔ یہ دونوں ہی ہو یا پہنچے۔ کریم کی کوٹھی کے پچھلے دروازہ پر موٹر رکی اور یہ جوڑا کمرہ میں داخل ہوا۔ جب جوگ آئے تو یہ اس روپیہ بھی آنے تو کریم اور انجم تھے۔

لڑکی ہوسپٹل سے آ کر ایک فلیٹ پر آ رہی تھی۔ دوسرے دن صبح ہی سرسبز باب کے ایجنٹ نہایت سراسیمہ پہنچے۔ بولے سارا کام بگڑ گیا۔ اب لاج آپ کے ہاتھ ہے۔ لڑکی بولی کیا ہوا۔ انہوں نے رات کی تمام حالت بیان کی۔ سٹرائک سخت شست کیا۔ پھر یہ بتایا کہ ہمارے ایجنٹس کے علاوہ مزدوروں کا ایک اور لیڈر بھی ہے جو ہم سے اتفاق نہیں رکھتا۔ کل رات بھی اس نے ایک شاعر کو خفا کر دیا۔ مزدور بہت کچھ اس کے کہنے میں ہیں۔ لڑکی بولی تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں ایجنٹ نے جواب دیا وہ آپ کو بہت مانتا ہے۔ آپ اگر اسے اور اسکے ساتھیوں کو سمجھا دیں تو کام بن جائیگا۔ نہیں تو یہ بنا بنایا کھیل خراب ہوا جا رہا ہے۔ اور پھر آپ جانتی ہیں یہ سب سرمایہ دار مزدور کو پیس ڈالے گا۔ اتنا کہتے ہوئے نہایت بڑی رقم کا چیک میز پر رکھدیا۔ لڑکی نے کنکھیوں سے دیکھا۔ اور بولی یقیناً اس ٹھوکر سے مزدور کو بچانا ہمارا فرض ہے۔ میں ہر خدمت کے لئے تن من دھن سے حاضر ہوں۔ مزدور کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ مزدوروں کے اس لیڈر کا نام کیا ہے۔ ایجنٹ نے کہا۔ رحیم بخش۔ آخر یہ قرار پایا کہ رحیم بخش اور اس کے ساتھیوں کو انجم کے پاس بھیج دیا جائے۔ پھر وہ نمٹ لے گی۔

ایجنٹ خوش خوش سدھارے۔ شام کو چند مزدور رحیم بخش کی سرکردگی میں انجم سے ملنے آئے۔ یہ رحیم بخش وہی شخص تھا جس نے جلسہ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ہر ایک کو اپنے بزرگوں کی تعریف کا حق ہے۔ انجم کی یہ بہت عزت کرتا تھا۔ مقابل تمام نہایت اصرار پر یہ کرسی کے ایک کنارہ پر ہو بیٹھا اسکے دوسرے ساتھی بھی سکڑ سکڑا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

لڑکی :۔ آپ کے لئے چاء منگواؤں ؟

رحیم بخش :۔ جی نہیں

لڑکی :۔ کچھ سوڈا لیمن

رحیم بخش :۔ مہربانی۔ ہم کو پیاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ ہم زیادہ دیر تکلیف دینی نہیں چاہتے۔

لڑکی :۔ جی فکر نہ کیجئے۔ میری تو انتہائی تمنا ہے کہ مزدور بھائی کی خدمت کرتے کرتے مر جاؤں۔ سنتی ہے اس روز مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔

رحیم بخش :۔ جی ہاں۔ ان لوگوں نے کفر بکنا شروع کر دیا جس کی ہم تاب نہ لا سکے۔

لڑکی :۔ خدا معلوم یہ کیا واہیات ہے۔ بعض جانتے ان میں سے اپنے چھوٹی

بعض لوگ فیشن کی خاطر یہ بکواس کرتے ہیں۔ ورنہ یقیناً پوچھئے ہر شخص دل میں ہی کھٹکا اس کا۔ علاوہ بریں میری رائے میں خدا کے خلاف کچھ کہنا انتہائی جہالت بھی ہے۔ اور بدتمیزی بھی۔ بیوقوفی تو اس لئے کہ جب ایک چیز کا تم وجود ہی نہیں مانتے تو خواہ مخواہ اس کے خلاف الفاظ ضائع کرنے چہ معنی دارد اور بدتمیزی اس لئے کہ جب ایک شخص دوست کے باپ کو اس کے روبرو برا نہیں کہتا اس لئے کہ باپ عزیز ہوتا ہے تو پھر ایک تمیزدار انسان خدا پرست کے روبرو خدا کو نعوذ باللہ من ذالک کیسے برا کہہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہم کو زیادہ سے زیادہ جو ہستی عزیز ہے وہ ذات پاک ہے۔ سنا ہے آپ بھی روز پیش پیش تھے۔

رحیم بخش :۔ (آنکھیں نیچی کر کے) کیا عرض کروں مجھ سے رہا نہ گیا۔

لڑکی :۔ خدا ہر خدا پرست کو یہی توفیق عطا فرمائے۔ جزاک اللہ ——— سنا ہے سٹرائک کھٹکتی معلوم ہوتی ہے۔ مزدور اکتا گئے ہیں۔

رحیم بخش :۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔

لڑکی :۔ فرمائیے۔

رحیم بخش :۔ آپ کے قدموں پر میری جان نثار۔ مزدور تو پیچھے ہٹنے والا نہیں کچھ لیڈرز کا رویہ مشتبہ کن ہے۔

لڑکی :۔ میں سمجھی نہیں۔

رحیم بخش :۔ آپ کو زیادہ دیر باتیں کرنے سے تکان تو نہیں ہوگی۔

لڑکی :۔ ہرگز نہیں۔ آپ کہے جائیے۔ میں تمام حالات سے واقف ہونا چاہتی ہوں

رحیم بخش :۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو مزدوروں کو آٹھ آنے روز تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ صاحب ہم فقیر نہیں جو خیرات پر گذر کریں۔ پھر سوال یہ ہے کہ یہ رقم آتی کہاں سے ہے۔ دو ہزار ہم لوگوں نے آپس میں جمع کیا تھا کچھ مزدور سبھا سے ملا۔ اب تک خرچ ہو چکا ہے اس سے بہت زیادہ یہ ساری رقم کہاں سے آئی۔ جب یہ سوال اٹھایا تو لیڈرز بغلیں جھانکنے لگے۔ اور بس اتنا جواب دیا کہ ایک ہمدرد ہماری مدد کر رہا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ سرسبز باب کی مل اور ہماری مل میں پرانی رقابت ہے۔ پہلے تو ہم کو شبہ ہوا پھر ہم نے اپنے آدمی چھوڑے۔ تو یہ چیز ثابت ہوگئی کہ سرسبز باب کے روپیہ سے سٹرائک چلائی جا رہی ہے۔

رحیم بخش نے اتنا کہنے کے بعد اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور کہا

رحیم بخش :۔ تم بتاؤ۔ تم نے کیا دیکھا ؟

ساتھی :۔ جی میں اور وہ سویرے ہی [illegible] کے گھر پر جا کر کھڑے ہو گئے وہ ہم کو پہچانتا نہیں۔ سو کیا دیکھتا ہوں کہ موٹر میں سے ایک آدمی اترا

اُس نے سر جھکا لیا۔ جب بھی اتنی دیر میں ٹیکسی بالاخر ٹھہر گئی تو میں کرلی وہ آدمی تو باہر نکلا اور رمو بھی ٹیکسی میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ میں اپنی ڈیوٹی پر کھڑا رہا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد اصغر علی نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھا میں بھی سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ لگا رہا۔ اُس نے چیک دیا۔ مجھے تھوڑی سی انگریزی کی حرف شناسی ہے۔ میں نے پڑھ لیا۔ سر سہراب جی کے دستخط تھے۔

لڑکی :۔ تم اتنا پڑھنا جانتے ہو ؟

ساتھی :۔ جی ہاں

لڑکی :۔ معاف کیجیے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ہر بات کی تصدیق کر لوں۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے پرس میں سے چیک نکال کر میز پر رکھ دیا اور بیان دینے والے سے دریافت کیا کہ یہ دستخط کس کے ہیں؟ اُس نے فوراً کہہ دیا سر سہراب کے۔ اب رحیم بخش کے چہرہ سے کچھ پریشانی اور تکدر ظاہر ہونے لگا لڑکی تاڑ گئی۔ بولی۔

لڑکی :۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ بہن کا اعتبار کیجیے۔

رحیم بخش نے شرمندہ ہو کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

لڑکی :۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟

ساتھی :۔ (رحیم بخش سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت لیکر) اب اصغر علی بھی چل آیا۔ اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے۔ رمو مجھ سے پہلے پہنچا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ موٹر سر سہراب جی کے بنگلہ پر گئی اور وہ آدمی وہاں اُتر گیا۔

لڑکی :۔ اچھا ایک بات اور بتاؤ۔ اس روز مشاعرہ میں جو جھگڑا ہوا تھا اس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے ؟

ساتھی :۔ جی ہاں۔

لڑکی :۔ لیکن شاعر نے تو مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگائی تھی۔ ہندو کیوں بگڑے ؟

ساتھی :۔ بات یہ ہے کہ ہم سب ایک بستی کے رہنے والے ہیں۔ ہم ہندو مسلمان کچھ نہیں جانتے۔ جو رحیم بخش کو بری لگی سو ہم سب کو بھی بری لگنی ہی تھی۔

لڑکی :۔ خدا کا شکر ہے یہی جذبہ ہندوستان کو ترقی کے راستہ پہ لے جا سکتا ہے یقین جانئے۔ میں آپ کو بھائی سمجھتی ہوں اور یہ بہن ساتھ چھوڑنے والی نہیں۔ معاف کیجیے گا میں نے آپ سے اچھی طرح سمجھ کر لیکن میں

معاملہ کی پوری طرح سے چھان بین کر لینی چاہتی تھی ... ہے ... میرے ... آپ نے ... اور ... آپ کے ... پہلے اجازت دیجیے کہ میں ساری داستان شروع سے آپ کو سنا دوں پھر آپ کو حق ہو گا مجھ سے سوالات کر کے اپنا اطمینان کر لیں۔ اس کے بعد اگر آپ کی خوشی ہو تو مجھے اپنا شریک کار کریں ورنہ نہیں۔

رحیم بخش :۔ ہم کو بغیر سنے آپ پر اعتبار ہے۔

لڑکی :۔ آپ کی مہربانی۔ تاہم میں اپنے اطمینان خاطر کے لئے چاہتی ہوں کہ من وعن آپ کو سنا دوں۔

اس کے بعد لڑکی نے شروع سے آخر تک ساری رام کہانی کہہ سنائی اور مزدوروں سے سوالات کرنے کی درخواست کی۔

رحیم بخش :۔ آپ نے اپنے اطمینان کے لئے سنائی۔ ہم تو صرف سنتے رہے۔ سننے سے پہلے بھی آپ پر اعتماد تھا اور اب بھی ہے۔ مزدور کا جی نمک کی دیوار نہیں جو ایسے چھینٹوں سے بہہ جائے۔ ہم صرف حکم کے منتظر ہیں۔ آپ جو فرمائیں گی اس پر عمل کیا جائے گا۔

لڑکی :۔ معاملات نے بالکل نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب ذرا مجھے سوچ لینے دیجیے۔

لڑکی تھوڑی دیر کمرہ میں ٹہلتی رہی۔ مزدور ساکت وجامد بیٹھے رہے اس کے بعد اُس نے کھڑے کھڑے اُن سے کہنا شروع کیا۔

لڑکی :۔ میں اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔ اس میں جہاں آپ کو اختلاف ہو بلا تکلف فرما دیجیے گا۔ میں سر سہراب اور ان کے تمام تنخواہ داروں کو اپنے ہاں بلاتی ہوں۔ آپ مزدوروں کے کچھ نمائندے لیکر پہلے سے آ جائیے اور دوسرے کمرہ میں ہماری تمام باتیں سنتے رہیے اس طرح یہ تو سب کا پورا اجتماع سامنے آ جائیگا اور پول بھی کھل جائیگی

مزدور اس تدبیر پر بہت خوش ہو گئے۔ لڑکی نے سر سہراب کو ٹیلیفون کیا اور شام کے چار بجے کا وقت دیا۔ مزدوروں کو یہ ہدایت کر کے کہ اس بات کا ذکر زبان پر نہ آئے رخصت کر دیا۔ نیز یہ بھی کہہ دیا کہ اوروں کو کسی بہانے سے ساتھ نہ لائیں بعد میں معاملہ بتائیں۔ تین بجے کا وقت قرار پایا۔ ــــــ خود لڑکے کے پاس جا کر سب کچھ کہہ سنایا۔ وہ پریشان خاطر سا ہوا۔

لڑکی :۔ کیا یہ تدبیر غلط ہے ؟

لڑکا :۔ ... کی قسم ... بھی ... کر سکتے ... بھی

چونکہ بس جھگڑوں میں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچنے پائے اور بے آپ اس بلڈنگ کے بابت معاملات سے زیادہ عزیز ہیں۔

لڑکی :۔ اس لیے آپ کا وقار اور مزدوروں کی فلاح دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ نیر سچائی کے راستہ میں کھونا بھی پانا ہے۔ غنیمت بخیر ہے تو پیٹ لیا ہے۔ اب تو بیڑا اٹھا لیا۔

لڑکا :۔ ماشاءاللہ یہ دلّی کی زبان ہے۔ دل کی کائنات زیر و زبر کر رہی ہو۔

غرضکہ تین بجے مزدور آگئے۔ لڑکی نے سب کچھ سمجھا دیا۔ اور دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ لڑکا ریوالور میں گولیاں بھر بند موٹر میں گھر کے آگے آن جما۔ چار بجے سر سہراب وارد ہوئے۔ اور آن کے سارے چیلے چانٹے لڑکی نے باتوں کا ایسا عنوان ڈالا کہ ساری داستان اور سازش سامنے آگئی آگے کیا کرنا ہے یہ بھی کھل گیا۔ مطلب کیا ہے اس کا بھی اظہار ہو گیا۔ اب لڑکی نے چائے بنانی شروع کی۔ اور سب نے پیالیاں ہاتھ میں اٹھائیں۔

لڑکی :۔ میں بولی۔ ابھی کچھ اور بھی مہمان آنے ہیں۔

اتنا کہکر وہ دوسرے کمرہ کے دروازہ کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ وہاں سے آگے آگے رحیم بخش اور پیچھے سارے مزدور برآمد ہوئے کسی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹی۔ کوئی کرسی سے ٹکراتا ہوا بھاگا۔ کسی کو گرما گرم چائے کا اُچھو ہوا۔ سر سہراب کرسی سے ٹکرائے۔ پگڑی لڑھک گئی۔ غرض کہ تو بہ بیرا اور میں تجھ پر اس کمرے سے نکلے۔ لڑکا ریوالور ہاتھ میں لئے بلڈنگ کے دروازہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جب ان کو بحالت تباہ نکلتے دیکھا تو موٹر کا دروازہ کھول کر باہر آنے ہی کو تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ اور ڈرائیور کو کہا جاکر بلڈنگ میں دیکھو کچھ جھگڑا فساد تو نہیں ہو رہا۔

آخرکار تمام معاملات بخیر و خوبی انجام پاگئے۔ غدار ذلیل ہو کر نکلے اسٹرائک کھل گئی۔ مزدوروں کے جائز مطالبات منظور کئے گئے۔ بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ انجمن زندہ باد اور انجم زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔

گذشتہ واقعات کی کشاکش اور بیماری نے انجم کے اعصاب پر سخت اثر کیا تھا۔ کریم نے سامان سفر تیار کرا لیا۔ انجم کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ایک روز سیٹھ رنمو کرو انجم کے ہاں جا پہنچا اور نادر شاہی حکم داغ دیا کہ دو گھنٹہ کے اندر مسوری چلنا ہے۔ وہ بھلا کب ماننے والی تھی۔ بولی۔

لڑکی :۔ چہ خوش چرا نہ باشد۔ بندی تو اب دلّی جائے گی۔

لڑکا :۔ میں نے تو سیٹیں بھی بک کرا لیں۔

لڑکی :۔ کینسل کرا دو۔

لڑکا :۔ سونے میں کمروں کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔

لڑکی :۔ تو ہم کیا کریں۔ ہم سے پوچھا تھا۔

لڑکا :۔ میرا کیا ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ کچھ دن وہاں رہکر آپ مجھ سے تقریر کرنے کے چند گُر سیکھ لیتیں۔ بہرکیف آپ کی خوشی۔ میں ٹیلیفون کر کے ریزرویشن کینسل کئے دیتا ہوں۔

لڑکی :۔ یہ آپ نے پہلے سے کیوں نہ کہا۔ میں ضرور چلوں گی۔

دیوؤں کے مُلک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

۱۲

(بارہویں قسط)

اس کشمکش میں آخر گلبہور کے کوٹ کا دامن اُس کے ہاتھ آگیا۔ اور اس نے میاں ننھا کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ بندر نے گلبہور کو اپنے داہنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور اس طرح جھونٹے دینے لگا جیسے کوئی دودھ پیتے بچے کو کھلاتا ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے جب گلبہور نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے تو اس نے اس زور سے دبوچ کر بھینچا کہ جان سی نکلنے لگی اور عقلمندی اسی میں سمجھا کہ نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ بالکل بے حس و حرکت اور خاموش رہے۔

بندر نے جانا کہ یہ اپنے ہی خاندان والوں میں سے کسی کا چھوٹا سا بچہ ہے کیونکہ وہ گلبہور کے منہ پر گھڑی گھڑی بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتا تھا۔ بندر صاحب ننھے سے آدمی کو کھلا رہے تھے کہ یکایک دروازے پر ایسی آہٹ ہوئی جیسے کوئی اندر آ رہا ہے۔ زمیندار کی لڑکی واپس آگئی تھی۔ لڑکی کو دیکھتے ہی بندر جس کھڑکی سے آیا تھا اسی پر چھلانگ مار کر جا پہنچا۔ اور وہاں سے چھت پر چڑھ گیا۔ گلبہور ابھی اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ لڑکی نے جو اپنے ننھے مُنے موتی کی یہ گت دیکھی تو ایک زور کی چیخ ماری۔ گلبہور کے کانوں میں بھی اپنی کھلائی کی آواز پہنچی۔ مگر اُدھر اس کی خوف سے گھگی سی بندھی ہوئی تھی۔ اِدھر لڑکی حیران پریشان کہ کیا کرے۔ اس مُسٹنڈے سے کس طرح ننھے گُڈے کو بچائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

چند منٹ میں محل کے ہر طرف بندر بندر کا شور مچ گیا۔ اور یہ سُن کر کہ گلبہور کو وہ لے اُچکا ہے بھیڑ بھی جمع ہو گئی۔ کوئی سیڑھی لینے دوڑا جا رہا ہے تو کوئی بانس ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ دو آدمی اِدھر دوڑ دھوپ کر رہے ہیں تو چار اُدھر دوڑ دھوپ۔ لیکن کوئی تدبیر نہیں بنتی اور کسی کی سمجھ میں صحیح طور پر یہ نہیں آتا کہ گلبہور کو بندر کے پنجے سے چھڑایا کیونکر جائے۔

باہر کی طرف بھی سینکڑوں آدمی تماشا دیکھنے کو کھڑے ہو گئے۔ بعض نے پتھر بھی مارے کہ کسی طرح وہ نیچے اُترے۔ لیکن یہ سب حرکتیں جلدی سے بند

[illegible]

چھوڑے اور بندر کو ڈرانے لگے۔ بندر چونکہ [illegible] بھاگ نہیں سکتا تھا اس لئے اُس نے گلبہور کو چھوڑ دیا اور بھاگ گیا۔

مکان کی چھت ڈھلواں تھی۔ غریب ننھا آدمی بیچارہ سہما ہوا [illegible] بیٹھا۔ ڈر کے مارے جان نکلی جاتی کہ کوئی ہوا کا جھونکا آ اڑا لے جائے یا پھسل کر نیچے نہ آ رہے۔ وہ تو خدمتگاروں میں سے ایک لڑکے کو سوجھ گئی۔ وہ جرأت کر کے سیڑھی لگا جھٹ چھت پر چڑھ گیا۔ چھت پر پہنچتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا گلبہور کو اُٹھا لیا۔ اور اپنی جیب میں رکھ نیچے اُتر آیا۔

ظالم بندر نے گلبہور کو ایسا بھینچا تھا کہ اُس کی پسلیاں ہڈی پسلیاں ایک ہو گئی تھیں۔ سر سے پاؤں تک نیل پڑ گئے تھے۔ خوف نے اس کی جان ہلکان کر دی تھی بالکل ادھ موا ہو گیا تھا۔ چالیس دن تک بیچارہ پلنگ پر پڑا رہا۔

جب ذرا جان میں جان آئی اور چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو بادشاہ سے ملنے اور اس کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے گیا۔ بادشاہ کو دل لگی سوجھی گلبہور کو چھیڑنے لگا کہ "واہ بھئی اتنے بہادر ہو کر ایک بندر سے ہار گئے" بیچارہ گلبہور بہت پریشان ہوا کیا جواب دیتا۔ دراصل اِن دیوزادوں نے ننھے انسانوں کے زمرے میں اب تک شمار ہی نہیں کیا تھا۔ وہ اس کو آدمی کی شکل کا جانور ہی سمجھتے اور اس کا مذاق ہی اڑاتے رہتے۔ دربار میں روز روز اس کی نسبت ایک نیا قصہ گھڑا جاتا۔ اور اُس کے ساتھ دل لگی کی جاتی۔

بادشاہ کی خلوت و جلوت میں گلبہور کو بلا تکلف آنے کی اجازت تھی۔ جب وہ اپنی ڈاڑھی مونڈتا تو یہ بھی اکثر موجود ہوتا اور اُسے اُسترا چلاتے دیکھا کرتا بادشاہ سلامت کے سامنے ان کی سنگار میز پر حضرت بھی کھڑے کر دیئے جاتے۔ پہلے پہل گلبہور کو اس منظر سے بڑا ڈر لگا۔ اس لئے کہ اُسترا معمولی تلوار سے بھی دُگنا سمجھو۔

گلبہور کے لئے اکثر وقت گزارنا بہت مشکل ہو جاتا تھا اس لئے وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شغل پیدا کر لیتا۔ اور اس سے اپنا دل بہلایا کرتا۔ ملکہ کی خواصوں میں سے ایک عورت کو گا تھا اس نے کہا کہ "ملکہ صاحبہ کنگھی بھی تو کرتی ہوں گی؟"

خواص :- ہاں۔ کیوں نہیں!

گلبہور :- اور ان کے بال بھی جھڑتے ہوں گے؟

خواص :- روزانہ۔

(باقی آئندہ)

رباعیات جوش

(حضرت جوش ملیح آبادی)

دل اُن پہ نہ یوں نثار کرتا اے کاش
خود کو نہ زبون و خوار کرتا اے کاش
بہتر تھا کہ دوزخ پہ بھروسہ کرتا
جنت کا نہ اعتبار کرتا اے کاش

پروا نہ کرینگے تازہ آنے والے
کچھ دن میں بھلا دینگے زمانے والے
گلشن سے اے بہار جاتی ہے تو جا
اب ہم بھی ہیں عنقریب جانے والے

ماضی کا رباب دل میں چھیڑا میں نے
سوئی ہوئی راتوں کو جگایا میں نے
تارے تھرا گئے جب آنسو پی کر
کل چاند کو مسکراتے دیکھا میں نے

خونخواری کو پروان چڑھانے والے
کمزور کو خاک میں ملانے والے
شاہیں بھی ہے کیا تیری ہی ایجادِ لطیف
معصوم کبوتر کے بنانے والے

غزل

(حضرت میکش اکبر آبادی)

بیٹھے ہیں گیسوؤں کو پریشاں کئے ہوئے
میرے جنوں کو حسن کا عنواں کئے ہوئے

جی چاہتا ہے کیجئے برہم مزاجِ حسن
مدت ہوئی ہے اُنکو نمایاں کئے ہوئے

رکھتا ہوں سو معاملے تجھ سے بہ فیضِ دل
تیری نظر سے بھی تجھے پنہاں کئے ہوئے

جرأت تو میری دیکھ کہ ہوں تیرے سامنے
ہستی سے اپنی تجھکو نمایاں کئے ہوئے

بیٹھا ہوں اس طرح سے کہ اب کوئی غم نہیں
کشتی کو نذرِ موجۂ طوفاں کئے ہوئے

لیتے ہیں تابِ اہلِ محبت کا امتحاں
رُخ پر حجابِ فتنۂ دوراں کئے ہوئے

ہے وہ نظر تو اضعِ الفت سے مطمئن
مہماں کو نذرِ شوخیٔ مژگاں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہے غم تری پلکوں پہ چند اشک
عرصہ ہوا ہے یادِ شہیداں کئے ہوئے

غزل

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی)

عشاق جو اس در پہ یونہی ڈٹ کے رہیں گے
تم دیکھنا دن بیس کے سر پھٹ کے رہیں گے

گر ہند میں ہوتی رہی معکوس ترقی
پھر ماس کو وہ چاٹ بینگے اور پٹکے رہیں گے

مٹی کے اگر تیل کا قائم رہا راشن
پھر زور دہی دیکھنا ڈیوٹ کے رہیں گے

دروازے پہ اس شوخ کے گر چل گئی لکڑی
واللہ بڑے لطف کھٹا کھٹ کے رہیں گے

فرحت نہ تھا معلوم ہمیں بعد وظیفہ
زنجیر میں خدمت کے یونہی اٹکے رہیں گے

بکھرے تارے

از جناب فراق گورکھپوری

ترے جمال سے گاتی ہوئی بہار آئے
تری نگاہ سے جیسے فضا مہک جائے

وہ رنگ و بوئے بدن ہے کہ جیسے رہ رہ کر
قبائے تنگ سے شعلہ سا کچھ لپک جائے

ترے خیال کی رنگینیوں کا کیا کہنا
فضا میں جیسے گلابی سی کوئی چھلکائے

جو بھولتیں بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

کیف بردوش بادلوں کو نہ دیکھ
بیخبر تو کچل نہ جائے کہیں

موت اک گیت رات گاتی تھی
زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

سنگ و آہن بے نیاز غم نہیں
دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پتلا نہ کوئی زہرہ جبیں

ریاضِ دہر میں توبہ تناہ اپھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر دیکھے

وہ کھلا چہرہ وہ سانچے میں ڈھلے شانے سڈول
جسم کے خط جیسے لودینے لگیں شاعر کے قول

کون یہ لے رہا ہے انگڑائی
آسمانوں کو نیند آتی ہے

ابھی بہت ٹھوکریں ہیں کھانا ابھی بہت چال چوکنا ہے
ابھی بہت گل ہیں کھلنے والے ابھی بہت خون تھوکنا ہے

نیند میں ڈوبی مہکی سانسیں
آنکھیں جھپکاتی ہوئی آئیں

زندگی کے موڑ پر

از
جناب [illegible] نثار اختر

(۱)

ہنس رہی ہے روبرو رنگیں بہار
کتنے نظارے ہیں جنت درکنار
راستا تکتی ہے کب سے رہگزار
دیکھتا ہوں مُڑ کے لیکن بار بار

آ گیا ہوں دور کس کو چھوڑ کر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

(۲)

کتنے ہونٹوں پر ہے عہدِ دلنشیں
بڑھ رہے ہیں کتنے دستِ نازنیں
منتظر ہیں کتنے آغوشِ حسیں
مجھ کو لیکن ہے نہ جانے کیا یقیں

رہ گئی ہے جم کے اک جانب نظر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

(۳)

ہو چکی ہیں گُل اُفق کی سرخیاں
تیرگی ہے کارواں در کارواں
بجھ چکا ہو جیسے نظروں میں جہاں
کچھ نہیں معلوم جانا ہے کہاں

ظلمتوں میں کھو گئی ہے رہگزر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

ذکرِ جمیل

(از جناب آغا سرخوش قزلباش دہلوی)

اے کہ تیرے نام سے قائم جہانِ رنگ و بو — اے کہ تیری ذات سے رنگین دُنیائے نمو
سائے میں زُلفوں کے خورشیدِ تپاں ہے جلوہ گر — تیرے ماتھے کی چمک سے ماند ہے نُورِ سحر
اس شفق آلود چہرے پر یہ زُلفِ مُنتشر — اِک پریشاں خواب ہے یا موسمِ دیوانہ گر
تیری آنکھوں کی چمک ہے زندگی کی روشنی — جس طرح مہتاب سے عالم پہ برسے چاندنی
چھلکی پڑتی ہے تری آنکھوں سے یوں موجِ شراب — ڈگمگاتا جا رہا ہو جیسے اِک مستِ شباب
بھر دیا، کس نے حنائی رنگ اے حُسنِ جواں — تیرے عارض سے شفق نے مانگ لی ہیں سُرخیاں
بخش دی ہے تُو نے فطرت کے نظاروں کو اُمنگ — ہر گُل تر لے اُڑا تیرے لبِ لعلیں کا رنگ
تیرے ہر اِک سانس سے آتی ہے بُوئے خوشگوار — صبح دم گلشن سے جوں پھوٹے نسیمِ مُشکبار
تیری ہر اک رہگذر کو کہکشاں سمجھا ہوں میں — تیرے سنگِ آستاں کو آسماں سمجھا ہوں میں

تیری قُربت ہے سکونِ زندگی میرے لئے
موت کیا ہے، صرف تیری بے رُخی میرے لئے

کلامِ ظریف

از
ظریف الملک حضرت ظریف دہلوی

ہٹلر اور تُوجو آئے پکڑے پیٹ ۔۔۔ اور لگے کہنے اب نہ کیجے ہیٹ
تھوک دیجے بس اب تو غصّے کو ۔۔۔ بولے چرچل شٹ اَپ اٹ اِز ٹو لیٹ

جینے کی رہی نہ جب اُمید ۔۔۔ کہا ہٹلر نے قوم سے یہ بھید
کبھی اِنگلش سے تم نہ ٹکرانا ۔۔۔ من نہ کردم شما حذر بکنید

کہا ہٹلر نے رو رو کر بصد عجز و پریشانی ۔۔۔ خطا سے در گذر کیجے مجھے یاد آگئی نانی
کہا چرچل نے اب تُو سوئے بہانے سے نتیجہ کیا ۔۔۔ چرا کارے کُند عاقل کہ باز آید پشیمانی

تھے کبھی ہم بھی تناور اب تو ہیں مثلِ ارنڈ ۔۔۔ بھر گئے ہیں زخم دِل کے آگیا اُن پر کرنڈ
کھیلتے رہتے ہیں روز و شب لنگوٹی ہی میں پھاگ ۔۔۔ پیلا کرتے ہیں سدا الّی کے پتّے ہی پہ ڈنڈ

نہ ڈاڑھی مونچھوں کی کر تو صفائی رہنے دے ۔۔۔ نہ تیجے بھاگ جوانی کے، بھائی رہنے دے
سمجھ سے کام لے منّت کشِ خضاب نہ بن ۔۔۔ ورق لگی ہوئی باسی مٹھائی رہنے دے

شرحِ عاشقی

از
محترمہ سیدہ اختر حیدرآبادی

یہ شانِ لطف ہے، یا رنگِ برہمی کیا ہے؟
رُخِ حسیں پہ یہ تیرے فسردگی کیا ہے؟

جسے تلاشِ دوا ہے وہ درد ہی کیا ہے
ہوس کی شان ہو جس میں وہ عاشقی کیا ہے

ہوں تو اسیرِ محبت! خطا معاف! مجھے
خبر نہیں کہ رہ و رسمِ عاشقی کیا ہے

ترے فراق کو آرامِ جاں بنا لینا
پھر اور اس کے سوا درسِ زندگی کیا ہے

حجابِ لالہ و گل میں جو تو نہیں ہے تو پھر
یہ بوئے روح فزا رنگِ دلکشی کیا ہے

کہاں کے شیشہ و پیمانہ و سبو! ساقی!
تری نگاہ کے صدقے مجھے کمی کیا ہے

کسی کی موجِ تبسم کے سب کرشمے ہیں
وگرنہ لالہ و گل کی شگفتگی کیا ہے

اسی کی چشمِ توجہ یہ راز سب جانے
میں کیا بتاؤں خودی کیا ہے بیخودی کیا ہے؟

اٹھی ہے دل سے پھر اک موجِ شوق و بے تابی
نشاطِ دردِ محبت میں پھر کمی کیا ہے؟

برس رہا ہے فضاؤں سے نشۂ غمِ عشق
کسی کی چشمِ حسیں آج شبنمی کیا ہے!

تری جبینِ ضیا افشاں کا فیض ہے ورنہ
قمر کا نور ستاروں کی روشنی کیا ہے؟

لئے بھی اس کے غمِ عشق میں بھلا دینا
جو بیخودی اسے کہیئے تو پھر خودی کیا ہے؟

نہ پوچھ ہم سے ہمارے لبِ خموش کا راز
رہینِ عرض جو ہو شرحِ عاشقی کیا ہے

اسی کی چشمِ توجہ کا فیض ہے اختر
وگرنہ شعر مرے کیا ہیں؟ شاعری کیا ہے؟

خوابِ زندگی

نجمہ تصدق

ابھی یاد ہے وہ طلسمی زمانہ — وہ میں، وہ مری مستی بیکرانہ
وہ اک تال پر دو دھڑکتے ہوئے دل — نظر میں لرزتا ہوا اک فسانہ
کبھی یونہی وہ دل کے رونے کی حالت — کبھی خود بخود بے سبب مسکرانا
محبت کی صبحیں منور منور — محبت کی راتیں حسیں ساحرانہ
ہر اک سو رواں شعر و مستی کی لہریں — ہر اک سانس اک لڑکھڑاتا ترانہ
وہ شاداب مہکے ہوئے گلستاں میں — مرا نرم سا جھولتا آشیانہ

مری زندگی کا وہ اک خوابِ نجمہ
مجھے آج تک یاد ہے وہ زمانہ

غزل

از
محترمہ آرمکے درخشاں
بجنوری

میں آج ان کو پشیماں دیکھتی ہوں — یہ کیا خوابِ پریشاں دیکھتی ہوں
کوئی پروانہ شاید آ رہا ہے — کہ شمعِ دل فروزاں دیکھتی ہوں
کبھی لہرا کے جب دل مسکرائے — تو دنیا کو غزل خواں دیکھتی ہوں
وہاں میرے تصور سے بھی نفرت — یہاں شوقِ فراواں دیکھتی ہوں
یہ کیفِ صبحِ آغازِ محبت — کوئی خوابِ زرافشاں دیکھتی ہوں
بہاروں میں بھی اب گلچیں میں تیرا — تہی پھولوں سے داماں دیکھتی ہوں
جوانی اور محبت اللہ! اللہ!! — بیاباں میں گلستاں دیکھتی ہوں
مرے دل میں سلگتے ہیں جو آنسو — تری آنکھوں میں لرزاں دیکھتی ہوں

ضیا ایسی کبھی دیکھی نہ میں نے
جو تجھ میں اے درخشاں دیکھتی ہوں

تیرے لئے

(از محترمہ بلقیس جمال صاحبہ بریلوی)

تو نے سوچا بھی کبھی اے بے خودِ جامِ حیات
ہے یہ حیرت خانۂ شام و سحر تیرے لئے

گوہرِ تابندہ ہے تو ہی نقاب اندر نقاب
ہے یہ اسرارِ درونِ بحر و بر تیرے لئے

اے شبابِ لالہ و گل، اے حیاتِ آرزو
ہے خود فروشیٔ گلہائے تر تیرے لئے

محرمِ ذوقِ نوا، نا آشنائے سوزِ دل
ہے فغانِ بلبلِ خستہ جگر تیرے لئے

ناشناسِ رازِ انجم، مائلِ حسنِ فلک
ہے نشاطِ خندۂ بزمِ قمر تیرے لئے

تیغ بدامن یہ فرازِ کوہ آئینہ پرست
ہے مثالِ آرزو تابندہ تر تیرے لئے

عنفوانِ سبزۂ نوخیز در موجِ نسیم
اشکِ شبنم گریۂ چشمِ سحر تیرے لئے

جلوۂ شب تاب ہیں یہ سوزشِ شمعِ حزیں
یہ گدازِ کرمکِ تفتیدہ تر تیرے لئے

زہد کش، رنگینیٔ صہبائے جامِ ارغواں
آتشیں یہ قطرۂ خونِ جگر تیرے لئے

اے چراغِ دستِ قدرت اے شعاعِ امتیاز
ہے بلائے تیرگیٔ رہ گزر تیرے لئے

تاجدارِ بزمِ فطرت بے خود پندارِ حسن
خاکِ دشتِ نجد ہے فخورِ یدہ سر تیرے لئے

مصنوعیٔ نازِ طفلی امید تمکینِ شراب
ہے یہ تنظیمِ حیاتِ مختصر تیرے لئے

وہ یہ فہم و ذکا گنجینۂ ادراک و ہوش
مایۂ دل تحفۂ ذوقِ نظر تیرے لئے

تجھ سے ہے تخلیقِ ہستی تو ہے تعمیرِ حیات
ہے یہ اسرارِ طلسمِ بحر و بر تیرے لئے

خود فراموشی یہ کب تک اے امیرِ دو جہاں
معنیٔ امکاں سمجھ۔ اے جمالِ کون و مکاں

عورت سے

از
محترمہ رابعہ پنہاں صاحبہ

باعثِ تخلیقِ بزمِ عالمِ امکاں ہے تو
آسمانِ زندگی پر نیرِ تاباں ہے تو

قسمتِ انسانیت کا کوکبِ رخشاں ہے تو
داستانِ زیست کا ضو آفریں عنواں ہے تو

تو بنائے زندگانی تو بقائے کائنات
مخبرِ تقدیر ہے اور نظم فرمائے حیات

حسن کی تنویر ہے یا عشق کی تصویر ہے
رازِ سربستہ تری تخلیق کی تفسیر ہے

تیرا سرِ زندگانی فہم پا سکتی نہیں
یہ حقیقت عقلِ انسانی میں آسکتی نہیں

قلب میں لرزاں ہے شعلہ الفتِ جانسوز کا
آنکھ کی تمکین لیکن آبرو و لاجِ حیا

ہے ترے انفاسِ رنگیں سے قیامِ کائنات
جنبشِ لب پر ہے قائم یہ نظامِ کائنات

تیری چشمِ لطف پرور ہے بہارِ زندگی
ہے خمِ ابرو ترا وجہِ قرارِ زندگی

ذات سے تیری ہے ربطِ انتشارِ کائنات
تجھ سے وابستہ ہے حسنِ جلوہ زارِ کائنات

بنتِ حوا قصرِ ہستی کی تو ہی معمار ہے
کاروانِ زندگی کی قافلہ سالار ہے

ہے مگر یہ کیا کہ ساکت ہیں لبِ معجز نما
چشمِ حیرت آفریں کیوں ہے خموشی آشنا

آ! کہ محشر ہے ترے اندازۂ رفتار میں
رازِ اعجازِ مسیحائی تری گفتار میں

اُٹھ! کہ ساکت ہیں رگِ دل کی طپش افزائیاں
چھیڑ دے پھر نشترِ مژگاں سے یہ زخمِ نہاں

سنگ دل میں چشمِ محشر زا سے پیدا کر شرر
جنبشِ لب سے سکونِ قلب کر دے منتشر

چھیڑ دے افسانۂ ماضی کا سازِ دل فزا
نغمہ ہائے جانستاں سے ہو ابھی محشر بپا

پھر سنا دے داستانِ درد اس انداز سے
گنبدِ افلاک ہل جائے تری آواز سے

اُٹھ! کہ ملنے کو ہے جبروتِ وطن اب خاک میں
زخمِ خوں رسنے لگے ہیں سینۂ صد چاک میں

آ! کہ پھر اس حالتِ برباد کا ماتم کریں
پھر نظامِ کارگاہِ دہر کو برہم کریں

آؤ آتش ریز سے عالم تہ و بالا کریں
اس شکستہ ساز سے نغمہ نیا پیدا کریں

شمعِ ایماں

ہوں اس دور میں نغمہ سنجِ مسلسل
فروزاں ہے پہلو میں اک شمعِ ایماں

مری لے ہے آئینہ دارِ صداقت
مرے دم سے کاخِ تصنع ہے لرزاں

میں بے شک پرستارِ سوزِ جگر ہوں
وہ سوزِ جگر جو ہے سرتاجِ انساں

سراسر زبون و زیاں عہدِ حاضر
ہے پیشِ نظر میرے تاریخِ نسواں

میں آغوشِ مادر پہ نوحہ کناں ہوں
فسانہ نہیں ذکرِ سام و نریماں

خدایا یہ ماحولِ بے حس بدل دے
کہ حق بات کہکر نہ ہوں میں پشیماں

ہوں آزادیٔ زن کو حیرت سے تکتی
نظر میں ہے بربادیٔ کارِ طفلاں

مری نظم عبرت اثر آئینہ وہ
سکندر بھی دیکھے تو وہ جائے حیراں

اگر دادِ خونِ جگر کی نہ پائی
صداقت نہ رسمِ ستائش کی خواہاں

صدف ہی نہیں کوئی موتی کے قابل
اُمنڈ کر پشیماں ہوا ابرِ نیساں

زمیں شور دہقان منتِ تخیل
ابھی اور برسے سحابِ زرافشاں

بہ ظاہر مرے شعر کڑوے ہیں لیکن
بہ باطن بصیرت کے امرت کا ساماں

اُٹھاتی ہوں معنی کے چہرہ سے پردا
پسند آئی مجھکو نہ تقلیدِ ہذیاں

شکوہ عجم روحِ شعر و سخن ہے
میں اس دور کی ہوں روش سے گریزاں

میں پیغمبرانہ حقیقت کی قائل
یہاں ساحری منتہائے سخنداں

از

محترمہ ساجدہ بنت دانش
شاہجہانپوری

فلمی خبریں

...ان دنوں ... فلم ...
... کی تیاریوں میں مصروف ہیں ... پنجابی کی پہلی ...
... ہے ... فلم ...
... ہے۔ اس فلم میں ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے کیلئے
... پر ... کا انتخاب کیا گیا ہے ...

کی تلاش تھی کافی غور و فکر کے بعد ... اور نواب کی مشہور ہیروئن مینا کے متعلق فیصلہ کیا۔ یہ انتخاب یقیناً ہر حیثیت سے قابل ستائش ہے۔ مینا کی اداکاری ایک بلند معیار رکھتی ہے۔ اس فلم کے اداکاروں میں بنگال کے مشہور کیریکٹر ایکٹر "احمد چودھری" کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ دیگر اداکار ... بھی ... ہیں۔

حال ہی میں یہ فلم جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کے ہاں "بک" ہو گیا ہے اور عنقریب دہلی میں اس کی نمائش ہونے والی ہے۔

... کا مرکز بنا ہوا ہے۔

پبلک آنکھ بند کر کے اس فلم کی کامیابی پر پورا پورا بھروسہ کر سکتی ہے۔ اس فلم کی تیاری میں کمپنی نے اپنی ... خاص ... اور محنت کا ثبوت دیا ہے۔ موسیقی کے ... اور اداکاری کا اعلیٰ معیار پیش کیا گیا ہے۔ اس فلم کی روح رواں ... اختر۔ ... اور منورما ہیں۔

(۳) شمسی پکچرز

کا تیار کیا ہوا پنجابی فلم "کومل" جو پچھلے تمام پنجابی فلموں پر سبقت لے گیا ہے۔ بہت جلد دہلی میں ریلیز ہونے والا ہے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر خود روپ کے شوری ہیں۔ موسیقی امرناتھ صاحب کی کاوش و توجہ کا نتیجہ ہے۔ فلم کی روح رواں منورما۔ مجنوں۔ غلام قادر اور ... ہیں۔ یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ یہ فلم جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کے ہاں بک ہو گیا ہے۔ اور دہلی میں اس کی بہت جلد نمائش ہونے والی ہے۔

اس کے علاوہ اس کمپنی کا دوسرا شاندار فلم "شالامار" بھی بہت جلد پیش ہونے والا ہے۔

(۵) ہرامنک پروڈکشن

کے زیر اہتمام مشہور ڈائرکٹر مسٹر جاگیردار نے ایک شاندار رومانی فلم "کرن" تیار کر لیا ہے۔ اس فلم میں مقبول و ہردلعزیز اداکار مسٹر افضل کمار اور لیلا چٹنس نظر آتی ہیں۔ افضل کمار اور لیلا چٹنس کے نام ایسے نہیں ہیں جنہیں شائقین فلم نظر انداز کر سکیں۔ فلم میں موسیقی اور اداکاری کا اچھا معیار پیش کیا گیا ہے۔ حال ہی میں اس فلم کے حقوق رتن پکچرز نے دہلی کیلئے فروخت کر دیئے ہیں۔ مجموعی خصوصیات کی بنا پر اس فلم کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ... جاتا۔

(۶) پدما سان پکچرز

نے اپنے پہلے فلم "داسی" ... غیر معمولی توجہ صرف کی ہے۔ کمپنی نے اداکاروں کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ اس فلم کی روح رواں ... نجم الحسن، گیا تری اور کلاوتی ہیں۔ ڈائریکشن مسٹر برن بوس کا کارنامہ ہے۔ موسیقی ... ہندوستان کے شہرت یافتہ استاد فن پنڈت ... نے پیش کیا ہے ... گانے مسٹر مدھوک کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ جس اہتمام کے ساتھ یہ فلم تیار ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ عظیم الشان توقعات وابستہ ہیں۔

(۴) ہرو اپروڈکشن

کے زیر اہتمام ہندوستان کے مشہور ڈائرکٹر اور ایکٹر مسٹر ہیرو نے ایک فلم "... ..." کی تیاری میں غیر معمولی ... اور کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ مسٹر ہیرو فلمی دنیا میں ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ ڈائرکٹر ہونے کے علاوہ خود ایک کامیاب ایکٹر ہیں۔ اور ہمیشہ اداکاری کا بلند معیار مدنظر رکھتے ہیں۔ اس فلم میں ہیروئن کی حیثیت سے مینا ان کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ کلاوتی کی اداکاری بھی قابل ذکر ہے۔

یہ فلم ۲۰ راپریل سے جوبلی ٹاکیز دہلی میں ہر خاص و عام کی دلچسپی کا باعث ہے۔

(۵) رنجیت موویٹون

نے ان دنوں ایک شاندار فلم "... ... ... پاروتی" تیار کیا ہے۔ اس فلم میں ایک ... مقدس کہانی اپنی پوری عظمت اور شان و شوکت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ اس فلم کی تیاری میں کمپنی نے تقریباً دس لاکھ روپیہ صرف کیا ہے۔ اس فلم میں مشہور معروف رقاصہ سادھونا بوس نے اداکاری کی ہے۔ اس فلم میں انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف ایک بلند معیار رقاصہ ہیں بلکہ ایک کامیاب اداکارہ بھی ہیں۔ یہ ڈرامہ ہمالیہ کے برف پوش ماحول کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ... ...

[illegible] کہانی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یقیناً یہ فلم شائقین [illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible]

(۸) گوار پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم شکریہ بمبئی، کلکتہ، پشاور اور لاہور میں اِن دنوں اپنی کامیابی اور مقبولیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس فلم نے مزاح کا کامیاب اور خوشگوار امتزاج کیا ہے دلچسپ اور تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاحی [illegible] پیش کیا گیا ہے۔ اداکاروں میں مشہور و مقبول ریحانہ، ستیش، منورما اور گیانی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۹) امر پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **پیغام** ۵ مئی سے ریز سنیما دہلی میں بڑی دھوم کے ساتھ شروع ہو گیا ہے۔ شائقین ہی نے اِس فلم کے خیر مقدم میں غیر معمولی گرمجوشی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ایک سوشل فلم ہے اور اپنی جملہ خصوصیات کی بنا پر کسی سوشل فلم سے پیچھے نہیں ہے۔ اِس فلم میں مرکزِ توجہ ہندوستان کی مشہور و معروف رقاصہ سادھنا بوس ہیں۔ اِن کے علاوہ اشوک کمار اور پرتیما دیوی نے نہایت کامیاب اداکاری کا ثبوت دیا ہے۔

(۱۰) نیو تھیٹرز نے ایک طویل خاموشی کے بعد مخصوص اہتمام و توجہ کے ساتھ ایک فلم **واپس** تیار کیا ہے۔ جو اِن دنوں بمبئی میں غیر معمولی رش لے رہا ہے۔ نیو تھیٹرز اپنے پس پشت شاندار فلمی روایات رکھتا ہے۔ اِس کمپنی نے اب تک جس بلند معیار کے فلم پیش کئے ہیں اس سے فلم کے شائقین بخوبی واقف ہیں۔ اداکاروں کے انتخاب میں بھی اِس کمپنی نے ہمیشہ تنوع اور خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ اِس فلم میں ہیروئن کے پارٹ کے لئے مشہور و معروف [illegible] کی خدمات [illegible] ہیں۔ [illegible] اداکاروں میں مشہور اداکار نواب، اشیت برن اور [illegible] کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱۱) آئیڈیل [illegible] نے اِن دنوں بڑی محنت و کاوش کے بعد ایک شاندار فلم **زمین** تیار کیا ہے۔ یہ فلم اپنے سامنے ایک بلند مقصد رکھتا ہے۔ کہانی نہ صرف افسانوی دلکشی رکھتی ہے بلکہ وطنیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور دیکھنے والوں کے دلوں میں خدمتِ وطن کا [illegible] ہے۔ فلم میں ہندوستان کے کسانوں کی زندگی اور اِن کے مصائب [illegible]

[illegible] گئے ہیں۔ [illegible] کے انتخاب میں ڈائرکٹر آنند کمار نے بالغ نظری اور [illegible] دیا ہے۔ اِس فلم میں اگر ایک طرف مشہور و معروف [illegible] کمرے پیش پیش ہیں تو دوسری طرف خورشید، نظیر، خلیل، [illegible] اور [illegible] اپنے جوہر دکھلاتے ہیں۔

یہ فلم کمار ٹاکیز دہلی میں بک ہو چکا ہے۔ یقیناً یہ ایک بلند معیار کا [illegible] ہے۔

(۱۲) محبوب پروڈکشنز نے اپنی طرف ایک سوشل تصویر **تقدیر** کے نام سے تیار کی ہے۔ ڈائرکٹر محبوب کا فلمی کارنامہ **نجمہ** ملک بھر میں اپنی مقبولیت کا [illegible] ہے۔ تقدیر سے بھی عظیم الشان توقعات وابستہ ہیں۔ یہ فلم ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا مرقع ہے اور خاص مقامی رنگ رکھتا ہے۔ اِس فلم میں مشہور و معروف کیرکٹر ایکٹر چندر موہن اور موتی لال نے اداکاری کی ہے۔ اس کے علاوہ چارلی نے مزاح کا حق ادا کیا ہے اور نرگس اور [illegible] نے اداکاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ ایک نہایت کامیاب فلم ہے۔ اور یقیناً اس فلم کا پوری گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جائیگا۔

(۱۳) راج کمل کلامندر کا تیار کیا ہوا فلم **شکنتلا** جو معروف و مستند ڈائرکٹر مسٹر شانتارام کا ایک قابلِ فخر کوشش کا کارنامہ ہے۔ آج بھی میجسٹک سنیما دہلی میں شائقین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ فلم کی کامیابی اور مقبولیت کا یہ کیا کم ثبوت ہے کہ یہ میجسٹک سنیما میں اپنی جوبلی منا رہا ہے۔ فلم بنانے والوں کے لئے یہ کارنامہ یقیناً باعثِ افتخار ہے۔

(۱۴) [illegible] پکچرز نے حال ہی میں ایک مسلم سوشل فلم **مسلمی** تیار کیا ہے۔ جس کا کئی شہروں میں بہت شاندار خیر مقدم ہوا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس طرف بعض فلمی اداروں نے مسلم کلچر پیش کرنے کے لئے فلم بنا کر ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ اب تک فلموں میں جو یک رنگی [illegible] تھی وہ اِس [illegible] حد تک دور ہو گئی ہے۔ مسلمی کا دہلی، کلکتہ اور دوسرے شہروں میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا ہے دہلی میں بھی بے چینی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے۔ اِس فلم کے [illegible] اداکاروں میں [illegible]، حمید اور [illegible] فلم پر خاص توجہ [illegible]

نیشنل
وار فرنٹ

قومی محاذ جنگ یعنی کیا چیز ہے؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد تمام عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں:-

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کیلئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بدامنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا۔

(۲) ہندستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاشوں اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور ان کا انسداد کرنے کیلئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا۔ اور ان کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمن کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور ان کی نگرانی کرنا۔ تاکہ وہ اپنی کاروائی کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چیزوں کو ان کی مقررہ قیمت پر فروخت کرنیکا انتظام کرنا۔ اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملے سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنے کی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا اور اس کے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض و مقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور تعاون کر کے عوام الناس کی فلاح و بہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ اجمیر روڈ۔ دہلی

اپنی صحت کی حفاظت کیجئے [illegible]

[illegible] ضروری ہے ــــــــ اور ــــــــ بازاری گھی [illegible]

لہٰذا بہترین مشورہ یہ ہے کہ آپ

گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ

(کا تیار کیا ہوا اصلی اور عمدہ)

ہنولہ برانڈ بناسپتی

استعمال کیجئے

- یہ اس قدر اور پاکیزہ ہے کہ آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔
- ہر کھانے کو خوش ذائقہ بنانے کے لئے بہترین چیز ہے۔
- غیر معمولی طاقت اور تروتازگی پیدا کرتا ہے۔

منیجر گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ دہلی

[illegible] لال [illegible] کھاڑی باؤلی [illegible]

اس موسم میں سائنٹفک طریقہ سے

خون کی صفائی ضروری ہے

ہمدرد کی ایجاد

صافی

کی ایک دو شیشیاں آپ کے جسم کو تندرستی دیں گی
اور آنے والے موسم کی بیماریوں سے محفوظ رکھیں گی۔
قیمت فی شیشی دو روپے

ہمدرد دواخانہ، لال کنواں دہلی



صبح
سے شام
تک
کام کرنے کو دل نہ چاہے تو۔

شربت روح افزا

نوش کیجیے آپ تازہ اور چست ہو جائیں گے
قیمت فی بوتل دو روپے۔

دواخانہ، د

دوائی (رجسٹرڈ)

کیا ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کی آرزو ہے؟

وہ کونسی خاتون ہے جو نہیں چاہتی کہ اس کی گود ہری بھری رہے۔ دنیا میں اولاد سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ اولاد کیلئے ہزار ہا روپیہ صرف کر دیا جاتا ہے مرادیں اور منتیں مانی جاتی ہیں۔ گنڈے تعویذ کئے جاتے ہیں۔ لیکن اب بہت کم عورتوں کو اسکا علم ہے کہ **سیلان الرحم** کی وجہ سے اولاد نہیں ہوتی۔ یہ ایک مرض ہے جو خفیہ جسم سے پانی کی شکل میں بہتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شباب آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگتا ہے طبیعت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے۔ بھوک اڑجاتی ہے قبض رہتا ہے۔ اور جب تک یہ مرض رہتا ہے استقرار حمل ناممکن ہے۔ لہٰذا **دوائی** کیلیہ مستورات کو استعمال کرائیے جو مذکورہ مرض کو ہمیشہ کیلئے نابود کر کے اولاد ہونیکی بشارت دیتی ہے۔ اور ماہواری ایام بھی اس دوا کے استعمال سے درست ہو جاتے ہیں۔

قیمت بیس خوراک عہ (ترکیب استعمال دوا کے پیکٹ پر تحریر ہے)

مشہور دواخانہ فراشخانہ دہلی

گیتانجلی مووی ٹون

کا

عظیم الشان کارنامہ

سوال

جو

اپنی نوعیت کا

بے نظیر فلم ہے

جادو اثر موسیقی

اس فلم میں

مقبول و ہردلعزیز **ممتاز شانتی** نے اداکاری

کا کمال پیش کیا ہے

دوسرے اداکار

الہاس۔ رادھا رانی۔ آغا۔ راج رانی

صادق۔ شیر علی۔ حبیب۔ بابو بھائی۔ نرنجن

ڈائریکٹر:۔ نرنجن

میوزک:۔ پنالال گھوش

کہانی:۔ شریندر بنرجی

یہ تڑپا دینے والا فلم

عنقریب دہلی میں آرہا ہے

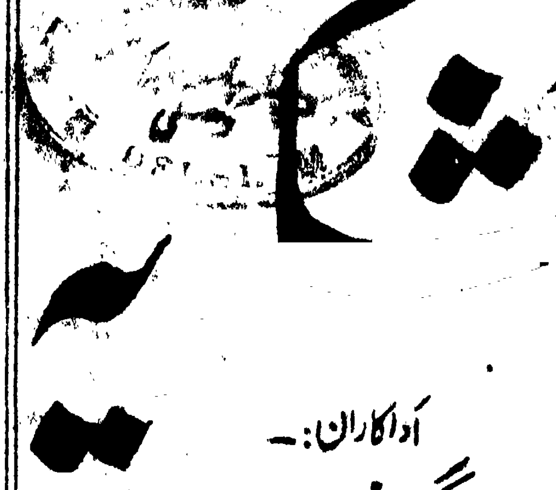
جاری کردہ:۔

ستارہ فلمز۔ دہلی

مسکراہٹ کے ساتھ ایک ترقی پسند پیغام!

تلوار پروڈکشنز کا

گراں قدر سوشل شاہکار



اداکاران:—

رمولا۔ سندر۔ گیانی۔ امر۔ منورما۔

روپ لیکھا

مزاحیہ اور اصلاحی سوشل پیشکش

بمبئی، لاہور، کلکتہ اور پشاور میں عظیم الشان

کامیابی حاصل کر رہا ہے

عنقریب ہی شمالی ہند کے اہم مقامات پر

ریلیز کیا جائیگا

وادیا پیراماؤنٹ پکچرز —— دہلی۔ لاہور

جناب ایم، اسلم کے دو تازہ شاہکار

بیتی باتیں اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت افسانے سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ وہ حقیقت جس پر ہزاروں رومان قربان کر دیئے جاتے ہیں۔

بیتی باتیں اس پاکدامن حسینہ کی داستانِ حیات ہے جو زندگی [illegible] دستیوں سے تنگ آچکی ہے۔

بیتی باتیں ایک تعلیم یافتہ خوبصورت لڑکی اور اس کے [illegible] شوہر کی ناچاقی کا بڑا پر تکلف نقشہ ہے۔

بیتی باتیں ایک نامہربان باپ اور سوتیلی ماں کی گندم نما جو فروش محبت کی عبرتناک داستان

بیتی باتیں ایک باہمت اور بلند حوصلہ لڑکی کے عزم اور ارادہ کی بڑی سبق آموز کہانی۔

بیتی باتیں سہیلیوں کے پریم، معصوم محبت اور زندگی کی کامرانیوں کا ایک بڑا رومان خیز اور رنگین افسانہ ہے۔

بیتی باتیں نفاست اور خوبصورتی کے لحاظ سے ایک دلہن کی طرح سجی ہی۔ سہ رنگہ جاذب نظر گرد پوش، جلد مضبوط، مصنف کی تصویر سے مزین۔ حجم ۳۵۲ صفحات، قیمت تین روپے آٹھ آنے علاوہ محصول۔

رین نظارے افسانوں کے عنوان: جھلکے کنارے، نیت کا پھل، سودائے محبت، خواب حکیم، ہیٹر ٹیے، یوگی۔ نیا۔ کفارہ، رین نظارے۔

ادیب شہیر میاں ایم، اسلم کو متفقہ طور پر دنیائے رومان کا بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے یہ کتاب آپ کے دس دلکش طبعزاد و غیر مطبوعہ شاندار افسانوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ ہر افسانہ فطرتِ انسانی کا آئینہ دار اور ہر لفظ رنگینی کے باوجود درسِ عبرت، ہر افسانہ اصلاحِ معاشرت کا کوئی نہ کوئی پہلو لئے ہوئے۔ یہ مجموعہ آپ کے کمالات کا نچوڑ اور شاہکار ہے جس نے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ انتہائی گرانی کے باوجود کاغذ اور حسنِ طباعت کے جملہ لوازم سے آراستہ۔ مصنف کا فوٹو شامل کتاب ہے۔ کاغذ سفید۔ حجم [illegible] صفحات مجلد۔ گرد پوش مصور۔ قیمت چار روپے علاوہ محصول ڈاک

اشک و شرر کوثر چاندپوری کے رقت انگیز افسانوں کا شاندار مجموعہ قیمت دو روپے بارہ آنے

میاں ایم اسلم کی زیر طبع کتب: شمسہ۔ شام و سحر۔ رقصِ بہار

ملنے کا پتہ:—

کتب خانہ دار البلاغ، محمد نگر، میو روڈ، لاہور

*
نیچے درمیان میں
پونجی کا ایک
دلکش رقص
*



*
فلم رانی
*



مس پیشنس کوپر





ی - فلم ''پونجی'' میں

THE ADEEB
DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only, single copy Rupee one.
4 The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi.
Edited by Fasih-ud-din Ahmad M. A. and M. I. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)







فلم ''داسی'' میں مس کلاونی

سہگل اور وندنا دیسائی - فلم ''ھرجائی'' میں



فلم ''تقدیر'' کے خالق
اور محبوب پروڈکشنز
کے مالک مسٹر محبوب





فلم ''رومانی''
میں
مسٹر سہگل

چندہ سالانہ:- دس روپے عہ علاوہ محصول ڈاک

قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ عہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب دہلی

ایڈیٹرز:-

سید محمد مرتضیٰ واحدی

فصیح الدین احمد ایم۔اے

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔اے۔بی۔ٹی

جلد ۷ | جون سنہ ۱۹۴۴ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

دہلی لٹریری سوسائٹی

(از فصیح الدین احمد)

دہلی لٹریری سوسائٹی ہارڈنگ لائبریری کا سالانہ جلسہ بتاریخ ۲۶ مارچ ۱۹۴۶ء منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت سر دار سر جگندر سنگھ صاحب ممبر اگزیکٹیو کونسل وائسرائے ہند نے فرمائی۔

جلسہ سہ پہر کو چار بجے شروع ہوا۔ پہلا مضمون آغا محمد اشرف صاحب ایم اے نے بعنوان "انگلستان میں اردو" پڑھا۔ دوسرا مضمون حضرت خواجہ حسن نظامی نے پڑھا۔ جس کا عنوان تھا "سرنامہ"

پانچ بجے لالہ تلسی رام صاحب کی طرف سے ممبران سوسائٹی کو پر تکلف ٹی پارٹی دی گئی۔

آٹھ بجے شب کو مشاعرہ شروع ہوا۔ جس کی صدارت سر سید رضا علی صاحب ایم۔ ایل۔ اے نے کی۔

بیرونی شعرا میں سے حسب ذیل شعرا شریک محفل تھے۔

جناب سیماب اکبرآبادی۔ مسز جاں نثار اختر۔ مسٹر محمد رفیع جناب تخشب جارچوی۔ جناب احسان دانش۔ جناب خمار بارہ بنکوی۔

مندرجہ ذیل شعرائے دہلی شریک تھے۔

جناب بیخود دہلوی۔ جناب زار دہلوی۔ جناب سرخوش تنز لباش۔ مسٹر اسرار الحق مجاز۔ مسٹر معین احسن جذبی۔ مسٹر علی جواد زیدی۔ جناب نہال سیوہاروی۔ جناب ظریف دہلوی۔ جناب کنور مہندر سنگھ صاحب سحر بیدی۔ مسٹر عبدالمالک عاصی۔

مضامین نثر اور وہ کلام جو مشاعرہ میں پڑھا گیا اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ دہلی لٹریری سوسائٹی کا تیسرا سالانہ جلسہ تھا۔ ہماری لٹریری تین سال سے ادبی خدمات انجام دے رہی ہے۔ یہ سوسائٹی ہر ماہ مختصر پیمانہ پر دو ادبی نشستوں کا اہتمام کرتی ہے جن میں منتخب ارباب قلم مقالے اور نظمیں پیش کرتے ہیں۔ ہر سال بڑے پیمانہ پر ایک ادبی اجتماع کیا جاتا ہے۔ اگر ہمارے ملک کے ارباب قلم ہماری اعانت کرتے رہے تو ہمیں امید ہے کہ ہم آئندہ اس سے زیادہ کامیاب اور معیاری جلسے منعقد کر سکیں گے۔

دہلی لٹریری سوسائٹی (خواتین سیکشن)

خواتین کی ادبی مجلس کا دوسرا سالانہ جلسہ بروز پیر ۲۵ مارچ کو تین بجے ہارڈنگ لائبریری میں حمیدہ سلطان بیگم کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ نے فرمائی۔ پروگرام حسب ذیل تھا:—

	مضامین	خواتین
۱	خاتون سے خطاب (نظم مجاز)	آنسہ صفیہ درانی صاحبہ
۲	ترقی پسند ادب پر خواتین کے رجحانات	آنسہ اختر قریشی بی اے، بی ٹی
۳	نظم	شریمتی مسز ترشی بیزار
۴	جنگ کی وجہ سے عورتوں کی مشکلات	آنسہ حمیدہ عارف
۵	بسنت (نظم)	آنسہ امت الشکور راز
۶	روسی خواتین	کماری سرلا گپتا
۷	عورت	بیگم ڈاکٹر امیر حسن
۸	صنف نازک پر سرور عالم کے احسانات	بیگم محمد اکرام مدیرہ انیس نسواں
۹	غزل	نواب زادی عصمت بانو صاحبہ
۱۰	افسانہ	محترمہ لالہ رخ صاحبہ
۱۱	نظم	آنسہ سحاب آغا شاعر
۱۲	سروجنی نائیڈو کی شاعری	حمیدہ سلطان
۱۳	سروجنی نائیڈو کی ایک نظم	بیگم قدیر الدین احمد
۱۴	جدید اردو شاعری میں عورت کا تصور	محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی
۱۵	پیروڈی	کماری للتا جی
۱۶	چند گھریلو باتیں	ڈاکٹر شائستہ اختر بانو سہروردیہ
۱۷	عورتوں کو شاعری کیسی کرنی چاہیئے	آمنہ خورشید حیدری
۱۸	واشنگ اور عورتیں (نظم)	محترمہ نیر جہاں بیگم شجاع

چھ بجے ان خواتین کو جنہوں نے ادبی مجلس میں حصہ لیا تھا سکریٹری کی جانب سے چائے پلائی گئی۔

مندرجہ بالا پروگرام میں سے جو کچھ دستیاب ہو سکا اُسے اسی شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد)

(۱) سیاروں پر زندگی کے امکانات

از محمد عبد الرحمٰن

شائع کردہ ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن ۔ قیمت ۱۰/

نظام شمسی اور اس کی حرکات وسکنات پر انگریزی میں کافی مواد مل جاتا ہے جو صدیوں کی تحقیق کا نتیجہ ہے ۔ ہمارے قدیم مشرقی مفکرین نے بھی اس باب میں کچھ کم تحقیق نہیں کی ہے ۔ مگر اس موضوع پر اُردو میں کم مواد منتقل ہوا ہے ۔ عرب، ایران اور خود ہندوستان میں ماہرین نے ستاروں کے متعلق جو بیش بہا تحقیقات پیش کی ہیں ان سے خود مغرب کے سائنس دانوں نے فائدہ اٹھایا ہے ۔ زیر نظر کتاب میں محمد عبد الرحمٰن صاحب نے نظام شمسی کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کن سیاروں میں کن کن حالات میں زندگی کے امکانات پائے جا سکتے ہیں ۔ یہ کتاب ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ ان مختصر صفحات میں ایسے وسیع موضوع پر تسلی بخش لٹریچر پیش کرنا ایک دشوار کام ہے ۔ لکھنے والے نے کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کتاب ہر چند ایک خالص علمی موضوع پر ہے مگر عام لوگوں کیلئے بھی اسکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔

(۲) خدا اور کائنات

از ماہر القادری صاحب

شائع کردہ ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن ۔ قیمت ۹/

ماہر القادری صاحب اس دور کے ایک مشہور اور خوش عقیدہ شاعر ہیں زیر نظر کتاب ان کے ایک مضمون پر مشتمل ہے جسے کفر و الحاد کے خلاف ایک پُرجوش صدائے احتجاج سمجھنا چاہیئے ۔ مضمون میں فلسفیانہ استدلال کے علاوہ کافی شاعری اور تحریر کا جوش و خروش بھی ملتا ہے جو ماہر صاحب کا حصہ ہے ۔

(۳) تذکرہ یوروپین شعرائے اُردو

مرتبہ محمد سردار علی

شائع کردہ ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن ۔ قیمت ۱۲/

ہندوستان کی سرزمین میں دوسری قوموں کو جذب کر لینے کی غیر معمولی صلاحیت رہی ہے ۔ جو لوگ بھی یہاں باہر سے آئے وہ یہاں کے تمدن یہاں کی زبان اور معاشرت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ اہل یوروپ یہاں تجارت اور دوسرے مقاصد لیکر آئے ، مگر ان میں سے کتنے یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ یہیں کی معاشرت اور زبان بھی اختیار کر لی ۔ یہاں کی زبان کی تحصیل اس حد تک کی کہ اس زبان میں شعر کہنا شروع کر دیا ۔ ان شعرا کا سرمایۂ شعر و سخن ہر چند ادبی حیثیت سے کوئی بلند مرتبہ نہیں رکھتا مگر تاریخی اعتبار سے اس کی خاص اہمیت ہے ۔ زیر نظر کتاب میں مرتب نے ان یوروپین شعرا کا تذکرہ لکھکر ہمارے ادب کی ایک تاریخی کڑی پیش کی ہے ۔

(۴) شادی اور محبت

مترجمہ مقصودہ نزہت

شائع کردہ ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن ۔ قیمت ۱۲/

زیر نظر کتاب میں جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے محترمہ مقصودہ نزہت صاحبہ نے انیسویں صدی کے مشہور ماہر اخلاقیات ڈاکٹر سیموئل اسمائلس کی تصنیف "کیریکٹر" کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا ہے ۔ یہ باب شادی اور ازدواجی زندگی سے متعلق ہے اور اس اہم سماجی مسئلہ پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے ۔

ہمارے اخلاقی ادب میں یہ ایک گرانقدر اضافہ ہے ترجمہ کی زبان نہایت سلجھی ہوئی ہے اور مخصوص دلکشی رکھتی ہے ۔

(۵) زلزلے از جناب قدوس صہبائی
شائع کردہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲؍

اُردو ادب کا یہ دَور افسانہ نگاری کے اعتبار سے کافی زرخیز دور کہا جاسکتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں افسانوں کے بیشمار مجموعے شائع ہوچکے ہیں اس عرصہ میں کتنے ہی افسانے نگار منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب قدوس صہبائی صاحب کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اِن افسانوں میں ہماری سماجی زندگی کے دردناک پہلو ملتے ہیں۔ موجودہ سوسائٹی اپنے اندر کیسی تلخ اور عبرتناک حقیقتیں رکھتی ہے۔ زیرِ نظر افسانوں کی بنیاد انہیں حقیقتوں پر ہے۔ ہر افسانہ ایک خاص اثر اور مقصد رکھتا ہے۔

(۶) ابن خلدون کے معاشرتی وسیاسی خیالات

از عبد القادر صاحب

شائع کردہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن۔ قیمت ۲؍

زیرِ نظر رسالہ جو ۳۲ صفوں پر مشتمل ہے عبد القادر صاحب لکچرار جامعہ عثمانیہ کے دو مضامین یکجا شائع کئے گئے ہیں۔ ان مضامین میں موصوف نے دنیائے اسلام کے مشہور مفکر و مورخ ابن خلدون کے سیاسی و معاشرتی تصورات سے بحث کی ہے

مورخ ہونے کی حیثیت سے ابنِ خلدون کا مرتبہ اسلامی تاریخ میں بہت بلند ہے۔ اس بلند مرتبہ مورخ نے تاریخ کو ایک خاص فن اور ایک خاص سائنس کا درجہ بخشا ہے جو بعد کے مورخوں کیلئے رہنمائی کا کام کرتا ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے کے بعد نہ صرف ابن خلدون کے سیاسی معاشی نظریات کا اندازہ ملتا ہے بلکہ تاریخ اسلام کے ایک نہایت اہم دَور کی ذہنی وفکری بلندی کا احساس ہوتا ہے۔

(۷) تقدیریں از جناب منظور بخاری ایم۔ اے
شائع کردہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن

زندگی صرف ایک حسین خواب یا رومان نہیں ہے۔ زندگی نام ہے ایک مسلسل جد وجہد کا۔ انسان روزِ آفرینش سے آج تک ایک مسلسل کاوش ومحنت کا عادی رہا ہے۔ زندگی محنت و مجاہدہ کے بعد ہی ایک ارفع واعلیٰ صورت اختیار کرتی ہے۔ جس سوسائٹی نے عمل وجد وجہد سے مُنہ موڑا ہے وہ انحطاط اور اخلاقی پستی کا شکار ہوگئی۔ زیرِ نظر کتاب میں محنت عمل کی عظمت اور اُس کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں مستند مفکر، سائنس داں اور ادیبوں کے نظریات بھی پیش کئے گئے ہیں اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محنت ہی حقیقی سرمایہ راحت ہے۔

(۸) آبشار از جناب فیض جھنجھانوی
شائع کردہ اُردو مجلس پبلشرز۔ شبانکل دہلی۔ قیمت مجلد ۸؍

زیر نظر کتاب جناب فیض جھنجھانوی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ غزلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور اس طرف جناب فیض کا رُجحان بھی بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے اسے خالصۃً نظموں کا مجموعہ کہنا چاہیے فیض صاحب ابھی نوجوان ہیں مگر ان کی نظمیں قادرالکلامی کا آئینہ ہیں۔ موصوف کو فارسی الفاظ وتراکیب کے استعمال پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں مختصر نظمیں بھی ہیں اور طویل بھی۔ مگر دونوں میں اسلوب کی سج دھج فن کارانہ صناعی اور شوکتِ الفاظ نمایاں ہے۔ بعض نظموں کا موضوع تاریخی عمارات اور آثارِ قدیمہ ہیں۔ یہ نظمیں نہ صرف صنعت وبلاغت کے اعتبار سے آپ اپنا جواب ہیں بلکہ ان میں ہماری بعض بہترین تاریخی عمارات کی عظمت اپنی پورے جاہ وحشم کے ساتھ نمایاں ہے۔ قطب مینار کی نظم مندرجہ ذیل شعر سے شروع ہوتی ہے :۔

اے کہ افسوں گریِ صنعتِ آدم پہ گواہ
ایک مدت سے ہے انگشتِ شہادت تیری

یہ شعر بلاشبہ شاعرانہ صناعی اور مُصوری کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ اس نوع کی تمام نظمیں اپنا مخصوص معیار ومرتبہ رکھتی ہیں۔ نظموں میں "بغاوت" طنز کا اچھا نمونہ ہے۔ ہر چند یہ نظم مصنف کی دوسری نظموں کی طرح بلند آہنگ تو نہیں ہے۔ مگر اس کی سادگی اپنے اندر ایک خاص اثر رکھتی ہے۔ کتاب کے آغاز میں خواجہ محمد شفیع صاحب کی ایک تقریظ شامل ہے جو پڑھنے کی چیز ہے۔

(۹) انگڑائیاں مرتبہ جناب احمد ندیم قاسمی
شائع کردہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن قیمت ۳؍

زیر نظر کتاب دَورِ حاضرہ کے ان چند افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مجموعہ ہے جنہیں موجودہ افسانوی ادب کی روحِ رواں سمجھنا چاہیئے۔ افسانوں کا انتخاب وترتیب جناب احمد ندیم قاسمی کی سعی وکاوش کا نتیجہ ہے جو نہ صرف ایک خوشگو شاعر ہیں بلکہ اسکے ساتھ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں اُردو افسانہ نگاری نے حیرت انگیز ترقی کرکے افسانوں کا ایک خاص معیار قائم کردیا ہے۔ اب ہمارے افسانے تخیلی اور سستے رومانوں کا آئینہ نہیں ہوتے وہ زندگی کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ان میں سماج کا دُکھ درد اور اُسکے مسائل ملتے ہیں۔ اب افسانوں کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے۔ اس دور کا افسانہ نگار ایک خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اس کا مقصد تفریحی لٹریچر پیش کرنا نہیں ہے۔ وہ پڑھنے والے کو زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے۔ اب یہ خود افسانہ نگار کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ زیر نظر کتاب میں جتنے بھی افسانے ہیں وہ موجودہ افسانہ نگاری کا صحیح معیار پیش کرتے ہیں۔ کتاب بحیثیت مجموعی اس دور کے کامیاب افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتی ہے۔

کے نزدیک بات بھی تھی۔ ایک یہ کہ نفس و شیطان کی وجہ سے ننگا رہنے کا گناہ مجھ سے ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ملا قوی شیطان ہے۔

ملا عبدالقوی سرمد کی فقرہ بازی سے بہت برہم ہوئے۔ اور اورنگ زیب کے پاس جا کر کہا:۔

سرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است از و کشف عورت است

یعنی ننگے سرمد کو صاحب کرامات کہنا ایک تہمت ہے کیونکہ جو کشف و کرامت اُس سے ظاہر ہے بس وہ یہی ہے کہ وہ ننگا ہے۔

ایک کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ جب شاہجہاں تخت نشین ہوا اور اس نے پانسو لاکھ روپے درویشوں اور مشائخ میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ تو ایک شاہی امیر اشرفیوں سے بھرا ہوا خوان سرمد کے پاس بھی لایا۔ اس وقت سرمد آگرے میں جمنا دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے ننگے بیٹھے تھے۔ امیر مذکور نے اشرفیوں کا تھال سامنے رکھا۔ سرمد نے پوچھا یہ کیا ہے؟ امیر نے جواب دیا۔ ہندوستانی شہنشاہی کے صاحب قران ثانی شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ غازی مالک ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے یہ نذر بھیجی ہے۔ سرمد نے دریا کی ریت مٹھی میں اُٹھائی اور اشرفیوں پر ڈال کر کہا۔ یہ دُنیا کے بیماروں کے لئے شربت دینار ہے۔ اور شربت دینار کے بیمار بے شمار ہیں۔ مگر میں تو تندرست ہوں۔ مجھے شربت دینار کی ضرورت نہیں ہے۔ اس واسطے میں اس شربت دینار پر خاک ڈالتا ہوں۔ اس کے بعد سرمد نے امیر سے کہا۔ لے جا اس میل کچیل کو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ امیر نے شاہجہاں کے پاس آکر ساری حقیقت عرض کی۔ دوسرے دن شاہجہاں اپنے چاروں لڑکوں کے ساتھ سرمد کے پاس آیا۔ سرمد ایک کمبل ٹانگوں پر ڈالے بیٹھے تھے حاضرین نے کہا ہندوستان کا شہنشاہ آپ کے سلام کیلئے آیا ہے۔ شاہجہاں نے اور داراشکوہ اور شجاع اور مراد اور اورنگ زیب نے سرمد کو سلام کیا اور ہاتھ باندھکر سامنے کھڑے ہوگئے۔ سرمد نے ان پانچوں کو غور سے دیکھا اور کہا تم آئے ہو۔ اور تم جاؤگے۔ جو آتا ہے وہی جاتا ہے۔" یہ کہکر اپنی ٹانگوں سے کمبل اٹھایا اور سامنے ڈال دیا۔ پھر شاہجہاں سے کہا اے آنے والے اس کمبل پر بیٹھ جا۔ شاہجہاں نے کمبل کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو بوسہ دیا اور کمبل کی بجائے فرش خاک پر بیٹھ گیا۔ سرمد نے دارا شکوہ کی طرف اشارہ کیا کہ اے اچھی صورت والے جوان تو بیٹھ جا۔ دارا نے بھی کمبل چوما اور باپ کے قریب خاک پر بیٹھ گیا۔ پھر سرمد نے شجاع اور مراد سے کہا آؤ تم اس کمبل پر بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے بھی تعظیم کی اور کمبل پر نہ بیٹھے۔ آخر میں سرمد نے اورنگ زیب کو گھور کر دیکھا اور کہا۔ او ضدی لڑکے آ تو بیٹھ جا۔ اورنگ زیب نے فوراً آگے بڑھکر کمبل پر قدم رکھا۔ اور کمبل پر دوزانو بیٹھ گیا۔ سرمد نے کہا تو کیوں اتراتا ہے۔ یہ کمبل اُون سے بنا ہے۔ اور اُون بھیڑ جیسے بے عقل جانور کی اُترن ہے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ مگر مجھ کو تو یہ اُترن پہننے کی تمیز بھی نہیں ہے۔

ایک روایت یہ مشہور ہے کہ سرمد نے شاہجہاں سے یہ بھی کہا کہ تو چاہتا ہے کہ دارا تیرا جانشین ہو اور میں بھی چاہتا ہوں کہ دارا تیرا جانشین ہو۔ مگر تیرا چھوٹا بیٹا چاہتا ہے کہ وہ میرے کمبل پر بیٹھے اور تیرا جانشین بن جائے۔ جاؤ میرے پاس سے جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا۔ تم کو میری ضرورت ہے مگر مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ پھر شاہجہاں کی طرف دیکھا اور کہا تو خدا کا پیارا ہے۔ تیرا دارا بھی خدا کو پسند ہے۔ تو نورجہاں کی دلجوئی کر کہ میرے رسولؐ نے فرمایا ہے کسی قوم کا سردار بے عزت ہو جائے تو اسکی دلجوئی کا خیال رکھو۔ تجھکو نورجہاں نے ستایا ہے مگر تو نورجہاں کو نہ ستا۔ تیری بیٹی جہاں آرا بیگم تیرے خاندان میں سب سے بڑے درجے والی عورت ہے۔

سرمد کی رباعیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمد ہندوستان میں آنے کے بعد ہندو فلسفے کے دلدادہ ہوگئے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرمد کی ڈاڑھی بڑی تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرمد کی عمر بھی زیادہ تھی۔ اور یہ بات بھی سرمد نے خود لکھی ہے کہ پہلے وہ یہودی تھے اور پھر مسلمان ہوگئے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام رفیع قلندر تھا۔ اور سرمد تخلص تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ننگا رہنے کا خیال ان کو ہندو فلسفے ترک اور تیاگ سے پیدا ہوا تھا۔ اور بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دارا شکوہ نے ہندو کتابوں کا فارسی ترجمہ سرمد کے کہنے سے کیا تھا۔ اور اس مجموعے کا نام "سر اکبر" رکھا تھا۔ سرمد نے اپنی رباعیوں میں لکھا ہے کہ حافظ اور عمر خیام کی پیروی کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرمد کا رنگ ان دونوں سے الگ تھا اور بعض باتوں میں ان دونوں سے بڑھا ہوا بھی تھا۔

منشی قربان علی صاحب بسمل دہلوی نے رقعات سرمد نام

رقعات سرمد کا ایک رسالہ شائع کیا ہے جس میں ۲۳ رقعے ہیں۔ جن لوگوں کے نام یہ رقعات ہیں، نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فرضی نام ہیں یا اصلی۔ پہلا شاہ نعمت اللہ کے نام ہے۔ دوسرا عبدالغنی کے نام۔ تیسرا عبدالرحیم کے نام۔ چوتھا مردِ نماز گذار کے نام، پانچواں خود نما کے نام۔ چھٹا بندگی شاہ باقی کے نام۔ ساتواں شیخ نظر باز کے نام۔ آٹھواں عبدالرزاق کے نام۔ نواں بھی عبدالغنی کے نام۔ دسواں بندگی سید نظام الدین کے نام۔ گیارھواں طالب خدا

کے نام۔ بارہواں یار عزیز کے نام۔ تیرہواں پھر عبدالنبی کے نام۔ چودھواں غلام محی الدین کے نام۔ پندرہواں فرخ بیگ کے نام۔ سولہواں غلام محی الدین کے نام۔ سترہواں شکر اللہ بخاری کے نام۔ اٹھارہواں محمد تقی کے نام۔ انیسواں پھر عبدالنبی کے نام۔ بیسواں شیخ جمال کے نام۔ اکیسواں پھر شاہ نعمت اللہ کے نام۔ بائیسواں پھر شیخ غلام محی الدین کے نام۔ تیئسواں پھر غلام محی الدین کے نام۔

ہر ایک رقعے کی شروعات لفظ برادرم سے کی ہے۔ اور ہر رقعے کو مقصود تمام شد پر ختم کیا ہے۔ نمونے کے طور پر اول اور آخر کا ایک ایک رقعہ نقل کرتا ہوں۔

پہلا رقعہ

رقعہ الف۔ برادرم شاہ نعمت اللہ را آنہا آنکہ، دریائے توحید چناں عمیق است۔ کہ کونین درو غریق است، شناوران دریا را کدام رفیق است آنکس کہ موحد تحقیق است، پس اے عزیز موحد آن است کہ نہ شاہد را داند نہ مشہود را۔ نہ مقصد را داند نہ مقصود را۔ نہ راکع را داند نہ مرکوع را۔ نہ ساجد را داند نہ مسجود را۔ نہ خود را داند نہ موجود را۔ نہ عبد را داند نہ معبود را۔ نہ عدد را داند نہ معدود را۔ خود شاہد است و خود مشہود۔ خود مقصد است و خود مقصود۔ خود عابد است و خود معبود۔ خود راکع است و خود مرکوع۔ خود ساجد است و خود مسجود۔ خود خود است و خود موجود۔ خود عدد است و خود معدود۔ رفیع قلندر را این طریق است، در سخن تفریق است۔ اگر دریافتی ہم شفیق است، والا ہنوز نا تحقیق است۔ مَنْ فَہِمَ فَہِمَ۔ عقل و نفس رام شد، مقصود تمام شد۔

(ترجمہ) میرے بھائی شاہ نعمت اللہ کے نام۔ توحید کا دریا اتنا گہرا ہے کہ دونوں جہان اس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس دریا کے تیرنے والوں کا کون رفیق ہے؟ وہ رفیق ہے کہ جو تحقیقی موحد ہو۔ اور موحد وہ ہے کہ جو نہ شاہد کو جانے نہ مشہود کو۔ نہ مقصد کو جانے نہ مقصود کو۔ نہ راکع کو جانے نہ مرکوع کو۔ نہ ساجد کو جانے نہ مسجود کو۔ نہ عدد کو جانے نہ معدود کو۔ خود ہی شاہد ہے، خود ہی مشہود ہے۔ خود ہی مقصد ہے اور خود ہی مقصود ہے، اور خود ہی عابد ہے اور خود ہی معبود ہے۔ خود ہی راکع ہے اور خود ہی مرکوع ہے۔ خود ہی ساجد ہے اور خود ہی مسجود ہے۔ خود ہی خود ہے اور خود ہی موجود ہے۔ خود عدد ہے اور خود ہی معدود ہے۔ پس رفیع قلندر کا یہی طریقہ ہے۔ البتہ سخن میں تفریق ہے۔ اگر تجھکو یہ راستہ مل جائے تب تو تو شفیق شفیق بھی (ایک نامور بزرگ) ہے ورنہ اب تک تو نا تحقیق ہے۔ جس نے سمجھا، سمجھا، عقل اور نفس تابع ہوئے اور مقصود پورا ہوا۔

آخری رقعہ یہ ہے

برادرم غلام محی الدین را آنہا آنکہ عاشق صاحب قرار است کہ دائم مستغرق در نظارہ دلدار است۔ فارغ از جبہ و دستار است۔ با روزہ و نماز او را چہ کار است۔ از نشیمن بہشت و سایۂ طوبیٰ عار است تا نہ پنداری کہ دیوانہ وار است بکار و خود ہشیار است۔ من فہم فہم۔ عقل و نفس رام شد۔ مقصود تمام شد۔

(ترجمہ) بھائی غلام محی الدین کے نام۔ عاشق قرار والا ہے۔ کہ ہمیشہ نظارہ دلدار میں ڈوبا رہتا ہے۔ جبہ و دستار سے فارغ ہے۔ بھلا اس کو نماز و روزہ سے کیا سروکار۔ اس کو تو بہشت کے نشیمن اور طوبیٰ کے سایہ سے عار ہے۔ تاکہ تو یہ گمان نہ کرے کہ دیوانہ تو ہے مگر اپنے کام میں ہوشیار ہے۔ جس نے سمجھا بس سمجھا۔ عقل و نفس مطیع ہوئے اور مقصود پورا ہوا۔

یہ ۲۳ رقعے اسی طرح مقفّیٰ عبارت میں ہیں اور سب کا مضمون فلسفہ وحدت وجود اور فلسفہ ہمہ اوست سے لبالب ہے۔ اور ہر رقعہ کے آخر میں مَنْ فَہِمَ فَہِمَ نفس و عقل رام شد، مقصود تمام شد تحریر ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمد کی ہر ادا میں ایک نکتہ اور ایک راز تھا۔

میں نے ان رقعات کا ترجمہ اور شرح لکھنی شروع کردی ہے۔

رباعیات کا منظوم ترجمہ منشی قربان علی صاحب نے شائع کیا ہے جو بہت عمدہ اور بہت درست ہے۔ لیکن نثر ترجمہ اگر ہو اور اصل متن بھی ساتھ ہے تو ناظرین کو بہت فائدہ ہوگا

رباعیات کے نمونے

اب میں چند رباعیاں ترجمے سمیت پیش کرتا ہوں۔

از جرم فزوں یافتہ ام فضل ترا
این شد سبب معصیت بیش مرا
ہر چند گنہ بیش، کرم بیش تراست
دیدم ہمہ جا، و آزمودم ہمہ را

(ترجمہ) ہر جرم سے پایا ہے سوا فضل ترا
باعث یہ فزونی معاصی کا ہوا
افزوں ہیں اگر گناہ کرم افزوں تر
دیکھا ہر طرح خوب سب کو جانچا

ہرچند غرور دستگاہست اینجا
بر خود بیچون عز و جاہست اینجا
در ساز شکستگی حضور دیگر است
از سرمہ شدن سنگ نگاہست اینجا

(ترجمہ) اگرچہ اس دُنیا میں غرور کو ایک شان سمجھا جاتا ہے اور خود نمائی کو عزت اور وجاہت خیال کیا جاتا ہے۔ مگر میں نے شکستہ دلی کے ساز میں ایک خاص حضوری دیکھی ہے۔ کیونکہ سُرمہ کا پتھر جب پس جاتا ہے تو نگاہ میں قوت پیدا کرتا ہے۔

سرمد تو ز ہیچ خلق بیاری مطلب
از شاخ برہنہ سایہ داری مطلب
عزت ز قناعت است و خواری ز طمع
با عزت خویش باش خواری مطلب

(ترجمہ) اے سرمد تو خلقت میں سے کسی کی امداد تلاش نہ کر۔ بن پتوں کی شاخ سے سایہ نہ ڈھونڈھ۔ یاد رکھ قناعت میں عزت ہے اور طمع میں ذلت ہے۔ لہٰذا خودداری کی عزت حاصل کر۔ اور ذلیل کرنے والی چیز کو تلاش نہ کر۔

از ساقی کوثر مے گلفام طلب
در پیری و ضعف جام آرام طلب
تا چند گرفتار بدنیا باشی
از فضل خدا نجات زیں دام طلب

(ترجمہ) اے سرمد ساقی کوثر یعنی رسول اللہ سے شراب طہور مانگ اور بڑھاپے اور کمزوری میں آرام اور آسائش کا جام حاصل کر۔ کب تک دُنیا داری میں گرفتار رہے گا۔ فضل خدا سے درخواست کر کہ وہ تجھے اس دام سے بچالے۔

اِس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمد پکے مُسلمان تھے۔

دنیا طلباں را غم دنیا راست
بے مہری شان یک دگر بیا راست
از عقرب و مار ہیچ اندیشہ مکن

دنیا تو ہمہ بکن کہ نیش و خار است

(ترجمہ) دُنیا ڈھونڈھنے والوں کو ہر وقت پیسے کا غم رہتا ہے اور پیسے کی محبت کے سبب وہ سب کے سب آپس میں بے مہر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تو بچھو اور سانپ کا اندیشہ نہ کر۔ مگر ایسے لوگوں سے بچتا رہ۔ کیونکہ یہ بچھو کے ڈنک ہیں اور کانٹے ہیں۔

ایام شباب شعر و انشا ہنر است
الفت بگل و ساقی و مینا ہنر است
پیری چو رسید ترک دُنیا ہنر است
ہر لحظہ خیال و فکر عقبیٰ ہنر است

(ترجمہ) جوانی کے زمانے میں شاعری اور انشا پردازی ہنر ہے۔ پھول اور ساقی اور شراب سے اُلفت ہنر ہے۔ مگر جب بڑھاپا آ گیا تو ترک دنیا ہنر ہے۔ ہر وقت عقبیٰ کا خیال و فکر رکھنا ہنر ہے۔

سرمد کہ ز عشق سرمدی یافت
کز بادۂ عشق بے خودی یافت
ہشیار نشد ز تیغ جلاد
منزل بمقام احمدی یافت

(ترجمہ) سرمد نے عشق کی بدولت دولت سرمدی پائی۔ اور شراب محبت سے بیخودی حاصل کی۔ ایسی بے خودی کہ جلاد کی تلوار سے بھی ہشیار نہ ہوا۔ اور مقام احمدی میں منزل حاصل کر لی۔

(شرح) اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید شہید ہونے کے بعد سرمد نے یہ رباعی کہی ہوگی مگر حقیقت یہ ہے کہ سرمد نے اپنی شہادت سے پہلے اپنی شہادت کا مقام اور درجہ اس رباعی میں بتا دیا ہے۔ اور ان دشمنوں کا منہ بند کر دیا ہے جو سرمد کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گیا تھا اور اسلام چھوڑ کر ہندو بن گیا تھا۔ اس رباعی کے منظوم ترجمے میں تیسرے مصرعے کا ترجمہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ لکھا ہے، سرمد کو جو عشق سرمدی حاصل ہے پی کر مئے عشق بیخودی حاصل ہے۔ جلاد کی تیغ سے جو غافل وہ رہا منزل بمقام احمدی حاصل ہے۔

غور کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ "ہشیار نشد ز تیغ جلاد" کا ترجمہ "جلاد کی تیغ سے جو غافل وہ رہا" درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس مصرعے

کی ترجمہ صرف یہ ہے کہ سرمد بادۂ عشق سے ایسا بے خود ہوا کہ جلاد کی تلوار بھی اس کو ہشیار نہ کر سکی۔

سرمد اگر ش وفاست خود می آید
گر آمدنیست رواست خود می آید
بیہودہ چرا در پئے او می گردی
بنشیں اگر او خدا ست خود می آید

(ترجمہ) سرمد اگر اس میں وفا ہے تو خود آجائے گا۔ اگر اس کا آنا جائز ہے تو خود ہی آجائے گا۔ تو کیوں بیکار اس کے پیچھے پیچھے گشت لگا رہا ہے۔ آ، بس بیٹھ جا۔ اگر وہ خدا ہے تو خود ہی آجائے گا۔

یاراں چہ قدر راہ دورنگی دارند
مصحف بہ بغل دین فرنگی دارند
پیوستہ ہم چوں مہرہ ہائے شطرنج
در دل ہمہ فکر خانہ جنگی دارند

(ترجمہ) دُنیادار لوگ کتنی دورنگی رکھتے ہیں۔ کہ قرآن شریف بغل میں ہے مگر اُن کا دین فرنگیوں کا سا ہے۔ سب کے سب ہر وقت شطرنج کے مہروں کی طرح اپنے دلوں میں خانہ جنگی کے منصوبے بنائے رہتے ہیں۔

اس رباعی میں لفظ "دین فرنگی" بہت اہم لفظ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں اہل یورپ کے مذہب کو سنا نفعت سمجھا جاتا تھا۔ اگر یہ عام چرچا نہ ہوتا تو سرمد اہل دنیا کی دورنگی کو دین فرنگی سے تشبیہہ نہ دیتے۔

قتل کے فتویٰ کے وقت کی رباعی

ذیل کی رباعی کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رباعی سرمد نے اس وقت کہی ہوگی جبکہ سرمد کو اورنگ زیب کے دربار میں بلایا گیا تھا اور ان کی برہنگی کے خلاف علما نے فتویٰ دیا تھا، فرماتے ہیں اور غالباً اورنگ زیب کو مخاطب کرکے ارشاد کیا ہوگا۔

آنکس کہ ترا تاج جہانبانی داد
مارا ہمہ اسباب پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید
بے عیباں را لباس عریانی داد

(ترجمہ) اے شخص جس ذات نے تجھ کو بادشاہی کا تاج دیا ہے۔ اسی نے مجھ کو سب اسباب پریشانی کے دیئے ہیں اور اسی ذات نے جس کسی میں کوئی عیب دیکھا تو اس عیب کو کسی لباس سے ڈھک دیا مگر جن میں کوئی عیب نہ تھا ان کو برہنہ رہنے کا لباس عطا فرمایا۔

در مسلکِ عشق جز نکو را نکشند
لاغر صفتاں و زشت خو را نکشند
تو عاشق صادقی ز کشتن مگریز
مردار بود ہر آنکہ او را نکشند

(ترجمہ) عشق کے مذبح میں اچھے جانور کاٹے جاتے ہیں۔ دبلے اور بیمار نہیں کاٹے جاتے ہیں۔ پس اے سرمد اگر تو سچا عاشق ہے تو قتل ہونے سے نہ بھاگ۔ کیونکہ مردار چیزوں کو کوئی قتل نہیں کیا کرتا۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد
یا جان برہش نثار می باید کرد

(ترجمہ) سرمد دُنیا کے شکووں کو مختصر کر دینا چاہیئے۔ اور ان دو کاموں میں سے ایک کام کرنا چاہیئے۔ یا تو رضائے دوست کے لئے تن قربان کر دینا چاہیئے۔ یا اس کے راستے میں جان نثار کر دینی چاہیئے۔

سلطان خودم منتِ سلطاں نہ کشم
از بہر دوناں منتِ دوناں نہ کشم
نفس من سگ ہست و منم سگبانم
از بہر سگے منت سگباں نہ کشم

(ترجمہ) میں اپنا خود بادشاہ ہوں۔ کیوں کسی اور بادشاہ کا احسان اُٹھاؤں، صرف دو روٹیوں کے لئے دو روٹیاں دینے والے کا احسان کیوں برداشت کروں۔ میرا نفس کتا ہے۔ اور میں کتے کا چوکیدار ہوں۔ پس میں ایک کتے کے لئے کتے کا احسان کیوں اُٹھاؤں۔

سرمد در دین عجب شکستے کردی
ایماں بہ فدائے چشم مستے کردی
با عجز و نیاز جملہ نقد خود را
رفتی و نثار بت پرستے کردی

(ترجمہ) سرمد تو نے دین میں ایک عجب رخنہ پیدا کردیا کہ اپنا ایمان ایک چشم مست پر قربان کردیا۔ اپنا سب کچھ عجز و نیاز کے ساتھ ایک بت پرست پہ نثار کرکے آگے بڑھ گیا۔

سرمد بہ جہاں بسے نکونام شدی
از مذہب کفر سوئے اسلام شدی
آخر چہ خطا دیدی ز اللہ و رسول
برگشتہ مرید لچھمن و رام شدی

(ترجمہ) اے سرمد! تو دنیا میں خوب نیک نام ہوا۔ مذہب کفر سے نکل کر اسلام میں آیا۔ پھر تو نے اللہ و رسول میں ایسی کیا بات دیکھی کہ ان سے برگشتہ ہوکر لچھمن و رام کا مرید ہوگیا۔

یہ رباعی درحقیقت اورنگ زیب کی اس پالیسی کے جواب میں ہے جس پالیسی نے ظاہر پرست مولویوں کو ہندوؤں کے خلاف نامناسب باتیں کرنے کی جرأت دلائی تھی۔ اور چونکہ سرمد نے ہندو مسلمانوں کو ایک دل بنانے کیلئے دارا شکوہ سے ہندوؤں کی کتابوں کے ترجمے کرائے تھے اور مولویوں نے ان کتابوں کے خلاف شورش کی تھی اس واسطے سرمد نے یہ رباعی لکھکر درحقیقت ناعاقبت اندیش مولوی اور ظاہر پرست لوگوں کو سرزنش کی ہے۔ ورنہ درحقیقت سرمد مرتے دم تک پکے مسلمان رہے۔ جسکا ثبوت ان رباعیوں سے مل سکتا ہے جو ابھی پیش کی گئی ہیں۔



انگلستان میں اُردو

(از جناب آغا محمد اشرف ایم۔اے)

ہندستانیوں کے ساتھ اب دنیا کے ہر حصّے میں ہماری اُردو زبان پہنچ چکی ہے۔ چاہے یہ ہندستانی اپنے وطن میں کوئی بولی بولیں۔ مگر جب ہندستان سے باہر کسی غیر ملک میں جاتے ہیں تو ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے اُردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ اور یہی زبان ہر وقت انہیں اپنے وطن کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ چنانچہ ایران، عراق، مصر، جنوبی افریقہ اور مغربی افریقہ کے ساحلوں پر بہت سے ہندستانی بھائیوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے کچھ سندھی تھے۔ اکثر پنجابی اور چند گجرات کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے۔ مگر ان سب نے ہندستان سے باہر نکل کر اُردو زبان اختیار کرلی تھی۔ اور اب اسی زبان میں اپنے گھر والوں اور بچّوں سے بات چیت کرتے ہیں۔

انگلستان میں لڑائی سے پہلے ہر سال ایک بہت بڑی تعداد ہندستانی طالب علموں کی جایا کرتی تھی۔ یہ طالب علم زیادہ تر اپنا وقت یونیورسٹی اور کالج کے ماحول میں بسر کرتے تھے یا سیر و سیاحت میں۔ اس لئے انہیں اپنی زبان کے متعلق زیادہ کہنے سُننے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ البتہ ان میں چند ایسے نوجوان بھی تھے جو خاص طور سے ہماری زبانوں کے متعلق تحقیق و غور کرنے کی غرض سے انگلستان جاتے تھے۔ اور یہ اپنا سارا وقت زبانوں کی چھان بین میں صرف کرتے تھے۔ بہت سے ہندستانی ڈاکٹر، وکیل، بیرسٹر اور تاجر انگلستان جا کر بس گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے وہیں شادی بیاہ بھی کرلیا ہے۔ ہر وقت انگریزی سوسائٹی میں رہتے بستے ہیں۔ وہی زبان بولتے ہیں۔ لیکن پھر بھی تعجب اس بات پر ہے کہ اُن کے بچّوں کو تھوڑی بہت شُدبُد اُردو کی ضرور رہتی ہے۔ تیسرا طبقہ ایسے ہندستانی خوانچہ والوں اور مزدوروں کاریگروں کا ہے کہ جو خدا جانے کیونکر اور کس طرح انگلستان جا پہنچے۔ آزاد ملک کی خوشحالی اور آزاد خیالی انہیں پسند آئی اور وہیں کے ہو رہے۔ اب یہ ہوٹلوں میں، دُکانوں پر اور جنگی کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ لڑائی سے پہلے اس طبقے کے سینکڑوں ہندستانی ضرورت کی چیزیں اور چھوٹا موٹا سامان لیکر گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے پھیری پر نکلا کرتے تھے چونکہ عام دوکانداروں کی نسبت یہ مال ذرا سستا بیچتے تھے۔ دوسرے ہندستان کی بنی ہوئی جوتیاں۔ چھاپے کے رومال اور اِدھر اُدھر کی چیزیں انگلستان والوں کو پسند آتی تھیں۔ اس لئے ان کی بہت قدر تھی۔ یہ پھیری والے انگریزی زبان ذرا واجبی سی جانتے تھے اور عام بات چیت بھی انگریزی اور اُردو کے لفظ ملاکر بولتے تھے۔ اس لئے انگلستان والوں کے کان میں ان کے ذریعے ایک آدھ اُردو کا لفظ پڑا رہ گیا۔ ان میں سے چند کپڑا اور بساط خانے کا سامان بیچنے کے علاوہ علم جوتش، رمل اور نجوم کا بھی دم بھرتے تھے۔ اپنا مستقبل اور اپنی قسمت معلوم کرنی کون نہیں چاہتا۔ چنانچہ کپڑا خریدنے کے ساتھ ساتھ گاؤں دیہات کی عورتیں اور لڑکیاں بالیاں انہیں اپنا ہاتھ بھی دکھا دیتی تھیں۔ ان میں کچھ گنڈا تعویذ بھی کرتے تھے۔ اور اس طرح جو کچھ مل جاتا وہ ردّکھن میں رہا۔

میں نے لندن کے مشہور بازار آکسفورڈ اسٹریٹ میں ایک ہندستانی کو پگڑی باندھے اکثر کھڑا دیکھا ہے۔ جس کے گلے میں ایک تختے پر موٹے موٹے حروف میں انگریزی زبان میں لکھا تھا "ہندستان کا سب سے بڑا نجومی"۔ شاید چھ پنس لے کر یہ لوگوں کی قسمت کا حال بتاتا رہتا تھا۔ اور ہمیشہ اُس کے چاروں طرف عورتوں کا مجمع لگا دیکھا۔ جو عورت اپنا حال پوچھنا چاہتی اُس کے سامنے یہ بہت سے سفید کاغذ کے پرزے رکھ دیتا۔ یہ عورت ان میں سے ایک کاغذ کا پُرزہ چُن لیتی۔ نجومی صاحب کے ہاتھ میں ایک بہت بڑی جست کی چمنی سی تھی، جیسی سماوار پر لگا دیتے ہیں۔ یہ عورت سے کہتے پرزہ اس چمنی میں ڈال اور کچھ دیر تک چپکے چپکے یہ اُس پر کوئی عمل پڑھتے اور پھر ہاتھ ڈال کر وہ کاغذ کا پُرزہ باہر نکال لیتے اُس پر انگریزی میں قسمت لکھی ہوئی نکلتی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ خدا پیٹ بھر کر کھانے کو دے ہی دیتا ہے۔ اور گرمیوں کے زمانے میں جب یہ کسی سمندری کنارے پر جا نکلتے ہیں تو آمدنی اور بڑھ جاتی ہے۔

اسی طبقے میں آپ کو کچھ ہندستانی نیم حکیم بھی ملیں گے۔ ہندستانی ڈاکٹروں نے جو شہرت انگلستان میں حاصل کی ہے اُس کا حال آپ نے شاید سنا ہوگا۔ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ انگریزوں کو ہندستانی ڈاکٹروں کے دستِ شفا پر بہت اعتقاد ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ہندستانی ڈاکٹر انگلستان میں اپنے مریضوں کا حال بہت غور سے سُنتے ہیں۔ اور مریض کا آدھا مرض ڈاکٹر کی توجہ سے دُور ہو جاتا ہے۔ ایسے ہندستانی ڈاکٹروں کا اگر کام چلے تو تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ نیم حکیم قسم کے ہندستانی بھی اپنے سفوف، معجون، چٹنی اور بُڑیا کے بل پر اچھے پیسے کما لیتے ہیں۔ انگلستان کے

جنوب مغربی [illegible] کی ایک بہت خوشنما مقام ہے۔ یہاں سمندر کے کنارے مجھے ایک ایسے ہندستانی نیم حکیم سے ملنے کا اتفاق ہوا کہ جو آنکھوں کا علاج کرتے تھے اور ان کی شہرت اس علاقے میں کچھ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی تصویریں مقامی اخباروں میں چھپتی تھیں۔ بڑی بڑی دور سے لوگ ان کے پاس علاج کرانے کے لئے آتے تھے۔ اور بہت سے معقول آدمیوں نے تجربے کے بعد انہیں سندیں بھی دی تھیں۔ یہ حکیم صاحب دوا کے ساتھ دعا کے بھی قائل تھے۔ اور ان کی دکان سے مریض آشوب چشم کی دوا کے علاوہ درد دل کے تعویذ بھی حاصل کر سکتے تھے۔ البتہ میں نے اس بارے میں اُن کے پاس کوئی خاص عینی شہادت نہیں دیکھی۔

لڑائی کی وجہ سے آج کل کئی ہزار ہندستانی سپاہی انگلستان کے میدانوں اور چراگاہوں میں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ یہ وہی ہندستانی فوج ہے کہ جو دسمبر ۳۹ء میں فرانس کے مورچے پر لڑنے گئی تھی۔ اور فرانس کی شکست کے بعد ڈنکرک کے راستے انگلستان پہنچ گئی۔ فوجی سپاہی۔ تعلیم کی معمولی سی شد بد۔ لیکن چند ہی مہینے کے اندر اُنہوں نے اچھی خاصی فرانسیسی زبان سیکھ لی۔ اور فرانسیسیوں پر ایسا جادو کیا کہ سب ان کا دم بھرنے لگے۔ جون ۴۰ء میں جب یہ سپاہی انگلستان آئے تو یہاں کی بولی بولنے لگے۔ اب تین سال سے یہ سپاہی ویلز۔ سکاٹ لینڈ اور انگلستان میں رہتے ہیں۔ جنگی جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ان کی سج دھج۔ خاکی پگڑیاں، اُن پر اُونچے اُونچے طرّے اور خوبصورت بنے ہوئے جسم دیکھنے والوں پر بہت اچھا اثر کرتے ہیں۔ اور جہاں کہیں بھی ہمارے سپاہی جا نکلتے ہیں، سب کی زبان سے بے اختیار واہ واہ نکل جاتی ہے۔ لندن کے ایک جلوس میں جب ہندستانی سپاہیوں کی پلٹن گذری ہے تو بازار میں سب "شاباش۔ شاباش" چلا رہے تھے۔

انہی ہندستانی سپاہیوں کے لئے بی بی سی سے مارچ ۴۱ء میں ہندستانی گانوں کا پروگرام براڈکاسٹ ہونا شروع ہوا۔ اتوار کے دن صبح ساڑھے دس بجے سے گیارہ بجے تک ہر ہفتے لندن ریڈیو پر ہندستانی گانوں کے ریکارڈ بجتے ہیں۔ انہی سے انگلستان کے شہروں اور دیہات کے گھروں سے صبح کے وقت اکثر ہندستانی نغموں کی گونج نکلتی سنی ہے۔ خدا جانے وہ لوگ ہمارے گیتوں اور دھنوں کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ انہیں بلا ناغہ سنتے ہیں۔

لڑائی سے پہلے اودے شنکر اور رام گوپال کے ناچ لندن کی سٹیج پر خوب کامیاب ہوئے تھے۔ اور اب تک بہت سے لوگ انگلستان میں ان ہندستانی ناچوں کا ذکر مزے لے لے کر [illegible] اکتوبر [illegible] میں ایک نوجوان ہندستانی رفیق انور نے تین چار انگریز لڑکیوں کو ہندستانی ناچ سکھائے اور ہندستانی آرکیسٹرا کی تان پر انہیں ایسا رواں کیا کہ یہ انگریز لڑکیاں بلا تامل ہندستانی گتیں بھرنے لگیں۔ ایک ہفتے تک اس ہندستانی ناچ کی نمائش لندن کے ایک تھیٹر میں ہوئی۔ اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اس پر رفیق انور کی ہمت بڑھی اور مئی ۴۲ء میں تین ہفتے تک لندن کے ایک مشہور تھیٹر میں انہوں نے ہندستانی رقص کی نمائش کی۔ اس مرتبہ انہوں نے کچھ اور لڑکیوں کو ناچنا سکھا کر اپنی جماعت میں شامل کر لیا تھا۔ اور آرکیسٹرا بھی بڑھا لیا تھا۔ تین ہفتے تک ان کے تھیٹر میں ایسی رونق رہی کہ آس پاس کے انگریزی تھیٹروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

آج کل انگلستان میں ہندستانیوں نے ایک نیا کاروبار شروع کیا ہے۔ اور یہ عطر سازی ہے۔ لڑائی سے پہلے انگلستان میں زیادہ تر عطر فرانس سے آیا کرتا تھا۔ فرانس کی شکست کے بعد وہاں سے عطر آنا یک قلم موقوف ہو گیا۔ کسی ہندستانی کے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ ہندستانی طریقے سے انگلستان میں عطر کی کشیدگی کی جائے تو کیسی رہے۔ خدا جانے عطر کی کشید کا نسخہ اُن کے ہاتھ کہاں سے آیا۔ اور اس کے مرکبات اُنہوں نے کیسے حاصل کئے۔ مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ آج کل لندن کے بازاروں میں "دہلی نائٹ"۔ "تاج محل" "گلزار" اور "صبح بنارس" نام کے عطر بہت بک رہے ہیں۔ اگست کے مہینے میں لندن کی ہمپ اسٹیڈ ہیلتھ (Hampstead Health) والی پہاڑی پر بڑے زور کا میلہ ہر سال لگتا ہے۔ پچھلے سال اس میلے میں ایک ہندستانی نوجوان بڑی سی پگڑی باندھے، اچکن پہنے عطر کی شیشیاں ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ عطر کی تعریف کچھ شاعرانہ انداز میں خود ہی کرتے جاتے تھے۔ اور جس کی سمجھ میں ان کی بات نہیں آتی تھی اُسے رام کرنے کے لئے ان کی انگریز بیوی انگریزی زبان میں اشتہار دے رہی تھیں اور پھر "ہندستانی عطر خود بولتا ہے" بھی تو ہوتا ہے۔

گویا اس طرح ہندستانیوں کے ساتھ انگلستان تک اردو زبان پہنچی اور اُس کے بہت سے لفظ انگریزی میں داخل ہو گئے۔ لیکن ان لفظوں کو انگریزی میں رواج دینے کا سہرا ان انگریزوں کے سر ہے کہ جو ہندستان میں ایک عرصے تک رہے۔ اور جب ہندستان سے انگلستان واپس گئے تو اپنے ساتھ سوغات کے طور پر بہت سے ہندستانی لفظ بھی لیتے گئے۔ چنانچہ قسمت۔ گمرہ۔ پکا۔ کری۔ صاحب۔ میم صاحب۔ چٹنی۔ بنگلہ۔ یوگی۔ چھوٹا۔ بڑا۔ بازار۔ شربت اور ولایتی ایسے لفظ ہیں کہ ان کی کھپت انگریزی زبان میں ہو چکی ہے۔

بلکہ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے "ولایتی" کا لفظ انگریزی گیتوں میں بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ آج کل جنگ کے زمانے میں لوگوں کو غیر ملکی زبان سیکھنے کا ایسا شوق ہوا ہے کہ بہت سی انگریز عورتیں اور مرد ہماری زبان سیکھ رہے ہیں۔ لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں تو اُردو پڑھانے کا انتظام کئی برسوں سے تھا اور لندن یونیورسٹی کو ہی حضرت نظام دکن کی سرکار سے نظام ریڈر آف اُردو کی تنخواہ بھی ملتی تھی۔ مگر اب لندن میں اُردو پڑھنے والوں کا شوق بڑھتا دیکھ کر انڈین وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی طرف سے بھی میں اُردو کی جماعتوں کا بندوبست کیا گیا ہے۔ [illegible] اسٹریٹ میں زبان سکھانے کا ایک چھوٹا سا مدرسہ ہے۔ وہاں بھی اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ اور اخباروں میں اُردو سیکھنے اور سکھانے کے اشتہار عام طور سے چھپتے رہتے ہیں۔

ایک روز میں لندن کے مشہور وکٹوریہ سٹریٹ کے ایک محلہ میں سے گذر رہا تھا کہ ایک مکان کے سامنے کوڑا کرکٹ جمع کرنے والی موٹر کھڑی دیکھی۔ اس میں سے دو انگریز مزدوروں نے اُتر کر ایک دروازے پر دستک دی اور جب وہاں سے ایک انگریز لڑکی نکلی تو اُن سب نے آپس میں اُردو میں باتیں کرنی شروع کر دیں۔ پہلے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن جب میں نے غور سے سنا تو واقعی یہ اُردو میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں مزدور ایک عرصہ تک فوج کے ساتھ ہندستان میں رہے اور اب لندن کے محکمہ صفائی میں کام کرتے ہیں۔ یہ انگریز لڑکی ہندستان میں پیدا ہوئی۔ اتفاقاً ان کی ملاقات ہو گئی۔ اور اب ہر روز جب یہ مزدور کوڑا جمع کرنے آتے ہیں تو خاص ہندستانی انداز میں آواز لگاتے ہیں۔ "کوڑا دینا بی بی جی!"

مگر سب سے دلچسپ واقعہ میں نے ایک ہندستانی موٹر ڈرائیور کی زبانی سنا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں جب برمنگھم پر جرمنوں نے زبردست بم برسائے تو بادشاہ سلامت بم زدہ علاقے کا ملاحظہ فرمانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اس دورے میں بادشاہ سلامت نے A.R.P. میں موٹر چلانے والوں کی ایک جماعت کا معائنہ فرمایا۔ اس جماعت میں ایک ہندستانی سردار رام سنگھ بھی شامل تھے میں بعد میں ان سے ملا۔ یہ شخص فخریہ بیان کرتا ہے کہ معائنے کے دوران میں بادشاہ سلامت میرے پاس تشریف لائے۔ اور اُردو میں فرمایا "کیوں سردار اچھے ہو؟" میں نے جواب دیا "مہربانی حضور کی۔"

لیکن اس پر ہمیں تعجب نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ہمارے بادشاہ سلامت کی پردادی ملکہ وکٹوریہ نے اُردو زبان خاص طور پر سیکھی تھی۔ اور ہر روز اپنی ڈائری اُردو میں لکھتی تھیں۔ چنانچہ اس ڈائری کا ایک ورق میرے پاس موجود ہے۔ یہ صفحہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۹۲ء کو لکھا گیا تھا۔ اس میں ملکہ وکٹوریہ نے اپنے ہاتھ سے اُردو میں یہ عبارت لکھی ہے:-

"آج جس قدر صدمہ اور رنج ہم کو اور ہماری اولاد کو ہے کبھی نہیں ہوا۔ کیونکہ ہمارے جوان نواسے پرنس البرٹ وکٹر آف ویلز آج نو بجے مرحوم ہو گئے۔"

ادب کی تعمیر نو

(از محترمہ صالحہ عابد حسین)

سائنس والے کہتے ہیں کہ ہر چیز کی فطری خاصیت یہ ہے کہ جہاں ہے وہیں جمی رہے۔ یا جس ڈگر پر چل رہی ہے اسی پر چلتی رہے۔ جب تک کہ باہر سے کوئی قوت اُسے اپنی جگہ یا اپنا رُخ بدلنے پر مجبور نہ کردے۔ سچ پوچھئے تو انسان بھی اسی طرح لکیر کا فقیر ہے۔ جب تک زمانہ کا زبردست ہاتھ اسے جھنجھوڑ کر نہ جگائے وہ ایک ہی طرز کی زندگی میں مگن رہتا ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ بچارے مشرق والوں کو تو ساری دُنیا کہتی ہے کہ مدتوں سے غفلت کی نیند سوئے ہیں مگر خیر سے مغرب والے بھی اس صدی کے شروع میں علم و دولت اور حکومت سے سیر ہو کر اونگھنے لگے تھے۔ پہلی جنگ عظیم نے انہیں کچھ ہوشیار کیا اور انہیں یہ احساس پیدا ہوا کہ زندگی کے نظام میں تغیر کی ضرورت ہے۔ مگر اکثر ملکوں نے اس ضرورت کو تھوڑی سی اول بدل کر کے ٹال دیا اور پیٹ بھروں کی طرح پھر اونگھ گئے۔

پچیس برس بعد یہ جنگ شروع ہوئی جس نے نہ صرف مغرب بلکہ ساری دُنیا کو اس سرے سے اُس سرے تک ہلا دیا ہے۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو مگر ہر قوم اور شخص کو یہ یقین ہو گیا کہ ہماری زندگی کی عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اب محض لیپ پوت سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ اسے نئے سرے سے بنانے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرف تعمیر نو کی آواز گونج رہی ہے۔ سیاست، حکومت، صنعت، تجارت، علم ادب، تعلیم سب کی تعمیر نو کے نقشے بنائے جا رہے ہیں۔

حکومت، سیاست، علم و ادب وغیرہ وغیرہ یہ سب زندگی کی عمارت کے حصے ہیں۔ کسی ایک حصے کا نقشہ اُس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک پوری عمارت کا نقشہ سامنے نہ ہو۔

چونکہ ہر حصے کا نقشہ بنانے کیلئے پوری عمارت کا نقشہ ذہن میں ہونا چاہیے۔ اس لئے ادب کی تعمیر نو کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ نئی زندگی کا تصور ذہن میں صاف ہو۔

میرے نزدیک ہندوستانی عورتوں کے ذہن میں نئی زندگی اور ادب کا جو تصور ہے وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔ ممکن ہے اس کے جزوی پہلوؤں سے بعض بہنوں کو اختلاف ہو لیکن بنیادی خیال ہم سب کا کم و بیش یکساں ہے۔

اس پر تقریباً سب لوگوں کو اتفاق ہے کہ نئی زندگی آزادی اور مساوات پر مبنی ہونی چاہیے۔ جس میں ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقے اور ہر صنف کو پوری پوری آزادی حاصل ہو اور ان کے ساتھ کامل مساوات برتی جائے

پہلے میں آزادی اور مساوات کا مفہوم صاف کر دوں۔

آزادی کے لئے سب سے پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں وہ مقصد متعین ہو جس کے حاصل کرنے کیلئے وہ آزادی چاہتے ہیں۔ مقصد کے تعین کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسکی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ ان کا دُور ہو جانا آزادی کہلاتا ہے۔ آزادی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اس میں کسی قسم کی پابندی اور بندش نہیں ہوتی۔ فرائض اور ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ ضابطے اور قاعدے نہیں ہوتے۔ جس آزادی میں کوئی پابندی نہ ہو وہ خطرناک بلکہ مہلک ہے ایسی آزادی انسانی سماج کو حیوانوں کے غول سے بدتر کر دیگی۔ آزادی کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کو قدرت نے جو مختلف صلاحیتیں عطا کی ہیں، اُسے اُن کو بلا روک ٹوک نشو و نما دینے، اُجاگر کرنے اور کام میں لانے کی آزادی حاصل ہو۔

اب مساوات کو لیجئے۔ مساوات کے بھی معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر کوئی ایک ہی قسم کے کام کرے اور ہر ایک سے ہر بات میں یکساں برتاؤ کیا جائے ——— نہیں یہ مساوات کی غلط تعبیر ہے۔ خدا نے مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ ہر ایک کو اپنی فطری صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کا پورا موقع ملنا چاہیئے۔ خصوصاً حصول علم کا دروازہ ہر ایک کیلئے کھلا رہے اور سب کو یکساں طور پر اس سے فیضیاب ہونے کا موقع ملے کیونکہ یہی چیز انسان کی فطری صلاحیتوں کو جگاتی اور اُجاگر کرتی ہے۔

اس آزادی اور مساوات میں جو چیز بھی رکاوٹ ڈالے خواہ وہ حکومت ہو سرمایہ داری، قدامت پسندی یا رسم پرستی اُسے راستے سے ہٹا دینا پڑیگا۔ جس سماجی نظام میں ایک بہت بڑا طبقہ حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہو، اسکی ساری جسمانی اور دماغی قوتیں کسب معاش کی کوشش میں صرف ہوتی ہوں اور پھر بھی پیٹ بھر روٹی نہ ملے جہاں ایک طبقہ دولت اور ثروت کی زیادتی کی وجہ سے بے حس اور بے عمل ہو گیا ہو۔ دولت کی کثرت اور عیش و عشرت نے اس کی دماغی اور ذہنی قوتیں سلب کر لی ہوں، اُسے بے درد، بے حس اور نفس کا غلام بنا دیا ہو۔ جہاں حکومت اپنی طاقت کے نشہ میں مصیبت زدہ اور فاقہ کش لوگوں پر بھی رحم کرنا نہ جانتی ہو اور اسکی غفلت کے سبب ہزاروں لاکھوں آدمی بھوک سے تڑپ تڑپ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہے

ہوں۔ اور اُس کے کان پر جُوں بھی نہ رینگتی ہو۔ جہاں ایک طبقہ دُنیا بھر کی ضروریات کو ضرورت سے زیادہ جمع کر کے منافع بازی کی خاطر لوگوں کو فاقے سے جان دیتے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔ جہاں عورت کو اس تصور پر کہ وہ عورت ہے علم کی روشنی سے محروم رکھا یا مصنوعی اور نکمّی تعلیم دیکر اور تیتری بنا کر چھوڑ دیا۔ کہ وہ محض سیر چمن کا لُطف اُٹھاتی رہے اور پھولوں کا رس لیتی پھرے۔ ایسی سماج کو جس قدر جلد ختم کر دیا جائے بہتر ہے نئی زندگی میں آزادی اور مساوات حاصل کرنے کے لئے اس قسم کی رکاوٹیں خواہ وہ پُرانے زمانے کی مروجہ ہوں یا نئی تہذیب نے ہمارے سر پر لادی ہوں، جو امتیاز ہٹا دینی چاہئیں۔

نئی زندگی اور نئے سماج میں عورت کو بھی اتنی آزادی اور مساوات حاصل ہونا لازمی چیز ہے جس میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ اپنی فطری صلاحیتوں کو نشوونما دے سکے۔ ان کو اُبھار کر اُن سے کام لے سکے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو جو آزادی اور مساوات کی خواہش ہے تو کس مقصد کے لئے؟ آیا وہ بھی ملکی، قومی اور سیاسی کاموں اور پیشوں میں مردوں کے دوش بدوش چلے اور برابر حصہ لے یا اس کا کوئی الگ مقصد اور مخصوص کام ہو؟ آج کل کے نوجوان اور جوشیلے طبقہ کا خیال ہے کہ عورت محض چلّی چولہے اور بچوں کی مصیبت بھرنے کیلئے نہیں پیدا کی گئی۔ اُسے بھی مرد کی طرح عقل سمجھ، ہاتھ پیر، آنکھ کان سب ملے ہیں وہ کیوں ان سب سے کام لیکر مردوں کے برابر اُن کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے کاموں میں حصہ نہ لے۔ اور کیوں محض گھر اور خاندان کیلئے مٹے۔ مگر یہ لوگ ایسا کہتے اور سوچتے وقت خاندان کی اہمیت کا بھی پوری طرح اندازہ نہیں کرتے اور اس پر بھی غور نہیں فرماتے کہ جہاں مرد اور عورت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں وہاں قدرت نے دونوں کو کچھ الگ الگ صلاحیتیں بھی دی ہیں۔

عورت کو ایثار اور قربانی، برداشت اور صبر، محبت اور خدمت، تہذیب اور تعمیر کا مادہ مرد سے زیادہ دیا گیا ہے۔ اور اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ وہ انسانوں کی فطری وحشت کو دور کر کے اُنہیں ایک دوسرے سے مانوس کرے اور انہیں باہمی محبت کے رشتے میں مربوط کرے۔

آپ دنیا کی تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھ لیجئے۔ عورت ابتدا ہی سے خاندان کا مرکز رہی ہے۔ انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں خاندان کی بنا اسی نے ڈالی تھی جسے رفتہ رفتہ ترقی دیکر موجودہ سماج تعمیر کی گئی ہے۔ عورت کی زندگی میں ـــــ خصوصاً ہندستانی عورت کی ـــــ خاندان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عورت کی مخصوص صلاحیتوں کو مدنظر رکھئے اور خاندان میں اس کی مرکزی حیثیت پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ قدرت نے یہ مخصوص صفتیں اسے کس لئے عطا کی ہیں۔ اُسے قدرت نے خاندان کی بنا ڈالنے اس کی شیرازہ بندی کرنے اور اُسے قائم رکھنے کا ذمہ دار بنایا ہے۔ ہندوستانی عورتوں کو یہی مقصد پیش نظر رکھکر اپنی نئی زندگی کی تعمیر کرنی چاہئے۔

خاندان مرد کی زندگی کا ایک جز ہے لیکن عورت کی ساری زندگی ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ عورت صرف کھانے پکانے اور ماماگیری کیلئے پیدا کی گئی ہے (اگرچہ وقت ضرورت یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور کرنا چاہیئے) اسکے علاوہ بھی کام ہیں۔ لیکن اصل کام خاندان کو خاندان اور گھر کو گھر بنانا ہے۔ اس کی ساری زندگی کو خواہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ اسی محور کے گرد گھومنا چاہیئے۔ وہ گھر کی مالکہ، خادمہ، معلم، سرپرست، حاکم اور منتظم سبھی کچھ ہے اس کا فرض خاندان کے لئے محض معمولی ضروریات زندگی فراہم کرنے کے بعد ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ خاندان کی شیرازہ بندی، اصلاح اور ترقی کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ جیسے ریاست کے رہنما پر رعایا کی بہبودی اور فلاح آپس کے تعلقات کو بہتر رکھنے، ان کے تعلیم دینے، ان کو اچھا شہری بنانے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کو ریاست کی ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح خاندان کے تمام افراد کی اصلاح اور بہبودی، تعلیم و تربیت، اُن کے آپس کے تعلقات بہتر بنانے، ان میں محبت اور خلوص پیدا کرنے، ان کو قوم کا خادم اور اچھا انسان بنانے کی ذمہ دار عورت ہے۔ اسے اپنی تمام قوتوں ـ ـ ـ دینوں سے کام لیکر اپنے اس مقصد کو حاصل کرنا ہے۔ اور ہر اُس رکاوٹ کو دور کرنا ہے جو اس مقصد میں حائل ہو۔

خاندان کا رہنما رہنا اور اسکی شیرازہ بندی کرنا کوئی آسان یا معمولی کام نہیں وہ مردوں کے بہت سے عظیم الشان کاموں سے زیادہ اہم کٹھن اور ضروری ہے۔ خاندان ہی کے بل پر قومیں بنتی ہیں اور خاندان کی تباہی اور انتشار سے قوم کا شیرازہ بکھر سکتا ہے۔ عورت خاندان کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اور کاموں کو بھی شوق سے کر سکتی ہے۔ علم و عمل کی ہر راہ اس کیلئے کھلی ہے مگر کسی صورت میں اُسے یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہر راہ سے اُسے اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔

وہ سب سے کے میدان میں شوق سے آئے مگر خالص سیاسی مسائل میں اُلجھنے کے بجائے ان مسائل کی طرف رجوع کرے جن کا عورتوں اور خاندانی زندگی سے تعلق ہے۔ وہ نرسنگ، معلمی، مصوّری، موسیقی، ادب، شاعری، غرض اس قسم کے سب کام بخوشی کر سکتی ہے۔ ان میں کمال حاصل کر سکتی ہے۔ مگر اپنے اصلی کام کو چھوڑ کر یا پس پشت ڈال کر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور ہر بات میں اپنے اس مقصد کو پیش نظر رکھکر۔

خاندان کا دائرہ تنگ نہیں بہت وسیع ہے اور ہو سکتا ہے یہی خاندان بڑھتے بڑھتے ملت اور قوم کی شکل اختیار کر لیتا ہے . . . . جو عورت کامیابی کے ساتھ خاندان کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہے، اس کی شیرازہ بندی کر سکتی ہے۔ وہی قوم اور ملک کی بھی سچی اور صحیح خدمت کر سکے گی۔ کیونکہ اسکے دل میں جذبہ، انسانی ہمدردی

اور محبت ہوگی اور لوگوں کے آپس کے تعلقات بہتر بنانے اور قائم رکھنے کے گر معلوم ہونگے۔

غرض زندگی کی اس نئی تعمیر میں عورت کو کامل آزادی ملنی چاہیئے جس سے کام لیکر وہ اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل کر سکے۔ اس میں جو بھی رکاوٹ ہو اسے ہٹا دینا چاہیئے۔ خواہ وہ رسم و رواج کی بندشیں ہوں یا مردوں کی محکومی اور بیجا فاعت، رواجی پردے کی قید ہو یا مذہبی ٹھیکیداروں کی خود ساختہ روایتیں یا موجودہ نئی تہذیب کی خود پسندی اور فیشن پرستی ہو لیکن اس کا تعین بہت سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیئے کہ کون سی چیز رکاوٹ ڈالنے والی ہے اور کس حد تک کس کو بالکل دور کرنا چاہیئے اور کس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

نئی زندگی کے تعین کے بعد اب ادب کی تعمیر نو کی طرف آئیے۔ یہ بات تو مسلم ہو چکی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے جس کا کام زندگی کی تصویر پیش کرنا بھی ہے اور اس کی اصلاح اور تعمیر بھی۔ اس لئے ادب کو کسی ایک طبقے یا مخصوص دائرے میں محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کا مقصد ہر فرقے، ہر طبقے، ہر صنف کی ترجمانی کرنا، ان کی اصلاح اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے۔

ہمارا پرانا ادب زیادہ تر اونچے طبقے کیلیئے مخصوص تھا (بہ ایں ہمہ چند اس سے مستثنٰی ضرور ہیں اور تھوڑے بہت بعض اور صنف) یہ بات یقیناً قابل اعتراض اور قابل اصلاح ہے۔ اب کچھ عرصہ سے نیا ادب پیدا ہوا ہے جس نے پست طبقہ کی تصویریں کھینچنے اور انکی ترجمانی کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ نیا ادب ہر پرانی چیز کو بلا امتیاز مٹا دینا چاہتا ہے خواہ وہ زبان ہو یا طرز بیان۔ اسے پرانے ادب یعنی پرانی زندگی میں سوائے برائیوں اور عیبوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ سختی سے ہر چیز پر نکتہ چینی اعتراض اور عیب جوئی کرتا ہے۔ وہ ماضی سے کوئی تعلق اور واسطہ رکھنا نہیں چاہتا لیکن مستقبل کیلیئے کوئی راہ بھی نہیں بناتا ہے۔ چونکہ وہ اب تک اپنا مقصد صاف نہیں کر سکا، اپنا نصب العین اس نے مقرر نہیں کیا کہ اس تخریب کے بعد تعمیر نو کیا ہوگی۔ اور کیسی؟ اس لئے لوگ ابھی اس سے بھڑکتے ہیں۔ ایک اور وجہ نئے ادب کی مخالفت کی اس کا طرز بیان اور حد سے زیادہ عریانی بھی ہے۔ وہ زبان میں بھونڈے قسم کے بازاری الفاظ اور غیر مانوس محاورے بھدی اور بے تکی بندشیں اور بعض اوقات گندی گالیاں تک شامل کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ قابل اعتراض اور نازیبا باتوں کو یا تو چٹخارے لیکر بیان کرتا ہے یا بھیانک اور خوفناک طریقہ سے پیش کرتا ہے۔ اس میں آرٹ کی سی عریانی نہیں، بلکہ گندے بازاری ناولوں کا سا ننگاپن ہوتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیا ادب زندگی کی ساری عمارت کو ایک سرے سے یعنی اس کے اچھے اور برے دونوں حصوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ اور کوئی نئی چیز تعمیر نہیں کرنا چاہتا۔ بظاہر یہ لوگ پرانی بندشوں کو تو توڑ پھینکنا چاہتے ہیں اور نئی پابندیوں کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لیکن اس طرح نہ آج تک کسی سماج اور معاشرت کی تعمیر ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ وہ قومیں بھی جو ابھی تہذیب کے بالکل ابتدائی دور سے گزر رہی ہیں ان کے ہاں بھی کچھ نہ کچھ ضابطے اور پابندیاں ضرور ہوتی ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی مثالی زندگی، اعلیٰ معاشرت بغیر کسی ضابطے اور پابندی کے بن سکے۔ کوئی سماج زندگی کی اعلیٰ قدروں سے منہ موڑ کر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

نئے ادب کا یہ مقصد کہ وہ پرانی تہذیب اور سماج کی خرابیوں کو دکھائے اور عوام اور غریب طبقہ کی ترجمانی کرے بہت قابل تحسین اور اچھا ہے۔ لیکن وہ صرف ایک پہلو کو لیتا ہے۔ دوسرے کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ادب کے تعمیر نو میں نئے ادب کی یہ خصوصیت تو لازماً لی جائے کہ وہ لوگوں کی کمزوریوں اور برائیوں کو دکھانے اور عوام کی زندگی کی تصویر دکھانے کا کام اپنے ذمے لے۔ لیکن اسی کے ساتھ اپنے مقصد اور نصب العین کو بھی سوچ لینا چاہیئے اور اسکے تحت کام کرنا چاہیئے۔

یہ ادب زندگی کی نئی تعمیر میں مدد دے۔ افلاس، غلامی، ظلم اور ناانصافی، سطحی اور جھوٹی تہذیب، ناقص اور نکمی تعلیم، خود غرضی اور نفس پرستی کا دشمن اور بیخ کن، سماج اور معاشرت کا مصلح اور زندگی کی تصویر حقیقی اور سچی تصویر پیش کرنے والا ہو۔ مگر بھونڈے پن اور بازاری پن سے نہیں۔ زبان اور بیان کی سب قیدوں سے آزاد ہو کر نہیں۔ وہ اپنے ماضی سے بالکل قطع تعلق نہ کرے کہ کوئی چیز بھی ماضی سے قطع تعلق کر کے باقی نہیں رہ سکتی۔ جس نے ماضی سے واسطہ نہ رکھا اس کا مستقبل میں بھی کوئی حصہ نہ ہوگا۔

ادب کو تنقید، اعتراض اور نکتہ چینی کا حق ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں، نیکی، علم، صداقت وغیرہ کا حامی اور علمبردار ہو، تاکہ لوگوں کو سچائی کا سیدھا راستہ دکھا سکے۔

عورتوں کے ادب میں خصوصیت کے ساتھ یہ پہلو نمایاں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عورت زندگی کی امین، خاندان کی خالق اور سماج کی بنیاد ہے۔ اسکے ادب میں بھی تخریب سے تعمیر یعنی بگاڑنے سے بنانے کا عنصر زیادہ ہو کیونکہ یہی عورت کی فطرت کا نمایاں پہلو ہے۔

مولانا حالی نے کہا ہے ؎

کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی | دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی
دھبا ہے کپڑے پہ نہ کہیں لگ جا باقی | دھو شوق سے کپڑے کو پر اتنا نہ رگڑ

اس رفارمر کو جو ادب کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھاتا ہے مجھے یہی پیام پہنچانا ہے۔ ہاں اتنا اور کہنا ہے کہ گندے کپڑے کو سر بازار دھونے اور اس کے گندے پانی کو راہ چلتوں پر پھینکنے سے بھی احتراز کرنا چاہیئے۔

جنگ کی وجہ سے عورتوں کی مشکلات

(از محترمہ حمیدہ عارف)

جب لوگ ضرورت سے زیادہ قدرت کے اصولوں اور فرمانوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ تو دُنیا میں جنگ، قحط، وبائیں اور بھونچال ان لوگوں کو ڈرانے اور درست کرنے کے لئے تازیانے لے کے آتے ہیں۔ شاید یہ زمانہ بھی بگڑے ہوئے لوگوں کا ہے۔ جنگ اور قحط کچھ عرصے سے ہمارے سروں پہ سوار ہے۔ ان کے نتائج سے آپ بخوبی واقف ہونگی۔ مجھے آج جنگ کی وجہ سے صرف عورت کی مشکلات پر روشنی ڈالنا ہے۔ ویسے تو جنگ نے سب لوگوں کی ہی زندگیوں کو ندے بے لُطف بنا رکھا ہے۔ پر جن مشکلات کا سامنا میرے طبقہ نسواں کو کرنا پڑا ہے۔ وہ کافی تکلیف دہ ہے۔ مردوں کے روپے کمانے کے دھندے جو جنگ سے پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ وہی دفتر کا مقررہ وقت پہ جانا اور واپس لوٹ آنا۔ پر غریب عورتوں کی گھرداری کے دھندوں میں نمایاں فرق پیدا ہوگیا۔ غریب دن رات اسی اُدھیڑ بن میں ہیں کس طرح کوئلہ حاصل کیا جائے۔ اس کی دوڑ دھوپ کا خاتمہ ہوا تو آٹے گھی اور چینی کے حاصل کرنے کا اشتیاق کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ "من وسلویٰ" کا۔ جہاں کہیں دو بیبیوں کا آمنا سامنا ہوا دو معمولی گفتگو کے بعد ضروری گفتگو کا تذکرہ بغیر حیل وحجت شروع ہوگیا۔ دونوں کے دماغ عام شکایت نے چکرا رکھے ہیں۔ "بہن کوئلے کا کیا انتظام ہے متواتر چھ دن سے گھاس پھونس پہ کھانا پکتا رہا۔ آج نوبت یہاں تک پہنچی کہ پُرانی کرسی توڑ کر جلائی ہے۔" دوسری بہن کی شکایات بھی کچھ ان سے کم وزن نہ تھیں۔ خیر یہ دور بھی خدا خدا کرکے ختم۔ پرچیوں کا دستور عام ہوا۔ پرچی والے لوگوں کا دم میں دم آیا۔ چیزیں مہنگی، پر ملنے تو لگیں۔ مگر بغیر پرچی والی آبادی کا ناک میں دم اس طرح آیا کہ انہیں دُگنے داموں پر بھی چیزیں مشکل سے میسر آئیں تیسرے ان لوگوں کا شیوہ یہ ہوا کہ رشتے دار یا واقف کار لوگوں کی بچی کچی پرچیوں سے گذارہ چلنے لگا۔ شاید دل میں سوچتے ہوں کہ یہ وقت بھی یاد رہے گا۔ پر کیا کیا جائے۔ بقول غالب "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

یہی انسانی زندگی کا حال ہے۔ اب دوسری مشکل عورت کے لئے کپڑے کی ہے۔ جورجٹ، شیفون اور سیٹن وغیرہ کی حقیقت کھدر میں گم ہونے لگی۔ بھلا کہاں کی شرافت۔ خواہ مخواہ چوگنے دام دینے پہ تیار ہو جانا۔ اپنے پُرانے کپڑے جو جنگ سے پہلے حقیر و ناچیز خیال کئے جاتے تھے وہی ضرور نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ خدا جب کسی کے اچھے دن لاتا ہے تو ایسی ہی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔

تیسری مشکل جو عورت کو درپیش آئی۔ پٹرول راشننگ کی وجہ سے کلبوں۔ پارٹیوں کی مصروفیات پہ نمایاں اثر پڑا۔ اب تو کبھی کبھار کا ملنا ہوگیا۔ خیر۔ یہ بھی زیادہ ہوا نقصان۔ کھو دیا ہے ہر وقت کا آنا جانا۔

جن بہنوں کو کتابیں خرید کر پڑھنے کا شوق تھا۔ اُن پر تو واقعی ظُلم ہوا۔ بھلا دو روپے کی کتاب دس روپے میں کیوں خریدیں۔ لائبریریوں کی ممبر بن جانے سے کافی فائدہ ہوا۔ ایک غضب ناک مشکل جو عورت کو پیش آئی جس سے کہ اس کی رنگینی حسن کو نقصان پہنچا۔ وہ اُس کے بناؤ سنگار کی چیزوں کا کونہ ہے اور بہت مہنگے داموں پر ملنا ہے۔ لپ سٹک سے لت پت لب ملیں چھپے اور اُداس نظر آنے لگے۔ گلابی رنگے رخساروں پہ وہی پُرانی زردی برسنے لگی۔ Cutex کی بدولت سرخ چمکیلے نوکدار ناخن جو شیر کے خونی پنجوں سے زیادہ مہیب وحسین تھے۔ پانی کی طرح سفید نظر آنے لگے۔ پر کوئی بات نہیں۔ ہم اپنے حسن کی افزائش کے لئے ان چیزوں کے کیوں محتاج ہوں۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ خدا خود ہمارے حسن کی ایسے ہی حنا بندی کرے جیسے کہ وہ لالہ خودرو کی حنا بندی کرتا ہے۔

اب ایک آخری دور ابھی عورت کی مشکل کا باقی ہے۔ اور وہ دَور پہلی مئی سے Food Rationing یعنی غذا کا اتنا ہی ہر ایک انسان کو ملنا ہے جتنا وہ کھا سکتا ہے۔ اس میں عورت کیلئے بندش یہ ہے کہ وہ اناج جمع نہیں کرسکتی اور نہ ہی فالتو پکا سکتی ہے۔ جمع کرنے کا اور فالتو پکانے کا فائدہ بھی کیا۔ بچا کھچا کھانا کوڑے میں یا فقیر کے پاس جاتا ہے۔ جس سے کہ فقیروں کو محنت کرنے کی عادت نہیں پڑتی۔ اور جمع کرنے سے دوسرے بہن بھائیوں کو غذا نہیں ملتی۔ ان تمام مشکلات کا جو میں نے ذکر کیا ہے، مجھے اپنی ذات سے لوگوں سے ہمدردی بھی ہے۔ پر خوشی بھی ہے۔ اور وہ خوشی اس بات کی ہے کہ شاید یہ موجودہ مشکلیں ہمیں حضرت فاطمہؓ، عائشہؓ اور مریمؑ جیسی عمدہ بہادر پاک عورتوں جیسے رہنا سکھا دیں۔ اُن کی سادہ

زندگیاں ہمارے لئے بہترین نمونہ ہیں۔ پیغمبر اسلام کی بیٹی خود چکی پیستی، گھر کے تمام کام کاج خوشی خوشی سرانجام دیتیں۔ بعض اوقات تین تین روز تک گھر میں چراغ نہ جلتا۔ ہمسائے کی بھوک انہیں اپنی بھوک سے زیادہ ناقابل برداشت معلوم ہوتی۔ سونے کے زیورات، قیمتی کپڑے اور باقی عیش انہوں نے لوگوں کے آرام کے لئے قربان کر دیئے —

عیش و آرام کے دلدادہ۔ محلوں میں رہنے والے کو کسی کے گھر کی تکلیف کا کیا اندازہ۔ ریشم میں ملبوس رہنے والوں کو کسی کے ٹھٹھرنے کا کیا اندازہ۔ لطیف کھانوں کے دلدادہ لوگوں کو کسی بھوکے کی فریاد و تڑپ کا کیا گمان۔ کاش کہ ہم لوگ سادہ و محنتی زندگی سے اپنی روح اور اخلاق کو بلندی کے آخری مرتبہ تک پہنچا دیں۔ تب ہی ہمیں دنیا میں جینے کا حق ہے۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ پھر ان مشکلات کی ضرورت نہ تھی

دھبّہ

(از جناب قیسی رامپوری)

سیرت میں نصاب کا حُسن بھر کچھ اپنی خالص تھا اور پابندِ شریعت نظرت۔ مولوی زآہد صاحب تیس سال تک دُنیا اور اس کے گناہوں سے جنگ آزما ہوتے رہے۔ مگر اس کا اندازہ خود ان کو بھی ہوگا کہ لودگی تمام سے ایک ن بھی وہ معرکۂ مختتم نہ کر سکے تھے۔ کرتے بھی کیسے۔ تیس سال کی نگہی جا درمیں بچپن کی مُسکراتی کلیاں اور جوانی کی وہ اینٹیں بندھی ہوئی تھیں جو اُن پر برسکی تھیں۔ اور جن میں سے چند اُنھوں نے کہیں برسائی تھیں —— بغیر چوٹ کھائے۔ بغیر چوٹ پہنچائے۔

درسِ نظامی ختم کر چکے تھے۔ مادیت کی کُہر میں مذہبی زندگی کا مُستقبل دُھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ معاشرہ کی چیخوں میں دین کے نغمے بہت مدھم سُنائی دے رہے تھے۔ مگر زاہد صاحب اُن کو سُن رہے تھے۔ "حالات" کے ساتھ چینچتے جاتے تھے اور دُور بنسری کی آواز کو بھی سُنتے جاتے تھے۔ اس طرح تیس سال کی عمر تک اُنھوں نے حالات میں مذہب بنالیا اور مذہب میں ڈسپلن پابندی اور ان اصولوں کے ساتھ دنیا کو برتنے کی جامعیت

ناممکن ہے کہ زندگی کسی عظیم شخصیت کے ساتھ رکھ کر غلطت سے خالی رہ جائے۔ حیات کے ضخیم اور تند دھارے میں سے اپنے لئے ایک تیز موج کاٹ لینا ہے بہت دشوار۔ مگر زاہد صاحب اس میں کسی قدر کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ ؟ ، جہ تھی کہ ان کی ذات عوام میں محبوب تھی۔ اور خواص میں مرغوب۔

جمعہ کا دن تھا۔ زآہد صاحب، پاک لباس اور خوشبو کی ہر دلعزیز مہک کے ساتھ نماز کے لئے روانہ ہوئے۔ جامع مسجد دُور تھی۔ اس لئے اختصارِ راہ کی غرض سے ایک بڑی سی گلی میں سے گذر رہے تھے۔ سیدھا راستہ تھا مگر زآہد صاحب چند نامعلوم اثرات کی وجہ سے بہت کم اس سے گذرتے تھے۔ اگر آج بھی اُن کو جامع مسجد تک پہنچنے میں دیر ہو جانے کا خطرہ نہوتا تو وہ شاید اس طرف سے گذرنا پسند نہ کرتے۔

دل میں پیدا کرنے والے کا عشق اور جبیں میں اُسکے سامنے جُھکنے کا شوق بڑے شیریں تاثرات میں ڈوبے ہوئے زآہد صاحب چلے جا رہے تھے کہ ایک بلند مکان کے چھجّے کا کونا دفعتہً ٹوٹا۔ شدید درد سے گھٹی ہوئی ایک ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور ایک نسانی جسم عین زآہد صاحب کے سامنے آپڑا۔ اس جسم میں چند لمحے تک کرب سے حواس تڑپے اسکے بعد خاموش ہو گئے۔

ایک عورت کا جسم تھا۔ محلہ کی معروف طوائف کا جسم جس نے آج جُمعہ کے احترام میں غُسل کیا تھا اور کپڑے بدلے تھے۔ گُناہ وہ شدید دھواں ہے جو ایک بند کوٹھری میں گھُٹا ہوا ہو، اب جس قدر اُس کا حجم بڑھتا جائیگا اتنا ہی وہ اپنے منفذ کو تلاش کریگا۔ ایک چھوٹا سا سوراخ بھی اس کو نظر آجاتا ہے تو اس میں سے آہنی ابھرتا ہوا سیاہ ٹھوس سلاخ کی طرح نکل کر اپنے حجم کو ہلکا کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

عیدن کا غُسل جُمعہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ وہ نہا کر چھت پر ساڑی سکھا رہی تھی۔ کہ منڈیر سے ٹکرائی اور نیچے آگری۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اور کسی اندرونی صدمہ سے بیہوش ہوگئی تھی۔ بہرنوع تھی زندہ۔

یہ راز تھا زآہد صاحب کا اس راہ سے کترانے کا۔ لیکن وہ راز آج چھت پر سے اُن پر پھٹ پڑا۔ اس کوچے کی نجاست آج عین ان کے سامنے سمٹ کر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ اور اس گلی کی مانع ہستی اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے اس بُری حالت میں آگری تھی۔

زآہد صاحب نے اسکو پہچان لیا شیطان نے کہا یہ تیرا امتحان ہے۔ کہاں گندگی کو ہاتھ لگا کر گنا ہگار ہوتا ہے۔ فرشتوں نے کہا یہ امتحان نہیں ہے تیری انسانیت سے اپیل ہے۔ تیری تشنہ آدمیت کے لئے ایک گھونٹ ہے اگر تو چلا گیا تو خبردار آج سے اپنے کو انسان نہ کہنا۔ چنانچہ انسان نے انسان کو سہارا دیا۔ مٹی نے مٹی کو سنبھالا۔ اور بندے نے بندے کی غور و پرداخت کی۔

جمعہ کا وقت گھٹتا جا رہا تھا اور انسان کی سنبھال کا وقت بڑھتا جا رہا تھا زآہد نے شاید دونوں فرض ادا کئے ہوں۔ معلوم نہیں۔ یہ تحقیق ہے کہ عیدن کی زندہ لاشس اور زاہد صاحب کا طاہر جسم دونوں ایک تانگے میں تھے اور تانگہ شفاخانہ میں۔ شفاخانہ والوں نے اس عجیب اتّصال کو حیرت سے دیکھا۔ ڈریسر نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں زاہد صاحب کو دیکھا اور ڈاکٹروں نے ایک دوسرے سے ہنستے ہوئے کہا "یہ ہیں آپ کے مولینا زآہد!" زآہد نے سب کچھ سُنا۔ سب کچھ سہا۔

اس واقعہ پر تیس سال اور گذر گئے۔ زآہد صاحب کا تقویٰ بھی تیس سال زیادہ بڑھ گیا۔ تیس سال پہلے اس کی ابتدا تھی اور مزید تیس سال "مشقِ بسیار" کی سائے میں اس کو اور پختہ کر دیا۔ اس دوران میں زآہد نہ صرف ہر بلائے علم

دمیں بلکہ اپنی نیک نفسی و پاک باطنی کی وجہ سے تمام شہر میں مشہور ہو گئے تھے۔ ان کی شادی کو پچیس سال گذر گئے تھے اور ان کے ہونہار، طباع و ذہین لڑکے کی عمر اب بائیس سال کی تھی۔

عابد نے اپنے بزرگ و نیک نفس باپ کے نقش قدم پر چل کر ہر طرح اپنے کو صالح اولاد ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مولینا زاہد نے اپنے قدموں کے نشانات ایسی ایسی سخت راہوں اور دشوار گذار جادہ پر چھوڑے تھے کہ غریب عابد ان کی تتبع میں ہانپ ہانپ جاتا تھا اور اکثر مقامات پر دم لینے کے لئے اس کو اتنی دیر تک بیٹھنا پڑتا تھا کہ عمر کے دن تیزی سے آگے نکل جاتے اور ایک طویل خلاء سا چھوڑ جاتے۔ جس کو عابد کچھ خانہ ساز اچھے اصولوں سے کچھ اپنی جوانی کی ناگناہ شناس الجھنوں سے پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ ان الجھنوں میں ایک الجھن شاعری کی تھی۔ اور دوسری حسن فطرت کی قدر۔ ورنہ ویسے اس کا حال بڑا صاف تھا۔

عابد کی زندگی کا رخ اپنے ماضی سے عین مطابقت کرتا نہ پا کر زاہد صاحب نے اس کو میڈیکل کالج میں داخل کر دیا تھا۔ جہاں سے وہ چھبیس ستائیس سال کی عمر میں ایک بہت ہوشیار ڈاکٹر اور سرجن بن کر نکلا۔ اور تمام شہر پر چھا گیا۔

عابد کی شہرت کافی پھیل چکی تھی۔ چنانچہ اس کو بمبئی میں ایک بہت معقول جگہ مل گئی۔ اور زاہد صاحب بھی چند سال اس کے پاس آ گئے۔ ان کی بیوی نے لیکن لاہور ہی میں رہنا پسند کیا۔

عابد بیشتر اپنے فرائض کی وجہ سے مکان سے باہر رہتا تھا۔ ایک دن زاہد صاحب کو اپنی بیوی کا ایک بڑا سا لفافہ ملا کھولا تو اس میں تحریر تھا۔

"آپ کے نام بمبئی سے یہاں کے پتہ پر کل یہ نامعلوم کسی کا لفافہ آیا تھا آپ کو روانہ کیا جاتا ہے۔ یہیں آ جائیے۔ وہاں خدا جانے آپ کو کیسا کھانا ملتا ہوگا۔ اور وقت پر بھی ملتا ہوگا یا نہیں ——"

بڑی بی نے اسی قسم کی بڑھاپے کی سچی محبت سے بھرا ہوا خط روانہ کیا تھا۔ اور تمام ہمدردی و غمگساری سے پر تھا۔ زاہد صاحب لیکن اس نامعلوم لفافے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ آخر حیرت سے اس کو کھولکر پڑھا تو مندرجہ ذیل سطور تھیں:۔

از بمبئی

حضور مولینا

آپ مجھے بھول چکے ہونگے۔ ایک گندی اجڑی ہوئی مخلوق کو۔ مگر میں آپکو قیامت تک فراموش نہیں کر سکتی۔ تیس سال پہلے آپ نے ایک شریف و خدا ترس انسان کی طرح میری گناہگار جان کو بچایا تھا۔ آپ میرے محسن ہیں۔

میری ناپاک زندگی قریب الختم ہے۔ اب میں امروز فردا کی مہمان ہوں بڑی مشکل سے مجھے مربوط کرکے یہ خط آپ کو لکھوا رہی ہوں۔ مولانا! میں نے گناہوں کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھا۔ جس میں میں نے ہر طرف اپنے ہی جیسے گناہگار پائے۔ ہاں صرف آپ کو فرشتہ پایا۔ چنانچہ میں اب اس فرشتہ کے سپرد اپنی تمام عمر کی سیاہ کاریوں کی یادگار کو کرنا چاہتی ہوں تاکہ لوگ اس کو دیکھکر مجھے اور معصیت کے پھیلاؤ کو یاد نہ کریں بلکہ آپ کے نورانی پرتو سے وہ ایسی چمکے کر شریف بستیاں اس سے جگمگا اٹھیں۔

میرے محسن! خدا نے مجھے ایک جوان و خوبصورت بیٹی عطا کی ہے جس کے دامن نسائیت کو میں نے اپنے گندے ہاتھوں سے اب تک آبروئے طہارت سے جوڑے رکھا ہے۔ مگر وہ اب میرے قبضہ سے نکلی جا رہی ہے اور سینما میں داخل ہونے کیلئے بیچین ہے۔ لڑکی بری نہیں ہے۔ اللہ نے اس کو شریف بیٹیوں کی سی شرم و حیا دی ہے اور میں اس سے بھی خوش ہوں کہ ایک شریف نوجوان سے وہ بہت مانوس نظر آتی ہے جو پچھلے ہفتہ سے دو ایک بار یہاں آتا ہے۔ اس کا نام حمید ہے۔

میں پچیس سال سے بمبئی میں ہوں۔ یہیں یہ میری بچی پیدا ہوئی تھی مجھے پوری امید تھی کہ ناہید نیکی کی زندگی بسر کریگی مگر میری موت قریب دیکھ کر ہی اس کا بے قاعدہ باپ جو یہاں ایک فلم کمپنی کا مالک ہے آ کودا۔ اور اس نے میری ناہید کو ورغلا کر پرسوں میرے پاس سے اڑا دیا۔ وہ دادر میں پارسیوں کی بلڈنگ کے اندر رہتا ہے۔ اور اس کا نام عظیم خاں ہے۔ سنا ہے وہ ایک آدھ ہفتہ کے لئے بمبئی سے باہر گیا ہوا ہے۔

میرے محسن! آپ میری بچی کو بچا لیجئے۔ ہاں خدا نے آپ جیسے لوگوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ گناہوں کی بستی میں معصومیت و نیکی کا نور پھیلائیں۔ کیا آپ میری بچی کو اپنے دامن پناہ میں لینے سے گریز کریں گے؟ آپ جو ہمیشہ مظلوموں اور پیش پا افتادہ لوگوں کے کام آنے کے عادی رہے ہیں۔ للہ جلد پہنچئے اور میری ناہید کو ہمیشہ کیلئے تاریکی میں گرنے سے روک کر ثواب عظیم حاصل کیجئے۔ میں زیادہ سے زیادہ آج کی مہمان ہوں۔ خدا آپ کو اجر بخشے آمین۔

گناہگار عیدن

زاہد صاحب اس خط کو پڑھکر تھرا اٹھے۔ تیس سال پہلے ہی عیدن۔ ان کی بے عیب زندگی میں ناگاہ کو دو کر سلوٹیں پیدا کر دی تھیں جو خدا خدا کر کے

استبداد وقت کے ہاتھوں مٹ سکی تھیں۔ اب پورے تیس سال بعد وہ ان کے ناکردہ گناہوں میں جن کی کبھی غریب زاہد نے حسرت بھی نہ کی تھی۔ ایک اور معصیت نامودہ کا اضافہ کرنا چاہتی تھی۔ کیا زندگی کی بساط اس قدر کٹھنائیوں سے بھری ہوئی ہے کہ سنبھل سنبھل کر پیر رکھنے کے باوجود کسی مقام پر آکر ہمیں ٹھوکر کھانی پڑتی ہے؟

آہ بیچاری بشریت۔

مگر اس میں ٹھوکر کا کیا سوال تھا۔ زاہد اپنی پوری کوششوں سے ساٹھ سال کی طویل کشمکش میں سے اپنے اصول و قوانین مذہب کو صاف بچا لے گئے تھے۔ اس کا کیا علاج کہ ٹھوکریں خود سامنے آکھڑی ہوں۔ اور اگر ان کے درمیان سے کوئی بغیر چوٹ کھائے گذر بھی جائے تو لوگ یہ خیال کئے بغیر نہ رہیں کہ یہ شخص متصادم ہوئے بغیر کہیں ٹکرایا ہے۔

غریب عیدن کو خبر بھی نہ تھی کہ اس کا محسن ابھی تک زندہ موجود ہے۔ وہ ان کو لاہور میں سمجھ رہی تھی۔ زاہد صاحب بہت دیر تک تمام واقعات پر غور کرتے رہے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب فطرت آخر میں گناہ سے تنگ آجانے کی عادی ہے تو اس کو شروع ہی سے انتہا کے مواج دریا کی طرف جانے سے کیوں نہ روک دیا جائے۔ پھر بھی انہوں نے سوچا کہ اپنے ہونہار لڑکے سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ مگر کہیں گے کیا؟

کیا عابد ان کے تمام بیان کو سنکر واقعات کے سارے زینوں پر صحیح قدم رکھتا ہوا یہ سمجھ سکے گا کہ عیدن اس کے باپ کی زندگی کا ایک دور چھپا ہوا اور راز خود ساختہ کا جزو ہے۔ اگر اس نے خدانخواستہ اس کے برعکس یہ خیال کیا کہ قبلہ کی مشہور عادات زندگی کے ساٹھ سال کی جو وہ کہیں کہیں سے تتبع نہ کر سکا ہے تو اس بات میں خوش نصیب تھا کہ وہ عیدن اور اسی قبیل کی دوسری عورتوں سے پاک ہی!

آخر انہوں نے یہ طے کیا کہ کسی دوسرے شخص کے واقعات زندگی بنا کر اس واقعہ کا ذکر عابد کے سامنے کیا جائے۔ اگرچہ اس تاویل میں کذب کی بو تھی جس سے زاہد صاحب کی لطیف روح سخت گھبراتی تھی مگر اس تاویل کے عقب میں ثواب بھی ابدی سانسیں لیتا ہوا نظر آرہا تھا۔

جب عابد شام کو مکان پر آیا تو مولانا نے پدری حجاب کو بے محل خیال کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "عابد میاں! میں اپنے ایک عزیز دوست کے معاملہ میں تم سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔"

"مجھ سے ابا جان بچہ ہیں تو آپ کا خاک پا ہوں۔" عابد نے کہا

"بات یہ ہے بیٹے" انہوں نے اس کی فرمانبرداری کی قدر کرتے ہوئے کہا "کہ وہ دوست خدا کی بخشی ہوئی عزت کا مالک ہے اور نہایت افسانہ مشہور ہے۔ ایک دفعہ اتفاقی طور پر اس کو ایک طوائف کی از راہ خدا ترسی جان بچانے کا موقع حاصل ہوا تھا۔" اس کے بعد زاہد صاحب نے تمام معاملات اس سے بیان کر دیئے۔

"اب بتاؤ بیٹے کہ وہ کیا کرے؟" آخر میں زاہد صاحب نے دریافت کیا۔

"میری رائے میں تو آپ کے دوست کو ضرور اس طوائف کی وصیت پر عمل کرنا چاہیئے۔" عابد نے کہا۔

"مگر میرا دوست یہ گوارا نہ کریگا کہ وہ نوجوان اس لڑکی کے پاس آتا جاتا رہے۔" زاہد صاحب نے کہا۔

"وہ دونوں کا نکاح کرا دیں۔" عابد نے کہا۔

"اگر دونوں نے اس سے انکار کر دیا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ نوجوان اچھا ہی آدمی ہے؟"

"تو معاملہ ذرا دشوار ہو جاتا ہے۔ بیشک یہ تو معیوب بات ہوگی کہ وہ لڑکی آپ کے معزز دوست صاحب کی نگرانی میں ہو اور غیر مرد آتا رہے۔" عابد نے کہا "بہر نوع لڑکی کو وہ سمجھانے کی کوشش کریں۔"

"ہاں میری بھی یہی رائے ہے۔ اچھا اپنے ناجائز باپ سے وہ کس طرح چھٹکارا پائے؟" زاہد صاحب نے دریافت کیا۔

"اس باپ ہی لڑکی کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ بصورت دیگر پولیس سے امداد لی جائے۔" عابد نے کہا۔

"مگر اس میں بڑا فضیحتا ہوگا۔ میرے دوست کے معاملات پر خواہ مخواہ روشنی پڑیگی۔" زاہد صاحب نے کہا۔

"تو پھر آپ کے دوست صاحب پہلے لڑکی سے مل کر اس کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کریں اور اگر اسکو آمادہ بغاوت پائیں تو سمجھائیں۔"

"ہاں سردست تو یہی ممکن ہے۔" زاہد صاحب نے کہا اور چپ ہو گئے۔

اب زاہد صاحب پھر سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کس طرح اس سن و نوع طوائف زادی کے مکان پر جائیں۔ جب وہ اسکے مکان کی طرف مڑینگے تو لوگ ان کی عمر کو دیکھیں گے۔ ان کے وہاں جانے کو دیکھیں اور ہنسیں گے۔ اسی طرح ہنسیں گے جس طرح عیدن کو ان کے ساتھ تانگے میں دیکھکر تیس سال پہلے ہنسے تھے۔ مگر اس وقت لوگوں کی ہنسی میں تحقیر کا جزو نہ ہوگا کیونکہ وہ جوان تھے اور ان کی اس لغزش کو جوانی کی انگڑائی پر محمول کر کے ٹال دیا ہوگا۔ مگر اس سن میں ایک نوجوان عورت کا کوٹھا ان کو اپنے اندر جذب کر کے ایک مستقل سیاہ نقش قائم کر دے گا۔ اور ان کے داخلہ کو بڑھاپے کی جوان شوخی سمجھا جائیگا کتنی بڑی بات ہے۔ عیدن گناہگار رہتی تو غنیمت تھا۔ مگر اس کا گناہگار کرنا قیامت ہے۔ مگر یہ گناہ

کس کا تھا؟ سماج کا؟ ضمیر کا؟ خدا کا؟

آدمی اس قدر اچھا نہ بن جائے کہ اُس سے بُرائی (خواہ لوگوں کے مغالطہ کی بنا پر ہو) سرزد ہوتے دیکھکر لوگ ہو چکے رہ جائیں۔ آخر زاہد صاحب نے ناہید کے پاس پہنچنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ من لئے اُصولوں کی پابندی اور ایک آسمانی ضابطہ کی پیروی میں یہی فرق ہے۔ اول الذکر ذات و انفرادیت کے انحطاط کی طرف انسان کو لے جاتے ہیں اور موخر میں اپنی ذات کو تکلیف پہنچا کر انسان خدمتِ خلق کے قابل اپنے کو بناتا ہے۔

رات کے آٹھ بجے ہونگے۔ عابد اب تک مکان پر نہیں آیا تھا۔ زاہد صاحب چپکے سے مکان سے نکلے اور دادر پہنچ کر چپکے سے ناہید کے مکان میں داخل ہوئے۔ ملازمہ نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ سفید ڈاڑھی۔ نورانی چہرہ اور قبلہ نما قسم کا شخص آج تک اس مکان میں داخل نہیں ہوا تھا۔

"ناہید صاحبہ مکان میں ہیں؟" زاہد صاحب نے اس طرح دریافت کیا گویا کسی کے مکان میں آکر مکین کو نہیں بلکہ دوسرے شخص کو دریافت کر رہے تھے۔

"جی ہاں یہیں ہیں۔ کھانا کھا رہی ہیں۔ آپ تشریف رکھیں" زاہد بیٹھ گئے۔ اس طرح بیٹھ گئے جیسے ہوا پر بیٹھے ہوں۔ لاکھ ضمیر مطمئن تھا مگر ماحول تو اجنبی تھا۔ اتنا اجنبی جتنا کرۂ ارض کے رہنے والے کو کرۂ مریخ۔

زاہد دروازے کی طرف پشت کئے بیٹھے تھے کہ زینے پر پیروں کی آواز ہوئی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ زاہد نے جو مُڑ کر دیکھا تو اُن پر بجلی سی گر پڑی۔ سنبھلے اور غصے سے کپکپاتے ہوئے بولے۔ "ناخلف! یہ حرکات ہیں تیری۔ اپنے باپ کی جاسوسی کرتا ہے۔ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہے"

زاہد سُن کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کمرے میں داخل ہونے والا عابد ہی تھا۔ اُسکو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اور آنکھیں فرطِ حیرت و استعجاب سے پپوٹوں میں سے نکلی جا رہی تھیں۔ جب اس کی زبان کھلی تو وہ بمشکل کہہ سکا "میں —— میں نہیں سمجھ سکتا کہ ——"

"تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم ایک ذلیل و ناقابلِ اعتبار انسان کی طرح میرے پیچھے پیچھے یہاں آئے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی" زاہد صاحب نے غصہ سے کپکپاتے ہوئے کہا "شرم کی ایک ہی رہی"

"میں نے آپ کا —— پیچھا بالکل نہیں کیا ——" غریب عابد نے ممیاتے ہوئے کہا۔

"جی تو آپ شاید آسمان پر سے نازل ہو گئے ہیں۔ یا آپ اس کوچہ کی اکثر ہوا کھایا کرتے ہیں" زاہد نے اس قدر غصے سے کہا۔

"جی کبھی کبھی —— لیکن میں نے متعلق آپ کا صاحب نہیں کیا ہے۔ میں بھی جاتا ہوں"

زاہد صاحب کی نظروں نے عابد کے چہرے پر صداقت محسوس کی لہٰذا ان کا غصہ آہستہ آہستہ سرد ہونے لگا۔ اُس کے عوض ایک سخت کولٹ فہالت کے خلجان نے ان کو آدبوچا۔ بہر حال اُنہوں نے ماحول کے تعلق کی نفی کرتے ہوئے اپنے کو سنبھالا اور فضا کا تکدر دُور کرنے کو ذرا ملائم لہجہ میں بولے۔

"عابد! ٹھہرو۔ واقعات کا غلط اندازہ لیکر نہ جاؤ۔ تم میری بابت کسی مغالطے میں مبتلا ہو گئے ہو گے اور مجھے اس مقام پر پاکر سخت متحیر ہو گئے"

"جی میری حیرت کی انتہا نہیں ہے کہ آپ یہاں کہاں؟" عابد نے کہا۔

"مجھے واقعات۔ چند ناگوار واقعات یہاں گھسیٹ لائے ہیں۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں آتے ہوئے میں اپنے جسم میں جذام سا پیدا ہوتے محسوس کرتا ہوں" زاہد صاحب نے کہا۔

"اچھا میں سمجھا۔ آپ شاید اپنے دوست صاحب کے معاملہ میں یہاں تشریف لائے ہونگے" عابد نے اپنے والد کے پچھلے بیان کو یاد کر کے کہا۔ زاہد صاحب اب سخت ضغطہ میں پڑ گئے۔ حقیقت کو چھپانا بیکار تھا۔ بولے:۔

"وہ اپنا دوست میں ہی ہوں۔ عبدن میرے ہی سپرد اپنی لڑکی ناہید کو کر گئی ہے۔ چنانچہ میں اس وقت اسی سے ملنے آیا ہوں"

"اچھا جی۔ آپ اُس سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ اس سن شریف میں مولوی صاحب"۔ کسی نے سخت لہجہ میں پیچھے سے کہا۔ دونوں باپ بیٹے اس آواز کو سُنکر چونک پڑے۔ اور اُنہوں نے ایک بدمست شرابی کو اپنی طرف حقارت و استہزا سے نگراں پایا۔

"مولوی صاحب! آپ کو شرم نہیں آتی۔ اس عمر میں تمہارا یہ حال ہے تو جوانی میں تو تم نے ہمارے بھی کان کاٹے ہونگے" اس شخص نے پھر بکنا شروع کیا۔

"یہ غیر کا مکان ہے۔ آپ شاید غلطی سے یہاں آ گئے ہیں" زاہد صاحب نے کہا۔

"غیر کا مکان ہے!" اُس نے ایک گندہ قہقہہ لگایا۔ "تم مجھے اپنے ہی مکان میں سے نکالنا چاہتے ہو۔ میری لڑکی کے مکان سے۔ واہ مولوی صاحب عقل ماری گئی ہے تمہاری" اس شخص نے کہا۔ اس کے بعد عابد کی طرف مخاطب ہوا "تمہاری بیکار کوششوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ کیوں میاں صاحبزادے! کچل ڈالوں گا" لیکن عابد خود بخود کچل گیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید

پڑگیا اور منہ پہ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ زآہد صاحب اپنے لڑکے کی اس سراسیمگی پر سخت متحیر ہوئے اور اُن پر ایک سخت اذیت سی طاری ہوگئی۔ آخر سنبھل کر بولے "آپ شاید عظیم خاں ہیں؟"

"جی غلام حاضر ہے۔" عظیم خاں نے اسی انداز استہزا سے کہا۔

"تو میں اعلانِ حقیقت کے طور پر آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کو آپ کی مرحوم بیوی میری نگرانی میں چھوڑ گئی ہے۔ میں ناہید سے یہی کہنے آیا ہوں۔" زآہد نے کہا۔

"جی۔ آپ کی اس سے کب ملاقات ہوئی تھی۔" عظیم خاں نے حقارت سے کہا۔ زآہد صاحب اپنے کو اپنے لڑکے کی آنکھوں میں ذلیل ہوتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ گھرانا ہی سوسائٹی کا ابتدائی مدرسہ ہے۔ آہ تیس سال پہلے کا نیک مجرم۔

"آپ کو شرم نہیں آتی کہ نوجوان ایکٹریسوں کے درکی جبیں سائی کرتے پھر رہے ہیں۔ ہاں لرشیں۔ اچھا کل ہی اخبار میں سنبھالئے۔ میں آپ کو پہچان گیا۔ آپ ہمارے شہر لاہور کے بڑے مولوی ہیں۔" زآہد شرم و خفت سے زمین میں گڑ گئے۔ مگر بے داغ ضمیر نے اس دھبہ کو دھو دیا۔ خدا کی آنکھوں کے سامنے تمام حقیقت تھی۔ انہوں نے پیشانی پر سے پسینے کی بوندیں صاف کیں اور تلخی سے بولے "آپ بہت گستاخ انسان ہیں۔" ان کو سب سے زیادہ حیرت اپنے بیٹے کی خاموشی پر تھی جو دبا دبا یا ایک کونے میں کھڑا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ جس طرح یہاں آنا میرے سن کے خلاف ہے اسی طرح تم سے لڑنا بھی میری عمر کے شایاں نہیں۔ بلکہ میں تو اپنے جوان بیٹے عآبد کو بھی تمہارے منہ لگنے کی اجازت نہیں دوں گا۔" زآہد صاحب نے کہا۔

"مگر آپ کے برخوردار عآبد یہاں ہیں کہاں؟" عظیم نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

عآبد تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ اس قدر بھیگی بلی کیوں بن گئے ہو۔" زآہد صاحب نے کہا۔

"عآبد!" عظیم نے حیرت سے کہا۔ "عابد نہیں مولوی صاحب ان کا نام حمید ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کو اپنے بیٹے کا صحیح نام یاد نہیں۔"

"حمید!" زآہد صاحب نے بیحد متحیر ہوکر کہا۔ "وہ حمید جس کا ذکر عیدن نے اپنے خط میں کیا تھا۔"

"یہ میاں حمید تو یہاں روز ہی آتے ہیں۔ مگر بڑے مولوی صاحب آج آپ پر جوانی کیسے چڑھ آئی۔" عظیم نے گستاخانہ کہا۔

اب زآہد صاحب پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ عآبد، حمید بنا ہوا طوائف کی اس چھوکری کے کوچے کی روز سیر کرتا تھا۔ اس انکشاف سے انکی حالت غیر ہوگئی۔ مگر چو طرف سے گندگی میں گھر گئے تھے ہاتھ پیر ہلانے سے خطرہ تھا کہ اور لتھڑ جائیں گے۔ اس لئے ضبط و تحمل سے عآبد سے مخاطب ہوئے۔

"عابد مکان پر چلو۔ اب یہاں ہم کو نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ اور عظیم خاں آپکے شبہات بالکل بے بنیاد ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے اس قدر کہہ دینے سے وہ نہیں مٹ سکتے۔ خدا کا شکر ہے کہ جس طرح ہم ایک شریف مقصد کے ساتھ آئے تھے اسی طرح پاک و شریف ضمیر کے ساتھ واپس جارہے ہیں۔"

"درست ہے۔" عظیم خاں نے ہنس کر کہا۔ "بہت شریف ہیں آپ کہ عیدن کے پرانے شناسا ہیں۔ اور آپ کے برخوردار حمید۔ یا عآبد بھی شاید یہاں شریف ہی مقصد سے آئے ہونگے۔ خیر یہ باز پرس آپ کیجئے۔ ان کے باپ ہیں۔ حق تو نہیں ہے باز پرس کا آپ کو۔ کیونکہ اس مکان میں جب دو آدمی ایک ساتھ ہی پکڑے جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے باز پرس کرنے میں شرماتے ہیں۔"

عظیم کے کلمات پگھلے ہوئے سیسے کی طرح زآہد صاحب کی روح میں بیٹھ رہے تھے۔ آخر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور عآبد کو ساتھ لیکر چل دیئے۔

"ابا! آپ مجھے بہت ہی ذلیل انسان سمجھ رہے ہونگے۔ میں شرم سے زمین میں گڑا جارہا ہوں۔" عآبد نے آدھے راستے تک بمشکل یہ جملے ترتیب دیکر ادا کئے۔ زآہد صاحب کئی سیکنڈ تک خاموش رہے۔ عظیم خاں کے ذلیل الفاظ میں صداقت کر رہی تھی۔ بیشک طوائف کے مکان کے اندر پکڑے ہوئے دو اِن باپ بیٹے جیسے انسان ایک دوسرے سے باز پرس نہیں کرسکتے ہیں۔ آخر زآہد صاحب نے کہا۔ "حمید تم ہی ہو۔ اچھا تم حمید بنے ہوئے تھے۔"

"جی ہاں! دوستی کی قربان گاہ پہ مجھے حمید بننا پڑا تھا۔ اب میں دوست کے لئے مگر ایک باب میں ناگوار واقعہ کا ذکر کرکے آپ کو پریشان نہ کرونگا۔ اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ میں یہاں مجبوراً حمید بن کر رہ گیا تھا۔" عآبد نے کہا۔ زآہد صاحب نے آہ خفی کے ساتھ دل میں کہا کہ میں بھی اخلاقاً اور بعد میں مجبوراً عیدن کا شناسا بننے پر آمادہ کرلیا گیا تھا۔

"عابد! ہم ابھی حادثات کی تراہے پر نہیں پہنچے ہیں۔ چنانچہ قبل اس کے کہ چوراہا شروع ہو، دوراہے کو اپنے پیروں کے نیچے سے نہ نکلنے دو۔ تم اگر حادثہ کے کسی تھپیڑے یا اخلاق وانسانیت کے بے ضرر لیکن چشم آشوب دکھ سے مجبور ہوکر ناہید کو زبان دے چکے ہو تو اس کا پاس کرنے کو آزاد ہو۔ اور منحرف ہونے کیلئے بھی تم پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر میں اپنے متعلق کہتا ہوں کہ میں

[illegible] کا ضمیر [illegible]

[illegible] اس قدر اچھا نہ بن جائے کہ اس سے برائی [illegible] لوگوں کے [illegible] بنا پر جو سرزد ہوتے دیکھ کر دنگ ہو کے رہ جائیں۔ آخر زاہد صاحب نے ناہید کے پاس پہنچنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ جن کے اصولوں کی پابندی اور ایک آسمانی ضابطہ کی پیروی میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر ذات و انفرادیت کے انحطاط کی طرف انسان کو لے جاتے ہیں اور موخر میں اپنی ذات کو تکلیف پہنچا کر انسان خدمت خلق کے قابل اپنے کو بناتا ہے۔

رات کے آٹھ بجے ہونگے۔ عابد اب تک مکان پر نہیں آیا تھا۔ زاہد صاحب چپکے سے مکان سے نکلے اور دادر پہنچ کر چپکے سے ناہید کے مکان میں داخل ہوئے۔ ملازم نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ سفید ڈاڑھی۔ نورانی چہرہ اور قبلہ نما قسم کا شخص آج تک اس مکان میں داخل نہیں ہوا تھا۔

" ناہید صاحبہ مکان میں ہیں ؟" زاہد صاحب نے اس طرح دریافت کیا گویا کسی کے مکان میں آ کر مکین کو نہیں بلکہ دوسرے شخص کو دریافت کر رہے تھے۔

" جی ہاں یہیں ہیں۔ کھانا کھا رہی ہیں۔ آپ تشریف رکھیں ۔" زاہد بیٹھ گئے۔ اس طرح بیٹھ گئے جیسے ہوا پر بیٹھے ہوں۔ لاکھ ضمیر مطمئن تھا مگر ماحول تو اجنبی تھا وہ اتنا اجنبی جتنا کرہ ارض کے رہنے والے کو کرہ مریخ۔

زاہد دروازے کی طرف پشت کئے بیٹھے تھے کہ زینے پر پیروں کی آواز ہوئی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ زاہد نے جو مڑ کر دیکھا تو ان پر بجلی سی گر پڑی۔ سنبھلے اور غصے سے کپکپاتے ہوئے بولے۔ "ناخلف! یہ حرکات ہیں تیری۔ اپنے باپ کی جاسوسی کرتا ہے۔ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہے ۔"

عابد سُن کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ہاں کمرے میں داخل ہونے والا عابد ہی تھا۔ اسکو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اور آنکھیں فرطِ حیرت و استعجاب سے پپوٹوں میں سے نکلی جا رہی تھیں۔ جب اس کی زبان کھلی تو وہ بمشکل کہہ سکا۔ " میں —— میں نہیں سمجھ سکتا کہ —— "

" تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم ایک ذلیل و ناقابل اعتبار انسان کی طرح میرے پیچھے پیچھے یہاں آئے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی ۔" زاہد صاحب نے غصہ سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ "شرم کی ایک ہی رہی۔"

" میں نے آپ کا —— پیچھا بالکل نہیں کیا —— " غریب عابد نے ممیاتے ہوئے کہا۔

" جی تو آپ شاید آسمان پر سے نازل ہو گئے ہیں۔ یا آپ اس کوچہ کی اکثر ہوا کھایا کرتے ہیں ۔" زاہد نے اس قدر غصے سے کہا۔

[illegible]

جاتا ہوں ۔"

زاہد صاحب کی نظروں سے عابد کے چہرے پہ [illegible] ان کا غصہ آہستہ آہستہ فرد ہونے لگا۔ [illegible] کے طوفان نے ان کو آدبوچا۔ بہرحال اُنہوں نے ماحول کے [illegible] اپنے کو سنبھالا اور فضا کا تکدر دور کرنے کو ذرا نرم لہجہ میں بولے۔

" عابد! ٹھہرو۔ واقعات کا غلط اندازہ لیکر نہ جاؤ۔ تم میری ذات کسی مغالطے میں مبتلا ہو گئے ہو گے اور مجھے اس مقام پر پاکر سخت متحیر ہو گے۔"

" جی میری حیرت کی انتہا نہیں ہے کہ آپ یہاں کہاں ؟" عابد نے کہا۔

" مجھے واقعات، چند ناگوار واقعات یہاں گھسیٹ لائے ہیں۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں آتے ہوئے میں اپنے جسم میں جذام سا پیدا ہوتے محسوس کرتا ہوں۔" زاہد صاحب نے کہا۔

" اچھا میں سمجھا۔ آپ شاید اپنے دوست صاحب کے معاملہ میں یہاں تشریف لائے ہونگے ۔" عابد نے اپنے والد کے پچھلے بیان کو یاد کر کے کہا۔ زاہد صاحب اب سخت ضغطہ میں پڑ گئے۔ حقیقت کو چھپانا بیکار تھا۔ بولے :-

" وہ اپنا دوست میں ہی ہوں۔ مینا میرے ہی سپرد اپنی لڑکی ناہید کو کر گئی ہے۔ چنانچہ میں اس وقت اسی سے ملنے آیا ہوں ۔"

" اچھا جی۔ آپ اُس سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ اس سن شریف میں مولوی صاحب"۔ کسی نے سخت لہجہ میں پیچھے سے کہا۔ دونوں باپ بیٹے اس آواز کو سُنکر چونک پڑے۔ اور اُنہوں نے ایک بدمست شرابی کو اپنی طرف حقارت و استہزا سے نگراں پایا۔

" مولوی صاحب! آپ کو شرم نہیں آتی۔ اس عمر میں تمہارا یہ حال ہے تو جوانی میں تو تم نے ہمارے بھی کان کاٹے ہونگے ۔" اس شخص نے پھر بکنا شروع کیا۔

" یہ غیر کا مکان ہے۔ آپ شاید غلطی سے یہاں آ گئے ہیں ۔" زاہد صاحب نے کہا۔

" غیر کا مکان ہے !" اُس نے ایک گندہ قہقہہ لگایا۔ "تم مجھے اپنے ہی مکان میں سے نکالنا چاہتے ہو۔ میری لڑکی کے مکان سے۔ واہ مولوی [illegible] عقل ماری گئی ہے تمہاری ۔" اس شخص نے کہا۔ اس کے بعد عابد کی طرف مخاطب ہوا۔ "تمہاری بیکار کوششوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ [illegible] صاحبزادے بھیجا نکال ڈالوں گا ۔" لیکن عابد خود بخود کھل گیا تھا۔ اس کا چہرہ [illegible]

[illegible]

چہرے پر ... اور ان پر ایک سخت اذیت کی حالت طاری ہو گئی ... کہ
"آپ شاید عظیم خاں ہیں؟"

"یہ خادم حاضر ہے۔" عظیم خاں نے اسی انداز احترام سے کہا۔

"میں اعلانِ حقیقت کے طور پر آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کو آپ کی مرحوم بیوی میری نگرانی میں چھوڑ گئی ہے۔ میں نا جیہ سے یہی کہنے آیا ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"چھوڑ۔ آپ کی اس سے کب ملاقات ہوئی تھی۔" عظیم خاں نے حقارت سے کہا۔ زاہد صاحب اپنے کو اپنے لڑکے کی آنکھوں میں ذلیل ہوتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ گھرانا ہی سوسائٹی کا ابتدائی مدرسہ ہے۔ آہ تیس سال پہلے کا نیک مجرم۔

"آپ کو شرم نہیں آتی کہ نوجوان ایکٹرسیوں کے در کی جبیں سائی کرتے پھر رہے ہیں۔ یا ہی رشیں۔ اچھا کل ہی اخبار میں سنبھالئے۔ میں آپ کو پہچان گیا۔ آپ ہمارے شہر لاہور کے بڑے مولوی ہیں۔" زاہد شرم و خفت سے زمین میں گڑ گئے۔ مگر بے داغ ضمیر نے اس دھبّہ کو دھو دیا۔ خدا کی آنکھوں کے سامنے تمام حقیقت تھی۔ انہوں نے پیشانی پر سے پسینے کی بوندیں صاف کیں اور تلخی سے بولے "آپ بہت گستاخ انسان ہیں۔" ان کو سب سے زیادہ حیرت اپنے بیٹے کی خاموشی پر تھی جو دبا دبایا ایک کونے میں کھڑا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ جس طرح یہاں آنا میرے سن کے خلاف ہے اسی طرح تم سے لڑنا بھی میری عمر کے شایاں نہیں۔ بلکہ میں تو اپنے جوان بیٹے عابد کو بھی تمہارے منہ لگنے کی اجازت نہیں دوں گا۔" زاہد صاحب نے کہا۔

"مگر آپ کے برخوردار عابد یہاں ہیں کہاں؟" عظیم نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"عابد تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس قدر بھیگی بلی کیوں بن گئے ہو۔" زاہد صاحب نے کہا۔

"عابد!" عظیم نے حیرت سے کہا۔ "عابد نہیں مولوی صاحب ان کا نام حمید ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کو اپنے بیٹے کا صحیح نام یاد نہیں۔"

"حمید!" زاہد صاحب نے بیحد متحیر ہو کر کہا۔ "وہ حمید جس کا ذکر حمیدن نے اپنے خط میں کیا تھا۔"

"یہ میاں حمید تو یہاں روز ہی آتے ہیں۔ مگر بڑے مولوی صاحب آج آپ ہو ... کیسے چلے آئے۔" عظیم نے گستاخانہ کہا۔

زاہد صاحب پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ عابد، حمید بنا ہوا طوائف کی اس چوکری کے کوچے کی خدمت سیر کر رہا تھا۔ اس انکشاف سے انکی حالت غیر ہو گئی۔ مگر چو طرف سے گندگی میں گھر گئے تھے۔ ہاتھ پیر ہلانے سے خطرہ تھا کہ اور لتھڑ جائیں گے۔ اس لئے ضبط و تحمل سے عابد سے مخاطب ہوئے۔

"عابد مکان پر چلو۔ اب یہاں ہم کو نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ اور عظیم خاں آپ کے شبہات بالکل بے بنیاد ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے اس قدر کہہ دینے سے وہ نہیں مٹ سکتے۔ خدا کا شکر ہے کہ جس طرح ہم ایک شریف مقصد کے ساتھ آئے تھے اسی طرح پاک و شریف ضمیر کے ساتھ واپس جا رہے ہیں۔"

"درست ہے۔" عظیم خاں نے ہنس کر کہا۔ "بہت شریف ہیں آپ کہ حمیدن کے پرانے شناسا ہیں۔ اور آپ کے برخوردار حمید یا عابد بھی شاید یہاں شریف ہی مقصد سے آئے ہونگے۔ خیر یہ باز پرس آپ کیجئے۔ ان کے باپ ہیں۔ حق تو نہیں ہے باز پرس کا آپ کو۔ کیونکہ اس مکان میں جب دو آدمی ایک ساتھ ہی پکڑے جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے باز پرس کرنے میں شرماتے ہیں۔"

عظیم کے کلمات پگھلے ہوئے سیسے کی طرح زاہد صاحب کی روح میں بیٹھ رہے تھے۔ آخر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور عابد کو ساتھ لیکر چل دیئے۔

"ابا! آپ مجھے بہت ہی ذلیل انسان سمجھ رہے ہونگے۔ میں شرم سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔" عابد نے آدھے راستے تک بمشکل یہ جملے ترتیب دیکر ادا کئے۔ زاہد صاحب کئی سیکنڈ تک خاموش رہے۔ عظیم خاں کے ذلیل الفاظ میں صداقت کر رہی تھی۔ بیشک طوائف کے مکان کے اندر پکڑے ہوئے دو ان باپ بیٹے جیسے انسان ایک دوسرے سے باز پرس نہیں کر سکتے ہیں۔ آخر زاہد صاحب نے کہا۔ "حمید تم ہی ہو۔ اچھا تم حمید بنے ہوئے تھے۔"

"جی ہاں! دوستی کی قربان گاہ پر مجھے حمید بننا پڑا تھا۔ اب میں دوسرے ملنے مگر ایک باب میں ناگوار واقعہ کا ذکر کر کے آپ کو پریشان نہ کرونگا۔ اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ میں یہاں مجبوراً حمید بن کر رہ گیا تھا۔" عابد نے کہا۔ زاہد صاحب نے آہ خفی کے ساتھ دل میں کہا کہ میں بھی اتفاقاً اور بعد میں مجبوراً حمیدن کا شناسا بننے پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔

"عابد! ہم ابھی حادثات کی تہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ چنانچہ قبل اس کے کہ چرچا ہانا شروع ہو، دو راہے کو اپنے پیروں کے نیچے سے نہ نکلنے دو۔ تم اگر حادثہ کے کسی تھپیڑے یا اخلاق و انسانیت کے بے عذر لیکن چشم آشوب دکھ سے مجبور ہو کر حمید کو زبان دے چکے ہو تو اس کا پاس کرنے کو آزاد ہو۔ اور مغفرت ہونے کیلئے بھی تم پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر میں اپنے متعلق کہتا ہوں کہ میں

[illegible]

[illegible] ہوئے [illegible] سے [illegible] کہا۔

"میں اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔" عابد نے بہت دھیمے سے کہا۔

دونوں مکان پر پہنچے اور ایک دوسرے سے اس طرح دور دور رہے۔ گویا ایک دوسرے کا آئینہ تھا۔ جس میں اپنی صورتوں کو دیکھ کر دونوں کراہت محسوس کرتے تھے۔

زاہد صاحب شب بھر نہ سو سکے۔ سب سے زیادہ پریشانی ان کو اس بات کی تھی کہ آیا عابد نے ان کے پچھلے تیس سال کے واقعات کو صحیح سمجھا ہے یا اُن کے باپ میں اس کی رائے بھی چرخ کھا کر مغالطہ میں مبتلا ہو گئی ہے۔ پھر ان کو خیال آرہا تھا کہ ان کا اپنا لڑکا حمید بنا ہوا ناہید کے پاس آتا جاتا رہا ہے۔ میدان کے کام آکر جس قسم کا زخمی ثواب اب اپنے حاصل کیا تھا۔ کیا عابد بھی کسی آفتادگی مرد سے ایسا ہی مجروح ثواب حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

دوسرے روز شام کو زاہد صاحب مکان پر تنہا بیٹھے ہوئے تمام باتوں کو تول رہے تھے۔ اور ایک مدھم حقیقت کو روشن کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس مدھم حقیقت کے دھندلکے میں انہوں نے عابد و ناہید کے واسطے غور سے دیکھنا چاہا تو گرد و نواح میں دور دور تک ان کو ایصالِ ثواب کی کوئی پگڈنڈی نظر نہیں آئی جس پر گامزن ہوتا ہوا عابد ناہید کے پاس پہنچا تھا۔ ہاں ایک شدید اوگھٹ راستہ اس حقیقت کے دھندلکے میں ایسا نظر آرہا تھا جس میں خار تھے۔ مہیب چٹانیں تھیں۔ نکیلے کانٹے تھے اور اس پر ایک شخص ؎

محبت کی یہ راہ کتنی ہے سیدھی

گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

رات کو عابد آیا تو اب بھی بدستور خاموش تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے زاہد صاحب سے صرف اتنا کہا۔ "عظیم خاں کے ساتھ آج صبح موٹر کا ایک حادثہ ہو گیا تھا جس کے صدمہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اسی کے انتظام میں مجھے اتنی دیر ہو گئی۔ آخر غریب چل بسا۔"

"اچھا! بہت بُرا ہوا۔" زاہد صاحب نے نہایت افسوس سے کہا۔ "خدا اُسے غریقِ رحمت کرے۔" اس کے بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ عابد اپنے خیالات میں اور زاہد صاحب اپنے خیالات میں گم تھے۔ آخر زاہد صاحب ہی نے خاموشی کو توڑا۔

"اب ناہید کا کیا ہوگا عابد؟"

[illegible]

[illegible] وہ [illegible]

غیر لڑکی کو کس حیثیت سے پناہ دے سکوں گا۔" زاہد صاحب نے کہا۔

عابد چپ ہو گیا۔

عابد صبح جلدی ہی چلا گیا۔ جب زاہد صاحب ناشتہ پر بیٹھے نوکر نے ایک لفافہ لاکر دیا، کھولا تو یہ سطور نظر آئیں۔

"قبلہ

ناہید کے معاملہ کو اگر ہم آپ کے دوست صاحب کی شکل سے جوڑ دیں تو تمام باتیں سلجھ جائیں گی۔ آپ کے دوست صاحب نہیں چاہتے تھے کہ حمید ناہید کے پاس آتا جاتا رہے۔ چنانچہ اس کے حل کے لئے ایک تجویز پیش کی تھی۔

خاکسار عابد"

"تم تجویز پیش نہ کرتے تب بھی میں اس کی پیش بینی سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔" زاہد صاحب نے مسکرا کر خود سے زیر لب کہا۔ "میدان جنگ پر سے میرے اوپر اس لئے ٹیکی تھی کہ اس کے مجروح جسم کا اندمال میں کروں اور اس کی روح کا ضمیمہ جو دنیا میں رہ گیا تھا اس کو آئندہ جراحت پہنچنے سے تم بچاؤ۔ بہر نوع مجھ سے زیادہ تم کامیاب رہے۔"

ان خیالات میں زاہد صاحب خوش خوش اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے گئے۔

سفید خون

(از جناب عادل رشید صاحب)

امّی کو بڑی التماس تھی کہ اُن کی گود ہری ہو جائے اور ابا جی اپنے گھر میں ایک ننھا منا غوں غوں کرتا ہوا کھلونا دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ ہزاروں منتیں مانی گئیں۔ دعائیں کی گئیں اور روزانہ فقیروں، لنگڑے لولوں اور اپاہجوں کو کھانا کھلایا گیا۔ ایک دو سال نہیں بلکہ متواتر پانچ چھ سال تک دواؤں، منتوں اور خیرات بازیوں کا سلسلہ جیوں کا تیوں قائم رہا۔ آخر کار ابا اور امی کی یہ دعائیں بارگاہ خداوندی میں مستجب ہوئیں اور مجھے اس رنگ و بو کی خوبصورت دنیا میں بھیج دیا گیا۔ امی بے حد خوش تھیں اور ابا کی خوشیوں کا تو گویا کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔ پیدائش کے وقت امی پر جو کچھ گذری اُس کے خیال سے اب تک مجھے بڑی اذیت ہوتی ہے۔ اپنے اوپر جتنا مجھے غصہ آتا ہے اُتنا ہی بیچاری امی پر ترس۔ آپریشن کے وقت امی کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ مگر امی خوش تھیں اس لئے کہ اُنکی گود میں ایک بیحد خوبصورت معصوم سی بچی کھیل رہی تھی۔ انہیں قدرت کی طرف سے ان کی تمام تکالیف کے عوض میں یہ حسین تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ رات رات بھر امی مجھے اپنے شانے سے لگا کر ٹہلتیں۔ اس لئے کہ میں بے حد ضدن تھی۔ بات بات میں روتی اور اتنا کہ سارا گھر سر پر اُٹھا لیا کرتی تھی۔ امی بیچاری خود بیمار تھیں۔ میری دنیا میں آمد اُن کے لئے یہاں سے کوچ کا پیغام بنی۔ وہ بیحد نحیف ہو گئی تھیں۔ نوکر، چاکر، آیائیں، امائیں لاکھ کوشش کرتیں کہ وہ مجھے اُن کی گود میں دیکر خود تھوڑی دیر کیلئے آرام کرلیں۔ مگر وہ اسے گوارا نہ کرتیں بس میری ضدیں اور چیخیں تھیں اور ان کا رات رات بھر مجھے کندھے سے لگائے ٹہلنا۔ نتیجہ ظاہر تھا ان کی حالت اور بھی بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اور ایک دن ایسا آیا جبکہ وہ حسرت و ارمان کا طوفان اپنے سینے کے اندر لئے یہ کہتی کہتی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئیں کہ "اتنی مرادوں اور منتوں کے بعد تجھے پایا تھا۔ اب خدا جانے میرے بعد تجھ پر کیا گذرے تجھے کون پالے گا۔ کون پرورش کریگا۔ خدایا تو میری معصوم بچی پر رحم فرمانا۔ میں اسے تیرے رحم و کرم کے سپرد کرتی ہوں۔"

میرے ایک چچا ہیں جن کی زبانی اب تک سنتی چلی آرہی ہوں کہ وہ اپنے بھائی سے بیحد محبت کرتے تھے انہوں نے ان کی بیماری کے دوران میں رات دن ایک کر دیئے۔ اور مرتے وقت ابا نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ ان کے بعد ان کی بچی کی وہی پرورش کرینگے۔ گویا انہوں نے مرتے مرتے میرا ہاتھ میرے شفیق چچا کے ہاتھ میں دیدیا تھا۔ امی کی موت کے چند سال بعد شفیق باپ کا بھی سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ شفیق باپ کے مرنے پر چچا جان کے خون نے ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ جوش مارا۔ اور وہ میری خالہ سے مانگ کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ خالہ اماں مجھے دینے پر قطعی رضامند نہ تھیں مگر چچا جان کے اصرار اور مرحوم والد کی وصیت کے آگے اُن کی ایک نہ چلی۔ اور اس وعدہ پر کہ خالہ اماں مجھے جب دیکھنا چاہیں گی چچا جان مجھے واپس پہنچا دینگے۔ انہوں نے آنسوؤں کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کے ساتھ مجھے رخصت کر دیا۔ اس وقت میری عمر تقریباً چار، پانچ سال کی تھی۔

علی گڑھ آکر میں بے حد خوش تھی۔ ایک تو معصومیت جس میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں، پھر اس پر ابا اور امی کی حد سے بڑھی ہوئی محبت (میں آج تک چچا اور چچی کو اسی نام سے یاد کرتی اور یہی سمجھتی ہوں) نیز ماشاءاللہ تین چار بھائیوں کی معیت نے مجھے پچھلے مشفقوں کی یاد سے بالکل ہی بے نیاز کر دیا اور پھر پانچ سال کا سن ہی کیا ہوتا ہے۔ جو ان تمام الجھنوں کو سمجھ سکے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ جیوں جیوں میں بڑھتی گئی اسی نسبت سے ابا اور امی کی محبت گھٹتی گئی۔ پہلے امی مجھے دن دن بھر سنوارا کرتیں۔ میرا ہر بات کا خیال رکھتیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ وہ میری طرف سے اجنبی ہوتی جا رہی تھیں۔ اب اُن کا زیادہ وقت مجھے جھڑکنے بکنے جھکنے اور اپنی بچیوں کی دیکھ بھال میں گذرتا۔ وہ میرے متعلق نت نئی باتیں ابا سے کہا کرتیں۔ خدا معلوم کیوں اب امی کو مجھ میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے۔ میرا ہر کام اُنہیں اُلٹا دکھائی دیتا۔ میری بولی، میری بات چیت، میرا اُٹھنا بیٹھنا تک انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ ہر وقت یہی کہا کرتیں "عجیب لڑکی ہے، کسی کام میں دیدہ نہیں لگتا اس کا۔ جب دیکھو چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں سے لڑا کرتی ہے۔ شرم نہیں آتی اسے۔ ماشاءاللہ چودہ پندرہ برس کا سن اور اس پر یہ نکما پن۔ میں تو جب اس عمر میں تھی تو کیا مجال کہ امی کو ایک کام بھی کرنے دیتی۔ ہر کام خود سے کرتی، امائیں۔ نوکرانیاں لاکھ منع کرتیں مگر میں کب سنتی، اپنا کام خود سے انجام دیتی۔ سارا گھر میں نے سنبھال رکھا تھا۔ اور ایک یہ ہے نالائق کہ اُٹھ کر خود سے پانی بھی نہیں پی سکتی۔ جب دیکھو بیگم صاحبہ چھپر کھٹ پر سوار ہیں۔ سر میں درد ہے، کبھی بخار ہو گیا، چولھے کے پاس جانا تو گویا شیر کے منہ میں جانا ہے" وغیرہ وغیرہ

[illegible] کی زبان [illegible] تک سب [illegible] کے

[illegible] کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ بچنا ہے [illegible]

اتنا بڑا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے سامنے ان کا اٹھنا اور احترام جینا پڑا

۔ محلہ کی کوئی بھی عورت آتی اور بس امی بیٹھ گئیں میری شکایتیں کرنے۔ بس اب ہونے

میری تیلیاں ۔ کم بخت ناک میں دم کر رکھا ہے اس لڑکی نے۔ ماشاء اللہ جوان

کو آئی۔ کل بیاہ کے قابل ہو جائیگی مگر کسی کام کا سلیقہ نہیں۔ نہ کھانا پکانا جانتی ہے

سینا آتا ہے ۔ دوسرے کے گھر جائیگی تو بس ناک کٹوائیگی۔ اپنے ساتھ اماں باوا کی بھی۔

بات کہو تو بس مرچیں لگ جاتی ہیں صاحبزادی کے۔ سمجھاؤ تو آنسو بہائے جاتے

۔ میں تو بہن عاجز آگئی ہوں اس لڑکی سے۔"

ایک دن کا ذکر ہے محلہ کی ایک بڑی بی جنہیں ہم لوگ منظاق بی کہا کرتے تھے،

تشریف لائیں اور مجھے چولہے کے پاس دیکھکر امی سے بولیں "بی بی بس تم ہی غضب

کی ہو جب دیکھتی ہوں یہ لڑکی ہنڈیا چولہا کرتی رہتی ہے۔ اگر اس سے فرصت ملی تو

بھائی بہنوں کو کھلا رہی ہے، نہلا دھلا رہی ہے، کبھی کپڑے دھو رہی ہے۔ میں کہتی ہوں

پرائے گھر جانا ہے اسے، آخر کچھ سینا پرونا تو سکھاؤ۔ اگر یہ یوں ہی رہ گئی تو کیا کہیں گے

سسرال والے کیسے کٹے کی وہاں۔ آخر تمہیں ہی نام رکھیں گے کہ کچھ سکھلایا نہیں۔ چپ سے"

منظاق کی باتیں سنکر امی جل ہی تو گئیں۔ چیں بجبیں ہو کر بولیں "آخر میں کیا کروں۔ منظاق

بی تمہیں انصاف کرو۔ کتنا کتنا تو کہتی ہوں ان سے کہ کبھی سوئی تاگا لیکر بیٹھا کرو مگر سنتا

کون ہے۔ دم نکلتا ہے ان کا تو سینے کے نام سے، دیدہ ہی نہیں لگتا۔ تو کیا کسی کام میں

آخر میں کیا کروں۔" منظاق تو یہ کہکر چلتی بنی اور ادھر میری آفت آگئی۔ امی چیل کی

طرح جھپٹ کر چولہے کے پاس آئیں اور میرے ہاتھ سے آٹے کا پیڑا چھین کر بولیں "چلو ہٹو

یہاں سے جاؤ سینا پرونا سیکھو، چھوڑ دو اس کام کو، ورنہ محلہ والے مفت میں بدنام

کریں گے کہ لڑکی کو کچھ نہیں سکھاتیں۔" اب میں ہوں کہ لاکھ منتیں کر رہی ہوں۔ ہاتھ جوڑ رہی

ہوں کہ یہ روٹی تو ختم کر دوں مگر امی ہیں کہ روئے جا رہی ہیں اور بار بار چیخ رہی ہیں کہ

باورچی خانے سے چلی جاؤں۔ کیا کرتی مجبوراً چار سی بنکر میں باورچی خانہ سے چلی گئی۔ اتنے

میں ابا آگئے۔ امی ہیں کہ بال پریشان، آنکھیں سرخ، روئے جا رہی ہیں اور چولہا خواہ مخواہ

پھو پھو کر رہی ہیں۔ کبھی کبھی ناک بھی سڑ سڑ کر لیتی ہیں۔ ابا نے جو یہ رنگ دیکھا تو بس

گھبرا گئے۔ اب سوالات پر سوالات کر رہے ہیں۔ "آخر ہوا کیا؟ یہ آپ رو کیوں رہی ہیں۔ اور

آخر آج یہ کھانا آپ کیوں پکا رہی ہیں اکیلی۔ بڑی بچی کہاں گئی؟" امی ہیں کہ گم صم جلدی

جلدی کام کئے جا رہی ہیں۔ بڑا آٹا وہ ہے لگی ہوئی ہیں۔ ابا نے بالآخر روٹی وغیرہ ٹھیک سے

اصرار کیا اور امی کے پاس جاکر دلجوئی کرتے ہوئے کہا "کیا بات

[illegible] امی ۔ اب [illegible]

[illegible] ہم [illegible]

ہے کہ مجھے کھلانے جا رہا ہے کہ میں ان سے کہ کام [illegible]

کیا ہوگا۔ [illegible] ہے آخر میں غیر ہوں۔ [illegible]

[illegible] ۔ اور یہ خود آپ کی لاڈلی بیٹی بھی تو مجھے اپنا [illegible] ہیں: [illegible]

بات سنتا تھا کہ ابا صاحب کچھ نشانی فرماتے ہوئے بولے: "تو کیا ہم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے

اس منحوس لڑکی کا۔ بھیج دیجئے اسے اس کی نانا کے پاس۔ اب وہی دیکھیں اسے۔ آخر ان کا بھی تو

کچھ حق ہے۔ یہ مفت کی بلا کب تک ہمارے سر رہے گی۔ میں خود عاجز آگیا ہوں اس لڑکی

سے۔ بیاہنے کو کون کم بچے ہیں جو ایک یہ بھی نازل ہو گئی۔" ابا نے جو امی کی باتیں سنتا ہیں

تو امی کو تھوڑی سکون نصیب ہوا۔ آنسو خشک کرتے ہوئے بولیں "خیر آپ بھی جانے دیجئے اس

قصہ کو کھانا کھائیے۔ وہ اب جائیگی کہاں۔ میں تو ابھی سے کبھی ان کی بات بھی کہتی نہیں

ہوں آپ سے، ہمیشہ پی کر رہ جاتی ہوں کہ خواہ مخواہ بات بڑھیگی۔ ہوگا، جانے دیجئے۔"

اب امی بشاش ہو گئیں اور ابا کیلئے کھانا نکالا جانے لگا۔

امی کا یہ دستور تھا کہ صبح سے شام تک سارا کام مجھ سے لیتیں، یہاں تک

کہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی اور عین اس وقت جبکہ ابا کے آنے کا وقت ہوتا لپک

کر باورچی خانے میں پہنچ جاتیں۔ یہ ہانڈی کھول، اس کو دیکھ، گوشت کی گرم بوٹی کو پانی

میں ڈبو کر انگلیوں سے اس کی گلاوٹ کا اندازہ لگایا گیا اور ——— اتنے میں ابا آگئے ——

"بیگم کہاں ہیں آپ؟" انہوں نے آواز دی "ابھی آئی۔" امی نے گویا گرمی اور دھوئیں سے

پریشان ہوتے ہوئے الجھ کر جواب دیا۔ ابا باورچی خانے میں پہنچ گئے۔ امی نے انکی آمد

کو اپنی مصروفیت میں چھپا کر پھکنی اٹھائی اور خواہ مخواہ پھو پھو کرنے لگیں اور اس طرح

کر اچھی بھلی جلتی ہوئی آگ کو بجھا دیا تا کہ دھواں ہونے لگے۔ زبردستی کے آنسو آنکھوں میں

لائے گئے۔ آنکھیں مل کر لال بنالی گئیں۔ اور منہ سرخ کر لیا گیا۔ ابا کو دیکھکر بولیں: "اس

چولہا چکی نے تو عاجز کر رکھا ہے۔ لو بھی اب سب کام تو میں نے کر ہی لیا ہے تم ذرا جلدی

سے یہ تھوڑی سی روٹیاں ڈال لو۔ تمہارے ابا دفتر سے بھوکے آئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے

امی دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھکر سارے بدن کا زور ٹانگوں پر دیتے ہوئے اس انداز سے

اٹھیں گویا بہت دیر سے اس طرح بیٹھے بیٹھے ٹانگیں بھر گئی ہیں۔ اب میرا اصل رنج و

غصہ کے برا حال کہ ابا کے سامنے انہوں نے مفت میں بدنام کیا۔ گویا میں کچھ کام نہیں کرتی

اور یہ بیچاری گھنٹوں چولہے میں گھسی رہتی ہیں۔ اور پھر یہ صرف ایک دن کا تماشا نہ تھا۔ بلکہ

ابا کے سامنے امی روزانہ صرف اسی تماشے کو اسی اپنے مخصوص ایکٹنگ کے ساتھ

دہرانے کی عادی ہو چکی تھیں۔

ایک شام جبکہ امی محلہ میں عورتوں سے ملنے جلنے گئی تھیں میں گھر کا سارا کام ختم

[illegible]

[illegible] سے [illegible] ہے۔ غرض دل اور تھکے ہوئے پانی [illegible] ہونے سے کے گھر آیا ہے۔ وہاں تو کاری تقریباً ایک گھی ہے ہوئیں آبا گو زمور رہی تھیں سوچ رہی تھیں کہ آخر آج کس بات پر بگڑوں۔ ادھر باورچی خانے میں آئیں۔ ہانڈیاں دیکھنے کے بعد حیرت کا اظہار فرماتے ہوئے بولیں: لے! وہ گوشت کدھر گیا؟ کیا پکا؟؟

"کیا گوشت امّی؟" میں نے تقریباً ایڈیٹ ہو جانے والے انداز سے پوچھا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا۔ لایا نہیں تھا کیا حنیف گوشت۔ اب کیا کھلاؤ گی اپنے آبا کو اپنا کلیجہ"

میرا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا اور میری آنکھوں کے سامنے گوشت کی بوٹیاں مختلف زاویوں سے ناچنے لگیں۔ امّی نے چیخ کر آواز دی۔ "حنیف! او حنیف کے بچے! کدھر گیا آخر۔ گوشت لایا تھا یا نہیں؟"

"لایا تو تھا بیگم صاحبہ۔" حنیف بھاگتا بھاگتا آیا۔ جو باہر صحن میں بیٹھا تھی رضیہ کو کھلا رہا تھا۔ "میں نے گوشت یہیں باورچی خانے میں رکھ دیا تھا۔ بڑی بی بی کو معلوم ہے نا —— یہ آخری جملہ اُس نے اپنی بچت کیلئے کہا تھا۔ حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ گوشت کون اور کب لایا۔

"سُن لیا تم نے؟ کام میں رہو گے تو ہوش بھی ہو۔ اب کیا کھائیں گے تمہارے ابا، تمہارا سر۔ بھئی میں تو عاجز آگئی ہوں اس لڑکی سے۔ دھیان تو لگا رہتا ہے ہر وقت کہ کب شادی ہو اور کب اُڑیں یہاں سے۔ گوشت بلی نہ کھا جائے تو کیا ہو۔ بیقرار ہے بیچاری اپنی شادی کیلئے۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ تم جانو اور تمہارا کام۔ آتے ہوں گے دفتر سے تمہارے ابا۔ انہیں کو جواب دے دینا۔"

اب میں جل کر کباب ہو گئی تو بدن میں لہو نہیں بس سن ہو گئی۔ دماغ چکرا گیا۔ میں نے خوشامد سے امّی سے کہا۔ "اچھی امّی آپ ابا سے نہ کہئے گا کہ گوشت آیا تھا اور بلی کھا گئی۔ ورنہ وہ خفا ہوں گے۔"

"جی۔ بہت خوب۔" وہ غرائیں۔ "یہ لیپا پوتی مجھ سے نہیں ہونے کی۔"

ابا آ گئے۔ اور امّی نے چپکے چپکے ان سے سب کچھ کہہ دیا اور سکھا دیا کہ آج کھانے پر گوشت ضرور مانگئے گا۔ میں بڑی سٹ پٹائی کہ آخر کروں تو کیا کروں۔ میرے پاس دو آنے پیسے تھے، میں نے پڑوس کے ایک نوکر لڑکے سے خوشامد کی اور اس نے وہ آنے کے بازار سے سیخ کے کباب لا کر مجھے دے دیئے۔ میں نے یہ کام چھپ کے اس لئے کیا کہ وہ نہ کرتا اور مفت میں مجھے ذلیل ہونا پڑتا۔ وجہ یہ تھی کہ جب امّی مجھ سے خفا ہوتیں تو نوکر یہاں تک کہ نوکر بھی مجھ سے بات چیت کرنا چھوڑ دیتے۔ گویا مجھ سے خفا ہیں۔ جب کھانا ابا کے سامنے گیا تو امّی ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ کباب دیکھ کر وہ متعجب ہوئیں اور ابا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس لئے کہ انہیں سیخ کے کباب بہت پسند تھے۔ مگر اس وقت انہوں نے بھی کمال ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے کفران پسندی فرمائی۔

"ہیں! یہ کباب کیسے؟ گوشت نہیں پکا کیا؟ میں کباب نہیں کھاؤں گا۔ بازار کے کباب اچھے نہیں ہوتے۔" —— چونکہ ابا کا روئے سخن امی کی طرف تھا لہٰذا وہ بولیں —— "انہیں سے پوچھئے اپنی صاحبزادی سے۔"

ایسا معلوم ہوا گویا مجھ پر پہاڑ گر پڑا ہو۔ پاؤں تلے کی زمین مجھے سرکتی ہوئی معلوم ہوئی اور میں نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "امّی آپ کو تو معلوم ہے"

"کیا معلوم ہے؟" ابا گرج کر بولے

"یہی کہ گوشت آپکے بجائے بلی کو کھلا دیا ہے آپ کی لاڈلی نے۔" امّی نے مجھے تقریباً کھا جانے والی نظروں سے گھور کر کہا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا اس وقت۔" ابا بولے اور انہوں نے مجھے لاکھوں باتیں سُنا کر رکھ دیں۔ "کم بخت کہیں کی، ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ کہاں کا یہ عذاب لگ گیا ہے میرے سر۔ بس اب یہ کوفت نہیں برداشت ہو سکتی۔ بھیج دیجئے اسے اسکی خالہ کے پاس۔ آپ ہی تو دنیا بھر کے عذاب سمیٹا کرتی پھرتی ہیں اپنے سر پر۔ آج کل فکر تو رہتی ہے ہر وقت لاڈلی کو اپنی شادی کی کہ کب ہو اور کب نجات ملے یہاں سے۔ یہ گھر تو اب کاٹتا ہے انہیں۔ آج خدا کرکے چلے کے پاس گئیں تو یہ گل کھلائے۔" امّی نے گویا ابا کے غصّہ کی آگ پر پیٹرول چھڑک دیا —— "اچھا! اتنی بے حیائی۔ اتنی بے شرمی۔ آپ کو شادی کی لگی ہے۔ شرم نہیں آتی اسے ایسی بات سوچتے ہوئے۔ اب تو میں اس کی شادی عمر بھر نہ کروں گا۔ جہاں دل چاہے خود کرے۔ مرنیوالوں نے کس قدر کم ظرف لڑکی جنی ہے۔ لاحول ولا —— میں دوسرے کمرہ میں چلی گئی اور اتنا روئی کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ مجھے امّی کی کوئی بات اتنی بُری نہیں لگتی تھی جتنی کہ ان کی الزام تراشی، یعنی یہی شادی کے متعلق لغو، بے سروپا اور بے حیا باتیں۔ میں روئی اور خوب روئی مگر کون تھا جو مجھے چپ کراتا۔ روتے روتے مجھے بخار آ گیا اور میں دم بے دم ہو کر سو گئی۔

اظہر امّی کا چہیتا لڑکا تھا۔ بیحد شریر اور میرا جانی دشمن، اگرچہ کہ مجھ سے عمر میں دو یا تین سال چھوٹا تھا۔ مگر جب دیکھو میرے درپے آزار۔ کبھی میرے سر کے بال کھینچ رہا ہے تو کبھی بیٹھا خواہ مخواہ کوئی بات منہ چڑا رہا ہے۔ ہر وقت نوک

[illegible] سی بات پہ کر [illegible]
[illegible] آیا۔ [illegible]
ہی۔ آخر کیوں [illegible] اس کم بخت کے۔" [illegible] نے [illegible]
جسے تاکید آ یہ فقرہ کہا کہ "دیکھیے آبا سے نہ کہنا"
آج ذرا معصوم کیوں [illegible] دفتر سے واپس آ کر تنگ آ کئے ہی آنہوں نے
[illegible] اور جو میں پانی لے کر گئی تو انہوں نے پوچھا" ہیں! یہ تمہارے
ہوا؟"
"کچھ نہیں"
"کیا مطلب؟" آبا نے استفسار کیا۔
"ہوتا کیا آخر گھر سے لڑ رہی تھی وہ چھلا تو ہے ہی نوچ لیا اُس نے"
"ہوں"۔ آبا بولے "تو پھر اُسے پاگل خانہ بھیج دو نہ۔ لیں ذرا سا نوچنے
[illegible] زخم۔" اباّ نے میرے ہاتھ کی پٹی کھول کر زخم دیکھ لیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے
[illegible] ہمدردی نے میرے زخموں پر نمک کا کام کیا۔
"وہ کدھر گیا نا معقول؟" آبا نے چیخ کر کہا۔ اور جب اظہر انکے سامنے آیا تو
اُسے واقعی پیٹا اور خوب پیٹا۔ اور اس سے یہ بھی کہا کہ وہ بڑی بہن سے معافی
اس گستاخی کی۔
ابا کی یہ ہمدردی میرے لئے زہر قاتل ثابت ہوئی۔ امی نے اور انکے ساتھ ہی سا
[illegible] مجھ سے نان کو اپریشن شروع کر دیا۔ اب میں جس کام کو ہاتھ لگاتی ہوں امی
[illegible] کر دیتی ہیں۔ جدھر جاتی ہوں میرا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ غرضکہ اسی طرح تقریباً
[illegible] مجھے نکو بنائے رکھا گیا۔ رات کا کھانا بھی امی نے سینی میں سجا کر خنیت کو یہ
[illegible] دیا کہ باپ کی لاڈلی کی خدمت میں یہ ماحضر لے جاؤ۔ شاید ہم پر رحم و کرم
[illegible] ہوئے تناول فرمالیں۔
میں باورچی خانے سے معاملہ پیس کر اٹھی تو اتفاقیہ میری ٹھوکر سے
[illegible] کا وہ برتن ٹوٹ گیا جس میں امی نمک رکھا کرتی تھیں بس آفت آگئی۔ جتنا
[illegible] کہا جا سکتا تھا۔ امی نے کہا اور اپنی عادت کے مطابق شادی کے بھی
[illegible] دیئے۔ میں نے دبی زبان سے کہا "امی خدا کیلئے میرے متعلق ہر وقت ایسی ذلیل
[illegible] نہ کیا کیجئے۔ مجھے بے حد شرم آتی ہے" ___ میرا اتنا بولنا تھا کہ وہ بکھا سی
[illegible] بیٹھیں۔ مجھے خوب بُرا بھلا کہا۔ جتنا خفا ہو سکتی تھیں ہوئیں۔ اور رات کو
[illegible] آنے پر اُن سے شکایت کرنے کا بھی تہیہ کر لیا۔
[illegible] اور اس خیال سے کہ جب آئیں تو امی کہیں [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] کر دیا ہے آج تو میری ناک ہی کٹ گئی۔"
"کیا ہوا؟" آبا نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر ہوا کیا؟"
امی بولیں "آج انہوں نے شیشے کا برتن توڑ دیا۔ اور میرے ذرا
سے ڈانٹنے پر مجھے ترا تڑ وہ جواب دیئے کہ خدا کی پناہ۔ سارا محلہ سر پر اٹھا لیا۔
آخر محلے والی دوڑی ہوئی آئیں اور جب ان سے پسین دیکھکر نہ رہا گیا تو انہوں
نے حیرت سے کہا کہ "بی بی خدا کی پناہ کیا اٹھان اٹھائی ہے تم نے لڑکی کی۔
اس قدر دیدہ کہ تڑ تڑ جواب دے رہی ہے۔ آخر اس کو غیر کے گھر جانا ہے۔
اگر وہاں بھی اس نے یہی کیا تو۔ پتہ مارنا تو جانتی ہی نہیں ہے یہ۔ غضب
خدا کا ہوگا کیا۔ میں کیا جواب دیتی جھینپکر چپ ہو رہی۔"
"اچھا ___ تو اب یہ یہاں تک بڑھ گئی ہے۔ گستاخ کہیں کی"
آبا بولے۔ "گئی کہاں؟"
"سو رہی ہیں۔ جانے دیجئے۔" امی بولیں "مفت میں کیا فائدہ
دنیا مجھے ہی بُرا بھلا کہے گی کہ آخر سوتیلی ہے نہ۔ ماں ہوتی تو یہ باتیں نہ ہوتیں
سچ ہے غیر پھر غیر ہے۔ اور اپنا پھر اپنا۔"
یہ کہکر امی رونے لگیں۔ اور آبا نے مجھے اٹھوا کر خوب خوب
ڈانٹ پلائی۔ اور جتنا بھی ذلیل کیا جا سکتا تھا کیا۔ اور بعد میں یہ بھی فرمانے
لگے کہ "ازراہ کرم آپ صبح ہی اپنی خالہ کے ہاں جانے کا بندوبست کیجئے۔
میں اب بہت دنوں تک اپنی بیوی بچوں پر آپ کو سولی بن کر نہ رہنے دوں گا"
ابا تو یہ کہکر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اور میں آسی جگہ دالان میں
ہوا کے سرد جھونکوں کے درمیان بہت دیر تک کھڑی تھر تھراتی رہی۔
میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ کیا دنیا کا خون اتنا سفید ہو گیا ہے
اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

محبت اور نفرت

(از جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی)

کیا آپ نے کبھی موسم بہار میں طلوع آفتاب سے قبل کسی گوشۂ چمن میں پھول کو اس کی بیدار شگفتگی کے ساتھ دیکھا ہے؟ —— بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ ایک ایسے ہی پھول کی مانند شگفتہ اور حسین و جمیل تھی۔ جس کا نام زہرہ تھا ——

اگر اس کے خد و خال کی رعنائی۔ اعضاء کی موزونیت اور گفتگو کی لطافت پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے۔ تو مجبوراً وہی استعارے اور تشبیہیں استعمال کرنی پڑیں گی جو عدم پامال ہو جانے کے باعث اب اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتیں —— کوئی جاذبیت نہیں —— حالانکہ وہ بذاتِ خود سراپا جاذبِ نظر تھی۔ اور ناممکن تھا کہ اس پر ایک بار نگاہ پڑ جانے کے بعد دیکھنے والا پلٹ کر دوبارہ نہ دیکھتا۔ غالباً یہی اس کی سب سے بڑی جیت تھی۔

جب وہ کسی محفل میں شریک ہوتی تو ہر شریکِ محفل اس کو اور صرف اپنی ذات کو موجود سمجھتا اور محسوس کرتا کہ باقی سب لوگ حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دئے گئے ہیں۔ جب وہ کسی فردِ واحد سے گفتگو کرتی، تو مخاطب کو یقین ہونے لگتا کہ اس کی ہستی سطحِ زمین سے بلند ہو کر عرشِ اعلیٰ تک پہنچ گئی ہے۔ اور اس مقامِ مقدس کی ساری مخلوقات میں سے کوئی حور اس کے ساتھ مصروفِ تکلم ہے۔

کچھ ایسی ہی حالت میں نسیم نے پہلی بار اس کو دیکھا جبکہ وہ اپنی تازہ و رنگین شعر پڑھنے کے لئے مصطبہ پر جلوہ گر ہوئی۔ پہلے ہی شعر پر مسلسل تالیوں اور داد و تحسین کے نعروں سے تمام ایوان گونج اٹھا اور برابر گونجتا رہا۔

اب اسے حقیر ارتزالی کہئے یا حقیقتاً اپنی شکست کا خاموش اعتراف کہ نسیم اپنی غزل سامعین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت پیدا نہ ہو سکی۔ حالانکہ اس سے پہلے ہمیشہ اس کا کلام مرکزِ مشاعرہ رہا کرتا تھا۔ اور وہ اپنی اس کامیابی پر فخر و ناز کرتا تھا۔ چنانچہ صاحبِ صدر کے ایماء پر جب اس سے کہا گیا کہ اپنے کلام سے حاضرین کو ساماعت نوازی کرے تو اس نے ایک مجہول سا عذر پیش کرتے ہوئے دوسروں کے کلام سے اجتناب مناسب سمجھا۔

[illegible]

پیچھے والا تھا، صفحۂ اول پر لکھے ہوئے انتساب کے الفاظ بدل ڈالے۔ پہلے ایک رفیقِ دیرینہ کے نام کی جگہ یہ عبارت لکھ دی:-

"میں منسوب کرتا ہوں اپنی ناکام کوششوں کے اس حقیر مجموعے کو تمہارے اس اسمِ گرامی سے جس کو وضاحت کے ساتھ سپردِ قلم کر دینا میں مسلکِ محبت کا سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ تم اسے قبول کر لو۔ اور آسمان کی بلندیوں پر چمکنے کی بجائے خود میرے دل کی گہرائیوں میں ایک شعاعِ رقیق بن کر سما جاؤ"

ہر چند یہ عبارت کافی مبہم ہے۔ لیکن الفاظ کا پردہ اتنا دبیز نہیں۔ کہ وہ اصل نوشتہ کی پردہ پوشی پورے طور پر کر سکتا۔ چنانچہ زہرہ کی نظر سے جب یہ رسالہ آیا پہلی ہی بار پڑھ کر بالکل صحیح اندازہ لگا لیا۔ کہ آسمان پر چمکنے کا اشارہ دراصل میری طرف ہے۔ اور اس طرح کتاب میرے نام سے منسوب کی گئی ہے۔

دراصل رمز و کنایہ کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ ہستی معنی و مطلب کو فوراً سمجھ لے۔ جسے سمجھانا مقصود ہو۔ اور دوسرے کو پتہ لگنے نہ پائے۔

نسیم اُن شاعروں میں سے تھا جن کو شیلے اور بائرن کی طرح مردوں سے زیادہ نسوانی دنیا میں درجۂ قبول حاصل ہوتا ہے۔ جن کو عورتیں اپنا معبودِ خیال سمجھتے ہوئے آرزوئے سپردگی کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن اب یہ سپردگی خود نسیم کی طرف سے عمل میں آ رہی تھی۔ جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خود دیوتا نے اپنی پجارن کی شانِ الوہیت سے متاثر ہو کر اس کے قدم چھونے شروع کر دیئے تھے۔

نسیم صرف بے مثل شاعر ہی نہیں بلکہ ایک شہرۂ آفاق بیرسٹر بھی تھا۔ نیز اس میں کچھ وہ خوبیاں بھی موجود تھیں جو ایک عورت کا دل موہ لینے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زہرہ بھی اس کی طرف کھچنے لگی۔ اور اُس نے اپنی اگلی نظم کا "تہدیہ" ان الفاظ میں چھپوایا:-

"میں اپنی اس حقیر کاوش کو منسوب کرتی ہوں تمہارے نام سے جس کی ایمائی کیفیتیں ترکیب پاتی ہیں غنچے کے تبسمِ رقیق اور شبنم کی خنک لطافت کے امتزاجِ باہمی سے —— کاش! اس سے پہلے کہ صبح کی تمنا زا کیفیات کے زیرِ اثر تم پھولوں کے آغوش میں بے ایما ہو کر چمنستانِ شباب و شعر میں اٹکھیلیاں کرنے نکلو، میرا یہ پیام بدوشِ صبا کے دوش پہ تمہارے کانوں تک پہنچ جائے۔ اور تم میرے ہدیہ کو قبول کر لو"

[illegible] کی طرح نسیم بھی [illegible] کیا کہ [illegible] کی گئی ہے۔ [illegible] کتاب کی عبارت نقل کر رہے ہیں کہ [illegible] نسیم کے [illegible] ترتیب دیا گیا ہے۔

گویا دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی اور زیادہ تعجب اس بات کا تھا کہ آگ لگانے والے ہی اسے بجھانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

رمز و کنایہ کے ساتھ یہ طریقہ اظہار زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اور بہت جلد عام لفظوں میں اصل مدعا زبان پر آگیا۔ دلی میل و محبت اور معنوی روح و تسلیم کے بعد ایجاب و قبول کی حدیں ختم ہو گئیں۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے شریک حیات بن گئے۔ شادی کے سہرے بھی دونوں نے گا گا کر سنائے۔ اور ان کا مترنم کیفیت کو رفقائے حلقہ نے ایک نمونہ منتقل کے طور پر پیش کیا۔ دوستوں نے مبارکباد پیش کی۔ اور ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

جس طرح دو بادلوں کے ٹکرانے سے فضا میں کڑک اور چمک پیدا ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح ان دونوں لطیف طبیعتوں کے اتصال سے شعر و سخن کی دنیا میں نت نئے گل کھلنے لگے۔ اور ان کی شہرت کا آفتاب بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ ہر محفل ادب میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جانے لگی۔ جب کسی مشاعرے میں وہ اور خصوصاً زہرہ شریک نہ ہوتی تو اس مشاعرہ کا لطف بے مزا ہو جاتا۔

کبھی کبھی ادبی نشستیں خود ان کے مکان پر منعقد ہوا کرتیں۔ اور چونکہ نسیم زیادہ تر اپنی عدالتی ذمہ داریوں میں مصروف رہتا تھا، اس لئے اکثر زہرہ ہی تن تنہا ارباب ذوق کی خاطر مدارت کر کے میزبانی کا فرض ادا کرتی۔ لوگ اس سے ملنے آتے، تبادلۂ خیالات کرتے اور اس قدر تعریف کر جاتے کہ بسا اوقات خود اس کو شرم سی محسوس ہونے لگتی۔ یہ نشستیں عموماً ایسے اوقات میں ہوتیں جبکہ نسیم گھر پر موجود نہ ہوتا۔

ادبی رسائل کے مدیر ان کی تصاویر برائے اشاعت طلب کرتے۔ کبھی ان کی تصویر اکٹھی چھپتی اور کبھی الگ الگ۔ علیحدہ شائع ہونے کی صورت میں زہرہ کی تصویر کو ہمیشہ زیادہ اہمیت دی جاتی۔ بالکل اسی طرح اس کی نظمیں بھی رسائل کے ابتدائی صفحات میں ادارتی تقریظوں کے ساتھ شائع ہوتیں۔ یہ فرق و امتیاز ہر کس و ناکس کے دماغ میں تشکیک و ارتیاب کا مادہ پیدا کر سکتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک قانون داں کا دماغ، جو یوں بھی نکتہ رس اور باریک بینی کے اعتبار سے کافی بلیغ النظر سمجھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسیم کے دل میں محبت کے ساتھ ساتھ کچھ حسد کی آگ بھی بھڑک اٹھی۔

[illegible] سے [illegible] کی [illegible] بے کہنے ہی لگا [illegible] کچھ زیادہ اکھڑا اکھڑا نہیں [illegible] کی ایک [illegible] خدا کی دین سمجھ کر دل کو تسلی دے لی جاتی ہے۔ [illegible] شاعرانہ اور فنکارانہ [illegible] گو زہرہ کے [illegible] نسیم کو اس احساس سے خوشی ہوتی تھی۔ کہ بہت جلد ایک [illegible] بھی [illegible] سکے گا۔ وہ شاعرہ —— ایک آزاد خیال شاعرہ تھی۔ لیکن [illegible] تھی یعنی اس اعتبار سے مشرقی مسلک خیال کی حامی تھی کہ شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنی مسرتوں کو قربان کر دے۔

اس نے یہ محسوس کر کے کہ نسیم کو اس بات سے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس کی شریک حیات امور خانہ داری کی طرف بذات خود متوجہ رہے۔ گھر کی تمام خادماؤں کو ایک ایک کر کے الگ کر دیا۔ اس نے نہ روٹی پکانے والی ماما کو رہنے دیا اور نہ دودھ پلانے والی اناّ کو۔ حتیٰ کہ اگر بازار سے سودا سلف لانا اس کے لئے معیوب نہ سمجھا جاتا تو وہ ڈیوڑھی کے ملازم کو بھی برطرف کر دیتی۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ بلکہ یہ سب کچھ مصلحتاً کیا گیا تھا یعنی حصول مسرت کے خیال سے۔

ظاہر ہے کہ اس غیر شاعرانہ ماحول میں پھنس کر زہرہ کی شاعرانہ شخصیت خاک میں ملتی چلی گئی۔ اسے نہ تو اتنی فرصت ملتی کہ وہ ادبی جلسوں میں شرکت کرے اور نہ یہ موقع نصیب ہوتا کہ اپنے خیالات کو موزوں کر کے کسی صحیفہ میں چھپوا سکے۔ اس کے لئے تو گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا بھی غیر ممکن ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شہرت کا چراغ مدھم پڑتے پڑتے محض ٹمٹمانے لگا۔ اور اس کا ذکر غیر مطبوعہ ہونے کی بجائے صرف تنقیدی کتابوں تک محدود ہو گیا۔ زہرہ کبھی کبھی تنہائی کے موقعوں پر اس تغیر پہ غور کرتی۔ مگر زیادہ دیر نہیں۔ کیونکہ بہت جلد یہ احساس اس کو مطمئن کر دیتا کہ ان کی ازدواجی زندگی لائق رشک حد تک خوشگوار اور پرسکون گذر رہی ہے۔ اور اگر اس کو نہیں تو کم سے کم اس کے شوہر کو تو اب بھی عوام میں وہی درجۂ قبول حاصل ہے۔ اسی طرح اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ لوگ اس کا کلام سننے کے لئے بیتاب نظر آتے ہیں۔ اور اس کی نظموں کے مجموعے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے ہیں۔

وہ خود ہی یہ فرض کر کے اپنے دل کو ڈھارس دے لیتی کہ میں اس شہرت نیک نامی میں برابر کی شریک ہوں۔ بظاہر نہیں۔ در پردہ ہی سہی۔

…کے یہ سال زندگی کے ادبی ہنگاموں میں گذرے اور گزرتے چلے گئے۔
…مضت میں کُلا تبدیلی اس کے علاوہ نہ ہوئی کہ زہرہ چھ بچوں کی ماں بن چکی
…نے سال کے لئے بالکل تیار تھی۔

عید کا روز سعید تھا۔ تمام فضا تہنیت و مبارکباد کے دلپذیر نغموں سے گونج رہی تھی۔ نسیم کے گھر میں بھی مسرت و شادمانی کی ہوا چل رہی تھی۔ بچے اپنے کھلونوں سے کھیلنے میں مشغول تھے۔ اور دونوں میاں بیوی ایک ایسی خود فراموش محبت کے عالم میں، جس کا طاری ہونا صرف موسم بہار کی شبابی راتوں میں دیکھے ہوئے خواب کے بعد ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے۔ ہرچند اعضار کی موزونیت بڑی حد تک ابھی برقرار تھی۔ مگر جوشِ نشاط اور لذتِ التئام کے بعد زہرہ کے لب و رخسار سے مصنوعی سرخیوں کو کم کر کے چہرے کی مضمحل اور پژمردہ جلد کو عریاں کر رہے تھے۔ اسے اپنی اس کمزوری اور نقص کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میرا حسن بالکل پامال ہوچکا۔ اس لئے نسیم کی طرف سے اظہارِ محبت حقیقت سے کوسوں دور محض مصنوعی اور بناوٹی ہے۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اور آخر وہ دل کی بات زبان پہ لے آئی۔

"بھلا اب مجھ میں رکھا کیا ہے۔ جو تم اس قدر گرویدگی کا اظہار کر رہے ہو نہ میرے خط و خال میں رعنائی ہے۔ اور نہ ———"

"تم تو پگلی ہو" نسیم نے بات کاٹ کر کہا: "کیا تم میرے معیارِ حسن کو اس قدر سطحی سمجھتی ہو کہ وہ صرف خد و خال کی رعنائیوں تک محدود رہے گا۔ کاش تم کہہ سکتیں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔ اور محبت بھی اس قدر حریص قسم کی کہ اسے برقرار رکھنے کے لئے میں نے تم کو نقصان تک پہنچا دیا۔ شاید تم یہ سن کر مجھے بدترِ عادت بتاؤگی۔ کہ تمہاری ظاہری رعنائیوں کو جان بوجھ کر پامال کرنے والا خود میں ہوں۔ میں نے ارادتاً تم کو خانگی بکھیڑوں میں پھنسا کر تمہاری صحت و زندگی کو تباہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ضبطِ تولید کا تو ذکر ہی کیا۔ میری آرزو رہنے لگی کہ تم سال بھر میں ایک نہیں تو کم سے کم تین سال میں دو بچوں کی ماں ضرور بن جایا کرو۔ میں جانتا تھا کہ پیدائش و تربیتِ اطفال سے عورت کی جوانی اور اس کا حسن و جمال بہت جلد خزاں رسیدہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب لوگ تم سے ملنے آتے، تمہارا کلام سن سن کر تمہاری تعریف کرتے، تم خوشی سے پھولی نہ سماتیں۔ اور جب تم مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی نظمیں سناتیں، ایک دلفریب ترنم کے ساتھ، اور تمام ایوان داد و تحسین کے بلند نعروں سے گونج اٹھتا۔ لوگ للچائی ہوئی نظروں سے تمہاری طرف دیکھتے تو میرا خون کھولنے لگتا۔ میرا جی چاہتا کہ ان سب کا منہ نوچ لوں۔ ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ اور کان بہرے کر دوں تاکہ وہ تمہیں دیکھ نہ سکیں۔ تمہاری آواز سن نہ سکیں۔ اور تم تنہا صرف میرے لئے ہو جاؤ۔ تم یہاں بھی میں تسلیم کرتا ہوں، یقیناً بلا شرکتِ غیرے صرف میری تھیں۔ مگر میرا حریص دل اتنا بھی گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی اور تمہاری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔

میری یہ آرزو صرف اس طرح پوری ہوسکتی تھی کہ میں ایک طرف تم کو بچوں کے جھمیلے میں پھنسا دوں اور دوسری طرف گھر کے کام کاج میں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تم کو ادبی ہنگاموں کے لئے کبھی فرصت نہ ملی اور تمہارا ذوقِ شاعری ظاہری حسن اور جوانی کے ساتھ ساتھ فنا ہوتا چلا گیا جو میرا دلی مقصد تھا۔

تم اسے میری خود غرضی پر محمول کرتے ہوئے مجھے ملعون کرسکتی ہو۔ یقیناً میں لائقِ نفرین ہوں۔ لیکن کیا کروں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ اگر تم چاہو تو میرے اس قصور کو معاف کرسکتی ہو۔"

زہرہ بہت غور سے یہ سب کچھ سنتی رہی سنتی رہی اور غور کرتی رہی اس حقیقت کا کچھ کچھ احساس تو اسے خود بھی ہوگیا تھا۔ مگر نسیم کی زبان سے بالکل کھلے الفاظ میں سن کر وہ بھونچکا سی ہو کر رہ گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ تمام دنیا میں زلزلہ سا آرہا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے دھچکوں سے تھرا رہی ہے۔ اور سب سے زیادہ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ یقیناً اس کی ضرباتِ قلب اس قدر تیز ہوگئی تھیں کہ نبض شناسی کا کوئی آلہ اس سرعتِ رفتار کے اعداد و شمار کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔ کچھ دیر اپنے برانگیختہ جذبات پر قابو پاکر اس نے ایک تلخ تبسم کے ساتھ کہا:-

"ہاں — تمہارا یہ قصور معاف کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ تم بھی میرا ایک قصور کسی شرط کے بغیر معاف کر دو۔"

نسیم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کیا تمہارا کوئی قصور اتنا سنگین بھی ہوسکتا ہے جسے معاف کرانے کی ضرورت تمہیں محسوس ہو۔ جاؤ۔ میں اس کی تفصیل سنے بغیر معاف کرتا ہوں۔"

"نہیں — تفصیل بتا دینی ضروری ہے۔" زہرہ نے کسی قدر دلسوز لہجے میں کہا۔ "سنو۔ میں نے گذشتہ نو سال کی مدت میں ایک بار تم سے بیوفائی کی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان چھ بچوں میں سے جو اس وقت صحن میں تمہاری نگاہوں کے سامنے کھیل رہے ہیں، صرف ایک بچہ تمہارا نہیں ہے۔ یہ سب کے سب تم کو باپ کہکر پکارتے ہیں۔ لیکن صرف ایک کے الفاظ صداقت سے بُعد ہوتے ہیں۔ اگر تم یہ پوچھنا چاہو کہ وہ بدنصیب بچہ کون سا ہے۔ تو میں ہرگز نہیں بتاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ خواہ تم کتنا ہی اصرار کرو۔ ہاں۔ اگر تم میں سوجھ بوجھ کا مادہ ہے تو خود معلوم کرلو۔ شاید تمہیں کامیابی نصیب

عید کا روزِ سعید تھا۔ تمام فضا تہنیت و شادمانی کے [illegible] نغموں سے گونج رہی تھی۔ لیکن تسنیم کے گھر میں بسنے والی مسرت و شادمانی کی فضا حزن و ملال کی بادِ سموم میں تبدیل ہو گئی تھی۔

اس حادثے کو پورا ایک سال گذر گیا۔

زمانے کا رنگ تو خیر ہمیشہ ہی بدلتا رہتا ہے۔ لیکن تسنیم کی زندگی خصوصیت کے ساتھ اس مختصری مدت میں انقلابِ عظیم کے تمام مدارج طے کر گئی۔ تسنیم وہ تسنیم نہ رہا جو ایک سال پہلے تھا۔ اس کی شاعری کا تو ذکر ہی کیا۔ وکالت بھی گوشۂ گمنامی میں جا پڑی۔

ایک سال بعد وہی عید کا دن تھا۔ لیکن تہنیت و مبارکباد سے بیگانہ۔ مسرت و شادمانی سے کوسوں دور۔ زہرہ نے تسنیم کے قریب آکر کہا:-

"برس کا برس دن ہے۔ کیا آج بھی نماز پڑھنے نہیں جاؤ گے-؟"

تسنیم نے حرماں نصیب نظر کو اوپر اٹھا کر دیکھا —— اس کی آنکھیں! خدا کی پناہ! معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کے جنگلوں کی ویرانیاں اس میں سما گئی ہیں۔

"میری بات سنو!" زہرہ نے ان ویران آنکھوں کی وسعتوں میں گم ہو کر کہا —— "آج سے پورے ایک سال پہلے جو خبرِ بد میں نے سنائی، وہ سراسر غلط تھی۔ شاید تم یقین نہ کرو۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ اس میں سرِ مو صداقت نہیں تھی۔ یہ ساتوں بچے جو اس وقت چھ تھے، سب کے سب تمہارے ہیں۔ ان کی رگوں میں صرف تمہارا ہی خون ہے۔ اور وہ دنیا میں صرف تم ہی کو باپ کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اس وقت میں ارادتاً جھوٹ بولی تھی۔ کیونکہ مجھے یک لخت تم سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور میں چاہتی تھی کہ اس سے بھی زیادہ شدید ظلم و ستم کے ساتھ تم سے انتقام لوں۔ جو تم نے میرے لئے روا رکھا تھا۔

ظاہر ہے کہ میں اپنے مقصد میں توقعات سے بھی زیادہ کامیاب رہی۔ عورت اپنی محبت کی خاطر دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا سکتی ہے۔ اپنے ماں باپ، بھائی بہن، عزیز و اقارب اور دوست احباب سب کو چھوڑ سکتی ہے۔ ترکِ وطن کر کے بے گھری اور مذہب پر لات مار کر خدا سے منکر ہو سکتی ہے۔ وہ صرف اپنے محبوب کا دامن تھام لیتی ہے۔ کیونکہ اس کی نگاہ میں محبت سے زیادہ اہمیت کسی چیز کو حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی نفرت محبت سے بھی زیادہ عمیق اور شدید ہوتی ہے۔ نفرت کرتے ہوئے وہ محبت کو بھی ٹھکرا دیتی ہے۔ کیونکہ پھر جذبۂ انتقام ہر چیز پر حاوی ہو جاتا ہے۔ میرے [illegible] دل میں [illegible] نے اس کو بالکل چکنا چور کر دیا۔ [illegible] محبت کی دنیا ہی تھی —— تم نے [illegible] ان کا [illegible] دل میں نفرت پیدا کر دی۔

میں نے فوراً اپنے ذہن میں ایک خاکہ تیار کیا۔ بڑی صفائی سے جھوٹ بولی۔ اور تمہارے دل میں ایک خلشِ پیہم پیدا کر دی۔ ایک ایسی خلش جس کو دور کر دینا کسی عنوان ممکن نہیں تھا۔ میں اس ایک سال کی مدت میں تمہارے [illegible] کا مطالعہ کرتی رہی۔ یہ دیکھتی رہی کہ وہ کس تیزی سے ڈھل رہا ہے۔ تم باری باری سب بچوں کو دیکھتے تھے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان میں سے کس کے خدوخال تمہارے نقش و نگار سے مشابہت نہیں رکھتے۔ ان میں سے کس کی رگوں میں دوڑنے والا خون تمہارے خون کا ہم رنگ نہیں ہے۔ کس کے عادات و اطوار تم سے جداگانہ ہیں۔ تم نے ہمیشہ اپنے اور ان کے درمیان ہر اعتبار سے زبردست مماثلت محسوس کی۔ مگر اس کاوش سے کبھی باز نہ آئے۔ تم اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی ایک میں شکل و صورت یا طبیعت و خصلت کے اعتبار سے ایسا فرق معلوم کر لو۔ جس کی رو سے یہ کہہ سکو کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ مگر بے سود تجسس خود زندگی کی عمارت، لکڑی میں لگے ہوئے گھن کی طرح اندر ہی اندر تم کو کھوکھلا کرتی رہی۔ حتیٰ کہ آج تمہاری روح بھی کھوکھلی ہو چکی ہے۔ تم اس پھول کی مانند ہو جس کا رس نکالا جا چکا ہو۔

مجھے بتاؤ، کہاں ہیں تمہاری جوانی کی سرمستیاں اور کہاں ہے تمہاری وکالت کی دھوم دھام۔ نہ شباب و شعر کا وجود باقی ہے، نہ روپے پیسے کی فراوانی ہے۔ آج اپنی زندگی سے بیزار ہو تم —— اور سر کو دیوار سے ٹکرانے کے لئے ایک مضبوط دیوار تلاش کرتے ہو، مگر وہ بھی نہیں ملتی۔ میں جانتی ہوں کہ میرے جھوٹ کا انکشاف بھی تمہاری بدلی ہوئی حالت کو نہیں سنوار سکتا۔ گری ہوئی دیوار دوبارہ تعمیر ہو سکتی ہے مگر لٹی ہوئی جوانی از سرِ نو شاداب نہیں ہو سکتی۔ اب عمر کے باقی ماندہ لمحے حسرت و یاس کی فضاؤں میں بسر کرو۔ تم تڑپو اور میں رقصِ بسمل کا تماشہ دیکھوں۔ تم خون کے آنسو بہاؤ اور میں ہنس ہنس کر تمہارے زخموں پر نمک چھڑکوں۔ یہی غمزدہ دل کی لبریز آخری تمنا ہے۔ بس، اس سے زیادہ کچھ اور کہنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ یہ میری آخری نظم ہے جسکو تمہیں پیش کیا ہے۔ اسکے بعد دنیا میرا کوئی کلام نہ سن سکے گی۔"

اور دوسرے ہی دن محلے والوں نے سنا کہ زہرہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث اس جہان سے کوچ کر گئی۔

کیا آپ نے کبھی موسمِ خزاں میں غروبِ آفتاب کے وقت کسی [illegible] کی آغوش میں دیکھا ہے —— [illegible] کہ وہ ایک [illegible] کی مانند [illegible] اور شہرِ مردہ تھا جس کا نام تسنیم تھا۔

دو آنسو

(از محترمہ مہر آرا صفی مراد آبادی)

طارق کو پورے چھ سال کی طویل مفارقت کے بعد دیکھنا ـــ کس قدر مسرت بخش تھا ـــ یہ صرف تنویر کا وہ محبت شعار دل ہی جانتا تھا جو طارق کی ضیاء الفت سے منور تھا ـــ

طارق اور تنویر زمانہ طالب علمی ہی سے گہرے دوست تھے ـــ اور اب اس طویل مفارقت اور بظاہر دوری نے ان کے اطوار اور محبت میں کوئی کمی نہ آنے دی تھی۔

طارق بی۔اے نہ کرنے پایا تھا کہ اس کے سر سے اس کے شفیق باپ کا سایہ اٹھ گیا ـــ ماں اوائل عمری ہی میں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اب طارق تھا ـــ اور اس کی غمگسار انا جس نے اسکو دراصل بڑی محبت اور چاؤ سے پالا تھا۔ کچھ دن کے اخراجات کیلئے تو وہ روپیہ کفیل ہوا جو شفیق اور مرحوم باپ کی یادگار تھا۔ آخر مجبور ہو کر تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر حصول ملازمت کی فکر لاحق ہو گئی۔ تنویر نے اپنے چچا کو بھی (جن سے والد کی زندگی ہی سے کچھ جائداد اور خانگی ناچاقیوں کی بدولت کبھی میل نہ تھا) اپنے مفصل حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن جب وہ بھائی کی زندگی ہی میں ان سے نہ ملے تو اب انکے مرنے کے بعد ان کو تنویر کی محبت کیا ہو سکتی تھی۔ مجبور ہو کر تنویر مصائب دنیا برداشت کرنے کیلئے کمربستہ ہو گیا۔ اس کو اگر کوئی افسوس تھا تو وہ یہی کہ وہ بی۔اے نہ کر سکا۔

چند ماہ کی بادیہ پیمائی کے بعد آخر تنویر کو الہ آباد میں ایک جگہ سو روپے ماہوار پر کسی دفتر میں کلرکی مل گئی۔ اور اس نے صبر اور شکر کے ساتھ اس ہی کو بصد شوق قبول کر لیا ـــ البتہ کبھی کبھار وہ سوچا کرتا تھا کہ شاید یہی ہے اس کے ان سنہرے اور رنگین خوابوں کی تعبیر جو والد کی زندگی اور طالب علمی کے زمانے میں وہ دیکھا کرتا تھا۔ کبھی وہ محسوس کرتا وہ آئی، سی، ایس ہوگا ـــ ایک کوٹھی ایک موٹر اور ایک ... حسین اور تعلیم یافتہ بیوی اسکی ذاتی ملکیت ہوگی۔ دولت اسکی غلام ـــ عزت اسکی لونڈی ـــ اور شہرت اسکی باندی ہوگی ـــ آہ کیسے ـــ ولولہ خیز تھے وہ ایام اور کیسی پر کیف وہ خوابیں ـــ !!

ان تمام پراگندہ خیالات سے اکثر وہ گھبرا سا جاتا ـــ اور پھر ایک صابر اور شاکر انسان کی طرح اس کا دل معبود حقیقی کا شکر ادا کرنے پر مجبور سا ہو جاتا۔ وہ سوچتا ـ آئی، سی، ایس ـــ نہ سہی کلرک ہی سہی ـــ کوٹھی نہ سہی یہ چھوٹا سا خوشنما آرام دہ صاف ستھرا مکان ہی سہی ـــ کیا یہ سب ـــ کچھ کم ہیں ایسی صورت میں جبکہ پیاری صبیحہ جیسی رفیق زندگی میرے ہر دکھ اور درد کو مسرت اور شادمانی میں تبدیل کرنے کو موجود ہو۔ ایسے وقت وہ سوچنے لگتا، کیا یہ کچھ کم عنایت ربانی ہے کہ ـــ اس کا ایک خواب تو شرمندۂ تعبیر ہوا ـــ بے شک ـــ اسکے ذہن میں ـــ ایک مدت سے طرح طرح کا روپ بھر کر ایک مکمل عورت ـــ جو جلوہ گر تھی وہ ـــ صبیحہ سے زیادہ دلکش ـــ نہ تھی !!

پھر کیوں نہ وہ مسرور ہو ـــ اور کیوں کفران نعمت کرے؟؟

"زمانے کے ساتھ تم بھی ایسے پہلے کہ نرے چغد ہو کر رہ گئے" ـــ طارق نے تنویر کو راضی کرنے کیلئے یہ آخری وار کیا۔

"طارق ـــ سوچو تو ـــ میں آخر ـــ صبیحہ کو کیا جواب دوں گا" تنویر نے بڑی ندامت سے جواب دیا۔

"یک نہ شد دو شد ـــ واہ یار واہ ـــ ایسے زن مرید ہو کر رہ گئے ـــ تمہیں ہو کیا گیا ـــ یہ عمر ـــ اور یہ ـــ گوشہ نشینی ـــ یار رہ رہ کے افسوس ہوتا ہے تمہارے حال زار پر ـــ"

"لیکن یہ حقیقت ہے طارق ـــ کہ صبیحہ کو ـــ بہت رنج ہوگا ـــ عورت کبھی کسی حال میں بھی یہ پسند نہیں کر سکتی کہ اس کا شوہر آوارہ گردی کرتا پھرے ـــ میں کیا کروں ـــ میرا دل نہیں چاہتا کہ میں صبیحہ کے نازک دل کو صدمہ پہنچاؤں ـــ مجھے معاف کر دو ـــ !!"

تنویر نے مجروح ـــ ہو کر ـــ ناچار کہہ ہی ڈالا ـــ

ہر چند کہ ایسا کہتے ہوئے اس کا جذبہ خود لذتی اگر ایک طرف اسکا ـــ گلا گھونٹ رہا تھا تو دوسری طرف صبیحہ کا حسین تصور ـــ اس کو ہمت و جرأت دلا رہا تھا ـــ کہ وہ اپنے ان اصولوں پر کاربند رہے جو ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی خاطر اپنی سمجھ میں آئے۔ اس آزادی کو جس سے اس کے نزدیک

بیچ کے معصوم دل کو آزار پہنچ سکتا تھا جیسنٹ چڑھا کر اس نے خود ہی بنائے
تھے ___ اور جن کو تازیست نبھانے کا وعدہ ___ اس نے سچے دل سے
صبیحہ سے بھی کیا تھا اور اس کے جواب میں اس نے دیکھا صبیحہ کی نرگسی مسکراتی
آنکھیں پرنم تھیں ___ !!

" عجیب گدھے ہو ___ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ___
اماں اُلو کا گوشت کھلا دیا گیا ___ کیا ضروری ہے کہ تم صبیحہ سے ہی کہو کہ
تم ناچ دیکھنے جا رہے ہو ___ ارے میاں ہزار بہانے ہیں ___ کہدو طارق
کے ساتھ کسی دوست سے ملنے جا رہا ہوں سینما جا رہا ہوں ___ یا پھر وہیں
پر معذرت کر لینا کہ ___ فلاں دوست کے گھر برج میں بیٹھ گیا ___
کیا بتاؤں بس یار دوستوں نے اُٹھنے ہی نہیں دیا ___ غرض کہ دنیا میں رہ کر
___ تمہاری طرح خدا نہ کرے جو کوئی مُردہ دل بنے ___ آخر یہ میاں جی
قاک سے ہو کر رہ گئے ہیں ___ طارق نے طنزاً کہا۔ تنویر حیران تھا
___ باوجود لاکھ جتن کے گلو خلاصی ناممکن تھی۔

آخر انسان تھا ___ بہک گیا ___ اور طارق اس کو مجبور کر کے
حامد کے یہاں ڈنر میں لے ہی گیا ___ جہاں ___ طارق کی خاطر اور تواضع
کیلئے خشک ڈنر ہی نہ تھا بلکہ روپا ___ الہ آباد کی اس مشہور و معروف روپا
کا ناچ بھی تھا جس سے الہ آباد کا بچہ بچہ واقف تھا۔ روپا ابھی چند ماہ گذرے
یہاں نئی نئی آئی تھی۔ اور ___ بازار حسن میں ___ اس کی تابانی ___
اس وقت عروج پر تھی ___ وہ اپنے نام کی طرح خوبصورت حسین تھی ___
بلکہ نوخیز ___ اور غضب کی ماہر فن بھی تھی۔ اور اس ہی لئے اس کی آمد
نے یہاں کی اور تمام سوداگرن ___ کے گاہک توڑ لئے تھے ___ اور
ان میں سے بہت سی بچاریوں کو تو مجبور ہو کر یہاں سے اپنا بوریا بستر باندھ کر
کہیں اور جگہ مقدر آزمائی کا موقع بھی مل چکا تھا ___ !!

تنویر نے یوں تو اُچٹتی ہوئی نظروں سے ___ کئی بار روپا کو
دیکھا تھا ___ اور باوجود اس کے بے انتہا حسین ہونے کے اس کو دوبارہ
دیکھنے کی ہوس کا احساس اس کو کبھی نہ ہوا تھا۔ لیکن ___ آج اس محفل
سرود ___ کی سرشار کن مستی اور مدہوش کن کچھ کیف کشش ایسی نہ تھی ___
کہ اس کے دل میں پھر بھی کبھی اس سیلاب نشاط میں کھو نے جانے کا ارمان ___
پیدا نہ ہوتا ___ !!

اس نے درمیان میں کئی مرتبہ ___ صبیحہ ___ اور اس کی تنہائی کا
احساس کیا۔ لیکن کچھ اور دوستوں کے مذاق اڑانے کے خیال ___ اور کچھ
اس موسیقی کے سحر نے جس کا اثر ___ یقینی ہوتا ہے اس کی حالت ہی کچھ
اس پر مدہوشی سی کر دی تھی جس میں باوجود خواہش پرواز کے طاقت پرواز نہ ہو
___ اس نے کئی بار ارادہ کیا، نیند کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اسکی
یہ سعی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی ___ !!

جب وہ ___ گھر واپس لوٹا ___ تین بج چکے تھے ___
تمام راستہ ___ طارق ___ روپا کی تعریفوں سے ___ اس نفتق کو اور
گھبرا کرتا چلا آیا ___ جو تنویر کے دل میں صبیحہ ___ کے ہم پہلو ___
رونق افروز تھا ___ !! کیسا انقلاب تھا۔ آج اس کے گوشۂ دل میں ایک
ساتھ دو مورتیاں براجمان تھیں ___ !!

دروازہ کی ڈیوڑھی پر جس وقت تنویر نے قدم رکھا اس کا دل دھڑک
رہا تھا ___ اور ___ دماغ بہانے تلاش کرنے کی ناکام سعی میں سرگرداں تھا۔
اس کا ضمیر ___ ان دونوں پر حاوی تھا ___ وہ ملامت کر رہا تھا اس پر کہ
___ صبیحہ جیسی محبت شعار۔ بھولی ___ معصوم ہستی کو دھوکا دیا جائے ___
اس کو دھوکا دیا جائے جسکو کبھی دھوکا نہ دینے کا اس نے صدق دل سے خدا کو
حاضر و ناظر جان کر وعدہ کیا تھا ___ !!

لیکن ___ چارہ بھی کیا تھا ___ اس طرح ___ اس کا ضمیر
مجروح ہوتا تھا۔ تو سچ بول کر ___ صبیحہ کا وہ نازک دل شکستہ اور ___ چور
___ جس کی نزاکت کا احساس مجروح ضمیر کے احساس سے کہیں زیادہ تھا ___
اس ہی کشمکش میں وہ ___ زنانے دروازے تک پہنچ گیا۔ دستک
دینے کے ارادہ سے ابھی کواڑ پر ہاتھ رکھا ہی تھا ___ جو صبیحہ کی دلکش آواز
کانوں میں آگئی ___

" اللہ کا شکر ہے کہ آپ آگئے ___ میں تو ___ آج بہت ہی پریشان
ہو رہی تھی۔" صبیحہ نے دروازے کے کواڑ جلدی سے کھول کر کمال محبت
سے کہا۔

" اوہ ___ وہ اب تک دریچہ کے قریب کھڑی اس کا انتظار کر رہی
تھی ___ " اس احساس کے ساتھ ہی تنویر کی آنکھیں بے ساختہ صبیحہ کی آنکھوں سے
جا ملیں ___ نصف شب سے زیادہ دیر جاگتے رہنے کی وجہ سے ___ پھر شاید
___ رونے کی وجہ سے وہ گلابی تھیں ___ نشیلی ___ اور ___ کسی قدر
مغموم ___ !! اس کا چہرہ بھی ___ آج ___ معمول کی طرح بشاش نہ تھا ___
یہ احساس تنویر ___ کیلئے ایک صدمہ جانکاہ تھا ___ ندامت سے اسکی

آنکھیں زمین پر گڑھ کے رہ گئیں ـــــ الفاظ ـــــ پر تُل تُل کر رہ جاتے ـــــ اور اس کے منہ سے ادا نہ ہوتے ۔ نہ جانے ـــــ وہ کب تک ایسی بھرم کی سی حالت کو کمال حیرت سے دیکھتی رہی !!

"کیا یہیں کھڑے کھڑے سونے کا ارادہ ہے ؟" صبیحہ نے حیرت کے ساتھ قدرے ترشروئی سے کہا۔

"اوہ ـــــ" تنویر نے بے ساختہ جواباً کہا۔ اس کا ایک ایک قدم ایک ایک من کا تھا ـــــ اُف ـــــ احساس ندامت بھی کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے !!

باوجود ضمیر کی بغاوت ـــــ کے وہ صرف اس قدر کہہ سکا ـــــ

"معاف کرنا صبیحہ ـــــ آج مجھے بہت دیر ہوگئی ـــــ کھانے کے بعد سب لوگ برج کھیلنے لگے ـــــ اور ـــــ مجھے بھی طارق کی وجہ سے مجبوراً شریک ہونا پڑا ـــــ"

چونکہ عمر میں ـــــ ازدواجی زندگی کی مختصر ـــــ پنج سالہ زندگی میں یہ پہلا جھوٹ تھا جو وہ بول رہا تھا اس لئے ـــــ اس کے لب کانپ رہے تھے ـــــ اور ـــــ الفاظ حلق میں پھنسے جا رہے تھے ـــــ !!

کون جانے کہ صبیحہ اس کے اس جواب سے مطمئن تھی یا نہیں ـــــ بظاہر ناراض نہ تھی ـــــ لیکن جب وہ سونے کو لیٹی ـــــ تو ـــــ اس کی آنکھوں سے چند قطرات اشک بے ساختہ اس کے تکیہ پر ٹپک پڑے جنہیں بہت جلد تکیہ نے بالکل اس طرح جذب کر لیا جیسے آج کے بہت سے فرسودہ خیالات کو اس کے دل نے جذب کر لیا تھا ـــــ !!

طارق تو ایک ہفتہ سیر و تفریح کر کے واپس دہلی چلا گیا۔ لیکن روپا اور تنویر کی شناسائی رفتہ رفتہ رنگ لائی ـــــ ہر چند کہ حقیقت یہی ہے کہ تنویر ـــــ برابر ـــــ روپا سے کشیدہ رہنے کی ناکام سعی میں مصروف رہتا تھا ـــــ لیکن پھر بھی کبھی کبھار روپا سے کسی نہ کسی بہانے سے اسکی ملاقات ہو ہی جاتی ـــــ کبھی اس طرح کہ وہ دفتر سے واپس آ رہا ہوتا اور وہ اتفاق سے ٹانگہ میں بیٹھی سڑک پر سے گذر رہی ہوتی اور اس کو دیکھ کر وہ ـــــ فوراً ٹانگہ رکوا لیتی ـــــ اور تصادم نگاہ کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے ہاتھ سلام کو اٹھ جاتے ـــــ روپا کے حسین احمریں لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ـــــ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی اور اس کا حسن ملاقات کی اس فوری مسرت کے سبب نکھرا نکھرا نظر آنے لگتا ـــــ تنویر لاکھ چاہتا کہ اس طرح سر بازار اس سے گفتگو نہ کرے ـــــ لیکن روپا کے دوچار سوالوں کا ایک آدھ مختصر سا جواب بھی نہ دیتا آخر کہاں کی انسانیت تھی ـــــ! وہ لاکھ کوشش کرتا ـــــ بد اخلاق بن جائے ـــــ لیکن وہ محسوس کرتا اس کی یہ ـــــ سعی ـــــ کبھی شرمندہ تکمیل نہ ہوگی۔ اور شاید اس کا ایک سبب روپا کے وہ حسین شکوے تھے جو اس کے کانوں میں سے گذرتے گذرتے آخر دل تک پہنچ ہی گئے تھے ـــــ نہ جانے کیوں ـــــ جتنا وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ـــــ اسی قدر وہ اس کی طرف کھنچی چلی آ رہی تھی ـــــ کیسا عجیب اصول تھا ـــــ جو اس کی بارگاہ ناز میں سر نیاز جھکا چکے تھے اُن سے وہ بیزار تھی ـــــ ان کی محبت ـــــ ان کے عشقیہ محبت نامے ـــــ اور المیہ حکایات فراق سنتے سنتے ـــــ وہ گھبرا گئی تھی ـــــ اور اکثر تنویر سے کہا کرتی تھی ـــــ میں اکثر دعا مانگا کرتی ہوں کہ کبھی کبھار گھڑی دو گھڑی کو تو مجھے ان کم بخت عاشقوں سے نجات مل سکے۔ وہ ان کا بری طرح مذاق اڑایا کرتی تھی ـــــ اور ـــــ پھر بھی چاہتی تھی نہ صرف چاہتی تھی بلکہ کوشاں تھی ـــــ اور بے چین کہ ـــــ اس طویل فہرست میں تنویر کا نام بھی درج ہو سکے ـــــ !! اور اب تک شاید ایسا ہو بھی چکا ہوتا ـــــ اگر واقعی ـــــ تنویر کو صبیحہ سے دلی محبت نہ ہوتی ـــــ صبیحہ ـــــ کو اس نے اپنی پوری قوت ـــــ محبت اور شان عشق سے چاہا تھا اور ـــــ

"عشقے کہ بر او سال گذر کرد کہن شد"

کے مطابق اس کی یہ مفتونیت کبھی آمادہ تنزل نہ ہوئی لیکن اب ـــــ بعض اوقات ـــــ محبت کا وہ نقش اولین جو کبھی نقش کالحجر نظر آتا تھا ـــــ کچھ ـــــ کچھ مٹا ـــــ سا جا رہا تھا۔ یا پھر اب اس ملتہب کی تابناکی میں ـــــ اس لئے کمی آتی جا رہی تھی کہ بھڑک کر وہ اپنی پوری بھڑاس نکال چکا تھا ـــــ اور وقت آ گیا تھا کہ اب ـــــ راکھ کا ایک چھوٹا سا ڈھیر ـــــ اس شعلہ کی یادگار ثابت ہو ـــــ !! اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ صبیحہ ـــــ کو اس کے لاکھ کوشش کے اخفا کے باوجود اس کے اطوار میں فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ اور وہ ـــــ نادان ـــــ ایک خزاں رسیدہ بہار کی طرح حسرت کے عالم میں واقعات رفتہ کی یادوں ـــــ ضرورت سے زیادہ غرق رہتی ـــــ جس کے سبب اس میں وہ پہلا سا حسن وہ تازگی اور کشش یا تو باقی نہ رہی تھی ـــــ اور یا تنویر کی آنکھوں کو اس حسن جہاں سوز کی تابناکی نے اس قدر خیرہ کر دیا تھا کہ صبیحہ کا حسن اس کی نظر میں اب ایک ایسا سحر تھا جو قلب کو اپنی طرف متوجہ تو کرے مگر مجبور نہ کر سکے ـــــ !!

صبیحہ ـــــ وہ جانتا تھا ـــــ کہ اس کے لاکھ کوشش اخفا کے باوجود سب کچھ جانتی ہے ـــــ اس لئے اس کو اس سے جھینپ سی آنے لگی تھی

…ف ملکہ تھا ـــــ روپا سے اس کا کوئی مطلب نہ واسطہ ـــــ جا سبب آخر کیوں صبیحہ کا مجرم بنوں ـــــ لیکن حضرت دل ـــــ اس کے خلاف آمادہ پیکار تھے ـــــ !! اور صبیحہ ـــــ نادان ـــــ صبیحہ کاش وہ ـــــ اسکی اس حرکت پر کبھی اس سے بگڑتی، شکوہ کرتی یا پھر اس کی اصلاح کی کوشش تو کرتی ـــــ مگر وہ ـــــ وہ جانتا تھا وہ کس درجہ مغرور ـــــ اور خوددار ہے ـــــ جس طرح وہ سب کچھ جان کر انجان بنا ہوا تھا ـــــ بالکل اس ہی طرح صبیحہ بھی کوشاں تھی کہ اس صدمہ جانگسل کا ایک ہلکا سا اثر بھی تنویر کو نہ پہنچے جو اس کے قلب اور دماغ پر مسلط ہے۔ اور اس طرح اس کے جذبہ خودداری کو ٹھیس نہ لگے !!

روپا جس قدر اس سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی ـــــ صبیحہ اس ہی قدر دور۔ لیکن یہ معنی نہیں کہ وہ روپا کی محبت میں تحلیل ہو رہا تھا ـــــ نہیں ـــــ بلکہ روپا ـــــ ایک اسیر محبت ہستی کی طرح خود ہی اس کی طرف کشاں کشاں آ رہی تھی۔ وہ جس قدر پیچھے ہٹتا ـــــ یہ اس ہی قدر اور آگے آ جاتی ـــــ ! اس نے کبھی روپا کو ـــــ نامہ محبت تحریر نہ کیا تھا ـــــ اس نے کبھی معمولی گفتگو کے علاوہ ایک لفظ پیار ـــــ زبان سے ادا نہ کیا تھا ـــــ اور ـــــ اس نے کبھی دل میں یہ آرزو نہ کی تھی کہ وہ اس آفتاب جہاں سوز کی حرارت سے ـــــ اپنے منجمد اور بے حس دل میں حرارت الفت ـــــ پیدا کرے ـــــ بلکہ وہ تو اس سے دور ـــــ کہیں بہت دور ـــــ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جہاں وہ اس کا تعاقب چھوڑ دے۔ اور اس کی گم شدہ پُرسکون ـــــ زندگی اس کو دوبارہ حاصل ہو سکے۔ مگر اب یہ سب ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کا ایک وہم تھا اور بس ـــــ !!

آخر ـــــ اسکو مجبور ہو کر ـــــ روپا کے گھر بھی جانا پڑا ـــــ اور اس کے نامہ محبت ـــــ کے مختصر سے جواب بھی تحریر کرنے ہی پڑے ـــــ لیکن ـــــ پھر بھی وہ صبیحہ کو نہ بھلا سکا تھا ـــــ اس ہی لئے اس نے آخر روپا کی التجا کو ٹھکرا دیا وہ ـــــ مجبور ہو کر کہہ ہی اٹھا ـــــ "معاف کرو ـــــ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا ـــــ روپا کیلئے یہ خشک جواب بہت ہی حوصلہ شکن تھا ـــــ یہ اس کا آخری حربہ تھا۔ آہ ـــــ وہ اب بھی تنویر کو نہ حاصل کر سکی ـــــ اپنی آزادی کو بارگاہ الفت میں بھینٹ چڑھا کر بھی وہ مراد دل حاصل نہ کر سکی۔ اس کی اس مختصر سی زندگی میں ـــــ تنویر ہی وہ پہلا شخص تھا جو اس قدر بے مہر تھا ـــــ اس کے خواب اور خیال سے کہیں زیادہ سرد مہر ـــــ اس نے اپنی پوری قوت سے چاہا ـــــ اور اس کا صلہ ایک ایسی ٹھوکر تھی جس نے اس کو سنبھلنے نہ دیا ـــــ وہ لڑکھڑائی ـــــ اور آخر گر ہی پڑی۔ لیکن پھر بھی دامن صبر اس کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا ـــــ !!

روپا کے اس تغیر نے اس کے کاروبار ـــــ اس کی زندہ دلی اور دلچسپیوں پر بھی کافی اثر ڈالا تھا اور اس لئے امّاں جی اس سے سخت ناراض تھیں ـــــ تو استاد جی خفا۔ ہر شخص بیچارے تنویر پر دانت چبا رہا تھا اور اس ہی لئے ایک دن جب وہ روپا کے کئی مرتبہ بلانے کے بعد گذشتہ بدسلوکی کو بھول کر آ گیا تو خلاف امید روپا کی موجودگی ہی میں اس بار امّاں جی نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"بیٹا یہ رنڈی کا کوٹھا ہے۔ اماں جی کا گھر نہیں ـــــ"

"مانا کہ آپ غریب ہیں لیکن ایسے تو نہیں کہ ہمارے نصیب کے اگر سو دو سو نہیں تو دس بیس بھی آپ کی جیب میں نہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے اللہ غریب کرے مگر دل کا غریب نہ کرے ـــــ !!

روپا نے لاکھ کوشش کی کہ یہ تلخ سلسلہ گفتگو بند ہو سکے۔ مگر ایک نہ چلی۔ آخر اس نے اپنا آخری فیصلہ ان الفاظ میں صادر کر ہی دیا۔

"اماں ـــــ میں مسلمان ہو گئی ہوں اور اس لئے اب میں ایک منٹ یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ مجھے ایک ایسے شریف انسان کی اشد ضرورت ہے جس کی رفاقت میں میں زندگی کے بقیہ دن یاد خدا میں گذار سکوں ـــــ موجودہ پُر معصیت زندگی میرے لئے اب وبال جان ہے۔"

تنویر کھڑا ـــــ ایک پتھر کے بے حس مجسمہ کی طرح سب کچھ سُن رہا تھا اور خاموش تھا ـــــ اماں جی اور استاد صاحبان وغیرہ کی منت سماجت اور آہ و بکا ـــــ بے اثر تھی ـــــ اور آخر روپا تنویر کے سر تھی کہ اب وہ اُسکو وہاں سے لے جائے۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ سو روپے کی قلیل رقم میں ـــــ جبکہ اپنا اور صبیحہ کا گذارا ہی اس مہنگائی کے زمانہ میں دشوار تھا۔ کیا وہ روپا کے اخراجات کا بھی کفیل ہو سکے گا ـــــ ! اس نے روپا سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بہت غریب آدمی ہے۔ اور اس لئے اُس کو یقین ہے کہ روپا ایسا کرنے کے بعد عمر میں ایک بار ضرور پچھتائے گی ـــــ لیکن روپا کو سب کچھ منظور تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا ـــــ اس کو روپا سے وعدہ کرنا پڑا کہ وہ ـــــ اس کو اپنی زوجیت میں لے لیگا ـــــ !! لیکن صبیحہ سے اجازت لینے کے بعد ـــــ اور یہ ایک ایسا ارادہ تھا جس کی تکمیل کا تصور بھی اس کو لرزہ براندام کر رہا تھا۔ کیسا عجیب واقعہ تھا۔ آج وہ جس کام کا عزم کر رہا تھا اس کا ارادہ

تو ارادہ کبھی ایسا کرسکنے کا تصور بھی تو نہ کرسکتا تھا۔

"صبیحہ ــــ !" تنویر نے اس کا نرم اور نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بمشکل کہا ــــ "میں حیران ہوں کہ آخر تم کو کس طرح ..... وہ سب کچھ بتا دوں جس کو بتا دینا چاہتا ہوں ــــ" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جسم کانپ رہا تھا۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں ــــ آپ نے جو کچھ کیا ــــ مجھے اس کا صدمہ نہیں ــــ ملال ہے تو یہ کہ کاش میرے ہاں اولاد ہوتی ــــ" اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ لاکھ کوشش ضبط کے باوجود فرط گریہ سے اس کی آواز بھرا گئی ــــ !!

"صبیحہ یہ تمہارا وہم ہے ــــ بالکل غلط سمجھا تم نے ــــ بخدا میں اولاد کے لئے ــــ یا اپنے کسی ذاتی شوق کیلئے ایسا نہیں کر رہا ــــ صبیحہ ــــ کاش تمہیں یہ صدمہ ــــ"

صبیحہ کے آنسوؤں کی فراوانی ــــ تنویر کے ہر ارادہ اور ضبط کی شکست تھی۔ وہ نہ کچھ کہہ سکا ــــ اور نہ ہی صبیحہ کے حسین چہرہ پر قطرات اشک کو دیکھنے کی اس میں تاب تھی اور آخر وہ آنسو جو نہ معلوم کب سے نکلنے کے لئے آنکھوں میں مچل رہے تھے بہہ پڑے ــــ عین اس ہی وقت ــــ دروازہ پر دستک کی آواز آئی ــــ اور ایک لمحہ توقف کے بعد ایک ہلکی سی خوشگوار صدا کانوں میں آئی۔ جس نے ان دونوں کو تھوڑی دیر کیلئے مبہوت بنا دیا۔

"تنویر بھائی ــــ ! کیا میں اندر آسکتی ہوں ؟"

اس کی آواز سے کان آشنا ضرور تھے۔ مگر پھر بھی تنویر حیران تھا۔ اور اسی ہی لئے فرط حیرت نے اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب کرلی تھی۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

"مت جواب دو ــــ میں آرہی ہوں ــــ" یہ دوسری صدا تھی جو پہلی سے زیادہ تازگی لئے ہوئے لبریز شرارت تھی۔ اور دوسرے لمحہ ــــ روپا مع "اماں جی" کے ان کی آنکھوں کے سامنے صحن میں تھی ــــ !

تنویر کے ساتھ ــــ صبیحہ کی بھی پیشانی پر اس کی اس بے باکانہ جسارت سے بل پڑ چکے تھے اور قریب تھا کہ وہ لب کشائی کرے۔ جو روپا نے پیش قدمی کی۔

"میں نہ کہتی تھی ــــ کہ ــــ آخر میں اس قدر باوجود تمہاری بے نیازیوں کے تمہاری طرف کھنچی چلی آرہی ہوں۔ جتنا غور کرتی اتنی ہی حیران ہوتی ــــ"

" روپا تمہیں سوچنا چاہیئے کہ صبیحہ کی بغیر اجازت اول تو تمہاری اس طرح مداخلت ہی نازیبا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ تم ــــ" تنویر اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ الفاظ پر اپنے جذبات کی طرح قابو اس وقت اس کا قابو نہ تھا ــــ !!

"تم صابر علی انسپکٹر آبکاری کے لڑکے ہو ــــ بنارس میں جو ریٹائر ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک رہے ــــ انہوں نے اپنے جائے رہائش ــــ ہی بنارس کو بنا لیا تھا۔ اور ریٹائر ہو کر بھی کبھی واپس وطن نہ گئے ــــ میں نے سب بھید نکال لیا ــــ"

"آپ کی اس فضول گفتگو کا مطلب ــــ ؟" تنویر نے غصہ سے بات کاٹ کر جواباً کہا۔

روپا تمہاری بہن ہے ــــ بڑی بی نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ تصدیق کے لئے تمہارے والد مرحوم کی تحریر موجود ہے جو انہوں نے اپنے انتقال سے چند ماہ قبل روانہ کی تھی ــــ آہ میں نے ان سے بیوفائی کی ــــ اور ان کے انتقال کے بعد ــــ میں ایک مدت دراز تک اسی احساس سے تڑپا کی کہ میں نے اس فرشتہ صفت انسان سے بیوفائی کرکے کچھ اچھا نہ کیا ــــ" اماں جی کی ــــ آواز میں ــــ سوز اور آنکھوں میں آنسو تھے ــــ ! اور تنویر باآواز بلند پڑھ رہا تھا۔

"چندا ! تمہاری بیوفائی اور کج ادائی کا قلق نہیں ــــ جب تھا وہ زمانہ گذر گیا ــــ مجھے مسرت ہے ــــ کہ میں تمہارے سنہرے جال سے نکل گیا ــــ لیکن ایک احساس ــــ بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اب روپا اللہ کے فضل سے سیانی ہونے کو آئی ــــ کسبی کی لڑکی ــــ کسبی نہ بنے ــــ کاش تم میری التجا کو قبول کرلیتیں۔ اور اس معصوم کو میں معصیت سے آلودہ نہ ہونے دیتا۔

چندا ! اب بھی مان جاؤ ــــ ! اور بچی کو مجھے دیدو۔ اس کے عوض میں میں جس قدر میرے امکان میں ہے نقدی دینے کو تیار ہوں ــــ میرے ضمیر کی صدا ــــ ہر دم میرے کانوں میں آتی ہے۔ اور اب میں نے سوچ لیا ہے کہ دنیا اور دنیا والوں کی نگاہوں میں مجرم بن جاؤنگا ــــ بے غیرتی کو برداشت کروں گا ــــ مگر روپا کو تمہاری صحبت میں اب نہیں چھوڑ سکتا بہتر ہے کہ آسانی سے مان جاؤ ورنہ کوئی اور صورت اختیار کرنی پڑیگی۔

ــــ صابرہ علی

خط کی ان چند سطروں نے تنویر کے اور صبیحہ کے دل اور دماغ پر ایک وقت یکساں اثر کیا —— ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے کہ میری سعی —— اور ناتواں کوششیں —— کامیاب رہیں —— اور —— میرا دامن عصمت —— اس گندی موری میں رہنے کے باوجود غلاظت سے پاک ہے ——" روپا نے فخریہ کہا۔

"اس خط کے ملنے کے بعد —— میں کنجوس کے خزانے کی طرح روپا کو پوشیدہ رکھنے کی آرزو —— اور کوشش کی خاطر شہروں شہروں —— ماری ماری پھری —— اور آخر جب صابر علی کے انتقال کی خبر سنکر مطمئن ہوگئی تو —— روزی کمانے کیلئے ہر چند اس چھوکری کو رضامند کرتی۔ مگر —— یہ قبضہ میں نہ آتی تھی —— وہ تو بھلا تھا کہ یہ ان تمام رازوں سے قطعی ناواقف تھی۔ ورنہ شاید ناچ اور گانے کیلئے بھی راضی نہ ہوتی۔ قسمت —— میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا —— یہ خط نہ جانے کس طرح —— میرے بکس میں کپڑوں کے اندر لپٹا چلا آیا اور —— روپا کے ہاتھ لگ گیا —— پھر کیا تھا —— اسی دن سے اس نے الٹی میٹم دیدیا کہ اب وہ —— اس پیشہ کو نہ کریگی۔ لاکھ سمجھایا۔ منت خوشامد کی مگر راضی نہ ہوئی۔ اور آخر —— اس نے خفیہ طریقے سے چھان بین شروع کردی —— جسکا نتیجہ یہ نکلا —— اب تمہارے رحم و کرم پر ہے —— چاہے مجھے کچھ ہی سزا —— دو ——" فرطِ گریہ نے اس کی آواز کو بھرا دیا —— وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ "دو آنسو" اس کی آنکھوں سے نکلے اور رخساروں پر بہنے لگے —— تنویر اور صبیحہ بھی —— اس نظارہ کی تاب نہ لاکر اشکبار تھے۔ اور ان سب کے رخساروں پر قطرات اشک بکھرے تھے —— خدا جانے یہ اظہارِ مسرت تھا —— یا احساس ندامت !!

ضروری گذارش

حضرت عادل رشید اور جناب جمیل احمد کنہ. ھاپوری ملک ہندستان کے مانے ہوئے چوٹی کے نئے اور پرانے افسانہ نگاروں کے غیر مطبوعہ افسانوں کا ایک گرانبہا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ لہذا درخواست ہے کہ وہ حضرات جنہیں دعوت دی جاچکی ہے یا جنہیں سہواً نہیں مدعو کیا جاسکا اپنے افسانے مندرجہ ذیل پتہ پر جتقدر جلد ممکن ہوسکے ارسال فرمادیں۔ یہ مجموعہ تقریباً پانچ صد صفحات کا وہ گراں بہا مجموعہ ہوگا جسے بطور یادگار ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رکھا جائیگا۔

عادل رشید، ۱۵۱۲ مشتاباڈی، کیڈل روڈ، ماہم۔ بمبئی ۱۶

دُولہن بھابی

(از محترمہ شفیق بانو لکھنؤ)

"آخر کار بھائی جان نے ایک تصویر پہ انگلی رکھدی۔ ایک لخت قہقہہ کی زنانہ سے دادہ اواہ کی آوازیں نکل گئیں۔ دولہن بھابی کے چناؤ میں شکنتلا بہن کی تصویر سلی گئی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ اول تو بھائی جان شادی کے لئے کبھی تیار ہی نہوتے تھے۔ اور بالآخر رضامند ہوئے تو ایسی لڑکی کے ساتھ جو کسی دوسرے کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ میرے علم میں شکنتلا کو ونود بھائی سے محبت تھی۔ اور ونود بھائی شکنتلا کو اپنے تمام ارمانوں کا نچوڑ سمجھتے تھے۔

یہ چیز راز نہیں تھی مگر پھر بھی کچھ لوگ اس راز سے واقف ہوچکے تھے اس کتاب محبت کا ایک باب میں نے بھی سنا تھا۔ اور مجھے حیرت تھی کہ بھائی جان اور ونود بھائی نے اس سلسلہ میں تبادلۂ خیالات کیوں نہ کئے؟ بھائی جان الہ آباد میں پڑھتے تھے اور ونود بھائی نے اسی سال لکھنؤ سے بی۔اے کیا تھا۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ بعد میں ونود بھائی نے بھائی جان کو اس انتخاب پہ گرم جوشی کے ساتھ مبارکباد بھی دی۔ یہ سب کچھ دیکھکر میرا یقین شک میں بدل گیا۔ اللہ جانے یہ کیا طلسم تھا۔

پورے ایک ماہ کے بعد بھاگن میں بھائی جان کی شادی ہوگئی۔ دلہن بھابی نے اپنے مبارک قدموں سے گھر کو عزت بخشی۔ جب تک بھائی جان موجود رہے سارا گھر محفل نشاط بنا رہا۔ سالیوں کا ہجوم۔ دیورانیوں کا جمگھٹ۔ دور دور سے آنے والے بہناپوں کا جماؤ۔ گانا، بجانا، دعوتیں، مبارک سلامت کے شور۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ دلہن بھابی کیا آئیں ایک قیامت آگئی۔ دسویں روز بھائی جان کالج گئے۔ تو یہ معلوم ہوا کہ ساری خوشیاں اور چہل پہل انھیں کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔

بھائی جان کے جانے کے بعد دولہن بھابی بھی اپنے میکے چلی گئیں۔ ایک مہینہ کے بعد بھائی جان کسی تعطیل میں پھر آئے اور مجھے دولہن بھابی کو لانے کے واسطے سسرال بھیجا گیا۔ میں پہنچا تو بھائی جان کی سسرال والوں نے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے کسانوں اور چرواہوں کے بیچ میں کوئی جوتشی آجائے۔ تھوڑی دیر دالان میں بیٹھکر جب اندر جانے لگا تو دولہن بھابی میرے استقبال کے لئے ڈیوڑھی پر کھڑی ہیں۔

میں نے جھک کر مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ تو بولیں۔ "آگئے؟"

دولہن بھابی کے اس لفظ "آگئے" میں کتنی مٹھاس اور رس تھا۔ میں بیان نہیں کرسکتا۔ انتظار کی گھڑیاں۔ تنہائی کی تکلیف اور ساتھ ہی بھائی جان کی بابت کوئی نامعلوم سوال۔ صاف عیاں تھا۔

میں نے کہا "جی ہاں آگئے۔ اور آپ کو یاد کیا ہے۔"

دولہن بھابی نے ڈھلکے ہوئے گھونگٹ کو سر پر ڈال کر مجھے کمرہ کے اندر کردیا۔ کمرہ انگریزی طریقہ پر آراستہ تھا اور سنگاردان کی میز پر خوبصورت فریم میں جڑی ہوئی بھائی جان کی تصویر رکھی تھی۔

"یہ کون ہیں بھابی؟" میں نے تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے پوچھا۔

"پھر وہی شرارت" دولہن بھابی نے میرے گال پر ایک ہلکا سا طمانچہ مار کر کہا۔ پھر بولیں چائے پیوگے یا کوکو؟

دولہن بھابی نے اس طرح بات ٹال کر کمرہ خالی کردیا۔ اور ناشتہ کے انتظامات میں مشغول ہوگئیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے بھابی کے سامنے کمرہ کا جائزہ لیا۔ ہر چیز سے نفاست اور انگریزیت ٹپکی پڑ رہی تھی۔ اس بڑے کمرے سے ملحق دو چھوٹے سے تدرے اور تھے۔ جس میں ایک بھابی کا باتھ روم تھا اور دوسرا سونے کا کمرہ۔ سونے کے کمرے میں مجھے ایک چیز اور نظر آئی۔ وہ ایک چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی ونود بھائی کی تصویر تھی۔ جس کے نیچے مہین مہین الفاظ میں لکھا تھا "صرف تمہارا ونود"۔

"صرف تمہارا ونود"۔ میں نے اس جملہ کو دل میں دوہرایا۔ کیا یہ ممکن ہے؟ ہوسکتا ہے۔ ونود بھائی اب تک صرف انہیں کے ہوں۔ مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرا خیال ایک دم بھابی دولہن کی طرف چلا گیا۔ وہ تو یہ دعویٰ نہیں کرسکتیں۔ وہ بھائی جان کی ہیں اور بھائی جان اُن کے۔ مگر کون جانے؟

بھابی کے مخصوص کمرے میں ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہنے والی ایک مخصوص تصویر ——— "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"۔ ان خیالات نے تھوڑی دیر کے لئے الجھن کی صورت اختیار کرلی۔ میں نے سوچا اگر یہ حقیقت ہے تو بھابی کی بے زبانی ——— بھائی جان کی لاعلمی اور ونود بھائی کی ان بان نے کس طرح تینوں گھروں کا ستیاناس کردیا۔ مگر بھابی تو ویسی ہی خوش و خرم ہیں۔ وہی بانکپن، نگاہوں میں وہی خمار، حرکتوں میں وہی پہلی سی مستانہ روی۔ مگر کیا میرے آنے پہ ان تمام خوشیوں کا اظہار بناوٹی ہے؟ بناوٹ اور اس قدر حقیقت آمیز؟ ——— کچھ نہیں۔ دولہن بھابی سے اب ونود بھائی کا کوئی تعلق نہیں۔ عیش و نشاط میں پڑکر عورت کا پہلا شیوہ، دوسروں کو بھول جانا ہے

بھابی نے بھی بھلا دیا ہوگا۔ ممکن ہے یہ تصویر شادی کے پہلے سے رکھی ہو۔ اور یونہی رہ گئی ہو۔ دلہن بھابی کے دل میں اب ونود بھائی کا خیال بھی نہ ہوگا۔ دنیا میں نہ جانے کتنی چیزیں مٹ کر بنتی ہیں۔ اور بن کر مٹتے جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ محبت اپنی جگہ سے ہٹ کر کوئی دوسری جگہ لے لے۔ ونود بھائی کو بھابی سے محبت ہے اور بھابی کو اپنے فرض سے —— مجھے معلوم تھا کہ بھائی جان تن، من، دھن ہر طرح سے بھابی پر بادلوں کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ بھابی کے دل کا کوئی گوشہ اب تک ونود بھائی کے لئے خالی ہوتا ——

اتنا سب کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے پھر ونود بھائی کی چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی تصویر کو بہت غور سے دیکھا۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس وقت ان کے لبوں سے کھیل رہی تھی۔ اور جیسے وہ یہ کہہ رہے تھے۔ انجان بالک! تو کیا جانے؟

پیروں کی چاپ کے ساتھ برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اور بھابی مجھے ڈھونڈتی ہوئی اس چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوئیں۔ مجھے اس محویت کے عالم میں دیکھکر بولیں۔ کیا ونود بھائی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے مگر یہ تو ایک تصویر ہے اور وہ بھی بے جان۔ چلو چل کر چائے پئیں۔

میں خاموشی سے اٹھا اور اسی طرح پھر پہلے والے کمرہ میں داخل ہوا۔ چائے میز پر لگائی جا چکی تھی۔ پھلوں اور مٹھائیوں کو مناسب جگہوں پر چنا جا رہا تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ آخرکار بھابی ہی نے پھر سکوت کو توڑا۔

"تم تو اس طرح شرما رہے ہو جیسے یہ تمہاری سسرال ہو ——!

میں واقعی کچھ جھینپ سا گیا۔ مجھے اپنی اس بیجا خاموشی پر ندامت سی ہونے لگی۔ مگر میں نے دل کڑا کرکے جواب دیا۔

واہ —— سسرال میں کون شرماتا ہے۔ شرم اور سسرال میں تو کوئی مناسبت ہی نہیں۔ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ سسرال آنے والا انتہائی بے شرم اور بے باک ہوتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو مثال دے دوں۔

اس پر بھابی شرما گئیں۔ اور بغیر کچھ جواب دیئے مسکرا کر میری پیالی میں چائے انڈیلنے لگیں۔

میں نے چپکے سے کان میں کہا۔ "بھابی! بھائی جان نے یہ نادر شاہی حکم دیا ہے کہ آٹھ بج کے بیس منٹ پر جو گاڑی لکھنؤ پہنچتی ہے اس سے میں آپ کو لے کر پہنچوں۔ ورنہ حکم عدولی کی سزا ——

"اچھا تو آپ وارنٹ گرفتاری لیکر آئے ہیں۔" بھابی نے پلٹ کر کہا۔ "کچھ رشوت سے کام چل سکتا ہے۔؟"

"اوں ہوں ——" میں نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "حکم بہت سخت ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد روانگی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور ساڑھے سات بجے سے پہلے ہی ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی اپنے ٹھیک وقت پر آئی۔ اور حسب حکم بھائی جان آٹھ بج کے بیس یا بائیس منٹ پر ہم لوگوں نے گاڑی پر سے چار باغ کا پلیٹ فارم دیکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے بھائی جان ہی پریڈ کرتے ہوئے دکھائی پڑے۔ دلہن بھابی کھڑکی سے گردن نکالے جھانک رہی تھیں۔ میں نے مذاقاً کہا۔ "شوق میں کہیں پھاند نہ جائیےگا —— سارا کیا دھرا مٹی ہو جائے۔ گاڑی رک لے تو اتریئے گا۔"

گاڑی رکی تو بھائی جان نے لپک لپک کر قلیوں سے سامان اتروانا شروع کیا۔ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے۔ میں سامنے گیا تو پوچھنے لگے۔ "آ گئے —— ؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ آپ کے سندیسہ کے لانے بھی ساتھ میں بھابی کو انہوں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ بڑے انہماک سے پیٹھ ٹھونک کر بولے شاباش!

اتنے میں بھابی نے ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچ لیا۔ اور پاؤں اس طرح سمیٹ لئے جیسے کسی اور اسٹیشن پر جا کر اتریں گی۔ اب جو میں نے اترنے کی درخواست کی اور بتلایا کہ لکھنؤ کا اسٹیشن یہی تو ہے۔ تو انہوں اور زیادہ نخرے کئے۔ گاڑی پلیٹ فارم چھوڑنے کے لئے سیٹی دے رہی تھی۔ اور بھابی ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھیں۔ آخرکار میں نے تلی سے اس عدد کو بھی اتار کر پلیٹ فارم پر رکھو۔ اور بھائی جان کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

بھائی جان ہنسے۔ اور دلہن بھابی گاڑی کی سیٹی کے ساتھ رنگتی ہوئی پلیٹ فارم پر اتریں۔ معلوم یہ ہوتا تھا۔ "قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں" ——

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھائی جان نے چپکے سے ایک دس کا نوٹ میرے ہاتھ پر رکھکر کہا۔ "لو یہ ہے تمہارا انعام۔"

"صرف دس روپے؟ بھابی تو ایک دن کی مہلت پر سو دے رہی تھیں۔

اس پر انہوں نے پانچ کا ایک اور نوٹ جیب سے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھا۔

میں نے کہا "نہیں سرکار۔ ابھی تو پیٹ نہیں بھرا۔ ذرا میری محنت کو تو دیکھئے۔ بلا ضمانت کا وارنٹ لیکر گیا تھا۔

بولے "بس" میں نے کہنے والی بات ہی نہیں کی۔ اگر ایسا ہی محنتانہ چاہئے تو اپنی بھابی کو واپس لے جایئے۔"

میں نے مڑکر دولہن بھابی کی طرف دیکھا۔ "چلتی ہیں آپ واپس۔ سندلیب بجائے سو کے پچاس ہی نذر دیجئے گا۔

بھابی پچیس کے نوٹ ستا پہلے ہی سے ہاتھ میں دبائے کھڑی تھیں سینے سے دہ گڈتی مٹھی بند کر کے میری طرف بڑھا دی۔ گویا محترمہ اپنی گرفتاری پر خوش تھیں۔

پندرہ اور پچیس کے نوٹوں کو میں نے اپنی مٹھی میں دبا کر اب ان دونوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ سب سے آگے میں۔ میرے پیچھے بھائی جان اور دولہن بھابی ساتھ ساتھ۔ اور ان دونوں کے پیچھے دو قلی سامان لئے ہوئے گیٹ کی طرف چلے۔ باہر بھائی جان کا بوک کار کھڑا تھا۔ اگلی سیٹوں پر بھائی جان اور دولہن بھابی۔ پچھلی سیٹوں پر میں، شوفر اور سامان۔ بھائی جان نے ایک عجیب انداز سے اسٹرنگ پہ ہاتھ رکھکر کار کو اسٹارٹ کیا۔ اور کار فراٹے بھرنے لگی۔

صبح کو میں ہنستا ہوا بھائی جان کے کمرہ میں گیا۔ دولہن بھابی خوابیدہ حالت میں نڈھال اپنے موٹے موٹے تکیوں پر سر ڈالے پڑی تھیں۔ بھائی جان باتھ روم میں تھے۔

میں نے بھابی سے کہا۔ "مجھے بے شرمی کی صرف ایک داستان سنا دیجئے۔ کیونکہ آپ اپنی سسرال میں آئی ہوئی ہیں۔"

کہنے لگیں "یہ تو تم کہتے ہو کہ سسرال میں آنے والا ہر شخص بے شرم ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی دلیل بھی موجود ہے۔ جتنی بے شرم آپ یہاں آکر ہوئی ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ بے شرم بھائی جان آپ کے یہاں جاکر ہو جاتے ہیں۔

اتنے میں بھائی جان باتھ روم سے نکل آئے اور انہوں نے میری گردن میں ہاتھ دیکر مجھے کمرہ سے باہر کر دیا۔

بہت دن گذر گئے جب بھائی جان اور دولہن بھابی کی زندگی کا یہ ایک مختصر سا ابتدائی خاکہ تھا۔ مگر اب تو یہ واقعات اتنے فرسودہ ہو چکے ہیں کہ ان کے دہرانے میں کوئی لطف نہیں۔ بھائی جان کی شادی کے بعد ونود بھائی اس طرح لاپتہ ہوئے جیسے کسی ہیبت ناک زلزلہ کے بعد بہت سی عالیشان عمارتیں اپنا نام و نشان تک نہیں چھوڑتیں۔ یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ انہوں نے کن حسرتوں کے ساتھ سب کو چھوڑا۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ پُر اسرار طریقہ پر کہیں پوشیدہ ہیں۔ اور کچھ یہ سمجھتے تھے کہ اب ان کا اس دنیا میں وجود ہی نہیں البتہ دولہن بھابی کا ان کی بابت کیا خیال تھا؟ یہ آج تک کسی کو نہ معلوم ہو سکا

پھر ایک دن شام کو جیسے ہی چراغوں میں بتی پڑی۔ اور چڑیاں اپنے بسیروں کی طرف جانے لگیں، ونود بھائی شراب کی بوتلیں بغل میں دبائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ اتنے عرصہ میں ونود بھائی کا سارا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ سر کے بال تمام سفید ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اور ان کے سرخ سرخ ڈوروں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ شراب پینا ہی اب ان کی زندگی کا تنہا مقصد ہے۔

جس وقت یہ گھر میں داخل ہوئے تو پہلی نظر میں ان کو کسی نے نہیں پہچانا۔ شاید خود دولہن بھابی نے بھی نہیں۔ مگر شکل و صورت کہیں چھپتی ہے۔ پھر فوراً ہی سب پہچان گئے۔ وہ آتے ہی بستر پر لیٹ گئے۔ کھانسی کی انتہا اور شدت سے پتہ چلتا تھا کہ کسی مہلک مرض میں گرفتار ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد انہیں ایک خون کی قے ہوئی۔ اور اس کے بعد پھر جو کھانسی کا دورہ پڑا تو دم توڑنے لگے۔

دولہن بھابی خاموشی کے ساتھ سرہانے بیٹھی تھیں۔ کبھی یہ ونود بھائی کی تھیں اور ونود بھائی ان کے۔ شاید یہی بتانے کے لئے آج ونود بھائی گھر میں آگئے۔ دو چار اکھڑی اکھڑی سانسوں کے بعد ونود بھائی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ خاموش وہ زندگی میں بھی تھے۔ مردہ جسم کو نہلاتے وقت لوگوں نے ان کی انگلی سے ایک انگوٹھی اتاری۔ جس کے نگ پر دولہن بھابی کا نام لکھا تھا "شکنتلا"۔ سب نے اس نام کو پڑھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولے۔ اور آج ونود بھائی کی ہڈیوں کے ساتھ یہ راز بھی ہمیشہ کے لئے انہیں کی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے۔

~~~~~ :(·:·): ~~~~~
~~~~~

سالگرہ کا تحفہ

(از محترمہ نجمہ انوار الحق بی اے)

میں نے کمال کو پہلی بار اپنی چچازاد بہن صبیحہ کے ہاں دیکھا۔ صبیحہ کے ننھے بچے کی سالگرہ کی دعوت پر وہ بھی آیا ہوا تھا۔ میں حسب معمول اُس دن بھی ڈنر پر دیر میں پہنچی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میں نے کوشش کی کہ کسی طرح نظریں بچا کر چپکے سے کسی صوفے پر بیٹھ جاؤں۔ تاکہ صبیحہ کو میرے اتنی دیر میں آنے کا علم نہ ہو سکے۔ مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے صبیحہ ایک ممبئی سٹول پر بیٹھی ایک صاحب سے باتوں میں مشغول تھی۔ میں جلدی سے وہاں سے کھسکنے کو تھی کہ اُن صاحب نے مجھے دیکھ لیا اور جھک کر چپکے سے صبیحہ سے کچھ کہا صبیحہ نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور سٹول سے اُٹھتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولی۔

"آئیے بیگم صاحبہ۔ آپ تو خوب وقت پر تشریف لائیں تمہیں وقت کا اس قدر پابند دیکھکر تو بعض دفعہ مجھے واقعی تم پر رشک ہوتا ہے۔"

میں کھسیانی ہو کر ہنسنے لگی۔

"بات یہ ہوئی صبیحہ پیاری! کہ آج میرا کتا شوکت کی بائیکل کے نیچے آ گیا۔ اور میں اُسے لیکر ہسپتال ......"

"چھوڑو ان فضول بہانوں کو۔ آؤ تمہیں کمال صاحب سے ملاؤں۔" صبیحہ میری بات کاٹ کر مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے اُنہیں صاحب کے پاس لے گئی جن سے چند لمحہ پیشتر وہ باتیں کر رہی تھی۔

"یہ کمال صاحب ہیں۔ آپ آج کل دہلی سے تبدیل ہو کر یہاں آئے ہیں...... اور یہ مارینہ بیگم ہیں (مسکرا کر) ہمارے کالج میں ٹینس کی بہترین کھلاڑی ہیں۔" صبیحہ نے ہمارا تعارف کرایا۔

"اوہ...... کمال صاحب نے ایک لمبی سی اوہ کی اور کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اُن کے ہونٹوں کے کونے میں ایک بھورے رنگ کا پائپ بغیر کسی سہارے کے لٹک رہا تھا۔ پھر ایک ہاتھ سے اپنا پائپ تھام کر مجھے خمار آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"مزاج شریف؟"

"شکریہ!"

صبیحہ مجھے اُن کے پاس والی کرسی پر بٹھا کر خود کسی کام کے لئے باہر چلی گئی۔

"آپ سے ملکر دلی مسرت ہوئی ہے۔" تھوڑی دیر بعد کمال صاحب نے کہا۔ اُن کے چہرے پر کچھ شرارت سی ٹپک رہی تھی۔ میں جھینپ سی گئی۔ نہ معلوم کیوں۔

اب کمال صاحب بالکل خاموش ہو کر مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ میں شرما کر قالین کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے بھی ٹینس کھیلنے کا بہت شوق ہے۔" وہ تھوڑی دیر بعد ایک خاص انداز سے بولے

"اوہ...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے گھبراہٹ سے کہا۔

"کیوں؟...... اچھی بات کیوں ہے؟" اُنہوں نے کرسی کا سہارا لیتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں آہستہ سے سوال کیا۔ اب اس بات کا میں کیا جواب دیتی۔ میرا چہرہ شرم سے سُرخ ہونے لگا۔ اور وہ میری پریشانی محسوس کر کے مُسکرانے لگے۔

تھوڑے عرصہ پھر خاموشی رہی۔ مجھے اب اُن کے پاس بیٹھنے سے اُلجھن سی ہونے لگی۔ اور میں وہاں سے کھسکنے کا کوئی طریقہ سوچتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"آپ شاید اپنے کسی دوست کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" کمال صاحب بھی متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں! مجھے معاف فرمائیے......" میں کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

"شوق سے جا سکتی ہیں آپ......" اُنہوں نے بے پرواہی سے کہا اور کرسی کا سہارا لگا کر پائپ کے لمبے لمبے کش لینے لگے۔ میں تیزی سے اُٹھ کر پرفلت کے پاس جا بیٹھی

"ملی ہو کمال سے...... اچھے آدمی ہیں؟" پرفلت اپنے بائیں ہاتھ کی چوڑیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"بڑے جانگلو ہیں۔" میرے مُنہ سے ایک دم غیر ارادی طور پر آدھی آواز میں نکل گیا۔ اور اُسے غالباً کمال صاحب نے بھی سُن لیا۔ کیونکہ اُنہوں نے عین اسی وقت پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اور مسکرا دیئے۔ میں شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

کھانے کی میز پر وہ میرے عین سامنے بیٹھے تھے۔ دوسرے لوگوں سے وہ بظاہر بہت خوش اخلاقی اور زندہ دلی سے باتیں کر رہے تھے۔ نہ معلوم وہ مجھ سے کیوں اس قدر عجیب و غریب طریقے سے پیش آ رہے تھے۔ اب بھی وہ کسی وقت مجھے طنزیہ چھا جانے والی نظروں سے دیکھکر مسکرا دیتے تھے۔ خیر! مجھے تو ان سے نفرت سی ہو گئی۔ عجیب انسان ہے اسے آداب ملاقات بھی نہیں آتے۔ کھانے کے بعد جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ایک طرف میز لگائے پر فلت، کمال اور نصرتی۔ مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تاش کے پتے سنوار رہے تھے۔ پر فلت مجھے دیکھکر چلائی۔

"برج کھیلو گی مارینہ۔ ادھر آؤ۔ کمال صاحب کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔"

میں کچھ جھجکتی ہوئی میز کی طرف بڑھی۔ مگر کمال مجھے دیکھتے ہی کرسی سے تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ اور آگے بڑھکر ملازم سے ایک کونی کی پیالی لیتے ہوئے بولے۔

"معاف کیجئے میں تو اس وقت تھوڑی سی کونی پیوں گا۔ اور میں تو بالکل جانگلو سا ہوں۔ برج اچھی طرح نہیں کھیل سکتا۔ یہ بدنصیر صاحب انکے ساتھی بنیں گے۔"

یہ سنکر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے واقعی مجھے جانگلو کہتے سن لیا تھا۔ میں بہت بے دلی سے تاش کھیلنے لگی۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ نہ معلوم آج صبح کس کا منہ دیکھکر اٹھی تھی۔ جو ایسے شخص سے پالا پڑ گیا۔

رات تقریباً ساڑھے دس بجے میں گھر پہنچی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ آتے ہی بغیر لباس تبدیل کئے اپنے بستر پر گر کر ایسی گہری نیند سوئی کہ صبح جب آنکھ کھلی تو دھوپ کمرے میں لہریں مار رہی تھی۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے نیم باز آنکھوں سے ملازمہ کو دیکھتے ہوئے سستی سے کہا۔

"ساڑھے نو بج گئے ہیں۔" ملازمہ میز لحاف اٹھاتے ہوئے بولی۔

میں اپنے دونوں بازو تکئے پر پھیلا کر رات کے واقعات کے متعلق سوچنے لگی۔ کمال کو میرا جانگلو کہنا اور اس کا سن لینا یہ یاد آتے ہی مجھے پھر شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے ایک جھٹکے سے لحاف کو پائینتی کی طرف پھینکا اور پھر دریچے میں کھڑے ہو کر سمندر کی نیلی نیلی موجوں کو دیکھنے لگی۔ سمندر کے ساحل پر ننھے ننھے صاف ستھرے بچے اپنی ملازمہ عورتوں کی نگرانی میں کھیلتے ہوئے بہت اچھے معلوم ہو رہے تھے۔

غسل سے واپس آکر ابھی میں اچھی طرح لباس بھی تبدیل کرنے نہ پائی تھی کہ ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ نیچے کوئی صاحب شوکت صاحب سے ملنے آئے ہیں

"تو شوکت کو جاکر اطلاع دو۔ مجھ سے کیا کہتی ہو۔" میں نے تنک کر کہا۔

"شوکت صاحب ابھی سواری سے واپس نہیں آئے۔"

"تو جاکر بیگم صاحب یا اباجان کو خبر کر دو۔ اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔"

"صاحب غسل کر رہے ہیں۔ اور بیگم صاحبہ اس وقت مصروف ہیں۔ اور فرماتی ہیں کہ آپ ان سے مل لیجئے۔"

"اچھا تم نیچے انہیں بٹھاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

میں جلدی سے اپنے بالوں کو لپیٹ کر اوپر چڑھاتے ہوئے بولی۔

چند لمحوں میں میں تیار ہو کر نیچے پہنچ گئی۔ ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھاتے ہی میں حیران رہ گئی۔ صوفے پر کمال صاحب بہت بے تکلفی سے آنکھیں میچے بیٹھے تھے۔ ہونٹوں کے کونے میں وہی مجھو... جب ...سی سہارے کے لٹک رہا تھا۔

"آپ ...." ...میرے منہ سے کمال کا کمال رہ گیا۔

"اوہ ...." کمال نے پھر ایک لمبی سی اوہ کی اور کرسی سے اٹھکر مسکراتے ہوئے بولے "تو یہاں بھی آپ تشریف رکھتی ہیں۔"

میں جل کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ شوکت سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"خیال تو ایسا ہی ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"وہ تو سواری کے لئے گئے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔"

"کب تک واپس آئیں گے؟" اور انہوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"غالباً ابھی پانچ دس منٹ میں آ جائیں گے۔ اس وقت تک تو وہ عموماً آ ہی جایا کرتے ہیں۔" میں نے کچھ مضطرب انداز میں جواب دیا۔

"اجازت ہو تو انتظار کر لوں۔"

"شوق سے۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ میں اس سنگین خاموشی سے گھبرا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔ کمال صاحب کمرے میں ایک شاہانہ انداز سے ٹہلتے ہوئے ایک تصویر کے پاس جاکر کھڑے ہو گئے۔

"خوب! اچھی پینٹنگ ہے۔"

"یہ میں نے پینٹ کی ہے۔" میں نے خوش ہو کر فخریہ لہجہ میں کہا۔

"خوب! تو یہ آپ کے ہاتھوں کا کھیل ہے۔" کمال نے بشاشت سے کھڑے ہوتے ہوئے بے پروائی سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر دریچے سے باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ اُن کے سیاہ بالوں کو نوچ لوں۔ مگر کڑھ کر رہ گئی۔

"آپ ناشتہ کریں گے؟"

"میں ناشتہ عموماً صبح آٹھ بجے کیا کرتا ہوں اور اب تو غالباً دس بجے ہیں۔" کمال نے شوخی سے جواب دیا۔ میں شرمندہ سی ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد میں خاموشی سے اُکتا کر بولی: "آپ یہاں کس جگہ قیام فرما ہیں؟"

"اپنے گھر میں۔" اُنہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں تو اُن کی ان بے سروپا باتوں سے سخت پریشان ہو گئی۔

اچانک گھوڑے کی ٹاپوں اور گھنٹی کے بجنے کی آواز سنائی دی۔

"لیجئے شوکت آ گیا۔" یہ کہہ کر میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ چند ہی لمحوں میں شوکت اندر آ گیا۔

"اوہ ہیلو ..... کمال" شوکت کمال کو دیکھ کر چلایا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ میں ہونٹ کاٹتی ہوئی ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ملنے سے فارغ ہو کر شوکت نے میری طرف دیکھا اور پھر چیخ کر بولا۔

"ارے کمال تم مارینہ سے نہیں ملے (مجھے کھینچ کر بازو میں لیتے ہوئے) یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ یاد ہے زمانۂ طالب علمی میں تم ایک دفعہ اپنے سکول کے بورڈنگ ہاؤس سے ہمارے ہاں آئے تھے۔ تو ایک روز تمہاری غیر حاضری میں یہ شریر بچی تمہاری میز کی دراز سے تمہاری چوکلیٹ نکال کر کھا گئی تھی۔"

"اوہو ..... تو یہ وہ صاحبہ ہیں (آہستہ سے) میں تو انہیں رات کو ہی پہچان گیا تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اور پھر اپنا ہاتھ ملانے کیلئے آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

"کہئے کیسے مزاج ہیں؟"

میں نے بے دلی سے ان سے ہاتھ ملا کر "شکریہ" کہہ دیا۔

اب مجھے یاد آ گیا کہ یہ حضرت شوکت بھائی کے بہت پرانے اور نہایت عزیز دوست ہیں۔ اب قریباً تین سال بعد شوکت کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

"بھئی شوکت! ناشتہ تو کرا دو۔ صبح صرف ایک چائے کی پیالی پی کر سیدھا تمہاری ہی طرف آ رہا ہوں۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ مجھے تو رات مارینہ بیگم کو دیکھ کر معلوم ہوا تھا کہ تم لوگ یہاں ہو۔" کمال نے میری طرف دیکھ کر شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ نہ معلوم انہیں مجھ سے دشمنی بغیر کسی وجہ کے کیوں ہو گئی تھی۔ لیکن یہاں کسے پروا تھی۔

شوکت نے ملازم سے کہا کہ ہم سب کے لئے وہیں ناشتہ لے آئے۔

ناشتے پر امی بھی آ گئیں۔ کمال کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ کمال بھی ان سے بہت ادب اور شائستگی سے پیش آئے۔ مجھے دیکھ کر امی سے کہنے لگے۔

"آپ کی صاحبزادی سے رات صبیحہ کے ہاں ڈنر پر ملاقات ہوئی تھی۔ ماشاءاللہ بہت ہونہار بچی معلوم ہوتی ہیں۔"

امی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں میں غصہ اور بے پروائی سے چھت کو دیکھنے لگی۔

"ارے تمہارے منہ پر یہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" شوکت مجھے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا۔ "صبح کہیں امی سے پٹیں تو نہیں۔"

"مجھے نہ چھیڑو شوکت۔ میں رو پڑوں گی۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"کھی۔ کھی۔ کھی" شوکت اور کمال ہنسنے لگے۔

"دیکھو میری جان! اتنی جلد ناراض نہیں ہوا کرتے۔" امی نرمی سے شفقت بھرے لہجہ میں بولیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جنہیں میں پی گئی اور جو یقینی طور پر کمال نے بھی دیکھ لئے۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے پھر مجھے کوئی دل آزار بات نہ کہی۔

کمال سے ملاقات ہوئے قریباً تین ماہ ہو چکے تھے۔ مگر میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ مجھ سے کیوں اس قدر ناگوار طریقے سے پیش آتا ہے۔ اور اب تو مجھے اُس سے دلی نفرت ہو گئی تھی۔

آج شام کمال نے مجھے اور شوکت کو چائے پر بلا رکھا تھا۔ شوکت کے اصرار پر میں بھی بادل ناخواستہ کمال کے ہاں گئی۔ جب ہم اُن کے ہاں پہنچے تو وہ بہت انہماک سے ایک دبلی پتلی زرد سی لڑکی سے باتوں میں مشغول تھے۔ میں نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لڑکی کیا تھی۔ اچھی خاصی دق کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔ ہاں اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں واقعی کچھ دلکشی سی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ میں کمال صاحب سے مل کر رفعت اور پرویز کے پاس جا بیٹھی۔ کمال صاحب نے سوکھا سا منہ بنا کر مجھے دیکھا اور پھر اُسی دبلی پتلی زرد زرد نیلی آنکھوں والی لڑکی کے پاس جا بیٹھے اور مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے ہنس ہنس کر اُس سے باتیں کرنے لگے۔ پھر میرے پاس کمال بمشکل دو یا تین منٹ بیٹھے۔ اور پھر بھاگ کر اُسی لڑکی کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کی یہ خواہش معلوم ہوتی تھی کہ میں بھی اُنہیں دیکھتی رہوں۔ — کمال

ساحرہ بیگم مسکراتے ہوئے بہت مغرورانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ یقیناً وہ میرے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔ مجھے تو اب وہ لڑکی بھی بہت بری معلوم ہو رہی تھی۔ چائے کے بعد وہ لڑکی اور کمال دونوں میری طرف اُٹھ کر آئے۔ میں جلدی سے اُٹھ کر کونے میں رکھی ہوئی میز پر ایک تصویر کو دیکھنے لگی۔

"معاف کیجئے گا ۔ ۔ ۔ ۔" کمال نے میری پشت پر آ کر کہا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ "اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"میں آپ کو ان سے ملانا چاہتا ہوں (لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ساحرہ بیگم ہیں ۔۔۔۔ اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "یہ مارینہ بیگم ہیں (مسکرا کر) آپ ٹینس بہت اچھا کھیلتی ہیں۔"

"آداب عرض ۔" میں نے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی کی طرف لے جاتے ہوئے ساحرہ بیگم سے کہا۔

اُنہوں نے مسکرا کر اپنا ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھا دیا۔ میں نے بھی جھینپتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

ساحرہ بیگم کو میرے حوالے کر کے کمال شوکت اور تبسم کے پاس جا بیٹھے۔

مجھے تو یہ ساحرہ ذرا بھی پسند نہ آئی۔ اپنے آپ کو اور لوگوں پر بہت اہمیت دینے کی کوشش کرتی تھی۔ کبھی اپنے جوڑے میں لگے ہوئے پھولوں کو درست کرتی۔ کبھی ساڑھی کے پلو کو اِدھر اُدھر کرتی اور کبھی اپنے پالش کئے ہوئے ناخنوں کی رنگت کو غور سے دیکھنے لگتی۔ اور ایک دفعہ تو اُس نے اپنے بیگ سے آئینہ نکال کر اپنی ناک پر پاؤڈر بھی لگایا۔ اب کمال صاحب نے ساحرہ سے پیانو بجانے کی درخواست کی۔ ساحرہ نے مسکرا کر انکار اور کمال صاحب نے گڑگڑا کر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دل میں ضرور چاہتی تھی کہ پیانو بجائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر پیانو کے سٹول پر جا بیٹھی۔ کمال بھی اس کی پشت پر جا کر کھڑے ہوئے۔ کمرہ پیانو کے سُریلے سُروں سے گونج اُٹھا۔ کمال بظاہر بہت اشتیاق سے ساحرہ کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور کبھی کبھی پلٹ کر مجھے بھی دیکھ لیتے تھے۔

رفتہ رفتہ سب مہمان رخصت ہو گئے مگر شوکت اُٹھنے کا نام بھی نہ لیتا تھا میں نے ایک دفعہ سب کی نظریں بچا کر شوکت کو اُٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔ جو شوکت نے تو نہیں بلکہ کمال صاحب نے دیکھ لیا اور قہقہہ لگا کر بولے۔

"واللہ بعض انسانوں کو بندروں کی طرح مُنہ بنانے میں کس قدر مہارت ہوتی ہے۔"

"اُف! خدایا کس قدر بدتمیز شخص تھا۔ اتنے سخت الفاظ کتنی بے تکلفی سے کہہ دیئے۔ میں نے جل کر دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ سے اس گستاخ سے ہرگز نہ ملوں گی۔

اب ڈرائنگ روم میں صرف کمال، شوکت اور میں رہ گئے۔

"ساحرہ سے ملے ہو نا شوکت؟" کمال آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے پائپ کا ایک لمبا سا کش لگا کر بولے۔

"ہاں ملا ہوں۔" شوکت نے آتشدان کے اوپر رکھی ہوئی ایک پہاڑوں کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ میری ہونے والی منگیتر ہے۔" کمال نے یہ کہہ کر اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ گویا یہ فقرہ کہہ کر وہ میرے محسوسات کا جائزہ میرے چہرے سے لینا چاہتے ہیں۔ میں نے شیلف پر پڑی ہوئی ایک کتاب اُٹھائی اور بے پروائی سے تصویریں دیکھنے لگی۔ کمال صاحب نے رُوٹھا ہوا مُنہ بنا کر مجھے دیکھا۔ میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ شوکت نے غالباً یہ فقرہ نہ سنا۔ کیونکہ وہ اسی طرح آتشدان کے پاس کھڑا اُس تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا۔

کچھ عرصہ بعد کمال صاحب نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ ہمیں پیانو نہ سنائیں گی؟"

"میں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" میں نے کتاب پر نظریں اُٹھا کر چونک کر کہا۔

"جی ہاں! جہاں تک میرا خیال ہے۔ میں نے آپ سے ہی کہا ہے۔"

"جی نہیں۔ میں اس وقت نہیں بجا سکتی۔"

"تو آپ کے بجانے کا کون سا وقت ہوتا ہے؟"

یہ سُنکر شوکت ہنس پڑا اور کمال سنجیدگی سے میرے جواب کا منتظر ہی رہ گیا۔ میں چپ رہی۔

"اس لئے نہیں بجا سکتی کہ بہت دیر ہو گئی ہے اور اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ امی منتظر ہوں گی۔ دیر سے پہنچنے پر وہ گھبرا جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شوکت اور کمال مسکرانے لگے۔ اس کے بعد کمال کو خدا حافظ کہنے کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

آج میری سالگرہ کا دن تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ نیچے امی دعوت کے اہتمام میں مصروف تھیں۔ اُوپر میں اپنے کمرے میں قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک خادمہ اور میری بہن کی سہیلی مجھے تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ صبح سے مجھے سالگرہ کے بے شمار تحفے وصول ہو رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے ابھی میں نے دیکھے ہی نہ تھے۔ اور وہ نیچے ڈرائنگ روم میں امی نے میز پر سجائے تھے۔ میں نے اپنے بالوں پر کنگھی، لیونڈر کی پھوار چھڑکتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔

"کمال بھی کوئی تحفہ لائے گا۔ لیکن مجھے تو تجھ سے اس قدر دشمنی ہے کہ شاید ہی کوئی تحفہ لائے۔ ساحرہ بھی تو آرہی ہے۔ نہ معلوم وہ کیا لائیگی۔ خیر مجھے کمال کے تحفے کی کیا پرواہ ہے۔ نہ ہی لائے تو اچھا ہے۔"

میری سعدیہ نے ایک بڑا سا گلاب کا سفید پھول میرے بالوں میں لگا دیا۔ جوشِ محبت سے اسکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے بھی اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اُسے پیار کیا۔

"جلدی نیچے آؤ نازیہ۔ تمہاری سہیلیاں آگئی ہیں۔" نیچے سے ابا جان نے مجھے بلایا۔

"ابھی آئی۔" میں نے جھٹ آئینے میں اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ اور پھر بھاگتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

رفتہ رفتہ سب مہمان آگئے۔ چند لڑکیاں میز کے پاس کھڑی میرے تحفوں کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ لوگ امی اور ابا جان سے باتوں میں مشغول تھے۔ امی اور ابا جان کے چہروں پر ایک محبت آمیز مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ بجنے لگا مگر کمال صاحب ابھی تک تشریف نہ لائے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اب وہ نہ آئیں گے۔ ہم سب اُٹھ کر کھانے کے کمرے میں جانے ہی لگے تھے کہ اچانک باہر کار کے ہارن کی آواز آئی۔ اور تھوڑی دیر بعد کمال صاحب جھینگی سی بنے ایک پیکٹ بغل میں دبائے اندر داخل ہوئے۔

"اوہ ہیلو مسٹر کمال ....." میز کے پاس کھڑی ہوئی لڑکیوں نے کمال کو دیکھ کر صبح کی چڑیوں کی طرح چہچہانا شروع کر دیا۔ کمال صاحب سیدھے میری جانب آئے۔

"خدا کرے ایسے ہزاروں پُرمسرت دن اور آئیں۔" کمال نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اور پھر پیکٹ میرے ہاتھ میں دے کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے ساحرہ بیگم کے پاس جا بیٹھے۔ میں نے پیکٹ کھولنا شروع کیا۔ میری سہیلیاں منہ اُٹھا کر میرے اُوپر جھک گئیں اور تحفے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ پیکٹ میں سے ایک بڑا سا ڈبّہ نکلا۔ ڈبّا کھولنے پر اس میں سے ایک اور ڈبّا نکلا۔ اس کے بعد ایک اور ڈبّا نکلا۔ سب ہنسنے لگے۔ پھر ایک اور ڈبّا نکلا اور آخیر میں ایک ڈبّے میں سے ایک سرخ گلاب کا کھلا ہوا پھول نکلا۔ میں نے وہ پھول اُٹھا کر ناک سے لگاتے ہوئے بہت ممنون نگاہوں سے کمال کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ساحرہ نے اپنی دلکش نیلی آنکھیں اُوپر اُٹھاتے ہوئے پہلے مجھے، اور پھر کمال کو خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ میں سہم گئی۔ مگر کمال ساحرہ کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

مجھے سب سے زیادہ کمال کا تحفہ پسند آیا۔ نہ معلوم کیوں۔ میں نے وہ سرخ گلاب کا پھول اپنے بالوں میں لگا لیا۔ کمال صاحب پھول کو میرے بالوں میں لگا ہوا دیکھ کر چونک پڑے۔ اور پھر مضطرب نگاہوں سے دریچے سے باہر دیکھنے لگے۔

کھانے کی میز پر کمال میرے ساتھ بیٹھے اور ہنس ہنس کر بہت خوشگوار باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے آج وہ بہت اچھی طرح پیش آرہے تھے۔ ساحرہ ہمیں کبھی کبھی قہر آلود نگاہوں سے گھور لیتی تھی۔ مجھے کمال کی اس تبدیلی مزاج پر بہت مسرت ہوئی اور میں نے سوچا کہ اگر یہ شخص ہمیشہ اسی طرح باتیں کیا کرے تو بُرا آدمی نہیں۔

کھانے کے بعد ساڑھے تین بجے تک ہم کٹ تھروٹ کھیلتے رہے۔ ساحرہ ہم میں شامل نہ ہوئی۔ بلکہ الگ ایک طرف بیٹھی بظاہر ایک کتاب پڑھتی رہی۔ باہر ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا کچھ مہمان چلے گئے۔ جو باقی رہ گئے اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ ٹینس کھیلا جائے۔

ٹینس میں ایک طرف پروینہ اور میں ہوئے۔ دوسری طرف ساحرہ اور کمال۔ کمال واقعی بہت اچھی ٹینس کھیلتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد نہ معلوم اُنہیں کیا ہوا۔ وہی اپنی پُرانی روش پہ اُتر آئے۔ اور مجھے غصہ دلانے والی حرکات کرنے لگے۔ مجھے بہت اُلجھن سی ہونے لگی۔ ایک سیٹ کھیلنے کے بعد ہم جالی کے قریب کھڑے ہوکر سانس لینے لگے کہ اچانک کمال صاحب نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگے۔

"آپ کا بیک ہینڈ تو بہت اچھا ہے۔"

میں ابھی "شکریہ" بھی نہ کہنے پائی تھی کہ وہ پھر بولے۔

"لیکن اگر گیند اللہ میاں کی طرف پھینکنے کی بجائے میری طرف پھینکا کیجئے تو زیادہ عنایت ہو۔"

شوکت نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ساحرہ بھی فخریہ انداز میں ہنسنے لگی۔ مجھے تو شرمندگی سے رونا آگیا۔ دل چاہا کہ ٹینس کا ریکٹ اُٹھا کر کمال کے مُنہ پہ دے ماروں۔ مگر خاموش ہو کر رہ گئی۔ محض خوش اخلاقی قائم رکھنے کے لئے میں نے ٹینس کھیلنا جاری رکھا۔ اور بہت خاموشی سے کھیلتی رہی۔ ورنہ اب کھیلنے کو مطلق دل نہ چاہتا تھا۔ کمال نے بھی میری رنجیدگی کو محسوس کیا۔ کیونکہ وہ بھی اب بالکل خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد سب مہمان رخصت ہو گئے۔ صرف کمال بیٹھے رہے۔ میں کمال اور شوکت سے دردِ سر کا بہانہ کرکے اُوپر اپنے کمرہ میں آگئی۔ اور

سوئے پلیٹ کر کمال کے نامناسب مذاق کے متعلق سوچنے لگی۔ عجیب پُراسرار شخص تھا۔ میں تو شاید تمام عمر بھی اُسے نہ سمجھ سکوں۔ میں نے وہ سُرخ گلاب کا پھول اپنے بالوں سے اُتار کر غصہ سے نیچے پھینک دیا۔ اور پھر دریچے کے قریب کھڑے ہو کر یاسمین کے پھول اپنے بالوں میں سے اُتارنے لگی۔

کسی نے دروازے پر ہلکے سے دستک دی۔

"آجاؤ"

پردہ اُٹھا اور کمال اندر داخل ہوئے۔ اور پھر نہایت بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ ہونٹوں کے کونے میں وہی بھورے رنگ کا پائپ لٹک رہا تھا۔ مُسکرا کر بولے۔

"اب آپ کے دردِ سر کا کیا حال ہے؟"

میں بے پروائی سے باہر سمندر کو دیکھنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو مارینہ!"

میں اُن کی بے تکلفی دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"کس بات کی معافی؟" میں نے بے رُخی سے کہا۔

"شام کو جو میں نے تمہیں ٹینس کھیلتے ہوئے کچھ کہا تھا وہ شاید نامناسب مذاق تھا۔"

"تو گویا آپ کو ابھی شک ہے کہ وہ نامناسب تھا۔"

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔"

"شکریہ۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ نہ معلوم وہ اِس قدر بے تکلفانہ الفاظ کیوں استعمال کر رہے تھے۔

پھر وہ اُٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ پھر مضطربانہ انداز سے اپنی گردن کو گھماتے ہوئے کہنے لگے۔

"مجھے تم سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔"

"فرمائیے!"

"بات یہ ہے ......" وہ گھبرا کر چھت کو دیکھتے ہوئے بولے مجھے تم سے یہ کہنا تھا کہ ...... کہ ہاں یاد آیا تم مجھے بہت پسند ہو۔"

مجھے اُن کے اس انداز پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ بھی ہنسنے لگے اُس وقت وہ اتنی بے تکلفی سے ہنستے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ پھر وہ میرے قریب آکر کہنے لگے۔

"میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنانا چاہتا ہوں۔"

میں چونک اُٹھی۔ یاسمین کے پھول میرے ہاتھ سے نیچے گر گئے۔

میں نے حیرت زدہ نظروں سے کمال کو دیکھا۔ وہ مُسکرا رہا تھا۔ میں شرما کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔ کمال نے جھک کر وہ پھول اُٹھا لئے اور پھر نیچے سے سُرخ گلاب کا پھول بھی اُٹھا کر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ کیوں نیچے پھینک دیا تھا — ؟ یہ تو بہت قیمتی تحفہ ہے۔"

میں نے آہستہ سے وہ پھول اُن کے ہاتھ سے لے لئے۔ اور پھر ہم دونوں سمندر کی زور شور سے اُوپر اُٹھتی ہوئی موجوں کو دیکھنے لگے۔ دُور سمندر میں سُورج غروب ہو رہا تھا۔ اُفق کی سُرخیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اور اُن کے عکس سے سمندر کا پانی جگمگا رہا تھا۔ نیلی نیلی لہروں کے اُوپر ننھے ننھے پرندے اُڑ رہے تھے۔ کچھ بچے ساحلِ سمندر پر ریت سے کھیل رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں سمندر کی موجوں کے اُوپر ہچکولے کھا رہی تھیں۔ بادلوں کے چند سفید ٹکڑے فضا میں تیرنے لگے۔ دُور کہیں سے ماہی گیروں کے دلنشیں گیتوں کی آواز آئی۔ اور فضاؤں پر ایک صہبا اثر خاموشی مسرت چھا گئی۔

"کتنی حسین شام ہے۔" میں نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔

"اور کتنی مُبارک" کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

زُلف

(از محترمہ سیدہ اختر حیدرآبادی)

تقدیرِ محبت کی سیاہی ہے کہ زُلف!

یہ کالی گھٹا جھوم کے چھائی ہے کہ زُلف

اللہ ترے دوش کی زینت رکھے!!

"خیام" کی پُرکیف رُباعی ہے کہ زُلف

افسانہ

واپسی

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

"فریدہ بجو! —— ادھر تو سنو تم سے کام ہے۔" رشید نے آہستہ سے کہا اور کمرہ کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کی بہن بھی کتنی سیدھی ہے۔ اتنی بڑی ہوگئی مگر پھر بھی میرے اوپر جان چھڑکتی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ آڑے وقت پر بس یہی تو کام آتی ہے۔ سچ ہے بہن کی محبت کتنی بے لوث ہوتی ہے۔ جب روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو میرا آخری سہارا یہی ہے۔ رشید نے مسکراتے ہوئے فریدہ کی طرف دیکھا جو ابھی تک کپڑے سینے میں بدستور مشغول تھی۔ شاید اس نے سنا نہیں۔ اپنے بیاہ کے کپڑوں سے کتنی دلچسپی لے رہی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس کے اپنے ہی کپڑے ہیں۔ دو مہینے بعد اسکی شادی ہوجائیگی۔ مگر پھر تو بڑی مشکل ہوگی۔ مہینے کے آخر دنوں میں کیا ہوگا۔ آخر یہ پانچ چھ روپے کتنے دن چلیں گے۔ اتنے دن سے کہتا ہوں مگر ابا سے یہ نہیں ہوتا کہ چار روپے اور بڑھا دیں۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہر چیز مہنگی ہوگئی۔ مہنگائی کا بھتہ سب کا بڑھ گیا ہے مگر ہمارے روپے وہیں کے وہیں۔ ایک دھیلا نہیں بڑھتا اور اس پر طرہ یہ کہ اگر بس چلے تو اس میں سے بھی کٹ جائے۔ وہ تو کہو ہمیں موقع نہیں دیتا۔ ورنہ یہ بوا بھلا کہیں ایک پیسہ بھی دیدیں۔

"فریدہ! —— اُس نے دوبارہ آواز دی۔ "بجو ذرا سننا تو کام ہے۔"

"سنتی نہیں بہری ہوگئی —— کتنی دیر سے بھیا بلا رہا ہے۔"

"آئی بھیا ——" اُس نے زور سے کہا۔ وہ تو بھائی کے تیور ہی دیکھکر سمجھ گئی تھی کہ ہو نہ ہو آج پھر بھیا کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ اچھی مصیبت ہے۔ آخر وہ بھی روز روز روپیہ کہاں سے لائے۔ پانچ روپے جو انہیں ملتے ہیں وہی مجھے بھی۔ آخر مجھے کونسا زیادہ مل جاتا ہے۔ بلکہ اس میں سے بھی کبھی کبھی کمی ہوجاتی ہے۔ یہ سوچتی ہوئی وہ اٹھی اور سامنے والے رشید کے کمرے میں چلی گئی۔

"میں سمجھ گئی۔ آج پھر عزت خطرے میں ہوگی، اب میرے پاس نہیں ہے دینے بھی آج۔ بس پانچ ہے میرے پاس جو کچھ تھا وہ ——"

"سنتی نہیں —— اپنی کہے جاتی ہے۔ اس شادی نے تو تیرا دماغ اور خراب کر رکھا ہے۔" رشید نے کچھ ہنس کر کہا۔ فریدہ نے سر جھکا لیا اس کے چہرہ پر ایک بناوٹی غصہ آیا۔

"اچھا دیکھئے پھر وہی مذاق۔ جو کام ہو، بتائیے۔ مجھے کپڑے سینے ہیں ورنہ پھر بوا بگڑینگی۔"

"یہ کپڑے بھی میرے لئے اچھی مصیبت ہو گئے۔ جب گھر میں آؤ کپڑے سل رہے ہیں اور وہ بھی معمولی نہیں بڑے قیمتی۔ بس بھرے تو ٹھاٹ ہیں۔ ابا اگلے ہفتے بمبئی جا رہے ہیں اور کچھ لاتے ہوں گے۔ جارجٹ کی ساڑیاں۔ بنارسی۔ دوپٹے۔ بس تو تو بیاہ کرکے اپنے گھر ٹھاٹ کریگی۔ ہمیں پڑے سڑیں گے۔"

"تو آپ بھی شادی کر لیجئے نا ——" فریدہ جل کے بولی

"ارے بجو! ہماری کون خبر لیتا ہے" رشید نے ایسا افسردہ منہ بنا کر کہا کہ فریدہ کو ہنسی آگئی۔

"میں جاتی ہوں۔ آپ تو بیکار باتیں کر رہے ہیں۔"

"ارے رے سنو تو —— تمہارا غصہ بڑا خراب ہے۔ اب جاؤ شادی بیاہ کی بات نہیں کرتے۔ کام کی بات کرینگے۔"

"ہائے اللہ۔ تو پھر کہئے نا —— آپ تو خواہ مخواہ کی بات کر رہے ہیں۔ مجھے کپڑے ——" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کو خیال آگیا کہ پھر کہیں نہ چھیڑنے لگیں۔

"ہاں کہو کیا کہہ رہی ہو —— کیسے کپڑے ——" رشید نے پھر چھیڑا۔

"اچھا بجو! —— شادی وادی کی بات نہیں ہوگی۔ بات یہ ہے کہ دراصل آج بڑا اچھا کھیل آیا ہوا ہے۔ یوں سمجھو کہ ایسی زبردست تعلیمی تصویر کبھی نہیں آئی۔ اب اس کا دیکھنا بھی کتنا ضروری ہے۔ لیکن پیسہ پاس نہیں۔ میرے روپے کتابوں میں ختم ہوگئے۔ اب تم ہی بتاؤ کیا کریں۔"

"تو کتابوں والے روپے بوا سے لیجئے نا —— وہ دینگی۔"

"اجی وہ نہیں دینگی۔ بیکار کہنا۔"

"ارے کہہ کے تو دیکھئے۔"

"پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ —— ارے بجو کہہ کے دیکھ لیا۔ تبھی تو تم سے جھک مار رہا ہوں۔ اگر بوا ایسی ہوتیں تو رونا کس بات کا تھا۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔ تم ہی بتاؤ کہ کہاں سے لاؤں۔ جتنا تمہیں ملتا ہے اتنا ہی مجھے۔ سوئیٹر میں تھوڑا سا اون کم پڑ گیا تھا۔ وہ میں نے منگا لیا۔ تمہیں بتاؤ کہ پانچ روپے کا اون اب لڑائی کے زمانہ میں کتنا مہنگا ہوگیا۔"

"بجّو یہ تو ٹھیک ہے مگر اب میں کیا کروں۔ احمد سے فخر سے کہہ آیا کہ آج تم کو سنیما دکھائیں گے۔ بعد میں خیال آیا کہ پیسے تو ہیں نہیں۔ پھر سوچا کہ ہماری فریدہ تو موجود ہے۔ بجّو جب تمہاری شادی ہو جائیگی تو بڑی مصیبت ہو جائیگی۔ پھر کہاں سے روپیہ لاؤں گا۔ تم سے تو اتنا سہارا ہے کہ آڑے وقت میں کام آجاتی ہو۔ ورنہ ابا تو ایک پیسہ نہ دیدیں۔" اس نے معنی خیز نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا۔ سمجھ گیا یہ حربہ کام آگیا۔

"بس کُل تین ہی روپیہ کی ضرورت ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

فریدہ چونک پڑی ——— "واہ دو آدمیوں میں تین روپیہ۔ خوب مجھے بیوقوف بناتے ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ——— میں اپنی چھوٹی سی بہن کو بیوقوف بناؤنگا جو دو مہینے کی اور مہمان ہے۔ دیکھو جب احمد کو لے جاؤنگا تو ضمیر کو بھی لے جانا ضروری ہے۔ ہم تینوں میں بات رکھی ہے۔ دیکھا نہیں ابھی پچھلے ہفتہ اس غریب نے میری کتنی زوردار دعوت کی تھی۔"

فریدہ لاجواب ہوگئی۔ آہستہ آہستہ اُس نے قدم بڑھائے۔ اور سوچنے لگی کہ تین روپے کے لئے بھیا کو ناراض کر دینا بڑی بُری بات ہے پھر پھر کبھی روز روز تھوڑا ہی یہاں آؤنگی۔ معلوم نہیں کہاں ہوں کہاں نہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے صندوق کے پاس پہنچ گئی ——— "اچھا آپ وہیں رہیئے۔" اُس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی میں تمہارے روپیہ تھوڑا ہی چھین لونگا۔ بڑی ہوشیار ہوتی جارہی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ستہیں بھائی کے روپیہ رکھے گی نا۔"

"پھر وہی مذاق ——— اچھا جائیے نہیں دیتی۔ لے لیجئے اب ایک پیسہ جو دوں۔"

"اچھا لاؤ۔ اب نہیں کہتے۔ دیر ہو رہی ہے مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔"

فریدہ نے تین روپیہ کے نوٹ نکال کر رشید کو دیدیئے۔ رشید نے فوراً لیکر جیب میں رکھے۔

میری بجّو کتنی اچھی ہے۔ میں جانتا تھا کہ فریدہ مجھے کبھی ناامید نہ کریگی۔ میری بجّو ———" اس نے آہستہ سے کہا اور دروازے کے باہر نکل گیا۔ بس اب ٹھیک ہے۔ ایک روپیہ گیارہ آنے کے ٹکٹ۔ پانچ آنے کی سگرٹ اور ایک روپیہ جیب میں۔ اُس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ بس اب تو احمد کو دعوت دے ہی دوں۔ احمد کی کوٹھی پاس ہی تھی۔ اس کی کوٹھی بھی کتنی خوبصورت ہے ظالم ٹھاٹ کرتا ہے۔ اور ہمارا مکان ——— بس اس کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ابا جان دو سو پاتے ہیں لیکن یہ نہ ہوا کہ سلیقہ کا ایک مکان ہی بنا ڈالتے۔ اب تو خیر گرانی کا نام ہے۔ پہلے جب گرانی نہیں تھی تب ہی کیا کر لیا۔ پیسہ نہ ہونا بھی واللہ کتنی بڑی مصیبت ہے۔ احمد کو دیکھو کبھی اس کے پاس روپیہ کی کمی ہی نہیں پڑتی۔ ہر وقت جیب بھری۔ اور یہاں دیکھو تین روپلی کے لئے فریدہ کی خوشامد کر رہے ہیں۔ پھر احمد اکثر میری دعوت بھی کرتا رہتا ہے۔ اچھے سے اچھے کھانے میز پر لگے رہتے ہیں اور یہاں تو دو ایک سال میں ایک مرتبہ کہیں دعوت کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ اور اس پر جتنا بھی سننا پڑتا ہے کم ——— اس کو غصّہ آنے لگا ——— دس پندرہ منٹ بعد احمد اندر سے آیا۔

"کیوں اُستاد کیسے آئے؟"

"اماں یار آج چلو "تان سین" دیکھ آئیں۔ گانے غضب کے ہیں اور پھر خورشید بھی تو ہے۔"

"کون سا شو؟"

"پہلا والا جو ساڑھے سات بجے ہوتا ہے۔ چھ بج گئے۔ ذرا جلدی چلنا چاہئے۔"

"اچھا تو طے ——— میں بھی سوچ ہی رہا تھا کہ آج کیا کیا جائے؟"

"تو پھر ضمیر سے بھی کہے دیتوں کہتا آؤں۔"

"اچھا جاؤ۔"

"مگر یار دیر بہت ہوگئی۔ مجھے ذرا نہانا بھی ہے۔ اس واسطے تم ایسا کرو کہ تم اپنے نوکر کو بھیج دو۔"

"اچھا تو ——— تم جاؤ تیار ہو کر آؤ۔ میں نوکر کو ابھی بھیجے دیتا ہوں لیکن دیر مت کرنا۔"

رشید دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ کیا پہنے ——— بادامی سوٹ لے دیکھ تھا۔ اور وہ اُسے کئی مرتبہ پہن چکا تھا۔ روز روز ایک ہی کپڑا پہنے ہوئے اچھا بھی تو نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی نظر فریدہ کے اُونی جمپر پر پڑی جس کا ڈیزائن اسے بیحد پسند تھا۔ لڑکیوں کے مزے ہیں۔ یہاں ایک سوٹ سے دوسرا سوٹ میسر نہیں۔ جب کہو کہ ایک گرم سوٹ بنوا دو مگر "ایک ہے تو اب کیا ضرورت" یہ جواب ملتا ہے۔ جیسے پچاسوں بھرے پڑے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ احمد نے سرج کا کتنا اچھا سوٹ ابھی پرسوں ہی بنوایا ہے۔ اور پھر اُس کے ابا پوچھ رہے تھے کہ اور تو ضرورت نہیں۔

حالانکہ جس کے پاس بارہ سے تو کم نہ ہوں گے۔ خیر اب اس وقت کیا کیا جائے یہ خیال اُسے پریشان کر رہا تھا۔ سنیما نہ جاتا تو اچھا تھا۔ مگر اب جائے تو کیا پہن کر۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ اور ایک قمیص نکالی۔ بنیائن بھی تو سب دیکھ رہ گئے تھے۔ خیر یوں ہی سہی۔ آج اپنی پُرانی شیروانی پہن کر جائے گا۔ وہ چارپائی پر کپڑوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اب کیا سوچے۔ فریدہ کپڑوں کا ایک بنڈل لئے ہوئے وہاں رکھنے آئی۔

"بھیا!" اُس نے کہا — "یہاں کیسے پڑے ہو۔ کچھ طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں تو" یہ کہکر وہ اُٹھا اور غسل خانہ میں کپڑے لیکر چلا گیا۔

آدھے گھنٹہ بعد وہ تیار ہوکر نکلا اور آئینہ کے سامنے کھڑا ہوکر بال سنوارنے لگا۔ باہر سے بوا کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ آج معلوم ہوتا ہے نواب صاحب نے پھر کہیں جانے کی تیاری کرلی ہے۔ اس لڑکے نے بھی اچھی مصیبت کردی ہے۔ گھر پہ تو بیٹھنا جانتا ہی نہیں۔ یہ نہیں گھڑی دو گھڑی کو بیٹھ کے پڑھے۔ اب امتحان ہونے والا ہے۔ پاس کیا خاک ہوگا۔

"گھر کو میں کیا کروں۔ کوئی بھاڑ میں جھونکوں —"

"ہاں اور کیا — تیرا بس چلے — تو گھر بار ماں بہن سب ہی کو آگ میں جھونک دے۔"

اچھا خیر۔ یہ جھک جھک ختم کیجئے — میں سنیما جا رہا ہوں۔"

"پھر وہی روز روز سنیما — اب بھی سنبھل جاؤ نہیں تو پچھتاؤ گے"

رشید غصہ میں باہر نکل گیا۔ بوا برابر بڑبڑا رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکے کو کیا ہوگیا۔"

رشید دور چلا گیا تھا۔ بوا کی آواز سُنائی تو نہیں دے رہی تھی البتہ اُس کے کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھی۔ یہ بھی سٹھیا گئیں۔ احمد کے پاس مت بیٹھو۔ بڑے آدمی ہیں۔ سنیما مت دیکھو۔ بس ان کے لئے دن رات پڑھو۔ اپنی تندرستی خراب ہو۔ ایک دن تو خوشی سے نہیں کہا کہ بیٹا جا سنیما دیکھ آ — ویسے تو بڑی محبت آجاتی ہے۔ ان کی محبت سے تو بس خدا ہی بچائے۔

اُس نے دیکھا کہ سامنے احمد نیلا سوٹ پہنے کھڑا ہے — نیلا سوٹ — [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ چالیس روپیہ [illegible] ٹھاٹ کرتا ہے۔

"کیوں رشید! تماں سین ہے یا کوئی اور — ورنہ ساری محنت رائیگاں جائیگی۔ اماں ضمیر تو گھر پر ہوگا ہی نہیں۔ چلو سنیما چلیں۔

فریدہ سوچنے لگی دس کا گھنٹہ بجے دیر ہوگئی۔ اب تو آتے ہی ہونگے۔ بھیا بھی عجیب لاپرواہ ہیں۔ جب دیکھو ہمیشہ ایسے ہی آتے ہیں۔ کبھی درستی۔ مگر اب اُن سے کہے کون۔ جیسے ڈانٹ کھانی ہو۔ بوا بگڑتے بگڑتے تھک گئیں۔ وہ کہاں سُنتے ہیں۔ احمد کا تو دن بھر کا وظیفہ ہوگیا ہے۔ بوا بستر پہ آرام کر رہی ہیں۔ بچے تو شام ہی سے سوگئے۔ اور یہ کوئی وقت بھی ہے جاگنے کا۔ جاڑے کی راتیں، وہ بھی کہاں تک انتظار کرتی۔ آدھا بھی تو شاید بج گیا۔ مگر بھیا! — وہ بستر پر لیٹ گئی۔ بوا کا ڈر تھا ورنہ وہ کب کی سو جاتی۔ جب آئیں گے تو ڈانٹ پڑیگی۔ کہ اتنی رات گئے گھر میں آتے ہو۔ اور نیند ایسی آ رہی ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس نے اُٹھکر پانی سے مُنہ دھویا۔ اگر اس وقت چائے پی جاتی تو اس سے نیند اُڑ جاتی مگر سماوار کی آواز — اس سے یہ آواز جو نکلتی ہے یہ اور مصیبت ہے۔ بوا کی آنکھ نہ کھلتی تو کھل جائے۔ بوا تو ہر جگہ پابندی لگاتی رہتی ہیں۔ جب دیکھو ڈانٹ — اسی سے تو بھیا بھی بگڑتے ہیں۔ لیکن زیادتی تو وہ بھی کرتے ہیں۔ اب کھیل نہ جانے کب کا ختم ہوگیا ہوگا — تعلیمی فلم — اُس کو ہنسی آئی۔ کیا بہلانے بناتے ہیں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی تعلیمی تصویر آ رہی ہے۔ بھیا تو یہ کہتے ہیں۔ ادھر آبا کہہ رہے تھے کہ ہندستان میں تعلیمی تصویریں بنتی ہی نہیں — بڑا بہانہ کرتے ہیں یہ بھیا — اس کی نیند کچھ کم ہوگئی تھی۔ چائے بنائے یا نہ بنائے۔ جانے بھی دو۔ خواہ مخواہ کو بوا ڈانٹیں گی۔ وہ اپنے کپڑوں کی پٹلیا اُٹھا لائی۔ اور اُس نے سینا شروع کردیا۔ اب اس کی گھبراہٹ کم ہوگئی تھی۔ تھوڑے دن میں اسکی شادی ہو جائیگی۔ سینما تو وہ بھی دیکھتے ہونگے۔ ان کا بھی وہ انتظار کیا کریگی۔ اس کو اب سوچنے میں لُطف آنے لگا تھا۔ لیکن پھر تو وہ خود بھی سنیما جائیگی۔ مجھے تو وہ ضرور دکھائیں گے۔ بڑا مزا آئیگا۔ پھر تو خوب اچھا رہے گا۔ سنیما کا پردہ اسکی نظروں کے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سوئی بڑے مزے میں چل رہی تھی۔ سنیما کا پردہ اور تصویریں — وہ آہستہ آہستہ مُسکرا رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر جھینپ گئی۔ نیند غائب ہوچکی تھی۔ اُس نے کپڑے میں سوئی لگا کر رکھدی اور اُچھل کر تکیہ میں مُنہ چھپا کر پڑ گئی۔ وہ بھی کیسی کیسی باتیں سوچتی ہے۔ مگر سب ہی لڑکیاں ایسا سوچتی ہوں گی۔ لیکن [illegible] ہوتے ہوں [illegible] ننھی کیسی ہیں جیسے کوئی خوشی ہی نہیں ہے۔ دل میں چاہے [illegible]

اور کوئی پوچھے تو منہ چھپالیتی ہیں۔ اُس نے تکیہ میں سے سر نکال لیا۔ اور پھر اپنی جگہ پہ بیٹھکر سینے لگی۔ کتنی دیر ہوگئی۔ ابھی تک بھیا نہیں آئے۔ وہ اتنا کپڑا بھی تو سی چکی۔ کہیں بیٹھے گپ ہانک رہے ہوں گے۔ ان کو کیا فکر ———
چارپائی کی چول چرڑ چرڑ ہوئی۔ وہ گھبرا گئی۔ بوا ابھی تک جاگ ہی رہی ہیں۔ نہیں سوگئی ہونگی۔ وہ کچھ مطمئن ہوئی۔ کروٹ لی ہوگی۔

"بٹیا ابھی سوئی نہیں۔ کیا کررہی ہے۔ کتنی رات ہوگئی۔ بھیا آگیا؟"

"آخری دو لفظ نہ کہتیں تو وہ جواب بھی دیتی۔ مگر اب کیا جواب دے۔ وہ گھبراگئی تھی۔ جھوٹ بولے۔ کہیں ادھر نہ آجائیں کبھی ڈانٹنے کیلئے ہی آئیں۔ سچ بولے تو بھی مشکل ہے بگڑیں گی۔ کہ اتنی رات گئے کیوں نہیں آیا۔ جھوٹ بولے ——— سچ بولے ——— ہائے اللہ کیا کرے!

کھٹ ——— کھٹ ——— "فریدہ!

آگئے بھیا" اُس نے آہستہ سے کہا اور ننگے پیر اُٹھی۔ زمین ٹھنڈی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلی۔

کھٹ ——— کھٹ ——— "فریدہ سوگئی کیا؟" کھٹ ——— کھٹ

"اچھا" ——— اُس نے آہستہ سے کہا اور وہ گھبرا گئی۔ کھٹکھٹائے جارہے ہیں۔ مانتے ہی نہیں۔ بوا جاگ گئیں تو میرا کیا ہے ان کی اپنی آپ مصیبت آئیگی۔

اُس نے دروازہ کھول دیا۔ "آہستہ سے چلے آئیے۔ بوا کی آنکھ کھل گئی تو وہ بگڑ جائیں گی۔ کہاں رہ گئے تھے۔ اتنی دیر لگادی۔

رشید بغیر کچھ جواب دیئے اپنے بستر پر آکر بیٹھ گیا اور جوتے اُتارنے لگا۔ فریدہ باورچی خانہ میں گئی کھانا ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ اُس نے انگیٹھی میں کچھ کوئلے ڈال کے دہکائے۔ تب کہیں جاکے کھانا گرم کرنے کو رکھا

بوا آخر جاگ ہی پڑیں۔

"توبہ فریدہ! اس وقت یہاں کیا کررہی ہے؟" انگیٹھی کی طرف جو دیکھا تو آگ دہک رہی تھی۔ بوا کے تن بدن میں بس آگ ہی تو لگ گئی۔ انہیں یاد آگیا کہ رشید سنیما دیکھنے گیا ہوگا۔ اب واپس آیا ہے۔

"کھانا گرم ہورہا ہوگا۔ نواب صاحب اس وقت تشریف لائے ہیں۔ ہوں ———" وہ بڑبڑائیں۔ فریدہ اطمینان سے اب کھانا گرم کرنے لگی بوا کو خبر تو ہوگئی اب اور ڈر کس کا تھا۔

"مجھے تو اس اولاد نے کھالیا ہے۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک کے چور ہوجاتی ہوں اور رات کو بھی چین نہیں۔ جانے کیسی اولادیں ہوتی ہونگی جو ماں باوا کو سکھ پہنچاتی ہونگی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے بستر میں جاکے لیٹ گئیں۔ فریدہ بھی کھانا لیکر کمرہ میں چلی گئی

"بارہ ایک بجے گھر میں آکے گھستے ہیں اور پھر دس بجے دن کے سوکے اُٹھیں گے۔ جبھی تو گھر میں نحوست برس رہی ہے۔ وہ بستر میں لیٹی لیٹی بڑبڑا رہی تھیں۔ "روز سنیما۔ یہ فرنگیوں کے ڈھنگ لئے ہیں۔ نہ اللہ کا نام نہ رسول کا۔" رشید اور فریدہ خاموش تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بڑبڑاتی بڑبڑاتی سوگئیں۔ جب رشید کی کہیں جان میں جان آئی۔

"فلم دیکھ آئے؟" فریدہ نے کپڑے میں سے سوئی نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ——— بہت اچھی تعلیمی فلم تھی۔" اور پھر اس طرح ہنس کر فریدہ کی طرف دیکھا جیسے اس کا شکریہ ادا کررہا ہو۔ اور سچ بھی تھا۔ اگر وہ روپیہ نہ دیتی تو ضرور فلم دیکھتے۔ بوا تو پھوٹی کوڑی بھی دینے والی نہیں ہیں۔ اور ڈانٹ بتاتیں۔

"احمد آج نیلا سوٹ پہن رہا تھا۔ بڑا قیمتی کپڑا ہے۔" آج اُسکے ذہن میں پھر پھیر کے وہی سوٹ گھوم رہا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا وہ سوٹ۔

"نیا سوٹ ——— ہوں ———"

فریدہ نے ایسے جواب دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ اور اس کیلئے بات بھی کیا ہوسکتی ہے۔ اور اپنی شادی کے نئے نئے جوڑے سیتی ہے۔ نیلے پیلے۔ معلوم نہیں کن کن رنگوں کے ایک ایک بڑھیا۔ قسمت تو ہماری ہی خراب ہے۔ سال دو سال میں کبھی ایک شیروانی مل گئی چلو چھٹی۔

"لو اُٹھاؤ ———" رشید نے کھانا بھی تھوڑا ہی کھایا۔ کچھ بھوک نہ تھی اور پھر بوا کی جھک جھک نے اور بھوک غائب کردی۔ فریدہ کپڑے میں سوئی لگاکر کھڑی ہوگئی۔

"اوہ بارہ بج گئے ———" اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "فریدہ اب تم بھی سوجاؤ۔"

"اور نہیں تو کیا رات بھر پہرا دوں گی"۔ وہ جل کے کوئلہ ہی تو ہوگئی رشید رضائی میں منہ ڈھانپ کے سوگیا۔ اور فریدہ بھی روشنی بجھا کے اپنے بستر میں جا لیٹی۔

رشید کو نیند نہ آئی۔ اس کو بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی پریشانی رہتی ہے آخر یہ پریشانیاں سب اسی کے لئے کیوں رہ گئی ہیں۔ دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں ——— ویسے تو وہ قسمت کا قائل نہ تھا مگر آج نہ جانے کیوں رہ رہکر اپنی قسمت

پہ تنوسن کر. بالکل یہ لفظ غیر ارادی طور پر اس کے ذہن میں آیا ۔ اسکی قسمت بھی کیسی ہے ـــــ ہمیشہ تو وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے ۔ روپیہ پیسہ کی کمی اس کے لئے ہمیشہ ہی ایک مصیبت رہتی ہے ۔ آج کو تو فریدہ نے ساتھ دیدیا ۔ اب وہ بھی کہاں تک میری مدد کریگی ۔ پھر اس کی بھی شادی ہوجائیگی ۔ اپنے گھر کی ہو جائیگی ۔ آج اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روپیہ انسانی زندگی کی باگ ڈور تھامتا ہے ۔ روپیہ ہی ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے ۔ ـــــ کتنی رات ہوگئی ۔ اب اس کو سونا چاہیئے ۔ صبح جلد اُٹھنا ہے ۔ مگر صبح کو کیا ہوگا ۔ احمد کی دوستی بھی میرے لئے بھاری ہوگئی ۔ پھر ہائے ایسی دوستی ہے ـــــ مگر اب تو نباہنا ہی پڑیگا ۔ بڑے آدمیوں کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے ، مگر اس میں تو اس کی ہی غلطی ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اسکی والدہ کتنی سختی برتتی ہیں ۔ چار پیسے دینا نہیں چاہتیں ۔ سب باتیں ہیں مگر پھر بھی میں نے دعوت دیدی ۔ آخر ایسا کون سا موقع تھا جو خواہ مخواہ کو اپنے گلے میں میں نے یہ مصیبت ڈال لی ۔ مگر مجبوری بھی تو تھی ۔ معلوم نہیں کتنی مرتبہ میری دعوت کی ہے ۔ اور کیسی کیسی چیزیں کھلائیں ۔ میں نے تو کبھی اسکو جھوٹے کو بھی نہیں پوچھا لیکن آخر وہ پیسے والا ہے ۔ اپنی حیثیت بھی تو دیکھنی چاہیئے ۔ اُسے ایکدم سے کچھ یاد آیا ۔ اور وہ ہنس پڑا ۔ بچپن میں اُس نے کاہلی اور چستی کا مقدمہ پڑھا تھا اس وقت وہ اس کو دوسرے معاملہ میں دوہرا رہا تھا ۔ خود ہی ایک بات کہتا اور پھر خود ہی اس کو کاٹنے کی فکر میں کوئی دوسری دلیل پیش کرتا ۔ فریدہ کی آنکھ لگتی آرہی تھی وہ اس بے موقع ہنسی سے جاگ اُٹھی ۔

"کیا ہے بھیا ! کیوں ہنس رہے ہو ؟"

"گویا ہمارے ہنسنے پر بھی پابندی ہے ۔"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں بھیا ۔ پابندی کون لگاتا ہے ۔ لیکن آخر یہ آدھی رات گئے ہنسنے کا کون سا وقت ہے ۔"

رشید کچھ لاجواب ہوگیا ۔ کمرے میں دوبارہ خاموشی چھاگئی ۔ رشید بھی سوگیا ۔

اگلے روز صبح صبح رشید خلافِ معمول جاگ گیا ۔ آج اس کو بوا کو راضی کرنا تھا ۔ کاش وہ دعوت میں روڑا نہ اٹکائیں ۔ اب کوئی روز روز تو وہ دعوت کرنے جا نہیں رہا ہے ۔ پھر بعد میں امتحان قریب ہے ۔ کون اب کس کی دعوت کریگا ۔ اس نے دعوت تو دی مگر اب بوا سے کہا جائے تو کس طرح ۔ وہ تو دور سے دوڑ ہی کھانے کو دوڑتی ہیں ۔

" فریدہ " اس نے کتاب پڑھتے پڑھتے کہا ۔ کیا کررہی ہو ؟ سی رہی ہو ؟ "

" ہاں " ۔ فریدہ نے مقیش پر نظریں جمائے جواب دیا ۔ وہ دوپٹہ کے پلوؤں پر مقیش ٹانک رہی تھی ۔

" یہاں آنا منّو ! کام ہے ۔"

" کیا کام ہے ؟ " وہ بولی ۔

" بڑا ضروری کام ہے ـــــ بس تم ہی کرسکتی ہو ۔" رشید یہ کہکر ہنس پڑا اور فریدہ کچھ جھنجلا سی گئی ۔ " ہوگا کام ۔ پھر روپیہ کی ضرورت پڑی ہوگی ۔ میرے پاس اب روپیہ دوپیہ نہیں ہے ۔ تین تھے وہی کل دیدیئے ۔ یہ بھی تو نہیں خیال کرتے کہ اس کا دل بھی کسی چیز کو چاہتا ہوگا ۔ ایک تو کچھ لانے سے گئے ۔ اور ـــــ وہ دل ہی دل میں بڑبڑا رہی تھی ۔

" فریدہ بہنو ! اپنے بھیا کی بات بھی سُن لیا کرو ۔" اس نے ایسی محبت اور خوشامد سے کہا کہ فریدہ کو رحم آگیا ۔ اور وہ پلو میں سوئی لگاکر کھڑی ہوگئی ۔

"کیا ہے ؟ ــــ" فریدہ کو ہنسی آگئی ۔

" بڑا ضروری کام ہے میری بہنو ! بس میری عزت کا سوال ہے ۔"

" روز روز میں روپیہ کہاں سے لاؤں ۔ آپ نے تو قارون کے خزانے کا مالک مجھ ہی کو سمجھ رکھا ہے ۔"

رشید ہنس پڑا ـــــ " تمہیں تو ہر وقت روپیہ ہی کا خیال رہتا ہے ۔ بہنو روپیہ نہیں چاہیئے ۔"

" پھر اور کیا کام ہے ؟ " فریدہ نے ایسے کہا جیسے روپیہ کے علاوہ رشید کا وہ کوئی کام ہی نہیں کرسکتی ۔

" کہاں گئی فریدہ ؟ " بوا باہر سے چلائیں سارا دن اسی طرح ختم کردیتی ہو ۔ ایک کپڑا بھی توسل کے تیار نہیں ہوتا ۔"

" ابھی مصیبت میں جان ہے ۔ سارے دن سیتے سیتے آنکھیں بھی تھک جاتی ہیں ۔ مگر یہ بگڑتی ہی رہتی ہیں ۔"

" جاؤ بھئی تمہاری شادی کے کپڑے ہیں سیو ۔ مت کرو ہمارا کام " رشید نے کہا ۔

" آپ کام تو بتاتے نہیں ۔ میں نے کرنے سے کب انکار کیا ۔"

" بات یہ ہے بہنو کہ احمد کئی دن سے سر ہورہا تھا کہ چائے کی دعوت کرو ۔ اب انکار بھی کس طرح کرتا ۔ بیسیوں دفعہ وہ میری دعوت کرچکا ہے

"ہاں تو یہ کہیئے کہ آپ دعوت کرآئے" ۔ فریدہ ہنسی ۔ جیسے اس پر حصہ کر رہی ہو۔ اب بوا کی ڈانٹ بھی خوب کھانی پڑیگی ۔ کوئی یہ تو ہے نہیں کہ جیب سے روپیہ نکال کر دیدوں اور بوا کو خبر نہ ہو ۔"

"تو پھر کیا ہوگا بھنّو !" رشید نے خوشامد کی ۔ کسی طرح بوا کو راضی کرلو ۔ دیکھو چار بجے احمد آئے گا ۔ اگر چائے ناشتہ نہ تیار ہوا تو بڑی شرمندگی ہوگی اور پھر میں عمر بھر اُسے مُنہ نہیں دکھاسکوں گا ۔"

"میں کیسے راضی کروں ۔ آپ خود کہہ دیجئے نا" فریدہ اکڑی ۔ جیسے ساری دنیا کا نظام اسی کے ہاتھ میں تھا ۔ دنیا کا ہو یا نہ ہو رشید کا تو ہے ہی ۔ وہ چاہے تو ذرا سی دیر میں درہم برہم کردے ۔

"اری فریدہ !" بوا باہر سے چلائیں "کہاں چلی گئی ۔"

"آرہی ہوں ۔" فریدہ نے جواب دیا ۔

"تو بھنّو کردو گی ہمارا کام ۔ دیکھو پھر ہم تم سے کسی کام کو نہیں کہیں گے ۔ ایک مہینہ بعد تو تم خود ہی اپنی سسرال چلی جاؤ گی ۔ پھر تم کہاں ہوگی ہم کہاں ہونگے ——— کون تم سے کام کرانے جایا کریگا ۔"

"دیکھئے پھر وہی مذاق ۔ جائیے میں بھی آپ کا کوئی کام جو کرکے دوں"

"نہیں ——— نہیں ——— میری اچھی سی چھوٹی سی بہن ۔ ناراض ہوگئی کیا ۔ اچھا جاؤ بوا کو راضی کرلو ——— انعام دونگا ——— بڑا اچھا انعام ———"

وہ ہنس پڑی ۔ "اچھا اچھا کہہ دونگی ۔" جیسے وہ پہلے مذاق سے روٹھ گئی تھی ۔ بیاہ کے نام سے تو اور اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی ، شادی سسرال ۔ نہ جانے کیوں بار بار اُس کے ذہن پر چھانے لگتے ۔ اور وہ ——— وہ سوچتے سوچتے تھک سی جاتی ۔ ہر چند وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر ہر وقت تو گھر میں شادی کا ذکر رہتا تھا ۔ آخر وہ بچتی بھی کس طرح ۔ اس کے دل میں ایک عجیب طرح کی گدگداہٹ محسوس ہوتی ۔ اور پھر خود ہی خود شرما جاتی ۔

شام ہوئی ۔ کسی نہ کسی طرح بوا کو راضی کرہی لیا ۔ اور فریدہ نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ بوا خود بھی چیزیں پکانے میں مدد دینے لگیں ۔

جلدی جلدی پھرتی سے کام کرو بٹیا ۔ چار بجا چاہتے ہیں ۔ اور دونوں ماں بیٹیوں کے ہاتھ چرخی کی طرح چل رہے تھے ۔ بڑے ماں باپ کو چلانے میں بھی لڑکیوں کو کمال حاصل ہوتا ہے ۔ کتنی چالاک ہوتی ہیں یہ لڑکیاں ۔ رشید تو دل ہی دل میں اس کا قائل ہو چکا تھا ۔ جبھی تو جب بوا کو راضی کرنا ہوتا تو فریدہ سے کام نکالتا ۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرہی لیتی تھی ۔

"چائے تیار ہوگئی بھنّو !" رشید نے فاتحانہ انداز میں آکے پوچھا ۔

"ہاں ——— سب چیزیں تیار ہیں ——— کس کمرہ میں رکھوں ——— میں نے تو برابر والے کمرہ میں میز لگادی ہے ۔ جس کا دروازہ باہر کو بھی کھلتا ہے ۔"

"ہاں ——— ہاں ——— بس ٹھیک ہے ۔ تم تو خود ہی سمجھدار ہو ۔ بس ذرا جلدی سے کرنا کیونکہ مجھے پانچ بجے کی ٹرین سے جانا ہے ۔" یہ کہکر رشید باہر چلا گیا ۔ اور بوا کے تو جیسے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی ہو ۔ وہ کڑاہی چولھے پر سے اتار رہی تھیں ۔ غصہ میں اس زور سے زمین پر رکھی کہ تیل گرتے گرتے بچا ۔

"پانچ والی گاڑی سے کہاں جا رہا ہے یہ" بوا غصہ سے بولیں ۔ فریدہ بیچاری جواب دیتی تو کیا ۔ یہ تو اُسے بھی معلوم نہیں تھا ۔ ابھی طے کیا ہوگا ۔

"اس لڑکے نے تو مجھے کھا لیا ہے ۔ امتحان کا ایک مہینہ رہ گیا ہے اور یہ سیر سپاٹوں میں پھر رہے ہیں ۔ آنے تو دو آج اس کے ابا کو ———" وہ اٹھ کر بڑبڑاتی ہوئی کمرہ میں چلی گئیں ——— مگر اب انہیں سکون کہاں تھا ۔ پھر باہر آئیں ۔

"کہاں گئے یہ نواب صاحب ۔" رشید بھی باہر سے آگیا اور پھر تو بوا برس ہی پڑیں ——— سارا گھر سر پر اُٹھا لیا ۔ لیکن رشید کو بھی کچھ ایسی ضد چڑھی کہ چاہے بوا کچھ بھی کرڈالیں مگر وہ جائیگا ضرور ۔ اس نے غصہ بھی دکھایا اور پھر خوشامد بھی کی ۔

"تو بواجی ! آپ کو کپڑا بھی تو منگانا ہے آخر اس کیلئے بھی تو آپ کسی کو بھیجیئے گا نا !" رشید کو یہ ایک نئی چال سوجھی ۔ اس طرح کرایہ کا روپیہ بھی بوا سے وصول ہوجائیگا ۔ اب بوا بھی کچھ ٹھنڈی ہوچکی تھیں ۔ بات بھی ٹھیک تھی اُن کو کپڑا اور گوٹا فریدہ کے بیاہ کے لئے منگانا تھا ۔ وہ چپ ہو رہیں ۔ اچھا ہے کپڑا ہی آجائے گا ۔ رشید بھی باہر نکل گیا ۔

فریدہ جلدی جلدی سب چیزیں میز پر لگانے لگی ۔ معلوم نہیں کتنے مہمان آئیں گے ۔ اس نے چھ پیالیاں لگادیں ۔ ہوں گے کتنے ہی ہوں ۔ چیزیں تو اُس نے بہت تیار کرلی ہیں ۔ دوپہر سے لگے لگے یہ وقت آگیا ۔ آج تو کپڑے میں ٹانکا بھی نہ لگا ۔ اب رات کو اسے سر مارنا پڑیگا ۔

"ارے بھائی رشید !"

"ایک گورے چٹے ہاتھ نے پردہ ہٹایا ۔ فریدہ ادھر بیٹھی کیک برتن لگا رہی تھی ۔ وہ چونک پڑی ۔ کون ہے ؟ ——— اجنبی آواز ——— دروازہ کھلا رہ گیا تھا ۔ اُس نے پیچھے مڑکے دیکھا ۔ کوئی پردہ کے پاس کھڑا تھا ۔ نیا شخص ——— وہ گھبرا گئی ۔ بھاگتی تو کدھر وہ وہیں کرسی کی آڑ میں ہوگئی ۔ پردہ بھی فوراً

ہی ہٹ گیا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ یہاں کون ہے۔ نیلا سوٹ پہنے تھا ——— خوب موٹا تازہ، رنگ بہت سفید تھا۔ جبھی تو نیلا سوٹ اتنا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ یہ وہی معلوم ہوتے ہیں ——— کیا نام ——— نام اُس کے ذہن سے اُتر گیا۔ ہاں وہی بھیا کے دوست ——— ہاں ٹھیک ہے یہ احمد تھے۔ بڑے آدمی کے لڑکے ہیں۔ کیسا بڑھیا سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ اور کلائی پر گھڑی بھی تو بندھی ہوئی تھی۔

"سب چیزیں لگا دیں بھتو!" رشید نے پوچھا۔ فریدہ ایکدم سے گھبرا اُٹھی۔ کہیں وہی نیلے سوٹ والا تو نہیں آ گیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اس سے باتیں کرنے لگتا۔ رشید بھی کام میں فریدہ کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"آج تو نے بڑا کام کیا ہے ——— میری عزت رہ گئی۔ جب ہماری بھتو چلی جائیگی تو پھر ہم اکیلے رہ جائیں گے۔ کوئی بات بھی پوچھنے والا نہ رہیگا۔"

مگر فریدہ چُپ رہی۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ گال جیسے انگاروں کی طرح دہک رہے ہوں۔ کنپٹیوں سے آگ سی نکل رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی سب ٹھیک کرکے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"نیلے سوٹ والا ——— ہاں احمد ہی ہونگے۔ بھیا کے دوست کئی دن ہوئے بھیا کہہ بھی رہے تھے کہ احمد نیلا سوٹ پہن رہا ہے۔ بڑے قیمتی کپڑے کا ہے" پھر پھر کے اُس کے سامنے احمد ہی آ کھڑا ہو۔ وہ پھر اپنا ار ریشہ لے کے بیٹھ گئی۔ اُس کی سوئی گوٹے کے تاروں میں سے سرسر نکل رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی۔ وہ بھی آج کہیں جا رہے ہیں ——— جبھی تو ایسا بڑھیا سوٹ پہن کر آئے ہیں ——— بھیا بھی انہیں کے ساتھ جا رہے ہوں گے۔ بھیا کہہ رہے تھے کہ احمد کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابھی پڑھتا ہے اُس نے اپنے سر کو ذرا زور سے جنبش دی۔ وہ بھی کیسی کیسی باتیں سوچ رہی ہے۔ اُس کو کیا مطلب اس کی شادی ہے، ہو یا نہ ہو۔ اس کی تو منگنی ہو چکی ہے۔ اب اگلے مہینے میں اس کی شادی بھی ہو جائیگی۔ اُسے کیا حق ہے کہ وہ غیر مردوں کے متعلق سوچے۔ مگر اس میں اس کا کیا قصور۔ وہ کوئی جان کے تو اُس کے سامنے چلی نہیں گئی تھی۔ وہ تو میز پر برتن لگا رہی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ وہ آ جائیگا۔ کیسا بدتمیز آدمی ہے۔ بغیر آواز دیئے پردہ کھول دیا۔ اُس نے اپنے دوپٹہ کو ٹھیک کرکے اوڑھا۔ جیسے وہ اُس کے سامنے ہی تو کھڑا ہے۔ باہر ہی سے آواز دیدیتے۔ اُسے اپنے اُوپر ہنسی آ گئی۔ پھر کیا ہوا اگر دیکھ لیا۔ اس کا کچھ بگڑ تھوڑا ہی گیا ——— اونہہ ——— وہ جلدی جلدی گوٹا ٹانکنے لگی۔ احمد کی جب شادی ہو جائیگی تو اُس کی بیوی بڑی خوش رہا کریگی۔ کتنا اچھا اُس کا شوہر ہے۔ خوبصورت بیوی تو سب ڈھونڈتے ہیں۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ خود شوہر بھی تو ہو۔ جیسے لڑکیوں کے دل ہی نہیں ہوتا ——— اُن کے لئے تو بس شوہر تلاش کیا جاتا ہے۔ چاہے کیسا ہی بدصورت ہو۔ جبھی تو زیادہ تر شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں ——— اُس نے بیٹھے بیٹھے اُوپر نظر اُٹھائی سامنے بڑا آئینہ لگا تھا۔ گندمی رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ یہ اُسی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھی تو خوبصورت ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے احمد نیلا سوٹ پہنے اس کے قریب کھڑا ہے۔ وہ جھینپ سی گئی۔ مگر اس جھینپ میں بھی تو ایک لذت ہے۔

"فریدہ بھتو!"

اُس نے مُڑ کے دیکھا۔ دروازے میں رشید کھڑا تھا۔

"میں جا رہا ہوں ——— سب برتن اُٹھا لینا۔"

"اچھا ———" وہ یہ کہکر چُپ ہو رہی۔ اور پھر سینے لگی۔

رشید اور احمد موٹر میں بیٹھے ہوئے اسٹیشن جا رہے تھے۔ زندگی میں ایسے موقعے بھی کم آئے ہیں۔ اُسنے اپنے سوٹ کی طرف ایک نظر کی۔ گویا وہ اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ آیا وہ اس موٹر میں بیٹھنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ کون مجھے دیکھکر یہ کہیگا کہ یہ شخص بہت کم موٹر میں بیٹھا ہے۔ یا یہ موٹر اس کی نہیں ہے۔ اُس نے احمد کی طرف دیکھا اور پھر آپ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ یہ موٹر اس کی نہیں تو کیا ہے۔ دُنیا میں کتنے ہیں جن کے پاس موٹریں ہیں۔ فی الواقعی موٹر والے تو انگلی پہ گنے جا سکتے ہیں۔ موٹر والے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ اس نے دوبارہ احمد کی طرف دیکھا۔ موٹر تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار کافی تیز تو ہوتی ہے۔ موٹر آگے جا رہی تھی۔ دکانوں کی عمارتیں پیچھے چھٹتی جا رہی تھیں۔ پیدل چلنے والے راہگیر پیچھے جا رہے تھے۔ زندگی ایک دوڑ ہے۔ رشید نے دل ہی دل میں کہا۔ جس میں موٹر والے منزل پر پہلے پہنچتے ہیں اور پیدل چلنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ ہنسا۔ وہ بھی بعض اوقات کیسے کیسے فلسفیانہ خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دیتا ہے۔ وہ ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے۔ جیسے وہ موٹر میں کبھی نہیں بیٹھا۔ لیکن وہ کسی سے کم ہے اگر اُس کے پاس موٹر نہیں ہے۔ تو کوئی خاص کمی نہیں۔ اپنے دوستوں میں وہ کسی سے ہیٹا نہیں سینما وہ دکھاتا ہے۔ دعوتیں وہ کرتا ہے۔ اور آخر ایسی کون سی بات ہے جو اس میں نہیں ہے۔ ہاں موٹر ضرور اس کے پاس نہیں ہے۔ مگر اس سے کون سی کمی ہو جاتی ہے۔

اس نے کھڑکی میں سے سر ذرا سا نکالا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اتنے دن یہاں رہتے ہوگئے اور اس کو یہ نہیں معلوم۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور۔ موٹر بھی کتنی عجیب بات ہے۔ موٹر بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ ذرا سی دیر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

"رشید! بھئی سیکری بھی جائیں گے۔"

"اچھا"

رشید پھر خاموش ہوگیا۔ اس وقت معلوم نہیں کیوں وہ ایک عجیب پریشانی میں مبتلا تھا۔ ایسی کونسی بات ہے جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آخر کوئی بات بھی تو ہو۔ ہاں تو سیکری بھی جانا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کے پاس مشکل سے سات روپے بچتے ہیں۔ باقی روپیہ تو ابا کا ہے جس کا کپڑا خریدنا ہے۔ اگر اس میں سے ایک پیسہ بھی خرچ ہوگیا تو مصیبت ہو جائیگی۔ ہاں تو پندرہ روپے تو ٹکٹ ہی میں خرچ ہوتے ہیں۔ انٹر کا ٹکٹ۔ کاش وہ تیسرے درجہ کا ٹکٹ خرید سکتا۔ مگر یہ بھی تو مجبوری ہے۔ تیسرے درجہ کا ٹکٹ —— ناممکن آخر احمد انٹر سے کم میں تو بیٹھنے سے رہا اتنے بڑے آدمی کا لڑکا ہے —— تیسرا درجہ —— ناممکن —— اس نے گردن کو زور سے جھٹکا دیا۔ مگر انٹر میں بیٹھنے میں بھی تو مشکل ہے۔ بلکہ مجبوری۔ وہ کیسے احمد کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے۔

کاش وہ احمد کا دوست نہ ہوتا۔ پہلے اس کی دوستی صرف مہنگی پڑتی تھی۔ مگر آج اس کے لئے اس کا نباہنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیسے والے کی دوستی —— مگر اس میں اسی کی تو غلطی ہے۔ کتنے لڑکے تھے۔ مگر اس میں سے اس نے اتنا بڑا انتخاب کیا۔ اطہر میں ہی کون سی برائی تھی۔ کتنا ہنس مکھ ہے۔ مگر میں نے اس کی غربت کی بنا پر اس کو ٹھکرا دیا۔ خیر۔ چھوڑو ان باتوں کو اونہہ۔ —— اس نے پھر گردن کو جھٹکا دیا۔

"میاں اترو بھی —— جیسے کبھی موٹر میں بیٹھے ہی نہیں۔ پھر کسی دن ٹہلا لائیں گے۔ چلو وقت کم ہے۔" احمد نے ہنس کر کہا۔

رشید چونک پڑا۔ پانی پانی ہوگیا۔ کاش وہ اس وقت کچھ نہ سوچتا۔ کاش اس کے پاس بھی موٹر ہوتی۔ احساس کمتری اپنی بلندی پر تھا۔ اس کو اپنی غربت پر غصہ آرہا تھا۔ کاش وہ بھی دولتمند ہوتا۔

رشید موٹر سے اتر چکا تھا۔ مگر اس کا دماغ اسکا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس طرح اگر وہ آگرہ گیا تو کیا خاک اسکو مزا آئیگا۔ احمد کے ساتھ اس وقت وہ ایک منٹ کیلئے بھی خوش نہ رہ سکتا تھا۔ مگر یہ تبدیلی یکایک کچھ ٹھیک نہیں —— وہ اسٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ موٹر جا چکی تھی۔ گاڑی چھوٹنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔" احمد نے کہا۔ رشید نہ جانے کیا سوچ کر رُک گیا۔

"تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا ٹھیک وقت معلوم کرلوں۔" احمد آگے بڑھ گیا۔ رشید وہیں رُک گیا۔ خیالات کا ایک ہجوم اس کے دماغ میں آرہا تھا۔ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ ٹکٹ کلکٹر کو دیکھکر اس کے پاس چلا گیا۔ مگر اسکی نظریں برابر احمد کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"گاڑی میں کتنی دیر ہے؟" اس نے یہ سوال یونہی کیا۔ لیکن احمد کی جانب برابر دیکھتا رہا۔

"آپ کا مطلب کس گاڑی سے ہے۔ پھر یہ سوال تو کچھ مہمل سا ہے۔ معلوم نہیں آپ کا مطلب آنے والی گاڑی سے ہے یا جانے والی سے۔"

رشید نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جیسے اس سوال کے پوچھنے سے اسکا مطلب جواب پانا سرے سے تھا ہی نہیں۔

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں" ٹکٹ کلکٹر کہکر آگے کو بڑھ گیا۔ رشید کی نظریں احمد پر گڑی ہوئی تھیں جو دوسرے درجہ کے ٹکٹ گھر کے سامنے پہنچ کر رُک گیا تھا۔ رشید کانپ اٹھا۔ میں احمد کے ساتھ نہیں جاؤنگا۔ ہرگز نہیں۔" اس کی زبان سے یکبارگی نکلا۔ اسکا دماغی ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نیم پاگل معلوم ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکائے واپس چل دیا۔ وہ گھر جائیگا۔ دوسرے درجہ کے پیسے اسکے پاس کہاں۔ احمد تو بڑے آدمی ہیں۔ وہ تو انٹر کا ٹکٹ ہی بمشکل تمام خرید سکتا تھا —— ان بڑے آدمیوں کا شوق —— ان کی دوستی سے وہ باز آیا۔ آج اسکو پہلی بار محسوس ہو رہا تھا کہ گویا اسکا دماغ کسی قید سے آزاد ہوگیا تھا۔ وہ موٹر میں آیا تھا لیکن کتنا تھک گیا تھا۔ اونچے طبقے سے ہاتھ ملانا ناممکن ہے۔ اسے متوسط طبقہ سے انتہائی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ ان لوگوں کی دوستی —— آج طبقاتی کشمکش کے ایک پہلو کو رشید نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ جس کو بڑے بڑے سیاست داں نہ سمجھا سکتے تھے۔ کاش دُنیا میں ایک انقلاب ہوتا جو ایک غیر طبقاتی نظام قائم کرسکتا —— جس میں ہر شخص انٹر کلاس میں بیٹھ سکتا —— تیسرا درجہ، ڈیوڑھا درجہ اور دوسرا درجہ گویا یہ ہیں تین طبقے —— ان تینوں ڈبوں میں جتنی نزدیکی ہے۔ اتنی ہی دُوری کیوں ——

اس نے احمد کا ہر جگہ ساتھ دیا۔ ہر دعوت میں۔ اس کے دوش بدوش بیٹھا۔ سنیما میں اس نے وہی ٹکٹ لیا۔ مگر ریل میں وہ اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ مگر اس وقت اس کا ساتھ دینے کی اس کے دل میں کوئی آرزو نہ تھی۔ آج اتنے عرصہ کے بعد اسکے دماغ کو سکون میسر ہوا۔

وہ سر کو جھکائے چلا جا رہا تھا۔ قمریہ کی شادی میں وہ اطہر کو ضرور بلائیگا۔

ارادے

(از محترمہ قرۃ العین حیدر)

اتوار کی ایک معمولی سی دوپہر۔ یعنی ذرا زیادہ رنگین اور رومانوی اور بالکل غیر دلچسپ —— ہم بیچاری لڑکیاں امرود کے ایک گھنے درخت کے نیچے قالین پر بیٹھی جمائیاں لے رہی تھیں۔ نیند تھی کہ خواہ مخواہ چلی آ رہی تھی اور ایک دوسرے سے لڑنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اب یہ میں کیوں بتاؤں آپ کو کہ جب اس وقت اچھی خاصی طرح کمرے میں بیٹھ سکتے تھے تو ہمیں درخت کے سائے میں بیٹھنے کی کیا خاص ضرورت پیش آئی تھی۔ لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آج کل لڑکیاں حد سے زیادہ رومان پسند ہوتی جا رہی ہیں۔ اور آم کے تنے سے ٹیک لگا کر چارلس بوائیر کے فلموں اور فوت محمد کے تازہ ترین فیشن میچ پہ تبصرہ کرنا ان کے لئے بے حد ضروری ہے۔

چاکلیٹ کھاتے ہوئے ہم لوگ بھی اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ ٹینس۔ مذہب۔ فلسفہ۔ الی وڈ۔ کیوٹکس کے رنگوں کا انتخاب۔ انڈیا گیٹ کے معرکوں کا ذکر خیر۔ یہ کہ فرخ بیاری جو شیفون کل تم لیلا رام کے یہاں سے لائی ہو اس پہ کس طرح کی Piping کروگی۔ اور ہائے ذوکی پرویز کے کوٹ جانے کے بعد شیو کو ہم نے تین مرتبہ ویلنگرز میں زرینہ کے ساتھ دیکھا۔ اس قدر غضب کا Smart لگ رہا تھا کہ کیا بتاؤں۔

ذبیحہ دنیا سے قطعی بیزار ایک عورت کو آکڑوں بیٹھی لکڑی سے مٹی میں گڑھا کھودتے ہوئے شاید مسائل تصوف کے حل میں مصروف تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ سب سے الگ تھلگ جنوبی فرانس کے سبزہ زاروں میں ایک انگوروں کی بیل سے چھپے ہوئے شاتو میں رہا کریگی۔ پیانو بجائے گی۔ تصویریں بنائے گی مختصر یہ کہ بالکل کسی الحدیلو بیشہزادی کی سی زندگی بسر کریگی اور یہ کہ اب اسے عزیزہ یا کسی اور گنسے کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ کیونکہ وجہ یہ تھی کہ ذبیحہ کو اسی دن صبح خالہ جان کے متعلق پتہ چلا ہوا ایک خیال لگا تھا۔ جس میں اسی کے عزیز نے مخفہ ذبیحہ کے سبق شعر نے اپنے کسی دوست کو یہ لکھا تھا کہ صاحب مجھے اس قسم کی لڑکیوں سے تو ڈر لگتا ہے جو سر پہ بگوائی سی لپیٹ کر اور پتلون پہن کر امریکن وضع کی انگریزی

بولتی ہوں۔ اور یہ کہ میں تو ایک ایسی سیدھی سادی گھریلو سی لڑکی سے شادی کروں گا جو اس سال پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دینے والی ہے۔ جو موزوں میں رفو کرنے کے علاوہ مرغ مسلم اور پلاؤ پکانا بھی خوب جانتی ہے۔

لیکن ابھی تک میں نے اس قسم کا کوئی ارادہ نہ کیا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ابھی دنیا کو میری کافی سے زیادہ ضرورت ہے۔ اور اسی سلسلے میں مجھے بہت سے کام کرنے باقی تھے۔ ایک تو یہ کہ اپنی نئی ٹشو کی ساری میں بارڈر لگانا تھا اور دوسرے پرویز کو فون کرنا تھا کہ ال سٹر ٹینس کا میچ دیکھنے کیلئے چلے۔

ہم سب چپ چاپ بیٹھے امرودوں کو گن رہے تھے کہ خالہ اماں نے باورچی خانے کے برآمدے میں سے آواز دی۔ "لڑکیو! خالی بیٹھی کیا کر رہی ہو جنتی گر دھاری چرن کو یہ چٹھی دو کہ صبح سے میں نے نیفو کو کوپن دیکر موہن سٹورز آٹا اور شکر لینے کے لئے بھیجا ہوا ہے۔ اب تک انہوں نے کیوں نہیں بوریاں بھجوائیں۔ موا دور پہ من تو کو ملے رہے ہیں، اللہ مارے ——" اُف کس قدر غیر رومانوی بات ——

خالدہ نے اپنے لمبے لمبے عنابی ناخنوں کو دیکھتے ہوئے دھوئیں سے بھرے ہوئے باورچی خانے میں رکھی ہوئی کوئلے کی بوریوں کے تکلیف دہ تصور کو ایک دم جھٹک کر پھر رومان کی دنیا میں واپس آتا چاہا۔ اس لئے وہ امرود کا ایک پتا سونگھ کر بولی۔ "پرویز کتنا حسین نام ہے۔ بالکل جیسے جہلم کے کنارے کوئی چرواہا الغوزہ بجا رہا ہو"

"واہ! کیا زوردار تخیل ہے آپ کا۔" میں نے فوراً جل کر کہا۔ ذرا دیکھو تو لڑکی کی باتیں۔ ایتھل مینن کراکا اور ہکسلے کی کتابیں پڑھتے پڑھتے اس کا دماغ خطرناک طور پہ چل گیا ہے۔ یہ بے انصافی اور زیادتی ملاحظہ کیجئے کہ میں نے خود ہی خالدہ کا پرویز سے تعارف کروایا تھا اور اب کس اطمینان اور بے تکلفی سے وہ فرما رہی ہیں کہ جہلم کے کنارے چرواہا الغوزہ بجا رہا ہے —— واہ بھئی ——

ہم پھر خاموش ہو کر جمائیاں لینے لگے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کون سی بات شروع کی جائے۔ جو موضوع بھی گفتگو کا میں چھیڑتی۔ یقیناً اس میں لڑائی کا کوئی پہلو نکل آتا۔ لہٰذا میں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا اور کنکر سے نشانہ لگا کر امرود توڑنے کے مسئلے پر غور کرنے لگی۔

"کیوں لالہ ڈیریسٹ۔ یہ عادت کیوں آ رہے ہیں۔ تمہارے یہاں؟" فرخ نے مجھے گویا آنے والی جنگ کا الٹی میٹم دے دیا۔

"کیا لغو سوال ہے۔ عام طور سے مہمان کیوں آیا کرتے ہیں؟" میں نے

چیخ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جو مہمان کمرے کی صفائی کے سلسلے میں نہایت مستعدی سے انتظامات کرتا پھر رہا تھا۔

"تو تم شادی کرو گی ان مچند سے ؟"

"ارادہ تو فی الحال ایسا ہی ہے"۔ گویا اب تک جتنے چند مہمان آئے تھے ان سے شادی کا ارادہ کرنا ایک ضروری بات تھی۔

خاک پڑے تمہارے ارادوں پر۔ کل شام امرتا شیرگل کی تصاویر کی نمائش سے واپسی میں تم بالکل یقین کے ساتھ کہہ رہی تھیں کہ تمہارا ارادہ زندگی بھر بے لوثی سے آرٹ اور قوم کی خدمت کرنے کا ہے"

اب میں نے کیا یاد دلائی کہ جب تک وہ شاہد سے نہ ملی تھی اس نے کامریڈ احمد سے صدق دل کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ جنتا کی حالت سدھاریگی۔ اور اس موجودہ قومی اور پولتاری جنگ کو جیتنے کے سلسلے میں کامریڈ اسٹالین کا ہاتھ بٹائے گی اور اب وہ شاہد کے ساتھ مسوری جانے کے پروگرام بنا رہی تھی۔

"فرخ نہایت بورژوا ہو تم" میں نے خالص ترقی پسند لہجہ میں اس سے کہا۔ اور پھر مجھے اس بے تکے سے لفظ کا استعمال کرنے پر خود ہنسی آگئی۔ روس کس بری طرح ہم پر چھایا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا۔

سیاسی اُفق پھر غبار آلود ہوتا جا رہا تھا اس لئے میں نے فیضو کو آواز دیکر چائے منگوائی۔ بدقسمتی سے قریب کے برآمدے میں ماموں جان بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے تھے اور دو تین دفعہ انہوں نے عینک اُتار کر ہماری طرف بھی نظر کی تھی۔ شاید انکا خیال تھا کہ بچاری بچیاں کتنی محنت سے امتحان کی تیاری کر رہی ہیں۔

فرخ بورژوا اور پولتاری کی تکرار پر نہایت جوش سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اب خالہ جان بھی منشی گردھاری چرن کے کوپنوں کا انتظام کرتی ہوئی برآمدے میں ماموں جان کے پاس آچکی تھیں۔ اس لئے میں نے اچھی اچھی لڑکی بننے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا اونچی آواز سے کہا۔

"خدا کے لئے لڑکیو ان لغویات کے علاوہ کبھی تو اور باتیں بھی کیا کرو۔ اب مثلاً یہ کہ تم تو اتنی قیمتی کیڈبری چاکلیٹ اپنے کتے کو کھلا رہی ہو اور سرزمین بنگال کے سینکڑوں فرزند فاقہ ——" لیکن یہ تو بیحد پیٹنٹ قسم کا جملہ ہے۔ ہزاروں دفعہ دُہرایا جا چکا ہے۔ میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے لگی کہ کوئی اور شریفانہ سا تذکرہ چھیڑوں۔ یاد آیا کہ خالہ اماں تہذیب نسواں اور عصمت میں حقوق نسواں، اصلاح نسواں اور تعلیم نسواں وغیرہ پر بہت مضامین لکھا کرتی تھیں۔ اس لئے ——

ہاں تو ذرا اس جفاکار سماج کے مظالم پر غور کرو جو بیکس صنف نازک پر

—— "نہیں بھئی یہ بھی نہیں۔ کچھ اور سوچنا چاہیئے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ قوم۔ "قوم ہماری کس تیزی سے قعر پستی میں گری جا رہی ہے۔ اس ڈوبتی نیا کو کوئی پار لگانے والا نہیں۔ ہائے قوم۔ ہائے قوم۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا —— پاکستان —— بہنو آؤ اور میدان عمل میں کود کر شاہراہ ترقی پر گامزن ہو جاؤ —— زندہ باد مزدور سبھا —— زندہ باد ——

"کافی ہاؤس" خالدہ نے چپکے سے جملہ پورا کر دیا۔ میں نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ سوا پانچ بج چکے تھے۔ اور چھ بجے پرویز نے کافی ہاؤس میں مدعو کیا تھا۔

اور ہم سب اصلاح قوم اور آزادی ہندوستان کے ارادوں کو ملتوی کر کے تبدیل لباس کے لئے ڈریسنگ روم کی طرف بھاگ گئے۔

دیوؤں کے مُلک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

تیرھویں قسط

گلیور: ۔ تو وہ جھڑے ہوئے بال مجھے دے دیا کرو۔

خواص: ۔ جتنے چاہو۔

اجازت ملنے کے بعد گلیور نے بال جمع کرنے شروع کر دیئے اور تھوڑے دن میں اُس کے پاس بالوں کا ڈھیر ہو گیا۔ گلیور کے لئے یہ بال بھی مچانات میں سے تھے۔ رسیاں کی رسیاں اور ایسے مضبوط کہ جھے کئی آدمی جھول جائیں تو نہ ٹوٹیں۔

ملکہ نے اپنے مستری کو حکم دیا تھا کہ گلیور کے لئے ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا دے جو وقتاً فوقتاً اس کے کام آسکیں۔ چنانچہ مستری سے دو کرسیوں کے ڈھانچے بنوائے تھے اور اس کو یہ بات جتا دی تھی کہ ان کرسیوں کی پشت اور بیٹھک کی جگہ خالی رہے۔ نہ اس پر کپڑا منڈھے نہ تختے لگائے۔ بلکہ تکیے اور بیٹھنے کے مقام کے گرداگرد کسی نازک برمے سے باریک باریک سوراخ کر دے۔

کرسیوں کے ڈھانچے بن کر آئے تو بڑے خوبصورت تھے۔ دربار میں ہر شخص نے ان کی تعریف کی۔ لیکن حیرت سب کو یہ تھی کہ ننھا آدمی بیٹھے گا کہاں. اور پیٹھ کا سہارا کیا ہے؟ کرسیوں کے ان خالی حصّوں میں کیا چیز لگے گی؟ گلیور کے سوا اس بھید کو کون پا سکتا۔ اُس نے ملکہ کے گرے ہوئے بال لے کر کرسیوں کو بُننا شروع کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہاں بید سے ایسی چیزیں بنی جاتی ہیں۔ اور جب کرسیاں تیار ہو گئیں تو اُس نے اُنہیں تحفتہً ملکہ کے حضور میں پیش کیا۔ ملکہ یہ ننھی ننھی کرسیاں اور گلیور کی صناعی دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئیں۔ حکم دیا کہ ان کو ہمارے عجائب خانہ میں رکھا جائے۔ جو نیا شخص محل میں آتا اُسے وہ کرسیاں دکھائی جاتیں۔ اور دیکھنے والے حیران ہو ہو کر دیکھا کرتے۔

کرسیاں بُننے کے بعد بھی بہت سے بال بچ گئے تھے۔ بہت دنوں تک وہ سوچتا رہا کہ انہیں کس طرح کام میں لائے۔ پھینکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ خیال کرتے کرتے آخر ایک بڑی عمدہ تجویز سوجھ گئی۔ ان بالوں کا اُس نے ایک چھوٹا سا خوبصورت بٹوا بُن ڈالا۔ چھوٹا کتنا؟ قریب قریب پانچ فٹ کا لمبا۔ دیوؤں کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے تو یہ چھوٹا ہی تھا اور اُس پر ملکہ کا نام بھی بناوٹ میں لکھا۔ یہ بٹوا ملکہ معظمہ کو دے کر کہا۔ کہ آپ اس کو اپنی طرف سے زمیندار کی لڑکی کو دیدیجئے۔ گلیور کی اس ادا پر ملکہ بھی بہت خوش ہوئی اور لڑکی کے خوش ہونے کا تو پوچھنا ہی کیا۔ نہال نہال ہو گئی۔

بادشاہ سلامت کو گانا سُننے کا بڑا شوق تھا۔ موسیقی سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں گویوں اور مختلف باجے بجانے والوں کا اکثر مجمع رہتا۔ دوسرے تیسرے دن گانے بجانے کے جلسے ہوتے رہتے۔ ان جلسوں میں کبھی کبھی گلیور بھی بُلایا جاتا۔ گویوں کے قریب اس کا صندوق ایک میز کے اوپر رکھ دیتے۔ لیکن گلیور کو ان لوگوں کے گانے بجانے میں کیا لُطف آتا۔ ان کی معمولی تنن تنن بھی اسے ایسی معلوم ہوتی جیسے فوجی نقارے بج رہے ہیں۔ کان پھٹنے لگتے۔ جب باجے بجنے شروع ہوتے اسے ایسا محسوس ہوتا کہ سمندر میں طوفان آگیا۔ اس قدر خوفناک شور مچتا کہ برداشت نہیں کر سکتا۔

ملکہ نے اپنی مہربانی سے زمیندار کی لڑکی کیلئے بھی ایک اُستاد مقرر کر دیا تھا۔ جو ہفتے میں ایک دو مرتبہ محل میں آکر لڑکی کو گانے بجانے کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ لڑکی کے کمرے میں ایک قسم کا باجہ تھا جس کی صورت پُرانی طرز کے پیانو سے ملتی جلتی سی تھی۔ وہاں کی زبان میں تو اسے کچھ اور ہی کہتے تھے۔ لیکن گلیور اُسے پیانو ہی کہتا۔ اس لئے کہ وہ پیانو ہی کی طرح بجایا جاتا۔

ایک روز گلیور نے سوچا کہ اس معاملہ میں بھی بادشاہ اور ملکہ کو خوش کرنے کی کوئی ترکیب نکالنی چاہیئے۔ بچپن میں اُس نے پیانو پر ہاتھ چلانے سیکھے تھے اور ایک آدھ گت اب تک اسے یاد تھی۔ چنانچہ اس نے دو لکڑیاں لیں اور اتنی بڑی کہ آسانی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ انہیں اپنے مطلب کا بنایا۔ چھیل چھال کر گول کیا۔ اور ایک سرا موٹا رکھا۔ دوسرا پتلا۔ موٹے سرے پر چوہے کی کھال کا ایک ٹکڑا منڈھا۔ کھال منڈھنے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک تو آواز میں کرختگی نہ پیدا ہو دوسرے باجے کے پردوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے

(باقی آئندہ)

غزل

(از علامہ سیماب اکبرآبادی)

دلِ اکثر شکر یہ سنجِ جفائے یار ہوتا ہے　　محبت کرنے والوں کا یہی کردار ہوتا ہے
ازل کے خوابِ کیف انگیز سے سرشار ہوتا ہے　　بڑی مشکل سے ذہنِ آدمی بیدار ہوتا ہے
دلِ اہلِ نظر قبلِ سحر بیدار ہوتا ہے　　یہی وقتِ کشودِ پردۂ اسرار ہوتا ہے
مجھے آتی ہے غیرت دیر اور کعبہ کے فتنوں پر　　کہ جھگڑا بر بنائے آستانِ یار ہوتا ہے
گراں ہوتی نہیں ہے کوئی کیفیت محبت کی　　وہ غم غم ہی نہیں ہوتا جو دِل پر بار ہوتا ہے
وفا کا نام لے یا ذکر کر عجزِ محبت کا　　بہر صورت غرورِ عشق کا اظہار ہوتا ہے
معاذ اللہ ہیجانِ اسیری موسمِ گل میں　　چمن کا ذرہ ذرہ اِنقلاب آثار ہوتا ہے
وہی تنکے چنے جاتے ہیں جو ہوں جانِ گلشن کی　　چمن تاراج کر کے آشیاں تیار ہوتا ہے
اک ایسا نازک آ جاتا ہے لمحہ موسمِ گل میں　　کہ بال و پر کا سایہ بھی چمن پر بار ہوتا ہے
کبھی قرنوں میں محفل منعقد ہوتی ہے ایمن کی　　کبھی صدیوں میں کوئی طالبِ دیدار ہوتا ہے
نظر اُٹھنے پہ مجبور اور سر جھکنے پہ آمادہ　　عجب عالم قریبِ جلوہ گاہِ یار ہوتا ہے

مرے اشعار ہی سیماب ہوتے ہیں گراں اُن پر
مجھی سے شعر پڑھنے کے لئے اِصرار ہوتا ہے

غزل

غیر کو ہرگز نہ آگاہِ مزاجِ دل بنا　　اپنی اک تصویر لے اور پیار کے قابل بنا

تم نے کن نظروں سے دیکھا ہے گلشن کی طرف　　مسکرائے پھول ہر ذرہ دھڑک کر دل بنا

ناخدا کی منتیں کیسی، خدا پہ ناز کر　　نظمِ دریا کو بدل دے موج کو ساحل بنا

گرچہ تھی تخلیقِ انسانی میں بےحد احتیاط　　پھر بھی یہ کم بخت محتاجِ سکونِ دل بنا

اس مصور سے کہ ہے ذی روح جسکی ہر لکیر　　کس طرح کہہ دوں کہ عالم نقشِ باطل بنا

آب و گل میں مدتوں آرائشیں ہوتی رہیں
تب کہیں اک آدمی کونین کا حاصل بنا

از
جناب احسان بن دانش

زندگی کی آرزو

از جناب جاں نثار اختر

نہ صبحِ خندہ حسیں نہ شامِ گیسوئے جمیل
نہ ذرہ رشکِ عدن نہ قطرہ رشکِ سلسبیل
نہ گُل بہار کا امیں نہ خار امن کا کفیل
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ فرقِ سنگ و خشت پر ہے ضو فگن گہر کا تاج
نہ آب و گل کی آبرو نہ کاسہ و سبو کی لاج
نہ گرمِ آشتی کا دل نہ نرمِ تیغ کا مزاج
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ خوشبوؤں کی بستیاں نہ آب و رنگ کے دیار
نہ چاندنی کے گلستاں نہ کہکشاں کے شاخسار
نہ راگنی کی ندیاں نہ زمزموں کے آبشار
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

شرابِ جاوداں ابھی نہ شوقِ جاوداں ابھی
نہ عشقِ کامراں ابھی نہ حسنِ کامراں ابھی
نہ جامِ خور فشاں ابھی نہ بادۂ مہ چکاں ابھی
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ دام میں صبا ابھی نہ دوش پر قمر ابھی
نہ بجلیوں کا قلب چیرتی ہوئی نظر ابھی
نہ وسعتِ خلا میں امتحانِ بال و پر ابھی
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ بامِ عرش پر کمند پھینکتی جوانیاں
نہ مہر و ماہ پر ابھی بشر کی حکمرانیاں
نہ صفحۂ حیات پر دوام کی نشانیاں
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

ابھی تو سعی و فکر ہے ابھی تو جوش و اضطراب
ابھی تو رُوئے دہر سے ہٹا ہے گوشۂ نقاب
ابھی تو بازوؤں میں لے رہا ہے زیست کا شباب
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

اعتبار

(از جناب نہال سیوہاروی)

صبح کے روئے دلِ آرام سے مایوس نہیں
یعنی میں تیرگیٔ شام سے مایوس نہیں

عہدِ شیریں کوئی آئے گا یقیناً کہ یہ دل
تلخیٔ گردشِ ایّام سے مایوس نہیں

پیکِ دلدار کی مشتاق ابھی تک ہے نگاہ
شرفِ نامہ و پیغام سے مایوس نہیں

فرقتِ یارِ گُل اندام سے ہوں صورتِ خار
جلوۂ یارِ گُل اندام سے مایوس نہیں

کرمِ ساقیِ دَوراں سے وہی ہے اُمّید
بادہ کشِ مرحمتِ جام سے مایوس نہیں

ابرِ عرفاں ہے ابھی دل کی فضاؤں پہ محیط
بارشِ نغمۂ الہام سے مایوس نہیں

تا بکے رنگ نہ لائے گا مرا نغمۂ خاص
ردشِ زمزمۂ عام سے مایوس نہیں

چند کرنیں سی ہیں گھنگھور گھٹاؤں میں ہنوز
زندگی کثرتِ آلام سے مایوس نہیں

پھونک دوں گا یہ جہانِ قفس و دام اِک روز
اِس جہانِ قفس و دام سے مایوس نہیں

گرمِ اعلانِ حقائق ہے اسی شان سے عقل
ہاں نہیں فتنۂ اوہام سے مایوس نہیں

ڈال سکتا ہوں نئے قصرِ تمدّن کی بنا
عصرِ ماضی کے در و بام سے مایوس نہیں

رازِ ہستی کہ ازل سے ہے سراسر ابہام
ہمّتِ فکر اس ابہام سے مایوس نہیں

ہے وہی نیشہ زنی خلق کو پیغامِ ثبات
کوہ کن ہوں مگر انجام سے مایوس نہیں

لطمۂ موج کہ از بحرِ جہانیست مرا
می تواں گفت کہ تخلیقِ روانیست مرا

دلّی

(از حضرت فیض جھنجھانوی)

یادِ ایامِ دلِ کون و مکاں تھی دلّی
گوہرِ تاجِ سرِ شاہجہاں تھی دلّی

جذبۂ سینۂ آزاد تھیں جس کی موجیں
گلشنِ دہر میں وہ جوئے رواں تھی دلّی

سر بزانو تھی نظر، سر بگریباں تھا خیال
فرش پہ ہوتے ہوئے عرش نشاں تھی دلّی

جس کے آئینۂ ہر گل میں تھی تصویرِ بہشت
غیرتِ خلد وہ صد رشکِ جناں تھی دلّی

بے نظیر آئینۂ صبح تھا گلبارِ منیر
ہو بہو مثنویٔ سحر بیاں تھی دلّی

کشتۂ جورِ خزاں کے لئے پیغامِ بہار
جسمِ بے جاں کے لئے روحِ رواں تھی دلّی

ساغرِ بادۂ جاں آئینۂ حسن تمام
جلوۂ مہر و مہ و کاہکشاں تھی دلّی

اہلِ فن، اہلِ ہنر، اہلِ سخن، اہلِ کمال
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ زباں تھی دلّی

چاک ہوتے تھے یہاں چہرۂ ہستی کے نقاب
سچ تو یہ ہے کہ عیاں راچہ بیاں تھی دلّی

اب مگر داغ دلِ پیر و جواں ہے دلّی
خونِ دل، چاکِ جگر، سوزِ نہاں ہے دلّی

ذرّے ذرّے میں ہے آزادیٔ مرحوم کی نعش
نعشِ نالہ و فریاد و فغاں ہے دلّی

جز بلا عیش کا وہ ثمرِ پر کیف کہاں
سازِ اندوہ پہ اب نغمۂ خزاں ہے دلی

سرنگوں غنچے، گل آزردہ، خیاباں تاراج
سوزِ دلِ کشتۂ شمشیرِ خزاں ہے دلی

داغِ غم ہوں جسے دیکھ کے اربابِ نشاط
بزمِ عالم میں وہ دھندلا سا نشاں ہے دلی

چہرۂ عالمِ مظلوم پہ اک مدت سے
صورتِ دیدۂ خونناب نشاں ہے دلی

کیوں نہ ہو سر بگریباں دلِ ناموس پسند
عرصۂ دہر میں بے تیر و کماں ہے دلی

خوں نہ ہو جائے کہیں حسن کے دلِ کون و مکاں
کیا کہوں کل تھی کہاں آج کہاں ہے دلی

کاش پھر وجہِ سکونِ دل و جاں ہو دلی
رونقِ انجمنِ کون و مکاں ہو دلی

ضو بکف اہلِ گلستاں کی نگاہیں ہو جائیں
پردۂ گل سے کچھ اس طرح عیاں ہو دلی

عنبر افشاں ہوں نسیمِ سحری کے جھونکے
مثلِ شاخِ گلِ تر رقص کناں ہو دلی

دن کو ہر ذرۂ بیتاب میں خورشید بکف
رات کو شمعِ شبستانِ جہاں ہو دلی

خوں بہائے دلِ بسمل میں ملے خونِ عدو
صاحبِ خنجر و شمشیر و سناں ہو دلی

جس کے پرتو سے صد آئینہ بکف ہوں غنچے
شیشۂ گل میں وہ تصویرِ جناں ہو دلی

جی اٹھیں مردۂ صد سالہ بیک جنبشِ لب
شافیِ کُل وہ مسیحائے زماں ہو دلی

فرشِ رہ دیدہ و دل، شمس و قمر سر بسجود
سر بپا یک نگہِ حسنِ جواں ہو دلی

دستِ ہر غنچۂ رنگیں میں ہو قانونِ بہار
فیض یوں منتقمِ جورِ خزاں ہو دلی

کیفِ نظر

(از جناب نعمان تاثیر)

بزمِ تصوّرات میں وہ جلوہ گر ہے آج
یا یہ کوئی فریبِ جنونِ نظر ہے آج

چشمِ مجازِ عشق حقیقت نگر ہے آج
جو دل میں جاگزیں تھا وہ پیشِ نظر ہے آج

میں ہوں کہ پھر بھی آہ سے مجھ کو گریز ہے
گو سن رہا ہوں وا درِ بابِ اثر ہے آج

وہ جلوہ گر ہیں اور میں پہچانتا نہیں
کتنا عجیب رنگِ مذاقِ نظر ہے آج

طعنِ شکستِ ضبط و فغاں دے نہ اے ندیم
بے چارگی میں آنکھ اگر میری تر ہے آج

ہے دل کے اضطراب کی غایت کوئی ضرور
شاید وہ میری روح سے نزدیک تر ہے آج

بے رحم اپنی نیم نگاہی سے لے جواب
کیوں میرے دل کا صبر و سکوں منتشر ہے آج

سنتا ہوں وہ بھی ہیں خلش اندوزِ آرزو
شاید دعائے نیم شبی کارگر ہے آج

پھر پا بہ جستجو ہیں کہیں دے ندائے شوق
پھر دل تری تلاش میں گرمِ سفر ہے آج

وہ جنّتِ نگاہ، شفق زینتِ نظر
ہر شام آرزو کی برنگِ سحر ہے آج

تاثیر سامنے ہے مرا مرکزِ خیال
ہاں جھک اعترافِ عظمتِ سحر ہے آج

انتباہِ آخری

(از محترمہ ارجمند دبیر نکہت جھنجھانوی)

اے تغافل کیش مرد! اے حامیٔ تہذیبِ خام — تا بہ کے رکھے گا تو عورت کو مجبورِ غلام
دیکھ آنکھیں کھول کر دنیا کا بدلا ہے نظام — کب تک آخر کر سکے گا تو بتا یہ روک تھام
تیرے قدموں پر رہے گا تا بہ کے عورت کا سر — تا بہ کے کرتا رہے گا تلخ گوئی سے کلام
عورتیں تنگ آ چکی ہیں تیرے سخت آئین سے — رہ سکے گا تو نہ اب اپنی طریقت کا امام
وہ گھڑی نزدیک ہے اے بندۂ اغراض جب — تیرے ہاتھوں میں نہ ہوگی صنفِ نازک کی زمام
تا بہ کے عورت پہ یہ تیری تعدی تا بہ کے؟ — تیرے استبداد کا کتنے دنوں آخر قیام؟
وہ جو کہلاتی رہی تیری کنیزِ خانہ زاد — تا بہ کے کرتا رہے گا زندگی اس کی حرام
تجھ پہ کھل جائے گا اس مجبور و بیکس کا وقار — کفشِ پا اپنی جگہ تو جس کو سمجھا تھا مدام
تجھ کو ظاہر ہوگا عورت ہے برابر کی شریک — حد سے گذرا ظلم تیرا کچھ نہیں اس میں کلام
جس کو رکھ چھوڑا تھا تو نے ٹھوکروں میں آج تک — وقت آیا ہے کرے اس کا زمانہ احترام
نسلِ آدم جس سے باقی ہو اسی عورت کو مرد — اس قدر ذلت سے دیکھے، ہے تعجب کا مقام
مرد عورت پہ حکومت کر چکا، بس کر چکا — ختم ہوتا ہے بس اب قانونِ آقا و غلام
توڑتا آتا تھا تو صدیوں سے جس پہ ظلم و جور — پی لیا ہے اس نے عہدِ نو میں آزادی کا جام
چاہیے تجھ کو کہ سن لے اس کو گوشِ ہوش سے — ہے زباں نکہت کی لیکن ہے یہ عورت کا پیام

اس زمانہ میں یہ تیری خودسری بیکار ہے
یاد رکھ عورت بھی آخر زیست کی حقدار ہے

فلمی خبریں

(از مسیح [illegible])

ٹرپلیٹ پچھلے دنوں ایک معاشرتی فلم صلح کی تیاری میں مصروف رہی۔ فلم کی کہانی ہندستانی سماج اور اسکے مسائل کا آئینہ ہے۔ [illegible] ڈائرکٹر [illegible] بوس نے اس فلم پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ فلم میں [illegible] کے لئے جمنا کا انتخاب کرکے ارباب حل و عقد نے خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ جمنا نے دیوداس اور جواب میں اداکاری کرکے جو شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے وہ شائقین فلم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس فلم کا دوسرا نمایاں پہلو بنگال کے مشہور کیریکٹر ایکٹر [illegible] چودھری کی اداکاری ہے۔ یہ فلم دہلی میں جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کے ہاں بک ہوگیا ہے۔

راج کمل کلامندر کا تیار کیا ہوا فلم شکنتلا میجسٹک سینما دہلی میں سلور جوبلی منا رہا ہے۔ اس فلم پر ہندستان کے مشہور و مستند ڈائرکٹر مسٹر شانتارام بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ فلم کی کہانی کالیداس کے شہرۂ آفاق ڈرامہ شکنتلا پر ہے۔ فلمی ضروریات کے ماتحت کہیں کہیں ترمیم و اضافے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس فلم میں پس منظر پیش کرنے کے سلسلہ میں فاضل ڈائرکٹر نے جو کمال دکھایا ہے وہ آپ اپنا جواب ہے۔

شوری پکچرز نے خاص اہتمام کے ساتھ ایک پنجابی فلم کوئل تیار کیا ہے۔ یہ فلم اپنی [illegible] خصوصیات کی بنا پر تمام پچھلے پنجابی فلموں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس فلم کی [illegible] پر غیر معمولی توجہ صرف کی ہے۔ موسیقی امرناتھ کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے۔ فلم کی [illegible] ستیش اور منورما ہیں۔ اس کمپنی کا دوسرا فلم "شالامار" بھی بہت جلد پبلک کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔

رامنک پروڈکشن نے ایک شاندار رومانی فلم کرانتی تیار کیا ہے۔ مشہور ڈائرکٹر مسٹر [illegible] نے اس فلم کو پیش کرکے اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس فلم میں مشہور و مقبول اداکار اشوک کمار اور لیلا چٹنس کی اداکاری شائقین فلم کے لئے خاص طور پر باعث دلچسپی ہے۔ اس فلم میں اداکاری کے علاوہ موسیقی کا بھی اچھا معیار پیش کیا گیا ہے۔ یہ فلم [illegible] پکچرز نے دہلی کیلئے [illegible] خرید کرلئے ہیں۔

[illegible] پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم [illegible] موتی ٹاکیز دہلی میں بڑی دھوم سے چل رہا ہے۔ فلم کی کہانی [illegible] کہانی میں اصلاح کے ساتھ ساتھ مذاق کے چٹخارے خاص طور پر لطف کا باعث ہیں۔ یہ فلم بمبئی، لاہور، کلکتہ اور [illegible] میں بھی غیر معمولی کامیابی حاصل کرچکا ہے۔ اس فلم کے اداکاروں میں [illegible]، سندرا اور روپیکا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

محبوب پروڈکشنز ہندستان کے مشہور ڈائرکٹر محبوب نے "نجمہ" جیسا کامیاب فلم پیش کرکے شائقین فلم میں جو مقبولیت حاصل کرلی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ "نجمہ" ایک عرصہ تک [illegible] شائقین فلم کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اب ڈائرکٹر محبوب نے ایک دوسرا معاشرتی فلم "تقدیر" پیش کیا ہے۔ یہ فلم خالص ہندستانی تہذیب و معاشرت کا مرقع ہے۔ اس فلم میں رومان، مذاق اور موسیقی کا ایک نہایت خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ اس فلم کی روح رواں مشہور و معروف اداکار چندر موہن، چارلی، موتی لال، نرگس اور [illegible] ہیں۔

پردھان پکچرز نے اپنا پہلا فلم "داسی" بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تیار کیا ہے۔ اس فلم میں اداکاری اور موسیقی کا اچھا معیار پیش کیا گیا ہے۔ ڈائرکیٹر ہرن بوس نے اس فلم کو ایک کامیاب حیثیت سے پیش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے۔ موسیقی ہندستان کے شہرت یافتہ ماہر موسیقی پنڈت امرناتھ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس فلم کے گیت اور مکالمے مسٹر [illegible] نے لکھے ہیں جنہوں نے فلمی گیت لکھنے میں کمال حاصل کیا ہے۔ اس فلم میں راگنی، نجم الحسن، گیانی، کلاوتی، اور بے بی [illegible] کی اداکاری خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

اس فلم کی کہانی ڈی۔ ایم۔ پنچولی نے لکھی ہے۔ یہ فلم ہندستان میں سب سے پہلی مرتبہ منروا ٹاکیز دہلی میں دکھایا جائیگا۔ اس کی نمائش کیلئے خاص طور پر انتظامات ہو رہے ہیں۔

رنجیت مووی ٹون کے زیر اہتمام مشہور و معروف ڈائرکیٹر مسٹر کیدار شرما نے ایک شاندار فلم "گوری" پیش کیا ہے۔ اس فلم میں ایک سماجی کہانی پیش کی گئی ہے۔ اس فلم کے گیت اور مکالمے بھی ڈائرکٹر کیدار شرما کی توجہ کا نتیجہ ہیں۔ اس فلم میں سماجی مسائل، محبت کی تڑپ، موسیقی کا اعجاز سب کچھ پوری کامیابی کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہ فلم اپنی تمام خصوصیات کی بنا پر ایک بلند پایہ معیاری فلم ہے۔ اس فلم میں پرتھوی راج اور مونیکا دیسائی نے اداکاری کرکے اپنے پچھلے کارناموں پر سبقت ثابت کردی ہے۔ گوری ان دنوں [illegible] سنیما دہلی میں پبلک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

رنجیت مووی ٹون کا ایک دوسرا فلم "[illegible] دنیا" بھی بہت جلد پیش ہونے والا ہے۔ "[illegible] دنیا" کی روح رواں موتی لال، [illegible] شانتی، شیخ مختار، کنھیا لال اور [illegible] ہیں۔

نیشنل وار فرنٹ

یعنے قومی محاذِ جنگ کا مقصد

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذِ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امنِ عامہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض ومقاصد فلاح و بہبودی کے لئے ہیں۔

نیشنل وار فرنٹ چاہتا ہے کہ امن عامہ قائم رکھنے کیلئے عوام کا تعاون حاصل کیا جائے اور بدامنی کے ذرائع کو دُور کیا جائے۔ ہندستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کیا جائے اور اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ بدمعاش اور غنڈوں کی سخت نگرانی کی جائے۔ اوران کے انسداد کے لئے عوام کی امداد حاصل کی جائے۔ غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کی جائے۔ ایسی خبروں اور افواہوں کو پھیلنے سے روکا جائے۔ پانچویں کالم یعنی دشمن کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگایا جائے اور اُن کی نگرانی کی جائے تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔ کھانے پینے اور ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کو انکی مقررہ قیمت پر فروخت کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اور ناجائز منافع بازی سے روکا جائے۔ زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کی جائے اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کیا جائے۔ شہری بچاؤ اور ہوائی حملہ سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنے کی جانب عوام النّاس کی توجہ دلائی جائے۔ اور ان کے فوائد عوام کے ذہن نشین کرایا جائے۔ شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنے کی کوشش کی جائے۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض ومقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ عوام النّاس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور تعاون کرکے عوام النّاس کی فلاح و بہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ

نمبر ۲۵۔ راجپور روڈ۔ دہلی

عالیجناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کا نادر الوجود عطیہ

جبیان

یہ عجیب و غریب دوا جریان کیلئے تیر بہدف ثابت ہو چکی ہے

لیکن

اس خاص مرض کے علاوہ بھی یہ تمام اعصابی اور دل و دماغ کی قوت کو بحال کرتی ہے

ناتوانی توانائی سے، بڑھاپا جوانی سے اور مایوسی اُمید سے تبدیل ہو جاتی ہے

عضو میں تازہ خون گردش کرنے لگتا ہے

چہرے پر پُر جوش جوانی کی سُرخی جھلکنے لگتی ہے

اس کے چند روزہ استعمال سے اکثر مایوس العلاج نوجوانوں نے دوبارہ کھوئی ہوئی زندگی پائی ہے

قیمت ۳۲ قرص کی شیشی ۸ر ۶۴ قرص کی شیشی ۶ر

تار کا پتہ:- میڈیسنز دہلی

ملنے کا پتہ:- منیجر ہندوستانی دواخانہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۵۔ دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶



راج کمل کلامندر کی انوکھی پیشکش
شکنتلا
ڈائرکٹر — وی شانتارام
مکالمے — دیوان شرر
ایک عظیم الشان اور لافانی شاہکار
مشرق کے
غیر فانی شاعر
کالیداس کا غیر فانی ڈرامہ
جس میں
کائنات کی مصوری اور بہشت کا
حسن نمایاں ہے
اداکاران
جے شری
چندر موہن
وغیرہ
میجسٹک سنیما میں سلور جوبلی منائی جارہی ہے
جاری کردہ:- جنرل ٹاکیز لمیٹڈ - دہلی


مسکراہٹ کے ساتھ ایک ترقی پسند پیغام!!
تلوار پروڈکشنز کا
گراں قدر سوشل شاہکار
مزاحیہ اور اصلاحی سوشل پیش کش
اداکاران
رمولا
شنکر
گیانی
امر
منورما
روپ لیکھا
بمبئی۔ لاہور۔ کلکتہ اور پشاور میں عظیم الشان کامیابی حاصل کر رہا ہے
موتی ٹاکیز دہلی میں بڑی آب و تاب سے چل رہا ہے
وادیا پیراماؤنٹ پکچرز — دہلی، لاہور

پہلا کارنامہ

میوزک:-
پنڈت
امرناتھ
ہز ماسٹرز وائس
کے
شہرت یافتہ

منروا سینما
میں
عنقریب آرہا ہے

افسانہ:-
ڈی۔ ایم پنچولی

ڈائرکٹر:-
ہرن بوس
...یت و مکالمے
ڈی۔ این
مدھوک

(م) ہزاروں دولت کی مہارت اور تجربہ کاریوں کا یادگار شاہکار

اداکاران:-
راگنی۔ نجم الحسن۔ گیانی۔ کلاوتی۔ بے بی پروین
جی، این بٹ، اوم پرکاش وغیرہ

جاری کردہ:-
ایمپائر ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی۔ لاہور

تیار ہو رہا ہے!
پنچولی کا انمول فلم بیش قیمت ساز و سامان کے ساتھ
شیریں فرہاد
اداکاران:-
راگنی - جینت - غلام قادر وغیرہ
ڈائرکٹر:- پرہلاد دت

نخشب کی معرکۃ الآرا پیشکش

گوری

گیت، مکالمے اور ڈائرکشن
مشہور و مستند ڈائرکٹر
کیدار شرما
کی کوششوں کا نتیجہ ہے

محبت کی شعلہ انگیزی!
جذبات کی کشمکش!!
روح کی تڑپ!!!
ایک بلند پایہ سماجی داستان
جس میں
پرتھوی راج اور مونیکا دیسائی نے اپنے
پچھلے کارناموں پر سبقت ثابت کردی ہے
دوسرے اداکار
شمیم۔ لاجکماری۔ بھگوانداس۔ کملا چیٹرجی۔ نگندرا۔
راجندرا

رٹز سنیما دہلی میں رش لے رہا ہے

نخشب کی عظیم الشان پیش کش

پگلی دنیا

سحر آفریں رومان —— دل کو تڑپا دینے والی داستان
جس میں
دنیائے فلم کے مشہور و تابندہ ستارے موتی لال اور ممتاز شانتی
ایک ساتھ نظر آتے ہیں
ان کے علاوہ
شیخ مختار۔ کنہیا لال۔ اشرف۔ پرتیما۔ کیسری۔ ہادی
نے اداکاری کا کمال پیش کیا ہے
ڈائرکٹر: —— ایس۔ پی۔ ایرانی
عنقریب آرہا ہے

جاری کردہ:- جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی۔ لاہور۔ کراچی

نیا ترانہ

[illegible]

خواص و عوام دونوں کیلئے یکساں دلچسپ

نئے رجحانات کا آئینہ

سحر آفریں رقص!

وجد آور موسیقی!!

(اداکاران)

سنیہہ پربھا — جے راج — ڈیوڈ

کہانی مشہور اہل قلم خواجہ احمد عباس کے قلم کا نتیجہ ہے

ڈائرکٹر: — نجم نقوی

کمار ٹاکیز دہلی میں ۲ جون سے چل رہا ہے

جاری کردہ

موتی … چاندنی چوک دہلی

واپس

[illegible]

اس فلم میں مشہور و ہر دلعزیز ہیروئن

بھارتی

نے کام کیا ہے

ساتھ میں

نواب ۔ اشیت برن ۔ لتیکا وغیرہ نے

بھی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں

ڈائرکٹر: — شیم چندر

کہانی: — بنلئے بنرجی

موسیقی: — آر سی بورل

جگت سینما دہلی میں

ساتویں ہفتہ میں رش لے رہا ہے

جاری کردہ

جگت پکچرز ڈسٹری بیوٹرز ۔ دہلی ۔ لاہور ۔ کراچی

[illegible] (کیز [illegible])

[illegible] اشاعت میں [illegible] کرایا جا چکا ہے۔ اس ارتقائی اور [illegible] خواہ
امتیاز نے گا۔ آمیر مینائی کا قول ہے کہ خواہ زمین کتنی ہی پست کیوں نہ ہو گر شعر اچھا کہنا چاہیئے۔ کہ [illegible]
اصل کے مطابق اس غزل پر دارا ہے۔ اور شہرت کو اپنا کر [illegible] لیا ہے۔ پڑھئے اور سر دھنیئے۔ (ایڈیٹر [illegible])

دیدۂ جاناں میں عکسِ چشمِ تر دیکھا کئے
ڈوبتی کشتی کا منظر [illegible]

حسن نے شکوہ بقدرِ امتیازِ عشق تھا
آنکھ ملتے ہی ترا [illegible]

گرمیِ محفل تھا جامِ شعلہ و شبنم بھرا
کینہ گر فانوس میں [illegible]

قیس رقصاں تھا بہ توصیفِ نگاہِ امتیاز
محملِ لیلےٰ میں ہم [illegible]

شمعِ سوزاں سے وہاں حسنِ فروزاں کم نہ تھا
بزم میں پروانے [illegible]

ہم بلا نوشوں کا جامِ صبر کیوں چھلکا گیا
چشمِ ساقی کی طرف [illegible]

جلوۂ تاباں نہ تھا شرمندۂ گردِ فلک
آئینہ میں [illegible]

اختلافِ حسن سے [illegible]
[illegible]

[illegible] جانب کی [illegible]
[illegible] دو [illegible] آ [illegible]



پنچولی آرٹ پکچرز کے مالک اور فلم ''داسی'' کے خالق
مسٹر دلسکھ ایم پنچولی





فلم ''داسی'' میں مسٹر نجم الحسن



راگنی فلم ''داسی'' میں

(نیچے) مس بھارتی - فلم ''واپس'' میں



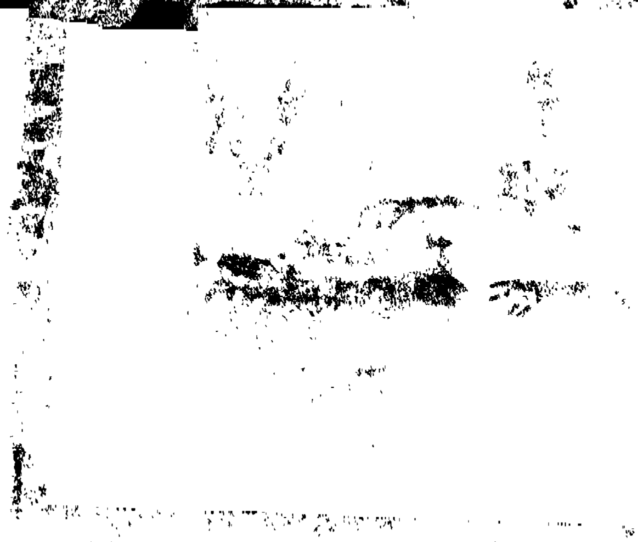
Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi.
Edited by Fasih-ud-din Ahmad M. A. and M. I. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)







ور جہاں فلم ''لال حویلی'' میں

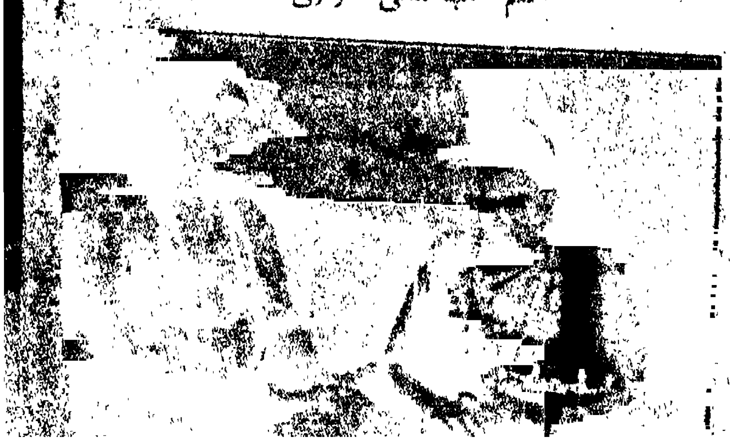


نجم الحسن اور راگنی فلم ''داسی'' میں

حسن راگنی فلم ''داسی'' میں



فلم ''مہا ستی ساوتری'' کا ایک منظر





ادیب

[illegible] ایم اے — [illegible] بی اے

[illegible] | ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء | [illegible]

فہرست مضامین

نئی کتابیں

(از نسیم الدین احمد ...)

بچوں کی کتابیں

از ابو تمیم فریدآبادی
شائع کردہ بک ڈپو انجمن ترقی اردو۔ دہلی

(۱) کالا دیو (۲) چتلا دیو (۳) پیلا دیو

(۴) لال دیو (۵) سبزہ پری (۶) ژالہ پری

(۷) لالہ پری

خوشی کی بات ہے کچھ عرصہ سے ہمارے بعض شگفتہ نگار اہل قلم حضرات نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ کی ہے یہ یقیناً ایک تعمیری اقدام ہے اور اس پر ایک نئی نسل کی تربیت ذہنی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یہ کام بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں اس کیلئے خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اور اس کے ساتھ ساتھ سیدھی سادی زبان پر قابو ایسے ادب کے ضروری عناصر ہیں۔ زیر نظر مختصر رسالے حضرت ابو تمیم فریدآبادی کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔

سیدھی سادی اور دلکش زبان میں یہ کہانیاں نہ صرف بچوں کے لئے دلچسپ ہیں بلکہ ان میں ہمت و جرات کا سبق بھی ملتا ہے۔ زبان اور نفس کے اعتبار سے یہ کہانیاں بچوں کے ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔

(۸) گدھوں میں بیداری

از سید ابو تمیم فریدآبادی
شائع کردہ بک ڈپو انجمن ترقی اردو دہلی۔ قیمت ۸/

زیر نظر کتاب جناب ابو تمیم فریدآبادی کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ تمیم صاحب اس سے قبل مزاحیہ افسانے لکھتے رہے ہیں۔ ایسے

افسانوں کا ایک دلکش مجموعہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ زیر نظر مضامین بھی ان کے خاص طرز نگارش کا آئینہ ہیں۔ ان مضامین میں جا بجا بے ساختہ پن ہے۔ زبان صاف و شستہ ہے۔ یہ مضامین مجموعی حیثیت سے اپنا ایک خاص وزن رکھتے ہیں۔ امید ہے ہلکے پھلکے ادب کے شائقین ان مضامین کا خیر مقدم کریں گے۔

(۹) شمع فروزاں

ترجمہ جناب صادق الخیری۔ ایم، اے
شائع کردہ خاتون کتاب گھر اردو بازار دہلی۔ قیمت ۸/

زیر نظر کتاب امریکہ کی شہرۂ آفاق مصنفہ مسز پرل بک کے ایک شاہکار ناول (ناولٹ) کا ترجمہ ہے۔ جو اردو کے مشہور و جانے پہچانے نگار ادیب صادق الخیری کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مسز پرل بک دور حاضر کے ان مصنفوں میں ہیں جنہوں نے بہت جلد بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اپنے بہترین ناولوں کے لئے انہوں نے چین سے مواد حاصل کیا ہے۔ انکی کتاب "گڈ ارتھ" کا شمار اس دور کے بہترین ناولوں میں کیا جاتا ہے۔ کسی خاتون مصنف کا نوبل پرائز حاصل کرنا یقیناً اس کے لئے ایک باعث فخر انعام ہے اور پرل بک نے اپنے ناولوں کی بنیاد پر خود کو بجا طور پر اس کا مستحق ثابت کیا ہے۔ ان کی زیر نظر کتاب بھی چین کے کردار پیش کرتی ہے۔ یہ دو مخلوط ہوتے ہوئے تمدن کی داستان ہے۔ اس میں نئی اور پرانی تہذیب کے تصادم اور میل سے پیدا ہونے والے اثرات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے سماج میں از خود پیدا ہونے والی قدریں کیا کیا صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ ترجمہ کی زبان مخصوص دلکشی رکھتی ہے۔ ہم اس کے لئے صادق الخیری صاحب کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔ سادہ ترجمہ اور مناسب ہے۔ کتاب [illegible] خوبصورت کے علاوہ ظاہری حسن کی بنا پر بھی قابل توجہ ہے۔ [illegible]

[illegible] کے ساتھ جاری رکھا جائیگا۔

(۱۰) زہراب

از محمود احمد خاں۔ ایم اے

شائع کردہ خاتون کتاب گھر۔ آردو بازار دہلی۔ قیمت ایک روپیہ

زیر نظر کتاب بھی مندرجہ بالا سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ بتایا جا چکا ہے کہ خاتون کتاب گھر کے مہتمم صادق الخیری صاحب نے مختصر ناولوں کا ایک نہایت دلکش سلسلہ شروع کیا ہے۔ کاغذ کے اس گرانی اور نایابی کے دور میں ایک ایسی نئی مہم کا شروع کرنا یقیناً بلند حوصلگی کا ثبوت ہے۔ یہ مختصر ناول بھی بہت دلچسپ ہے۔ ناول کے پلاٹ کا ارتقا سرزمین مصر کے رومان انگیز شہر اسکندریہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مصر کے ماحول میں ایک مفلس یونانی لڑکی کی داستان قلمبند کی گئی ہے۔ یہ داستان اپنے اندر نہایت عبرتناک واقعات رکھتی ہے ناموس و غیرت کی کشمکش اس ناول کی بنیاد ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ افلاس کا شکنجہ کس قدر مضبوط اور مستحکم ہے۔ کیسے کیسے حالات پیدا ہو کر ایک عفت مآب نازنین کو آبرو کھونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود اسکے دامن کو کوئی سنجیدہ منطق آلودہ اور داغدار نہیں کہہ سکتی۔ ناول شروع سے آخر تک دلچسپ اور مؤثر ہے۔ ترجمہ محمود احمد خاں صاحب ایم اے کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جو ادبی دنیا میں نووارد ہیں۔ مگر ان کے اسلوب نگارش کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے سامنے شاندار مستقبل رکھتے ہیں۔ آن کی تازہ ترین کوشش کا امید ہے کہ گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جائیگا۔ کتاب کا نام نفس کے اعتبار سے نہایت مناسب ہے۔

(۱۱) قید خانہ

از جناب احمد علی ایم اے

شائع کردہ انڈیا پبلشرز دہلی۔ قیمت ۸؎

احمد علی صاحب دور حاضر کے اُن چند ادیبوں میں ہیں جو نہ صرف اردو داں حلقہ میں روشناس ہیں بلکہ ان کی شہرت ہندوستان سے باہر بھی پہنچ چکی ہے۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں میں یکساں بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ حال میں ان کے ایک انگریزی ناول "ٹوائی لائٹ ان ڈیلی" نے انہیں [illegible] شہرت رکھنے والے نوجوان ادیبوں میں ایک نمایاں مرتبہ دیا ہے [illegible] آن کی بڑھتی ہوئی شہرت اور مقبولیت دیکھتے [illegible] کہ ان کی یہ تازہ کوشش بھی اب اردو ادب کی طرف ان کی توجہ ہو جائے۔

گاؤں کے زیر نظر مجموعہ کو دیکھکر ہماری مایوسی جاتی رہی۔ موجودہ کتاب ان کے چار افسانوں پر مشتمل ہے جو کافی وقفہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں ماحول کی عکاسی تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس باب میں مصنف کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ خواہ مخواہ کی رنگینی اور رومانیت سے مصنف گریز کرتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو صداقت کے ساتھ پیش کرنے کا قائل ہے۔ اور یہی بات ان افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت اور انکے ترقی پسند ہونے کی ضامن ہے۔ یہ افسانے یقیناً ہمارے ترقی پسند ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔

(۱۲) گہما گہمی

از جناب ممتاز مفتی

شائع کردہ ادارۂ ادبیات نو۔ ٹمپل روڈ لاہور۔ قیمت ۱۲/ ۱؎

ممتاز مفتی صاحب اس دور کے اچھے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انکے افسانے ملک کے متعدد رسالوں میں شائع ہو کر ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ انکے افسانوں کے کردار درمیانی طبقے کے افراد ہوتے ہیں جن کی زندگی کے مسائل سے وہ بہت قریب سے واقف ہیں۔ وہ تیز قوت مشاہدہ کے مالک ہیں اور جس ماحول کی عکاسی کرتے ہیں اسکی ضدوں، پیچیدگیوں اور نزاکتوں پر نظر رکھتے ہیں۔ طرز ادا میں شوخی اور دھیما خنکی پائی جاتی ہے۔ یہی چیز اُن افسانوں کے مؤثر اور کامیاب ہونے کی ضامن ہے۔ پلاٹ میں تنوع پایا جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ ہمارے افسانوی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

(۱۳) مداوا

از جناب فرحت علی، اے

شائع کردہ یوسفی پریس لکھنؤ۔ قیمت چار آنے

ترقی پسند ادب اور نیا ادب پر پچھلے چند مہینوں میں بہت کافی بحث ہو چکی ہے۔ ملک کا شاید ہی کوئی ایسا جریدہ ہو جس میں اس موضوع پر کسی نہ کسی صورت میں اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ زیر نظر کتاب چند دوستان لکھنؤ نے بعض موجودہ ادبی رجحانات سے متاثر ہو کر مرتب کی ہے۔ یہ کتاب پورے چار سو بیالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اپنے اندر نظم و نثر، طنز و تنقید کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتی ہے۔ "بیلنک ورس" پر "پیروڈی" کے بعض نمونے نہایت دلچسپ ہیں۔ اس کے علاوہ نئے رجحانات پر بعض مستند اہل قلم کے خیالات بھی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں ہدف ملامت پنجاب کے نئے شعرا ہیں۔ جس سے ایک خطرناک غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ جمعیت اور اخوت کے اس زمانہ میں صوبہ دارانہ تعصب کو چھیڑنا نہایت افسوسناک بات ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی اور توی ہو جاتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے کتاب اپنے اندر بہت سے دلچسپ اور عبرتناک پہلو رکھتی ہے۔ اور یقیناً اس کی ترتیب میں بڑی کاوش کا ثبوت دیا گیا ہے۔

سلسلہ گنجینۂ ادب ۱۰ مئی ۱۹۴۳ء

اگلے وقتوں کی باتیں

(از جناب پرنسپل مشتاق احمد صاحب زاہدی)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر نے ہندوؤں کے ساتھ خاص مراعات کیں۔ مگر جہاں امرا کا سوال ہے تو مندرجہ بالا اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ ہندو امرا وشاہجہاں کے زمانے میں تھے۔ اور اس کے بعد عالمگیر کے عہد میں۔ اور اعلیٰ ترین منصب یعنی ہفت ہزاری میں عالمگیر نے سب سے زیادہ ہندو داخل کئے۔

امرا کی تنخواہ کے سلسلے میں روپے کی قدر وقیمت کا ذکر ضروری ہے۔ آج کل روپے کا چار سیر زیادہ سے زیادہ گیہوں آتا ہے۔ عام طور پر بھی دس سیر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس زمانے کے بھاؤ کی تفصیل دینی غیر ضروری ہے۔ لیکن مقابلتہً اگلے وقتوں کا بھاؤ معلوم کرنے سے اس زمانے کے روپے کی قدر معلوم ہو جائیگی۔ تاریخ فرشتہ میں علاء الدین خلجی کے عہد کا وہ بھاؤ درج ہے جو کہ اس نے قحط اور جنگ کے زمانے میں راشننگ کے طریق پر مقرر کئے تھے اور جسکو اب تقریباً چھ سو برس ہو گئے۔ پہلے ہم کو اس زمانے کے سکوں اور اوزان کا حال معلوم کرنا چاہیئے۔ بڑے سکے تنکہ کہلاتے تھے جو سونے کے علیحدہ اور چاندی کے علیحدہ ہوتے تھے۔ چاندی کے ایک تنکہ میں پوری ایک تولہ خالص چاندی ہوتی تھی۔ جسکو ہمارے روپے کی برابر سمجھنا چاہیئے۔ گو ہمارے زمانے کے روپے میں قدرے کھوٹ بھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ چھوٹے سکوں میں جیتل تھا جو تانبے کا ہوتا تھا اور اسے پول بھی کہتے تھے۔ پچاس جیتل کا ایک چاندی کا تنکہ ہوتا تھا۔ آج کل چونسٹھ پیسوں کا روپیہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک جیتل کی قیمت ہمارے پیسے سے کچھ زیادہ ہی ہوئی۔ اوزان کا یہ حال تھا کہ اس وقت کا ایک من تو چالیس سیر کا ہوتا تھا جیسے اب۔ لیکن ایک سیر چوبیس تولے کا ہوتا تھا اور آج کل اسی تولے کا ہوتا ہے۔ اس طرح اس وقت کا ایک من آج کل کے بارہ سیر کا ہوتا تھا۔ عمدہ قسم کے گندم کی قیمت راشننگ کے حساب سے سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں فی من یعنی بارہ سیر ۷½ جیتل تھی۔ اربعہ کے قاعدے سے ۷½ جیتل کا اگر ۱۲ سیر گندم آیا تو ۵۰ جیتل یعنی ایک تنکہ نقرئی (جو آج کل کے ایک روپیہ کی برابر کا تھا) کا ۸۰ سیر یعنی آج کل کے دو من آیا۔ اسی طرح نخود یعنی چنے کی قیمت فی بارہ سیر یعنی قدیم من پانچ جیتل تھی جو حساب سے ایک روپے کے تین من [illegible] تھے اور ماش کی دال بھی روپے کی تین من تھی۔ شکر کا بھاؤ یا بورہ کی قیمت ایک روپے کی آج کل کے حساب سے آٹھ سیر۔ شکر سرخ کی قیمت ایک پیسہ کی ۳۲ سیر تھی۔ تیل روپے کا ایک من۔ نمک ایک روپے کا ۷۵ سیر یعنی ایک من ۳۵ سیر۔ اشیاء خوردنی جب اس قدر سستی تھیں تب لوگ کم تنخواہوں میں بھی آرام سے رہ سکتے تھے۔ صرف گندم کی قیمت ہی سے اندازہ کیا جاوے تو اب ایک روپیہ کے چار سیر گندم آتے ہیں اور اس وقت ۸۰ سیر آتے تھے۔ لہذا اس وقت کا ایک روپیہ آج کل کے بیس روپے کے برابر تھا۔ یہ قیمتیں قحط اور جنگ کے زمانے کی ہیں۔ اس لئے مقابلہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب اگر پیدل سپاہی کی تنخواہ اس وقت چھ روپے سے ساڑھے بارہ روپے تھی تو آج کل کے حساب سے اس کو ایک سو بیس روپے سے دو سو پچاس روپے تک تنخواہ ملی۔ آج کل گورنمنٹ آف انڈیا کے کلرکوں کو جو ڈیڑھ سو سے ڈھائی سو یا تین سو کا گریڈ مل جاتا ہے تو وہ بڑا فخر کرتے ہیں کہ ہم شاہی محکمے میں ہیں۔ حالانکہ شاہی زمانے کے پیادوں کو یہ تنخواہ ملتی تھی۔ امرا کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ یہاں آج کل کی رقم سے وائسرائے کو صرف پچیس ہزار ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اس وقت ہفت ہزاری کو اگر پینتالیس ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی تو آج کل کی رقم کے حساب سے اس رقم کو بیس گنا بڑھا لینا چاہیئے۔ یعنی نو لاکھ روپے ماہوار تنخواہ ہوئی۔ کم سے کم تنخواہ یوز باشی کی سات سو روپے تھی جو چودہ ہزار کے برابر ہوئی۔ یعنی کمترین امیر کی ماہواری تنخواہ ایک گورنر سے زیادہ تھی۔ معترض کہتا ہے کہ ساری دولت تو امیروں کے پاس تھی غریبوں کی تو بری حالت تھی۔ لیکن معترض یہ نہیں سوچتا کہ امیر اپنی دولت صرف کرنے کہاں جاتے تھے۔ وہ اپنا روپیہ مرقع اور چاندی سونے کے زیورات اور ساز وسامان پر لگاتے تھے۔ سونے چاندی اور جواہرات کی کانیں ہندستان میں موجود تھیں۔ لہذا یہاں کا روپیہ یہیں گردش کرتا رہتا تھا۔ پھر کاریگر سب اسی ملک کے ہوتے تھے۔ تاجر سب یہیں کے تھے۔ سامان خوردنی اور سامان تعیش سب یہیں کا ہوتا تھا۔ اس لئے عام لوگوں کو جنہیں غریب کہا جائے مزدوری اور کاروبار کے مواقع اب سے زیادہ تھے۔ خاصکر ان شہروں میں جو پائے تخت کہلاتے تھے۔ اس کے علاوہ سخاوت امراء کا خاص شیوہ تھا جسکی مثالیں اپنے محل اور موقعہ پر بیان کی جاوینگی۔ سخاوت صرف فقیروں اور محتاجوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ عام تھی۔ ہر امیر کے محل میں ہزارہا غریب لوگوں کا ہر طرح کا گزر ہوتا تھا اور نہ صرف کھانا اور مکان مفت ملتا تھا بلکہ ان کے شادی بیاہ اور تجہیز وتکفین کے مواقع پر بھی امراء غرباء کی مدد کرتے تھے۔ وہ لوگ غریب کی شادی میں روپیہ صرف کرنا عبادت

کے کئی دن تک نے خیرات کرنا موجبِ ثواب سمجھتے تھے۔ مسافر خانے اور لنگر خانے جن میں شاہی خرچ سے مفت کھانا تقسیم ہوتا تھا عام تھے۔ اور امراء اس میں بادشاہ کی نقل کرتے تھے۔ اور امراء کے ساتھ ساتھ دولتمند درویش اور بزرگ اور پیر اپنی خانقاہوں میں علیحدہ لنگر جاری رکھتے تھے۔ چند مسافر اور لنگر خانوں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ محمد عادل شاہ والئے بیجاپور کے عہد میں مسجدوں کے ساتھ لنگر خانے بھی تھے جہاں مسلمانوں کو پکا ہوا کھانا ملتا تھا مگر ہندو محتاجوں کو اسی مسجد سے خشک غذا حسبِ ذیل حساب سے ہر فرد کو دی جاتی تھی۔ آٹا ڈیڑھ پاؤ۔ چاول ایک پاؤ۔ دال ایک پاؤ۔ گھی نصف پاؤ۔ نقد برائے لکڑی اور مصالح تین پیسے۔ یہ خیال رہے کہ اس وقت کے تین پیسے آجکل کے تخمیناً ایک روپیہ یعنی ۶۰ پیسے کے برابر ہیں۔ اسی عادل شاہ کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک دن وہ اپنے محل کی چھت پر کھڑا ہوا تو اس نے دیکھا کہ سارے شہر میں کھانا پکانے کا دھواں نکل رہا ہے سوائے ایک محلہ کے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس محلہ کا نام برہمن پلی ہے اور وہاں برہمن رہتے ہیں۔ جو صرف صبح کا کھانا کھاتے ہیں۔ بادشاہ کو خیال ہوا کہ مفلسی اور ناداری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ چنانچہ حکم دیا کہ اس محلہ والوں کے لئے وظائف مقرر کر دیئے جائیں۔ اہلِ دربار نے بادشاہ کو یہ نہ بتایا کہ مذہبی دستور کے مطابق یہ برہمن صرف ایک وقت ہی کھانا کھاتے ہیں۔ تاکہ کہیں وہ مانعانِ خیر میں نہ شمار کئے جائیں۔ کیسے نیک دل لوگ تھے کہ مانعِ خیر ہونے کو گناہ سمجھتے تھے اور آج کل حاکم تمباکو اور چھالیہ تک پر ٹیکس لگانے کو بڑی ہوشیاری سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ غریبوں پر صرف سال میں ایک آنہ ہی تو بڑھا۔

اسی طرح شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں بڑے شہروں میں ہندو مسلمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ لنگر خانے تھے۔ اور منزلوں پر مسافر خانے تھے۔ جہاں مفت کھانا ملتا تھا۔ ہندوؤں کا مسافر خانہ دھرم پورہ اور مسلمانوں کا خیر پورہ کہلاتا تھا۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی خیرات نے لوگوں کو بیکار اور بھیک مانگنے والا بنا دیا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس زمانہ میں فقیروں کی تعداد زیادہ تھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ فقیر تو اب پہلے سے زیادہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے بادشاہوں اور امراء و دیگر اہلِ ہند کو نادار اور محتاج لوگوں کا خیال رہتا تھا اور ان کی مدد کرنا ثواب سمجھتے تھے۔ اب بادشاہ تو غیر ملک کا ہے۔ باقی لوگ ایسے کاموں میں چندہ دینا ثواب سمجھتے ہیں جن میں نام ہو۔

ہندوستان پر بھی عجیب عجیب زمانے گذرے ہیں۔ آج کل تو یہ غل مچتا ہے کہ ہندو راج ہو جائے تو مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ مگر یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ملک گیری کی ہوس بُری بلا ہے۔ خود مسلمان دوسرے مسلمان کو کب چھوڑتا ہے۔ جب پٹھان مسلمانوں کا راج تھا تو ان پر مغل مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ پھر موقعہ ملا تو شیر خاں سوری نے ہمایوں کو ہندوستان سے مار بھگایا۔ اسی طرح نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور مغلیہ خاندان کی بچی کھچی دولت مع تختِ طاؤس کے لوٹ کر لے گیا۔ محمد شاہ کے عہد میں سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا اور ملک کی وہ دولت و حشمت نہ رہی تھی جو شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں تھی۔ پھر بھی نادر شاہ نے جو رقم شاہی خزانے اور امرائے سلطنت سے وصول کی اسکی فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردہ حالت میں بھی یہاں کس قدر دولت تھی۔

نقد از خزانہ سلطنت ۸ کروڑ پچاس لاکھ روپیہ۔ جواہرات از جواہر خانہ شاہی ۵ کروڑ۔ آلات طلائی ایک کروڑ پچاس لاکھ۔ تخت طاؤس و سامان خوشبو خانہ و باورچی خانہ و محرر خانہ و فراشخانہ ۵ کروڑ۔ از آصف جاہ نظام الملک ۴ کروڑ۔ نواب المنصور خاں ۲ کروڑ۔ صوبہ دار اودھ ۲ کروڑ۔ ضبطی خانہ خاندوران خان و مظفر خان میر آتش ۲ کروڑ ستر لاکھ۔ وزیر الممالک قمر الدین خاں ایک کروڑ۔ لطف اللہ خاں داروغہ جواہر خانہ ۹ لاکھ۔ نواب محمد خاں بنگش ۲ لاکھ ۵۰ ہزار۔ رائے خوشحال چند بخشی ۲ لاکھ پچاس ہزار۔ متصدیانِ دفتر ۲ کروڑ۔ عمائدِ شہر شیخ سعد اللہ دیوانِ تن ۳ لاکھ پچاس ہزار۔ راجہ ناگرمل دیوانِ خالصہ ۳ لاکھ۔ سیتا رام خزانچی ۲ لاکھ پچاس ہزار۔ سبحان رائے وکیل ۲ لاکھ ۵۰ ہزار۔ زندہ رائے ۲ لاکھ ۶۰ ہزار۔ متفرق ۴۰ لاکھ۔ میزان کل ۵۲ کروڑ ۳۸ لاکھ ۷۰ ہزار۔

اس فہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہ نے مسلمانوں ہی سے زیادہ رقم وصول کی۔ یا یہ کہنا چاہیئے کہ اس زمانے میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے پاس دولت بہت زیادہ تھی۔ کچھ بھی سہی مگر اس میں شک نہیں کہ ہندو مسلمان سب متمول اور خوشحال تھے۔ اس چندے کا جو نادر شاہ کو دفع کرنے کیلئے کیا گیا تھا آج کل جنگ کے چندے سے اگر مقابلہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ چندہ چونکہ کئی ارب ہو چکا ہے اسلئے موجودہ زمانے میں دولت زیادہ ہے۔ مگر اس کا یہی جواب ہے کہ پہلے زمانے کا ایک پیسہ آج کل کے بیس پیسے کے برابر ہے۔

زر و جواہر کے ساتھ اگلے وقتوں کا ہندوستان دولتِ علم و ہنر سے بھی مالا مال تھا اور علم و ہنر دونوں کی سلطنت و امراء کی طرف سے قدر کی جاتی تھی۔ علماء و فضلا کے لئے وظائف و دوامی جاگیریں ہوتی تھیں۔ جو مددِ معاش کے نام سے مشہور تھیں۔ تاکہ حصولِ علم میں فکرِ معاش سے نجات ہو۔ مسلمان علماء کے ساتھ ساتھ ہندو عالموں کی بھی قدر کی جاتی تھی۔ شاہجہاں کے عہد میں سرناتھ

ایک ہندو فاضل تھا جسے بادشاہ نے مہاپاتر کا خطاب دیا اور خلعت واسپ و فیل کے علاوہ ایک لاکھ درم بھی اس کو عطا فرمائے۔ ایک شاعر جگناتھ کو مہاکب رائے کا خطاب ملا۔ شاہجہاں نے کئی دفعہ روپیوں سے تولوا کر زر انعام اسکو دیا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں سندر نام ایک برہمن کو کب رائے کا خطاب ملا۔ بہت سے ہندو فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور خوب شعر کہتے تھے۔ راجہ لون کرن کا بیٹا جس کا نام منوہر داس تھا فارسی میں بہت اچھی قابلیت رکھتا تھا۔ اس کا باپ اس کو ہمیشہ فخر سے مرزا محمد منوہر کہا کرتا تھا۔ اکبر اس نوجوان کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک اجڑے ہوئے گاؤں کو آباد کر کے اکبر نے اسکا نام منوہر پور رکھدیا اور منوہر کو وہاں کی حکومت دیکر مرزائے کا خطاب دیدیا۔ جہانگیر اسکی نسبت لکھتا ہے۔ "منوہر کہ از قوم سیکھاوٹ ست و پدر من براو در خورد سالی عنایت بسیار میکرد۔ فارسی زبان بودہ۔ با آنکہ از و تا بہ آدم ادراک فہم بہ ہیچ یکے از قبیلہ او نمیتوان کرد۔ خالی از فہمے نیست۔ فارسی میگوید۔ این بیت از وست

غرض ز خلقت سایہ ہمیں بود کہ کسے

بنور حضرت خورشید پائے خود نہ نہد

ملا عبد القادر بدایونی بھی اپنی تاریخ میں مرزا منوہر کی تعریف لکھتے ہیں۔ توسنی اس کا تخلص بتاتے ہیں اور یہ شعر اسکے کلام سے منتخب کرتے ہیں

شیخ مستغنی ز دین و برہمن مستغنی ز کفر

مست حسن دوست را با کفر و ایماں کار نیست

ولہ

بے عشق تو در جگر لبالب نار ست — بے درد تو در حرم سراسر خار ست

بتخانہ و کعبہ ہردو نزد ہم کفر است — مارا بہ یگانگئی ایزد کار ست

ولہ

توسنی بردہ ہمند عشق در مبیان عشق — میری این بہ مقصد تتبع ہوں اکبر ست

صاحب مآثر الامراء نے یہ بیت انتخاب کی ہے

یگانہ بودن و یکتا شدن ز چشم آموز

کہ ہر دو چشم جدا و جدا نے نگرند

آخری شعر پر اُن ہندو مسلمانوں کو فی زمانہ غور کرنا چاہیئے جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہندو مسلمان دو جدا جدا قومیں ہیں۔ کہ جدا جدا ہوں بھی تو ان کو آنکھوں کی طرح نکتہ واحد پر یکتا ہو سکتے ہیں۔ منوہر داس کے بیٹے پرتھی چند کو جہانگیر نے منصب ہفت صدی پر سرفراز کر کے راجہ بکرماجیت کے ساتھ مہم کانگڑہ پر مامور کیا۔

شاہجہاں کے زمانے میں منشی چندر بھان فارسی انشا پردازی اور مطلب نویسی میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے۔ وہ افضل خان کے میر منشی تھے۔ علامی افضل خان وزیر اعظم شاہجہاں کے پروردہ تھے۔ ان کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ دربار میں مشاعرہ تھا۔ چندر بھان نے جب یہ شعر پڑھا

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار

بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

تو بادشاہ کو اس کا مضمون پسند نہ آیا۔ وزیر اعظم تاڑ گئے۔ فوراً شیخ سعدی کا یہ شعر دہرایا

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود — چوں بیاید ہنوز خر باشد

چنانچہ بادشاہ ہنس پڑے اور معاملہ رفع دفع ہوا۔ برائے چندر بھان کا ایک اور شعر بہت مشہور ہے اور وہ یہ ہے

بہ بیں کرامت بتخانہ مرا اے شیخ

کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

رائے موصوف کے آخری ہر دو شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے پکے تھے۔ مرزا منوہر کی طرح بادشاہ کو خوش کرنے کو آفتاب کی تعریف میں شعر نہیں کہتے تھے

مرزا منوہر کے سلسلہ میں سیکھاوٹ کا ذکر آیا ہے۔ سیکھاوٹ کچھواہا راجپوتوں کی ایک گوت ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ آخر ایک صاحب کرامت بزرگ درویش کی دعا سے اُسکے لڑکا پیدا ہوا۔ یہ بزرگ شیخ کہلاتے تھے۔ اس لئے اس لڑکے کا نام شیخ رکھدیا گیا۔ جس طرح سلیم چشتی کے نام پر جہانگیر کا اور شاہ جی کے نام پر شاہ جی بھوسلہ کا نام رکھا گیا تھا۔ اس راجپوت لڑکے کی نسل شیخاوت کہلانے لگی۔ جو لفظ بگڑ کر سیکھاوٹ ہو گیا۔

علم و ہنر کی قدردانی میں بادشاہ کی نقل امرا بھی کرتے تھے چنانچہ امنیر کے راجہ جے سنگھ علوم و فنون کی قدردانی میں یگانہ روزگار تھے۔ تمام ہندوستان کے عالم فاضل گنوان پنڈت ان کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ برج بھاشا کی اس راجہ نے بڑی پرورش کی۔ ہندی شاعروں کو ایک ایک شعر پر ایک اشرفی سے لیکر ہزاروں اشرفیاں تک انعام میں دے ڈالیں۔ راجہ موصوف علم ریاضی سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلمان علماء سے شرح چغمینی وغیرہ کتب ہندسہ کا عربی سے بھاشا میں ترجمہ کرایا۔ اور مرزا خیر اللہ بیگ کے ذریعہ جو علوم ریاضی کے ماہر تھے اجرام فلکی کے مشاہدے کے واسطے آلات

اور وہیں رصدگاہیں تیار کرائیں اور زیچ محمد شاہی کے نام سے مشہور کیا۔ دلّی میں یہ رصدگاہ اب تک نامکمل موجود ہے اور اس کو لوگ جنتر منتر کہتے ہیں۔ چند سال ہوئے مہاراجہ جے پور نے اس کی مرمت کرائی تھی۔ اور اب ریاست کی طرف سے ایک منشی یہاں رہتا ہے جو تماشائیوں کو سیر کراتا ہے اور قیمتاً ایک کتاب اس تعمیر کے حالات کی پیش کرتا ہے۔ اس کتاب میں بھی خیر اللہ کا جس نے اپنے ریاضی کے علم کے ذریعہ سے اس رصدگاہ کا نقشہ بنایا کہیں ذکر نہیں ہے۔ جس طرح تاریخ نے مرزا خیر اللہ بیگ کو بھلا دیا اسی طرح خواجہ مظفر خاں کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ بلکہ ٹوڈرمل کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اکبر کے دیوانی دفتر کے نئے قواعد بنائے اور گجرات کے مالی بندوبست کے ضوابط و قواعد کی بنیاد ڈالی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پہلے خواجہ مظفر خاں دیوان تھے اور انہوں نے دیوانی دفتر کو ترتیب دے رکھا تھا۔ ٹوڈرمل مظفر خاں کے متصدی مقرر ہوئے۔ مگر رفتہ رفتہ بادشاہ کے منہ چڑھ گئے۔ اور مظفر خاں کی جگہ دیوان ہو گئے۔ اسی طرح جب صوبہ گجرات میں ٹوڈرمل مہتمم بندوبست ہو کر گئے تو وہاں کے کل قواعد و ضوابط خواجہ منصور شاہ نے ترتیب دیئے۔ لیکن اس غریب کا کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔ انگریزی تاریخوں میں یہ دونوں اصلاحیں ٹوڈرمل کے نام سے درج ہیں۔ خواجہ منصور شاہ محکمہ حساب پر اتنا حاوی تھا کہ ٹوڈرمل اس کے دشمن ہو گئے۔ اور ایک موقع پر خواجہ عبدالحکیم صوبہ کابل کے ساتھ اکبر کے خلاف سازش کرنے کا الزام لگوا کر بادشاہ سے اس کے قتل کا حکم دلوا دیا۔ مگر جب اکبر کو اصل حال معلوم ہوا تو اس نے بہت افسوس کیا۔ اور وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ جس دن سے خواجہ مرا تمام حساب درہم برہم ہو رہے ہیں۔ اور کاسبکا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اگلے وقتوں کے ہندی ایسے ہی انسان تھے جیسے آج کل کے ہندوستانی۔ یعنی کبھی کبھی وہ اپنے اپنے مذہب کی دھن میں ایسے اٹھتے تھے جیسے آج کل کے لوگ مگر ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ صرف دو بڑے بڑے مذہب والے لوگ ملک میں بستے تھے۔ اگر ان میں کھٹ پٹ بھی ہو جاتی تھی تو خود ہی آپس میں سلجھ لیتے تھے تیسرا لڑائی بھڑانے والا نہ تھا۔ مسلمان جب ابتدا میں آ کر بسے تو ان کو نہ صرف یہاں کا مذہب بلکہ ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ فتحمندی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بلند تر سمجھتے تھے۔ ایک خدا کو ماننے والے ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے کو سجدہ کرنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ بت پرست کو کافر کہتے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ دل میں انہیں حقیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ بیجا نگر کے راجہ دیوراج نے مسلمانوں کے تالیف قلب کے لئے اپنے ملک میں ایک مسجد بھی بنوائی اور ان کو جاگیریں بھی دیں تاکہ وہ وہاں آ کر آباد ہو جائیں۔ اور اس کی فوج میں بھرتی ہوں۔ مگر باوجود ان سب مہربانیوں کے مسلمانوں نے اس شرط پر راجہ کی ملازمت کی کہ ان کی آن بان میں فرق نہ آنے پائے۔ اور آن یہ تھی کہ افسر تو افسر راجہ تک کو سلام نہ کریں گے بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں کا سلام کا طریقہ سجدہ کرنا تھا۔ اور مسلمان آپس میں صرف منہ سے سلام علیک کہنا سلام سمجھتے تھے۔ وہ گردن جھکانا گناہ اور بے عزتی سمجھتے تھے۔ اور غیر مسلمان کو سلام علیک بھی نہ کہتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ جب وہ راجہ کے دربار میں آویں تو سامنے ایک اونچی جگہ پر قرآن شریف رکھا جائے اور مسلمان سپاہی اور افسر راجہ کی تعظیم اور تکریم کی بجائے قرآن شریف کی تعظیم کریں اور راجہ اس کو اپنی تعظیم سمجھے۔ یہ فیصلہ باہمی رکھ رکھاؤ سے ہوا۔ راجہ کو مسلمان سپاہی اور افسر رکھنے ضروری تھے اور مسلمانوں کو بھی کسی طرح گزارہ کرنا تھا۔ کوئی تیسرا اکسانے والا تھا نہیں۔ اس لئے صلح صفائی سے جانبین کا کام بن گیا۔ لیکن یہ تو ابتدائی زمانے کی باتیں ہیں۔ ہزار برس ہندوؤں کے ساتھ بستے رہتے یہ منافرت اور مغائرت رفتہ رفتہ جاتی رہی اور خود مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں سلام کے طریقوں میں آداب و کورنش۔ قدمبوسی اور سجدہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کی فوج میں ہندو اور ہندوؤں کی فوج میں مسلمان ایک دوسرے کے تحت رہنا کسی طرح اپنی آن کے خلاف نہ سمجھتے تھے۔ اور مسلمان بادشاہوں کی حکومت میں ہندو افسروں کا اس قدر اقتدار تھا کہ مسلمان ماتحت ان کے آگے چوں نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانے میں رتن چند اور نول رائے معمولی حیثیت سے بڑھ کر ایسے درجے پر پہنچے کہ بڑے بڑے شریف اور خاندانی مسلمان ان کی ماتحتی میں آ گئے۔ لیکن رتن چند اور نول رائے بھی اپنے مسلمان آقا کی وفاداری میں اپنی جان تک سے دریغ نہ کرتے تھے۔ رتن چند قوم کا بنیا تھا۔ اور ابتدا میں بڑھتے بڑھتے سید عبداللہ خاں صوبیدار الہ آباد کا دیوان ہو گیا۔ اور جب سید عبداللہ کی ہانک پور کڑہ کے مقام پر راجی محمد خاں سے جنگ ہوئی تو رتن چند تین چار سو سوار لیکر نہایت بہادری سے سید عبداللہ کی طرف سے لڑا اور فتحمند ہوا۔ پھر جہاندار شاہ کے خلاف فرخ سیر کی طرف سے لڑ کر شاندار فتوحات حاصل کیں۔ چنانچہ فرخ سیر نے رتن چند کو راجہ کا خطاب اور دو ہزاری منصب عطا فرمایا۔ اس زمانے میں اس کا اتنا زور ہوا کہ دیوان تن اور دیوان خالصہ یعنی نائب وزیر اعظم سب اس کے آگے معطل محض ہو گئے۔ ایک دفعہ ایک محالات خالصہ کا عامل جو رتن چند کا متوسل تھا زیر محاسبہ ہوا۔ اور بڑی رقم اسکے ذمے نکلی۔ عنایت اللہ خاں دیوان خالصہ و دیوان تن نے اسے قید کر دیا۔ رتن چند نے اسے چھڑوا دیا۔ عنایت اللہ خاں نے فرخ سیر بادشاہ سے شکایت کی۔ بادشاہ

کو غصہ آیا اور قطب الملک عبداللہ خاں کو حکم لکھا کہ رتن چند کو رخصت کر دے گا۔ مگر قطب الملک نے اس پر عملدرآمد نہ ہونے دیا۔ فرخ سیر کے عہد سے محمد شاہ کے عہد تک سب حکام رتن چند کے اشاروں پر چلتے رہے۔ چنانچہ مذہبی قضا میں بھی رتن چند کی دست اندازی ہونے لگی۔ ایک دفعہ ایک قاضی کی جگہ خالی ہوئی رتن چند نے قطب الملک کے سامنے اپنا آدمی تقرری کیلئے پیش کیا۔ قطب الملک نے اپنے ایک مصاحب کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ میرا رتن چند قاضی بھی تجویز اور مقرر کرتا ہے۔ مصاحب نے رتن چند سے مخاطب ہو کر کہا۔ راجہ جی کیا مالی اور ملکی امور سے فارغ ہو گئے جو اب امور شرعی کے انتظام میں مشغول ہوئے ہو۔ جب امیر الامراء قطب الملک پر حملہ ہوا تو قطب الملک کے ساتھ رتن چند بھی تھا۔ قطب الملک کے قتل کے بعد وہ اس کے بھانجے عزت خاں کے ساتھ تورانی امیروں کے مقابلے میں خوب لڑا۔ جب عزت خاں جنگ میں کام آیا تو امین خاں نے رتن چند کو پیغام بھیجا اب فضول لڑائی جاری رکھنے سے کیا فائدہ۔ چنانچہ رتن چند ہاتھی پر سے اترا اور پالکی میں سوار ہو کر اپنی قیام گاہ کو روانہ ہوا۔ مگر راستے میں لوگوں نے اسکو ذلیل کیا اور پکڑ کر محمد امین کے پاس لے گئے جس نے اسے قید کر دیا۔

از فروغ صبح دولت اے جواں غافل مباش
خندہ شیریست لطف آسماں۔ غافل مباش

نول رائے کی ستنے۔ ذات کا کائستھ تھا۔ رتن چند کی عنایت کی وجہ سے ترقی کر کے عبدالمنصور خاں صفدر جنگ وزیر اودھ اور الہ آباد کا نائب مقرر ہو گیا۔ اس طرح دو صوبوں کی حکومت مل گئی۔ نول رائے نے صفدر جنگ کے ساتھ روہیلکھنڈ اور فرخ آباد کی پٹھان ریاستوں کی بربادی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ نواب محمد خاں بنگش والی روہیلکھنڈ کی بیگم کو جو بی بی صاحبہ کہلاتی تھیں قید کر لیا۔ مگر نواب بنگش کے ایک وفادار کائستھ ملازم منشی صاحب رائے نے کسی ترکیب سے بی بی صاحبہ کو قید سے رہائی دلائی۔ دونوں مسلمان سرداروں کے رو ہندو ماتحت کیسی وفاداری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ نواب محمد خاں کے بیٹے احمد خاں نے بارہ ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادے جمع کر کے نول رائے پر حملہ کر دیا۔ نول رائے ایک ہزار توپ اور لاتعداد فوج سے مقابل ہوا۔ اور خدا گنج کے مقام پر صف آرائی کی۔ اتنے میں صفدر جنگ نے نول رائے کو حکم بھیجا کہ میں آ رہا ہوں۔ جب تک میں نہ آؤں حملہ نہ کرنا۔ نواب احمد خاں نے صفدر جنگ کے پہنچنے سے پہلے حملہ کر دیا اور سادات بارہ کی بہادری کے باوجود پٹھان مورچوں میں گھس گئے۔ جب نول رائے کو یہ خبر پہنچی تو وہ پوجا کر رہا تھا۔ کیونکہ بغیر پوجا کے وہ کوئی کام شروع نہ کرتا تھا۔ قاصد نے کہا کہ پٹھان تیرے

[illegible] نول رائے ہتھیار لگا کر ہاتھی پر سوار ہوا اور دو تیر ایک ساتھ چلنے میں زنگی دشمن پر یہ کہکر مارے۔ یہ مار میرے سامنے کو بجز دوں کو نہ۔ دشمن کا ایک سردار محمد خاں نول رائے کے مقابل آیا۔ نول رائے نے محمد خاں کے سینے پر ایک تیر حقارت آمیز الفاظ کہکر مارا۔ اس نے تیر کو سینے سے نکال کر کہا اے تیر تو کس نامرد کے ہاتھ سے آیا ہے کہ تجھ میں کچھ بھی زور نہ تھا۔ نول رائے نے ایک اور تیر تاک کر مارا۔ جس سے محمد خاں ختم ہو گیا۔ مگر فوراً ہی محمد خاں کے ایک قادر انداز آفریدی نے نول رائے کو اپنی گولی کا نشانہ بنا کر اس کو بھی بسیر کر دیا۔ نواب احمد خاں کی فتح ہوئی۔ ایک بھاٹ مسمی بھبوتی نے اس جنگ کا یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

نول سے مرد غازی کو نہ پوچھی بات پاجی کو
نول سے مرد غازی کو پہنچ گولی سے مارا ہے
نول ہووے سے کہ مورا، کہیں ہاتھی کہیں گھوڑا
قبائل بھی کہیں چھوڑا نہ سر چیرا سنبھالا ہے
چلیں توپیں دھڑا دھڑ سے ہوکلے بھی پڑا شہ سے
شتر نالیں تڑا تڑ سے تہود کا پچھاڑا ہے
چلیں تیریں سناسن سے چلیں گولی سناسن سے
کٹیں کمر جناجن سے پڑی تلوار دھارا ہے
بھبوتی نام ہے میرا عطائی پور میں ہے ڈیرا
یہی ہے منو کا کھیرا تلے گنگا کنارا ہے

اس گیت کے صلے میں نواب نے انعام میں ایک مسلم موضع بھبوتی کو مرحمت کیا۔

اس جنگ پر اگر تبصرہ کیا جائے تو معترض کہے گا کیسی بدامنی کا زمانہ تھا۔ ایک دوسرے کو مارے ڈالتے تھے۔ یہ اعتراض سچ ہے۔ مگر جہاں کسی کا ملک چھنا اور کوئی قتل ہوا تو کسی کو ملک بھی تو ملا۔ ایک ہندوستانی سے ملک چھنا تو دوسرے کو تو ملا۔ لڑائی میں لوگ ضرور مارے جاتے تھے۔ مگر جو جیت جاتے تھے وہ تو مالا مال ہو جاتے تھے۔ اور جو دولت ان کو ملتی تھی اس کو وہ انعام اور خیرات کی صورت میں دوسروں کو دیتے تھے۔ جیسے بھبوتی بھاٹ کو معمولی اشعار پر ایک گاؤں مل گیا۔ اس کا مقابلہ آج کل کی دنیا سے کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ نول رائے ایک ہندو تھا مگر مسلمان نے [illegible] کا کام لیا اور اس نے کائستھ ہونے کے باوجود پٹھان جیسی جری قوم کا مقابلہ

بادشاہ کے سب سے مقابلہ کیا۔ رن چند ایک بنیا تھا۔ مگر وہ بھی ایک بہادر سپاہی کی طرح لڑا۔ آج کل بنیا دی بھی غیر تجارتی تصور کی جاتی ہے۔ ہر شخص فوج کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ اور سپہ سالاری کی تو کوئی ہندستانی بھی لیاقت نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح کوئی ہندستانی وائسرائے ہونے کے قابل نہیں سمجھا جاتا حالانکہ مسلمانوں کے عہد میں بکثرت ہندو صوبیدار تھے۔ اور معمولی وزیر تو ہوتے ہی رہتے تھے۔ وزیر اعظم تک ہندو بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ راجہ رگھناتھ داس سعد اللہ خانی کو اورنگ زیب عالمگیر جیسے بادشاہ نے جس کو ہندوؤں کا سخت مخالف بتایا جاتا ہے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ راجہ رگھناتھ داس قلم ہی کا دھنی نہ تھا بلکہ سپاہ گری اور سرداری کا بھی جوہر رکھتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اورنگ زیب نے پہلے ہی سن جلوس میں اس کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ اس کے مرنے کے بعد فاضل خاں اور دیگر مسلمان وزیر اعظم ہوئے۔ مگر اورنگ زیب نے رقعات میں سوائے سعد اللہ خاں اور رگھناتھ داس کے کسی وزیر کی تعریف نہیں کی۔ اس کی سب سے بڑی تعریف یہ تھی کہ وہ آج کل کے وزیروں کی طرح صرف اپنے ہم مذہب لوگوں کے لئے وقف نہ کرتا تھا۔ چنانچہ عالمگیر نے اسکے متعلق اپنے رقعات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "رگھناتھ سعد اللہ خانی خدمات مالی بہ برادران خود نمیداد" دوسری جگہ لکھا ہے۔ "رگھناتھ داس سعد اللہ خانی رواجیانیکہ راتق مہمات دیوانی بود۔ بیگفت کہ کار سرکار والا بہ کسے باید فرمود کہ جوہر کاروانی ودماغ معاملہ آرائی داشتہ باشد۔ نہ طفیل غرض۔"

عالمگیر اور شاہجہاں سے پہلے جہانگیر کے زمانے میں رائے گوردھن سورج دھج کا ستارۂ عروج ہوا۔ اوائل عمر میں عرضی نویسی کے پیشے میں تین چار پیسے روز پیدا کر کے گذارا کرتا تھا۔ خواجہ ابوالحسن تربتی دیوان شہنشاہ جہانگیر کو جب اس نے عرضی دی تو اس کو دیکھکر خواجہ موصوف نے کہا کہ کچھ بیوقوف سا معلوم ہوتا ہے مگر خوشخط ہے۔ چنانچہ پچیس روپے ماہوار کی جگہ اس کو دی گئی۔ خواجہ کے بعد اعتماد الدولہ دیوان ہوئے۔ انہوں نے گوردھن کو اپنی سرکار کے دیوان اور سرکار ہی کے پیشکار دیوان کے عہدے پر سرفراز کیا۔ چنانچہ خود بادشاہ کی پیشی کے مواقع مل گئے اور بادشاہ کے منظور نظر ہو کر خطاب رائے سے موصوف ہوئے۔ رفتہ رفتہ ایسا اعزاز تھا کہ مرزا عبدالرحیم خانخاناں تک ان کے در دولت پر حاضر ہو کر اپنے معاملات میں عرض معروض کرتے تھے۔ اعتماد الدولہ کے مرنے کے بعد نور جہاں بیگم نے ان کو اپنا دیوان مقرر کر لیا۔ اور نور جہاں بیگم اس وقت کل سلطنت کی مالک تھیں۔ اس طرح گوردھن کا آفتاب اقبال خط نصف النہار پر پہنچ گیا۔ رائے صاحب موصوف اپنی دکانوں اور مکانوں کا کرایہ غریب اور مفلس رعایا اور اہل حرفہ کی امداد پر صرف کرتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں بھینس۔ گائے اور بکریاں پال رکھی تھیں۔ اس کا دودھ، دہی، گھی سب رعایا کو مفت دیا جاتا تھا۔ غرضیکہ اس زمانے کے امراء خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہاتھ سے کماتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اہل حاجت پر لٹاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رعایا وفادار تھی اور لوگ خوشحال تھے۔ اور امیر غریب سب چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ ملکر زندگی بسر کرنے کا مفید گر جانتے تھے۔ غرضیکہ اگلے وقتوں میں نہ ریل تھی نہ موٹر، نہ ہوائی جہاز، نہ تار، نہ ریڈیو، نہ بجلی۔ مگر سستا سما تھا۔ صاحب دل لوگ تھے۔ رحمدل بادشاہ تھے۔ اپنا ملک تھا اپنے ہی حاکم تھے۔ جو کچھ بھی ہندستان جنت نشان میں تھا سب اپنا ہی اپنا تھا۔ اور سارے ہندستانی بلاشرکت غیرے اس ملک کے حصے دار اور یہاں کی دولت کے وارث تھے۔ پھر کیوں نہ اگلے وقتوں کے لوگوں کو خوش قسمت کہا جائے اور کیوں نہ انکے قصے سنکر تھوڑی دیر کیلئے غم غلط کیا جائے۔ اور دل کو یہ کہکر کیوں نہ تسلی دیجائے کہ ہم نہ سہی ہمارے اجداد تو خوش قسمت تھے۔

یری زندگی کے چند موڑ

(از واحدی)

—— (۲) ——

اس مضمون کی پہلی قسط جو مئی کے رسالہ میں چھپی تھی، توقع سے زیادہ
ل ہوئی۔ تحریری اور زبانی بہت لوگوں نے خواہش کی کہ یہ سلسلہ جاری
ا چاہیئے۔ رسالہ "مشرخیال" کے مالک عبدالحق فاروقی صاحب اسے کتابی
ت میں شائع کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن انہیں غالباً معلوم نہیں کہ میری زندگی
ہے حد یکساں گذری ہے۔ اتنے موڑ کہاں سے لاؤں گا کہ کتاب بن جائے۔ لنچ
چمچہ استعمال کرنے والے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ وہ تانبے کا چمچہ نہ کبھی چھینا گیا:
ں چاندی اور سونے کے چمچے سے بدلا۔ بچپن میں بھی بڈھا تھا اور جوانی میں بھی
پن اور جوانی کی یاد سے بے چین نہیں ہوں۔ صبح سویرے اُٹھنا۔ رات کو
بے سونا۔ اوقات مقررہ پر کھانا کھانا۔ پانچ چھ میل کھلی ہوا میں پھرنا اور
، بھر کام میں معروف رہنا۔ نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے بیر۔ ساری زندگی کا
صہ اس قدر ہے۔ انقلاب انگیز واقعات سے عمر بھر سابقہ ہی نہیں پڑا۔ مد وجزر
ر چڑھاؤ اور جوار بھاٹے میری زندگی میں نہیں آئے۔ یہاں تک کہ ساری عمر
ا سخت بیمار نہیں ہوا کہ زندگی کا رُخ مڑ جاتا۔ البتہ تنبیہ کے لئے چھوٹی چھوٹی
یں کافی ہوتی ہیں۔ بس اس اعتبار سے پکا مُسلمان ہوں کہ ایک سوراخ
ے دو دفعہ نہیں کاٹا گیا۔ اس اعتبار سے مجھے بھلا آدمی بھی کہا جاسکتا ہے کہ مرت
ارے سے سنبھل جاتا ہوں۔ لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر شاید بڑے آدمیوں
ناگوار گذرے۔ خیر جیجے۔ اب مضمون کی دوسری قسط پڑھئے۔

حکیم اجمل خاں کے بنائے ہوئے لیڈروں میں اکثر حکیم صاحب سے
یادہ مالدار تھے۔ لیکن وہ حکیم صاحب کے ذاتی کام اس طرح انجام دیتے تھے جیسے
کیم صاحب کے غلام بے دام ہیں۔ کسی نے حکیم صاحب کی جائداد کی دیکھ بھال اور
ست ر ریخت کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ کوئی حکیم صاحب کے ہاں کی دعوتوں
انتظام کرتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو حکیم صاحب کے گھر میں تکیوں پر تسمہ
بیٹھنے اور لپٹواتے دیکھا۔ اور پھر یہ بھی دیکھا کہ جب وہ حکیم صاحب کے گھر سے

باہر نکلے تو سرکاٹ کے کی طرف بھاگا ... باہر نکلتے ہی ... لے جاتے جتنا سر نیچے جاسکتا تھا۔ مجھے یہ اوا کی ... البتہ حکیم صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ حکیم صاحب کے بتائے ہوئے لیڈر حکیم صاحب کے بنائے ہوئے لیڈر رہتے۔ مگر حکیم صاحب حقیقتاً خدا کے بنائے ہوئے لیڈر تھے۔ اُن سے زیادہ نیک اور متوازن دماغ مہاتما گاندھی کو بھی نہیں ملا۔ مہاتما جی کی تیوری پر بل آنا ممکن ہے۔ میرے سامنے ایک دفعہ مہاتما جی نے ایک بڑھیا پر غصہ کیا جو بالکل ادنی درجہ کے کاموں کے واسطے مہاتما جی کے سر ہوئے جاتی تھی۔ مہاتما جی نے ترش رو ہو کر کہا "ہم کا کا کریں۔ اپنا وکل لوگ سے بولو۔" لیکن حکیم اجمل خاں کے اوپر بچہ شرعورتیں نبض دکھاتے دکھاتے بچوں کو پیشاب کرادیتی تھیں اور ان کی انگلیاں نبض پر اس طرح حرکت کرتی رہتی تھیں جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ نبض دیکھ لینے کے بعد حکیم صاحب نسخہ بھی پورے اطمینان سے لکھواتے اور نسخہ لکھوا کر اور پھر ہر عورت کو اُس کا طریقہ استعمال بتا کر اور ہدایتیں کر کے متانت کے ساتھ اُٹھتے اور کپڑے بدلنے اندر چلے جاتے۔ اور اِدھر مدرسے ہوتے خدام حکیم صاحب کے پیچھے کا قالین بدل دیتے۔ طبیہ کالج کے لڑکے غلط مطالبے کرتے اور گستاخانہ انداز سے جھگڑتے اور حکیم صاحب بشاش چہرہ کے ساتھ برداشت کرتے۔ میرا خیال ہے اپنے لغزشوں کو بھی حکیم صاحب بس برداشت ہی کرتے ہوں گے۔ حکیم صاحب کی برداشت کا ایک قصہ سُن لیجیے۔ انجمن مویدالاسلام[1] اپنے یتیم خانہ اور وقف جائداد کی وجہ سے آج بھی مسلمانان دہلی کی بڑی اہم انجمن ہے۔ حکیم صاحب کے زمانہ میں بھی اہم تھی۔ حکیم صاحب اور حکیم صاحب کی جماعت اسے چلاتی تھی بشہر کی دوسری مُسلمان جماعتیں اس قبضہ کے خلاف تھیں۔ ایک دفعہ انجمن کا جلسہ ہو رہا تھا۔ انجمن کے ممبران کے علاوہ چند اور لیڈر بھی جلسہ میں گھس آئے۔ اُن میں سے ایک صاحب نے بڑے زور کی تقریر کی اور انجمن کے ممبروں کی خبر لے ڈالی۔ یاد نہیں، میں کس حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ یہ تماشہ میرے سامنے ہوا۔ حکیم صاحب کی طرف سے یا حکیم صاحب کی جماعت کی طرف سے مطلق جواب نہیں دیا گیا۔ مقرر بھی دل کی بھڑاس نکال کر چپکا ہو بیٹھا۔ حاضرین میں کوئی اس کا اثر قبول کرنے والا نہ تھا۔ مگر حکیم صاحب نے اُسی شام کو یا دوسرے دن شام کو اس مقرر کو اپنے گھر بلوایا۔ میں حکیم صاحب کے پاس اتفاق سے اُس وقت بھی حاضر تھا۔ حکیم صاحب نے جلسہ کی تقریر کا نام نہیں لیا۔ بلکہ اُسے اپنی ڈبیا میں

[1] اب اس انجمن کا نام ستی مجلس اوقاف میں مدغم ہو گیا ہے۔

علیہ وہ اپنے بیٹے کی عزت افزائی کر رہا تھا۔ "والد اچھے ہیں۔" پھر پوچھا "آپ آجکل کیا کرتے ہیں؟" مقرر نے جواب دیا "بیکار ہوں"۔ حکیم صاحب نے فرمایا "صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے واسطے سفیروں کی ضرورت ہے۔ جس میں اچھی تنخواہ ہوگی اور سفر خرچ ملیگا۔ آپ کہیں تو آپ کو صاحبزادہ صاحب کے پاس بھیجدوں۔ آپ یہ خدمت خوب انجام دے سکیں گے۔ میں نے اسی خیال سے آپ کو تکلیف دی ہے۔" وہ جو چند گھنٹے قبل حکیم صاحب پر برس رہے تھے حکیم صاحب کی شکرگذاری میں ان کی زبان لکنت کرنے لگی۔ حکیم صاحب نے فوراً ایک خط صاحبزادہ صاحب کے نام لکھکر انہیں دیا اور مخالف کو احسان کر کے رام کر لیا۔ حکیم صاحب اپنے عمل پر پورا قابو رکھتے تھے۔ دوسروں کے برے عمل سے ان کا عمل نہیں بگڑتا تھا۔ وہ دیوانوں کے ساتھ دیوانے نہیں بنا کرتے تھے۔ بلکہ حکمت سے دیوانوں کی دیوانگی دور کر دیتے تھے۔ حکیم صاحب یقیناً پارس تھے۔ ایسے پارس جیسے ہندستان کم پیدا کرتا ہے۔ مگر مجھی کسی پارس کے نقشوں میں بھی پارس کی سی بات نہ پائی۔ حکیم صاحب کے نقش قدم پہ نہ جائے تو کیا تعجب ہے۔ ان نقشوں نے میرا شوق لیڈری مار دیا۔ لیڈروں سے رغبت بھی کم ہوگئی۔ لیکن اخباروں رسالوں میں الٹا سیدھا لکھنا جاری رہا۔ اہل قلم میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب میرے پہلے ممدوح تھے۔ خدا نے انہیں مجھ پر غیر معمولی مہربان کر دیا تھا۔ میں جتنا لکھتا وہ اس سے زیادہ لکھوانا چاہتے تھے۔ اور جیسا لکھتا اس سے بہتر لکھنے کی تمنا کرتے۔ ان کے طفیل اس وقت کے تمام بڑے بڑے لکھنے والوں اور بزرگ مصنفوں کی جوتیاں اٹھانے کا موقع ملا۔ اہل قلم سے میں آج تک اہل قیادت کی نسبت زیادہ عقیدت رکھتا ہوں۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ لکھنے سے بھی دل پھر گیا۔ نظام المشائخ کو نکلتے تین ساڑھے تین سال گذر چکے تھے۔ خیال ہوا کہ نظام المشائخ ماہوار رسالہ ہے۔ درویش کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جائے۔ یہ خبر روزانہ "پیسہ اخبار" لاہور کے اڈیٹر سید جالب صاحب کو پہنچی۔ مرحوم میرے ہم محلہ تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ "دلی سے باہر رہتے رہتے گھبرا اٹھا ہوں۔ تم "درویش" نکالو تو مجھے بلا لو۔ میں یہاں ساٹھ روپے پاتا ہوں تم سے چالیس لے لوں گا۔ زندگی کے جو دن باقی ہیں وطن میں گذر جائیں تو بہت اچھا ہے۔" روزانہ اخبار کا اڈیٹر اور ساٹھ روپے تنخواہ۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا کہ جس اخبار کا مالک اخبار کے طفیل لاکھوں روپیہ کا مالک بنے بیٹھا ہے۔ اس اخبار کے اڈیٹر کو فقط ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہوں گے۔ دو روپے یومیہ۔ اردو کے اخبار نویسوں میں جالب صاحب سے اونچا اس وقت کوئی اخبار نویس نہ تھا۔ ان جیسی معلومات کا اخبار نویس آج بھی اردو کے اخبار نویسوں میں شاید کوئی ہو۔ وہ بڑے بھاری بھرکم لکھنے والے تھے۔ اور ان کی ملک میں عزت کی جاتی تھی۔ مگر تنخواہ دو روپے یومیہ! میں نے سوچا میں کتنی بھی کوشش کروں اخبار نویسی میں جالب صاحب کو نہیں پہنچوں گا۔ اور طرز تحریر میری خواجہ حسن نظامی۔ مولانا راشد الخیری اور مولانا ابوالکلام کی طرز تحریر سے ٹکر نہیں کھا سکتی۔ (ان تینوں کی مالی حالت بھی حوصلہ افزا نہیں تھی) میں نے فیصلہ کیا اڈیٹر بننے سے اور اہل قلم بننے سے رسالوں اور اخباروں کا مالک بننا فائدہ کا کام ہے۔ میں نے لکھنے کی مشق بڑھانے کی بجائے رسالوں اور اخباروں کی تعداد بڑھانے کی طرف توجہ زیادہ کر دی۔ اور ان کا انتظام سنبھالنے میں لکھنا میرا مختصر کر رہ گیا۔ لیکن لکھنے نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ جالب صاحب کے خط نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ میں اخبار نویسی اور تصنیف و تالیف کے خواب دیکھتے دیکھتے ایک دم کاروباری آدمی ہو بیٹھا۔ جالب صاحب کا یہ خط نہ آتا تو مجھے دھوکہ ہی رہتا اور میری عمر فاقوں میں گزرتی۔ اردو کے اخبار نویسوں میں ایک شخص بھی خوش حال نہیں ہے۔ انگریزی اخباروں کے اڈیٹروں کو بھی اتنی تنخواہ نہیں ملتی جتنی انگریزی اخبار کا مالک منیجری کے نام سے حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کی مالکانہ حیثیت کی آمدنی الگ رہتی ہے۔ اور اخبار کا کاروبار مالک اخبار کی دوسری تجارتوں کا ایک ادنیٰ جزو ہوتا ہے۔ یعنی دوسری تجارتوں کے مقابلہ میں اخباری تجارت کا مالک بھی زیادہ نفع نہیں کماتا۔ تجارت کے اعتبار سے اخباری تجارت سب سے کم نفع کی تجارت ہے۔ تاہم مالک پھر مزے میں رہتا ہے۔ اور اڈیٹر کی قسمت میں فاقے ہوتے ہیں۔ شاید دماغ میں روشنی فاقوں ہی سے آتی ہے۔ بہرحال کاروباری آدمی مجھے "جالب ناکام" نے بنایا۔ ایک اہل قلم کی مالی حالت دیکھکر میری زندگی کا رخ کاروبار کی طرف مڑا۔

(باقی آئندہ)

ہندوستانی پریس

(از فصیح الدین احمد)

ہندوستانی پریس کی تاریخ کافی حد تک ہندوستان میں بڑھتے ہوئے برطانوی اقتدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ پریس کا قیام اس کی ترقی اس کا مد و جزر اور بالآخر اس کا مستحکم بنیادوں پر قائم ہونا، یہ تمام چیزیں ہندوستان میں برطانوی حکومت اور برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کی آئینہ دار ہیں۔

مغرب میں اخباروں کی نشو و نما تقریباً اسی وقت شروع ہوئی جب کہ ہندوستان اور یورپ کے درمیان تعلقات کا سلسلہ قائم ہوا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل کے باشندوں کے تجارتی تعلقات ایرانیوں اور اطالویوں کے ساتھ پہلے سے قائم تھے۔ لیکن ۱۴۹۸ء میں جبکہ واسکوڈی گاما کیپ آف گڈ ہوپ کا چکر لگا کر کالی کٹ میں لنگر انداز ہوا اس وقت سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان براہ راست تجارتی تعلقات شروع ہوئے۔ ان تجارتی تعلقات سے تمدنی تعلقات پیدا ہوئے۔ جس کی وجہ سے چھپائی کا کام ہندوستان میں پہلی بار پرتگالیوں کے ذریعہ شروع ہوا۔ یاد رہے کہ جب ہندوستان میں پریس ایجاد آئی تو یورپ میں پریس کے آغاز کو ایک صدی گزر چکی تھی۔ سولہویں صدی کے آخر میں ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان تجارتی تعلقات شروع ہوئے۔ ڈیڑھ سو سال تک انگریز ہندوستان میں تجارت سے نفع کمانے میں لگے رہے لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت اختیار کی تو رائے عامہ کا آغاز ہوا۔ ہندوستانی پریس جن کی بدولت ظہور میں آیا وہ لوگ تھے جو مختلف وجوہات کی بنا پر کمپنی کی حکومت اور اس کے تنہا غلبہ کو ناپسند کرتے تھے۔ جہاں تک کمپنی نے سوائے تجارت سے نفع کمانے۔ مالگذاری وصول کرنے کے کوئی اور ذمہ داری اپنے سر نہیں لی تھی۔ لیکن اب رائے عامہ نے کمپنی کی کارروائیوں پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ چنانچہ یہ بات آپ کو بعد میں معلوم ہوگی کہ کس طرح ان نکتہ چینیوں نے آگے چلکر ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مشکل معاملات میں گورنمنٹ پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ چنانچہ ہندوستانی پریس کی تاریخ اس رائے عامہ کی تاریخ ہے جو رفتہ رفتہ پھیلتی اور بڑھتی چلی گئی۔

سلسلہ جاری رکھنے سے پہلے یہاں دو اہم سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ سیاسی ہندوستان کیا چیز ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ جرنلزم کسے کہتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول کانگریسی ہندوستان جس کے معنی ہیں وطن اور قوم پرست ہندوؤں کی اکثریت جس کے ساتھ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت بھی شامل ہے۔ دوسرے مسلم لیگی ہندوستان جس سے مراد آٹھ کروڑ مسلمانوں سے ہے۔ تیسرے ہندوستانی والیان ریاست۔ چوتھے وہ ترقی پسند مختلف قومیں جو آئینی ذرائع سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں۔ پانچویں یوروپین ہندوستان یعنی ان انگریزوں کا ہندوستان جو سرکاری ملازمتوں یا تجارت یا مختلف پیشوں کی وجہ سے ہندوستان میں موجود ہیں مگر ان کا اصلی وطن انگلستان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلی اور پانچویں قسم کے ہندوستان کا ہندوستانی پریس پر پوری طرح غلبہ ہے۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ابتدا میں یوروپین حضرات نے پریس کا کام شروع کیا۔ اس کے بعد ہندوؤں نے اس کی تقلید کی۔ اس کے لئے بنگال کی نظیر کافی ہوگی۔ بمبئی میں پارسیوں نے پہلے اخباری دنیا میں قدم رکھا۔

مسلم لیگ کے پاس اب تک کوئی انگریزی پریس نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں کی آواز ہمیں ملک میں بہت کم سنائی دیتی ہے اسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں بھی جو اب ملک کا ایک اہم جزو بن گئی ہیں کوئی ایسا چھاپہ خانہ یا اخبار نہیں ہے جو ریاستی حدود سے باہر کوئی اثر رکھتا ہو۔

سیاسی خیالات کی عکاسی کا دارومدار بیشتر ایک ایسی طاقت ور پارٹی پر ہوتا ہے جس کا اپنا پریس موجود ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پریس کسے کہتے ہیں؟ پریس کے معنی ہیں خبریں چھاپنا اور ان کو بیچنا۔ یہ ایک قسم کی قابل عزت خدمت ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پریس صنعت بھی ہے، تجارت بھی ہے، معزز پیشہ بھی — اور یہ تمام باتیں ایک ہی وقت میں ممکن بھی ہیں اور علیحدہ بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پریس عوام الناس کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔

ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے سے لیکر کیشب چندر سین۔ گوکھلے۔ تلک۔ فیروز مہتا۔ دادا بھائی نوروجی سی، وائی چنتامنی مہاتما گاندھی

اور جاہر لال نہرو تک جیسے لوگ بلند مرتبہ لیڈر ہیں۔ جنہوں نے پریس کے ذریعے سے عوام الناس پر اپنے خیالات کو نہایت خوش اسلوبی سے پہنچایا ہے۔

یہ ایک ناقابل تاریخی حقیقت ہے کہ جن بڑے بڑے رہنماؤں کے نام اوپر درج کئے ہیں ان سب نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ انگریزی زبان کی حیثیت اور اس کے استعمال سے وابستہ ہے۔ نیز یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ نئی الحال ہندستان اور برطانیہ کے خیالات میں زیادہ یگانگت پائی جاتی ہے۔ خیالات کے اظہار کی آزادی پریس کے نشوونما کے لئے بنیادی چیز ہے۔ جو انگلستان میں پوری طرح اور ہندستان میں کسی حد تک پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا نصب العین ہے جو بعض ملکوں کو حاصل ہو چکا ہے اور بعض میں مفقود ہو چکا ہے۔ ہندستانی دنیا میں سرعت کے ساتھ بدل رہی ہے اسی کی یہ زندہ تصویر ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہندستان کی آئندہ سیاسی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہوگی۔ بہرحال یہ یقینی چیز ہے کہ ہندستانی پریس پر اس سوال کو طے کرنے کی کافی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)

مُنتخبات

جوانی اگر جاودانی ہو یا رب
تری سادہ دُنیا کو جنت بنا دیں
شب وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

اختر شیرانی

حیات کی ابدی رات کے اندھیرے میں
چراغ عارضِ شب زندہ دار ہیں ہم لوگ
بس اِس خطا پہ کہ ہیں محرمِ رموزِ حیات
شکارِ کشمکشِ روزگار ہیں ہم لوگ

جوشؔ ملیح آبادی

افسانہ

صوفیہ

(از جناب خالد حسن قادری)

صوفیہ برابر اپنے کام میں مشغول تھی۔ اُس کی نازک مرمریں انگلیاں انگور کا خوشہ کاڑھنے میں مصروف تھیں۔ لیکن انیسہ برابر کمرے میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ کبھی میز پر سے یہ چیز اُٹھاتی کبھی وہ۔ کبھی دراز کھول کر اس کی چیزیں دیکھتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن بڑی بہن کی سنجیدگی اور مشغولیت کی وجہ سے کچھ ہمت نہیں پڑتی۔ اُس نے کچھ شعر گنگنانا شروع کیے۔ لیکن صوفیہ برابر اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہی۔ انیسہ کو اتنا صبر کہاں تھا۔ آخر اُس نے اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے سوال کر ہی دیا۔

"اپیا آپ کو معلوم ہے رضیہ نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

"یقینی کوئی غیر دلچسپ بات ہوگی۔"

"آپ کا یہ جواب اخروٹ کے چھلکے سے زیادہ خشک ہے۔"

"انیسہ تم بہت شریر بچی ہو!"

"یہ آپ کی دوسری غلطی ہے۔ میں اب بچی نہیں ہوں آپ کو معلوم ہے میری اب شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا؟"

"یہی تو رضیہ نے مجھ سے کہا ہے۔"

"کیا بے وقوفی ہے۔ میں تمہارا ایک لفظ بھی نہیں سمجھی۔"

"ابھی میں آپ سے سب کہتی ہوں۔ لیکن کیا آپ کی سنجیدگی آپ کی تھوڑی سی توجہ اِدھر مبذول کرنے کی اجازت دیگی؟"

"ہاں ہاں! لیکن جلدی کہو۔"

"سنہری صبح تھی ہم پولو کے میدان میں مریخ کی دنیا میں بیٹھے تھے آپ وہاں نہیں تھیں۔ آپ کو تو اپنی کتابوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔"

"اگر تم اس طرح افسانہ خوانی کروگی تو میں تمہاری بات نہیں سنوں گی۔ جلدی کہو جو کچھ کہنا ہے۔"

"آپ کو سننا پڑیگا۔ میں یہ بات آپ سے کہے بغیر نہ مانوں گی۔ ساتھ پھرتا رہتا ہیں۔

ہاں تو پولو کے میدان میں ہم اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔"

"ہم کون؟"

"میں رضیہ اور ممی۔ تھوڑی دیر کے بعد ارشد ہمارے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ ارشد کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ اس دن ممی نے پارک سے لوٹتے میں ہمارا تعارف کرایا تھا۔ تو تھوڑی دیر بعد ریس شروع ہو گئی۔ میرا خیال تھا نمبر ۱ جیتے گا مگر ارشد کا خیال تھا نمبر ۴ جیتے گا۔ ہم دونوں نے دس دس روپے لگائے۔ اتفاق کی بات ارشد والا نمبر جیت گیا۔ میں اور ممی اکثر پارک میں ٹہلنے جاتی ہیں۔ وہ بھی ساتھ ہو لیتا ہے۔"

"اچھا۔" صوفیہ نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی چمکدار آنکھوں میں افسردگی کی جھلک آگئی۔

"آپ تو ہر وقت اپنی کتابوں میں گھسی رہتی ہیں۔ ممی نے اس کے متعلق مجھ سے پوچھا بھی تھا۔ میں نے اس وقت تو کوئی جواب نہ دیا تھا لیکن اب یہ بات تقریباً طے ہو گئی ہے۔"

"اچھا۔" صوفیہ نے پھر افسردہ لہجے میں کہا۔ "پھر؟"

"پھر کیا: میں شادی پر بہلین، نرگس، پال اور شیلا کو بھی بلاؤنگی۔"

"لیکن .... تم اس طرح شادی کرنے کو تیار ہو جاؤگی؟"

"اس طرح سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"بغیر اُس کو جانے ہوئے بغیر اس سے محبت کیے ہوئے۔"

"لیکن میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کئی مرتبہ اس کو ریس کے میدان میں اور ممی کے ساتھ ٹہلتے پارک میں دیکھا ہے۔ میں اُس سے محبت بھی کرتی ہوں پرسوں میں نے کھانا کھانے سے اسی لئے انکار کر دیا تھا کہ میں نے اس کو صبح سے نہیں دیکھا تھا۔ اور بجائے کھانے کے تین پیالیاں کافی کی اسی لئے چڑھائی تھیں کہ اس کے غم میں خودکشی کرلوں۔"

"لیکن وہ" صوفیہ نے انیسہ کی شرارت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اِس لئے وہ محبت بھی کرتا ہوگا۔" انیسہ نے مسکرا کر کہا۔ لیکن صوفیہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ انیسہ یہ سمجھی کہ شاید اسکی بات سے صوفیہ کو تکلیف پہنچی۔ اُس نے صوفیہ کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور بولی۔ "میری بات آپ کو ناگوار ہوئی اپیا؟"

"نہیں پیاری تم سچ کہتی ہو۔ جب محبت کرتے ہیں تب ہی شادی بھی کرتے ہیں۔ محبت پیدا کرنا مشکل ہے۔" اُس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

محبت پیدا کرنا! محبت پیدا کرنا !! " انیسہ نے آہستہ آہستہ دہرایا۔

"لیکن پیار تو بہت آسان ہے۔ لیکن جب کوئی ہر وقت ناک بھوں چڑھائے رہے اور کبھی نہ مسکرائے۔ ہمیشہ فلسفیوں کی طرح سوچتا رہے۔ ہر وقت چہرے پر سنجیدگی برستی رہے اور جب سب دوست کھیل رہے ہوں یا تفریح کو جا رہے ہوں اس وقت بھی پڑھتا رہے۔ جب کوئی ملنے آئے تو کبھی اُس سے نظر ملا کے بات نہ کرے تو آپا ایسی حالت میں محبت کرنا واقعی مشکل ہے۔"

صوفیہ نے اپنا سر اور جھکا لیا اور کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ ہلکی سی کپکپی کے بعد ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ جیسے وہ سسکی کو روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا میں نے آپ کو پھر تکلیف پہنچائی؟" انیسہ نے پوچھا۔ "میں چاہتی ہوں کہ کوئی آپ سے بھی محبت کرے۔ میں آپ کو دُلہن بنا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیسا اچھا ہو اگر ہم دونوں ایک ہی دن دُلہن بنیں۔"

"کیا بیوقوفی ہے۔ میں نہیں کرونگی شادی۔"

"نہیں آپا" انیسہ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارشد کے ایک بھائی اور بھی تو ہے۔"

"بدتمیز چپ رہو۔" صوفیہ سنجیدگی سے بولی۔

اُسی وقت ان کی ماں داخل ہوئی وہ کہیں جانے کے لئے کپڑے بدلے ہوئے تھیں۔

"ممی آپ کہیں جا رہی ہیں؟" انیسہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں ارشد کی والدہ کے پاس جا رہی ہوں۔"

"ارشد کی والدہ کے پاس!" انیسہ بولی "تب تو واقعی ضروری بات ہوگی۔"

"ہاں تمہیں ابھی معلوم ہو جائیگا۔ صوفیہ تم ذرا میرے ساتھ چلو۔"

"کیا آپا کو بھی ارشد کی والدہ سے کچھ ضروری کام ہے؟" انیسہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"انیسہ! اب تم اپنی شرارتیں کب چھوڑو گی؟ ذرا آدمی بنو۔"

"ممی! آپ دیکھیں گی کہ میں ابھی اپنی شرارتیں چھوڑ دونگی۔"

یہ کہکر اُس نے بڑی سنجیدگی سے دروازہ کا پردہ اُٹھایا تاکہ ممی اور صوفیہ دونوں نکل جائیں۔ جب وہ دونوں چلی گئیں تو پیچھے سے زور سے قہقہہ لگا کر بولی "آپ دونوں باتیں کیجئے میں نہیں سن رہی ہوں۔"

ارشد، صوفیہ کی طرح زیادہ سوچنے کا عادی نہ تھا۔ نہ وہ فلسفی تھا اور نہ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ فلسفی بن سکے۔ دن بھر دوستوں سے ملنے، پولو، ریس اور سنیما، شکار وغیرہ میں گذر جاتا۔ شام کو اکثر حصہ انیسہ کے ساتھ گزرتا۔ اسکو رسالہ وغیرہ پڑھنے کیلئے بھی مشکل سے وقت ملتا۔ پھر وہ فلسفی کیسے بن سکتا تھا۔

لیکن اس شام وہ آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ نظریں کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ گویا وہ اُسے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن حقیقت میں اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "بابا بالکل راضی ہیں۔ آج انیسہ کی ممی بات کرنے آئی ہونگی۔ میرے سب دوست خوش ہیں۔ پرسوں کلب میں سب اس حسین انتخاب پر مُبارکباد دے رہے تھے۔ واقعی شادی کامیاب ہوگی۔ انیسہ واقعی خوبصورت ہے۔ جب وہ اپنی شرارتی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر ہنستی ہے اور موتی جیسے چمکدار دانت نظر آتے ہیں تو یہ جی چاہتا ہے اس کو خوب پیار کروں۔ وہ کتنی خوش مذاق ہے۔ ہنس مکھ ذرا ذرا سی بات پر ہنس دیتی ہے۔ شرارت تو نس نس میں بھری ہوئی ہے۔ ہر وقت فقرے چست کرنے کو تیار رہتی ہے۔ میں نے تو اس کی پیشانی پر شکن بھی نہیں دیکھی ہم دونوں کتنے خوش رہیں گے۔ مجھے سنجیدگی ذرا بھی پسند نہیں۔ اور خاصکر ان لوگوں میں جنہیں میں پسند کرتا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی سنجیدگی کسی غم کی پردہ دار ہوتی ہے۔ جو مجھے دیکھکر سنجیدہ بن جاتے ہیں مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ہی ان کی اس تکلیف کا جسے وہ سنجیدگی میں چھپانا چاہتے ہیں ذمہ دار ہوں۔ صوفیہ ہمیشہ ایسی ہی سنجیدہ رہتی ہے۔ نہ معلوم کیوں۔ جب بھی وہ میرے سامنے آتی ہے تو میری ساری شگفتگی ختم ہو جاتی ہے۔ تمام ماحول پر ایک گہرا سکوت اور خاموش اُداسی چھا جاتی ہے۔ وہ شام چاہے کتنی ہی حسین ہو لیکن مجھے جون کے مہینے کی تپتی ہوئی گرم دوپہر سے بدتر محسوس ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی میں مجھے انیسہ سے بھی مذاق کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس نے اپنا یہ ناخوشگوار اثر محسوس کیا ہو۔ اور ضرور کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ مجھ سے بغیر نظریں ملائے ہوئے بات کرتی ہے۔ نہ کبھی میری طرف دیکھتی اور نہ کبھی رخصت ہوتے وقت ہاتھ ملاتی ہے۔ اور کوئی بات پوچھو تو مختصر سے مختصر الفاظ میں جواب دیتی ہے۔ شاید اس نے میری نفرت کا احساس کیا ہوگا۔ اور ممکن ہے اپنی کچھ توہین بھی محسوس کی ہو ——"

"انیسہ تو بہت ہنس مکھ اور شرارتی ہے۔ اس کی تو رگ رگ میں بجلیاں دوڑتی ہیں سنجیدگی تو درکنار وہ کبھی سوچ سمجھکر بات تک نہیں کرتی۔ ہمیشہ مذاق، اودھم اور فقرے بازی۔ وہ مجھ سے یقینی محبت کرتی ہے۔ لیکن دیوانہ وار نہیں۔ اور میں شادی سے پہلے دیوانہ وار محبت کا قائل بھی نہیں۔ میں تو دو باتوں کا قائل ہوں

ایک یہ کہ لڑکے اور لڑکی کو بالکل ایک سی طبیعت کا ہونا چاہیئے۔ ذرا بھی اختلاف نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ شادی سے پہلے محبت دیوانہ وار نہ ہو۔ ہم دونوں کے ساتھ بالکل یہی معاملہ ہے۔ ہم دونوں یقیناً بہت خوش رہیں گے۔ شادی کے بعد ہم ہوا خوری کو جائیں گے۔ تمام دلچسپ مقامات کی سیر کریں گے۔ تین مہینے تک۔ مگر نہیں تین مہینے تو کم ہونگے۔ کم سے کم چار مہینے تک۔ اچھا ہے کچھ دن انیسہ صوفیہ سے الگ رہے مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں صوفیہ اسے بھی سنجیدہ اور خشک نہ بنا دے۔

مگر میں پوچھتا ہوں آخر صوفیہ اتنی سنجیدہ کیوں ہے؟ اس کی عمر مشکل سے بیس برس کی ہوگی۔ اس عمر میں بڈھوں کے سے انداز۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی آنکھیں انیسہ سے بہتر ہیں۔ وہ بالکل ایک ملک کی طرح ہے لیکن مغموم۔ میرے خیال میں اگر وہ ایسے ہی رہی تو شاید کوئی اس سے شادی کرنا پسند نہ کرے۔ اس کی اس سنجیدگی میں شاید کوئی راز ہے۔ رازِ محبت۔ ممکن ہے۔ میں اس راز کے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ انیسہ سے پوچھوں گا۔ جب ہم دونوں الگ ہونگے۔ انیسہ کو چاکلیٹ کتنے پسند ہیں۔ اس کے اعتراض بعض میں وہ کتنے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض وقت تو وہ بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ ایک دن کہہ رہی تھی کہ مجھے بادل گرجنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ جب بادل گرجتا ہے تو فوراً کمرے میں جاکر تکیوں میں اپنا منہ چھپا لیتی ہوں۔ کیسی بچوں کی سی بات ہے۔ مگر اس کی یہ باتیں کتنی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض وقت اس کی باتوں پر صوفیہ بھی مسکرا دیتی ہے۔ اس کے حسین چہرے کو یہ مسکراہٹ کس قدر درخشاں بنا دیتی ہے وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے اس وقت۔"

کتاب اس کے گھٹنوں پر گر پڑی۔ آواز پر چونکا۔ ادھر اُدھر دیکھا اور پھر کھو گیا ——

شفق کی سرخی آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ صوفیہ دریچہ میں سے جو سڑک کی طرف کھلتا تھا بازار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت بمبئی کے خاص بازاروں میں بہت بھیڑ ہوتی ہے۔ موٹروں اور سواریوں کی ایک مسلسل قطار چلی جاتی ہے صوفیہ نیچے کسی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دم اس کے چہرے پر ہلکی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے اور ذرا نیچے جھک کر دیکھا۔ اب اس کے چہرے کی شگفتگی غائب ہوگئی۔ وہ پھر کمرے میں آگئی۔ اتنے میں انیسہ اچھلتی کودتی داخل ہوئی۔

"کیا کر رہی ہیں آپ۔ پڑھ رہی ہونگی۔"

"ہاں پڑھ ہی رہی ہوں۔"

"اس وقت پڑھائی! کھڑکی میں سے سڑک کا تماشہ بھی نہیں دیکھا؟"

"ہاں دیکھا ہے۔"

"میں شام سے درزی کا انتظار کر رہی تھی۔ آج بادامی لباس لانے کا وعدہ کیا تھا اُس نے۔ اسی لئے میں نے کل ارشد سے کہا تھا کہ تم بھی اپنا بادامی سوٹ پہن کر ساڑھے چھ کے قریب یہاں آ جانا میں وہ پہنے ہوئے ملوں گی۔ وہ بے چارا شاید آیا ہو۔"

"ارشد ابھی یہاں سے گذرا ہے۔ بادامی سوٹ ہی میں تھا۔"

"اچھا آپ نے بھی دیکھا تھا۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ کتاب سے ہی چمٹی رہیں۔"

"میں اس دریچہ میں ہی کھڑی تھی۔"

"اور آپ نے ارشد کو پہچان بھی لیا —— حالانکہ آپ نے کبھی اسکے چہرے کی طرف نہیں دیکھا ہوگا۔ اُس نے دیکھا ہوگا آپ کو؟"

"ہاں ہاں"

"اور سلام بھی کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا؟"

"نا"

"کیوں؟ یہ بہت بُرا کیا آپ نے۔ کم سے کم اخلاقاً مسکرانا ہی چاہیئے تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ آخر آپ اس قدر الگ کیوں رہتی ہیں۔ ہر وقت سنجیدہ۔ خاموش۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ تیز، با اخلاق اور خوش سلیقہ ہیں لیکن نہ معلوم کیوں ان خصوصیات کو چھپائے رکھتی ہیں۔ وہ یہ سب باتیں بہت دلچسپی سے سنتا رہا پھر اخیر میں کہنے لگا کہ آخر وہ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟"

"نفرت!"

"ہاں اُس نے یہی پوچھا تھا مجھ سے۔ اور آپ جانتی ہیں کہ وہ غلط نہیں کہتا۔ آخر آپ اپنا برتاؤ دیکھئے اس سے کس طریقے سے ملتی ہیں۔ اگر وہ یہ خیال نہ کرے تو اور کیا کرے۔ لیکن میں نے اس کی اس بات کی بھی تردید کر دی اور کہا کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ تمہاری اکثر تعریف کرتی ہیں۔"

"انیسہ!"

"میں جانتی ہوں کہ یہ سب غلط ہے۔ لیکن آپ کا کس قدر خیال کرتا ہے اور آپ اس کے ساتھ بالکل اجنبی کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ آپ خود بتایئے یہ کس قدر نامناسب ہے۔"

صوفیہ نے بغیر کچھ جواب دئے ہوئے انیسہ کی گردن میں باہیں ڈالدیں اور اسے کھینچ کر پیار کیا۔

انیسہ بولی۔ "آخر آپ بھی ارشد کا تھوڑا بہت خیال کیوں نہیں کرتیں؟"

صوفیہ نے اسے کھینچتے ہوئے پیشانی پر بوسہ دیا۔ انیسہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ ٹہلنے نہیں چلیں گی؟"

"نہیں۔ میرے سر میں اس وقت درد ہو رہا ہے تم اور ممی چلے جاؤ۔"

"میں اور ممی تو خیر چلے ہی جائیں گے۔"

"ارشد جا رہا ہے تمہارے ساتھ۔"

"نہیں اُس کے کلب میں آج جلسہ ہے وہ وہاں گیا ہوگا۔"

صوفیہ اپنے کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ اس کو تنہائی ہی پسند تھی۔ کرسی پر وہ نیم دراز ہو گئی۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے لگا ہوا تھا۔ بجلی کی روشنی میں اسکے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔

سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سے وہ چونک گئی۔ ارشد کمرے میں داخل ہوا۔ صوفیہ کو دیکھکر کچھ ٹھٹکا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ باقی لوگ دوسرے کمرے میں ہی ہونگے۔ آگے بڑھا اور بولا:۔

"مزاج بخیر؟"

"جی ہاں شکر ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ اس مختصر جواب کے بعد وہ کیا کہتا۔ یہ صوفیہ کتنی خشک مزاج واقع ہوئی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔

دونوں ایک دوسرے کچھ فاصلہ پر بیٹھ گئے۔

"ممی اچھی طرح ہیں؟"

"جی ہاں بخیریت ہیں۔"

"اور انیسہ"

"وہ بھی اچھی ہے۔"

"کتنے مختصر جواب دے رہی ہے۔ ارشد نے سوچا کچھ دیر سلسلہ گفتگو رکھا جائے۔

"انیسہ کہیں گئی ہیں؟"

"وہ ممی کے ساتھ ٹہلنے گئی ہیں۔" صوفیہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

ارشد نے سوچا کہ شاید صوفیہ کو اُس کی موجودگی کی وجہ سے کچھ گھبراہٹ ہے۔ یہ سوچ کر اس نے جانا چاہا لیکن معلوم کیوں وہ نہ اُٹھ سکا۔

"ہمارے کلب کے ممبر نہیں آئے تھے اِس لئے جلسہ ملتوی ہو گیا۔"

"انیسہ کو خبر نہیں۔ اسی لئے وہ چلی گئی۔"

"آپ نہیں گئیں؟"

"مجھے کچھ ٹہلنے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔"

"غالباً کتابوں کو آپ ترجیح دیتی ہیں۔"

"یقیناً کتابیں اِس طرح وقت ضائع کرنے سے کہیں بہتر ہیں۔ آپ خود بتایئے ارشد صاحب! کتابوں سے آدمی بہرحال تجربہ لیاقت، معلومات بڑھا سکتا ہے۔ لیکن اسطرح وقت ضائع کرنے سے کیا نتیجہ۔"

صوفیہ کی سرد مہری اب ختم ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی بھی شگفتگی سے بدل چکی تھی۔ دو ایک دفعہ ارشد کی طرف دیکھکر مسکرائی بھی۔ ارشد اس تبدیلی پر بہت مسرور ہوا۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے میں کئی مرتبہ دونوں کی نظریں بھی ملیں۔ صوفیہ اب اس سے بالکل اس طرح بات کر رہی تھی جیسے ایک دوست سے کرنی چاہئیں۔ دونوں کافی بے تکلفی محسوس کرنے لگے۔ جب ارشد جانے لگا تو دونوں نے ہاتھ ملائے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ارشد چلا گیا۔

ارشد صوفیہ کے سامنے جتنا مسرور تھا زینہ سے اترتے ہی اس پر اتنی ہی اُداسی چھا گئی۔ ایک عجیب طرح کی افسردگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ صوفیہ، انیسہ اور اپنے بارے میں کیا سوچے۔

صوفیہ خوش تھی۔ بہت خوش۔ اتنی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ رونے لگی اور دیر تک روتی رہی۔

تین مہینے گزر گئے تھے۔ انیسہ برابر اپنی شادی کو ٹالتی ہی رہی۔ جب اس کی ممی اصرار کرتیں تو وہ کہدیتی کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ ذرا ٹھہرئے۔ اب وہ معاملات کو سمجھ رہی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح گاتی بجاتی اودھم مچاتی، صوفیہ کو تنگ کرنے کیلئے طرح طرح کی حرکتیں کرتی۔ لیکن جب وہ ارشد کا ذکر کرتی تو صوفیہ اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتی اور بڑی دلچسپی سے اُس کی بات سنتی۔ انیسہ نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ ارشد میں بھی اب تبدیلی ہو چکی تھی۔ اب وہ ویسا چھچھورا اور شرارتی نہیں تھا۔ اس میں سنجیدگی آ چکی تھی۔ اکثر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا۔ باتیں بھی بہت مختصر کرتا۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس حالت پر قابو پا لیتا اور وہی ارشد بن جاتا لیکن بہت تھوڑی سی دیر کے لئے۔ اسکی آنکھوں سے اس کے اندرونی غم و فکر کا اظہار ہوتا تھا۔

صوفیہ بھی بدل چکی تھی۔ صوفیہ جو کبھی کبھی بے اختیار انیسہ سے لپٹ جاتی تھی اور اس کو پیار کرتی تھی۔ اب گھنٹوں اس سے بات بھی نہ کرتی۔ بلکہ اکثر اس سے دُور رہنا چاہتی۔ جب وہ انیسہ کو دیکھتی تو ایک دم اس کے رخساروں پر سُرخی دوڑ جاتی۔

اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی ۔ رات کو دیر تک جاگتی رہتی ۔ اکثر انیسہ دبے پاؤں اس کے کمرے کے قریب جا پہنچتی تو وہ یا تو کروٹیں بدلتی ہوتی یا جاگتی ہوتی ۔

جب صوفیہ اور ارشد ملتے تو یہ حالت اور نمایاں ہو جاتی اور یہ تقریباً روزانہ ہی ہوتا ۔ دونوں کم گفتگو کرتے ۔ جواب بہت مختصر اور اکثر مبہم سے ہوتے ۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو اکثر دیکھتے رہتے ۔ کبھی کبھی تو تمام دن دونوں میں کچھ بھی گفتگو نہ ہوتی ۔ دونوں ایک دوسرے سے ذرا دور ہی رہتے ۔ لیکن صوفیہ جس چیز کو چھوتی تو ارشد ضرور کسی نہ کسی بہانے سے اس چیز کو اٹھا لیتا ۔ جب کبھی صوفیہ کو آنے میں ذرا دیر ہوتی تو ارشد بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھتا رہتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ صوفیہ کے آنے کے چند منٹ بعد ہی وہ اجازت لیکر چلا جاتا ۔ صوفیہ بھی پہلے سے دبلی ہو گئی تھی ۔ آنکھوں کے حلقے نمایاں ہو گئے تھے ۔ اکثر وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہتی ۔ نہ باہر نکلتی اور نہ کسی سے ملتی ۔

ایک شام کو انیسہ اُس کے کمرے میں داخل ہوئی ۔

" مہربانی کر کے آپ ذرا تکلیف گوارا کریں گی ؟"

" کیا بات ہے ؟"

" ارشد باہر چبوترے پر اکیلا ہے ۔ میں ذرا خط لکھنا چاہتی ہوں ۔ آپ مہربانی کر کے ذرا اس کے پاس چلی جائیے ۔"

" لیکن ــــــــ"

" میری خاطر ذرا سی تکلیف ۔"

" لیکن تم کب آؤ گی ؟"

" مجھے دو لائنیں لکھنی ہیں ابھی آتی ہوں ۔"

صوفیہ باہر چبوترے کی طرف چلی ۔ ارشد وہاں ٹہل رہا تھا ۔ آہستہ آہستہ وہ وہاں آئی ۔

" انیسہ نے مجھے بھیجا ہے ۔"

" آپ کو زبردستی آنا پڑا ؟"

" زبردستی ۔ نہیں تو ۔"

اُس کا چہرہ اتر گیا اور بدن نہ معلوم کیوں کپکپانے لگا ۔ ارشد اُس کے قریب ہی تھا ۔

" کیا بات ہے صوفیہ ؟"

" کچھ نہیں ۔"

" تمہیں معلوم ہے صوفیہ " اُس نے ہمت کر کے کہا ۔ " میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔"

" ارشد کیا کہہ رہے ہو ذرا سوچو تو ۔ اگر انیسہ سن لے تو ۔"

" میں انیسہ سے محبت نہیں کرتا صوفیہ ! مجھے تم سے محبت ہے ۔"

" لیکن یہ دھوکا دینا ہوگا ۔"

" میں جانتا ہوں ۔ لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔"

" اچھا !" انیسہ دروازے میں سے دیکھکر مسکرائی ۔ " دونوں میں صلح ہو گئی ۔"

انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا ۔ صوفیہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے وہاں سے چلی گئی ــــــ ارشد ساکت و صامت کھڑا رہ گیا ۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو ۔

" کیا ہوا ارشد ؟" انیسہ بولی

" کچھ نہیں میں جا رہا ہوں ۔"

بغیر انیسہ سے رخصت ہوئے وہ چلا گیا ۔ انیسہ اُس کو دیر تک دیکھتی رہی اور پھر دیر تک سوچتی رہی وہیں کھڑی ۔

" اوہو ! یہ بات ہے ۔ اب میں سمجھی ۔"

ایک دن انیسہ سے ممی نے جب شادی کے متعلق پوچھا تو وہ بولی

" میں ارشد سے شادی نہیں کروں گی ۔"

" کیوں ؟" اُنہوں نے تعجب سے پوچھا

" نہ مجھے اُس سے محبت ہے اور نہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے ۔"

" یہ صرف تمہارا خیال ہے وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور پھر تم دونوں وعدہ بھی تو کر چکے ہو ۔"

" اس سے کیا ہوتا ہے ۔"

" لیکن لوگ کیا کہیں گے ؟"

" یہ مسٹر لوگ کون صاحب ہیں میں ان سے واقف نہیں ۔"

" تم اپنی شرارتیں نہیں چھوڑو گی ۔ لیکن آخر ارشد سے کیا کہا جائیگا ۔"

" کیوں کہنے کو کیا ہوا ۔ آپ کہہ دیجئے گا کہ وہ بہت شرارتی ہے ۔ بدتمیز ہے ۔ ممکن ہے کہ آئندہ واقعات اور تلخ ہو جائیں ۔ پھر آپ ایسا کے ساتھ . . . ."

" ایسا ــــــ کیا کہہ رہی ہو تم ۔ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا ۔"

ہاں ہاں میں صوفیہ کے ساتھ ۔ اب تک وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ رہتے ہیں ۔ اس لئے ایک دوسرے کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں ۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ شادی کے بعد وہ بہت خوش رہیں گے ۔ اور پھر یہی مناسب بھی ہوگا ۔"

" یہ تو ٹھیک ہے ۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ ارشد مان جائے ۔ ممکن ہے اُس کی والدہ ناراض ہو جائیں ۔"

" نہیں نہیں ۔ آپ بالکل اطمینان رکھئے ۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا ہوگا کہ میں بغیر محبت کئے ہوئے شادی نہیں کر سکتی ۔ اس میں ناراضگی کی کوئی وجہ ہی نہیں ۔"

" لیکن صوفیہ کے متعلق شک ہے ۔"

" کچھ شک کی بات نہیں ۔ آپ اس چیز کو اُن پر چھوڑ دیجئے ۔ وقت گذرنے پر سب کام اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گے ۔"

" اچھا دیکھو کیا ہوتا ہے ۔ تم اب جاؤ سونے ۔"

جب انیسہ چلی گئی تو ممی نے سوچا کہ انیسہ ٹھیک تو کہتی ہے ۔ صوفیہ اور ارشد کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے ۔"

" اب معاملہ ٹھیک ہوا ۔" انیسہ نے سوچا ۔ ممی کے ساتھ کیا چال چلنا پڑی مجھے ۔" اب سب باتیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی ۔" وہ صوفیہ کے کمرے کی طرف گئی ۔ کمرہ بند تھا ۔ اس نے کان لگا کر سنا ۔ وہ بدستور کروٹیں بدل رہی تھی ۔ دو ایک سسکیوں کی بھی آواز آئی ۔

" اچھا اچھا !! اب تم آرام سے سو جاؤ ۔ میں نے سب باتیں ٹھیک کر دی ہیں ۔ تم کچھ فکر نہ کرو ۔"

اُس نے آہستہ سے کہا اور پھر اپنے کمرے میں آکر سو گئی ۔

وقت حقیقت میں بڑا کارساز ہے ۔ وہی ہوا جو انیسہ نے سوچا تھا ۔ آخر ایک دن وہ سنہری شام بھی آہی گئی جب انیسہ نے صوفیہ سے پوچھا کہ آپ اپنی شادی پر مجھے کیا تحفہ دیں گی ۔ ارشد بھی بیٹھا تھا ۔ اس نے ارشد سے کہا کہ دیکھئے میرے لئے بہت سی چاکلیٹ لانا نہ بھول جائیے گا ۔ ارشد اور صوفیہ اس کی باتیں سُن کر ہنس دیئے ۔" میرا ہمیشہ سے خیال ہے ۔" ارشد اسی شام کو اپنے ایک دوست سے بولا ۔" لڑکے اور لڑکی کو ہمیشہ مختلف طبیعتوں کا ہونا چاہیئے تاکہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں ۔ ایک دوسرے کی خاطر اپنی عادات و اطوار میں تبدیلی کر سکیں ۔ تھوڑی قربانی ہی کر سکیں ۔ دونوں کو کبھی بالکل ایک سی طبیعت کا نہ ہونا چاہیئے ۔ ایک سی طبیعت والے تو دو متوازی لائنوں کی طرح ہوتے ہیں جو بالکل آمنے سامنے ہوتی ہیں لیکن کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں ۔

بالکل سچا واقعہ - نام فرضی

بتاؤں کیا تجھے اے ہمنشیں کس سے محبت ہے؟

(از محترمہ عطیہ روحی دھلی)

نوٹ:... یہ اُن بے شمار واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جو ہماری سوسائٹی میں روزانہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر جانیں ہماری سوسائٹی کے قید وبند کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اور جو بچتی ہیں وہ زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔ ورنہ کم از کم ہر ایسی زندگی میں ایک ایسا کانٹا باقی رہ جاتا ہے جو کسی صورت نہیں نکلتا اور جس کی کسک مرتے دم تک باقی رہتی ہے۔

(فصیح الدین احمد)

میرے والد رتلام میں ملازم تھے یہ بہت ہی صحت بخش قصبہ تھا۔ یہاں زیادہ تر ریلوے ملازم رہا کرتے تھے۔ ایک نئے صاحب بدل کر آئے اور ہمارے بنگلے کے قریب ہی اُن کا قیام ہوا اُن کی ایک لڑکی تھی۔ جس کا نام زیب تھا۔ زیب سے میری گہری دوستی ہوگئی۔ زیب بہت سنجیدہ اور اچھی لڑکی تھی۔ شائستگی اور علمیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ گو اُس نے باقاعدہ کسی سکول میں تعلیم حاصل نہ کی تھی مگر اس کا انداز گفتگو تعلیم یافتہ لڑکیوں کا سا تھا۔ ہم دونوں بچپن کے حدود سے نکل کر جوان ہو رہے تھے۔ اور ہماری محبت بھی زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو رہی تھی۔ ایک دن مجھے بخار آگیا اور اُس نے ٹائیفائڈ کی صورت اختیار کرلی۔ اِن دنوں ریلوے ہسپتال میں ایک نیا ڈاکٹر ٹریننگ کے لئے آیا تھا۔ وہی میرے علاج کے لئے مقرر ہوا۔ زیب میری خطرناک بیماری کے سلسلہ میں ہر وقت میرے پاس رہا کرتی تھی۔ اور مجھے بھی اُسکی جدائی ایک منٹ کو گوارا نہ تھی۔ نہ جانے کیوں ان دنوں زیب کے چہرے سے کچھ انتشار معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا بھی۔ مگر وہ شاید میری بیماری کی وجہ سے ٹال گئی۔

زیب کا نکاح ہو چکا تھا اور فرید اُس سے بے حد محبت کرتے تھے اور یہ نکاح بھی محبت کی بنا پر ہوا تھا۔ وہ اکثر فرید کا تذکرہ کرتی اور اُن کے قصے سناتی تھی۔ اور ہمیشہ اُن کی کامیابی کیلئے دل سے دعا کرتی رہتی تھی۔ اس زمانے میں فرید کلکتہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وداع کی یہ ہی شرط تھی جب فرید تعلیم سے فارغ ہو کر برسر روزگار ہو جائیں گے تب زیب کو وداع کیا جائیگا۔ غرض ڈاکٹر کا علاج اور زیب کی تیمارداری بار آور ہو رہی تھی اور میں دن بدن رو بصحت ہوتی جاتی تھی۔ مگر زیب روحانی مرض میں گرفتار تھی اس عرصہ میں بھی بہت کچھ تندرست ہو چکی تھی۔

ایک دن میں نے بہت اصرار سے پوچھا کیا فرید کی یاد بہت بے چین کر رہی ہے؟ "تم آج کل بہت اداس نظر آتی ہو"۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور مجھے اُس نے بتایا کہ ڈاکٹر اُس سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور وہ بھی اُن کی محبت کی قدر کرتی ہے۔ مجھے ایکدم ہنسی آگئی۔ اور دیر تک اُس کے اس جنون کا مذاق اڑاتی رہی۔ دراصل میں محبت کی قائل نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کے جذبات کا احترام نہ کر سکی۔

رتلام میں ایک چھوٹا سا کلب بھی تھا۔ تھا تو وہ مردانہ۔ مگر ہفتہ کے دن عورتوں کا پروگرام ہوتا۔ سب لڑکیاں کھیلتیں، کودتیں اور ہنس بول کر وقت ختم ہو جاتا۔ چونکہ میری اور زیب کی دوستی ضرب المثل تھی اس واسطے اکثر لڑکیاں حسد کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے لڑکیوں کی دو پارٹیاں تھیں۔ ایک کی سردار زیب اور دوسری کی لیڈر اشرف تھیں۔ ان دونوں پارٹیوں میں اچھی خاصی لڑائی ٹھنی ہوئی تھی۔ ہر ایک موقعہ کی تلاش میں رہتا کہ کوئی بات ہاتھ لگے تو اپنی مخالف پارٹی کو نیچا دکھائے۔ وقت کی بات تھی، ڈاکٹر نے ایک خط زیب کے نام لکھا۔ پگلی زیب مجھے وہ دکھانے کیلئے کلب میں لے آئی۔ مگر لڑکیوں کی کثرت کی وجہ سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ پھر ہم سب کھیلنے چلے گئے۔ بیڈمنٹن کھیلنے میں زیب کے پاس سے وہ پرچہ گر گیا اور بدقسمتی سے وہ اشرف کے ہاتھ پڑ گیا۔ اور اُنہوں نے فوراً اُس کو کلب کی سکریٹری مسز رستم کو دیدیا۔ ہم لوگوں کے ذلیل کرنے کا اشرف کے ہاتھ ایک اچھا موقعہ آگیا۔ مسز رستم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ اُنہوں نے سب کو ہال میں جمع کرلیا۔ اور خود سٹیج پر کھڑے ہو کر کہا "یہ کس کا خط ہے؟" میں نے دیکھا زیب کے چہرے کا رنگ بدل چکا ہے اور قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ میرے بھی مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر مہر لگ گئی۔ ایک لمحہ میں میں سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ ڈاکٹر کی کارستانی ہوگی۔ میں پشت کی طرف سے مسز رستم کے پاس گئی اور تیزی کے ساتھ اُن کے ہاتھ سے وہ پرچہ

اُچک لیا۔ اور فوراً اس کو اس طرح چاک کردیا کہ اس کا کوئی جزو باقی نہ رہا۔ شمیم نے میرے منہ پر زور سے چپت رسید کیا اور کہا: "آئندہ تم کلب میں نہیں جاؤگی۔ مجھے امید نہ تھی کہ تم جیسی نیک لڑکی اس طرح کی ذلیل حرکتیں کرے گی۔"

اس کے بعد آگ کی طرح میری بدنامی تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ میری اماں جو ایک غیور طبیعت ہوی تھیں، شرم سے انہوں نے منہ چھپالیا۔ میری اس حرکت نے ان کو بیمار کردیا۔ ایک دن ان کو اختلاج کی شدید تکلیف تھی اور وہ بے حد مضمحل ہورہی تھیں۔ انہوں نے میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کہہ رہی ہیں۔ روحہ میری تربیت کا یہی انجام تھا۔ میں ان کی نظروں کو برداشت نہ کرسکی اور میں نے کھڑے ہوکر ان کے پاؤں چھوئے اور کہا: "امی جان! آپ کی شریف گود میں پرورش پاکر اور آپ جیسی عظیم ترین عورت کا دودھ پی کر کوئی لڑکی بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتی۔ اور میں نے بھی ایسا نہیں کیا۔ میں نے آپ کے دودھ اور تربیت کا حق ادا کردیا۔ آپ کو فخر ہوگا میری جرات پر۔ سنئے وہ خط میرا نہ تھا بلکہ زیب کے نام تھا۔ یہ مت پوچھئے گا کہ کس نے بھیجا تھا۔ آپ کو معلوم ہے زیب کو مجھ سے کس قدر بے پناہ محبت ہے اور مجھے بھی وہ دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ آپ جانتی ہیں جو کچھ ہمارے معاشرتی قانون ہیں اور چونکہ زیب کا نکاح ہوچکا ہے۔ مجھے اس لئے گوارا نہ ہوا کہ جس گھر میں زیب جانے والی ہے اس گھر میں اُن کے جانے سے پہلے اُن کی بدنامی پہنچے۔ جو شخص صرف زیب کے لئے تکمیل تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہے اُس کا دل اس خبر سے کہ اس کی خط و کتابت ایک دوسرے مرد سے ہے۔ پاش پاش ہوجائے اور زیب تمام عمر کے لئے نگاہوں کا نشانہ بن جائے۔ اس وجہ سے میں نے اس خط کو اپنا بنالیا۔ اس لئے کہ ابھی میں ان تمام چیزوں سے آزاد تھی۔" امی جان نے محبت سے میری پشت پر ہاتھ رکھکر کہا "مجھے واقعی تمہارے سچے ایثار سے بڑی خوشی ہوئی۔"

ایک ہفتہ بعد زیب کی شکل نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا برسوں کی بیمار ہے۔ میں نے حسب عادت ہنس کر اس کا خیر مقدم کیا۔ زیب نظریں نیچے کئے میرے قریب بیٹھ گئی۔ بالکل خاموش۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی حسین آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"تم نے مجھے بدنامی سے بچالیا روحہ! مگر ضمیر کی ملامتوں سے نہ بچاسکوگی۔ میرا منہ اس قابل نہیں کہ تمہارا شکریہ ادا کرسکوں۔ فرشتہ صفت لڑکی تم نے مجھ بدنصیب کے لئے اتنا بڑا ایثار کیا۔ میں ......"

اس کے آگے وہ کچھ نہ بول سکی۔ نہ جانے الفاظ اس کے حلق میں کیوں اٹک کر رہ گئے۔ اس کے خوبصورت رخساروں پر ندامت کے ناز قطرات آنسو بہہ رہے تھے۔ میں بھی اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ پھر میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا:۔

"زیب! یہ میرا فرض تھا اور ہر شریف کا فرض ہے کہ وہ اس مصیبت زدہ کو بچانے کی امکانی کوشش کرے۔ اب میں اس کے بعد تم سے یہ کہوں گی کہ زیب تم نے غلط راہ اختیار کی ہے۔ تمہارا نکاح ہوچکا ہے اور ایسے شخص سے جو تمہارا سچے معنوں میں پرستار ہے۔ جانتی ہو معاشرت کی جکڑ بندیاں تم کو اور ڈاکٹر کو کبھی یک جا نہ ہونے دیں گی۔ ہر عورت ایک مرد کی امانت ہے اگر تم نے یہی راستہ اختیار کیا تو لوگ کہیں گے کہ تم نے خیانت کی۔ زیب ہوش میں آؤ! اور یہ غلط حرکتیں چھوڑدو۔ تم رسموں کے بندھن میں مقید ہو جو تم کو ذرا بھی جنبش نہ کرنے دیں گی۔"

زیب نے ندامت سے سر جھکالیا۔ وقت گزرتا گیا اور آخر وہ دن آگیا جس کے خیال سے دل دھڑکتا تھا۔ جس کے تصور سے رونا آتا تھا یعنی زیب کی وداع کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ زیب اپنے وطن ہمیرپور جارہی تھی جہاں اس کی شادی کی تیاری بہت زور شور سے ہورہی تھی۔ ادھر پرچہ کا راز افشا ہوتے ہی ڈاکٹر نے اپنا تبادلہ موہن پور کرالیا۔ گو کسی کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ خط ڈاکٹر کا تھا۔

ڈاکٹر کبھی کبھی مجھے خط لکھتے تھے کیونکہ میں ابھی تک انتہائی لاغر تھی اور ڈاکٹر کے زیر علاج تھی۔ اسی وجہ سے میری خط و کتابت تھی۔ ڈاکٹر نے رخصت ہوتے وقت مجھ سے التجا کی تھی کہ تم زیب کی خیریت لکھنا اور اس کی وداع کی بھی تاریخ لکھنا۔ جو محبت کا پودا ان دونوں کے دلوں میں لگا تھا وہ اب بڑھکر تناور درخت بن چکا تھا۔ زیب نہیں چاہتی تھی کہ ڈاکٹر اتنے مضطرب ہوں اور اس لڑکی کو چاہا کریں جس کی گرد بھی ان کے ہاتھ لگنے والی نہیں۔ اس نے ڈاکٹر کو منع کیا تھا کہ وہ اس کو بھول جائیں اور وہ ان باتوں کو خواب سمجھیں۔ پھر میں نے ڈاکٹر کو شادی کی اطلاع دی تو انہوں نے زیب کے لئے ایک خوبصورت ہار بھیجا۔ یہی ان کا پہلا اور آخری تحفہ تھا۔ اس ہار کی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ کیس میں لگا ہوا "زیب" کا نام پڑھا جاتا تھا۔ بنانے والے نے اتنی خوبصورتی سے لفظ "زیب" بنایا تھا کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا۔

یہ نادر تحفہ میں نے زیب کو بھیج دیا۔ مگر زیب نے وہ ہار واپس

کر دیا۔ اس میں ڈاکٹر کے نام ایک پرچہ بھی تھا۔ جس میں لکھا تھا:۔

"نسیم! یہ ہار واپس کرتی ہوں۔ نہ میں اس کے قابل ہوں نہ مجھ میں اس کے رکھنے کی اہلیت ہے۔ ہوش میں آؤ نسیم! تم جذبات کی رو میں بہکر کہیں سے کہیں جا رہے ہو۔ میرا پیچھا مت کرو۔ مجھ بدقسمت لڑکی کے لئے کیوں پریشان ہوتے ہو۔ آئندہ مجھ کو کوئی خط نہ لکھنا۔ میں نے زوج کو بھی تاکید کی ہے کہ وہ تم سے کوئی تعلق نہ رکھے۔"

میں نے ہار اور پرچہ ڈاکٹر کو واپس کر دیا۔ آہ کیا بتاؤں ہار کو لیتے وقت ان کے ہاتھ کیسے کانپ رہے تھے۔ پھر حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھکر کہا: "بہن اپنے بھائی کی خاطر ایک بار اور تکلیف کرو۔ اور یہ ہار بھیج دو اور اس کے ساتھ لکھنا "ایک ناکام شخص کا یہ تحفہ ہے۔ جس کی ہر پنکھڑی اور پتّی میں بہت سی آرزوئیں نظر آئیں گی۔ اس کو رکھ لیں بس یہی التجا ہے۔"

میں نے ہار بھیج دیا۔ ساتھ ساتھ ڈاکٹر کی کیفیت بھی لکھ بھیجی۔ زیب کے شوہر ہنس مکھ اور شریف ترین انسان تھے۔ جس اُمید پر انہوں نے تمام تر کوششیں کی تھیں وہ بار آور ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ زیب کو پا کر اُنہوں نے سمجھا دُنیا میں جنت میسر آ گئی۔ اور وہ اپنے خواب محبت کی حسین تعبیر مشاہدہ کر رہے تھے۔ ایک دن زیب نے اپنے شوہر فرید سے کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ ہار پہن لوں؟ فرید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بنانے والے کی دیر تک تعریف کرتے رہے۔ پھر کہا "معلوم ہوتا ہے بنانے والے یا بنوانے والے کو تم سے کوئی قلبی تعلق ہے۔ کس کا ہے یہ انتخاب؟"

زیب نے کہا "ایک بدقسمت دوست کا" کچھ سوچ کر فرید چُپ ہو رہے۔

وقت گزرتا گیا۔ اس عرصہ میں زیب ایک بچہ کی ماں بن چکی تھی فرید کراچی میں ملازم ہو گئے۔ ایک دن زیب اچانک میرے پاس آ گئی۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ کوئی تین چار سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں تمام شب باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں ڈاکٹر کا بھی قصہ چھڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ زیب کے دل میں ڈاکٹر کی محبت کے نقوش اسی طرح تازہ ہیں جیسے پہلے تھے اب بھی اس کو ڈاکٹر کی یاد آتی تھی۔ افسوس ہماری یہ ملاقات جلد ہی ختم ہو گئی۔ مگر ہاں اس ملاقات میں میں نے اندازہ لگایا کہ زیب کی روحانی اور جسمانی صحت اچھی نہیں ہے۔ فرید کی بہت تعریف کرتی تھی۔ اور بھی باتیں ہوتی رہیں۔ غرض پھر وہ مجھ سے رخصت ہو گئی۔ بس یہی میری اس کی آخری ملاقات تھی۔

ادھر میری تعلیم کا آغاز ہوا۔ میں اپنی تعلیم میں بہت دلچسپی لینے لگی۔ اب زیب کی یاد بھی بہت کم آتی۔ پہلے تو شاید ہی کوئی وقت ایسا گزرتا ہو جب مجھے زیب کا خیال پریشان نہ کرتا ہو۔ اور اب ہر وقت مجھے اپنی پڑھائی کا فکر رہتا۔ ان اُلجھنوں میں کچھ ایسی گرفتار ہوئی کہ زیب کی خبر بھی نہ لے سکی۔ ایک دن اچانک زیب کا خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ "فرید نے ایک عیسائی عورت سے دوستی کر لی ہے۔ میں اُن کے پاس کراچی گئی تھی۔ بظاہر وہ اسی جوش و خروش سے ملے جیسے اُنہوں نے پہلے دن میرا استقبال کیا تھا۔ ہر وقت میری دلجوئی میں لگے رہتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے۔ زیب آج میں تم پر ایک عجیب واقعہ کا انکشاف کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب میں ناکام ہوا تو اباجان نے داخلہ کرا لینے سے انکار کر دیا۔ میں بہت پریشان تھا کہ کس طرح داخل ہوں۔ میرے داخلہ کی آخری تاریخ تھی کہ میرے نام تین سو روپے کا ایک منی آرڈر آیا۔ بھیجنے والے نے اپنے نام کی جگہ "ہوا" لکھا تھا۔ میں نے غائبانہ طور پر اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔ اور روپے کو اپنے کام میں لے لیا۔ اسی طرح اکثر جب بھی مجھے روپے کی ضرورت ہوئی میرے نام روپیہ آ گیا۔ اور وہی لفظ "ہوا" لکھا ہوا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے انتشار کو ضبط کیا۔ تم کو یاد ہے۔ ہم مذاق میں نسیم کو "ہوا" کہا کرتے تھے۔ اس وقت مجھے ڈاکٹر کی بدنصیبی پر رونا آ رہا تھا۔ میں چند دن فرید کے پاس رہی۔ بظاہر اُن میں میں نے کوئی تبدیلی نہ دیکھی مگر مجھے یقین ہے کہ فرید عیسائی عورت کے دام محبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

اس کے بعد زیب کی کوئی خیریت نہ معلوم ہوئی۔ وقت گزرتا گیا ایک دن تار آیا کہ زیب کا انتقال ہو گیا۔ میری آنکھوں میں دُنیا اندھیر تھی۔ مجھے اس کی بیماری کی بھی اطلاع نہ ہو سکی۔ میں فوراً وہاں پہنچی تاکہ اسکی موت کی تفصیل معلوم کر سکوں۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ زیب کو دق ہو گئی تھی۔ مگر میں تو یہی کہوں گی زیب دق کی مریض نہ تھی۔ بلکہ وہ محبت کے مہلک مرض میں گرفتار تھی۔ جس نے اُس کو ختم کر دیا۔ ڈاکٹر نسیم زیب کی موت سے ۲ دن پہلے وہاں پہنچے۔ اُنہوں نے فرید سے مل کر کہا "میں جو کچھ آپ سے عرض کروں گا خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ بالکل سچ ہو گا اور آپ اُس کو بُرے پیرایے میں نہ لیجائیں گے۔ مجھے زیب سے شدید ترین محبت

ہے۔ میں اُن کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ وہ سراپا نیکی ہے۔ وہ فرشتوں کی طرح مقدس ہے۔ مگر انہوں نے ہمیشہ مجھے ٹھکرایا۔ اور میں ہمیشہ دل سے مجبور رہا۔ اب زیب کا آخری وقت ہے وہ اچھی ہونے والی نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کے صدقہ میں اتنا موقعہ دیں کہ میں زیب کی خدمت کرلوں۔ کیونکہ اُن کی شمع حیات کے گل ہوتے ہی میری خوشیاں بھی ختم ہو جائیں گی"۔

فرید نے نہایت فراخ دلی سے ڈاکٹر کو خوش آمدید کہا۔ ڈاکٹر زیب کے کمرہ میں آئے اور اب کے ساتھ زیب کے پاؤں چھو کر بیٹھ گئے۔ زیب نے آنکھ کھولی۔ ایک بار دیکھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ڈاکٹر ان دنوں زیب کی تیمار داری میں مصروف رہے۔ اگرچہ وہ اس کو اچھا نہ کرسکے مگر اُس کو آرام پہنچانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے رہے تھے۔ ایک دن زیب نے فرید کو تنہائی میں بلاکر کہا۔ "فرید! اب میں تم سے رخصت ہو رہی ہوں۔ بتاؤ کیا تم سچ مچ عیسائی عورت سے محبت کرتے ہو؟"۔

فرید نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا وہم تم کو ہوا زیب! میں اور کسی دوسری عورت سے محبت کروں۔ زیب! دلوں کا حال جاننے والا خدا ہے۔ اور میں اسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے صرف تم سے محبت کی ہے۔ اور تمہارے بعد بھی میرے دل میں کوئی عورت تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔ زیب! میری محبت کا ایک اور ثبوت دیکھو کہ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں یہ کیسے گوارا کرسکتا تھا کہ ڈاکٹر تم سے محبت کریں۔ مجھے اُن کی تمام باتیں معلوم ہوگئی تھیں۔ مگر مجھے یہ پسند نہ ہوا کہ میں ان باتوں کا اظہار کرکے تم کو شرمندہ کروں۔ مجھے تم پہ ہمیشہ سے اعتماد رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رقابت کا جذبہ کبھی میرے دل میں پیدا نہ ہوا۔"

زیب نے کہا۔ "فرید مجھے معاف کرنا بے شک مجھے ڈاکٹر سے محبت تھی۔ مگر ڈاکٹر کو میں نے اس کا علم کبھی نہیں ہونے دیا۔ آپ کے ساتھ گو میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ محبت تھی۔ مگر میں نے فرائض کی ادائیگی میں کبھی کمی نہ کی۔ میں نے تمہاری محبت کا احترام کیا۔ تمہارے جذبات کی قدر کی اور تمہارے دل میں کبھی شک پیدا نہ ہونے دیا اور میں ہمیشہ تمہاری قدردان رہی۔ فرید! مجھے معاف کرنا اب میری ایک التجا ہے وہ یہ کہ تم ڈاکٹر سے دوستانہ مراسم قائم رکھنا کیونکہ ہمارے بچوں کے وہ بہترین دوست ہونگے۔ یہ دونوں بچے میری امانت تمہارے پاس ہیں ان کا خیال رکھنا۔"

پھر زیب نے ڈاکٹر کو طلب کیا اور کہا۔ "نسیم! مجھے تم سے محبت ہے۔ اور میں تم کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھلا سکی۔ اور مرنے کے بعد بھی میری روح کو تمہارے دامن کی تلاش ہوگی۔ میری ایک خواہش ہے ——"

ڈاکٹر نے سر اٹھا کر کہا۔ "زیب! تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ کہو۔ اگر میری جان بھی طلب کرو تو مجھے عذر نہ ہوگا۔"

زیب پہلی بار مسکرائی اور کہا۔ "آپ آرجہ سے شادی کرلیجئے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "زیب! میں نے اُن کو بہن کہا تھا اور میں بہن کی طرح اُن کی عزت کرتا ہوں۔ رہا شادی کا سوال۔ تو میں نے شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا ہے۔ زیب! جس دن تمہاری شادی تھی اُسی دن میں ختم ہو چکا تھا۔ اب ایک لڑکی کو اپنے پلّے باندھ کر تباہ نہیں کرنا چاہتا۔"

آخر شام زندگی کی صبح ہوتے ہوتے ان دونوں پروانوں کے سامنے زیب کی شمع ہستی گل ہوگئی۔

حادثے

دُکھ بھرے شعر لبوں پر اُبل آئے یہ کیوں؟
دیکھکر سبزہ و گل بھی نہ کل آئے یہ کیوں؟
یاد کس کی دلِ مجروح میں بیدار ہوئی
انڈیا گیٹ پہ آنسو نکل آئے یہ کیوں؟

ایک سبک اور حسیں کار ابھی گذری ہے
گنگناتی ہوئی سرشار ابھی گذری ہے
سن رہا ہوں دلِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا
خالقِ حسن کی شہ کار ابھی گذری ہے

"م"

گذشتہ جنگ کی مشہور جاسوس عورتیں

(از فصیح الدین احمد)

لڑنے والے ملکوں میں یہ عام بات ہے کہ اچھی خاصی شائستہ عورتوں کو سپاہیوں کا دل بہلانے کے لئے عصمت فروش بنا دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں عورتوں کو "خفیہ ملازمت" یعنی جاسوسی کے لئے بھی کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعہ سے جنگی راز معلوم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً فوجی پیغامات پر چھاپہ مارنا اور خفیہ فوجی کاغذات کو سازش کے ذریعہ حاصل کرنا وغیرہ۔ عورتیں اپنی خوبصورتی اور عشوہ گری سے ان لوگوں کو جو اُن کی زد میں آ جاتے ہیں مکڑی کی طرح اپنے جال میں پھانس لیتی ہیں۔ مرد کے لئے ایک ایسی عورت کے سوالات کا جواب نہ دینا جو اس کے گھٹنوں پر بیٹھی ہو یا اُس کے ساتھ رات بسر کرنے کو آمادہ ہو مشکل ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ عورتیں محبت کی پینگیں بڑھا کر اپنے مرد دوستوں سے فوجوں کی نقل و حرکت اور دیگر ہزاروں قسم کے راز دریافت کر لیتی ہیں۔ عورت پیدائشی ایکٹرس ہوتی ہے اور اس کے لئے مرد کو اُلّو بنانا دشوار کام نہیں چنانچہ محبت کا یقین دلا کر دشمن کے سربستہ راز معلوم کئے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت کے حُسن اور جوانی کے نشہ کے علاوہ شراب سے مخمور ہو کر مرد بالکل بے بس ہو جاتا ہے اور عورت کے اشاروں پر ناچنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ شب کی سیاہی میں سیاہ کار عورتوں کے لئے مرد کے سینے سے پیوست ہو کر اس کے دلی راز معلوم کر لینا زیادہ مشکل نہیں۔

ایک عورت کا ذکر ہے کہ وہ حُسن و جمال میں بے نظیر تھی۔ نیز صنفی اعتبار سے بھی اس میں زبردست جاذبیت موجود تھی۔ عموماً یہی چیزیں ایک کامیاب جاسوس عورت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ تاریخ میں وہی عورتیں جاسوسی میں زیادہ کامیاب ہوئی ہیں جن کو صنفی معاملات اور معلومات میں پوری مہارت حاصل تھی۔ چونکہ جاسوس عورت کا سب سے بڑا ہتھیار عصمت فروشی ہے اس لئے یہ پیشہ اس کے لئے ذلیل ترین پیشہ ہے۔ اس لئے کسی حکومت کیلئے بھی عورت کو ایسی بیہودگی کے کاموں پر مامور کرنا بڑی ذلیل بات ہے۔ مگر یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ موجودہ سلطنتوں میں کسی سلطنت کی بنیاد بھی حیا اور اخلاق پر مبنی نہیں۔

جاسوس عورت کے لئے صرف بداطواری کی وجہ سے یہ پیشہ باعث ذلّت نہیں بلکہ نفسیاتی حیثیت سے بھی یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کے رازِ دل سے واقف ہونے کے بعد جو اُسے دل سے چاہتا ہو اُسی کی بربادی کا سامان پیدا کرے۔ خود مسٹر چرچل نے ایک کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے: "عمداً دھوکا بازی کرنا جو جاسوسی کا لب لباب ہے ان خود ان لوگوں کے لئے بھی باعث ذلّت ہے جو اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ تاہم خفیہ جماعت کا کوئی فرد جو اس کام کو کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ حب وطن کی وجہ سے انجام دیتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس فعل کی سزا موت ہے۔ ایسی صورت میں اُن لوگوں کو اس کی خدمات کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے جنہوں نے اُسے اس کام پر مامور کیا۔" بعض مثالیں ہمیں تاریخ میں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں مردوں نے اپنی زندگی کو انتہائی خطرہ میں ڈال کر زبردست کارنامہ انجام دیئے ہیں۔ مثلاً ایک نام لارڈ بیڈن پول کا بھی موجود ہے۔ انہوں نے مسلسل تین سال تک گذشتہ جنگ میں جرمنی میں رہ کر خفیہ خدمات انجام دیں۔ اور دشمن کی صفوں کے پیچھے غارتگری اور بربادی کا بازار گرم رکھا۔ ان کے علاوہ مرد جاسوسوں میں سب سے مشہور نام لارنس کا ہے۔ جس نے تمام عرب آبادی کو ترکی حکومت کے خلاف نبرد آزمائی پر آمادہ کر دیا تھا۔

ہمیں جاسوس عورتوں میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں جہاں انہوں نے اپنی عصمت اور عفت کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو پوری کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہو۔

بعض عورتیں ایسی بھی تھیں جن کو دشمن کے سپاہیوں سے محبت ہو گئی تھی۔ اُن کے دل میں محبت اور فرض میں جنگ شروع ہو گئی۔ چنانچہ برطانوی خفیہ جماعت کو کئی ایسے معاملات سے واسطہ پڑا۔ ایک واقعہ "اپا سٹو برٹ" کا ہے جو ایک دن اپنے صدر دفتر میں داخل ہوئی اور بنک کے نوٹوں کے بنڈل کو زمین پر پھینک کر کہنے لگی: "میں فلاں افسر کے مانعں کو ظاہر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ چونکہ میں اُس سے محبت کرتی ہوں۔" ایک اور عورت کا واقعہ ہے کہ اس کو [illegible] میں کسی مشہور معزز سیاست داں کے ساتھ لگایا گیا۔ عورت کو اُس شخص سے محبت ہو گئی اور اُس نے رو رو کر اپنے حاکموں سے معذرت کی کہ وہ اس شخص کے ساتھ غداری نہیں کر سکتی۔ ایک اطالوی عورت جو برٹش خفیہ محکمہ میں ملازم تھی اس کا واقعہ یہ ہے کہ وہ عمداً دل سے [illegible]

خود اطلاعات بھیجا کرتی تھی۔ کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا آخر کار راز کھل گیا اور اسکو مناسب سزا دی جانے کو تھی کہ وہ بھاگ کر فرانس پہنچ گئی اور ایک فرانسیسی وزیر کے لڑکے سے شادی کر لی۔ جس کی بدولت وہ موت کے منہ سے بچ گئی۔

ماتا ہری گذشتہ جنگ کی جاسوس عورتوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ موقعہ با لکل برہنہ ناچتی تھی۔ اس کی زندگی کو ناولوں قصّے کہانیوں اور فلموں میں اکثر دکھایا گیا ہے۔ اس کو فرانسیسی حکومت نے جرمنی جاسوس سمجھ کر سزائے موت دی تھی۔ لیکن اس کا حُسن اور صنفی جاذبیت اس درجہ تھی کہ بڑے بڑے رئیس اور فوجی جنرل اس پر مفتوں اور شیفتہ تھے۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کو کافی عرصہ تک بے قصور سمجھتے رہے۔ لیکن ان لوگوں نے جن سے اس کے تعلقات رہ چکے تھے اس بات کو بین طور پر ثابت کر دیا کہ وہ محض ایک آوارہ عورت تھی۔ فرانس میں اس نے اپنے آپ کو ایک ہندو رقاصہ ظاہر کیا تھا تاکہ اس کو اپنے جسم کی زیادہ سے زیادہ قیمت دستیاب ہو سکے۔ مگر اس دعوے میں حقیقت نہ تھی۔ ماتا ہری کے ہندی میں کوئی معنی نہیں۔ لیکن یورپ میں اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس فریب کو بے نقاب کرتا۔ بلکہ وہاں اب بھی بے شمار ایسے آدمی موجود ہیں جو اس کو ہنوز ہندو سمجھتے ہیں۔

اُس کا نام گریٹا گیبل تھا اور وہ ولندیزی نسل سے تھی شروع میں وہ ایک شخص کیپٹن "لیکلیوڈ" کے ہاں امور خانہ داری کی نگرانی کرتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد کیپٹن نے اُس سے شادی کر لی۔ لیکن ماتا ہری نے شادی کی کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ خاوند کو چھوڑ کر ایک اور کیپٹن کے ساتھ فرار ہوگئی۔ اور وسط یورپ جا پہنچی۔ وہ روپے اور اچھے کپڑوں کو اسقدر عزیز رکھتی تھی کہ ان اخراجات کی وجہ سے اُسے اکثر عصمت فروشی کے اڈوں میں جانا پڑتا تھا۔ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ ان چکلوں میں اپنی چھوٹی چار سال کی لڑکی کو بھی ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ اس نے کچھ اور بھی اس قسم کے کام انجام دیئے۔ لیکن کسی کام میں اسکا دل نہ لگا۔ اس لئے وہ بطور ماڈل مصوروں کے سامنے اپنے برہنہ حُسن کو عکاسی کے لئے پیش کرتی تھی۔ نیز سٹیج پر بھی "برہنہ" ناچ دکھایا کرتی تھی جو بالکل برہنہ ہوتے تھے۔ مگر ان باتوں کی وجہ سے اُس نے اونچی سوسائٹی میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی تھی۔ اس وقت سے اُس کی زندگی میں عیاشی کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اب بڑے بڑے سیاست دانوں، حکمرانوں، فوجی افسروں اور خاص خاص شاہی خاندان کے افراد کو بھی اس کے ساتھ بغلگیر دیکھا گیا۔

اُس کی یہ کامیابی عقل یا ہنر پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کے سڈول اور چمکتے ہوئے جسم کی کشش سے مجبور ہو کر لوگ اُس کا شکار بنتے تھے۔ اسکی یہ کشش ایسی زبردست تھی کہ بہت سے عالی مرتبہ لوگ بڑی سے بڑی مالی قربانی دے کر اُسے حاصل کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی عنائیوں سے لوگوں کو ایسا مسحور کرتی تھی کہ لوگ از خود دفتہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ہمیں اس کی سب سے بڑی مثال اُن بارہ سپاہیوں میں ملتی ہے جنہیں اُسے گولی مارنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ان سپاہیوں میں سے ایک کو غش آگیا اور باقی گیارہ گولیوں میں سے صرف تین گولیاں اس حسینہ کے جسم کے پار ہوئیں۔ اور باقی آٹھ گولیاں نشانے سے خطا ہو گئیں۔

بحیثیت ایجنٹ H 21 کے اُسے بڑی سے بڑی تنخواہ ملتی تھی لیکن اس کے باوجود چند سو چاندی کے سکّوں کے لئے وہ ہر وقت اپنے جسم کو فروخت کرنے کو تیار تھی۔ اس کے چاہنے والوں میں ایسے بڑے بڑے لوگ تھے کہ کافی عرصہ تک اس کو کیفر کردار کو پہنچانے کے لئے ثبوت ملنا دشوار ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی حرکات اتنی خطرناک بن گئی تھیں کہ اب فرانسیسی گورنمنٹ کے لئے اسے گرفتار کر کے گولی مارنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

(۲) کیتھرین

ماتا ہری ایک معمولی قسم کی رقاصہ تھی۔ لیکن کیتھرین ایک پُرفن اور عیار عورت تھی۔ اس نے ایسے شخص سے شادی کی جو گذشتہ جنگ عظیم میں روس کا جنگی وزیر تھا اس کی دلچسپ زندگی کا آغاز یوں ہوا کہ یہ جرمنی کی خفیہ محکمے کے ایک خوبصورت نوجوان پر فریفتہ ہوگئی اور روسی فوج کے متعلق اہم ترین خبریں اپنے خاوند کے ذریعہ حاصل کر کے اس جرمن جاسوس کو پہنچایا کرتی تھی۔ یہ جرمنی جاسوس آخر کار پکڑا گیا اور اُسے پھانسی دیدی گئی۔ لیکن کیتھرین روسی وزیر جنگ کی بیوی ہونے کی وجہ سے سزایاب نہ ہو سکی۔

یہ سائبیریا میں ایک نہایت مفلس یہودی خوانچہ فروش کے ہاں پیدا ہوئی۔ قدرت نے اسے حُسن سے مالا مال کر دیا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں یہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ اور گاؤں کے نوجوانوں میں دن رات اس پر لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اسکے بال بہت لمبے اور سیاہ تھے۔ رنگ بہت کھلتا ہوا تھا۔ جلد بہت نرم اور نازک تھی اور اس کا بدن نہایت سڈول تھا۔ ایک دن وہ اپنے باپ کا پس انداختہ لیکر گاؤں کے ایک نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی۔

(باقی آئندہ)

ترجمہ از اگنس اسمڈلے

ہسومی لنگ

(از جناب محمد عتیق صدیقی)

ہسومی لنگ پرانی وضع کی لڑکی ہے، پرانی وضع کی تمام اچھائیوں اور بُرائیوں کی حامل۔ اس کی پرورش بھی پرانے ہی طریقے پر ہوئی — پڑھنا لکھنا ریشمی کپڑوں پر بیل بوٹیاں کاڑھنا نقش و نگار بنانا اور خوبصورت کیرکٹر لکھنا سکھلایا گیا۔

اب اس کی عمر تیس سال ہے اور وہ چار بچوں کی ماں ہے لیکن وہ آج بھی جوان ہے اور دلکش۔ اس کی جلد اُن چینی عورتوں کی طرح نازک و لطیف ہے جو نہ تو کارخانوں میں کام کرتی ہیں اور نہ کسان گھرانوں کی ہوتی ہیں۔ پہلے وہ اپنے سیاہ چمکیلے بالوں کو اپنی حسین پیشانی سے گردن کے جوڑ تک لاتی اور پچھلے سے جوڑا باندھ لیتی۔ جوڑے میں کبھی کبھی وہ خوشبودار کلیوں کا گچھا بھی لگاتی۔ اونچے گلے کی ریشمی گاؤن جس میں نہ تو آرائش و زیبائش کا کوئی شائبہ ہوتا اور نہ جس کے خطوط کا تسلسل کسی جگہ درہم برہم ہوتا۔ سادہ دلکشی کے ساتھ ٹخنوں پر پڑی اس کے جسم کی نزاکت کی غمازی کرتی اور اس کے پیر بنا ایڑی کے نرم جوتوں میں ہمیشہ ملفوف رہتے۔

جب وہ چلتی ہے تو بہت بھلی لگتی ہے۔ لیکن یوں بھدی اور بے لوچ ہے۔ اور اگر زیادہ قریب سے اس کو دیکھو تو موزوں کے اندر تم کو بڑے بڑے حلقے بھی نظر آئیں گے۔ اس کے ٹخنے بدہیئت اور اب تک نیم مقید ہیں۔ چین کے اندرونی علاقے میں جب وہ چھوٹی سی بچی تھی تو اس کے پیر مضبوطی کے ساتھ باندھ دیئے گئے تھے اور ان کی بالیدگی ماردی گئی تھی۔ پھر پیر کھولنے کی تحریک شروع ہوئی اور انقلاب آیا۔ وہ عورتیں جن کا سن تیس برس سے زیادہ نہیں تھا اُن کے پیر کھولنے پر زور دیا جانے لگا جنوبی حصہ ملک میں عورتوں کی انجمنوں نے پیر باندھنے اور لمبے بال رکھنے کے خلاف لوگوں کو سمجھانے کیلئے گھر گھر اپنے نمائندے بھیجے۔ اکثر پرانے خیال کی توہم پرست عورتوں نے ان باتوں کو قبول کرنے سے انکار کردیا تو ان جدید خیالات کی عورتوں نے زبردستی اُن کے لمبے بال کاٹ دیئے اور پیر کھول دیئے۔

ہسومی لنگ نے بھی اپنے پیر کھول دیئے۔ اگرچہ کھولتے وقت اُس کو اتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑی جتنی باندھتے وقت ہوئی تھی۔ باندھنے کی تکلیف مشہور ہے۔ "چھوٹا پیر اور سمندر بھر آنسو"۔ اگرچہ اب اس کے پیر آزاد ہیں مگر وہ لنج رہیں گے۔ اور اب اُس کو انہیں نیم مقید رکھنا پڑے گا۔

ہسومی لنگ باعتبار عمر اپنے شوہر سے پانچ سال بڑی ہے۔ اس کے شوہر نے ایک امریکن مشن سکول میں تعلیم پائی اور مشن کالج سے بی اے پاس کیا وہ جدید کا دلدادہ ہے اور اپنے جدید طریقوں کو امریکیت کے ساتھ خلط ملط کر دیتا ہے۔ امریکی موسیقی اور تاریخ سے وہ واقف ہے اور چینی سے کہیں زیادہ اچھی انگریزی لکھ سکتا ہے۔ انگریز وہ ناک میں بولتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ایک بار وہ امریکہ فورڈ کے کارخانوں میں جائے اور وہاں سے فورڈ موٹر کار ایجنٹ بن کر چین واپس آئے۔ لیکن چونکہ اتنا روپیہ اس کے پاس نہیں ہے اس لئے شنگھائی میں وہ صرف کلرک ہے۔ چند بے معنی وجوہ کی بنا پر وہ ہسومی لنگ اور بچوں کو چین کے اندرونی حصہ سے شنگھائی لے آیا اور ان کو بھی اپنی طرح "جدید" بنانے پر تلا ہے۔

پرانے بے قرینہ چینی مکانات اسکو پسند نہیں جہاں چھت کے کھپریل نگیں بھرے زرکار اور فرنیچر پر چینی وضع کے عجیب و غریب نقش و نگار کھدے ہوتے ہیں۔ وہ جدید طرز کا انسان ہے۔ اس کے خیال میں ان مکانات کو زمین کے برابر کر دینے کی ضرورت ہے۔ یہی ہے کہ اُس نے نئی وضع کی ایک منزل کرایہ پر لے رکھی ہے۔ جہاں کھڑکیاں چوکور ہیں دیواریں سادہ اور سفید اور جہاں تیز برقی روشنی اُس قسم کے، سفید پالش کئے ہوئے لیمپ پوشوں سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ جو مغربی لوگ اپنے غسل خانوں میں لگاتے ہیں۔

مکان کی آرائش گدے دار فرنیچر اور اس طرح کے ہلکے پھلکے سامان سے کی گئی جو اکثر مشنری گھروں میں نظر آتا ہے۔ فلسفیانہ کہاوتوں کے چینی طغروں اور کھجور کے نازک پودوں یا شفتالو کی کلیوں یا بانس کی لمبی تصویروں کے بجائے اس نے جدید طرز کی رنگین تصویریں خریدی ہیں جن میں جرمنی و سوئٹزرلینڈ کے اندرونی حصوں میں چاندنی رات کے مناظر ہیں۔ ان کو چوڑے سنہرے فریموں میں اس نے آویزاں کر دیا ہے اور یہ تصویریں اس کے گھر کی دیواروں پر ٹنگی ہیں۔ ان میں اس کو سب سے زیادہ عزیز نیویارک کے گرینڈ سنٹرل سٹیشن کی تصویر ہے۔ پھر اس جدید طرز کے ساز و سامان کی تکمیل اس نے ایک گراموفون کی ہے جس کے ساتھ ہی امریکن ناچ اور گانے کے کچھ ریکارڈ بھی اس نے خریدے۔ اُس کی ایک لڑکی جو ابھی صرف آٹھ ہی برس کی ہے امریکن ناچ بہت ہی کامیابی کے ساتھ ناچ سکتی ہے۔ ہسومی لنگ کے حال پر اُس نے یہ بڑی عنایت کی کہ چین میں رہنے والی امریکن مشنری عورتوں کے نقش قدم پر چلنے کیلئے اس کو مجبور نہیں کیا۔ یہ یقیناً اس کا بہت بڑا احسان تھا۔

اس نامانوس اور بدوضع مکان میں ہسومی لنگ اس طرح پھرا کرتی جیسے کسی متلاطم

ہو رہے ہو۔ تم چینی جدید تمدن کے بہت مشتاق ہو رہے ہو۔ وہ پرانی وضع کی ہے اور اُسے چین کی پرانی عمارتوں سے عشق ہے۔ اس کے ہر انداز سے پرانی وضع کی لڑکیوں کا حتی الامکان وقار اور اطمینان ٹپکتا ہے۔ لیکن وہ جاہل، توہم پرست اور وحشی بھی ہے اور مردوں اور عورتوں کے صرف ایک ہی رشتے کو سمجھتی ہے۔

اس کا شوہر دن رات جدید طرز کے متعلق باتیں کیا کرتا ہے اور کیا یہ اُس کا فرض نہیں ہے کہ وہ شوہر کی خواہش کے سامنے ہمیشہ اپنا سر جھکا دیا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہسو مَی لنگ نے پہ مکان لیا امریکی رقص سرود کے ریکارڈ قبول کر لئے اور اپنے شوہر کے ساتھ ہفتہ میں تین دن سینما بھی جانے لگی۔ اسکی نگاہیں سینما کے بڑے بڑے اشتہاروں پر پڑتیں جن میں یہ دکھلایا جاتا کہ مرد عورتوں کے جسموں پر لیٹے ہیں یا لپٹے جا رہے ہیں۔ تصویریں جن میں غیر ملکی عورتیں کھلے سینے کے گاؤن پہنے مردوں کو اپنی آغوش میں لیکر بڑی بے شرمی کے ساتھ ان کے منہ چومتی ہیں۔ اُن کو دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہو جاتی۔ تمام فلموں میں عورت بجبر و اکراہ یا برضا و رغبت یہی پارٹ کرتی نظر آتی۔ ایسے موقعوں پر جو جھجک اس کے اندر پیدا ہوتی اُس پر اُسکے شوہر کی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی و بیقراری بھی قابو نہیں حاصل کر سکی۔ یہی وجہ تھی کہ اسکے شوہر نے اسکو زیادہ زیادہ تنہا بچوں کے ساتھ چھوڑنا شروع کیا۔ اور اپنی شامیں دوستوں کے ساتھ گزارنے لگا۔

پھر ناچنے والی سفید روسی لڑکی کا معاملہ شروع ہوا اسکی گڑیا کی سی شکل تھی اور زلفیں خمدار تھیں اور شنگھائی کے ایک قہوہ خانہ میں وہ رقاصہ تھی۔ جب ہسو مَی لنگ کو پہلی بار یہ قصہ معلوم ہوا تو اُس نے اپنے شوہر کے کوٹ کا دامن تھام لیا اور شام کے وقت باہر جانے سے اُسے روکا۔ جب اُس کے شوہر کے ایک دوست کو یہ قصہ معلوم ہوا تو اُس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ہسو مَی لنگ حاسد ہے۔ وہ پرانی وضع کی لڑکی ہے اور وہ خود بھی تو پرانی ہو چکی ہے۔ چین میں لوگ تیس برس کی عورت کو بوڑھی سمجھنے لگتے ہیں۔

ہسو مَی لنگ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول سکتی ہے لیکن اگر وہ اچھی انگریزی بھی بول سکتی تو بھی وہ اپنا دل شوہر کے دوستوں کی نگاہوں کیلئے وقف نہ کرتی لیکن اُس کا شوہر اور کلرکوں کی طرح جتنا جدید تھا اتنا ہی بے مغز بھی تھا۔ ایک مرتبہ بہت ہی تلخ انداز سے اُس نے کہا "میں نے اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ شادی نہیں کی۔ وہ جاہل اور پرانے طرز کی ہے۔ مجھے اس سے کسی قسم کی مدد نہیں مل سکتی اس لئے میں اُس کو چھوڑنے والا ہوں۔"

"لیکن بیوی کو چھوڑ دینا بھی تو پرانی وضع کی بات ہے۔ اور پھر بچوں کا کیا ہوگا؟"

"وہ صرف میری غلطی کا نتیجہ نہیں۔ اور پھر بچوں کے ساتھ اسکو محبت ہے۔ وہ اُن کو لیکر میرے والدین کے پاس جا سکتی ہے۔ اور وہاں جو کچھ میری جائداد ہے اسکو وہ لے سکتی ہے۔"

"اور یہ روسی لڑکی؟"

"وہ جدید طرز کی ہے اور میری ترقی کی راہ میں کبھی بھی حائل نہ ہوگی اور وہ بھی امریکہ جانا چاہتی ہے۔"

ممکن ہے کہ وہ تم سے محبت صرف اسی وجہ سے کرتی ہو کہ وہ بھی امریکہ جانا چاہتی ہے۔"

میں اس لڑکی سے قطعاً ناواقف تھی جسکے متعلق ہسو مَی لنگ کا شوہر بحث کر رہا تھا لیکن وہ یقیناً غلطی پر تھا۔ ہسو مَی لنگ مجھے ایک بار اُس قہوہ خانہ میں لے گئی جہاں وہ ناچتی تھی۔ ایکبار دیکھنے کے بعد اسکو پہچاننے کیلئے کسی ذاتی واقفیت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہسو مَی لنگ اس کو دیکھنا اور یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے اسکے شوہر کو اسکا گرویدہ بنا دیا ہے۔ ہم دونوں قہوہ خانہ میں داخل ہوئے اور ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ہسو مَی لنگ بہت احتیاط کے ساتھ کرسی کے کنارے پر بیٹھی تھی اور اُسکی نظریں پُر شکوہ ہال کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسکی آنکھیں بھی سیاہ اور زود فہم تھیں۔ اور ممکن ہے کہ اس وضع کی آنکھیں نئی روشنی کی لڑکیوں کی آنکھوں سے زیادہ دیکھ سکتی ہوں۔ اسکی آنکھیں لڑکی کا، اسکی وضع قطع اور لباس کا تجارتی مطالعہ کر رہی تھیں۔ اسکے بشرے سے کسی قسم کے قلبی تاثرات کا تو اظہار نہیں ہو رہا تھا مگر اس کی آنکھیں آگ کی طرح مشتعل تھیں۔ چینی رقص کے آرکسٹرا نے "سونیا" کے سر چھیڑنے شروع کئے۔

"میرا دل بے چین اور مجروح ہے۔"

"کیونکہ تم کو نیکولس سے اب محبت نہیں رہی۔"

اس واقعہ کے بعد دن بدن گزرتے گئے اور اسکے شوہر کا اسکو چھوڑنے کا ارادہ قوی تر ہوتا گیا۔ رونا دھونا بڑھا۔ آپس کے جھگڑے بڑھے اور انکے ساتھ ہی اسکی گھر سے غیر حاضری بھی بڑھی۔

ہسو مَی لنگ نے یکایک اپنا رونا دھونا بند کر دیا۔ ایک دن وہ تراشے ہوئے گھونگھر والے بالوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اب اسکے حُسن کی وہ سادگی رخصت ہو چکی تھی اور اس وقار کا بھی کہیں نام و نشان نہ تھا جو اور وں سے اسکو ممتاز کرتی تھی بلکہ اب وہ ایک پریشان حال عورت تھی جو ایک خالی الذہن شوہر کیلئے ایک خالی الذہن رقاصہ سے بازی لے جانا چاہتی تھی۔ ایک روز جب میں اس سے ملنے گئی اور وہ ملاقات کے کمرے میں آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کا لانبا پر شکوہ گاؤن مختصر ہو کر گھٹنوں تک آ گیا ہے اور بالکل ویسا ہی ہے جو آج کل جدید طرز کی چینی لڑکیاں پہنتی ہیں۔ اسکے بھاری اور بھدے پیر مضبوطی کے ساتھ پنڈلیوں سے بندھے تھے۔ اگرچہ اُن پر کسی کی نظر صرف اُس وقت پڑتی جبکہ وہ چل رہی ہو۔

اس دن وہ فونوگراف کی طرف متوجہ ہوئی اور پریشان و اندوہناک لہجہ میں شرماتے ہوئے اُس نے کہا "مجھے ناچنا سکھلاؤ۔" سوئی کے گھومتے ہی ریکارڈ سے آواز نکلنے لگی۔ اس نے اُن گانوں کے ریکارڈ بھی خرید لئے تھے جو ہم لوگوں نے اُس دن قہوہ خانہ میں سنے تھے۔ لیکن ناچنے کے لئے تو دل میں مسرت اور پیروں میں لوچ و نرمی کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہسو مَی لنگ کا دل سیسے کی طرح بھاری تھا اور پیروں کی لوچ و نرمی کا بچپن ہی میں خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ لنگڑاتے ہوئے چند قدم اُٹھانے کے بعد وہ بیچ چھت پر یکایک رک گئی اور آستین میں منہ چھپا کر بچیوں کی طرح رونا شروع کیا۔ وہ لڑکے دروازے پر کھڑے اس کی حالت دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے حیرانی ٹپک رہی تھی۔ اور ہم لوگوں کی پشت پر فونوگراف تانیں مار رہا تھا۔

جھک

(از جناب للت موہن)

نجمی نے پیالی کے کنڈے میں انگلی پھراتے ہوئے پھر تقریر شروع کردی۔ "تم تو پاگل ہو چکے ہو ریاض! تمہیں اس بات کا احساس بھی نہیں۔ اُس بے ڈول بازو اور چھوٹے چھوٹے ہاتھوں والی لڑکی نے تمہارے دل و دماغ کو بالکل بیکار کر رکھا ہے۔ تم کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے۔ ساری دُنیا میں تمہارے لئے کوئی حسن رہ گیا ہے تو وہ ہے۔ کوئی لطافت ہے تو وہ ہے تمہارے اِس خبط کی کیا دوا ہو سکتی ہے کہ زبردستی مجھ سے بھی اس کا لوہا منوانا چاہتے ہو۔ تمہاری دلیلیں بھی کیا خوب ہیں کہ تم نے اُسے حواب کے لباس میں نہیں دیکھا سیاہ ساڑی پہنے نہیں دیکھا۔ غرارے دار پاجامے اور کرتے میں نہیں دیکھا شلوار میں نہیں دیکھا۔ سینے پر دوپٹے کا صلیب بنائے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب وہ دونوں ہتھیلیوں پر اپنی داغدار ٹھوڑی لئے کرسی پر متفکر بیٹھی ہوتی ہے جب نہیں دیکھا موٹر چلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ موٹر سے لہرا کر اترتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کان میں نیلگوں آویزہ پہنے نہیں دیکھا۔ بال کھولے ہوئے نہیں دیکھا۔ جوڑا باندھے ہوئے نہیں دیکھا۔ پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آنکھ ملتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہونٹ چباتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ٹیلی فون کا رسیور اُٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آسمان تکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دھوپ کی عینک لگائے ہوئے نہیں دیکھا۔ اِس عالم میں نہیں دیکھا اُس عالم میں نہیں دیکھا ——— اچھے خاصے احمق ہیں آپ۔ اور کیا کہا جائے ——— "

ریاض اپنی مخصوص نپی تُلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "بہت عمدہ چل رہے ہو نجمی! معلوم ہوتا ہے دفتر میں کس کے پڑی ہے۔ آج فارم میں ہو۔ کہے جاؤ۔ مگر آہستہ آہستہ۔ تمہاری بائیں جانب تیسری میز پر جاوید وغیرہ بیٹھے ہوئے ہیں اور تمہارے اس جوش و خروش پر ہنس رہے ہیں۔ اور کچھ باقی رہ گیا ہو تو جلدی سے کہہ دو۔ نہ معلوم کب ہارٹ فیل ہو جائے اور میں ان جواہر پاروں سے محروم رہ جاؤں گا۔"

نجمی بدستور چڑا چڑا کر "مجھے کیا۔ تم جاؤ جہنم میں۔ جب کسی بات کو سمجھو گی سے سننے کے لئے تیار نہیں تو کچھ کہنا حماقت ہے۔ خوب رسوا ہو، دوستوں میں ذلیل ہو۔ کل ہی مشرت کہہ رہا تھا کہ ریاض نے اپنی زندگی کی گاڑی پوری رفتار سے چھوڑ رکھی ہے۔ دیکھو کیا انجام ہوتا ہے۔ اور مشرت ہی کیا، اُس دن تمہاری قدردان نمبر دو شمو بھی تمہارا رونا رو رہی تھی۔ اُس نے جو باتیں بتائیں اُنہیں سُنکر خود مجھے شرم آنے لگی۔ خدا جانے تمہاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔"

ریاض چونکتے ہوئے بولا "ہاں اب آئے ہو ٹھکانے پر۔ کہو اس کے متعلق کیا رائے ہے، اچھی رہے گی۔ پیچھا کرو چند روز اور ———"

"خیر! یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے۔ مجھے بھی اپنا جیسا سمجھا ہے۔ زندگی کو ایک کھیل، ایک مذاق سمجھ رکھا ہے۔ ابھی پڑی نہیں ہے۔ پڑے گی تو پتہ چلے گا۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ تمہیں گرم کے بجائے ٹھنڈی کافی پینی چاہیئے۔ اچھا اب تم ایک بات کرو ——— شادی کر لو ———"

"اور شادی بھی طلعت سے کیوں؟ کہو نا۔ ایک تم نے اختر ہی کی شادی کرا کے کیا کچھ گُل نہیں کھلائے ہیں۔ اب میرے ناتوان کاندھوں پر بندوق رکھنا چاہتے ہو۔ ارے ریاض!"

نجمی! سچ سچ تم بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہو۔ تمہارے میرے مراسم کو آج پورے پندرہ سال ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہی تم ہو وہی میں ——— جب میں تمہاری شادی کا ذکر کرتا ہوں تو تمہاری ہی بھلائی کے لئے کہتا ہوں۔ تمہاری طبیعت میں ہمواری پیدا ہو جائے گی۔ یہ چڑچڑاپن۔ یہ تلخ مزاجی تو اسی طرح دُور ہو سکتی ہے۔ اور پھر طلعت تو خوش مذاق بھی ہے اور حسین بھی۔ نہ اس کے بازو بے ڈول ہیں۔ نہ اُس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے۔ اس میں تمہارے لئے کشش ہونی چاہیئے۔ اس کی خوش مزاجی اور شگفتگی تمہاری بے کیف زندگی میں شیرنی پیدا کردیگی۔ اور پھر وہ میرے خیال میں تمہیں پسند بھی کرتی ہے۔ کافی بھی وہ بہت اچھی بناتی ہے۔ اس دن تمہیں بھی وہ اچھی لگی تھی۔ یاد ہے تم ہی کہہ رہے تھے جب وہ پیالی میں شکر ڈال رہی تھی اُس کی چھوٹی لفتری انگلی کس زاویہ سے اُوپر کو اُٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کا وہ جالی دار بلاؤس ——— وہ یونہی سا تلاطم ———"

"دماغ کی اس خرابی کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔"

"خیر مجھے جو چاہو کہو۔ ہمیشہ کہتے رہے ہو اور میں ہمیشہ اسی سعادتمندی کے ساتھ سُنتا رہا ہوں۔ مگر یہ بتا دو کہ اس سے شادی میں کیا بُرائی ہے۔"

"تم خود کیوں نہیں کر لیتے۔"

"میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"اور تم اس پوزیشن میں ہو کہ دوستوں کی ــــ"

"چپ رہو نجمی! تم بالکل غلط سمجھتے ہو۔"

"اور خدا جانے ان بنفے سنورنے والی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو ان کی طبیعت پر رحم آتا ہے۔ کوئی مسخرا ادیب یا جرنلسٹ مل جائے بس ذرا لطیفے اور چٹکلے سنا سکتا ہو، باتیں بنا سکتا ہو۔ چند لمحوں میں ان کیلئے مافوق الفطرت انسان بن جاتا ہے۔ پھر ساری عنایات انہیں تک محدود رہیں تب بھی بات سمجھ میں آ سکے۔ دوسرے نیازمند بھی حلقۂ اقتدار سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ یہ ہے اُن کی زندگی۔ اور پھر تم جیسے خوداری و غیرت کا جنازہ نکال کر ساتھ دینے والے مل جائیں تو پھر کیا چاہیئے۔ سبحان اللہ ــــ"

"اچھا خیر۔ یہ تقریر تو تم کسی اور وقت بھی کر سکتے ہو۔ یہ بتاؤ شادی کا معاملہ کیا رہے گا؟ اس وقت بات آ گئی تو میں کہہ رہا ہوں۔ میں دو دن ہوئے ہی اس مسئلہ کا ذکر کر چکا ہوں اور اب یہ بھی کہہ دوں کہ وہ تیار ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں ــــ وہ یہی کہہ رہی تھی کہ میں کر لوں گی۔ اس شرط پر کہ پھر ہم لوگ سب حماقتیں چھوڑ کر ایک ساتھ سلیقہ سے رہنا شروع کر دیں۔ اسی طرح گاڑی زیادہ چلنے کی نہیں۔ کہو کیسی رہے گی۔"

"حد ہو گئی۔ خدا کی قسم۔ یعنی وہ تم سے بھی دس قدم آگے ہے۔ تم تو جو ہو سو ہو ان لڑکیوں کا ضمیر بھی مُردہ ہو چکا ہے ــــ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ اور کوئی بات کرو۔"

"تمہارا بھی جواب نہیں ہے نجمی! ایک طرف تو تم کہتے ہو کہ مجھ پر ایک ایسی لڑکی کا بھوت سوار ہے جو کسی زاویہ سے تمہیں حسین ہی نہیں معلوم ہوتی۔ تمہارے نزدیک اگر میں کچھ سوچ سکتا ہوں تو اُسی کے متعلق سوچ سکتا ہوں۔ اور اب یہ کہتے ہو۔ تمہیں کاش اس بات کا احساس ہوتا کہ تم ایک ہی سانس میں مجھ پر کتنے الزام لگا گئے ہو۔"

"اچھا بھیا۔ ہم ہار گئے تم ہی جیتے۔ اب تم سے بحث کون کرے۔"

"ہاں تو یہ کہو نا کہ تمہاری ساری بھڑاس مجھی پر نکلتی ہے۔ کل پھر یہیں سے گفتگو شروع کرو گے۔ اور کون کہہ سکتا ہے ــــ بات کہاں تک پہنچے گی۔ خیر چھوڑو اب یہ بتاؤ یہاں سے اُٹھنا چاہئے تھا۔ چلو کوئی فلم دیکھ آئیں۔"

"فلم دیکھنے کا موڈ نہیں ہے۔"

"تو پھر چلو طلعت سے مل آئیں۔"

"مگر اس شرط پر کہ میرے سامنے کوئی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں ہوگی۔" نجمی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تمہارے سامنے نہیں ہوگی۔" ریاض نے جواب دیا۔

طوفان

(بطرز قاضی نذر الاسلام)

از جناب نواب جعفر علیخاں اثر لکھنوی

آگیا طوفان، آگیا طوفان!
کڑکی، کڑکی، بجلی کڑکی
اس کی ہراول بن کر آئی
کس کی ہراول؟
طوفاں کی!
پل میں کھلیں گے اس کی دھمک سے بند ہیں گھر کے کواڑ تو کیا

دیکھو دیکھو بادل آٹھے
کالے، کالے
تیرہ اُفق سے مغرب کے
آئے گرجتے، شور مچاتے
پرچم اُڑاتے طوفاں کا
دیکھکر اس کے بپھرے تیور
بل پڑے ابرو، خشمگیں آنکھیں
ندی نالے، سہمے سہمے، سمٹے سمٹے
منہ کو چھپائے لیتے ہیں
گوشے میں اپنی چادر کے

روئی جو تیرے حال پہ شبنم، رونے سے ہوگا کیا حاصل
پھول بھی برسے گلبن گلبن، اُن کا برسنا لاحاصل
اشک فشاں ہیں ابر کی آنکھیں، اس کا نتیجہ؟ یا حاصل؟
آڑے ان کی چشم قیامت غیظ سے تجھ کو تکتی ہے
آگیا طوفان! آگیا طوفان!
کڑکی کڑکی، بجلی کڑکی!

دیس کہ جس کی جوت کے آگے سورج پانی بھرتا تھا
ماہ دو ہفتہ شرم سے کٹ کر، سامنے آتے ڈرتا تھا
آج وہاں خورشید قیامت جگمگ جگمگ کرتا ہے

خون سے اپنے سینچ کے ہم نے یہ گلزار سجایا تھا
ارمانوں اور امیدوں سے گوشہ گوشہ بسایا تھا
جان کھپائی اور دکھ جھیلے، تب کہیں یہ اکسیر بنی

بوٹا بوٹا ہم نے بویا، گیت پریت کے گا گا کر
اب جو بہار کا موسم آیا، لے لو ہمارا دخل نہیں!
ٹھہر تو دیکھو اپنے ہی گھر میں، کوئی ہماری محل نہیں!

سوئے نشیمن بلبل پلٹے، لینے بسیرا شام ہوئی
صحن چمن میں دل کی اُمنگیں نغمہ بن کر بکھری ہیں
پھول ہیں ڈوبے رنگ شفق میں، کلیاں نکھری نکھری ہیں

آہ اِدھر صیاد کا دھڑکا دام بچھائے جو بیٹھا ہے
اور اُدھر شاہیں پر تولے خون کا اُس کے پیاسا ہے
جان بچائے کس سے کس سے، بکیں بلبل جائے کدھر
پھول ہیں اُن کو حس ہی نہیں
مالی؟
سوتا ہوگا کہیں!.....

کڑکی، کڑکی، بجلی کڑکی
دھڑکی، دھڑکی، چھاتی دھڑکی
پھٹ پڑے بادل، دھنس گئی دھرتی
آگیا طوفان، آگیا طوفان!

اعتراف

از
جناب اسرار الحق مجاز بی، اے (علیگ)

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو، گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خواب گاہوں میں لٹائی ہے جوانی میں نے
حسن نے سامنے وہ لعل و گہر ڈال دیئے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈال دیئے

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریِ عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا
بسترِ مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری

سنگ کو گوہرِ نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پُر خار کو فردوسِ جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آبِ رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا
میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریادِ جگر دوز، مرا نالۂ زار
شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو، تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر، میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو، میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

غزل

از
علامہ آرزو لکھنوی

گھر یہ کب تک یونہی ویراں یونہیں آباد کروں
پھر اسے دل سے بھلاؤں پھر اُسے یاد کروں

ہوش سے بے خودیٔ شوق میں دل کہتا ہے
تو مجھے چھوڑ تو میں بھی تجھے آزاد کروں

رُک تو سکتا نہیں بے نکلے کہ ہے غم کا بخار
ٹکڑے ہو جائے کلیجہ جو میں فریاد کروں

دل و دلدار ہیں ضد، جان مری آفت میں
اب کسے شاد کروں اور کسے ناشاد کروں

پوچھ قسمت سے یہ اے کشمکشِ وحشت و شوق
گُل کو دیکھوں کہ نظر جانبِ صیاد کروں

ضبط ہے دل کے لئے درد سے بڑھکر جانکاہ
تو ذرا ظلم سے تھک لے تو میں بیداد کروں

آرزو کس لئے موہوم اُمیدوں کا لحاظ
دِل کو برباد جو کرنا ہے تو آباد کروں

فلمی خبریں

(از فصیح الدین احمد)

---

(۱) پربھات پکچرز کا نادر شاہکار داسی منروا مُوی ٹاکیز دہلی میں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اطلاع ملی ہے یہ فلم کئی اور مقامات پر بھی ریلیز ہوگیا ہے۔ اور ہر جگہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے بمبئی میں خاص طور پر شائقین فلم نے اس کا پوری گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ یہ فلم رام نراین ڈاوے ڈائرکٹر پروڈیوسر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ انکی تجربہ کاری اور مہارت فن نے اس فلم کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ داسی کی کہانی ایک نرالی دلچسپ اور پُر درد کہانی ہے اسکا پلاٹ عام کہانیوں کے پلاٹ سے مختلف ہے اور بلند درجہ رکھتی ہے۔ اس کا سہرا پنچولی کے سر ہے۔ ڈائرکٹر ہیرن بوس نے اس فلم پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ ان کی ہدایت کاری لائق تحسین ہے۔ اداکاروں میں نجم، راگنی، گیانی، جی۔ این بٹ کے نام خاص طور پر جاذب توجہ ہیں۔ اگر ایک طرف راگنی کی اداکاری اس فلم کی جان ہے تو دوسری طرف جی۔ این بٹ کی سی اداکاری ان کو منتخب کیریکٹر ایکٹروں میں جگہ دیتی ہے۔ مدھوک کے گیت اور پنڈت امرناتھ کی موسیقی بھی اس فلم کا روشن پہلو ہیں۔ فلم میں مزاح۔ سوز و گداز۔ موسیقی مناظر غرض سب پہلو یکجا ہیں۔

(۲) پنچولی آرٹ پکچرز ان دنوں پنچولی پکچر آرٹ کے سٹوڈیو میں جتنا پروڈکشن والے ڈائرکٹر گولانی ایک فلم جھمکے تیار کر رہے ہیں۔ تصویر کا تقریباً چوتھائی حصہ تیار ہوچکا ہے اور حال ہی میں اس کے رش پرنٹ کے پنچولی کے مشہور ڈائرکٹروں نے دیکھ بھی لئے ہیں۔ ان میں ڈائرکٹر جاگیردار۔ پروڈیوسر پنچولی اور دوسرے نمایاں ماہرین فلم شامل تھے۔ سب نے ڈائرکٹر نندا کو جو اس فلم کی ہدایت کاری کر رہے ہیں ہدیہ تحسین و مبارکباد پیش کیا اور خیال ہے یہ سال رواں کی بہترین تصویر ثابت ہوگی۔

اطلاع ملی ہے کہ پنچولی آرٹ پکچرز نے کیسے کہوں کی تیاریاں شروع کردی ہیں۔

(۳) چندر آرٹ پروڈکشنز کے زیر اہتمام "تان سین" "بھگت راج" اور زبان کے مشہور ڈائرکٹر مسٹر جینت دیسائی نے ایک فلم منصفا تیار کیا ہے۔ جو ستمبر سے موتی ٹاکیز دہلی میں شائقین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہ اور مقامات پر بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اس فلم میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم سے پیدا ہونے والے اثرات کی عکاسی کی گئی ہے کہانی نہایت دلچسپ، پاکیزہ اور ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے۔ ڈائرکٹر جینت دیسائی کے پرانے تجربے اس فلم میں پوری کامیابی کے ساتھ کار فرما ہیں۔ اس فلم نے بمبئی میں گذشتہ ۱۷ ہفتوں میں تین لاکھ روپے گراس کرکے گذشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ اور ان دنوں یہ بیک وقت دو مشہور سنیما ہال راکسی اور ویسٹ اینڈ میں جوق درجوق شائقین کو کھینچ رہا ہے۔ اس فلم کی روح رواں لیلا چٹنس۔ چارلی ایشور لال۔ مبارک اور مایا بنرجی ہیں۔

(۴) گیتانجلی موی ٹون نے ان دنوں خاص اہتمام کے ساتھ ایک فلم سوال تیار کیا ہے جو عید سے کفنہ ٹاکیز دہلی میں شروع ہے۔ اس فلم میں مشہور و ہر دلعزیز اداکار الیاس اور ممتاز شانتی ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان ہر دو ہستیوں نے اس فلم میں کامیاب اور معیاری اداکاری کا ثبوت دیا ہے۔ کہانی شروع سے آخر تک مخصوص دلکشی رکھتی ہے۔ موسیقی کا اچھا معیار پیش کیا گیا ہے۔ اس فلم میں الیاس اور ممتاز شانتی کے علاوہ رادھا رانی۔ صادق۔ راج رانی اور نرنجن کی اداکاری بھی اپنی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ فلم کے گیت، مناظر اور اس کا پس منظر ——— ہر پہلو اپنی جگہ کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

(۵) محبوب پروڈکشنز "نجمہ" کے مشہور و ہر دلعزیز ڈائرکٹر محبوب نے ایک اور نہایت کامیاب فلم تقدیر پیش کیا ہے جو جوبلی ٹاکیز دہلی میں چودہ ہفتہ پورے کرچکا ہے۔ اور آج بھی اسی طرح شائقین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ فلم کی بنیاد ایک معاشرتی کہانی پر ہے جو اپنے اندر نہایت دلچسپ پہلو رکھتی ہے۔ رومان و مزاح اس فلم کے نمایاں پہلو ہیں۔ مزاح کا رنگ شروع سے آخر تک ایک خوشگوار تسلسل کے ساتھ نباہا گیا ہے۔

اس فلم کی روح رواں فلمی دنیا کے گراں قدر اداکار چندر موہن۔ موتی لال۔ اور چارلی ہیں۔ اس میں نووارد نرگس کی اداکاری اور شخصیت دونوں اپنی مخصوص دلکشی کے ساتھ نمایاں ہے۔ موسیقی پُر اثر اور داستان نہایت دلچسپ ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک نہایت کامیاب فلم ہے۔

(۶) سن رائز پکچرز کا تیار کیا ہوا بلند پایہ فلم مہاستی انسوئیا ان دنوں میجسٹک سنیما دہلی میں ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس فلم میں ایک قدیم مقدس کہانی کی تصویر کشی کی گئی ہے "ستی انسوئیا" کا کردار اپنی تمام عظمت، وقار اور پاکیزگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہ ایک عورت کے جذبۂ ایثار اور اس کی پاک دامنی کی ایک بلند پایہ داستان ہے۔ کہانی

ایم جی تولانی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ڈائریکشن وی ایم ویاس کا کارنامہ ہے اس فلم کی روح رواں مشہور و معروف ڈرامہ نگار منٹو ہیں۔ شوبھنا سمرتھ، ساہو مودک اور گوپ ہیں۔ کہانی دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک نہایت شاندار اور کامیاب تصویر ہے۔

(۷) بمبئی ٹاکیز نے ان دنوں ایک رومانی فلم چار آنکھیں تیار کیا ہے۔ جو عنقریب وِٹر سینما دہلی میں آنے والا ہے۔ اس فلم میں ایک نہایت دلچسپ اور رومانی افسانے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو جا بجا نہایت دلچسپ اتفاقات اور واقعات سے لبریز ہے۔ کہانی امیہ چکرورتی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ڈائریکشن میں سشیل موزمدار کی کاوش و توجہ کارفرما ہے۔ اس فلم کے خاص اداکار لیلا چٹنس، سبے راج، پیٹھا والا، کانتا پرشاد اور پال مہندرو ہیں۔ نریندر کے گانے بھی مخصوص دلکشی رکھتے ہیں۔ اس فلم کے ساتھ شاندار توقعات وابستہ ہیں۔

(۸) سلور فلمز ان دنوں نہایت خاص اہتمام کے ساتھ ایک فلم بڑے نواب صاحب کی تیاریوں میں منہمک رہی۔ اس فلم میں ایک شاندار معاشرتی داستان ملتی ہے۔ جو اپنی مخصوص سج دھج اور آن بان کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ لباس و وضع، نزاکت و تکلف فلم میں اپنی مخصوص دلکشی کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس فلم میں فلمی دنیا کے مشہور و مستند اداکار چندر موہن۔ کمار۔ پہاڑی سانیال۔ پرملا۔ بتو۔ لیلا مصرا اور غوری ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ ایسے معیاری اداکاروں کے ہوتے ہوئے فلم کی کامیابی میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ ڈائریکشن مسٹر سیدی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یقیناً یہ سال رواں کا ایک نہایت کامیاب فلم ثابت ہوگا۔

(۹) بمبئی سینے ٹون کا تیار کیا ہوا فلم لال حویلی ناولٹی سینما میں گذشتہ پانچ ہفتوں سے شائقین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ پبلک روز افزوں دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے۔ اس فلم میں سوز و گداز اور مزاح و رومان کا ایک نہایت خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔ کہانی شروع سے آخر تک اثر رکھتی ہے۔ اس فلم میں نورجہاں، سریندر، الہاس، یعقوب، کنھیا لال، مایا بنرجی، اور غوری کی اداکاری خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ فلم بلاشبہ اس سال کا ایک نہایت کامیاب فلم ہے۔

(۱۰) رنجیت مووی ٹون کا تیار کیا ہوا تاریخی فلم شہنشاہ بابر جس کا شائقین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جمعہ ۵ ستمبر سے جگت ٹاکیز دہلی میں شروع ہوگیا ہے۔ اس فلم میں ارباب حل و عقد نے تاریخی پس منظر پیش کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ فلم میں اس جلیل القدر شہنشاہ کی عظمت اور اس کی شان و شوکت اچھے پیرائے کے ساتھ نمایاں ہے۔ موسیقی اور مناظر دونوں اپنی اپنی جگہ دلکشی رکھتے ہیں۔ اس فلم میں موسیقی کی ملکہ خورشید نے اپنے کمالات پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ مختار اور سشیل کمار کی معیاری اداکاری بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس فلم کی کامیابی اپنی جگہ مسلم ہے۔

(۱۱) شالیمار پکچرز یہ خبر یقیناً فلمی حلقوں میں مسرت کے ساتھ سنی جائیگی شالیمار کی تیار کی ہوئی مشہور تصویریں من کی جیت اور غلامی بھارت پکچرز نے خرید لی ہیں۔ بھارت پکچرز کا یہ اقدام بلند حوصلگی کا ثبوت ہے اور اپنے سامنے نہایت شاندار امکانات رکھتا ہے من کی جیت پر ڈبلیو زیڈ احمد نے خاص توجہ اور کافی وقت صرف کیا ہے۔ اس فلم کی روح رواں وہی پُراسرار "نینا" ہیں جو اس سے قبل "ایک رات" اور "پریم سنگیت" میں اپنی دلکشی کا سکہ جما چکی ہیں۔ مکالمے اور گیت دور حاضر کے بہترین شاعر جوش ملیح آبادی اور مشہور نوجوان ادیب کرشن چندر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس فلم کا ادبی معیار یقیناً بہت بلند ہوگا۔

اس کمپنی کے دوسرے فلم غلامی کے ساتھ بھی شاندار توقعات وابستہ ہیں۔ اس فلم میں مشہور و معروف رینوکا دیوی اور حسین و جمیل پرویز نے اداکاری کی ہے اس فلم کے مکالمے اور گیت بھی مندرجہ بالا بلند پایہ اہل قلم کی کاوش کا نتیجہ ہیں جن کی خدمات حاصل کر کے ڈائرکٹر احمد نے بلند ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے۔

(۱۲) ہندوستان چترا اس سال ایک نہایت کامیاب فلم شرارت تیار کیا ہے۔ اس فلم میں ایک نہایت دلچسپ اور شوخ رومان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ فلم کی روح رواں کشور ساہو پرنیما داس گپتا۔ رانی بالا۔ مایا بنرجی اور گلاب ہیں۔ ہردلعزیز اداکار کشور ساہو نے اداکاری کے علاوہ ڈائریکشن کی خدمات بھی انجام دی ہیں

(۱۳) اورینٹل پکچرز پچھلے دنوں ایک شاندار تصویر کلیاں بنانے میں مصروف رہی۔ اس فلم میں ایک نہایت دلگداز داستان اپنی پوری اثر آفرینی کے ساتھ نمایاں ہے۔ اداکاروں میں موتی لال۔ لیلا دیسائی۔ رمولا۔ رام دلاری۔ گیاجی۔ امرناتھ۔ لیلا مصرا اور کلاؤڈی جیسی مقبول خاص و عام ہستیاں نظر آتی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے فلم کی کامیابی میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر اور پروڈیوسر مشہور و مستند کیدار شرما ہیں۔

تیس سال سے زیادہ ہوئے جب جاپان نے چین سے
کوریا چھین لیا تھا۔ کوریا کے لوگوں کو کچھ بھی شہری حقوق
نہیں حاصل ہیں۔ وہ اپنے مُلک کی حکومت میں کوئی ذمّہ دار
عہدہ نہیں پا سکتے۔ تمام کاروبار جاپانی کمپنیوں کے ہاتھ میں
ہے۔ جاپان میں آزادی اور باہمی خوشحالی کا یہی مفہوم ہے

فتح کے ذریعہ ... آزادی

عالیجناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کا نادر الوجود عطیہ

جمیان

یہ عجیب و غریب دوا جریان کیلئے تیر بہدف ثابت ہو چکی ہے

لیکن

اِس خاص مرض کے علاوہ بھی یہ تمام اعصابی اور دل و دماغ کی قوتوں کو بکال کرتی ہے

ناتوانی توانائی سے، بڑھاپا جوانی سے اور مایوسی اُمید سے تبدیل ہو جاتی ہے

عضو میں تازہ خون گردش کرنے لگتا ہے

چہرے پر پُر جوش جوانی کی سُرخی جھلکنے لگتی ہے

اس کے چند روزہ استعمال سے اکثر مایوس العلاج نوجوانوں نے دوبارہ کھوئی ہوئی زندگی پائی ہے !!!

قیمت ۳۲ قرص کی شیشی تین رُپے آٹھ آنے ——— ۶۴ قرص کی شیشی چھ رُپے

ملنے کا پتہ:-

تار کا پتہ:- ہیڈلسنز دھلی ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

منیجر ہندوستانی دواخانہ۔ پوسٹ بکس ۲۵ دھلی

"نجمہ" کے بعد ڈائرکٹر محبوب کی دوسری انمول پیشکش

محبوب پروڈکشنز کا مقبول عام بہترین سوشل شاہکار

تقدیر

ایک شاندار معاشرتی افسانہ ـــــ رومان و مزاح سے لبریز داستان

ہندوستانی معاشرت و تہذیب کا مرقع

دل نشین اداکاری ـــــ سحر آفریں موسیقی

اداکاران:-

چندر موہن ★ موتی لال ★ چارلی ★ نرگس ★ جلّو

جوبلی ٹاکیز دہلی میں ۴ ویں پُربہار ہفتہ میں بڑی دھوم دھام سے رش لے رہا ہے

پکچرز دہلی ـــــ لاہور ـــــ کراچی

مغربی تہذیب اور مشرقی تمدن کے تصادم کی ایک نہایت پاکیزہ، پُر تفریح اور سبق آموز داستان

تان سین - بھگت راج

اور

زبان کے کامیاب ڈائرکٹر

جینت ڈیسائی کا نیا قابلِ فخر کارنامہ

چندر آرٹ پروڈکشنز

شوبھا

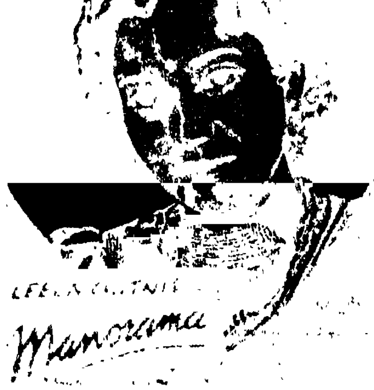
جس نے بمبئی میں گذشتہ ۱۷ ہفتوں میں تین لاکھ روپے کا گراس کر کے گذشتہ سب ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور اب بمبئی کے دو گراں قدر سینماؤں

راکسی اور ویسٹ اینڈ میں ایک ساتھ دکھائی جا رہی ہے

اداکاران:-
چارلی - لیلا چٹنس
ایشور لال - مبارک
مایا بنرجی
وغیرہ

جمعہ ۸ ستمبر سے
موتی ٹاکیز دہلی اور پکچر پیلیس مصوری میں
قابلِ فخر کامیابی حاصل کر رہا ہے

عید مبارک سے
آگرہ اور میرٹھ
میں شروع ہوگا



بلیموریا اور چھوٹو بھائی - دہلی، بمبئی



ور آنکھیں" نامی فلم میں
ہلا چٹنس اور چ ر



ا ایڈنا میجر



Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi.
Edited by Fasih-ud-din Ahmad M. A. and M. I. Wahidi & Published from the office of

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)

اکتوبر ۱۹۳۳ء





راگنی اور نجم الحسن - فلم ''داسی'' میں





چندہ سالانہ دس روپے علاوہ محصول — قیمت فی پرچہ :- ایک روپیہ علاوہ محصول

ادیب

اڈیٹرز :-
سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم،اے — (آنسہ) نجمہ تصدق ایم،اے - بی،ٹی

جلد ۷ — اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر ۶

فہرست مضامین

فصیح الدین احمد ایم اے نے دیال پرنٹنگ پریس [illegible] دہلی سے شائع کیا

نئی کتابیں

(از ضیع الدین احمد)

(۱) نغمے کی موت
از کرشن چند

شائع کردہ ہندستانی پبلشرز۔ دلی۔ قیمت للعہ

زیر نظر کتاب کرشن چندر کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔

کرشن چندر اس دور کی پیداوار ہیں جب ہمارے ادب میں قنوطیت اور ادبی وحشت پسندی کا دور اپنی پوری شعلہ سامانیوں کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ اور اردو دنیا ادب ایسے لکھنے والوں کا انتظار کر رہی تھی۔ جو فکر و مطالعہ کے علاوہ صبر و ضبط کے ساتھ گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ سماج کی پیچ در پیچ الجھنوں پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ مغربی ادبیات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مشرق کی ادبی روایات سے واقف ہوں۔ اور ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہوں۔ نئے تصورات و نظریات اس انداز و اسلوب سے پیش کر سکتے ہوں جو پڑھنے والے کے دل میں اجنبیت کا احساس نہ پیدا ہونے دے۔ کرشن چندر ایسے لکھنے والوں کی صف اول میں ہیں ہر چند کہ ان کی ادبی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مگر اس مختصر سی ادبی زندگی میں انہوں نے جو شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے اور جدید ادب میں اپنے لئے جو مقام پیدا کر لیا ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

پچھلے چند سالوں میں ان کے افسانوں کے کئی مجموعے ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ "نغمے کی موت" ان کی تازہ ترین ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کی طرح ان افسانوں میں بھی ان کی تحریر کی تین نمایاں خصوصیتیں محنت، مطالعہ اور مشاہدہ اپنی پختہ تر صورت میں کارفرما ہیں ان کے اسلوب میں شاعرانہ شگفتگی کے ساتھ ساتھ طنز کا ایک ایسا پہلو ملتا ہے جو انہیں اپنے بعض معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان افسانوں میں یہ تمام پہلو ایک دلکش امتزاج و آہنگ کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ماحول کی عکاسی اور کردار نگاری میں صداقت نظر آتی ہے۔ سماج کے دکھ اور درد کا خلوص کے ساتھ احساس کیا گیا ہے۔

کتاب اپنی خوبیوں کے علاوہ ظاہری آب و تاب کے اعتبار سے بھی کچھ کم دلکشی نہیں رکھتی جلد اور گرد پوش کا حسن دیکھ کر ہندستانی پبلشرز دلی کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس دور میں ایسی حسین چھپی ہوئی کتابیں شائقین ادب کے لئے ایک نعمت ہیں۔

(۲) تلخیاں
از سعید اختر ندوی

شائع کردہ ہندستانی پبلشرز - دلی - قیمت تین روپے

زیر نظر ناول کے مصنف کا شمار بھی ان گوشہ نشین ادیبوں میں کرنا چاہئے جنہوں نے نشر و اشاعت کے ذرائع سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ ہر چند کہ یہ ناول مصنف کا پانچواں ناول ہے مگر اس نے وہ شہرت اور امتیاز نہیں حاصل کیا جسکا وہ قطعی طور پر مستحق ہے۔ یہ ناول ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا ہونے والے عیوب کا ایک عبرتناک مرقع ہے۔ اس ناول میں دولتمند طبقہ کی ہوسناکیوں کی داستانیں ملتی ہیں۔ کرداروں کے انتخاب میں مصنف نے وسعت تخیل کا ثبوت دیا ہے۔ بالا اور وسط طبقے کے تمام ممکن نمائندہ کردار اس ناول میں یکجا کر دئے گئے ہیں۔ کردار نگاری میں خلوص و جرأت کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ بتا دیا گیا ہے کہ خود شاعر اور ادیب کا دامن بھی آلودگیوں سے پاک نہیں ہے۔ مصنف کا نقطۂ نظر انقلابی نہیں اصلاحی ہے۔ اسکو سرمایہ دارانہ نظام سے شکایت نہیں ہے بلکہ صرف ان صاحبان جاہ و ثروت سے شکوہ ہے جو قبیح حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ناول باعتبار نفس شروع سے آخر تک دلچسپ ہے کتاب کی ظاہری تزئین و زیبائش میں ہندستانی پبلشرز دلی نے پوری خوش مذاقی اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیا ہے اردو کی یہ کتاب طباعت، جلد اور گرد پوش کو دیکھتے ہوئے اچھی اچھی انگریزی اشاعتوں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔

(۳) مشعل راہ
از نخشب جارچوی

شائع کردہ ہندستانی پبلشرز۔ دلی۔ قیمت ۱ے

حضرت نخشب ایک خوش خلق، خوش گفتار اور خوش پوشاک نوجوان شاعر ہیں رسائل و جرائد سے زیادہ وہ مشاعروں کی وساطت سے پبلک سے روشناس ہوئے ہیں جو لوگ ان سے مل چکے ہیں ان کے دلوں پر انہوں نے خلوص و خوش مزاجی کا گہرا نقش چھوڑا ہے جو لوگ ان سے نہیں ملے ہیں وہ ملنے کے بعد یقیناً ان سے متاثر ہوں گے۔ وہ ایک ہونہار خوش سلیقہ اور نیک اطوار شاعر ہیں اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ سگریٹ تک نہیں پیتے۔

[illegible]

[illegible] غزلیں بہت شائع ہو چکی ہیں [illegible]

[illegible] پیدا ہوا ہے۔ غزل گو شاعر ہیں۔ وہ غزل [illegible]

[illegible] صداقت ہیں۔ ان کی غزلیں بہت سی پرخلوص ہیں۔ سادگی اور شوخی

ان کے اشعار کی جان ہے۔ ان کی غزلوں میں سیدھا سادہ حسن و عشق کی شاعری ملتی ہے

تصوف اور فلسفہ کی الجھنوں سے وہ ہر جگہ گریز کرتے ہیں۔ [illegible]

[illegible] ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے درج کئے جاتے ہیں۔

وہ مجبوریاں پر مری مسکرائے — یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

اسے جانب نظر ہو جب میں دیکھ کر اُدھر — وہ نظر گھبرا کے طرف بام و در ہو جائیگی

آیا تو انقلاب تو ناتہ جیہ کار — لیکن تری نظر کا سہارا لئے ہوئے

جانے کیا دل کو محبت میں سہارا ہو گیا — یا خوشی بھی یار تھی یا غم گوارا ہو گیا

ان کی محفل میں جاکے اے محتسب — غم نہ ہوتا تو کیا خوشی ہوتی

وہ جانتے ہی نہیں کیا ہیں اضطراب و جنوں — اور ان کا ہاتھ بھی رکھا دل بیمار پہ ہے

حقیقت جو صدق دل سے ہو — وہ گنہ بھی ثواب ہوتا ہے

(۴) سفینے مترجمہ صادق الخیری ایم۔اے دہلوی

شائع کردہ خاتون کتاب گھر اردو بازار دہلی۔ قیمت ۱۲

زیر نظر کتاب مختلف ممالک کے تین منتخب افسانوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ یہ تمام

تراجم صادق الخیری صاحب ایم اے دہلوی کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ مترجم نے جو [illegible] ایک افسانہ

[illegible] افسانوں کے انتخاب اور ترتیب میں خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ مجموعہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے

[illegible] مشرقی و مغربی اہل قلم کے وہ افسانے ملتے ہیں جنہیں قطعی طور پر معاشی کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے

حصہ میں ایسے افسانے ملتے ہیں جو جدید نظریات کے حامل ہیں۔ انہیں ہم ترقی پسند افسانے کہہ سکتے ہیں

افسانوں کے انتخاب میں تنوع کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان افسانوں میں مختلف ذوق کے لوگ اپنے

مذاق کی تسکین کا سامان پائیں گے۔ ترجمہ قلم برداشتہ نہیں ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے سے قبل مترجم

افسانوں کو محسوس کر چکا ہے اور ان سے پورے طور پر محظوظ ہو چکا ہے۔ ہمارے افسانوی ادب

میں یہ کتاب ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

(۵) شام و سحر از جناب ایم اسلم صاحب شائع کردہ مکتبہ دار البلاغ۔ لاہور قیمت ۵

صفحات ۴۸۰۔ سائز [illegible] مجلد مع گرد پوش

اسلم صاحب کی فسانہ نگاری اور ناول نویسی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ کوئی اردو

داں ایسا نہیں جو ان کے افسانوں یا ناولوں سے واقف ہو۔ اسلم صاحب کے نام سے ناواقف

ہو۔ ہندوستان بھر میں کوئی ایسا کتب فروش نہ ملے گا جہاں اسلم صاحب

کی کتابیں نہ ملتی ہوں اور ملک کا کوئی ایسا حصہ نہ ہوگا جہاں ان کی کتابوں کے سیکڑوں

لئے بہر حال نہ تھک جاتے ہوں۔

میں اسلم صاحب کے نام سے پہلی بار ۱۹۳۳ء میں واقف ہوا جب ان کی

مشہور معروف کتاب "نرگس" شائع ہوئی۔ "نرگس" ان کا شاہکار تھی۔ بلکہ میرے

خیال سے اب بھی ہے۔ اور شاید اسلم صاحب نے اس سے بہتر آج تک کوئی افسانہ

یا ناول نہیں لکھا لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے۔

اس کے بعد جو انکی تصنیفات کا سیلاب شروع ہوا تو آج تک پورے زور و

شور کے ساتھ جاری ہے۔ سال بھر میں افسانوں کے چار پانچ مجموعے یا ناول شائع کر دینا

ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا ہے۔

جب میں ایف اے میں پڑھتا تھا تو کسی انگریزی رسالے میں میں نے William

Dumas کے متعلق جو سلیخ رسانی کے سلسلے میں قیمتی ناول لکھنے کا ماہر تھا پڑھا تھا کہ بیک وقت

انکے سامنے تین چار سٹینوگرافر موجود رہتے تھے اور چاروں کو یکے بعد دیگرے وہ ناولوں کا

پلاٹ لکھوایا کرتا تھا۔ اگر اسلم صاحب کی تصانیف کا بھی یہی عالم رہا تو شاید ان کو بھی

سٹینوگرافروں کی ضرورت لاحق ہوگی۔ کم و بیش ان کی تصانیف کی تعداد اس وقت

ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ضرور ہوگی۔

"شام و سحر" کو جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے ایک خاندان کی زندگی کا خاکہ ہے۔

جس کی سحر امید افزا اور جس کی شام مایوس کن ہے۔ اسلم صاحب نے اس کتاب

کو ایک ہی جلد مگر دو حصوں میں شائع کیا ہے۔ ان کی سحر دلچسپ ہے۔ مگر شام

دلگداز ہے۔ نصف کتاب کو پڑھنے کے بعد صرف اسے دلچسپ کہا جاسکتا ہے۔ مگر پوری

کتاب پڑھنے کے بعد دلگداز کہنا پڑتا ہے۔ اسلم صاحب دلچسپی کے تمام سامان اپنے

ناظرین کیلئے بڑی خوش اسلوبی سے مہیا کرتے ہیں۔ مگر جس وقت وہ ٹریجڈی کی طرف

رخ کرتے ہیں تو ان کی شخصیت کو زیادہ کامیابی کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ میں اسلم صاحب کی

زندگی سے قطعی ناواقف ہوں۔ مگر تین چار باتیں ان کی ہر کتاب میں موجود پاتا ہوں۔

مذہب پر کچھ چلتی ہوئی بحث۔ اولاد کی ماں کا شکار کا شوق۔ اور شادی بیگم کے ڈھولک

کے گیت۔ چنانچہ ان کی تصنیفات کا تار و پود عموماً انہی اربعہ عناصر سے مرکب ہوا

کرتا ہے۔ ہاں ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ اسلم صاحب ہر باب کو ایک

پھڑکتے ہوئے شعر سے شروع کرتے ہیں۔ شاید ان کی طبیعت کو کچھ لگا ڈھوکا

کیونکہ ان کے کیریکٹر عموماً پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اور ان کے منہ

سے ایسے برمحل اور برجستہ شعر سننے میں آتے ہیں کہ اسلم صاحب کے

ذوق سلیم کی داد دینی پڑتی ہے۔

ہندوستانی پریس

قسط دوم

(از نصیح الدین احمد)

آدمی کو ہمیشہ سے علم کی تلاش رہی ہے۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد سے پہلے اطلاعات بہم پہنچانے کا کام زبانی انجام پاتا تھا۔ بڑے بڑے اشتہار ہاتھ سے لکھکر چوک میں لگائے جاتے تھے۔ کبھی تو یہ اطلاعات عوام کو بطور ہدایت دی جاتی تھیں اور کبھی ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو خبریں حکومت کو اپنے گماشتوں کے ذریعہ [illegible] لوگوں کی واقفیت کے لئے مشتہر کر دیا جاتا تھا۔

گماشتوں کا کام خبریں حاصل کرنا تھا۔ ان خبروں کو حکومت کے وزرا [illegible] کارروائی کے واسطے بھیج دیا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں تعلیمی ترقی ہوتی گئی اطلاعات بہم پہنچانے کے کام کو زیادہ محسوس کیا جانے لگا۔ چنانچہ سترھویں صدی کے آغاز میں یہی تذکرہ نویس جو اب تک امیروں اور بادشاہوں کے درباروں کے ساتھ وابستہ رہکر اپنے فرائض انجام دیتے تھے اب آزاد اخبار نویس بن بیٹھے۔ اور ملک الزبتھ کے زمانہ میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔

[illegible] درباروں میں بھی خبر رسانی کی ضرورت کو بہت پہلے سے تسلیم کر لیا تھا۔ بادشاہ ایک واقعہ نویس کو اپنے دربار میں ملازم رکھتا تھا۔ اور اس کے ماتحت واقعہ نویس ہر صوبے اور ضلعے میں کام کرتے تھے۔ اور اہم واقعات کی اطلاع صدر واقعہ نویس کو پہنچایا کرتے تھے۔ ان اطلاعات کی بنا پر موقع محل کے اعتبار سے احکامات جاری ہوتے تھے۔

ان [illegible] کا صحیح ہونا ضروری نہ تھا۔ بعض اوقات قصداً غلط اطلاعات بھی بھیجی جاتی تھیں تاکہ غلط واقعات کی روشنی میں حسب منشا احکام صادر کرا لئے جائیں۔

فرانسس برنیر ایک فرانسیسی ڈاکٹر تھا کسی بڑے امیر کے ہاں شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ملازم تھا۔ وہ صوبہ داروں کے متعلق یہ کہتا ہے:-

[illegible] کوئی سماعت نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ بادشاہ [illegible] کرتا تھا لیکن ان واقعہ نویسوں [illegible] قائم ہو جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے بسا اوقات [illegible] اٹلی کے مشہور شہر وینس کا ایک [illegible] دربار میں کئی سال رہا ہے، لکھتا ہے:-

"حکمرانوں کا یہ دستور رہا ہے کہ اُن کے ہاں [illegible] ایک عام طور پر واقعہ نویسی کیا کرتا تھا اور دوسرا [illegible] سلطنت کے متعلق خبریں لکھکر بادشاہ کو بھیجا کرتے تھے [illegible] بادشاہ کے سامنے محل کی خواصیں رات کے نو بجے پڑھکر سنایا [illegible] طرح بادشاہ کو سلطنت کی تمام خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ [illegible] ہوتے تھے جو شہزادوں اور اُمراء کے متعلق خفیہ طور پر خبریں لکھکر بھیجا کرتے تھے [illegible] آدھی رات تک روزانہ ان کاموں میں مشغول رہتا تھا۔"

۱۸۲۵ء میں کرنل جیمز ٹوڈ نے [illegible] کے تحریر کردہ سینکڑوں واقعات ایشیاٹک سوسائٹی [illegible] عموماً ۴ x ۸ سائز ہوتے تھے۔ ان میں عہدہ داروں کی [illegible] مختلف صوبوں میں جانے کا ذکر، سیر و شکار کے واقعات [illegible] اُمراء پر شاہی انعام و اکرام کی بارش کے حالات [illegible]

جون [illegible] بھی برنیر کی طرح ایک [illegible] اورنگ زیب کے عہد حکومت میں نو سال [illegible] تھی۔ اس کا بیان ہے [illegible] نویسی کے [illegible] میں جو [illegible] کامی حاصل ہوئی تھی اس کی وجہ دراصل واقعہ نویسوں کی [illegible] وہ لکھتا ہے کہ اُس کے جرنیل اور واقعہ نویس بادشاہ کو دھوکہ [illegible] کے شریک تھے۔

ڈیڑھ سو سال بعد ہمیں واقعہ نویسوں کی [illegible] اودھ کے گورنر غلام حسین میں ملتی ہے [illegible] نے سر ولیم سلیمن سے [illegible] کے بعد صوبے کے واقعہ نویسوں کو اتنی رشوت دی تھی کہ اس کے [illegible] دربار تک پہنچے تو کجا میدان کارزار سے بیس میل دور بھی نہ پہنچے ہونگے۔

ایک اور کتاب میں سر ولیم سلیمن نے لکھا ہے کہ [illegible] واقعہ نویس ملازم رکھ چھوڑے تھے جن کو چار یا پانچ روپے مہینہ تنخواہ ملتی تھی [illegible] سر ولیم سلیمن نے ان واقعہ نویسوں کا مذاق اُڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ [illegible]

[illegible] ریاست کا دارومدار ہوتا تھا۔

[illegible] اٹھارہویں صدی کے نصف میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے [illegible] نویسوں کے ذریعے پوشیدہ اور اہم خبریں ہندوستانی درباروں [illegible] سے پہنچا کرتی تھیں۔ پتہ چلتا ہے کہ ۲۷ مارچ سنہ [illegible]ء کو ایک شخص مسمی رام چندر [illegible] ہگلی بھیجا گیا کہ وہ وہاں جاکر صوبے کے گورنر، بخشی اور واقعہ نویسوں کو [illegible] یہ اطلاع دے کہ انگریزوں نے اس کو ہگلی میں اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ کمپنی کے ملازمین کی شکایات بھی انہی واقعہ نویسوں کے ذریعہ بادشاہ کے [illegible] کے لئے بھیجی جاتی تھیں۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی [illegible] سے کافی واقفیت بہم پہنچاتے اور وسیع انتظامات سے پورا فائدہ اٹھاتے [illegible] بات بھی قابل توجہ ہے کہ واقعہ نویس کو واقعات درج کرنے اور اُن پر [illegible] بڑی آزادی تھی۔

اب ہم چھاپہ خانے کی تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے سب [illegible] کام شروع کیا وہ چینی تھے۔ چنانچہ ایک کتاب جس پر یہ فقرہ چھپا ہوا تھا۔ [illegible] کے لئے شائع کیا تاکہ اس کے ذریعہ [illegible] ملتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ [illegible] پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کا سن [illegible]ء ہے [illegible]

[illegible] کے درمیان چین میں ٹائپ [illegible] ایجاد کب ہوئی [illegible] کے متعلق کوئی سنہ مقرر کرنا دشوار معلوم [illegible] میں اس کا آغاز ہوا۔ [illegible] اس کا [illegible] ان کو ایک لکڑی کے تختے پر [illegible] تک یورپ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی [illegible] اعظموں میں اٹھارہویں صدی سے ہوا۔ [illegible] ہالینڈ اور اٹلی ان سب ملکوں کا دعوی ہے کہ چھپائی [illegible] لیکن [illegible] ایک جرمن نے پہلے انجیل [illegible] سے اس کو شہرت حاصل ہوگئی۔ یہ عام طور پر چھپائی کا موجد [illegible] خانہ میں وہ ٹائپ بھی ڈھالے گئے جو ۱۴۵۴ء میں انجیل چھاپنے [illegible] میں جرمنی کے باشندے نے جس کا نام [illegible] تھا [illegible] جاکر روم کے قریب ایک چھاپہ خانہ کھولا۔ ۱۴۷۰ء میں تین [illegible] نے پیرس میں ایک چھاپہ خانہ کھولا اور اس زمانہ میں سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ اور بلجیم میں چھپائی کا کام شروع ہوا۔

ولیم کیکسٹن تھے جو انگلستان کا پہلا ناشر تھا۔ چھپائی کا کام ہالینڈ اور بلجیم میں سیکھا اور ۱۴۷۶ء میں اُس نے ویسٹ منسٹر میں ایک چھاپہ خانہ کھولا۔ اب تک چھپائی کا سارا کام لاطینی زبان میں ہوتا تھا۔ لیکن کیکسٹن نے انگریزی زبان میں پندرہ سال کے عرصہ میں تقریباً [illegible] کتابیں شائع کیں۔

چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم صرف ان لوگوں کی میراث نہیں رہا جن کو خوش قسمتی سے قلمی نسخے حاصل ہو سکتے تھے۔ مذہبی اداروں نے پریس کی حمایت کی، اور اس کی بدولت اچھے اور خوبصورت لکڑی کے حروف بننے لگے۔ اب چھپائی کا کام بہت عام ہو گیا۔ لیکن عیسائی پادریوں کو پریس پر اطمینان نہ تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ خیالات کی آزادی جو تعلیمی فروغ کا قدرتی نتیجہ ہے کہیں رنگ نہ دکھائے۔ اس وجہ سے مذہبی اداروں نے پھر پریس سے دست کشی اختیار کرنی شروع کی۔

لیکن جن لوگوں کو پریس کا چسکا پڑ گیا تھا وہ باز آنے والے نہ تھے چنانچہ جرمنی اور اٹلی میں پریس کو فروغ حاصل ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ ٹائپ کا استعمال ہونے لگا۔

۱۴۹۵ء میں [illegible] نے [illegible] کے شہر میں ایک پریس کھولا جو [illegible] زیادہ مشہور ہوا۔ اس کے تین سال بعد واسکوڈی گاما ہندوستان آیا۔ پہلے کچھ پرتگالی باشندے ہندوستان میں آکر آباد ہوئے۔ ادھر کچھ اور لوگ گوا میں آکر بسے۔ یہ واقعات سولہویں صدی کے آخر کے ہیں۔ ان لوگوں کو جب دین مسیحی کی اشاعت کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے یورپ سے دو پریس منگا بھیجے۔ یہ پریس [illegible]ء میں آئے اور پہلی کتاب سوال و جواب کی صورت میں دین مسیحی کے متعلق شائع ہوئی۔

پہلا انگریز جو ہندوستان آیا اس کا نام ٹامس سٹیفنس تھا۔ یہ شخص [illegible] گوا میں تھا اور چالیس سال اس ملک میں رہے اور کام کرنے کے [illegible] ستر سال کی عمر میں [illegible]ء میں مر گیا۔ اس شخص نے بنگالی قاعدہ کا [illegible] زبان میں ترجمہ کیا۔

[illegible]ء میں ایک ہسپانی باشندے نے پہلی مرتبہ ملیالم اور تامل زبانوں کا ایک ٹائپ ایجاد کیا جس سے اس نے ایک کتاب کا ترجمہ جس کا نام "دین مسیحی کا اصول" تھا شائع کیا۔ پادریوں کو اس میں اختلاف ہے کہ یہ پریس کس جگہ قائم تھا۔ کوچین میں یا کسی اور جگہ؟ بدقسمتی سے اس کتاب کا کوئی نسخہ بھی ہندستان میں موجود نہیں۔

[illegible]ء میں ایک اور پریس جنوبی ہند میں ضلع تناولی میں قائم ہوا جس کی

[illegible]

[illegible]

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اردو کی کتابیں [illegible]
[illegible] وجود میں آگیا تھا۔
انڈیا کے علاوہ [illegible] چھاپہ خانہ بھی وجود میں آگیا تھا۔
اس کے بعد ایک اور چھاپہ خانہ ۱۷۶۹ء میں قائم ہوا۔ یہ پریس [illegible] قائم
ہوا جہاں سے تامل زبان کی ایک ڈکشنری چھاپی گئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ
ہندوستان میں پریس کی اس قدر آہستہ ترقی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مغل بادشاہ اور
ان کے درباری امرا عموماً قلمی نسخوں کو زیادہ پسند کرتے تھے۔
یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۶۱۳ء میں شہنشاہ جہانگیر نے ایک شاہی
فرمان جاری کیا جس کی رو سے انگریز تاجروں کو ہندوستان میں امان دی گئی۔ اور انکو
ہندوستان سے تجارت کرنے کی بھی اجازت مل گئی۔ نیز ایک انگریزی سفیر بھی مغل دربار
میں رہنے لگا۔ چنانچہ سر طامس رو کو جہانگیر کے دربار میں انگریزی سفیر بنا کر بھیجا گیا۔
جس نے تین سال تک تجارتی کمشنر، سفیر، اور سیاسی نمائندے کے فرائض انجام دیئے۔
رفتہ رفتہ یہ تعلقات بڑھتے گئے۔ اور سورت، ہگلی اور مسولی پٹم میں کارخانے قائم
ہو گئے۔ کارخانوں کے ساتھ ضروری عملہ بھی مثلاً تاجر، پادری، منشی وغیرہ ہندوستان
آنے لگے۔ اب پہلی بار جرمنی سے ایک تجارتی اخبار شائع ہوا جس کا سنہ اشاعت
۱۶۱۱ء ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے ممالک سے بھی اسی قسم کے پرچے شائع
ہونے لگے۔ جن میں تجارتی خبروں کے علاوہ کچھ واقعات بھی درج کئے جانے تھے ۱۶۴۱ء
میں چارلس اول نے انگریزی پریس پر پابندیاں عائد کرنی چاہیں لیکن برطانوی پارلیمنٹ
نے ان کو برطرف کر دیا اور اس طرح انگلستان میں ایک آزاد پریس کا نفوذ شروع ہوا۔
میکالے نے اس وقت کی پریس کی حالت یوں بیان کی ہے:۔
" اخبار نویس قہوہ خانوں میں چکر لگاتے تھے سیشن کی عدالتوں سے
دلچسپ خبریں حاصل کرتے تھے۔ وائٹ ہال میں جا کر بادشاہ اور امراء کی شکلیں دیکھتے
تھے اور اس طرح فراہم کئے ہوئے مواد سے ایک ہفتہ وار اخبار شائع ہوتا تھا۔ ان
اخباروں کا چندہ سالانہ ہوتا تھا۔ ان میں پارلیمنٹ کے حالات اور مباحثے بھی شائع
ہوتے تھے ۱۶۴۱ء میں انگریزی پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان جھگڑا شروع
ہوا اور ان جھگڑوں نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ دونوں طرف اخباروں
کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں ایک دوسرے کو دل کھول کر برا بھلا کہا جاتا تھا۔
چونکہ یہ خانہ جنگی دیر تک جاری رہی۔ اس نئے لوگوں کی دلچسپی بڑھتی گئی اور اخبارات
کی اشاعت میں اضافہ ہونے لگا۔ پارلیمنٹ نے اس وقت اپنی نوجوں کے ساتھ سکریٹری
رپورٹر مقرر کر دیئے تھے جو پورے واقعات لکھ کر سکاؤٹ ماسٹر جنرل کو بھیجتے تھے اور
وہ ہاؤس آف کامنز کے سامنے ان واقعات کو پیش کرنے کے بعد مختلف اخبار نویس
[illegible] رپورٹ [illegible] کرنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔

[illegible]
ہندوستان کے [illegible]
دفتری عملہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اب یہ لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاصل کئے ہوئے
علاقوں کو مستحکم بنانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔
۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال اور بہار دو بڑے صوبے
ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آگئے اور تجارتی معاملات تک محدود رہنے کی بجائے
ملک کے نظم و نسق میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور ۱۷۷۳ء میں کمپنی کے مقبوضات
کے انتظامات کے لئے وارن ہیسٹنگز کو پہلا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ جس کی تنخواہ
۲۵ ہزار پاؤنڈ سالانہ تھی۔
ہندوستان کے تعلیمی احوال کا حال برنیر کی اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ
جو اس نے فرانس کے بادشاہ لوئس چہاردہم کے وزیر مال کو بھیجی تھی۔ وہ لکھتا ہے:۔
"ہندوستان میں علمی بیداری بالکل مفقود نظر آتی ہے۔ یہاں نہ کوئی اکاڈمی
ہے نہ کالج۔ نہ ایسے لوگ ہیں جو ہندوستانی طلبا کی تعلیم کیلئے اس قدر روپیہ خرچ
کر سکیں جس سے کالج قائم کئے جائیں اور طلبا کو تعلیمی سہولتیں حاصل ہوں۔ نہ ایسے
عہدے ہیں جن کو تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبا کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو۔ تمام
ملک بادشاہ کی ملکیت ہے اور وہ جس زمین کے ٹکڑے کو چاہے کسی رئیس یا امیر
کو کچھ عرصہ کے لئے دے دیتا ہے اور ناراضگی کی حالت میں وہ جاگیر ضبط کر لی جاتی ہے۔"
مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان تعلیم و تربیت سے بالکل بے بہرہ تھا
شمال مغربی صوبہ میں ٹیکسلا یونیورسٹی اس بات کا بین ثبوت تھی جہاں مختلف مضامین
پڑھائے جاتے تھے۔ اس یونیورسٹی کے ساتھ بہت سے سکول تھے اور علم طب کو بڑی اہمیت
حاصل تھی۔ اس کے علاوہ نقاشی، مجسمہ سازی، بت تراشی اور دیگر صنعتیں بھی سکھائی
جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں ایتھنز علوم و فنون کے لئے خاص طور پر مشہور تھا۔ اور
اشوک کے زمانہ میں حیوانات کے علاج کے لئے بڑے بڑے ہسپتال قائم تھے۔
اسی طرح پہلی صدی عیسوی میں صوبہ بہار میں نالندہ یونیورسٹی پورے عروج پر تھی۔
ہیون سانگ چینی سفیر نے لکھا ہے کہ دس ہزار طالب علم اس یونیورسٹی میں مفت
تعلیم پاتے تھے۔ اور قواعد صرف و نحو، منطق، حساب، عملی ہندسہ، نجوم
موسیقی، طب، فلسفہ، سنسکرت اور پالی سکھائی اور پڑھائی جاتی تھی
قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے اور شمالی ہند میں ہندوؤں کا
قائم کردہ انتظام تعلیم درہم برہم ہو گیا۔ اکبر اگرچہ خود لکھ پڑھ نہ سکتا تھا لیکن خود علم و
فضل کا ایک بہت بڑا سرپرست تھا۔ آئین اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کا نصاب
تعلیم یہ تھا:۔
(باقی آئندہ)

گذشتہ سے پیوستہ

میری زندگی کے چند موڑ

(از واحدی)

۳

میرے ایک پھوپی زاد بھائی تھے۔ میرے والد انہیں بہت چاہتے تھے۔ ان کی والدہ بیوہ تھیں۔ میرے والد بہن اور بھانجے کا دل ہاتھ میں رکھتے تھے۔ بہن بھی بھائی کے بچوں کی یعنی ہماری عاشق تھیں۔ میں اُن کے ہاں جاتا تو وہ خاطر ہوتی کہ کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے اُن کی فاتحہ کا کھانا کنبہ والوں کے ذریعہ پکوایا۔ میرے یہ پھوپی زاد بھائی اس وقت دلی میں موجود تھے۔ ہفتہ عشرہ بعد تشریف لائے تو انہوں نے سنا کہ سسرال کے عزیزوں کی بجائے میکے کے عزیزوں کے ذریعہ فاتحہ کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ صرف اس قصور پر میرے ان بھائی نے میری والدہ کو اس قدر بُرا بھلا کہا کہ میں آج تک نہیں بھولا۔ والد کے دو سال بعد زندہ رہکر والدہ بھی چل بسیں۔ اور یہی پھوپی ہماری سرپرست اور قانونی ولی بنیں۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ وہی میری والدہ کو بُرا کہنے والے پھوپی کے بیٹے مجھ پر اتنے مہربان ہوئے کہ میرے باپ کے احسانوں کو یاد کرکے روتے تھے۔ میرے ان کے تعلقات بہت اچھے ہوگئے۔ لیکن بارہ تیرہ برس کی عمر میں تند بھاوجوں اور میکے اور سسرال کے جھگڑوں کا جو نقش میرے دل پر جم گیا تھا وہ مٹائے نہیں مٹا۔ والدہ کے ساتھ پھوپی اور پھوپی زاد بھائی کا سلوک جو تھا سو تھا۔ خود مجھے یہ تجربہ ہوا کہ باپ کی زندگی میں جو عزیز آنکھیں بچھاتے تھے انہوں نے باپ کے مرتے ہی آنکھیں بدل لیں۔ ان پھوپی کے ہاں میں باپ اور ماں کے انتقال کے درمیانی زمانہ میں صرف ایک دفعہ گیا۔ دیر تک در سے لگا کھڑا رہا۔ گھر والوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ اسی زمانے میں ان پھوپی زاد بھائی کے سالے کی شادی ہوئی۔ بھائی نے سارے محلہ کو شادی میں شریک کیا۔ لیکن مجھ بھائی کو نہیں پوچھا۔ میں نے برات کا جلوس اپنے پھاٹک میں کھڑے ہوکر دیکھا۔ بچے براتوں کی شرکت کے کیسے شائق ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ میں چالیس سال پیچھے کے اپنے تاثرات سے لگا سکتا ہوں۔ ایک اور بھائی اور بڑھکر نکلے۔ میری والدہ نے ان سے کہا کہ ہمارے فلاں مکان کی اوپر کی منزل بہت بوسیدہ ہے اسے اتروا لو۔ اینٹیں اور کڑیاں بچیں [illegible] دو۔ کہیں اوپر کی منزل نیچے کی منزل کو نہ لے بیٹھے۔ اینٹیں بھی رہیں گی اور کڑیاں کام آجائیں گی۔ بھائی نے اینٹیں کڑیاں تو اتروا دیں۔ مگر صحن کی زمین پر بھی ان کا بوجھ نہیں پڑنے دیا۔ بلکہ اپنے ایک مکان میں انہیں کھپا کر بنگ لگا دیا۔

میری والدہ کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں اُن کا ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں تھا۔ اپنے بچپن کے احساسات بھی دلچسپ سمجھ کر لکھ دیئے۔ مگر زیادہ لکھنا فضول اور ہلکی بات ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ کنبہ کا برتاؤ باپ کی زندگی میں جیسا تھا، باپ کے انتقال کے بعد ویسا نہیں رہا۔ کنبہ کے بزرگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے ٹھکرا دیا۔ مجھے کنبہ سے تعلق پیدا کرنے کی تربیت نہیں دی۔ اَن گڑھ پتھر کی طرح میں لڑھکتا پھرتا تھا۔ سوائے خدا کے میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ صرف ایک ماموں نے مجھے اس قدر سہارا ضرور دیا کہ میری بہن کو اپنے گھر میں جگہ دیدی۔

میں نے بغیر کسی دینی یا دنیاوی تربیت کے عمر کے تقریباً بیس سال گزارے۔ سکول کے چند گھنٹوں کے علاوہ میرا سارا وقت انسانوں سے الگ تھلگ کٹتا تھا۔ ان حالات میں حقیقتاً میں ایک اَن گڑھ پتھر ہی بن کر رہ گیا۔ الگ تھلگ زندگی کاٹنے سے مجھے فائدہ بھی پہنچا۔ میں کنبہ اور سوسائٹی کے مضر اثرات سے بچ گیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میرا مذہب سوچا ہوا مذہب ہے۔ میں اس لئے مسلمان نہیں ہوں کہ مسلمان ماں باپ کے ہاں اور مسلمان خاندان میں جنم لیا ہے۔ بلکہ اس لئے مسلمان ہوں کہ اسلام پر میں نے واقعی غور کیا ہے اور اسلام کو میں نے سمجھا ہے۔ مذہب کی طرح میرے عادات و اطوار بھی کسی سوسائٹی کے رہین منت نہیں ہیں۔ فطرتاً ذی حس ہوں۔ ہر بات کا اثر قبول کرتا ہوں۔ کنبہ اور سوسائٹی کا اثر میں نے نہیں لیا۔ مگر کنبہ اور سوسائٹی کی بے رُخی کا اثر لیا۔ اور وہ یہ کہ سب سے دُور رہنا چاہیئے۔

میں اَن سوشل ہوگیا۔ اکل کھرا ہوگیا۔ لوگوں سے فائدہ اُٹھانے اور اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت مجھ میں (Develop) پیدا نہ ہوسکی۔ اپنے لڑکوں پر اپنا یہ خراب اثر پاتا ہوں تو اب افسوس ہوتا ہے اور ڈر لگتا ہے کہ اللہ کے ہاں پکڑا جاؤں گا۔ دوست شاید تبھی نہیں ہوں۔ عزیزوں کے ساتھ بھی بُرائی کبھی نہیں کی۔ لیکن صلہ رحم جسے کہتے ہیں اور جس کی اہمیت میں خوب جانتا ہوں اُس پر عمل نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ سے خدا کے سامنے شرمندہ شرمندہ ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میرے لڑکے کنبہ سے ملیں جلیں۔ ملنسار رہیں۔ میری تو گذر گئی۔ اور اچھی گذر گئی۔ لیکن ہر شخص کی الگ تھلگ رہکر نہیں گذر سکتی۔ انسانوں کو

جانوروں سے تعلق [illegible] چاہیے۔ اور بالکل الگ تھلگ جانور بھی نہیں رہتے۔ آزاد جانوروں کے بھی غول ہوتے ہیں۔ اور مقید جانوروں کو بھی تھوڑی دیر کے لئے آزاد چھوڑا جاتا ہے تو غول بنا کر چھوڑا جاتا ہے۔ میری زندگی کا یہ موڑ بڑا عبرتناک موڑ تھا۔ میرے بچوں ہی کو نہیں دوسروں کو بھی اس سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ اور دوسروں کے برتاؤوں سے قطع نظر کرکے اپنے برتاؤ پر نظر رکھنی چاہیئے۔ اور سمجھنا چاہیئے کہ "باہمیں مردماں بہ باید ساخت۔"

میں نے اب تک اپنی زندگی کے چار موڑ بتائے ہیں۔ ایک یہ کہ میرا سارا خاندان ہمیشہ ملازمت پیشہ رہا۔ لیکن مجھے ملازمت سے نفرت ہو گئی اور اس طرح ہو گئی۔ دوسرے میری طبیعت کا رجحان عزت اور شہرت حاصل کرنے کی طرف بہت تھا۔ یہ رجحان بدل گیا۔ اور کیسے بدل گیا۔ تیسرے مجھ میں انشاء پرداز بننے کی صلاحیت تھی، وہ صلاحیت ختم کر دی گئی اور کیونکر رہ گئی۔ یا انشاء پرداز بننے کی بجائے میں کاروباری آدمی کیونکر بنا۔ چوتھے یہ کہ میں آدمیوں میں پیدا ہوا تھا۔ آدمیوں میں پیدا ہو کر آدمیوں سے بھاگنے لگا۔ اس بھاگنے کی وجہ کیا ہے؟

میرے جاننے والوں کو غالباً تعجب ہوگا کہ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ عملاً میری زندگی ان ہی چار عدد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ موڑ انہیں میں نے کیسے قرار دیا۔ دعویٰ ملازمت سے نفرت کا ہے۔ اور بڑھاپے میں ملازمت کر لی ہے۔ اور چھ سات مہینے گذر چکے اب تک نہیں چھوڑی۔ دعویٰ عزت اور شہرت سے دل پھر جانے کا ہے۔ لیکن عزت اور شہرت آج کل جس مطلب کیلئے چاہی جایا کرتی ہے یعنی میونسپل کمیٹی کی ممبری، اسمبلی کی ممبری وغیرہ وغیرہ، یہ ادنیٰ پیمانے پر بھی تاہم مجھے میسر ہے۔ اور میں اس پر ٹھوکر نہیں مارتا اور ملازمت میں نے اس شرط پر قبول کی کہ اسے نہیں چھوڑونگا۔ دعویٰ ہے کہ انشاء پرداز بنتے بنتے کاروباری آدمی بن گیا، لیکن روز کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں اور روز کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کرتا ہوں جو کاروباری آدمی نہیں کیا کرتے۔ دعویٰ ہے کہ آدمیوں سے بھاگتا ہوں لیکن صبح سے شام تک آدمیوں میں گھرا رہتا ہوں۔

اپنے جاننے والوں کے تعجب کا جواب اس وقت تو میں اسی قدر دے سکتا ہوں کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ مجھ میں ان سب باتوں کے جراثیم ہیں۔ جراثیم نہ ہوتے تو انہیں اپنی زندگی کے موڑ ہی نہ کہتا جراثیم کے مضمحل ہونے کا نام میں نے موڑ رکھا ہے۔ مفصل جواب جب دونگا جب ان سب باتوں کو بالکل چھوڑ دونگا۔ وہ میری زندگی کا آخری موڑ ہوگا۔ اور آخری موڑ والا مضمون آخری مضمون ــــ لہٰذا فی الحال یہ سلسلہ یہیں ختم سمجھئے اور انتظار کیجیے کہ پانچواں

قیمتیں برابر گر رہی ہیں

دھوکے میں آکر

نقصان کا سودا مت کیجئے

پچھلے سال کے تجربے سے ظاہر ہے کہ سونے، جائداد، زمین اور اجناس میں روپیہ لگانا نقصان کا باعث ہوا قیمتیں گر گئیں اور ان چیزوں میں لگی ہوئی رقم صاف طور پر گھٹ گئی۔

وہ لوگ واقعی خوش قسمت رہے جنہوں نے سمجھداری سے کام لیکر اپنا روپیہ محفوظ مدوں میں لگایا تھا۔ ان کی بچت پہلے سے سوا ہوگئی۔ اوراب پہلے سے کہیں زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ ایک طرف ان سمجھدار لوگوں کی بچت اور دوسری طرف کنٹرول کی تدابیر اور صنعتی مال کی بڑھتی ہوئی پیداوار نے منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کو نیچا دکھا دیا۔ اور واقعی اپنے اور اپنے ملک کے ساتھ بڑی بھلائی کی۔

اس مفید کام کو جاری رکھئے۔ قیمتیں برابر گر رہی ہیں اور جب تک لوگ خرچ کم اور جمع زیادہ کریں اسی طرح گرتی رہیں گی۔ بہت سے لوگوں نے آزما کر دیکھ لیا کہ روپیہ کا مفید طور پر لگانا ہی سب سے اچھا ہے۔ ذیل کی مدوں میں سے ہر مد قطعاً محفوظ ہے:۔

امداد باہمی کی انجمنیں (کوآپریٹیو سوسائٹیز) بیمہ پالیسی (انشورنس) بنک کا جمع کھاتہ۔ ڈاک خانہ کا سیونگ بنک۔ سرکاری قرضے۔ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس۔

روپیہ بچائیے

اور سمجھداری سے لگائیے

کپڑے، فرنیچر، برتن بھانڈے، سائیکلیں، موٹر کاریں، اور ایسی دوسری چیزیں خرید کر روپیہ ضائع نہ کیجئے۔ یہ چیزیں آپ جنگ کے بعد اس سے کہیں سستے داموں پر خرید سکیں گے۔ آج کل آرام و آسائش کی چیزوں کے بغیر کام چلائیے۔ ذاتی اور قومی خوشحالی حاصل کرنے کی صحیح تدبیر یہی ہے۔

قوم کے لئے قومی جنگی محاذ کی اپیل

سیاست اور ہندستانی خواتین

(از محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ)

ہم پچھلے زمانہ کی خواتین کی بہادری اور جرأت کے کارنامے دیکھ کر مرعوب ہوتے ہیں۔ ان کی تعریف کے راگ گاتے ہیں۔ لیکن آج جو ہماری بہنیں سیاست میں حصہ لے رہی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش مصروف عمل ہیں، ان میں سے اکثر کے کام تو بڑی چیز ہیں، نام تک سے ہم واقف نہیں ہیں۔ اگر ترکی کی تعمیر میں خالدہ ادیب خانم یا چین کی سیاست میں میڈم چیانگ کائی شک کا حصہ ہے تو ہندستان کی آزادی کی تاریخ بھی جب لکھی جائیگی تو ہماری ان باہمت اور مصروف عمل بہنوں کا نام انشاء اللہ سنہرے حروف میں اس میں ہوگا۔

لیجئے! آج میں ان چند باہمت خواتین کے متعلق آپ کو بتاؤں جنہوں نے اپنے سچے جذبۂ عمل سے مردوں کی رہبری کی ہے۔ آپ اپنی ان باحوصلہ بہنوں کی مثال سامنے رکھکر کام کرسکتی ہیں۔ ان کے کاموں کو سنکر آپ محسوس کرلیں گی کہ خدا نے عورت کو بھی ایسا ہی دل، ایسا ہی دماغ دیا ہے جیسا مرد کو۔ وہ بھی اپنے دماغ سے کام لے سکتی ہے۔ سیاست کی گتھیوں کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھا سکتی ہے اس کا مشغلہ محض زیب و زینت نہیں ہے۔ قومی تنظیم اور ملکی اصلاح بھی ہے۔ اس کی دنیا گھر کی چاردیواری، آنگن اور باورچی خانہ تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس سے باہر بھی ہے۔ وہ اپنی دماغی صلاحیتوں کو اگر سمجھتی ہے اور اس کو صحیح تعلیم و تربیت، مناسب ماحول اور اچھی فضا ملتی ہے تو اس کا دماغ، اس کا جوش، اس کا خلوص، اس کا تدبر مردوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیتا ہے۔ میں ان چند ہندستانی خواتین کے کارناموں کو بیان کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہوں لیکن صرف فخر کرنا ہی کافی نہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک عورت اپنے فرائض کو سمجھ لے اور ملک کی حالت کا صحیح احساس اس کو ہو۔ جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا ہے یہ اس قدر اہم اور بکھرا ہوا ہے جس کا سمیٹنا اس تھوڑے وقت میں بالکل ناممکن تھا۔ جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے کوشش کی ہے کہ سیاست میں حصہ لینے والی ہر بہن کا ذکر کروں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ذاتی معلومات یا ایک دو اخباروں میں بکھرے ہوئے مضامین کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف ایسی نہ ملی جس سے مجھے اس میں امداد مل سکتی۔ اس لئے اس کو بھی

تشنۂ تکمیل سمجھئے۔ سب سے پہلے میں بیگم گاندھی

کستوری بائی گاندھی

کا ذکر کروں گی جو چند ہی مہینے ہوئے ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی ہیں۔ انکی پوری زندگی ہم عورتوں کے لئے سبق ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ ایک قومی رہنما کی رفیق حیات تھیں، بلکہ اس لئے بھی کہ خواتین میں کستوری بائی کا درجہ بہت بلند تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کستوری بائی نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے ان کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کیا جاتا۔ لیکن یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ کستوری بائی کی غمگساری اور وہ سچی ہمدردی اور رفاقت جو صرف ایک عورت ہی کرسکتی ہے ملک کے سب سے بڑے سیاسی رہنما کی ہر وقت مددگار رہی۔ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کے ساتھ ان کو بھی آغا خاں محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ جب گاندھی جی نے برت رکھا تو کستوری بائی انکی تیمارداری اور دیکھ بھال میں مصروف رہیں۔ ان کی صحت کچھ پہلے ہی اچھی نہ تھی اور اسیری کی ناخوشگوار فضا میں وہ دن بدن کمزور ہوتی گئیں۔ آخر اپریل میں فرشتہ اجل نے ان کو زندان بلا سے رہائی دی۔ ہم عورتوں کے لئے کستوری بائی کا انجام قابل فخر بھی ہے اور لائق رشک بھی۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہی ہے۔ پھر آزادی وطن کی خاطر کیوں نہ جان دی جائے۔

بی اماں

مولانا محمدؐ علی کی والدہ محترمہ ہیں۔ بی اماں مرحومہ کا سیاست میں حصہ لینا اور اپنے دونوں صاحبزادوں محمد علی اور شوکت علی کو تمام عمر استقلال و صبر سے قومی کاموں میں صرف کرنے کی ہدایت کرنا ایسا بڑا کارنامہ ہے جس پر مسلمان خاتون کو فخر کرنا ہی نہیں چاہیئے سبق لینا بھی چاہیئے۔

حیرت ہوتی ہے کہ یہ پردہ نشین خاتون کیسا باہمت دل لیکر آئی تھی۔ تمام عمر کلیجے کے ٹکڑوں کو انواع و اقسام کی تکالیف برداشت کرتے دیکھتی رہی لیکن صبر ہو تو ایسا ہو کہ لب پر اُف نہ آئی۔ آج مسلمان قوم کو بی اماں جیسی ماؤں کی ضرورت ہے جو اپنے نونہالوں کو قوم و ملک پر ہنس ہنس کر قربان کریں اور تیوری پر بل نہ آئے۔ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ستمبر ۱۹۲۳ء تک جب علی برادران حوالات اور جیل کے شدائد محض قوم پرستی کے جرم میں بھگت رہے تھے تو ایک غیر معروف مجہول الحال شاعر نے ایک نظم "صدائے خاتون" کے عنوان سے کہی تھی۔ شام کے وقت امین آباد کے چوراہے پر لکھنؤ میں اور دہلی میں چاندنی

پردہ رکھتی تھی۔ اور خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکل جاتی تھی۔ یہ بی اماں کے نام کا اثر تھا۔

انہوں نے خانہ کعبہ کا پردہ پکڑ کر دعا مانگی تھی " خدا! میرے لڑکوں کو اسلام کا خادم بنا " کتنی خلوص کے جذبے سے بھرپور دعا تھی۔ اس نیک مومنہ خاتون کی اس نے اپنے لڑکوں کے لئے جو اس کی بوڑھی کا سہارا تھے ملک و مال جاہ و حشم طلب نہیں کیا۔ قوم کی خدمت چاہی۔ یہ قوم کے خادم آج اپنے کاموں سے قوم کے سرتاج بن گئے۔

مبارک ہیں وہ مائیں جو بی اماں کے نقش قدم پر چلیں۔ اور اپنے لڑکوں کو قوم کا سرمایہ سمجھیں۔ قربانی، ایثار کے ان کو سبق دیں۔

بیگم محمد علی

مولانا محمد علی کی بیگم بھی اپنے نامور شوہر کے ساتھ سیاسی کاموں میں برابر حصہ لیتی رہیں۔ جب محمد علی جیل و اسیری کے سخت دائرے میں مبتلا تھے تو بیگم صاحبہ اس زمانہ کو نہایت صبر و سکون سے گزارتیں۔ بیگم محمد علی برقعے میں ملفوف ہر سفر میں ہر مجمع میں خلافت کانفرنس میں، کانگریس میں ہر وقت شوہر کے ساتھ رہتیں۔ اور بقدر ضرورت کارروائی میں حصہ بھی لیتی رہتیں جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ پردہ خواتین کے ادبی، سیاسی، اصلاحی و معاشرتی کاموں میں ہرگز حائل نہیں۔ اگر کوئی عورت کام کرنا چاہے اس کو مناسب ماحول نصیب ہو تو پردے میں رہ کر بھی سب قسم کے کام کرسکتی ہے۔ مولانا کے آخری سفر لندن میں بھی بیگم صاحبہ موصوفہ ان کے ہمراہ تھیں۔ ان کی وفات پر جو پورے ہندوستان کیلئے ہندوستانیوں کیلئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے ایک جانکاہ حادثہ تھی۔ بیگم صاحبہ نے اپنوں سے دور جس طرح صبر و استقلال کا ثبوت دیا وہ ان کا ہی حصہ تھا اپنے کرم شوہر کے بعد بھی بیگم صاحبہ سیاسی کاموں میں برابر حصہ لیتی رہتی ہیں۔ تین سال سے وہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی سرگرم کارکن ہیں۔ اس سے ان کی بیدار مغزی و اصابت رائے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مسز کملا نہرو

کملا جی جواہر لال نہرو مشہور سیاسی لیڈر کی بیوی تھیں۔ کملا نہرو دو مرتبہ جیل گئیں۔ پہلی مرتبہ ۲ سال ان کے نازک جسم نے جیل کی تکالیف برداشت کیں۔ دوسری مرتبہ ۲ یا ۳ مہینے بعد ہی بیماری کے باعث ان کو چھوڑ دیا گیا۔ کملا جی کی مختصر زندگی اور عالم شباب ہی میں وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوگئیں۔

مسز وجیا لکشمی پنڈت

سروپ کماری نہرو یا وجیا لکشمی پنڈت ۱۸ اگست سنہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئیں۔ اور گھر پر ہی تعلیم پائی۔ ان کا تعلق براہ راست کانگریس سے ہے۔ اس کے عملی کاموں میں وہ بیش از بیش حصہ لیتی رہتی ہیں سنہ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے سول نافرمانی کی اور ایک سال قید سخت کی شدائد بھی بھگتیں اور پانچسو روپے جرمانہ بھی دیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں وہ الہ آباد میونسپل بورڈ میں کامیاب ہوئیں۔ پھر تعلیمی کمیٹی کی چیئرمین ہوئیں۔ جہاں دو برس انہوں نے کام کیا۔ انہوں نے رات کے سکولوں کو ان پڑھے لوگوں کیلئے بنانے کی خاص جدوجہد کی۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں وہ الیکشن میں لیڈی سری واستوا کے خلاف کامیاب ہوئیں اور پھر لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر ہوئیں۔ ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں ستیہ گرہ کیا اور چار مہینے کیلئے جیل بھیجدی گئیں۔ پھر سنہ ۱۹۴۲ء میں گرفتار کرلی گئیں۔ مگر جلد ہی صحت کی خرابی کے باعث چھوڑ دی گئیں۔

مسز وجے لکشمی پنڈت نے سیاسی اور اصلاحی کاموں کے باوجود اپنے ان گھریلو فرائض کو نہیں بھلایا ہے جو ہر عورت کیلئے لازمی ہیں۔ اور نہ اپنی نسوانی خوبیوں کو کھویا ہے۔ وہ ایک بہترین عورت ہیں۔ اور ہندوستان کی سوشل صدی کی بے مثال کارکن۔ آج کل وہ بنگال کے قحط زدہ باشندگان کیلئے امداد کرنے کی حالت بہتر بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

مسز سروجنی نائیڈو

آج دنیا کے ہر مہذب ملک میں مسز سروجنی نائیڈو کی مستقل عزت و شہرت ہندوستان کیلئے طرۂ امتیاز کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ صرف ایک شعلہ نفس شاعرہ ہی نہیں ہیں۔ ملکی سیاسیات میں بھی ان کا زبردست حصہ ہے۔ انکی ادبی خدمات سے ان کی سیاسی خدمات کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جنگ عظیم کے زمانے ہی سے سروجنی دیوی ملکی سیاسیات میں حصہ لے رہی ہیں۔ ان کے سیاسی کاموں کی ابتدا سنہ ۱۹۱۶ء سے ہوئی۔ اسکے بعد انہوں نے تمام ملک کا دورہ کرکے اپنی شعلہ نشانیوں سے عوام کے دلوں کو گرما دیا۔ بیداری کا ایک عام ولولہ لوگوں کے دلوں میں جاگا۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے آخر میں کلکتہ کانگریس میں سروجنی دیوی نے حکومت خود اختیاری کے ریزولیوشن کی تائید کی۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں کانجی ورم میں صوبہ کانفرنس کے صدارت کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔ ستمبر سنہ ۱۹۱۸ء میں بمبئی کی سپیشل کانگریس میں عورتوں کی رائے دہی کے حقوق کا ریزولیوشن دوبارہ پیش کیا۔ اور دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء

میں آل انڈیا سوشل سروس کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ تحریک ترک موالات کے شروع ہوتے ہی مسز سروجنی نائیڈو کی سیاسی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں وہ ہمہ تن مصروف ہوگئیں ۱۹۲۴ء میں مسز سروجنی نائیڈو جنوبی افریقہ تشریف لے گئیں۔ تحمل نیشے کے بعد ہندوستانیوں کی حالت کا اندازہ کیا اور کوکناڈا کانگریس کی صدارت فرمائی۔

امریکہ کی مشہور قوم پرست مس میو نے اپنی کتاب "مدر انڈیا" شائع کرکے جب ہندوستان کے اخلاق و تہذیب، سیاست و تمدن، مذہب کو بدنام کرنے کی کوشش کی تو ہندوستان کی جانب سے سفیر بن کر آپ امریکہ گئیں تاکہ اس بے بنیاد اور لغو پروپیگنڈے کی تردید کردیں۔

۱۹۳۱ء میں تحریک نمک کے سلسلے میں گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد آپ بھی گرفتار ہوگئیں اور "بغاوت گلشن" کے سلسلے میں اس بلبل خوش الحان نے چھ ماہ "زندانِ قفس" کے مصائب برداشت کئے۔ رہائی کے بعد پھر سروجنی دیوی نے اپنی ذات کو قوم کی راہ میں ستیہ گرہ کیلئے پیش کیا۔ گاندھی اروِن پیکٹ کے وقت گاندھی جی کی شریک مشورہ رہیں۔ ۲۹ اگست کو دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں گاندھی جی کے ہمراہ انگلستان گئیں اور وہاں اپنے تدبر و سیاست دانی سے مدبرین یورپ کو بھی چکرا دیا۔ واپسی پر آپ بھی دوسرے محبانِ وطن کے ہمراہ پھر اسیرِ زندانِ بلا ہوگئیں۔ مگر اس بلبلِ لالہ نفس کی نغمہ سنجیوں نے زندان کو بھی گلستان بنا دیا۔ ۱۹۳۳ء میں جیل سے رہائی ملی تو پھر سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگیں۔

سروجنی دیوی کے تدبر اور سیاست دانی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ قومی پارلیمنٹ (آل انڈیا نیشنل کانگریس ورکنگ کمیٹی) کی رکن بنیں۔ ۱۹۴۲ء میں ۹ اگست کو مسز سروجنی نائیڈو کو بھی اور ورکنگ کمیٹی کانگریس کے ممبران کے ہمراہ زیر حراست لے لیا گیا تھا اور گاندھی جی کے ہمراہ ان کو بھی رکھا گیا تھا۔ لیکن بیماری کے باعث ان کو تین مہینے بعد ہی چھوڑ دیا گیا۔ چھوٹنے کے بعد انہوں نے ایک لمحے کیلئے بھی قومی و ملکی مصائب کو نظر انداز نہیں کیا۔ باوجود زبان بندی کے ہر طرح ملکی معاملات سدھارنے کی کوشش کی۔ موجودہ سیاسی حالات کو ہموار کرنے میں مسز سروجنی نائیڈو کا بہت بڑا حصہ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ملک کے سب سے بڑے سیاسی مدبر اور قومی کارکن گاندھی جی کی رہائی مسز سروجنی نائیڈو کی بے لاگ کوششوں اور آزاد بیانات کا نتیجہ ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو قومی سرت و استقلال حب الوطن۔ نیک نیتی، اخلاص و محبت و شرافت کا ایک ایسا دلکش سنگم اپنی ذات میں رکھتی ہیں۔ کہ ہم عورتیں جتنا ان پر فخر کرسکیں تھوڑا ہے۔

مسز ارونا آصف علی

نازک اندام ارونا آصف علی کو قدرت نے ایسا باعزم دل دیا ہے اور ان کے سیاسی و اصلاحی کارناموں کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ

سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لئے

۱۹۳۱ء سے اُنہوں نے سیاسی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی وہ پُرجوش کارکن ہیں ۱۹۳۸ء میں کل ہند خواتین کانفرنس جب دہلی میں ہوئی تو مسز آصف علی استقبالیہ کمیٹی کی سکریٹری تھیں۔ جس طرح اس کانفرنس کا انتظام اُنہوں نے کیا اور اسکو کامیاب بنانے کی کوشش کی یہ ہم عورتوں کے سیکھنے کی چیز ہے۔ غالباً پانچ سال دہلی ویمنز لیگ کی سکریٹری رہیں اور اسمبلی میں خلع بل پاس کرنے کا ریزولیوشن انہوں نے پاس کردیا ۱۹۳۹ء میں ایک سیاسی تقریر کرنے کی وجہ سے اُن کو گرفتار کرلیا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد رہا ہوئیں۔ ۱۹۴۲ء ۹ اگست کو اُن کے لئے بھی وارنٹ گرفتاری حکومت نے جاری کردیا لیکن مسز آصف علی اس مرتبہ کچھ ایسی لشکروں سے پوشیدہ ہیں کہ ان کا ابھی تک پتہ نہ چل سکا۔ جہاں کہیں بھی یہ ہماری بہن ہوں خدا بخیر رکھے۔

ایسی باہمت خواتین کی ملک کو ضرورت ہے۔ دہلی میں ہر اصلاحی سیاسی تحریک بھی جس کا تعلق خواتین سے ہوتا ہے، اکثر اس کی محرک مسز آصف علی ہوتی ہیں

رشیدہ باجی

پنجاب کی مشہور سیاسی کارکن خواتین میں سے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ برقعے سے سب کام کرتی ہیں۔ اسمبلی میں ان کی دھواں دھار تقریریں اکثر بڑے بڑے مردوں کو بھی لاجواب کردیتی ہیں۔ پنجاب اسمبلی کی ممبر ہیں۔

بیگم شاہ نواز

سر محمد شفیع کی صاحبزادی اور میاں شاہ نواز بار ایٹ لا کی بیگم صاحبہ ہیں۔ قومی و ملکی کاموں میں بہت دنوں سے حصہ لے رہی ہیں۔ ان کی سیاسی قابلیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دو مرتبہ جنیوا کانفرنس میں ہندوستانی خواتین کی جانب سے نمائندہ بن کر گئیں۔

بیگم زبیدہ رحمان

آسام کونسل کی نائب صدر ہیں۔ آسام مسلم لیگ کی پرجوش ممبران کی

متاثر کن تقاریر عملی جذبے کو دلوں میں اُبھار دیتی ہیں۔ ان کی اصلاحی اور قومی خدمات کی تمام آسام میں دھوم ہے۔

لڈّو رانی

اس دلیر خاتون کی داستان بجائے خود عورت کے لئے سبق ہے سولہ سال کی الہڑ عمر میں اس کو انقلاب پسند خیالات کی وجہ سے جیل میں بند کر دیا گیا ہے اور پندرہ سال سے شدائد زنداں بھگت رہی ہے۔ لیکن نہ تیوری پہ بل ہے نہ استقلال میں فرق۔ حکومت کی بزدلی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک الہڑ کمسن لڑکی کی باغیانہ سپرٹ سے ڈر کر اس کو قید کر دیا۔ یہ فخر آسام کو حاصل ہے کہ اس میں ایک ایسی دلیر خاتون ہے ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

ستیہ وتی دیوی

دہلی کی مشہور کانگریسی ورکر ہیں۔ کئی مرتبہ جیل جا چکی ہیں شعلہ بیان مقررہ ہیں۔ اب بھی اور کانگریسی لوگوں کے ساتھ ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ بدنصیب لیکن بہادر ستیہ وتی نے اس قید خانہ میں اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی کھو دیا ہے۔ خود بھی دق کے نامراد مرض میں مبتلا ہیں۔ لیکن آفرین ہے اس خاتون پر کہ اس عالم میں بھی خدمت قوم کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ زندگی بیشک ان کی ہے۔ اور یہ قوم کے لئے اصلی زندگی ہے۔

ڈاکٹر سوشیلا نائر

سیاسی کاموں میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔ گاندھی جی کی علالت اور برت کے زمانے میں ان کی تیمارداری ڈاکٹر سوشیلا ہی کرتی ہیں۔

چاند بی بی

دہلی مزدور یونین کی صدر ہیں۔ مزدوروں کیلئے اصلاحات کرنے میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔

بیگم اعزاز رسول

نواب ذوالفقار علی خاں کی بڑی صاحبزادی اور نواب اعزاز رسول کی بیگم ہیں۔ مسلم لیگ کی سرگرم کارکن اور کل ہند مسلم لیگ خواتین یو۔پی شاخ کی سکریٹری اور یو۔پی کونسل کی نائب صدر ہیں۔ یو۔پی میں خواتین کی اصلاحات کے لئے جو تحریکیں ہوتی ہیں ان میں سے اکثر بیگم اعزاز رسول کی ہوتی ہیں۔ بہت اچھی مقررہ اور صاحب الرائے خاتون ہیں۔

سکینہ بیگم (مویّد زادہ)

آقائے ملت مولانا مویّد الاسلام ایڈیٹر اخبار "حبل المتین" کی منجھلی صاحبزادی فرخ سلطان سکینہ بیگم مشہور سیاسی کارکن خاتون ہیں۔ کلکتہ کارپوریشن کی کئی سال سے ممبر ہیں۔ قومی و ملکی اصلاحی تحریکوں میں ہمیشہ حصہ لیتی رہتی ہیں۔ کامیاب وکیل بھی ہیں۔ اور شعلہ بیان مقررہ بھی۔ ۱۹۴۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کے دوسرے کارکن ممبران کے ہمراہ جیل گئی تھیں۔ لیکن خرابی صحت کے باعث ان کو جلد ہی چھوڑ دیا گیا۔ کلکتہ خاکروب یونین کی صدر ہیں۔ پچھلے سال اپنے وطن ایران گئی تھیں۔ وہاں کے سیاسی حالات خصوصاً ایران و روس کے خوشگوار تعلقات پر انہوں نے کلکتہ میں خواتین کے ایک جلسہ میں متاثر کن تقریر کی۔

رینو چکرورتی

کل ہند خواتین کانفرنس کی مجلس عاملہ کی ممبر ہیں۔ اصلاحی کاموں میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔ ہندو عورتوں کے مسئلے کو طے کرنے کیلئے انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ اسمبلی میں جو تجویز "ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا" کے خلاف کی گئی تھی اس کی رینو نے تائید کی۔ اور حکومت کی اس بات پر مذمت کی کہ اس نے زیر زمین کام کرنے کیلئے عورتوں کو ملازم رکھنے کی اجازت دیدی ہے۔ بنگال اسمبلی میں آپ نے اس بل کی پرزور حمایت کی جس کے ذریعے سے کنگال عورتوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔

میرن رامیش چندرا

کرنل بروچہ کی صاحبزادی ہیں۔ غالباً دو سال قبل مشہور کمیونسٹ کارکن رامیش چندرا سے انہوں نے شادی کی۔ ۱۹۳۹ء سے جب وہ ایم۔اے کلاس کی طالبہ تھیں پنجاب کے طلبا کی جماعت میں کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سکریٹری ہوئیں۔ ۱۹۴۲ء تک وہ طلبا کے لئے سیاسی اور تنظیمی کام کرتی رہیں۔ ۱۹۴۳ء کے آخر سے پنجاب کی سیاست میں انہوں نے انہوں نے حصہ لینا شروع کیا اور پنجاب کی کسان عورتوں کی تنظیم میں سب سے قبل شرکت کی۔ اب وہ عام سیاسی کاموں میں حصہ لے رہی ہیں۔ سیاسی

کاموں میں حصہ لینے کے علاوہ موجودہ غذائی مشکلات کے سلسلے میں امدادی کمیٹیاں تمام پنجابی اضلاع میں بنانے کا سہرا بیرمنی کے سر ہے۔

سرلا گپتا

سرلا گپتا اور ان کے ان تھک کاموں کو دیکھکر میں حیران ہوں۔ یہ دبلے پتلے جسم والی لڑکی آہنی عزم کی مالک ہے۔ وہی کمیونسٹ پارٹی کی مشہور کارکن ہیں۔ کالج کے زمانے سے سرلا نے طلبا کی تنظیم میں حصہ لینا شروع کیا اور سٹوڈنٹ فیڈریشن دہلی کی سرگرم کارکن رہیں۔ کالج چھوڑنے کے بعد وہ عام سیاسی تحریکات میں حصہ لے رہی ہیں۔

جب سے بنگال قحط کی وبا میں مبتلا ہوا ہے، سرلا نے بنگال کی اس مصیبت کو دور کرنے اور خواتین کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ان تھک کوشش کی ہے۔ چھ مہینے قبل بنگال کی دردناک حالت تصویروں کے ذریعے سے نمائش کرکے ڈرامہ کرکے پردہ نشین خواتین کو سرلا گپتا نے بتائی اور گھر گھر پھر کر بنگال کی مصیبت زدہ خواتین کیلئے روپیہ کپڑے جمع کرکے بھیجے۔ موجودہ راشننگ سکیم سے کئی مہینے قبل سرلا نے ہر محلہ میں کمیٹی بنائی۔ جگہ جگہ جلسے کرکے عورتوں کو اس مشکل کے وقت پریشان ہونے کے بجائے اطمینان سے کام کرنے کی ہمت دلائی "راشننگ سکیم" کا مطلب گھبرائی ہوئی پردہ نشین عورتوں کو سمجھایا اور حکومت سے غذائی مشکلات کے سلسلے میں ہر ممکن آسانی کرنے کی درخواست کی۔ سرلا کے کام اتنے لاانتہا ہیں کہ وقت کی قلت اور کاغذ کا کنٹرول ان کے لکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

مس جنک زتشی

اب سے دس سال قبل سیاسی کاموں میں بہت حصہ لیتی تھیں۔ تین مرتبہ جیل جا چکی ہیں۔ اب علمی مصروفیت کی وجہ سے سیاسی میدان چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اپنی بہنوں کی اصلاح کے لئے اب بھی کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔

ہاجرہ بیگم

کمیونسٹ پارٹی کی مشہور کارکن خاتون ہیں۔ عورتوں کی تنظیم اور اصلاح میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔ بنگال کی انجمن نسواں کی جس میں تینتالیس ہزار محب وطن بنگالی خواتین نے شرکت کی تھی صدارت ہاجرہ بیگم نے ہی کی۔ آپ کا رشتہ ... "بنگال" کی نمائش کرکے بنگال کے قحط زدہ لوگوں کیلئے امداد بہم پہنچانے میں مصروف ہیں۔

کملا چیٹرجی

ایم اے میں جب تعلیم حاصل کر رہی تھیں تو بنگال کی مشہور انقلابی پارٹی "جگانتر" کی ممبر ہو گئی تھیں عرصہ تک ان کا اس پارٹی سے تعلق رہا۔ چھ سال جیل میں رہنے کے بعد سنہ ۱۹۳۸ء میں جیل سے رہا ہوئیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء تک وہ بنگال کی طالبات کی صوبائی فیڈریشن کی مجلس عاملہ کی ممبر رہیں۔ اسکے بعد اس سے علیحدگی اختیار کرکے عام سیاسی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا۔ پچھلے سال سے بنگال کے ہولناک قحط کی تباہ کاریوں کو کملا کی ان تھک کوششیں بہت کچھ کم کر رہی ہیں۔

کنک مکرجی

جب ایف اے کی طالب علم تھیں جب سے انہوں نے بنگال کے طلبا کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا اور طالبات کو صوبائی سٹوڈنٹ فیڈریشن کے ماتحت منظم کیا۔ کلکتہ کی طالبات میں کملا چیٹرجی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت جانفشانی سے کام کیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں کنک کے گھر کی تلاشی لی گئی اور پولیس نے انکو زیر حراست کر لیا۔ لیکن پندرہ روز بعد ہی کنک کو رہا کر دیا گیا۔ اسکے چند روز بعد حکومت بنگال نے انکو کلکتہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ تین سال تک وہ شہر بہ شہر پھرتی رہیں اور بے خانماں کنک کو جب بھی وہ چند روز قیام کرتی تھیں پولیس تنگ کرکے جگہ تبدیل کرنے پر مجبور کرتی تھی لیکن کنک نے اس صبر آزما وقت پر حوصلہ نہ چھوڑا اور اپنے کاموں میں مصروف رہیں۔ آج کل بھوک کے بیمار اور دم توڑتے ہوئے انسانوں کی زندگیاں بچانے میں کنک مصروف ہیں۔ جب غذا کی قیمت بڑھ جانیکی وجہ سے بنگال میں گھروں کے چولہے بجھ گئے اور حکومت نے اسکی ذرہ برابر پرواہ نہ کی تو کنک مکرجی اور کملا چیٹرجی نے اپنے جوش عمل سے بنگال کو ہلا ڈالا۔ غلہ کی سرکاری دوکانوں پر کڑی دھوپ میں گھنٹوں کھڑے رہکر خریداروں کی قطاروں کا انتظام کیا۔ جب قحط پھیلا تو سب سے پہلے انہوں نے فاقہ کش دم توڑتی ہوئی ماؤں اور بھوک سے جان دیتے ہوئے بچوں کو اپنے دامن حفاظت میں لیا۔ انہوں نے نسوانی غذائی کمیٹی بنائی۔ قحط کے ہاتھوں تباہ شدہ گھر اور خانماں برباد لوگوں کی رہائش کا انتظام کیا۔

ان بہنوں کے کاموں کو دیکھکر کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی عورت بے عمل ہے، تعیش پسند ہے۔ اور وہ صرف مسند عیش کی زینت ہے۔ ہماری ان بہنوں نے ہر طرح ثابت کر دیا کہ عورت پھولوں سے نہیں کانٹوں سے بھی کھیل سکتی ہے۔ وہ مجسم محبت ہے، وہ قوم کی بہبود کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ مبارک ہیں وہ ہماری بہنیں جنہوں نے اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھ لیا ہے۔ بنگال کے مصائب کم کرنے میں ہماری کمیونسٹ بہنوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے ان میں سے اکثر نے اپنی صحت قحط و ... کے خلاف جد و جہد کرنے میں تباہ کر ڈالی ہے لیکن عورت کا فرض زندگیاں بچانا اور ...

(گذشتہ سے پیوستہ)

جاسوس عورتیں

قسط دوم

(از نصیح الدین احمد)

روپیہ ختم ہو جانے پر نوجوان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن وہ بڑی جانباز لڑکی تھی اور اُسے اپنی خوبصورتی پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ یوکرین کے محکمۂ تعلیم کے ایک بڑے افسر کے ہاں بحیثیت سکریٹری ملازم ہوگئی۔ اور تھوڑے دن بعد اُس سے شادی کر لی۔ اس طرح وہ روسی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کی رکن بن گئی۔ اور زندگی آرام سے بسر ہونے لگی۔ وہ اچھے کپڑے پہنتی اور یورپ کی آبشاروں میں خوب دادِ عشرت دیتی تھی۔ اس زمانہ میں جب اسکی عمر تیس سال کی تھی اس کی ملاقات ایک روسی جرنیل سے ہوئی جسکی عمر ترسٹھ سال تھی۔ کیتھرین نے اُس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ آخر کار جرنیل اُس سے شادی کرنے پر رضا مند ہوگیا۔ چنانچہ اُس نے کچھ دن جرنل کے ساتھ تعلق رکھنے کے بعد پہلے شوہر سے طلاق حاصل کر لی۔

جس جرنیل سے کیتھرین نے شادی کی تھی یہ وہی روسی وزیر تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہیں اس کی ملاقات پولینڈ کے سرحد کے چنگی کے ایک افسر سے ہوئی جو شخص نہایت حسین تھا۔ اور نوجوان عورتوں کی محبت جیتنے میں بہت طاق تھا۔ اُس کو فضول خرچی کی عادت تھی۔ اس لئے پوشیدہ طور پر بہت سا مال بغیر چنگی کا محصول وصول کئے سرحد کے پار گزار دیتا تھا۔ روسی معزز عورتیں جب فرانس، آسٹریا اور جرمنی سے تکس واپس لوٹتی تھیں تو ان کو روسی سرحد پر اپنے سامان کی تلاشی دینی ہوتی تھی۔ ان میں سے بہت سی عورتیں بیش قیمت لباس اور دیگر قیمتی چیزیں جن پر بہت زیادہ محصول تھا سرحد کے پار مفت سے جانا چاہتی تھیں۔ چنگی کا افسر ایک روسی کیپٹن تھا۔ جو ایسی عورتوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کرتا تھا جو اس کو قابلِ حصول نظر آتی تھیں۔ بہت سی ممتاز عورتیں سرکاری چنگی سے بچنے کے لئے کیپٹن کو اپنے جسم کا نذرانہ پیش کرتی تھیں۔ کیپٹن چونکہ ایک بہت حسین آدمی تھا اس لئے عورتیں بخوشی خود کو اُس کے حوالہ کر دیتی تھیں۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسے ہی موقعہ پر اس روسی کیپٹن اور کیتھرین کی ملاقات ہوئی جس نے رفتہ رفتہ محبت کی صورت اختیار کر لی۔

جب جنگ شروع ہوئی تو اس روسی کیپٹن نے روپوں کے لالچ میں جرمن مخبر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ اور روسی وزیر جنگ کی بیوی کے ذریعہ اہم فوجی راز معلوم کر کے بعد جرمنی کو بھیجا کرتا تھا۔ اور قیصر نے اس کی خدمات کے صلہ میں اُسے تمام پولینڈ کے جاسوسوں کا سرغنہ بنا دیا تھا۔

(۳) ایما اسٹوبرڈ

یہ عورت ایک مکمل جاسوس تھی۔ اس کا وطن وائنا تھا۔ اور دوران جنگ میں اس نے اتحادیوں کی ملازمت اختیار کی۔ برطانوی محکمہ جاسوسی سے اس کو بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں جس کی بدولت یہ شاہانہ زندگی بسر کرتی تھی اور وائنا کے فوجی اور سول افسروں کی جاسوسی کرنا اس کا کام تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں سوئٹزرلینڈ کا ایک دوا فروش جرمنی کا جاسوس تھا۔ ایما اسٹوبرڈ نے اُسے اپنے دامِ محبت میں ایسا گرفتار کیا کہ سچ مچ اُس کا سر پھر گیا اور وہ اُس کے ہمراہ حدود فرانس میں جا پہنچا جہاں اُسے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ فرانسیسی پولیس نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اور انہیں ڈرایا کہ دونوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائیگا۔ دوا فروش اقبالِ جرم کیلئے تیار نہ تھا لیکن ایما اسٹوبرڈ نے ایک خوفزدہ عورت کا پارٹ بڑی خوبی سے انجام دیا اور رو رو کر بے حال ہوگئی۔ یہاں تک کہ اُس کے سینے سے لپٹ کر اقبالِ جرم پر اُسے آمادہ کر لیا۔ فرانسیسی گورنمنٹ کو اسی اقبالِ جرم کا انتظار تھا۔ اور اس کے بعد دوا فروش کو گولی مار دی گئی۔ اس روتی ہوئی خوبصورت عورت نے دوا فروش کو اقبالِ جرم کے لئے رضا مند کر کے اپنی صنفی جاذبیت کا شکار بنا لیا۔

ایک دفعہ اس کو یہ ہدایت کی گئی کہ جرمن فوج کو کس طریقے سے فوجی احکامات بھیجے جاتے ہیں۔ اسے کسی طرح معلوم کیا جائے۔ ایما نے سوگ کے کپڑے پہن لئے اور محاذِ جنگ پر ایک بیوہ کے روپ میں اپنے مُردہ خاوند کی لاش تلاش کرنے کے لئے جا پہنچی۔ وہاں اتفاقیہ طور پر جرمنی کے گرینڈ ڈیوک سے ملاقات ہوگئی۔ جس نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اپنے آپ کو مرحوم کی جگہ پیش کیا۔ گرینڈ ڈیوک کو ایک خاص قسم کی عورتوں سے بہت دلچسپی تھی۔ یعنی وہ عورتیں جنکے بشرے سے ہوس ٹپکتی تھی۔ ایما بھی ایک ایسی ہی عورت تھی۔ چنانچہ گرینڈ ڈیوک کی ہر خواہش کو اس خوبی سے اُس نے پورا کیا کہ ڈیوک نے بھی اس کی کسی خواہش کو کبھی رد نہیں کیا۔ اور یہ متواتر نہایت خفیہ راز معلوم کر کے اپنے محکمہ جاسوسی کو بھیجتی رہی۔

ایک دفعہ کوپن ہیگن میں اس کی ایک جرمن افسر سے ملاقات ہوئی جب یہ واقعی ہزار جان سے فریفتہ ہوگئی اور اس نے اپنے محکمہ کے صدر دفتر میں پہنچ کر نوٹوں کا بنڈل میز پر پھینک دیا اور افسروں کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ اپنے نئے

محبوب کے خلاف غداری کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں۔

(۴) سو لینج

اس لڑکی کی سوانح حیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سچ جھوٹ کی نسبت زیادہ عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یہ غریب مگر معزز فرانسیسی خاندان میں پیدا ہوئی۔ یہ بہت حسین اور خوش خلق تھی۔ شروع میں نرس کی حیثیت سے اس نے بیماروں کی خدمت انجام دی جس میں انتہائی عقد اور نرمی سے کام لیا۔ اس کی وطن پرستی، اس کی پیدائش اور اس کے رویہ کی بدولت تمام شبہات سے بالاتر تھی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد وہ ان کے سرہانے اطمینان سے بیٹھ جاتی تھی اور نہایت صبر و سکون کے ساتھ اُن کی جنگ کی کہانیاں سنا کرتی تھی۔ اس کے ظاہرہ اطوار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت پر دل و جان سے نثار ہونے کے لئے تیار ہے اور دیوار پر لٹکے ہوئے فرانس کے نقشہ کو وہ اس طرح گھور کر دیکھتی تھی جیسے کوئی جرنل جنگ کا نقشہ تیار کر رہا ہو۔ اس کو یہ دلچسپی فوجی نقل و حرکت میں دو فرانسیسی افسروں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی جو توپ خانے کے ڈویژن میں ملازم تھے اور ان میں سے ہر شخص کو یہی گمان تھا کہ اس حسین ساحرہ کے نرم گداز جسم کا وہ تنہا مالک ہے۔ سو لینج بھی انہیں باری باری اپنے کمرہ میں بلایا کرتی تھی اور ان ملاقاتوں میں خوب جی کھول کر داد عشرت دینا اس کا نصب العین بن گیا تھا۔ وہ اپنے محبوب اور اسکی رجمنٹ کی نقل و حرکت کے معلوم کرنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ اور حُسن فروشی کے عوض میں جو معلومات حاصل کی جاتی تھیں اُس کو روپیہ کے معاوضہ میں جرمن افسروں کے ہاتھ بیچ دیتی تھی۔ اُس کی گرفتاری کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ فی الحقیقت ایک جرمن زنانہ ساز کی آلہ کار بنی ہوئی تھی جس نے اُس پر مسمریزم کے ذریعہ پورا قبضہ حاصل کر رکھا تھا۔ اس طرح جاسوس لڑکی سے اپنی ہر بات منوایا کرتا تھا اور اس کے ہر فعل کا ذمہ دار تھا۔ جب مسمریزم کا اثر زائل ہوچکا اور اس لڑکی کو یہ معلوم ہوا کہ وہ بازاری عورتوں کی طرح حُسن فروشی کرکے اپنے ملک کے جنگ کے رازوں کا پتہ لگا کر اُن کو دشمن کے حوالے کر دیتی ہے تو اُس نے زہر کھا لیا۔

(۵) میڈیم الیف

اُن بہت سی حسین عورتوں میں جنہوں نے گذشتہ جنگ عظیم میں جاسوسی خدمات انجام دیں، ایک حسین عورت اور بھی تھی جس کا نام جاسوس عورتوں کی تاریخ میں میڈیم الیف مشہور ہوگیا۔ اس کا قد دراز، چہرہ کھلتا ہوا، آنکھیں نیلگوں، سیاہ چمکتے ہوئے بال تھے۔ اور بظاہر معصومیت کا مجسمہ تھی لیکن جنہوں نے اسے ملازم رکھا اُنہوں نے یہ بات پہلے دیکھ لی تھی کہ اُس میں جنسی کشش بدرجہ اتم موجود تھی چنانچہ ایک نہایت اہم اور مشکل کام اُس کے سپرد کردیا۔ ایک سوئٹزرلینڈ کا باشندہ جس کا نام پروفیسر ارلڈ تھا ایک نہایت خاموش زندگی ایک دور افتادہ ہوٹل میں بسر کر رہا تھا۔ برطانوی محکمہ جاسوسی میں اس پروفیسر سے دلچسپی لینی شروع کی اور اُس کے مشاغل دریافت کرنے کے درپے ہوگئے۔ اور اس کام کے لئے میڈیم الیف کو تیار کیا گیا۔ بظاہر یہ شخص عورتوں کی عشوہ گری سے بالکل غیر متاثر نظر آتا تھا اور خیال تھا کہ دنیا کی حسین ترین عورت بھی اسکی رگوں میں کوئی حرارت پیدا نہیں کرسکتی۔ لیکن بڑی جعلسازی، عقلمندی اور مکاری کے ساتھ اس عورت نے اس کے جذبات خفتہ کو بیدار کرنا شروع کیا۔ اور جب وہ وصل کا خواہشمند نظر آنے لگا تو بہت سے حیلے بہانے کرکے ٹالتی رہی اور بالآخر جب اُسے یقین ہوگیا کہ پروفیسر اُس کے عشق میں دیوانہ ہوچکا ہے تو ایفائے وعدہ پر راضی ہوگئی۔

لیکن نہایت نازک لمحات میں اُس نے پروفیسر کو اپنے آغوش سے جدا کرکے دوسرے کمرہ سے ایک خاص قسم کی عطر کی شیشی لانے کیلئے بھیج دیا اور ان فرصت کے لمحات میں اُس نے کمرہ کی تلاشی لینی شروع کردی۔ بدقسمتی سے پروفیسر کا سکریٹری جو اُسی کمرہ میں پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا باہر نکل آیا۔ میڈیم الیف بوکھلا گئی اور سراسیمگی کی حالت میں بھاگ نکلی۔

لیکن اس فروگذاشت کے عوض اس نے ایک ایسا زبردست کام انجام دیا جس کی بدولت کہا جاتا ہے کہ برطانوی جنگی بیڑے کو جنگ جٹ لینڈ میں کامیابی حاصل ہوئی۔ کس طرح اُسنے ایک جرمن کروزر کے کمانڈر کو اپنا شکار بنا لیا اور جس وقت وہ جہاز پر اپنے فرائض انجام دیتا اس وقت بھی وہ اس کے ہمراہ رہنے لگی۔ اُس نے بہانہ یہ گڑھا کہ وہ اس کے کیپٹن کو اپنے آغوش کی لذت کی یاد سے اور اپنے معطر جسم کی خوشبوؤں سے ایسا بنا دینا چاہتی تھی جو کبھی اسکی یاد سے فراموش نہ ہوسکے۔ یہ بیمار محبت اس ساحرہ کو اپنے کمرے میں لے گیا اور جس وقت تختۂ جہاز پر اپنے عملہ کو ضروری احکامات دے رہا تھا اُس وقت اُس عیارہ نے اس کے بیگ سے ایک چھوٹی سی زرد رنگ کی کتاب نکال لی جس میں جرمن بیڑے کا خفیہ پیام رسانی کا حل موجود تھا۔

(باقی آئندہ)

(از جناب سید محمد حجازی)

بُہتان

(مترجمہ جناب شہزادہ احمد علی خاں صاحب درانی)

ملا نی پہاڑیوں کا ایک بہت اونچا پربت! اتنا اونچا، اتنا بھیانک، جسے دیکھ کر فرشتوں کا بھی پتہ پانی ہو جائے۔ اتنا گھناؤنا! کہ آسمان والے ایک نظر بھی نہ ڈال سکیں! اس کے نیچے ایک بہت چوڑا، بہت گہرا غار جس میں سے مُردوں کے دھوئیں جیسا بدبودار سیلن جسموں کی سڑاند اٹھ رہی ہے جو اہرمن کے جال میں پھنس کر جل رہے ہیں۔ اور اس دھند کار میں بن آنکھ کے کلبلاتے جانور اپنے بس بھرے دانتوں سے ان کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں، اوپر سے سانپ بچھولیں۔ کنکھجوروں اور بچھوؤں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور نیچے خون اور چربی کی ایک بدبودار گھناؤنی ندی یوں بہہ رہی ہے جیسے کوئی سہما ہوا اژدہا بل کھاتا چلا جا رہا ہو۔ یہیں سے اہرمن کے گھر کو راستہ جا نکلتا ہے۔

جلے بھنے لوگوں کی چیخ پکار، ان کی فریادیں، ان کے نوحے اور بین مندوں کی سہما دینے والی چنگھاڑوں میں رل مل کر اہرمن کے رستے میں داستان کہہ رہے ہیں۔

آج، لاکھوں بھیانک شیطان، سینکڑوں چڑیلیں، بھتنیاں اور ہزاروں بھوت پریت چمگادڑوں کے سے پنکھ تلے بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی آنکھ کھلی دیکھی، اپنے کٹار جیسے ناخن سے ایک کچوکا دیا یا کوئی زندہ دل مل گیا تو جھٹ سینے سے باہر کھینچ کر آگ دکھا دی، پھر اپنی خدمت جتانے کے لئے اتنا ملا دلا اور پیا اور گرما کر اس میں سے چرچراہٹ کی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ جیسے تانبے کی چادر کو ریتی سے رگڑا جائے۔

یہ سب شیطان اور سارے بھوت پریت ان لوگوں کی روحیں ہیں جو مدت سے اہرمن کی شیطانی چتاؤں میں جل بھن کر راکھ ہو چکے ہیں۔ یہ اہرمن کے خاص غلام آگ کی لپٹوں میں سے دھوئیں کی سی بھیانک شکلیں لئے نکل رہے ہیں۔ ان میں سے عموماً سر سے پاؤں تک ڈنک یا ناخن کی صورت کے ہیں اور کوئی دانت کی شکل کے، کئی ایک بغض اور فریب کی آنکھیں ہی آنکھیں، اور کوئی سراپا نشتر جیسی تیز زبان بنے پھر رہے ہیں ہزاروں شیطان جونکوں کی طرح بل کھاتے، ہر طرف خون چوسنے کیلئے اپنا منہ کھول رہے ہیں۔ یہ سب شیاطین آپس میں مل مل کر لاکھوں کی تعداد میں موذی کیڑوں جیسے بچے بھی جنے چلے جاتے ہیں۔

آج اہرمن کے سب جاں نثار اس جگہ پر اکٹھے ہیں۔ کوئی بڑا فتنہ بپا ہونے والا ہے! یکایک دھرتی ہلی، ایک سخت جھٹکا آیا، دنیا کپکپا اٹھی، پہاڑ لرزنے لگا، ہڈیاں بجنے لگیں، کائنات میں ایک محشر بپا ہو گیا! ایک دھواں سا چھا گیا اور لو اہرمن چٹان کی کڑکڑاہٹ لئے غار میں جا اترا۔ اس کے غلام ہر طرف سے دوڑے اور خون سے بھری ہوئی کھوپڑیاں اس کے حلق میں انڈیلنی شروع کیں۔ بھنے ہوئے دلوں کے ٹوکرے اس کے منہ میں گرائے جانے لگے۔ سینکڑوں شیطان اپنے ناخن اور پنجوں سے اس کے بدن کو کھجانے لگے۔ لیکن آج اس کا غصہ کسی طرح تھمتا ہی نہ تھا۔ وہ غصے میں دہاڑ رہا تھا اور ہر سانس لینے پر ہزاروں جاندار، بھنگوں کی طرح اس کے نتھنوں میں کھچے چلے آ رہے تھے۔ سب نوکر غلام اسے خوش کرنے کے لئے مرد اور عورتوں کا تازہ شکار لا لا کر آگ پر ڈھیر کئے جاتے۔ جن کی فریاد اور دھوئیں سے ظالم اہرمن کے کان اور نتھنے بھر بھر گئے۔ لیکن کوئی فائدہ نہ تھا۔ غضبناک اہرمن غصے میں بل کھاتا اور ہر دفعہ ہزاروں شیطانوں کو اپنے جسم کے نیچے مل ڈالتا تھا۔

اہرمن کی ہیئت کا کوئی خاص اندازہ نہیں ہے! یوں سمجھ لیجئے کہ کالے دھوئیں کا ایک بہت بڑا پہاڑ ہے جو بل کھاتے جاتا اور ہر دم بدلتا رہتا ہے اگر یزداں کسی جگہ سے منہ پھیرے تو یہ پل بھر میں اس جگہ کو اپنے دھوئیں سے بھر دیتا ہے اور جس جگہ وہ چمک جائے تو یہ ایک مکار کیکڑے کی شکل بنا کر کسی چھید میں داؤں گھات پر بیٹھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا اصلی روپ دکھایا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ اپنا چہرہ کسی کو نہیں دکھاتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی اصلی صورت کو دیکھ لے وہ جانتا ہے کہ اس کے حقیقی روپ کو دیکھ کر ظالم سے ظالم شیطان کا بھی پتہ بہہ نکلے گا۔ وہ اتنا بھیانک ہے کہ اگر ظاہر ہو جائے تو پہاڑ بھی دہشت سے ریت ہو جائیں گے۔ دنیا کی روح فنا ہو جائیگی۔ سورج بجھ جائیگا۔ اور زمین کھڑی کی کھڑی رہ جائے گی۔

اہرمن کی گڑگڑاہٹ سے بہت سی جانیں نکل گئیں، یہاں تک کہ اس کے سردار بھی خوف اور دہشت سے خون کی ندی میں ڈبکی لگا گئے۔ اور دوسرے کنارے سے

نکل کر ایک اندھے کنوئیں کے سوراخ میں گھسنے لگے۔

وہ اس بھیانک اندھیرے میں تڑپ کر کہنے لگا "کم بختو! یہ نمک حرامیاں ؟ کیا معلوم ہوتا ہے تمہیں یزداں نے پھسلا لیا ہو! بتاؤ تم حرامزادوں کا ایک نوالہ! ذلیل وہاں تمہیں ہمیشہ کیلئے اپنے پیٹ کے جہنم میں! کیا سمجھ رکھا ہے! میں پل بھر میں تم جیسے لاکھوں شیطان پیدا نہیں کرسکتا؟ کیا تمام دنیا میرے تابع نہیں؟ یزداں کون ہوتا ہے؟ انسان کی باگ میرے ہی ہاتھ میں رہی ہے۔ اور رہے گی۔ خدا تو کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتا۔ ارے میں بھی تو دیکھوں! وہ کون ہے جو ساری عمر تک خدا ہی کا بندہ بنا رہے! کھینچ لوں تمہیں اپنے ایک سانس میں؟

شیطانوں کا تن بدن پاؤں تلے مسلی ہوئی مکڑی کی طرح لرز رہا تھا۔ ہاں، کچھ دیر کے بعد شہوت کے بھوت نے ہمت کی اور کہنے لگا "اے برائیوں کے بھگوان! میں نے تیرے حکم پر ہر دل میں جہنم کی آگ بھڑکا دی اور کوئی دن نہیں جب میں ان لپکتے شعلوں میں جھانک نہ لوں اور مدھم آنچ کو پھر سے بھڑکا نہ دوں۔ کوئی آدمی تو دکھا دو جو میری آگ میں نہ جلا ہو! میرے جتنا کام تو تیرے کسی ایک شیطان سے نہیں ہو سکتا۔ جو شعلہ افگن آگ کی ان موذی لپٹوں کو آدمی کی آنکھ میں گلزار بنا دے۔ تمام دنیا میری اس ایک چنگاری پر ناچ کود رہی ہے۔ میرے جسم میں سانپوں کا اتنا زہر بھرا ہونا چاہیے جس کے اثر سے میرا شکار دور ہی سے ادھموا ہو کر کانپتا لرزتا خود بخود میری ہی طرف کھنچا چلا آئے۔ اس سے زیادہ کوئی کیا مصیبت سہار سکتا ہے؟ اور کیا خدمت ہو سکتی ہے؟ میں آہرمن تو نہیں ہوں!!"

یہ سنکر حسد کا شیطان آگے بڑھا اور کہنے لگا "میں ہمیشہ ایک تپتے ہوئے بھالے کی طرح لوگوں کی آنکھ میں دھنس دھنس جاتا ہوں۔ میں خلوص اور صفائی کی دوستی کو سرے ہی سے دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے صاف نظریں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ میں تو کھلی آنکھ پسند ہی نہیں کرتا۔ میں اس تمام تندرست روپ کو، جو کہتے ہیں خدا نے آدمی کیلئے بنایا ہے، اسکی نظروں میں دکھ درد کر رکھتا ہوں۔ میں چمکتے سورج کو اسکی آنکھوں میں جلتا توا بنا دیتا ہوں۔ میں بلند آسمان کو اسکے سر پر لا گراتا ہوں! ہیں؟ میں اس رنگین دنیا کو اس پر اتنا سکیڑ دیتا ہوں کہ وہ بلبلا ہی تو اٹھے اور اس سے چھٹکارے کی دعائیں مانگنے لگے اور رہائی کی ترکیبیں سوچے۔ میں پل بھر کے لئے بھی تو اس کے خیال سے جدا نہیں رہ سکتا۔ اسے ہمیشہ رنجور رکھتا ہوں، مجبور رکھتا ہوں۔ لے تو ہی بتا دے! کون ہے وہ جو میرے ہاتھ سے رنج و عذاب میں نہیں۔ اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے! میں آہرمن تو نہیں ہوں!"

اتنے میں انتقام کا شیطان گودکر آگے بڑھا اور چلا چلا کر کہنے لگا "میں جبکہ آدمی کے منہ میں تھوک دیتا ہوں تو دوسرا ازہر بنکر دوسروں کو ڈس لینے کیلئے موقع ڈھونڈتا رہتا ہے۔

حیوان درندوں کا غصہ کچھ دیر کیلئے ہوتا ہے لیکن میرا منتر انسانیت کی ڈینگیں مارنے والے آدمی کو حیوانیت کے درجے سے درندگی کے اندھیرے سے بھی کچھ نیچے گرا کر اسکے غصہ کو طویل بناتا اور اس کے دل میں کھولاتا رہتا ہے۔ میرے سامنے کوئی شیطان کیا ڈینگ مار سکے گا۔"

اس تو تو میں میں سے شیطانوں کی آپس میں چل گئی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا اور لتھم لتھا ہو گئے۔ نئے تیرے کی مٹے تیرے کی سے ایک شور محشر بپا ہو گیا۔ اور ان کے چھاج جیسے پروں کے پھڑکانے سے راکھ ہی راکھ اڑنے لگی۔ لیکن آہرمن ان سب ہنگاموں سے برا نہیں مانتا۔ اتنے میں کینہ کا شیطان بھیڑ چیر کر نکل آیا اور پکارا "تم میں سے کون میری بیرحمیوں کو پہنچتا ہے؟ انسان میرے ہی تو ڈر سے راتوں کو آہرمن کے خواب دیکھتا ہے۔"

یہ سنکر آہرمن غصے میں بوکھلا اٹھا اور شیطانوں کے بے چین گروہ پر ایک بڑی سی پیک تھوک دی جس سے ان کے پنکھ چپک کر رہ گئے۔ ان کا جوش ٹھنڈا ہو گیا اور سب ٹھنجا ٹھیں جاتی رہیں۔ پھر اس نے کسی بڑی عمارت کے دھماکے جیسی ایک آہ بھری اور کہا "شیطانو! تمہارے ان تمام جھگڑے جھانجوں سے خاک بھی فائدہ نہیں، اور ان سب برائیوں اور شعبدوں سے کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلتا۔ مجھے تو آج کل یزداں کی طرف سے ایک کھٹکا لگا ہوا ہے۔ ڈر ہے کہیں وہ سفید محل کھڑا نہ ہو جائے جس کی تعمیر فرشتوں کے پروں سے کی جا رہی ہے۔ وہ فردوسی قصر دن بدن اونچا ہو رہا ہے جسے دیکھ دیکھکر میری آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں۔ میرے اندر کی آگ یوں بجھ رہی ہے جیسے کوئی میرے تپتے جسم پر پانی ڈالتا چلا جائے۔ تمہیں تو شیطانو! میں نے اپنی جہنمی بھٹی میں خوب آنچ دے دیکر پکایا ہے۔ پھر تمہاری چالیں کیوں کچی پڑ رہی ہیں؟ کھینچ لوں اپنے ایک ہی سانس میں تم سب کو؟ بے شرط بنا لوں تمہیں ایک نوالہ؟ جھونک لوں تمہیں اپنے پیٹ کے اندر؟"

یہ سنکر شیاطین کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ تھرا گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے۔

"داتا! ہم نردوش ہیں، مالک ہم بے گناہ ہیں! اگر سو برس اور بھی تو اپنی اس جہنمی بھٹی میں ہمیں آنچ دیگا تو بھی اس گھر کی بربادی ہمارے بس کی بات نہیں۔ یزداں کے سب فرشتے دن اور رات اس محل کے بنانے اور اس کی حفاظت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم ہزاروں مرتبہ اس عمارت کے پاس پہنچے۔ لیکن ہر دفعہ اندھے اور بہرے ہو ہوکر واپس لوٹ آئے! ہم تجھے اصلی بات کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اگر جان کی امان ہو تو کچھ عرض کریں؟ سچ تو یہ ہے کہ اب تجھ سے بھی بنائے کچھ نہ بن سکے گا۔ اور یہ گھر تیرے بگاڑے بھی نہ بگڑیگا۔ کہیں اس کے پاس نہ چلے جانا! ورنہ تو بھی فرشتوں

۔ بھگتی کے گُڑ سے اندھا اور بہرا ہو جائیگا۔ ہمارے جلانے سے کیا فائدہ! اب تو کمل دوسری ہی چال چل! کچھ اور ہی بات نکال! یزداں کا محل کھڑا ہوا ہنستا ہے۔

اہرمن کا غصہ! خدا کی پناہ! وہ پھنکارا۔ اس کے نتھنوں کی آگ نے سامنے کے جرہ حدن شیطانوں کو جلا کر ان میں ایک گلی سی بنا دی۔ پھر بہت سے پرتیوں کو اپنے ایک ہی سانس میں اندر کھینچ گیا۔ اب کچھ دیر سوچنے کے بعد یکایک اس نے اپنے تیز پنجے سینے میں گاڑ دیئے اور ایک بڑے درخت کے ٹوٹ پھٹنے کی آواز کے ساتھ سارے اپنا سینہ چاک کر ڈالا۔ اس کے اندر سے ایک نہایت مہیب قسم کا دیو برآمد ہوا جس کی ہیبتناکیوں کو دیکھکر بڑے بڑے جغادری شیطانوں کا بھی کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کا جسم بچھو کے ڈنک، سانپ کے دانت، بھیڑیے کے منہ اور اُلّو کے دیدوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور اُن آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ منہ سے راکھ جھڑ رہی تھی۔ اور نتھنوں میں سے دُھواں نکل رہا تھا۔ اُس نے اپنے پنجے اہرمن کی گردن اور اس کی پشت پر گاڑ دیئے۔ اور لگے جھٹ کر غرّایا کہ "ہے کشٹ بھگوان! ہے دَم دیوتا! مجھ جیسا بلوان سپوت ہو تو پھر یہ چنتا کیسی؟ یہ کلپنا کیسا؟ یہ آشاؤں کا ناش کس لئے؟ آپ کے ہردے کی لو مدھم کیوں ہو رہی ہے؟ میں تو آپ کے سینے کی ٹھنڈک سے ٹھٹھر رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟ جو کہئے تو سب دنیا والوں کی آنکھوں کے پپوٹے اُن کے گھٹنوں تک کھینچ کر رکھ دوں؟ اُن کے نینوں کا نیر اور جسموں کا خون، جو اچھا ہو تو پتا جی! آپ کے چرنوں میں لا نچوڑوں؟ بھگوان وچار کیوں ہے؟ آگیا دو! آپ کی کرپا سے پریم کے آخری جھٹکے کو بھی اس دھرتی پر سے اُچک لوں! اور دنیا والوں کو تنہائی کی کپکپاہٹ اور بیکسی کی اداسیوں سے غار کے کیڑوں کی حالت میں تبدیل کر دوں۔ کہئے کہئے اچھے پتا جی کہئے! ہے مہا کال آگیا دو! میں بہتان کا پر جیت ہوں۔ میں اہرمن کا اکلوتا بیٹا ہوں! تمام شیطان میرے ہی تو شاگرد ہیں ہے دیوتا جی!"

اہرمن کا دل اپنے بالک کے ان وچاروں پر پسیج گیا۔ اُس نے اپنا منہ بہتان کے منہ پر رکھکر منوں کھولتا ہوا ڈامر اس کے حلق میں اُتارا اور پکار اُٹھا۔ "اے بزدل شیطانو! اے نالائق غلامو! وہ کام جو برسوں تم سے نہ ہو سکا دیکھ لینا میرا فرزند ایک ہی رات میں کس طرح نباہ لیتا ہے! اب میری اور یزداں کی لڑائی کا تماشا دیکھنا مجھے کبھی شکست کا سامنا نہیں ہو سکتا۔ یزداں کا تو کوئی وجود ہی نہیں، اس کی ہستی ایک خواب ہے، ایک خیال ہے۔ وہ ایک وہم ہے جو انسان کے دل سے گذر کر تمہیں ڈراتا ہے۔ اس موتی محل کو تمہارے ہی ڈر اور وہم نے تو کھڑا کر دیا ہے۔ تم تو یونہی ڈر رہے ہو۔ کوئی یزداں وزداں نہیں ہے! اگر ہوتا تو میرے پنجے ہر روز انسانوں کی جان میں کیوں گڑے جاتے؟ یزداں کچھ نہیں! وہم ہے! جھوٹ ہے! جاؤ! انسانوں پر دل کھول کر حملے کرو۔ اور یزداں کے خیال کو ان کی جانوں کے ساتھ جڑ بیخ سے باہر کھینچ پھینکو!

منہ بسورے ہوئے شیطان ایک دم چلا اُٹھے اور کہا۔ "ہے مہا پتا! تیرے آگ بھرے پیٹ کی قسم! یزداں جھوٹ نہیں ہے۔ ہمارے حکم سے آدم کی یہ نافرمانیاں یزداں ہی کے لئے ہیں۔ تو یہ باتیں ہمارے دل بڑھانے کیلئے کہہ رہا ہے ورنہ یزداں جھوٹ نہیں ہے۔ اچھا یہ تو بتا! وہ فرشتوں سے اٹا ہوا سفید محل کس طرح بن گیا؟ کیا وہ بھی وہم و خیال ہے؟ کیا ہم فرشتوں کی آواز سے اندھے اور بہرے نہیں ہوتے؟ اگر تو سچا ہے اور ہم جھوٹے تو خود چل اور چل کر دیکھ لے۔

یہ سنکر اہرمن غصے میں کھانسنے لگا اور کھانستے کھانستے اُس کے حلق سے آگ بہنے لگی۔ وہ گرجا، کڑکا اور چلایا "چپ رہو! چپ رہو نادانو! ہے شرط تمہیں سو سال کیلئے اس بند آگ میں قید کر دوں؟ تم لوگ بہتان دیو کے اجزا کا ایک ادنیٰ سا جزو ہو۔ اس کا ایک معمولی سا کرشمہ ہو، اگر تم سب کو مل جل کر ایک پلیتھن سا بنا لیا جائے پھر بھی اہرمن کے وجود سے تھوڑی سی لاگ لگانی پڑیگی تب کہیں جا کر بہتان دیوتا کے چرنوں کی پاسنگ بن سکوگے۔ بہتان تو میرا فرزند ہے، میرا دلبند ہے، میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میری آنکھوں کا تارا ہے، میرے دل کا سہارا ہے، بہتان اہرمن کی ہستی کا جوہر ہے! خبردار! جو کسی شیطان نے اُس کے حکم سے سرتابی کی! بہتان جو کہے وہ سب بجا اور درست ہے۔ اس کی ہر بات کو ماننا سب شیاطین پر فرض ہے۔ وہ جو ارشاد کرے ٹھیک اور جو کچھ کہے بجا ہے۔ بلکہ یہی بات ہمارے سب پیروؤں کے دل میں بھی بٹھا دو۔ اور نقش کر دو! تم سب شیاطین کی باگ بہتان ہی کے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔ وہ جس طرف دوڑائے، دوڑنا! جس کل بٹھائے، بیٹھنا! جس کروٹ لٹائے لیٹنا! اور جس تال نچائے، ناچتے چلے جانا! جاؤ اس کے نقش قدم پر چلو! وہ فردوسی محل بہتان کے ایک ہی وار سے نیو تک بیٹھ جائے گا۔ اور یزداں کا خیال بھی تم سے جاتا رہے گا!

اب اہرمن نے اپنے حلق میں ہاتھ ڈال کر ظالم تیروں کا ایک گٹھا جو صدیوں سے اس کے جگر کی آبداری لے رہا تھا۔ باہر نکالا۔ پھر اُس کے ہر تیر کو کئی بار اپنے دانتوں سے رگڑ رگڑ کر تیز کیا اور انہیں اپنے جبڑوں کے زہر میں بجھا کر بہتان کے حوالے کر دیا اور کہا۔ "لے! ان میں کا ہر ایک تیر قصر سعادت کی مضبوط ترین عمارت کو خراب کرنے کیلئے کافی ہے۔ اگر نشانہ ٹھیک بیٹھا تو امن شرافت کو خواہ وہ پہاڑ کے کلیجے ہی میں کیوں نہ بنا ہو، اپنے ایک فراٹے سے کھیل کھیل کر کے رکھدیگا۔ اس قصر فردوس کا کام ایک ہی وار میں تمام کر دینا۔ لیکن اتنا خیال رہے کہ یزداں نے اس گھر کے بنانے میں بڑی محنت اور شوق سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے سب فرشتوں کو

تیرے مقابلہ میں بھیجے گا! کہیں ڈگمگا نہ جانا! ان تیروں سے فرشتوں کی جان پہ آفت ڈھا دینا! اور ملکوتی دستوں کو تہ غار بناتے چلے جانا۔ دیکھنا! اس رن سے مُنہ نہ پھیرے! جا! یہ میرے تمام شیاطین تیری پُشت پر ہیں! تیری مدد پہ ہیں! میرا سانس، دُھواں سے ہوا کو فرشتوں کے لئے متعفن اور زہریلا کر دیگا۔ جا! اہرمن کا ہر سانس تیرے ساتھ ہے!

یہ سُنکر بہتان نے اپنے پتاجی کا مُکھ چوم لیا۔ اور پیپ اور زہر کی بہت بڑی مقدار اہرمن کے منہ سے اپنے پیٹ میں بھر کر ڈکار لی۔ اور غار سے باہر آگیا۔ سب شیطان اور بھوت پریت چیختے، چلاتے چرختے اور ہڑبونگ مچاتے اس کے پیچھے ہو لئے۔

حملہ

ہے ایک خلق کا خوں، اشک خونفشاں میں تری
سکھائی طرز لہے دامن اٹھا کے آنے کی

آدھی رات تھی۔ لوگ میٹھی نیند سو رہے تھے۔ ہر طرف مدہوشیاں چھا رہی تھیں۔ لیکن غم کے لشکر، کل کی تیاری کے لئے ویران کھنڈروں میں مشورہ کرنے کیلئے بیٹھ گئے۔ بہتان دیو کی آمد آمد پہ دُنیا میں جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ زمین نے کروٹ لی۔ پہاڑ جھُک گئے۔ جانور ہربڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ اور لوگ بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں اپنی جگہ سے اُبھر آئیں۔ کان کھڑے ہو گئے۔ مُنہ کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ پنجے اور اُنگلیاں ٹھٹھر کر رہ گئیں۔ جسم کپکپا اُٹھے اعضاء سُن اور سر جیسے ابھی تک سو رہا ہو، پیر دو دو من کے بوجھل ہو رہے تھے اور بھاگنے کی طاقت جاتی رہی۔

چاند بھی بہتان کو دیکھکر سہم گیا۔ پہلے سُرخ ہوا۔ پھر ہوتے ہوتے کالا پڑ گیا۔ جھلملاتے ستارے ڈر کے مارے کُلبلا کُلبلا کر گُم ہو گئے اور جو باقی رہ گئے تھے اُنہوں نے بھی اپنا مُنہ دُھند کی سیاہ سی چادر میں چھپا لیا۔

ہَوا اس طرح چلنے لگی جیسے کوئی دوڑتا ہانپتا ہوا کسی ناگہانی مصیبت کے یکدم پھٹ پڑنے کی خبر لا رہا ہو۔ درخت لرزنے لگے۔ ہلنے لگے۔ پتے یوں جھڑ رہے تھے جس طرح کسی بہتان دیدہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ جائے۔ اُلّو خوشی میں چھُر چھُر کر رہے تھے۔ کہ اب کوئی دم میں ویرانی ہوا چاہتی ہے۔ بھیڑیئے نتھنے پھُلائے اپنے دانت ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے۔ گویا اب لاشیں ہی لاشیں ہونگی۔ زہریلے ناگ دُم کے بل الف بنے کھڑے تھے اور خوشی میں پھَن پھیلائے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ رہے تھے۔

مُردوں کے ڈھانچے قبروں سے باہر نکل آئے۔ انکی آنکھوں کے حلقوں میں خون ٹپک رہا تھا اور وحشی جھڑ رہی تھی۔ وہ رو رو کر کہہ رہے تھے کہ اے فرشتو! افسوس تمہارے حال پر! اور صد افسوس ہماری حالت پر! تم پر یہ چھا رہے اور ہم تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے! اللہ تمہیں ان ظالم تیروں سے بچائے۔ کاش کہ ہماری ہڈیاں ہی تیروں کا نشانہ بنتیں۔ اب تم اپنے آپ کو یزداں کے حوالے کر دو۔ کہیں اس آفت سے بچنے کیلئے اہرمن کے فریب میں نہ آجانا! شیطان کے چنگل میں نہ پڑ جانا! دیکھنا! ہمیں ان باتوں کے تلخ تجربے ہیں! تمام شیاطین کا آپس میں اتفاق ہے اور سب اہرمن کے اشارے پر چلتے ہیں۔ تم خود اپنے آپ کو یزداں کے حوالے کر دو۔ اور اسی کے ہو رہو۔ اگر اس کے حکم پر چلوگے تو اہرمن اور اس کے شیطان تمہاری سعادت اور نیک بختی میں سے کچھ بھی اُچک نہیں سکتے۔ تمہیں ہماری قسم، اگر چاہتے ہو کہ ہم ان تنگ قبروں میں آرام سے رہیں تو یزداں کی نافرمانی نہ کرنا۔

بہتان دیو اور اس کے ساتھی اس آندھی اور اندھیرے میں سنسناتے چلے جا رہے تھے کہ یکایک سفید اور نُورانی تیروں کی بوچھاڑ ظلمت کی چادر کو چھیدتی ہوئی اہرمن کے لشکر پر ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح جھلملانے لگی۔ سب شیطان بلبلاتے ہوئے بھاگے۔ بہتان دیو نے بہتیرا ڈانٹا ڈپٹا اور للکارا لیکن کچھ نہ بنا۔ شیاطین چیختے چلاتے ایک دوسرے کے سر پر پاؤں ملتے ہوئے دوڑے۔ اور دُور سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔ اس گنتی کے چند رن بیر بلوان جیسے حسد، کینہ، بغض، انتقام اور مایوسی کے سردار تھے رہ گئے تھے لیکن اُنہوں نے بھی بہتان دیوتا کے جسم کے چُنٹوں میں پناہ لے لی۔

پھر بہتان للکارا کہ اے فرشتو! میں تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں! میں تو آپ چاہتا ہوں کہ اندھا ہو جاؤں تاکہ زیادہ بے خوف اور جیوٹ ہو کر بھیڑ بھیڑ کے حملے کروں، اس وقت تم اپنی حالت ملاحظہ کرنا۔

مسرت کے فرشتے نے ایک موسیقی بھرا قہقہہ لگایا اور کہا۔ میاں بہتان! یہاں تو خوشی کا گھر ہے، دوستی کا مامن ہے۔ مسرتوں کا مسکن ہے یہاں تیر کمان کیسے! دھنش اور بان کیسے! ارے بھئی! یہ جو تیری آنکھوں میں سے تیر گذر رہے ہیں وہ دراصل دوستی اور خلوص کی کرنیں ہیں۔ بان نہیں! یہ محبت اور بے نیازی کی چمک ہے۔ تیر نہیں! یہ تو تیری دید کی خطا ہے جو تو دکشنی اور مسرت سے بُرا مانتا ہے! چل آ! ہماری طرح بن! اور دنیا کو ہنستا کھیلتا دیکھ! ببول کے کانٹوں میں کیوں گھُس رہا ہے؟ یہ رہی پھلواڑی اور نُور کی پھوار! آ تجھے قصر سعادت کا راستہ دکھاؤں! جس کا در ایک پر کھُلا ہے۔ تمہیں ہمارے لڑنے سے کیا مل رہے گا؟ یہی نا کہ زیادہ بے رحم اور زیادہ خونخوار ہو جاؤ گے؟ اور اہرمن کے رنج و عذاب کا بوجھ تمہارے کندھوں پہ روز دگنا ہوتا چلا جائیگا۔ آؤ ہمارے ساتھ ہنسیں

چھینی اور وہیں رہیں! تم جو کچھ بھی ہو ہم تمہیں چاہیے گے!"

یہ سنکر انتقام کا بھوت بہتان کے پیٹ میں گھسا یا اور بین بجا کر کہنے لگا۔ "لے دیکھنا تلوار نیے بیر! اسی کو سب سے پہلے! مدد تاکہ دوسرے فرشتے اپنی جان سے بیزار ہو کر آپ سے آپ موت کے منہ میں کھنچے چلے آئیں۔"

بہتان نے چلہ چڑھایا۔ سرسراہٹ ہوئی اور ایک ظالم بان کھٹ سے فرشتۂ مسرت کے گلے میں بیٹھ گیا۔ فرشتہ تڑپا اور تڑپ کر چل بسا۔

اب اس جگہ کے تمام رنگین قہقہے، سب گیت بار مسرتیں اور رُوح پرور زندگیاں جن سے اس رنگ محل میں چہل پہل تھی۔ ایک سیلی سی کیفیت نیچے، کھنیں مسرت کا فرشتہ اب ٹھنڈا ہو گیا اور قصر سعادت کا ہر ایک کونہ ہچکیوں سے بھر گیا۔

دوسرا تیر بھی چھوٹا۔ سن سے آیا اور کھچ سے "محبت" کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ یہ لو! محبت کا فرشتہ بھی اُلٹ گیا۔ اب خورشید قصر خاموش ہوا، روشنیاں اور حرارتیں کافور ہو گئیں۔ اور چاندنی محل میں ٹھنڈی سی مُردنی چھا گئی۔ فرشتہ لڑکھڑا کر بولا۔ "ہائے ظالم! مجھے کیوں مارا؟ اب یہ گھر محبت سے خالی ہے اور زندگی اُداس! تُو نے تو مہلت بھی نہ دی ورنہ تجھے بھی ہم اس محل میں لا کر خوش کر دیتے۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا کہ تو نے میری دنیا میں ایک دل بھی زندہ نہ چھوڑا؟ لے! اب بھی آ! اور تمام بُرائیوں سے توبہ کر لے! جو کچھ بھی ہے آجا! میں تجھے اپنے آخری دموں میں بھی چُوم لوں گا! اور تیرا دل بھی گرما دوں گا! لے آجا!"

یہ سنکر بہتان دیو کا لال لال منہ ایک کھولتے ہوئے آتش فشاں کی طرح کھل گیا۔ اُس نے ایک کڑوا سا قہقہہ لگایا اور اِدھر اُدھر زخمی فرشتے پر پل پڑا۔ اس نے اپنے پنجے محبت کی گردن میں گاڑھ دیے۔ اور اُس کا گلا پورے زور سے گھونٹنے لگا۔ اب شیطانوں کے گروہ در گروہ اپنا دل کڑا کر کے اُس کے قریب آ گئے اور اپنی وحشت ناک آوازوں میں چیخنے چلانے لگے۔

کینے کا بھوت، بہتان کے بغل کی گندی سلوٹوں میں سے سر نکال کر کہہ رہا تھا۔ "او پھنکارنے والے بیر! سوچتا کیا ہے؟ گھونٹ دے گلا! کر دے فیصلہ۔ نکال دے جان محبت کی! اے میری خاطر بیر بہتان! کمان کو تان! دے ایک اور بان! ڈھیلا کیوں پڑ رہا ہے؟ وہ پہلا سا کس بل کیوں نہیں۔ وہ اگلی سی شدت کیا ہوئی؟ دیکھتا کیا ہے؟ جو فرشتہ بھی ملے ٹوٹ پڑ اُس پر! نکال لے اس کی جان! یہ محل ویران ہوگا! خاک میں یکساں ہوگا! محبت کا دل مٹی میں مل جائے! خون میں بدل جائے!

دوسرے ہزاروں شیطونگڑے اپنی دُموں کو منہ میں لئے چک پھیریاں لے رہے تھے اور قلابازیاں کھا کھا کر کہہ رہے تھے "حسد سچ کہتا ہے! وہ ہمارا بڑا بھائی ہے۔ اس کا کہنا مان! فرشتوں کو ریل دے! پیل دے! پھینک اِدھر اُدھر دے ہمیں! ان کے تکے اُڑائیں، بوٹیاں نوچیں، ہڈیاں چبائیں، ہاں بیر بہتان! تیری جے ہو! چیر ڈے اس دل کو جس پر یہ گھر بنا ہے۔ ہمیں لذت آئے گی۔ ہم تو ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں اور یہ خون کا لوتھڑا جنت کے مزے اُڑائے۔ اُڑا دے ٹکڑے اس دل کے! پکڑ لے فرشتوں کو! جکڑ دے آہرمن کی زنجیروں میں! شیطنت کی تدبیروں میں! بدی کی تقدیروں میں!

قصر کا نور بجھ گیا۔ دلا ویزیاں جاتی رہیں اور موسیقیاں ختم ہو گئیں۔ صبر و تحمل، بردباری، مروت، کوشش، خدمت (خوش بینی) خلوص اور دوسرے سب فرشتوں کی آہیں ہی نکل گئیں۔ وہ کہہ رہے تھے "اب ہم کس خوشی کے سہارے اس ٹھنڈے اور بھیانک گھر میں دن گزار سکتے ہیں؟ ہمارا وقت اس عذاب میں کیسے کٹے گا! بہتان کا تیر نہ سہی، ٹھنڈک اور اندھیرا ہی سہی۔ ہمیں گھلا دینے کیلئے کافی ہے، نا بھئی! یہ جگہ اب ہمارے رہنے کی نہیں، ہمیں تو اب یہاں سے پر لگا کر اُڑ جانا ہی چاہیئے۔"

شیاطین کلیلیں کر رہے تھے، تھرک رہے تھے، بھاؤ بتا بتا کر ناچ رہے تھے۔ دُم پکڑ پکڑ کر کود رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو چکت بھر بھر کر چلا رہے تھے۔

اتنے میں تقویٰ کے فرشتے نے بھاری بھرکم آواز میں فرشتوں کو مخاطب کیا اور کہا۔ "میں کبھی نہ بھاگوں گا! یہیں ڈٹا رہوں گا۔ بہتان کے ہزاروں تیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پاک فرشتو! تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟ یہ کیا ارادہ ہے؟ فتح تو ہماری ہے۔ گھبراؤ نہیں! بہتان کا ترکش کوئی دم میں خالی ہوا چاہتا ہے۔ دیکھتے نہیں؟ اب اس کے بان خالی جا رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ اپنی بوٹیاں نہ نوچنے لگے تو سہی۔ کیوں پر ہلا رہے ہو؟ کیوں کسمسا رہے ہو؟ سکیڑ لو اپنے پروں کو! میں تمہاری مدد کروں گا۔ اور اس محل کو بچاؤں گا!"

شیاطین یہ رجز سنا یہ سٹپٹائے اور گھبرا کر بہتان کے پیٹ میں مشورہ کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ باقی شیطان گروہ کے گروہ بہتان کے ارد گرد شور مچا رہے تھے کہ جلدی کرو! جلدی کرو! دیر ہوئی جا رہی ہے۔ جلدی کیوں نہیں کرتے؟

کینے کے بھوت نے یہ مشورہ دیا کہ "ان فرشتوں کو اس خالی خولی گھر میں یوں ہی ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے! یہ آپ سے آپ غم اور سردی میں گھل ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ اس طرح کی موت میں زیادہ لطف ہے۔"

اس پر حسد کے بھوت نے بس بھری ہنسی ہنس کر کہا "یہ کیا
ات ہے؟ سب سے پہلے تقویٰ کے فرشتے کو مارنا چاہیئے! نہیں تو یہ بڑے
ل دوسروں کا بھی دل بڑھا کر انہیں زندہ رکھیں گے!"

بہتان غرّانے لگا کہ بدبختو! میرا تو تیر بھی تقوے پر اثر نہیں کرتا
تدبیر کرو۔ کچھ سوچو! کوئی رستہ نکالو!

کچھ دیر بعد جب شیاطین نے ایک دوسرے کو دانتوں پنجوں سے
نوچ نوچ لیا اور کسی نتیجے پر نہ پہنچے تو یکایک انتقام کا بھوت چلا اٹھا۔
! وہ مارا! لو! سوجھ گئی! سب سے پہلے اس عمارت ہی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا
ہیئے۔ میاں تقوے اور دوسرے فرشتے خود ہی دب کر رہ جائیں گے۔ سب سے
ے اطمینان اور وقار کے کھمبوں کو جو اس سارے محل کو سہارا دیئے کھڑے ہیں گرا دو۔
پھر کیا تھا۔ سب شیطانوں نے مل کر بہتان کا بھالا فرشتۂ اطمینان
پہلو میں بھونک دیا۔ اب قصرِ اُمید لرزا، ینہو ڑایا اور دھم سے گر کر کھیل کھیل
لیا۔ جس کے اندر سے وہی خون بھرا دل سسکیاں لیتا دکھائی دیا۔ وہ زخمی دل
سمان کی طرف مُنہ اُٹھائے کہہ رہا تھا "میرے یزداں! مجھے اسی طرح اپنی درگاہ
قبول کر! میری فریاد کو سن لے! میرے معبود! میں تیرے انعاموں کے لائق
تھا۔ تو نے جو نعمتیں مجھے بخشی تھیں وہ یونہی میرے ہاتھ سے نکل گئیں۔ میں نے
جم کر مقابلہ ہی نہیں کیا۔ "خوشی اور محبت" پہلے ہی وار میں چل بسے۔ میں نے چاہا
نامردانگی دکھاؤں اور اس محل کو جو میرے اوپر تعمیر کیا گیا تھا روشنی اور حرارت کے
بغیر ہی کھڑا رہنے دوں۔ اور اسی کے اندر تیری یاد میں لگا رہوں۔ لیکن کیا کہوں
ں بہتان کا تیر کھا کر یوں لڑکھڑایا کہ سارا بنا بنایا خاک میں مل گیا۔ خداوندا! تو
نے قصرِ سعادت جیسی یادگار کو ایسے کمزور دل میں کیوں بسایا تھا جو یونہی لرز جائے؟
کیا یہ خطا میری تھی کہ میں نے قول ہارا یا تو نے مجھ جیسے دل کو مضبوط بنانے میں
توجہ نہ فرمائی؟ . . . . بہتان کے ڈر نے تیری یاد مجھ سے چھین
لی! میں نے اس سے سہم کر تجھے بھلا دیا، میں تو تجھے دیکھ دیکھ کر پروان چڑھا ہوں
اور تیرے پاک فرشتوں کے ساتھ پھلا پھولا ہوں۔ مجھ سے یہ اندھیری پرچھائیں
بھلا کب دیکھی جاتی تھی! یہ بھیانک شکل دیکھ کر قابو میں رہنا؟ کیسے ممکن تھا؟
اب مجھے اپنے پاس بُلا لے! داتا! مجھے اس بُری حالت میں نہ چھوڑ! مجھ میں
اہرمن کے مقابلے کی تاب نہیں۔ اور تیری فرمانبرداری کی لیاقت سے بھی محروم
ہوں۔ مجھے اپنے دربار میں بُلا لے۔ خدایا! مجھے ان شیطانوں کے ہاتھ میں یوں
ذلیل و خوار نہ کر! میں اس ذلت کی زندگی سے مر جانا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔
خداوندا! میں شرمسار ہوں! اگر سب ہی میری طرح کے ہو جائیں تو تیری تمام

دنیا اہرمن کے ظلم سے بھر جائیگی۔ کیا کوئی ایسا بھی ہے جو سب شیطانوں کو
مار بھگا کر بہتان کے تیر کا مقابلہ کرے؟ خدایا اس مجروح کی سُن۔ میں لاچار
دکھیارا ہوں۔ مجھے اپنے پاس بُلا لے۔ میرا گھاؤ اس دنیا میں نہ بھریگا۔
تو اپنے ہاتھ سے بھر دے!

اتنے میں کالا آسمان لاتعداد فرشتوں کے پروں سے سفید
ہو گیا۔ ملائک اُوپر سے اُترنے لگے۔ اور اس معصوم خون کے قطروں کو
ہیرے کے طشتوں میں رکھ کر سریرِ یزدانی تک لے گئے۔ عرشِ کبریائی
کا مقدس آسمان اِن بے بہا رتنوں کی ضو سے لال دکھائی دینے لگا اور
یزداں کا اورنگ بے نیازی جگمگا اُٹھا۔

یزداں صبحِ بہار کی طرح مسکرایا۔ اور کہنے لگا "اے فرشتو! میرے
اِس معصوم کو خبر نہیں کہ میں نے ہی اس کو اپنے لطف و عنایت سے اہرمن کی
مہیب جنگ پر بھیجا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ آخر میں فتح کا سہرا اسی کے سر
رہے گا اور ظفرمندی ہم کو نصیب ہوگی۔ اگر وہ اس بات کو پہلے ہی جان جاتا تو
اسے مصیبت کی بھی اتنی قدر نہ ہوتی اور نہ ہی اس کو قریبِ عرش میں
اعلیٰ علیین کا یہ مقام ہی ملتا۔ جو اب ہم نے اس کے لئے تجویز کر دیا ہے۔
یہ نہیں جانتا کہ ہم اپنے مقربینِ خاص کو کبھی اہرمن کے عذاب میں چھوڑا نہیں
کرتے۔ اگر وہ جانتا تو اتنا ملول بھی نہ ہوتا۔ اب اہرمن کی لڑائی کا امتحان
ہے۔ جو اس لڑائی میں زیادہ کامیاب ہوگا اسی کی بندگی زیادہ قبولِ درگاہ
ہوگی! جو کوئی ہماری یاد اور اہرمن کی دشمنی میں جما رہے اور سخت مصیبتوں
میں دل نہ ہارے وہی آخر میں کامیاب ہے۔ اب ہم اپنا ایک ایسا فرشتہ
بھیجتے ہیں جو اہرمن کے شیطانی لشکر کو یوں اُدھیڑ کر رکھ دیگا جس طرح
ہوا تنکوں کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اس فرشتے کے پروں کی ہوا دنیا کے
جہنم کو اُس معصوم دل کے لئے بہشت بنا دیگی! وہ پاک دل ہمارا خاص بندہ
ہے جس کی آزمائش کا دور اور مصیبت کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اب اسکی
مدد کیلئے ہم آسمان کے بڑے فرشتے کو بھیجتے ہیں۔

فرشتوں کی دلنواز صدائیں فضائے مقدس میں راگ برسانے لگیں۔
اور ملکوتی نسیم ان معطر سانسوں کے سرور کو اپنی پُرکیف آغوش میں لیکر
مستانہ وار چلنے لگی۔ فرشتوں نے صحنِ عرش کی جگمگاتی سطح پر جواہرات
لڑھکانے شروع کئے۔ جن کا جھلملاتا ہوا تسلسل، ترنمِ موسیقی کی آن
پیہم ضربوں سے مشابہ تھا جو شمیمِ بہار کی مستانہ روش پر یکے بعد دیگرے
سامعہ نوازی کرتی چلی جائیں۔ پاک اور معصوم فرشتے بھی اُن کے پیچھے

... رہے تھے۔

بجلی کی آوازیں آئیں، صُور پھُنکنے لگے۔ صدد ردوا نیے کے کواڑ ہٹے۔ آسمانی عطردان کا منہ کھول دیا گیا۔ نکہتِ نسیم کی رعنائیوں نے سپیدۂ صبح کی گلابی مسکراہٹوں کو بھر بھر کر چوما اور جھوم جھوم کر چلنے لگی نیکی کا فرشتہ آسمانِ تقدس کی بلندیوں سے قصرِ سعادت کے ویران کھنڈروں پر اتر آیا۔ دُنیا، پہاڑوں کے بیچ و خم تک روشن ہو گئی۔

شیاطین چیختے چلاتے دیو کی گھناؤنی بغلوں میں چھپ گئے۔ بھتان دیوانوں کی طرح اپنے جسم میں سے زہریلے تیر نکال نکال کر چلا رہا تھا۔ اور لالچ کے پہاڑ کی طرح غرا غرا کر آگ کے بھبکے اڑا رہا تھا۔ لیکن نیکی کے فرشتے کو پرواہ بھی نہ تھی۔ وہ سینہ تانے مسکراتے چلا آتا تھا۔ بلکہ نشانے سے بھٹکے ہوئے غلط انداز تیروں کو بھی ہوا سے پکڑ پکڑ کے اپنے جسم میں گھبو لیتا۔ جو شگوفہ بھری ڈالیوں کی طرح اس کے سراپا کو پھولوں سے لاد رہی تھیں۔

سب بھوت پریت تعجب اور دہشت سے آپس ہی میں کٹے مرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے، کاٹتے پھاڑتے اور گالیاں بکتے بھاگے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا "ارے تو نے ایسا کیوں نہ کیا! ویسا کیوں نہ کیا! تو نے جلدی کیوں نہ کی؟ تو نے پھرتی کیوں نہ کی؟ تو مر کیوں رہا؟ تو نے دیر کیوں لگائی؟ تو تو ٹس سے مس نہ ہوا۔ تو نے نیکی کو فرصت ہی کیوں دی؟

اب نیکی کے فرشتے نے زخمیوں کے سرہانے آکر ہر مجروح کو اپنے ایک ہی بوسے سے شفا بخشی۔ ہر گھاؤ کو اپنی شفقت کی نظر میں بھرتا اور لاچار آنکھوں میں اپنے تبسم سے نورِ امید چھلکاتا گیا۔ نکلی ہوئی جانیں کھوئے ہوئے کبوتروں کی طرح چھم چھم کرتی ہوئیں اپنے اپنے آشیانوں میں لوٹ آئیں۔ فرشتے اپنے پروں سے بہار برساتے ہوئے دوڑے۔ اور پہلے سے بھی اونچا ایک محل بنا سجا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اُس کے اندر اُس رنجور دل کو مسرت کی کرسی پر لا بٹھایا۔ دلِ غم دیدہ نے محزون سی مسکراہٹ لے کر کہا۔ "نیکی نہ ہو تو زندگی بیکار اور دل کی عمارت مسمار ہے۔ کیا دیکھ نہیں لیا؟ ....

سرِ عرش پہنچا۔ آواز آئی کہ جا! ہم نے نیکی کے فرشتے کو ہمیشہ کے لئے تیری حفاظت پر مقرر کر دیا ہے۔ جی! اور خوش رہ! اب تجھے کوئی دُکھ نہ پہنچے گا۔

دل میں سے ایک مسرور نغمہ نکلکر عرش سے لپٹ گیا۔

افسانے

کفّارہ

(از جناب محمد امین ششر قیصری)

کہتے ہیں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو منہ سے نکلتا ہے پورا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ واہمہ ہو۔ مگر اس واہمہ کو اس زندگی سے کتنا گہرا تعلق تھا۔ وہ تصور ہی سے کانپ اٹھتا۔ شانے جھٹک رہا تھا۔ نرس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھکر چیخ کر بولا "بتاؤ جلدی بتاؤ نرس" آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ دھیمے منہ سے بولی۔ "مرا ہوا بچہ ہوا ہے صاحب۔"

"تیسری مرتبہ مرا ہوا بچہ" اس کے مضطرب ہونٹ پھڑپھڑائے۔ وہ عورت سچ کہتی تھی۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ جیسے الہامی تھے۔ گناہ کی بھیانک تعبیر اس کی گود میں دیکھکر گرج کر بولا "نکل جاؤ فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ میرا نہیں ہے تیرے گناہوں کی تعبیر ہے۔ جسے میرے سر تھوپ رہی ہے۔"

"خدا بہتر جانتا ہے" وہ سرد آہ کھینچ کر بولی۔

"تیرے گناہوں سے خدا کو مطلب۔ بدکار، فاحشہ نکل جا۔ ورنہ دھکے دیکر نکلوا دوں گا۔"

عورت کے بازوؤں میں ننھی جان کلبلا رہی تھی۔ "میں اسے کہاں لے کر جاؤں۔ میں بھی عزت دار ہوں۔"

"عزت! تجھے بھی عزت کا پاس ہے" اس کا منہ چڑا کر بولا۔ اس کی سرخ آنکھیں اور پھیل گئیں۔ جیسے وہ اسے کچل ڈالے گی۔ ان خونناک آنکھوں سے!

"دنیا دیکھ لے گی یہ تمہارا بچہ ہے۔"

"تو کیا تو مجھے رسوا کریگی؟ کون احمق ہوگا جو تیری بات کو سنے گا۔ چاند پر تھوکنے کا انجام جانتی ہو۔ اسے مار کیوں نہیں ڈالتی۔ مصیبت سے نجات کا یہی ایک راستہ ہے۔"

"کیا کہا؟" اس کی آنکھیں اور وحشت زدہ ہوگئیں۔

"تو پھر کیا کریگی اس کا؟" وہ کانپ کر بولا۔

"کسی یتیم خانے میں ڈال دونگی —— بن باپ کے بچوں کا وہی ٹھکانا ہے۔ یہ زندہ ثبوت ہے تمہارے گناہوں کی یادگار" بالکل ایسے ہی کہہ رہی تھی۔

اشارہ پاکر چوکیدار آگے بڑھا۔ اسے دھکے دیکر نکال دیا گیا۔ وہ اس کے چلانے کی آواز سنتا رہا۔ وہ چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ شاید تو دنیا کے لیک —— دو —— سہنے تک اسے کوس رہی تھی۔ کہ اللہ کرے تمہیں بچے کی صورت نصیب نہ ہو۔ تمہاری گود ——"

اس نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔ ماما مردہ بچہ گود میں لئے آ رہی تھی، روتی ہوئی۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ جیسے وہ اس نظارے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ وہ اپنی آرزوؤں کا یوں خون ہوتے نہ دیکھ سکا۔ کس بے دردی سے اس نے دولت لٹائی تھی۔ صرف ایک ننھی سی جان کے لئے۔ اسے اپنی بے شمار دولت کیلئے ایک وارث درکار تھا۔ بے چین روح کی تسکین کے لئے ایک زندہ کھلونا! کاش وہ اپنی ساری دولت دے کر اسے خرید سکتا۔

سلولائیڈ کے منّے کی ناک کھینچ کر بولا "وہ اب بڑا ہو گیا ہوگا۔ سات برس کچھ کم نہیں ہوتے۔ نہ جانے کہاں ہوگا؟ کون سے یتیم خانے میں؟" اس نے یتیم بچے دیکھے تھے۔ یتیم خانوں میں پرورش پانے والے بچے۔ کھلے سر ننگے پاؤں، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس! خوشی کے موقعوں پر لوگوں کے ہاں کھانا کھاتے ہوئے بھوکے کتوں کی طرح خیرات کی روٹیوں پر جھپٹتے ہوئے —— اس کا لخت جگر بھی شاید ان میں ہو۔ وہ ایک سرے سے ایک ایک لڑکے کو بغور دیکھتا ہوا جا رہا تھا کس مزے سے کھا رہے ہیں۔ شاید انہیں پیٹ بھر کر کھانا آج ہی نصیب ہوا ہے۔ وہ اسے کیونکر پہچانے۔ "لڑکے تمہارا نام کیا ہے؟"

"قمر" وہ مسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھیں پیشانی پر جم گئیں۔

"یہ پیشانی کس قدر مشابہ ہے اس سے۔ اور ناک! ویسی ہی ستواں، وہی گول آنکھیں۔" اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ جیسے ابھی پھٹ جائینگی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ مسوس رہا تھا پیروں کے سیاہ تلوے دیکھ رہا تھا۔ کھلے بہنے سے مٹی نے جن پر ایک خول سا چڑھا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی پھیل گئی۔ کون جانتا ہے کہ یہ سب کے سب گناہ کی یادگار ہوں۔ مگر اس کا دل کیوں بے اختیار کھنچ رہا ہے۔ ایک کسک سی کیوں پیدا ہو رہی ہے۔ آنکھیں کیوں مروت اگل رہی ہیں۔ یہ ہمدردی کیوں امنڈی چلی آ رہی ہے۔ آخر یہ محبت کی ندی دل کے کون سے کونے سے پھوٹ پڑی۔ اس کا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اسے چوم لے، اس کے میلے ہاتھوں کو، گرد

[illegible] کے کھردرے بالوں پر اُس کا ہاتھ آپ ہی آپ دستِ شفقت بن گیا تھا۔ پدری محبت سے محروم بچہ اس کی لذت سے ہم کنار ہو رہا تھا۔ آخر کون سی طاقت اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ شہر کا سب سے بڑا رئیس آج یتیموں سے [illegible] لے رہا تھا۔ دل کا مداوا تلاش کر رہا تھا۔ زخموں کا مرہم ڈھونڈھ رہا تھا۔

آج یتیم خانے میں غیر معمولی اہتمام ہو رہا تھا۔ کسی کی آمد آمد کا شور تھا۔ بچوں کو اچھے کپڑے پہنائے جا رہے تھے۔ خیرات کے ڈھیلے اور تنگ جوڑے دُبلے پتلے جسموں پر سج رہے تھے۔ وہ آ گئے ——— موٹر دروازے پر رکی منیجر پیشوائی کے لئے بڑھا۔ پھر پھر کر اُن کی نظریں اس بچے پر پڑتیں۔ ڈھیلی آستینوں کی قمیص پہن کر وہ کتنا خوش نظر آ رہا تھا۔ اُونچے پاجامے پر وہ پھولا نہیں سماتا تھا۔ بچوں کے محبت سے گال تھپکاتے ہوئے وہ قمر پر رک گئے۔ اُسے دیکھ پا کر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ جم گئی۔ اور دل؛ جیسے مچل رہا تھا کہ اُسے اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیں اَن گنت بوسے اُس کی پیشانی پر ثبت کر دیں۔

قابو کے باوجود اُن کی زبان کھل گئی۔

"کے برس سے ہے یہ بچہ؟"

"چند مہینوں کا تھا جب اس کی ماں میرے حوالے کر گئی۔"

اُن کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" وہ انجان بن کر بولے۔

"قمر" منیجر مسکرا کر بولا۔ "میں نے اس کا نام اس کے باپ کی مناسبت سے رکھا ہے۔"

اُنہوں نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی۔ جیسے وہ کہتے ہوں۔ اس کے باپ کا نام کیا تھا۔ منیجر کے چہرے پر پھر مسکراہٹ پھیل گئی ہنس کر بولا۔ "آفتاب بتایا تھا اس کی ماں نے۔"

اُن کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ جلدی سے دوسرے بچے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جیسے وہ غیر معمولی بے چینی کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی حالت غیر تھی۔ چھڑی ہاتھ سے گری پڑتی تھی سنبھالتے ہوئے بولے۔ "میں آج سے ان سب کی پرورش کا ذمہ لیتا ہوں۔"

خلافِ توقع دریا دلی پر منیجر کی زبان اُن کی تعریف میں کھو گئی۔

"آپ جیسے حضرات کی سرپرستی اگر انہیں حاصل ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بچے اس صدمہ کو بھول جائیں گے جو انہیں یہاں تک کھینچ لایا ہے۔ اللہ آپ کو اس کا رِ خیر کی جزا دیگا۔ میں سمجھتا ہوں آج سے یہ بچے یتیم نہیں ہیں۔ انہیں لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑےگا۔"

"میرا بچہ بھکاری"! وہ دیوار تھام کر بولے۔ "آج سے یہ بھیک نہیں مانگیں گے۔"

"جزاک اللہ۔ اس سے اچھی اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔"

اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ جیسے وہ مزید کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ ان بچوں کے بارے میں، بن باپ کے بچے! خوشی جن پہ سوغات بن کر آتی ہے۔ یہ مرجھائے ہوئے پودے، دھوپ کی حدت سہتے جنہیں نسیمِ سحری بھی محروم رکھتی ہے۔ شاید بارش کی نمی بھی کچھ اثر نہیں کرتی۔ اس پژمردگی سے مُرجھائے ہوئے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں مگر اُن کی ہنسی روتی ہے۔ جوتے کپڑوں اور طرح طرح کے کھانوں پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ یتیم خانے کا آہنی دروازہ اور بلند دیواریں کاش وہ انہیں توڑ کر اُڑ سکیں۔ کھلی فضا میں سانس لے سکیں۔ اُنہیں دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کیوں نہ اپنے بچے کو نکال کر لے جائیں ——— اس بلند عمارت سے دُور ——— بہت دُور ——— مگر وہ کیا ایسا کر سکیں گے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ ثروت ہائے استقلال کو جھٹکے دے رہی تھی۔ وہ کیونکر کہہ دیں کہ یہ میرا بچہ ہے۔ اسے مجھے دیدو۔ اس کا باپ زندہ ہے۔ متمول آدمی ہے۔ کھانستے ہوئے باہر نکل گئے۔ اس افسردہ ماحول سے۔

"شبو! آ گئے تم"! وہ بے صبری سے بولے۔

"جی حضور"

"کیسا ہے قمر؟"

"بہت اچھا ہے حضور۔ آپ کے کپڑے پہن کر بہت خوش ہو رہا ہے اس کے بدن پہ فٹ آئے ہیں جیسے ناپ کر سلوائے ہوں۔"

"اُسے ٹھنڈ تو نہیں لگتی۔"

"اُس کے پاس ایک جوڑ دو کمبل ہیں۔ سردی کیسے لگے گی حضور۔"

کانپتے ہوئے اُنہوں نے ہاتھ بغلوں میں دے لئے۔ "وہاں دھوپ تو آتی نہیں ——— بہت ٹھنڈک ہو گی۔ کمرے بہت بڑے ہیں ——— کوئلہ پہنچ گیا کیا؟"

"جی۔ منیجر صاحب نے کہا ہے۔ رات بھر انگیٹھیاں جلتی ہیں۔"

"میرے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہیں کیا؟"

"حضور بند ہیں۔"

"ہوا کدھر سے آ رہی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا!"

"حضور خیال ہے آپ کا۔ مجھے تو پسینہ آ رہا ہے۔"

"پلنگ پر معلوم ہوتا ہے تم نے گدّا نہیں بچھایا۔"

"آپ ہی نے تو منع فرمایا تھا۔"

"ہاں ——" وہ کچھ یاد کر کے بولے "میں نے ہی کہا تھا تم سے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ لوگ مختصر بستروں میں بھی سو سکتے ہیں یا نہیں! اُف کس قدر ٹھنڈ ہو رہی ہے۔"

"حضور اُٹھنے کی تکلیف فرمائیں تو گدّا بچھا دوں۔"

"نہیں رہنے دو۔" رضائی اتار کر بولے "موزے اُتار دو —— ٹھنڈ لگے گی!"

"کیا بکتا ہے —— سنتا نہیں۔"

اُس نے جلدی جلدی پیروں سے موزے کھینچ لئے —— پلنگ سے اُتر کر بولے "ہم فرش پہ چلیں گے۔"

شبّو دانتوں میں انگلی دیئے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کہ آج نواب صاحب کو ہو کیا گیا ہے۔ دن بدن اُن کی صحت بھی گرتی جا رہی ہے۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے۔

"بہت ٹھنڈا ہے فرش" ہاتھ بغلوں سے نکال کر بولے۔

"برف ہو رہا ہے حضور!"

"برف ہو رہا ہے۔" وہ ہنس کر بولے "تم تو کہتے تھے پسینے آ رہے ہیں۔"

"ہاں حضور ——" وہ دہکتی ہوئی انگیٹھی پر نظر ڈال کر بولا —— "فرش گرم ہے حضور ——"

"تو ہم باہر نکلیں گے۔"

"کیا غضب کرتے ہیں آپ!"

"چُپ رہو ——" دروازہ کھل گیا —— "حضور باہر سرد ہوا چل رہی ہے۔ جوتے پہن لیں ——"

"مجھے منع کرتا ہے نالائق ——" بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل آئے

"میرا بچہ اس سردی کو برداشت کرتا رہا۔ کھلے سر اور ننگے پاؤں —— ایک برس نہیں پورے سات سال۔ میں کیا تھوڑی دیر بھی نہیں چل پھر سکتا، ننگے پیر ——" پاؤں سُن ہوتے جا رہے تھے۔ بدن کی ہڈی ہڈی ٹوٹ رہی تھی۔

شبّو نے دیکھا وہ خالی قمیص اور پاجامہ پہنے سڑک پر ٹہل رہے تھے۔

"بیگم! کوئی اطلاع آئی اسپتال سے؟"

"آپ خاموشی سے لیٹے رہیئے۔ بخار بہت تیز ہے اس وقت۔"

"اب تک اُس کا بخار نہیں اُترا کیا؟"

"میں آپ کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔"

"اور میں قمر کے متعلق دریافت کر رہا ہوں۔ بیمار ہے نا۔"

"ہاں خیر آئی ہے پہلے سے اچھا ہے اب۔"

"اچھا ہے ——" رضائی پھینک کر بولے۔ "میں اُسے دیکھنے جاؤں گا۔"

"پھر وہی باتیں کرنے لگے ——" ہاتھ چھو کر بولی "اُف کس قدر تیز بخار ہے۔"

"میں اس کے پاس جاؤں گا ——" رضائی سے گھٹی گھٹی آواز آ رہی تھی۔ چوبیس گھنٹے میں بیسیوں دوائیں پلٹی گئیں۔ مگر اُن کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ نمونیہ نے خوفناک صورت پکڑ لی تھی۔

آدھی رات کو بیگم نے دیکھا وہ کچھ لکھ رہے تھے۔

"میں کہتی ہوں کیا ہو گیا ہے آپ کو!"

"کچھ نہیں بیگم" لیٹتے ہوئے بولے "تم جاگ رہی ہو اب تک؟"

"آپ کو تکلیف ہے۔ مجھے کیا نیند آ سکتی ہے۔"

"تکلیف!" وہ ہنس کر بولے "مجھے کوئی تکلیف نہیں۔"

تھوڑے وقفہ کے بعد سکوت ٹوٹا "بیگم دم گھٹ رہا ہے۔ بہت گرماؤ ہو رہا ہے۔ کھڑکیاں کھول دو۔"

"مگر باہر تو سرد ہوا چل رہی ہے ——"

وہ چُپ ہو گئے۔ جیسے وہ قوت گویائی کھو بیٹھے تھے۔

کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ مکمل سکوت تھا! بیگم سمجھیں وہ سو گئے —— ! علی الصبح ڈاکٹر آیا —— نواب صاحب میٹھی نیند سو رہے تھے جس کا سکوت کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ! ڈاکٹر کے ہاتھ میں وہ کاغذ تھا جس پر اُنہوں نے وصیت لکھی تھی —— "مرنے کے بعد میری ساری جائداد کا مالک قمر ہے —— میرا بیٹا قمر —— !"

"آفتاب احمد"

تلخی

محمد اسحاق شوق کے ایک سرمایہ عزیز کے دولتکدہ پر جہاں دو روپے ماہوار پر ایک کمزور جوان پنکھا کھینچ رہا تھا

(از حضرت احسان دانش)

یہ مجھے اپنی سزا دیگا تو پھر کیا ہوگا
یعنی محفل سے اُٹھا دیگا تو پھر کیا ہوگا

جو نہ جانے اُسے بے مہر، جلے اُس کی بلا
اُس کے غم میں کفِ افسوس ملے اُس کی بلا

میں اُسے صاحبِ ایمان سمجھتا ہی نہیں
اوچھے زردار کو انسان سمجھتا ہی نہیں

اس جگہ چین نہیں ہے کسی پہلو مجھ کو
اس سے آتی ہے جلی لاش کی بدبو مجھ کو

اس کے اخلاق میں دھوکا ہے شرافت میں فریب
اس کے سجدوں میں ہیں اغراض عبادت میں فریب

اس کا اظہارِ وفا ناقص و بے قیمت و خام
علم کو اس کے تپِ دق ہے، عقائد کو جذام

اس کے دل میں ابھی بوئے نہیں احساس کے سانپ
اس کی تسکین میں لہرائے نہیں پیاس کے سانپ

اس سے پوشیدہ ہیں اخلاق کے ساحل اب تک
اس نے چکھے نہیں فاقوں کے مراحل اب تک

گرچہ دروازۂ اعمال نہ اونچا ہے نہ بند
نیکیاں اس کی بہت پست ہیں عصیاں ہیں بلند

پیسہ دیتے ہوئے محتاج کو غمخواری سے
گوشت ہوتا ہے جدا ناخنِ زرداری سے

عشرتیں شرم سے آنکھوں میں دھنسی رہتی ہیں
مکڑیاں جھوٹ کی باچھوں میں پھنسی رہتی ہیں

اس کی جاگیر کے خسروں میں ہے اوقاف کی بو
اس کی خوراک میں شامل ہے یتیموں کا لہو

کیا کہوں وقت اجازت نہیں دیتا مجھ کو
ورنہ کچھ اور ہے غیرت کا تقاضا مجھ کو

وقت کی رَو مرے سیلاب کی ہنگام نہیں
لبِ امواجِ وطن تک مرا پیغام نہیں

گرچہ ہر صاحبِ ثروت نہیں محرم میرا
پھر بھی ہے ان کے محلات پہ پرچم میرا

از جناب اختر شیرانی

ساقی

(عالمِ رقص و نغمہ میں)

اُٹھ ساقیٔ گلفام ، اُٹھا پھول ، اُڑا پھول!
بے تاب ہیں میخوار ، پلا پھول ، لُٹا پھول!
ہاں پھول کِھلا ، پھول !
اُٹھ ، پھول اُٹھا پھول! لا پھول ، پلا پھول!

دُنیا کے ستم بھول ، زمانے کے الم بھول!
فریاد و فغاں کس لئے ، سنسار کے غم بھول!
غم بھول ، اُڑا پھول
اُٹھ ، پھول اُڑا پھول! لا پھول ، پلا پھول!

مینا کی طرف گام بڑھا ، گام بڑھا گام
لا جام بڑھا ، جام بڑھا ، جام بڑھا جام
اور جام میں لا پھول
اُٹھ ، پھول اُٹھا پھول ، لا پھول ، پلا پھول

تاروں سے مرصّع ہو مئے ناب کا ساغر
ناہید کا پیمانہ ہو ، مہتاب کا ساغر
ساغر میں کِھلا پھول
اُٹھ ، پھول اُٹھا پھول! لا پھول پلا پھول

دل سرد ہے ، دل سرد ہے ، دل سرد ہے دُنیا
بیدرد ہے ، بیدرد ہے ، بیدرد ہے دُنیا
عشرت کے کِھلا پھول
اُٹھ ، پھول اُٹھا پھول ، لا پھول ، پلا پھول!

"نیا اُفق"

از
جناب آغا سرخوش قزلباش
دہلوی

نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

وطن نے پھونک دیا بڑھ کے صورِ آزادی
لٹا ہی چاہتا ہے اب سرورِ آزادی
برسنے والا ہے بھارت پہ نورِ آزادی
نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

شرابِ خلق و محبت پلائی جاتی ہے
دلوں سے قیدِ مذاہب اُٹھائی جاتی ہے
یہ رسمِ ہندو و مُسلم مٹائی جاتی ہے
نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

نظامِ سرور و مُفلس بدلنے والا ہے
وطن کے سانچے میں ہر ایک ڈھلنے والا ہے
جو اپنے دیس کا دشمن ہے، جلنے والا ہے
نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

پلٹنے کیلئے کون و مکان اُٹھتے ہیں
یہ بھوکے شیر یہ جانِ جہان اُٹھتے ہیں
یہ بے شمار سسکتے جوان اُٹھتے ہیں

نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

چراغِ غیر بُجھا کر عمل کی آہوں سے
ہٹا کے خارِ کہن اب وطن کی راہوں سے
نکل کے دیکھنا ہے دامِ دیں پناہوں سے
نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

شباب ہے کوئی آگے نہ ہوگی اب منزل
سدا بہار بنے گی وطن کی ہر محفل
نظر کے سامنے عُریاں ہے رُوحِ مُستقبل
نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

ابھی تبسمِ پیہم میں ڈھالنی ہے حیات
لہو کے دھارے پہ بہہ کر نکھارنی ہے حیات
خود اپنے ہاتھوں سے ہمکو سنوارنی ہے حیات
نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

کلاہِ فخر سرِ ارتقا پہ ہو گئی کج
بشر کے قدموں سے لپٹی ہے چرخ کی سج دھج
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ چاند یہ سُورج

نیا اُفق ہے نیا کارواں نئی دُنیا

یہ کون آگیا

از

جناب خلیق ابراہیم

یہ کون آگیا خلیق ساز جاں سنے ہوئے
محبتوں کا ایک سیلِ بیکراں لئے ہوئے

ادا ادا سے اضطراب شورشیں نہاں عیاں
نفس نفس میں سوگمان کے گماں لئے ہوئے

فرازِ ذہن میں ہو جیسے پست سا کوئی خیال
نظر میں زندگی کی ایسی تلخیاں لئے ہوئے

رُخِ صبیح پر حیا کی ہلکی ہلکی سُرخیاں
لبوں کی کپکپاہٹوں سے سوزِ جاں لئے ہوئے

جبیں پہ چھوٹ پڑ رہی ہے مستیٔ جمال کی
کہ جن سے جھینپے نور، وہ تجلیاں لئے ہوئے

رسیلی انکھڑیوں میں بھیگی راتوں کا نچوڑ ہے
مرے شکستہ خوابوں کی تلافیاں لئے ہوئے

وہ بجلیاں جو خرمنِ غم والم کو پھونک دیں
تبسموں کی اوٹ میں وہ بجلیاں لئے ہوئے

یہ کس نے میرا ہات اپنے سینے سے دبا لیا
بدن میں کپکپی نظر میں بجلیاں لئے ہوئے

یہ کن گداز باہوں نے مجھے جکڑ لیا ہے یوں
کہ جیسے کائنات دورِ آسماں لئے ہوئے

یہ کس کی مست مست خوشبو بس گئی دماغ میں
نشے کی بدلیاں، سرور کا دھواں لئے ہوئے

یہ خنکیٔ نگاہ ہے کہ برقِ شعلہ ساز ہے
طراوتیں لئے ہوئے تباہیاں لئے ہوئے

بہار ناچتی ہے ڈال ڈال پات پات پر
شمیم زا جوانیوں کی مستیاں لئے ہوئے

ہو کے دھیمے دھیمے ساز پر سکوت نغمہ ریز
نسیمِ صبح ہے خرامِ مہوشاں لئے ہوئے

فضا میں جیسے ناچتی ہوں سیمیں جسم والیاں
مقدس اپسراؤں کی جوانیاں لئے ہوئے

افق پہ رقص کُن ہوں جیسے ساقیانِ ماہوش
"ستارہ بار و مہ چکاں" گلابیاں لئے ہوئے

حیات و عشق کے یہ لمحے پھیل سکتے ہیں کہ ہے
ہر ایک لمحہ مختصر کہانیاں لئے ہوئے

سکوتِ شامِ غم بھی نغمہ زندگی کا بن گیا
اُداس زندگی کی شادمانیاں لئے ہوئے

یہ عفتِ نگاہ ہے کہ نا عفیف عصمتیں
جنوں کے راز، شوق کی بلندیاں لئے ہوئے

نشاطِ غم ابد سے ہم کنار ہوتی جاتی ہے
کرن کی شبنم اور گل کی داستاں لئے ہوئے

طلب کا اور طرب کا رقصِ جاوداں ہے زندگی
غزل کی اوس انجموں کی کہکشاں لئے ہوئے

یہ کون اشارے کر رہا ہے آسماں کی اوٹ سے
قمر، عطارد اور زہرہ کا جہاں لئے ہوئے

نگاہ عرش سے پرے بھٹکتی پھرتی ہے ابھی
قیاس و وہم و فلسفے کے کارواں لئے ہوئے

یہ کیوں زمین لے رہی ہے کروٹوں پہ کروٹیں
ہر اضطراب میں سکوں کی جھلکیاں لئے ہوئے

یہ کس جہانِ تازہ کی بنا پڑی ہے اس جگہ
کہ ذرہ ذرہ ہے لہو کی سُرخیاں لئے ہوئے

افق کی سانولی سیاہیوں سے آرہا ہے کون؟
نظامِ نو کے پرچموں کی سُرخیاں لئے ہوئے

یہ کس کا نغمۂ گداز آج سُن رہا ہوں میں
کہ روح تھرتھرا رہی ہے سازِ جاں لئے ہوئے

خلیق میری عرضِ غم پہ کون مسکرا دیا
لگاوٹوں میں شعلہ ساز شوخیاں لئے ہوئے

فلمی خبریں

(از فصیح الدین احمد)

(۱) محبوب پروڈکشنز "نجمہ" اور "تقدیر" کے مشہور و ہر دلعزیز ڈائرکٹر محبوب نے ایک نیا تاریخی فلم ہمایوں پیش کیا ہے۔ اس فلم میں اسلامی تمدن کے ایک خاص دور کی داستان پوری شان و شوکت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ عہد ہمایونی کی جھلک اپنی تمام عظمت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس فلم کے لئے کامیاب ڈائرکٹر نے بہت ہی منتخب اداکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ جن میں اشوک کمار۔ چندر موہن۔ وینا۔ نرگس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس فلم کی کامیابی اپنی جگہ مسلم ہے ؛

(۲) لکشمی پروڈکشنز کا پیش کیا ہوا فلم **کادمبری** کے متعلق اطلاع ملی ہے جہاں بھی نمائش کی گئی ہے اس نے سابقہ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اس فلم میں قدیم ہندوستان کی ایک شاندار کہانی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ بادشاہ ہرش کی شان و شوکت اور اس کے دور کا تمدن بڑے دلنشین انداز میں دکھایا گیا ہے۔ اداکاروں میں بعض ایسے ستاروں کا انتخاب کیا گیا ہے کہ جن کی مقبولیت فلمی دنیا میں اپنا سکہ جما چکی ہے بشلاً پہاڑی سانیال۔ شانتا آپٹے۔ ونمالا۔ ہریش وغیرہ۔ یہ فلم اپنی نوعیت کا ایک نہایت کامیاب فلم ہے ؛

(۳) رنجیت موویٹون کا پیش کیا ہوا شاندار فلم **شہنشاہ بابر** ان دنوں جگت دہلی میں ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس فلم میں رنجیت مووی ٹون نے اس جلیل القدر مغل شہنشاہ کی زندگی تاریخی صداقت کے ساتھ پیش کی ہے۔ فلم میں اس فاتح اعظم کی فوجی شان و شوکت خاص اہتمام کے ساتھ دکھائی گئی ہے۔ رزم و بزم دونوں پہلو نہایت دلنشیں طریقے پر پیش کئے گئے ہیں۔
اداکاروں میں خورشید۔ شیخ مختار اور سشیل کمار نے کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔ ابھی یہ فلم بہت دنوں تک شائقین کی توجہ کا مرکز رہے گا ؛

(۴) گیتا نجلی موویٹون کا تیار کیا ہوا فلم **سوال** ان دنوں کھنہ ٹاکیز دہلی میں شائقین کی تفریح کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس فلم کا دہلی میں بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کیا گیا ہے۔ اس فلم میں ایک نہایت دلچسپ رومان ملتی ہے جسے کامیاب گانوں اور حسین پس منظر نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ فلمی دنیا کی دو حسین و جمیل ہستیاں اس فلم کی روح رواں ہیں۔ ممتاز شانتی اور الیاس اس فلم میں یکجا نظر آتے ہیں۔ افسانہ شری سیندر بنرجی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ موسیقی پنا لال گھوش نے خاص اہتمام کے ساتھ پیش کی ہے۔
مجموعی حیثیت سے یہ ایک نہایت کامیاب پیش کش ہے۔ اور اسکی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا ؛

(۵) پربھات نے ان دنوں ایک تاریخی فلم **رام شاستری** کی تیاریوں میں خاص اہتمام کا ثبوت دیا ہے۔ پربھات اپنے پیچھے شاندار فلمی روایات رکھتی ہے۔ اس کے کتنے کامیاب فلم آج بھی دل سے محو نہیں ہوتے ہیں۔ اس آنے والے فلم میں ایک مایۂ ناز تاریخی کیریکٹر اپنے آہنی عزم و استقلال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ رام شاستری ایک ایسا ہیرو گذرا ہے جسکی جرأت، عزم اور نیک اطواری کا سکہ بادشاہ اور رعایا دونوں پر جم چکا ہے۔ پربھات نے اپنے نئے فلم کے لئے ایک اچھوتے ایکٹر کا انتخاب کیا ہے۔ اس فلم سے نہایت شاندار توقعات وابستہ ہیں۔ اداکاروں میں **گجانن** جاگیردار۔ للتا پوار اور میناکشی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
عنقریب منروا سینما دہلی میں نمائش کیلئے پیش کیا جائے گا ؛

(۶) پردھان پکچرز شمالی ہند کے مشہور و معروف پروڈیوسر مسٹر پنچولی کی کہانی **داسی** پردھان پکچرز نے اپنے سٹوڈیو میں نہایت کامیابی کے ساتھ تیار کی ہے۔ یہ فلم ان دنوں منروا ٹاکیز دہلی میں پبلک سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ اس فلم کی روح رواں راگنی۔ نجم الحسن۔ گیانی۔ کلاوتی۔ جی، این بٹ اور بے بی پدمنی ہیں۔ ڈائرکشن ہرن بوس کا کارنامہ ہے اور میوزک امرناتھ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔
اس فلم میں کہانی، گانے اور مکالمے سبھی اپنی خصوصیت رکھتے ہیں ؛

پنچولی پکچرز کا نیا آنے والا فلم **شیریں فرہاد** یقیناً اپنی نوعیت کا ایک بے نظیر فلم ہے۔ اس فلم کی تیاریوں پر بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ اس فلم میں فرہاد کی عجیب و غریب دلگداز داستان کو تاریخی صداقت کے ساتھ پیش کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس دفعہ کے ساز و سامان اور

لباس وضع کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔
تازہ ترین اطلاعات کے ماتحت اس فلم سے عظیم الشان توقعات وابستہ ہیں ؛

(۷) بمبئی سینے ٹون کا تیار کیا ہوا فلم **لال حویلی** آج بھی نادلی سنیما دہلی میں اسی دھوم دھام سے چل رہا ہے جس سے وہ شروع ہوا تھا۔ اس فلم نے پبلک کے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ اس فلم کی رُوح رواں نور جہاں۔ سریندر۔ الیاس۔ یعقوب۔ کنھیا لال مایا بنرجی۔ غوری اور برج رانی ہیں۔
موسیقی اور پس منظر دونوں اس فلم کے نہایت کامیاب پہلو ہیں۔
یہ فلم بہت دنوں تک اپنی یاد چھوڑ جائیگا ؛

(۸) شالیمار پکچرز کے بیدار مغز اور خوش مذاق ڈائرکٹر مسٹر ڈبلیو۔ زیڈ احمد نے اپنی پیشکش **من کی جیت** پر کافی دقت اور توجہ صرف کی ہے۔ اس فلم کے مکالمے اور گانے لکھنے کے لئے ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر جناب جوش ملیح آبادی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ مشہور ادیب کرشن چندر نے بھی مکالموں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ یقیناً اس فلم کا ادبی معیار بہت بلند ہوگا۔
اس فلم کی دلکشی کا یہی کیا کم ثبوت ہے کہ اسکی رُوح رواں حسین و جمیل پُراسرار نینا ہیں۔ جو "ایک رات" میں اپنی ہردلعزیزی کا سکہ جما چکی ہیں۔
اس کمپنی کا دوسرا فلم **غلامی** بھی اُمید کی جاتی ہے۔ آپ اپنی مثال ہوگا۔ اس فلم کی رُوح رواں مشہور و معروف رینو کا دیوی ہیں۔ پرویز کی جمیل اداکاری بھی اپنی مخصوص اہمیت رکھتی ہے ؛

(۹) ہندوستان چترا کا تیار کیا ہوا شوخ اور دلچسپ فلم **شرارت** اپنی نوعیت کا ایک نہایت کامیاب فلم ہے۔ اس فلم میں مشہور اداکار کشور ساہو نے اداکاری کے علاوہ کامیاب ڈائرکشن کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اداکاروں میں پرتیما داس گپتا۔ رانی بالا۔ مایا بنرجی اور گلاب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ؛

(۱۰) اورینٹل پکچرز کا تیار کردہ فلم **کلیاں** میں ایک نہایت دلکش داستان اپنے سوز و گداز کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کے مشہور و معروف ڈائرکٹر اور پروڈیوسر کیدار شرما کی یہ پیشکش بلاشبہ ان کی شایان شان ہے۔ اس فلم میں مشہور و ہردلعزیز موتی لال اور لیلا دیسائی کے علاوہ کمال، راجہ ولادی امرناتھ۔ لیلا مصرا اور کلاوتی نے کامیاب اداکاری کا ثبوت دیا ہے ؛

(۱۱) چترا روپ لمیٹڈ کے تیار کئے ہوئے فلم **صلح** کا دلی کے شائقین فلم ایک مدت سے سخت بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ اب یہ فلم جمعہ ۱۳ اکتوبر سے رنر سنیما دہلی میں شروع ہے اس فلم کی بنیاد ایک تڑپا دینے والی رومان پر ہے جو جابجا مسحور کن واقعات سے لبریز ہے۔ اس فلم میں ایک شوخ رومان ایک نہایت اچھوتے اور دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس فلم کے لئے نہایت بلند پایہ اداکاروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔
جمنا اس سے قبل "دیوداس" اور "خواب" میں اپنے کمالات کا سکہ جما چکی ہے۔ جمنا کے علاوہ بنگال کے مشہور بلند پایہ کیرکٹر ایکٹر اہیندر چودھری بھی اس فلم کی زینت ہیں۔ دیو بالا اور ہمین مکرجی کی اداکاری بھی مخصوص دلکشی رکھتی ہے ؛
موسیقی کا معیار اعلٰے اور پاکیزہ ہے۔ یقیناً یہ فلم بہت دنوں تک شائقین کی توجہ کا مرکز بنا رہے گا ؛

(۱۲) میکر و گولڈن پکچرز دہلی کے حوصلہ مند ڈسٹری بیوٹرز ہیں۔ حال میں اس کے ارباب حل و عقد نے کئی اچھی تصویریں خریدی ہیں جن میں جینت پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **تقدیر** خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اس فلم کی رُوح رواں مہتاب ہیں۔ اداکاروں میں شیام، ممتاز، مہری داس اور الکھنندہ نے کامیاب اداکاری کا ثبوت دیا ہے۔
"تقدیر" کے علاوہ جینت پکچرز کی مسلم تصویر **بھولی بھکارن**۔ واڈیا موویٹون کی جنگی تصویر **پہاڑی لڑکی** اور تاج پکچرز کی تیار کی ہوئی تصویر **زن مرید** بھی وہ تصویریں ہیں جنکو میکر و گولڈن پکچرز نے خرید کر فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تصویریں مقبول عام ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں ؛

(۱۳) بمبئی ٹاکیز کا تیار کیا ہوا شوخ و شنگ فلم **چار آنکھیں** رنر سنیما دہلی میں انتہائی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہانی کی بنیاد ایک نہایت دلکش رومان پر ہے جو جابجا دل دھڑکا دینے والے واقعات سے لبریز ہے۔
فلم میں لیلا چٹنس۔ جے راج۔ پٹھاوالا اور کانتا پرشاد کی اداکاری لائق تحسین ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک کامیاب فلم ہے ؛



شخصیّت کا اِظہار!

اندر کی طاقت کے اظہار کو شخصیت کہتے ہیں۔ اسی سے ہر قسم کی بڑائی، ہر قسم کی طاقت، ہر قسم کی کامیابی، مجلسی، مالی ترقی، عزت اور شہرت حاصل ہوتی ہے۔

شخصیت یوں ہی ہوا میں سے حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے نہایت اچھی صحت لازمی شرط ہے۔ اچھی صحت آپ کے اندر موجود ہے۔ آپ کو صرف اس قسم کے علم کی ضرورت ہے کہ کیوں کر یہ صحت اُبھر آئے اور قائم رہے۔

ایشیا کا نہایت مشہور و معروف رسالہ "**ہمدرد صحت**" بڑی باقاعدگی سے ہر مہینے شائع ہوتا ہے۔ اس میں تندرستی قائم رکھنے کی سائنٹی فک معلومات، سائنٹی فک ورزشیں، علمی اور ادبی مضامین، بیماریوں کے قدرتی علاج، از حد دلچسپ افسانے، سوالات اور جوابات، تیر بہدف چٹکلے فرنگی اور امریکی مضامین کے ترجمے، سلیس زبان میں نہایت دلچسپ طریقے سے پیش کیے جاتے ہیں۔ جن کی ہزار ہا ناظرین پُر جوش تعریف کرتے ہیں۔

سال بھر میں کسی ایک موضوع پر جواہرات سے زیادہ قیمتی، خاص نمبر خریداران کو مُفت پیش کیا جاتا ہے۔ رسالہ "**ہمدرد صحت**" ادبی ذوق رکھنے والوں اور طبی معلومات حاصل کرنے کے لیے بڑی نعمت ہے۔ سالانہ قیمت صرف ایک رُوپیہ (عہ) ضخامت ۷۲ صفحے +

اس فارم کو آج ہی بھر دیجیے

بخدمت جناب منتظم صاحب، ہمدرد صحت، ہمدرد منزل ( ) دہلی

میں ایک روپے کا پوسٹل آرڈر / منی آرڈر بھیج رہا ہوں، سال بھر کے لیے ہمدرد صحت جاری کر دیجیے۔ خاص نمبر بھی مفت میرے پاس آئے گا۔

نام:-

پورا پتہ:-

ہمدرد صحت، ہمدرد منزل — دہلی

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب نادر الوجود کا عطیہ

جبان

یہ عجیب و غریب دوا جریان کیلئے تیر بہدف ثابت ہو چکی ہے

لیکن

اس خاص مرض کے علاوہ بھی یہ تمام اعصابی اور دل و دماغ کی قوتوں کو بحال کرتی ہے

ناتوانی توانائی سے، بڑھاپا جوانی سے اور مایوسی اُمید سے تبدیل ہو جاتی ہے

عضو میں تازہ خون گردش کرنے لگتا ہے

چہرے پر پُر جوش جوانی کی سرخی جھلکنے لگتی ہے

اس کے چند روزہ استعمال سے اکثر مایوس العلاج نوجوانوں نے دوبارہ کھوئی ہوئی زندگی پائی ہے!!

قیمت ۳۲ قرص کی شیشی تین روپے آٹھ آنے ۔ ۶۴ قرص کی شیشی چھ روپے

ملنے کا پتہ:- منیجر ہندوستانی دواخانہ۔ پوسٹ بکس ۲۵ دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

تار کا پتہ:- ہندوستانی دہلی

کھنّہ ٹاکیز دہلی میں تیسرا شاندار ہفتہ

قابل تعریف پیشکش

جس کے گیت، مناظر اور رومانی پس منظر ایک عرصہ تک بھلائے نہ جا سکیں گے

بے نظیر موسیقی

افسانہ: سریندر بنرجی

موسیقی: پنّالال گھوش

فلمی دنیا کا حسین ترین جوڑا

ممتاز شانتی اور الناصر

شاندار افسانہ

دیگر اداکاران

رادھا رانی ★ صادق ★ راج رانی ★ نرنجن

جاری کردہ: ستارہ فلمز لمیٹڈ ۔ لاہور، دہلی



مادرِ وطن کا بے خوف فرزند

رام شاستری

جس کے

عزم۔ کیرکٹر اور جرأت کے سامنے

• تلواروں نے سجدہ کیا •

• حکمران لرز گئے •

• ظالم کانپ اُٹھے •

• انصاف کا ڈنکا بجا •

وطن کے شیر دل انسان کی تصویرِ حیات

پربھات کا بے مثل تاریخی شاہکار



رام شاستری

ڈائرکٹر:- جاگیردار

اداکاران

گجانن جاگیردار۔ للتا پوار۔ مینا کشی۔ ہنسا واڈکر۔ اننت مراٹھے۔

بے بی شکنتلا۔ سدھا آپٹے

بہت جلد

منروا دہلی میں

نمائش کیلئے پیش

ہوگا

جاری کردہ:- ستارہ فلمز لمیٹڈ — دہلی۔ لاہور

چترا روپ لمیٹڈ کا عظیم الشان

سوشل شاہکار

دلوں کو تڑپا دینے والی معاشرتی رومان

جس میں

جمنا ("دیوداس" اور "جواب" کی مشہور ہیروئن)

اہندر چودھری (بنگال کا بلند پایہ کیریکٹر ایکٹر)

اور

دیو بالا ——— **ہیمن مکرجی**

نے اداکاری کا کمال پیش کیا ہے

رومان و موسیقی کا مرقع

اداکاری کا معجزہ

رٹز سنیما دہلی میں

جمعہ کو ۱۳ اکتوبر سے شروع

چندن مل، اندر کمار۔ دہلی، لاہور، کراچی

بمبئی ٹاکیز کا بے نظیر کارنامہ

چار آنکھیں

کہانی:۔ امیہ چکرورتی
ڈائرکشن:۔ سوشیل موزمدار
گانے:۔ نریندر

جب اجنبی ——— ایک دوسرے کو متعجب ہو کر دیکھتے ہیں!
جب دوست ——— ایک دوسرے سے ملتے ہیں!
جب عاشق ——— ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں!

——— لیکن ———

جب اجنبی عاشق ——— ایک دوسرے سے دوبارہ چار آنکھیں کرتے ہیں!

——— تو کیا ہوتا ہے؟ ———

پردۂ فلم پر ملاحظہ فرمائیں!!

——— اداکاران ———

لیلا چٹنس۔ جیراج۔ پیٹھاوالا۔ کانتا پرشاد۔ پال مہندر وغیرہ

رٹز سینما دہلی میں تیسرا پُربہار ہفتہ

جاری کردہ: [illegible] ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی، لاہور، کراچی

رنجیت مووی ٹون کا تاریخی شاہکار
عہدِ مغلیہ کے عظمت و جبروت کا شاندار مرقع

شہنشاہ بابر

ڈائرکٹر:۔ وجاہت مرزا

اداکاران خصوصی:
خورشید۔ شیخ مختار۔ سوشیل کمار

اداکاری کا اعجاز

موسیقی کا کارنامہ

جگت ٹاکیز دہلی میں

چوتھا دلکش ہفتہ

جاری کردہ
دہلی ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی۔ لاہور۔ کراچی

...ک دنیا تک زندہ رہنے والی تصویر

بمبئی سینے ٹون کی غیر فانی پیش کش

لال حویلی

پروڈیوسر: ـــــ کے۔ بی لال

ـــــ:(ستارے):ـــــ

نورجہاں ۔ سریندر ۔ الیاس ۔ یعقوب ۔
نصیالال ۔ مایا بینرجی ۔ وتسلا غوری ۔ بدری پرشاد
برج رانی

...لٹی (دھلی) ...وال ہفتہ	ریجنٹ (لاہور) چوتھا ہفتہ	رائل (امرتسر) تیسرا ہفتہ
...آف ویلز (لکھنؤ) ...سرا ہفتہ	نوولٹی (کانپور) دوسرا ہفتہ	نگار (میرٹھ) دوسرا ہفتہ

۴ ہفتہ میں ۶۰ مرتبہ فُل ہاؤس کا بورڈ

آج تک کسی تصویر میں نہ دیکھا نہ سُنا
لکشمی کا تیار کردہ
...... ۲۰ روپیہ کی لاگت کا زبردست رومانی شاہکار
جس کو
مہاراجہ "ہرش" کے درباری شاعر "بان" نے ڈیڑھ ہزار برس
پہلے قلمبند کیا

چاند کی دُلہن
کادمبری

ڈائریکٹر: نندلال جسونت لال

اداکاران خوش گلو: شانتا آپٹے ۔ ونمالا ۔ پہاڑی سانیال
جیون ۔ ہریش وغیرہ

نشاط لاہور میں تاریخی رش

جاری کردہ: مون پکچرز ۔ دہلی ، لاہور

شمالی ہند کے سب سے قابل و نامور پروڈیوسر

مسٹر پنچولی کا قابلِ داد افسانہ

داسی

روزانہ تین شو

۴ بجے

۷ بجے

۱۰ بجے شب

جس کو

پردھان پکچرز نے اپنے عالیشان نگارخانہ میں فلما کر

پیش کیا

اداکاران:

راگنی۔ نجم الحسن۔ گیانی۔ کلاوتی۔ جی این بٹ

بے بی پروین۔ خیراتی وغیرہ

ڈائرکٹر:۔ ہرن بوس

میوزک:۔ امرناتھ

گانے و مکالمے:۔ ڈی، این مدھوک

دلکش افسانہ ★ وجد آفرین نغمے ★ پرزور مکالمے

صاف صدابندی ★ اعلیٰ فوٹوگرافی

منروا ہال میں چھٹا شاندار ہفتہ

پنچولی کا اوّل کارنامہ

شیریں فرہاد

بیش قیمت سازوسامان کے ساتھ

یادگار رومان!

دلگداز افسانہ!

اداکاران:

راگنی ★ جئینت

غلام محمد

ڈائرکٹر:

پرہلاد دت

جاری کردہ: ایمپائر ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ و لاہور

فضول کیوں تکلیف اٹھاتے ہو!

دانت ہل رہا ہے تو دہلوی صاحب کا منجن اکسیر دنداں فوراً منگا کر دو چار وقت ملنے سے دانت کا ہلنا موقوف ہو جائیگا اور ہلنے کی تکلیف تو ایک ہی وقت کے ملنے سے جاتی رہیگی۔ یہ منجن دانتوں اور مسوڑھوں کے ہر مرض کا بہترین علاج ہے۔ قیمت فی شیشی دس آنے (۱۰/) محصولڈاک نو آنے (۹/)

ٹین کے ڈبہ میں منگائیں تو ایک شیشی کے منجن سے لیکر [illegible] شیشیوں تک کے منجن پر نو آنے محصول لگے گا۔

ملنے کا پتہ

منیجر نظام المشائخ، کوچہ چیلاں امیران دہلی

ثروت آرا بیگم

[illegible] ناول

[illegible] ثروت آرا بیگم [illegible] ناول ہے جو [illegible] سال قبل لکھا تھا۔ اس [illegible] اہمیت [illegible] اخلاقی و ادبی لحاظ سے یہ اعلیٰ مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی [illegible] کی صحیح تصویر کشی کی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید [illegible] شعریت کی جھلک نہیں۔ [illegible] کی حفاظت [illegible] دی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص [illegible] تہذیب [illegible] اسکو پڑھکر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ [illegible] وہ ہمارے [illegible] دلی کے مردوں [illegible] عورتوں [illegible] پڑھی لکھی [illegible] کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے۔ غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:-

دفتر رسالہ "ادیب" دہلی

دَوائی [illegible]

(رجسٹرڈ)

کیا ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کی آرزو ہے؟

وہ کون سی خاتون ہے جو نہیں چاہتی کہ اسکی گود ہری بھری رہے۔ دنیا میں اولاد سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ اولاد کیلئے ہزار روپیہ صرف کر دیا [illegible] مرادیں اور منتیں مانی جاتی ہیں گنڈے تعویذ کیے جاتے ہیں۔ لیکن اب بہت کم عورتوں کو اس کا علم ہے کہ سیلان الرحم کی وجہ سے اولاد نہیں ہوتی۔ یہ ایک مرض ہے جو خفیہ جسم سے پانی کی شکل میں بہتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شباب آہستہ آہستہ ڈھلتا [illegible] ہے۔ طبیعت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے بھوک اڑ جاتی ہے قبض رہتا ہے جب تک یہ مرض رہتا ہے استقرار حمل ناممکن ہے۔ لہٰذا دَوائی [illegible] کا استعمال کرائیے [illegible] ہمیشہ کیلئے [illegible] ہے۔ اور [illegible] ایام بھی اس دوا کے استعمال سے درست ہو جاتے ہیں۔

قیمت [illegible] (ترکیب استعمال دوا کے پیکٹ پر تحریر ہے)

[illegible] دواخانہ دہلی

بحکم جناب سید بشیر احمد بخاری صاحب اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اوّل
جگادہری

رام چند پسر گوبند رام ویش اگروال ساکنہ مصطفےٰ آباد تحصیل
جگادہری سائل

بنام

تیلورام پسر سالگ رام ویش اگروال ساکنہ مصطفےٰ آباد وغیرہ
مسئول علیہم

درخواست تقسیم اراضی تعدادی 15 بیگہ 1 – 16/1 واقعہ
کول پور تحصیل جگادہری

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں تیلورام پسر سالگ رام ویش
اگروال وغیرہ مذکور تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتے ہیں
اور روپوش ہیں۔ اس لئے اشتہار ہذا بنام تیلورام وغیرہ مذکور
جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہم مذکور ۸ مارچ ۱۹۴۶ء کو
مقام جگادہری حاضر عدالت ہذا نہیں ہونگے تو اُن کی نسبت
کارروائی یکطرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء ہمارے دستخط اور
مہر عدالت سے جاری ہوا۔

دستخط
(بخط انگریزی)

مہر عدالت

بحکم جناب سید بشیر احمد بخاری صاحب اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اول
جگادھری

رام الیشور داس بالغ و خندلال نابالغ بمعافت رام الیشور داس برادرش
پسران جھنڈا لال ویش جگادھری سائل

بنام

رگھبر داس پسر آسا رام و شانتی پرکاش و جے بھگوان بالغان
و چمن لال و برج لال و جے کمار و منالال نابالغان بولایت
جے بھگوان ویش سکنائے جگادھری

درخواست تقسیم اراضی مقدسہ مکان

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں رگھبر داس و شانتی پرکاش وغیرہ مذکور تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتے ہیں۔ اور روپوش ہیں۔ اس لئے اشتہار ہذا بنام رگھبر داس و شانتی پرکاش وغیرہ مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہم مذکور تاریخ ۸ مارچ ۱۹۴۶ء کو مقام جگادھری حاضر عدالت نہ ہوں گے تو ان کی نسبت یکطرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو ہمارے دستخط اور مہر عدالت سے جاری ہوا۔

(دستخط)
بخط انگریزی

مہر عدالت

بعدالت جناب سید بشیر احمد بخاری صاحب اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اوّل جگادھری

رام ایشورداس بالغ و نندلال نابالغ برفاقت رام ایشورداس برادر خود پسران جھنڈولال ویش جگادھری سائلان

بنام

مسماۃ حکیماً بیوہ عادل راجپوت سکنہ کھیڑی رنگھڑان مسئول علیہا

درخواست برائے تقسیم $\frac{1}{6}$ حصہ ملکیت سائلان از اراضی مشترکہ تعدادی ما $\frac{?}{8}$ بسگہ کھیوٹ نمبر 2
واقع موضع کھیڑی رنگھڑان تحصیل جگادھری

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسماۃ حکیماً بیوہ عادل راجپوت سکنہ کھیڑی رنگھڑان مذکورہ بالا کو کئی بار نوٹس عدالت ہذا سے جاری ہو چکے ہیں۔ اور وہ عدم پتہ ہے۔ اس لئے اشتہار ہذا بنام مسماۃ حکیماً بیوہ عادل راجپوت مذکورہ بالا جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مسئول علیہا مذکور تاریخ ۸ مارچ ۱۹۴۶ء کو مقام جگادھری حاضر عدالت نہیں ہوگی تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاویگی۔

آج بتاریخ ۹ فروری ۱۹۴۶ء بہ ثبت میرے دستخط اور مُہر عدالت سے جاری ہوا۔

(دستخط بخط انگریزی)

اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اوّل

جگادھری (پنجاب)

مُہر عدالت

دہلی میں فتح کی خوشی کا ہفتہ

فوجی پروگرام:-

۴ر مارچ ۱۹۴۶ء	... ...	رسم یادِ رفتگان میموریل آرچ نئی دہلی دس بجے دن
۷ر مارچ ۱۹۴۶ء	... ...	فوجی پریڈ تین بجے
۴-۶-۸-۹ر مارچ ۱۹۴۶ء	... ...	فوجی ٹیٹو ساڑھے نو بجے
۹ر مارچ ۱۹۴۶ء	... ...	ہوابازوں کی نمائش ڈھائی بجے دن
۴-۶-۸ر مارچ ۱۹۴۶ء	... ...	فوجی بینڈ کنوٹ سرکس ۔ جامع مسجد ۔ قرول باغ ۔ میموریل آرچ

نوٹ:- ان کے علاوہ آتش بازی، کشتی، مشاعرہ وغیرہ کے اعلانات علیحدہ شائع کئے جائیں گے۔

فیلڈ پبلسٹی آفس ۔ ۲۵ ۔ راجپور روڈ ۔ دہلی



[illegible] في فيلم "وسقطت [illegible]"

THE ADEEB

DELHI

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at 'Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Fazl-ud-din Ahmed M. A. and M. L. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.